منظور شدہ محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ
بانی شدہ ۱۹۴۵ء ★ ٹیلی فون ۳۹۹۳۱

# افکار



سال :- ۲۲ ○ شمارہ :- ۱۷۶

مدیر

## صہبا لکھنوی

| زرِ سالانہ | بیرونی ملکوں سے | | فی پرچہ |
| --- | --- | --- | --- |
| ۱۲ روپے | ۴۰ شلنگ | ۱۰ ڈالر | ایک روپیہ |

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ، کراچی

برانچ آفس
۱۳۔ پرنسیز ایونیو۔ لندن۔ این۔ ڈبلیو ۹

افکار

# افکار کی ۴ یادگار دستاویزی اشاعتیں

جو آج اور ہمیشہ زندہ رہیں گی



## جوش نمبر

قیمتی ایڈیشن دستی ضخیم، مجلد سفید کاغذ
صفحات: ۷۷۴ - ۴۲ نادر و
نایاب تصاویر، غیر مطبوعہ کلام قلمی
خطوط۔ سرورق: عزیز کارٹونسٹ

قیمت ۲۱/= روپے

## حفیظ نمبر

صفحات: ۶۲۰
۵۰ سے زائد نادر و یادگار تصاویر
غیر مطبوعہ اور یادگار تحریریں
سرورق: چغتائی

قیمت ۱۰/= روپے

## فیض نمبر

صفحات: ۷۷۶
۶۳ منفرد اور یادگار تصاویر
مثالی ترتیب و تدوین، نادر تحریریں
سرورق: عزیز کارٹونسٹ

قیمت ۱۲/= روپے

## غالب نمبر

صفحات: ۳۴۰ فن و شخصیت پر ۵
نئے منتخب اور نادر مضامین نظم و نثر
واقعات غالب سن وار اشاریہ مع
کتابیات۔ سرورق: چغتائی

قیمت ۳/= روپے

**افکار معمولی نہیں ہمیشہ غیر معمولی اشاعتیں پیش کرتا ہے**

سالانہ ممبر بن کر آپ بھی — خاص اشاعتیں — رعایتی قیمت پر حاصل کر سکتے ہیں

**مکتبۂ افکار رابسن روڈ، کراچی**

# فہرست



## اپریل ۶۶ء کی تخلیقات

اس شمارے کی تمام تخلیقات براہ راست حاصل کی گئی ہیں، مضامین نظم و نثر کا حق اشاعت محفوظ ہے۔ کوئی تخلیق تحریری اجازت کے بغیر شائع نہیں کی جا سکتی

# ۲۱ سال بیت گئے!

شذرات

گذشتہ خاص اشاعت (غالب نمبر) کے ساتھ افکار نے اپنی عمر کے ۲۱ سال پورے کر لئے، اور اس شمارے سے اس کے ۲۲ ویں ادبی سفر کا آغاز ہو رہا ہے۔

اکیس سال کا عرصہ بظاہر بہت بڑا عرصہ نہیں، پھر بھی ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ان برسوں میں ادب و زندگی کئی ایسے انقلابات سے دوچار ہو چکے ہیں جن کے اثرات ہمیشہ محسوس کئے جائیں گے۔ سنہ ۴۵ء میں دوسری جنگِ عظیم کا خاتمہ، سنہ ۴۷ء کی آزادی اور خونیں فسادات کا المیہ، دو پڑوسی ملکوں کے باہمی روابط میں عدم استحکام، پاکستان میں سنہ ۵۸ء کا انقلاب۔ اور گذشتہ ستمبر میں پاک بھارت جنگ اور معاہدۂ تاشقند، وہ چند عنوانات ہیں جن سے گذشتہ ۲۰، ۲۲ سال کی داستان عبارت ہے۔ ان حالات میں ادب اور ادبی مسائل کی حیثیت ثانوی بن کر رہ گئی۔ 'اردو' جس کے نام پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔ آج تک تجرباتی دور سے گذر رہی ہے۔ ادبی ماہنامے ایک ایک کر کے ختم ہو گئے، جو بچ رہے وہ سسک رہے ہیں۔ ایک زمانے میں فلمی، جاسوسی، جنسی اور معموں کے رسالے "ادب کے خدمت گذار" بن کر چھا گئے تھے۔ اِن دنوں ڈائجسٹ رسالوں نے نئی آب و تاب کے ساتھ خالص ادب کے علاوہ سارے موضوعات کا احاطہ کر کے آسان مطالعہ کی آسودگی کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ ہمیں بھی چند ہمدردوں نے سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ افکار کو ڈائجسٹ کر دیں، یا کم از کم پرچہ کے ظاہری حسن پر توجہ دیں۔ ہم نے ٹھنڈے دل سے ان مشوروں کو سُنا، اور سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کیا — لیکن جو بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی وہ یہ تھی کہ آخر ہم علم و ادب کے کس دور سے گذر رہے ہیں جس میں سستی تفریح اور وقت گذاری کے لئے مطالعہ کا تو بے پناہ شوق پیدا ہو گیا ہے لیکن علم و ادب کے مسائل پر غور و فکر کرنے اور ماضی و حال کے اعلیٰ ادب سے استفادہ کرنے کی عام لگن نہیں پائی جاتی — چنانچہ ہم نے اپنے دوستوں سے صرف ایک سوال کیا کہ بھلا یہ تو بتایئے کہ برصغیر میں اب کتنے ادبی ماہنامے زندہ رہ گئے ہیں جو دلگداز، مخزن، اردوئے معلّٰی، زمانہ، ادیب، ہمایوں عالمگیر، شاہکار اور اسی معیار کے دیگر رسائل کی یاد تازہ کر سکیں۔ (یہاں سہ ماہی، چار ماہی اور شش ماہی جریدے زیرِ بحث نہیں)۔ لیکن ہمارے احباب اس کا جواب نہیں دے سکے — یہ حقیقت نہایت تلخ ہے کہ زمانے کی دست و بُرد نے کئی تاریخ ساز رسالوں کو موت کی نیند سُلا دیا۔ اور آج اُن رسالوں اور اُن کے مدیروں کا جنہوں نے ان رسالوں کی

آبیاری میں اپنا خونِ جگر صرف کیا، کوئی نام لیوا بھی نہیں۔ سچ پوچھئے تو ادبی تاریخ کا یہ ایک بڑا المیہ ہے!۔

ہمیں بھی ماضی سے حال تک ۲۱ سال کی صبر آزما جدّوجہد کے بعد اپنا مستقبل صاف نظر آ رہا ہے۔ پھر بھی ہم نے عمرِ عزیز کے جو قیمتی لمحے 'افکار' کو حسن و معیار کے ساتھ ماہ بہ ماہ شائع کرنے میں صرف کر دیئے ہیں، ان پر ہمیں قطعی افسوس نہیں بلکہ ایک طرح سے اطمینانِ قلب نصیب ہے کہ ان برسوں میں افکار نے اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کر کے، چند یادگار اور دستاویزی اشاعتیں پیش کر کے اور چند نئے تجربوں کو ادبی ماہناموں کا حصہ بنانے کی جرأت کر کے فرضِ منصبی ہی ادا نہیں کیا بلکہ اس دور کے نئے ادبی رسالوں کو اشاعت کا حوصلہ بھی دیا۔ ممکن ہے ہماری یہ بے نام سی سعی و جہد کو آج قابلِ اعتنا نہ سمجھا جائے لیکن عمرِ عزیز کے ۲۱ سال افکار کو ادبی تحریک کی صورت میں زندہ رکھنے کی جدو جہد کرنے کے بعد ہمیں یہ عرض کرنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کہ مستقبل کا مؤرخ جب بھی ادبی رسالوں کی تاریخ لکھے گا تو افکار کی حقیر سی خدمات کو کسی صورت نظرانداز نہیں کر سکے گا۔

گذشتہ ایک سال میں (اپریل ۶۵ء تا مارچ ۶۶ء) افکار نے بحیثیت مجموعی ۸ شمارے شائع کئے جن میں عام شماروں کے علاوہ فیض نمبر ۶۵ء، آزادی ایڈیشن ۶۵ء، جنگ و ادب پر خاص نمبر ۶۵ء، اور غالب نمبر ۶۶ء بھی شامل ہیں۔ یہ تمام شمارے ۱۴۸۷ صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان میں علمی، ادبی، تحقیقی اور نادر و یادگار مضامین کی تعداد ۲۴۴ ہے۔ منظومات ۱۰۸ ہیں اور دیس دیس کے ادب کی تعداد ۳۴ ہے۔ ان کے علاوہ فیض نمبر میں آرٹ پیپر کے ۲۸ صفحات پر ۶۳ نادر و نایاب تصاویر بھی فوٹو آفسٹ پر شائع کی گئی ہیں۔ ان آٹھ شماروں کی مجموعی قیمت ساڑھے اکیس روپے ہوتی ہے۔ جب کہ سالانہ ممبروں سے صرف اٹھارہ روپے وصول کئے گئے۔ ۱۴۸۷ صفحات پر مشتمل نظم و نثر کا اتنا تخلیقی اور جاندار مواد ایک سال کے قلیل عرصے میں برصغیر کے کس رسالے نے آج تک شائع کیا ہے ہمیں علم نہیں —— گذشتہ ایک سال کی کارگذاری سے قطعِ نظر افکار کے لئے یہی اعزاز کچھ کم باعثِ صد افتخار نہیں کہ اُس نے اس عہد کے تین عظیم شاعروں، جوش، حفیظ اور فیض پر ان کی زندگی میں جامع و مستند نمبر شائع کر کے زندہ دوستی کی نئی روایت کا آغاز کیا، اور یہ خاص اشاعتیں برصغیر پاک و ہند کے علاوہ بیرونی ملکوں کی یونیورسٹیوں میں بھی جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے حوالے کی کتاب بن گئیں اور طلبہ و طالبانِ ادب ان سے استفادہ کر رہے ہیں۔

آخر میں ہمیں صرف اتنا اور عرض کرنا ہے کہ ۲۱ سال سے افکار پڑھنے والوں اور پسند کرنے والوں کا ایک وسیع حلقہ رکھتا ہے اس لئے انشاء اللہ ہمیشہ ادبی ماہنامہ کی حیثیت سے ہی اپنے وجود کو قائم رکھنے کی سعی و کوشش کرتا رہے گا۔ ۲۱ سال تک افکار صرف رفیقوں، دوستوں اور ہمدردوں کے سہارے ہی زندہ رہ سکا ہے —— آئندہ بھی وہی اسے صبر آزما حالات اور مالی مشکلات سے چھٹکارا دلانے میں اس کی دستگیری فرمائیں گے۔ اس بات کا ہمیں یقین ہے۔

صہبا

انجم اعظمی

# لکھنا ناگزیر ہے

جب کوئی شخص مجھ سے یہ سوال کرتا ہے کہ میں شعر و ادب کی تخلیق کیوں کرتا ہوں تو میرے پاس اس کا صرف ایک ہی جواب ہوتا ہے — میں ادب کا آدمی ہوں میرے لیے لکھنا ناگزیر ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہی جواب سوال کرنے والے کو ہر عہد کے ادیب و شاعر سے ملتا ہے۔ لیکن میرے زمانے میں یہ جواب زیادہ شعوری اور بامعنی ہے۔ جاگیرداری اور بادشاہت کے عہد میں اہلِ علم و فن کا احترام خود بادشاہ اور جاگیردار کرتے تھے۔ زندگی کی اساس دولت کی لوٹ کھسوٹ کے بجائے چند تہذیبی اقدار تھیں۔ ظلم کرنے والے ظلم کرتے تھے لیکن اسے زندگی کی اساس کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ سرمایہ داری کا عہد زندگی کی ساری قدروں کی نفی کرتا ہوا آیا ہے اور سود و زیاں کا کاروبار شہر شہر اور ملک ملک پھیلا ہوا ہے۔ ملکوں کے درمیانی رشتے بھی کاروباری ہوتے ہیں۔ خیر سگالی کے مشن سیاسی نوعیت کے حامل ہیں اور سیاست کا نقطۂ نظر کاروباری منافع کے لیے دوسروں کا استحصال ہے۔ اس فضا میں ادب تمام تر گھاٹے کا سودا ہے۔ اور وہ تمام حضرات جو اس عہد میں دوسروں کا استحصال نہیں کر سکتے ادیبوں ہی کی طرح بے قدر و قیمت ہیں۔ اسی بنا پر اس عہد کے ہر آدمی کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کا استحصال کرے گا یا زندگی کی قدروں کی حفاظت کے لئے دکھ اٹھانا قبول کرے گا۔ کیونکہ جو استحصال نہیں کر سکتا اس کے لئے دُکھ اٹھانا ناگزیر ہے۔ اس تضاد میں ہمارے ادیب کا شعور اگر لکھنے کو اپنے لئے ناگزیر نہیں سمجھتا تو وہ لکھنا چھوڑ دے گا یا اس کی تحریر بے معنی اور کھوکھلی ہوگی۔ لہٰذا ہم آج اردو کے ادیبوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں تین قسم کے ادیب و شاعر ملتے ہیں۔ اول وہ جو لکھ رہے ہیں اور جن کے یہاں لکھنے کا حوصلہ ہے۔ دوم وہ ادیب ہیں جو لکھ رہے تھے لیکن لکھنا تقریباً ترک کر چکے ہیں۔ وہ اس بحرانی دور کا شکار ہو گئے ہیں جس نے بازار میں ادب کی کوئی قیمت ہی نہیں رکھی۔ تیسرا گروہ ان ادیبوں کا ہے جو تعداد میں سب سے زیادہ ہیں لیکن وہ خود نہیں بتا سکتے کہ کیا لکھ رہے ہیں اور کیوں؟ اس آخری گروہ میں روایت پرست، انفرادیت پرست، جمہوریت پرست، ہیئت اور تکنیک کے بے معنی تجربے کرنے والے، عروض و بیان کے شیدائی غرض بھانت بھانت کے لوگ ملتے ہیں۔ لیکن ان میں ہزار ذاتی اختلافات کے باوجود ایک بات مشترک ہے۔ ان میں سے کوئی شخص نہ تو استحصالی قوتوں کے خلاف احتجاج کرتا ہے اور نہ زندگی کی ان قدروں سے محبت جن کا کام معاشرت میں آدمی کے لئے زندگی کی مسرتیں بہم پہنچانا ہے۔ ایسے ادیبوں کے لئے فن کی تخلیق صرف ذاتی تفریح ہے زیادہ سے زیادہ وہ اس تفریح میں اپنی شہرت کی غرض سے اپنے جیسے چند اور لوگوں کو شامل کر لینے کے روادار ہوتے ہیں۔ ریڈیو، فلم اور ٹیلی ویژن کے دور میں وہ اس ادب کے بہت زیادہ قائل نہیں ہیں جو نسبتاً کم تفریح کا باعث ہے (بعض سنجیدہ ادیبوں کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے کہ ٹیلی ویژن کی موجودگی میں ادب کا کوئی مستقبل نہیں ہے)۔ لیکن یہ لوگ ادب کی بقا کے قائل ہوں یا نہ ہوں اپنی بقا ضرور چاہتے ہیں۔ اسی لئے ان ادیبوں سے جن کے یہاں قدروں کا شعور اور ایک صدائے احتجاج ملتی ہے تیسرے گروہ کے بعض ادیب شدید ترین اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ ان قدروں

کے خلاف بھی قلم اٹھاتے ہیں جو پہلے گروہ کے ادیبوں کا موضوع بنتی ہیں۔ بظاہر وہ پہلے گروہ کے ادیبوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن اس طرح تاریخ کی مثبت اور متحرک قدروں کی نفی کر کے ایسی قوتوں سے باطنی اشتراک پیدا کر لیتے ہیں جو دوسروں کے استحصال کو ضروری بھی ہیں۔ اس گروہ میں چند معصوم اور بھولے بھالے ادیب بھی شامل ہیں جو لمبی زلفوں والے ہیں۔ شراب پی کر مجاز اور منٹو کی طرح برباد ہونا چاہتے ہیں۔ ادھورے عشق کرتے ہیں۔ دماغ کے البم میں خوبصورت چہروں کو سجاتے ہیں، راہ چلتی چست لباس حسیناؤں کے گداز جسموں کی یاد ان کی راتوں کی نیند اڑا دیتی ہے۔ کافی ہاؤسوں میں میز کے گرد بیٹھ کر وہ حالات حاضرہ پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں گویا یہ بھی کوئی چیز ہے جسے چائے کی پیالی میں حل کر دیا جائے تو چائے کا نشہ دونا ہو جاتا ہے۔ لیکن لاعلم ہیں تو علم و فن کی تاریخ سے۔ تخلیق ادب کی راہ میں وہ علم و آگہی کو غیر ضروری نہیں بلکہ رکاوٹ بھی سمجھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہمارے شہر میں بھی ادب بعض لوگوں کے لئے ایک نیشن کا کام دیتا ہے لیکن لاہور میں یہ وبا بہت عام ہے۔ لاہور میں طباعت و اشاعت کا کام کراچی سے بہتر ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہر سال وہاں کے پرچے بعض بالکل نئے ناموں سے ہمیں روشناس کراتے ہیں جن کی بیشمار تخلیقات ایک عدد تعارف کے ساتھ دیدہ زیب انداز میں شائع ہوتی ہیں کچھ عرصے بعد لوگ اس نام کو بھول جاتے ہیں۔ اور دوسرے نام کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ ان سلسلوں کی وجہ سے لاہور کے کافی ہاؤسوں کی آمدنی میں تھوڑا بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے نقادوں کو ایک دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بے شمار لکھنے والوں میں دو چار سنجیدہ ادیبوں کو کیسے تلاش کر لیں اور اگر ایسا کر بھی لیا تو کتنی افسوسناک بات ہے کہ سنجیدہ لکھنے والوں کی تعداد اتنی کم ہے۔ اسی دشواری کے سبب سے ہمارے بیشتر نقادوں نے لکھنا بند کر دیا جس سے فائدہ اٹھا کر بعض ایسے حضرات نے لکھنا شروع کر دیا ہے جو عنوان اگر "اسعد ادب کا نیا دور" رکھیں گے تو مضمون میں یہ فرمائیں گے کہ فلاں ہندوستان سے آیا اس لئے بے ایمان ہے اور وہ اتفاق سے یہیں پیدا ہوئے تھے اس لئے زمانت انھیں کوٹے میں ملنی چاہیئے۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ ادب کے نام سے ایسی بے شعور تحریریں بھی شائع ہو جاتی ہیں۔ اور کتنا ظرف ہے ان لوگوں میں جو ادب کے فروغ کے لئے ان کی اشاعت کا بطور خاص انتظام کرتے ہیں۔

ادب کا مقصد اگر قومی زندگی کی تعمیر اور معاشرے میں قدروں کی آبیاری ہے تو ان ادیبوں کو پورے اعتماد کے ساتھ قلم اٹھانا چاہیئے جو آج بھی ادب کو زندگی کا رہبر سمجھتے ہیں۔ مشینی عہد میں ہماری زندگی کی رفتار بہت تیز ہے معاشرہ بکھر رہا ہے، اس کی از سر نو تنظیم ضروری ہے اور یہ کام ہمیشہ سے ان ادیبوں اور شاعروں کے سپرد ہے۔ جو ساری زندگی محبت کی تلاش کرتے ہیں، حسن کے خواب دیکھتے ہیں اور اس کام کے لئے زندگی کے سمندر کو متھ کر اس کا سارا زہر پی جاتے ہیں۔

میرے عہد میں جوش جیسے عظیم شاعر کے علاوہ فیض، عزیز حامد مدنی اور راشد جیسے معتبر شاعر بھی ہیں ان کے علاوہ مجید امجد، مصطفٰے زیدی، محشر بدایونی، ظہیر کاشمیری، ناصر کاظمی، ظہور نظر، سحر انصاری، فارغ بخاری اور سلیم احمد وغیرہ کی شعری تخلیقات اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ غلام عباس، احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کی کہانیاں عسکری، ممتاز حسین، مجتبٰی حسین، ڈاکٹر سید عبداللہ، وقار عظیم اور مدنی کے تنقیدی مضامین جدید ادب کے ارتقا کی ضمانت ہیں (ہندوستان کے ادیب ان کے علاوہ ہیں) اور ایک تازہ دم گروہ بھی ہے جو اپنی بساط کے مطابق شعر و ادب کی تخلیق میں کوشاں ہے زندگی کے اس کٹھن موڑ پر جہاں ادب بے قیمت ہو گیا ہے ادبی کاوشیں اور وہ شعور جو ادیبوں اور شاعروں کے فنی عمل کا محرک ہے ایک خوش آئند مستقبل کی ضمانت بن گئے ہیں اسی لئے آج کے بہترین ادب کا لہجہ رجائی ہے۔ وہ لوگ جو یورپ کی تقلید سے آگے نہیں بڑھتے اور ادب کو بھی دوسروں کی گرہ کا مال سمجھتے ہیں ایک زوال آمادہ تہذیب کی خوشہ چینی کی بنا پر اس رجائی لہجے کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

(باقی صفحہ ۱۴۰)

آغا افتخار حسین

# لندن یونیورسٹی

## اردو کی تعلیم کے چند مسائل

لندن کے قیام کے دوران اردو کی تعلیم کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے سلسلے میں لندن کے اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں اکثر جاتا رہا ہوں اور مجھے وہاں کے ڈائرکٹر اور دیگر اساتذہ سے تبادلۂ خیالات کا موقع بھی ملتا رہا۔ وہاں کے اساتذہ کو اردو کی تعلیم و ترقی کے سلسلے میں ہمیشہ سرگرم عمل پایا۔ ان ملاقاتوں میں اردو کی تعلیم کے مسائل اکثر زیر بحث آئے میں نے رالف رسل صاحب صدر شعبہ اردو سے درخواست کی کہ وہ ان مسائل اور پاکستان کے مطالعے کے شعبے کے بارے میں ایک نوٹ مرتب کر دیں چنانچہ رسل صاحب نے ایک مفصل اور نہایت کارآمد نوٹ تحریر فرما کر مجھے عنایت کیا۔ ذیل کے مضمون میں میں نے زیادہ تر رسل صاحب کے اسی نوٹ سے استفادہ کیا ہے

پہلی بات جس پر شعبے کے اساتذہ زور دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اردو زبان کے طلبا اردو بولنا اچھی طرح سیکھ جائیں۔ اردو متن پڑھ کر سمجھ لینا یا کبھی کبھی ایک آدھ مضمون لکھ دینا کافی نہیں۔ افسوس ہے کہ اردو بول چال کے لئے کوئی ایسا کورس ابھی تک مرتب نہیں کیا گیا جس میں زبان کی تفہیم کے جدید طریقوں کو استعمال کیا گیا ہو۔ یا اگر ایسا کورس کہیں موجود بھی ہے تو لندن یونیورسٹی کے شعبہ اردو کو اس کا علم نہیں۔ رسل صاحب نے اردو کی ابتدائی تعلیم کے دو نصاب مرتب کئے ہیں اور انہیں طلبا پر آزمایا بھی ہے۔ لیکن ابھی اس پر کام ہو رہا ہے اور اردو کے جملوں کی ٹیپ ریکارڈنگ جو اس کورس کا اہم حصہ ہے ابھی کرنا باقی ہے۔ لندن میں یہ کام کرنے کے لئے کچھ مشکلات ہیں کاش یہ کام ہمارے ملک میں ہوتا اور اس کی اشاعت باہر کے ملکوں میں ہوتی۔ رسل صاحب نے ایک اردو ریڈر بھی مرتب کیا ہے جس کا اردو حصہ نوے ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔ کورس میں مدد دینے کے لئے اردو زبان میں کئی مکالمے ٹیپ ریکارڈ کئے گئے ہیں۔ ہر مکالمہ ۳۰ منٹ کا ہے۔ ان تمام کاوشوں کے باوجود رسل صاحب مطمئن نہیں ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ طلبا خاطر خواہ اردو نہیں بول سکتے — مجھے رسل صاحب کی رائے سے کچھ اختلاف ہے۔ میں نے آنرز کے ایک طالب علم سے تقریباً ایک گھنٹہ تک اردو میں گفتگو کی۔ اور میں نے اندازہ کیا کہ طالب علم کو اپنا مافی الضمیر سمجھانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ محض دو تین سال ایک نئی زبان سیکھنے کے بعد (جس کے سیکھنے کی خاطر خواہ سہولتیں بھی موجود نہ ہوں) اگر بات چیت کرنے کی اتنی استعداد حاصل ہو جائے تو اور کیا چاہئے اور وہ طالب علم بے چارہ تو گھنٹہ بھر تک مجھ سے اردو ہی بولتا رہا۔ ہم میں سے کتنے تعلیم یافتہ افراد ایسے ہیں جو گھنٹہ بھر تک اردو ہی بولتے ہیں ہمارا تو ہر دوسرا تیسرا جملہ اردو انگریزی کی کھچڑی ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ابتدائی تعلیم میں دیگر مشکلات بھی ہیں۔ مثلاً اردو۔ انگریزی کی کوئی اچھی لغت موجود نہیں۔ سنہ ۱۸۵۲ء اور اس کے بعد کوئی اردو انگریزی لغت اس پائے کی نہیں لکھی گئی۔ ایک آدھ معمولی درجہ کی قواعد کی کتاب ہے اور بس۔ علاوہ ازیں کوئی ایسی کتاب نہیں جسے استاد ابتدائی جماعتوں میں استعمال کر سکے۔

طیلسانی جماعتوں (بی۔ اے پاس اور آنرز) کی تعلیم کو لندن یونیورسٹی میں مابعد طیلسانی (پوسٹ گریجویٹ) تعلیم کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ کیونکہ زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ برطانوی باشندوں کو اردو زبان و ادب سے روشناس کرایا جائے بی۔ اے پاس اور آنرز کے کورس کا نصاب اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ مابعد طیلسانی کام میں زیادہ تر پاکستانی اور ہندوستانی طلبا دلچسپی لیتے ہیں۔ رسل صاحب کا خیال ہے کہ یہ کام زیادہ تر پاکستان اور ہندوستان میں ہو تو بہتر ہے۔ پاس اور آنرز کورس کے طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ برصغیر پاک و ہند کی اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی تاریخ کا مطالعہ کرے تاکہ اس دور کے ثقافتی۔ سماجی۔ اور معاشی پس منظر پر اس کی اچھی نظر ہو لیکن افسوس ہے کہ اس دور کی تاریخ پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا اور کوئی معتبر تاریخ کسی برطانوی۔ ہندوستانی یا پاکستانی مورخ نے ایسی نہیں لکھی جو طلبا کی اس ضرورت کو پورا کر سکے۔

جیسا کہ اس سلسلے میں گزشتہ مضامین (مطبوعہ افکار اگست و ستمبر ۱۹۶۵ء) میں عرض کر چکا ہوں اس مدرسے میں ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کا کام کرنے کے مواقع بھی موجود ہیں۔ ان جماعتوں میں زیادہ تر پاکستان اور ہندوستان کے طلبا اور اساتذہ وغیرہ داخلہ لیتے ہیں۔ اکثر طلبا کو تحقیق سے کوئی خاص دلچسپی یا طبعی مناسبت نہیں ہوتی لیکن محض لندن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے لئے درخواست دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ڈگری آسانی سے مل جائیگی۔ لیکن ان جماعتوں میں داخلے آسانی سے نہیں ملتے بیشتر طالب علموں کی استعداد ایسی نہیں ہوتی کہ وہ اعلیٰ معیار کا تحقیقی کام کر سکیں۔ اس لئے عام طور پر درخواست گذار سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے منتخب موضوع پر ایک مختصر مضمون لکھے جس سے ظاہر ہو کہ اسے اس موضوع سے کیسے دلچسپی پیدا ہوئی وہ اس پر کس نہج سے کام کرے گا۔ نیز موضوع کے بارے میں معلومات میں اضافے کے کیا امکانات ہیں۔ اس کے علاوہ عام طور سے داخلے کی درخواستوں پر غور کرتے وقت یہ دیکھ لیا جاتا ہے کہ جس موضوع پر کام کرنا مقصود ہے اس کا مواد برطانیہ کے کتب خانوں میں موجود ہے یا نہیں ترجیح ان درخواست گزاروں کو دی جاتی ہے جن کے موضوع پر کتابیں وغیرہ برطانیہ میں موجود ہیں۔

مذکورہ بالا مشکلات کے علاوہ اور بھی کچھ ایسے مسائل ہیں جن سے لندن کے شعبہ اردو کے اساتذہ دوچار ہیں ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ اردو کے کلاسیکی ادب کا معتبر متن دستیاب نہیں۔ پرانے نسخے اغلاط سے پُر ہیں۔ اور ستم یہ ہے کہ نئے ایڈیشن جو گزشتہ دس بارہ سال میں طبع ہوئے ہیں ان میں بھی یہی نقص موجود ہے۔ کاش جتنی کاوش تنقیدیں لکھنے پر کی گئی ہے اس کی نصف محنت ان نسخوں کی صحیح طباعت و اشاعت پر بھی کی گئی ہوتی تاکہ کلاسیکی ادب کی　　بنیادیں تو مضبوط ہو جاتیں۔

جیسا کہ میں گزشتہ مضامین میں عرض کر چکا ہوں بیرونی ممالک میں لندن یونیورسٹی وہ ممتاز ادارہ ہے جس نے اردو کی تعلیم میں

---

رسل صاحب نے اپنے نوٹ میں لکھا ہے کہ بعض اوقات یہ احتیاط بھی کافی ثابت نہیں ہوتی۔ کچھ عرصہ ہوا ایک خاتون نے ایک اچھے معیار کا مضمون بھیجا۔ مضمون پسند کیا گیا اور انہیں داخلہ دیدیا گیا۔ لیکن جب وہ لندن آگئیں تو پہلے ہی انٹرویو میں یہ ثابت ہو گیا کہ یہ مضمون موصوفہ نے خود نہیں لکھا تھا۔ اور یہ کہ وہ اپنے موضوع پر کام کرنے کے لئے قطعی طور پر نااہل ہیں۔
چنانچہ ان کا داخلہ منسوخ کر دیا گیا۔

غالباً سب سے زیادہ دلچسپی لی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں اس مدرسے سے مستقل رابطہ رکھیں اور معلومات کے تبادلے اور کتب ورسائل کی پبلیکیشن سے اردو کے اساتذہ کی مدد کریں۔ یہ ادارہ ہماری تہذیب اور ہماری زبان کو دنیا بھر میں متعارف کر رہا ہے۔ دیگر قوموں نے اپنی تہذیب اور زبان کے تعارف اور ترویج کے لئے ہزاروں پونڈ سالانہ خرچ کر کے باقاعدہ ادارے قائم کئے جن کی شاخیں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ برٹش کونسل۔ آلیانس فرانسیز۔ امریکن کلچرل سینٹرز وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ کیا ہم یہ بھی نہیں کر سکتے کہ دنیا میں جو ادارے ہماری تاریخ، ثقافت اور زبان وغیرہ کی ترویج و ترقی میں دلچسپی لے رہے ہیں ہم خود کو ان کے مسائل سے باخبر رکھیں؟

---

# لکھنا ناگزیر ہے

(صفحہ ۱۴ سے آگے)

ہمارے معاشرے کے بعض ایسے ادیب وہ ہیں جو اپنے آپ سے خفا اور زمانے سے ناامید ہیں ان کے سامنے میں غالب، شبلی اور یگانہ مثال رکھنا چاہتا ہوں۔ غالب جیسے عظیم شاعر کے مقابلے میں ذوق کو سراہا گیا۔ بہادر شاہ ظفر آخری مغل تاجدار تھے حکومت کا دبدبہ نہیں رہا تھا لیکن محل کے اندر تہذیب کا عمل دخل پہلے سے بھی زیادہ تھا اس کے باوجود وہ غالب کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ شبلی کو آج تک سمجھا ہی نہیں گیا۔ سرسید کے چاہنے والے سمجھتے ہیں کہ شبلی کی فکر سرسید کے انکار پر مبنی ہے حالانکہ سرسید اور شبلی مل کر ایک عہد کو مکمل کرتے ہیں۔ یگانہ بے چارے کو لوگوں نے مرنے کے بعد بھی معاف نہیں کیا۔ اس ادب دشمنی کے باوجود یگانہ چنگیزی نہ صرف لکھنؤ بلکہ حسرت، اصغر، فانی اور جگر کی مقبول عام غزلوں سے الگ ایسے فن کی تخلیق کی جو بڑی حد تک عہد آفریں ہے۔ آج کے لکھنے والے بھی اگر لکھنے کی مزدوری طلب کرنے کے بجائے ان پیشروؤں کی طرح قلم اٹھالیں تو اپنا عہد خود پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی بنا پر جب میں یہ کہتا ہوں کہ لکھنا میرے لئے ناگزیر ہے تو اس کا واضح طور پر یہ مطلب ہے کہ میں معاشرے کے جھوٹ کا ساتھ دینے کے بجائے دوسرے ادیبوں کے ساتھ مل کر مستقبل کے دروازے پر مسلسل دستک دیتا رہوں گا اور اس عہد کا انتظار کروں گا جو آج کے روح عصر کا تقاضا ہے۔ بقول غالب

اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

بیگم افضل کاظمی

# ناول اور نقطۂ نظر

ناول فن کے اعتبار سے کتنا ہی مختلف سہی لیکن بڑی شاعری اور اچھے ناول کے موضوعات تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں۔ انگریز نقاد والٹر ایلیٹ نے ناول کے بارے میں کہا ہے ۔

"ناول کے موضوع کی وسعت خود ذات انسانی سے کسی طرح کم نہیں۔ ناول نگار عورتوں اور مردوں کا گہری نظر سے مطالعہ کرتا ہے اس کا تعلق ان کے افعال' خیالات' اغلاط' خام کاریوں' عظمت اور ان کی فرومائگی سے ہے۔ بے شمار حسین اشکال ان کی تلون مزاجی' خوف' احساسات' جوش اور جذبات جو قلب انسانی میں تموج برپا رکھتے ہیں ناول کے موضوع ہیں مختصر یہ کہ اس کا موضوع خود انسان ہے"۔

انسان اپنی نیرنگیوں کے ساتھ ناول اور دوسرے فنون کا موضوع بنتا ہے ۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ناول کا تعلق انسان اور اس کی زندگی سے کتنا گہرا ہے۔ ناول نگار کے لئے ناممکن ہے کہ زندگی اس پر جو تاثر چھوڑے اس کا اظہار نہ کرے۔ کبھی یہ اظہار پوری قوت اور وضاحت سے ہوگا۔ کبھی محض اشاروں پر اکتفا کیا جائے گا۔ موقع و محل کے اعتبار سے موضوع کو تفصیل اور اختصار سے پیش کیا جاتا ہے ان تاثرات میں ناول نگار کی شخصیت کا عکس بھی ملے گا۔ اس کے عقائد و نظریات کی جھلکیاں بھی ہوں گی۔ فنی خوبیوں اور خامیوں سے الگ اس کے اپنے نقائص اور کمالات ناول میں موجود ہوتے ہیں۔ اور اگرچہ یہ ساری باتیں ناول کے معروضی انداز بیان کا جز بنکر سامنے آئیں گی لیکن ناول چاہے کتنا پست ہو ناول نگار اپنے مخصوص نظریات اور انداز فکر ہی کے مطابق زندگی کے حقائق کو فنی شکل عطا کرتا ہے۔ اس طرح ایک انتہائی فرد مایہ ناول بھی زندگی کے متعلق ایک عام فلسفہ کا مجمل خاکہ ضرور پیش کرتا ہے۔ لیکن اس کے پیش کردہ نظریہ حیات میں نہ تازگی پائی جاتی ہے نہ سنجیدگی اور نہ ان خیالات کو اتنی قوت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ وہ لائق توجہ ہو۔ اس کے برعکس عظیم ناول نگار نہ صرف زندگی کے حقائق کا مشاہدہ کرتے ہیں بلکہ اس پر مراقبہ بھی کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے صرف تماشائی نہیں بلکہ مفکر بھی رہے ہیں۔ ان کا کرداروں کے متعلق بصیرت افروز بیان انسانی جذبات کا صحیح اور مکمل ادراک' زندگی سے متعلق مختلف تجربات اور ان سب سے بڑھ کر ان کی وہ پختہ بصیرت جس کا وہ اپنی تخلیق میں اظہار کرتے ہیں سب مل کر ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتی ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ نقطۂ نظر کسی بندھے ٹکے اصول کو جوں کا توں مان لینے کا نام نہیں ہوتا۔ ناول نگار کا نقطۂ نظر عام انسانوں سے مختلف زندگی کے بارے میں ایک فن کار کا منفرد رویہ ہوتا ہے ۔ جو اتنا معیاری اور اہم ہوتا ہے کہ قاری اسے کسی حال میں نظر انداز کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ہم جب بھی کسی بڑے ناول نگار پر بحث کرتے ہیں

توجلد یا بدیر ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ بحث خود زندگی سے مد بھر کو الگ نہیں کی جا سکتی۔ لیکن ساتھ ہی ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ بڑا ناول نگار صرف اس لئے ناول نہیں لکھتا کہ وہ زندگی سے متعلق اپنے مخصوص خیالات کو پیش کرنے کی کوشش کرے یا چند اخلاقی نظریات کو پیش کرنا اپنا مقصد تصور کرے بلکہ ناول کی معروضیت اور تخلیقی امکانات کو بروئے کار لاتے ہیں ان سے مدد حاصل کرتا ہے اور ان کی روشنی میں اپنے نظریات اور عقیدوں پر نظر ثانی بھی۔ جس سے ناول نگار کو تخلیقی عمل کے جدلیاتی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بڑے ناول نگار کے پیش نظر ناول کی تخلیق سے پہلے کوئی ان کا مقصد نہیں ہوتا جسے بطور خاص وہ ایک ناول میں لکھ دے۔ بلکہ اس کے نظریات زندگی کے تجربات کے ساتھ پنپتے ہوتے ہیں۔ اور وہ زندگی سے متعلق جو کچھ سوچتا اور جانتا ہے شعوری اور غیر شعوری طور پر اس کی رہنمائی میں اپنے پلاٹ کو ترتیب دیتا ہے اور کرداروں کو پیش کرتا ہے چند مخصوص خیالات یا مسائل سے بحث کرنا ہرگز اس کا مقصد نہیں ہوتا بلکہ وہ زندگی کے ہزار ہا حقائق سے سروکار رکھتا ہے۔ ایک کامیاب ناول نگار زندگی کے حقائق سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ قاری ناول پڑھتے وقت یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ چند اخلاقی مسائل ایسے بھی ناول میں آگئے ہیں جو ناول نگار کو بے حد محبوب ہیں۔ جب ایک ناول نگار اس منزل سے کامیابی کے ساتھ گزر جاتا ہے تو اس کا فن عظمت سے ہمکنار ہوتا ہے۔

شیکسپیئر دنیا کا عظیم ترین معلم اخلاق بھی ہے وہ یقیناً اپنے ڈراموں سے پیدا شدہ اخلاقی مسائل سے دلچسپی رکھتا تھا اس کے باوجود شیکسپیئر کو ناصح یا واعظ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ وہ اپنی تخلیقات کے عمل اور سیرت دونوں ہی میں برابر ٹھوس حقائق سے واسطہ رکھتا رہا ہے۔ اس کے ڈراموں میں فی الواقعہ حیات انسانی کے متعلق تخلیقی تبصروں کا ایک عظیم سرمایہ ہے۔ جو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ان کی ترتیب اور ترکیب سے زندگی کے متعلق چند عام اصول وضع کر لئے جائیں۔ لیکن اس خصوصیت کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ڈرامہ لکھتے وقت شیکسپیئر کے ذہن میں کوئی نظریہ یا اخلاقی درس تھا۔ اور یہی بات شیکسپیئر کے علاوہ دنیا کے عظیم ناول نگاروں مثلاً بالزک، دستووسکی، ٹالسٹائے وغیرہ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

ناول میں اخلاقی نظام یا فلسفۂ حیات پیش کرنے کی صرف ایک ہی مناسب صورت ہے کہ ناول نگار زندگی کی عکاسی ہی میں زندگی کی تعبیر پیش کرے۔ اس کا ناول زندگی کی تصویر اتارنے کے رخ سے تفسیر حیات بن کر ابھرے گا۔ ناول نگار زندگی میں پیش آنے والے واقعات میں سے چند کا انتخاب کرتا ہے۔ چند کرداروں اور ان کے محرکات پر روشنی ڈالتا ہے اور اپنی ترتیب کے ذریعہ انہیں نامیاتی وحدت میں پرو کر صداقت کے بعض پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے۔ اسی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زندگی سے متعلق اس کا کیا نظریہ ہے یا وہ کون کون سی قدروں کا زیادہ قائل ہے کہاں روایت پرست ہے اور کب بت شکن بن جاتا ہے۔

شیکسپیئر کا ہر ڈرامہ تنقیدی نظر سے دیکھنے پر ایک عالم اصغر نظر آتا ہے کیونکہ اس کا مصنف اس کا خالق اور اس کا پلاٹ اس کا لوح محفوظ ہے۔ یہی بات ناولوں کے بارے میں بھی درست ہے۔ ہر ناول ایک عالم اصغر ہے کہ اس کا مصنف اس کا خالق اور اس کا پلاٹ لوح محفوظ ہے۔ ناول نگار اپنی کہانی اس کے ارتقا، کرداروں کی پیشکش اور ان کے عمل و حرکت کے ذریعہ یہ بتا دیتا ہے کہ زندگی کے بارے میں اس کا نظریہ کیا ہے۔ اس کے بعد یہ فرض ایک نقاد کا ہوتا ہے کہ وہ اس ناول میں بکھرے ہوئے نظریات کو جمع کر کے بنیادی اصولوں کی شکل میں پیش کر دے بشرطیکہ وہ نظریات ہمارے لئے اہم اور ضروری ہوں اور فن کی نئی قدروں کی صورت میں ملے ہوں۔

ناول نگار اپنے ناول میں جو فلسفۂ حیات پیش کرتا ہے اس پر تنقید کرتے ہوئے ہم کو ایک بات خصوصیت سے یاد رکھنا چاہیے کہ افسانے سے اس حقیقت کا مطالبہ نہیں کیا جاتا جس کا تقاضہ ہم سائنس سے کرتے ہیں۔ کیونکہ افسانے کی حقیقت سائنس کی حقیقت سے یکسر مختلف اور منفرد ہوتی ہے۔ سائنس کائنات کے رموز و اسرار اور فطرت کے قوانین کو بے نقاب کرتی ہے۔ لیکن ناول یا کہانی دوسرے فنون کی طرح زندگی کی روایت کو مستحکم کرتا ہے۔ اس کا موضوع مستقبل سے زیادہ ماضی ہوتا ہے۔ ماضی جو ہمارا تجربہ ہے ماضی ہمارے لیے صرف کہانی ہی کی صورت میں زندہ ہے۔ اسی لیے اگر کہانی کا فن موجود نہ ہوتا تو ہم ان تمام قدروں سے الگ ہو جاتے جو ماضی سے ہمیں ملی ہیں۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہوتا کہ ہم خود اپنے ہی تجربوں سے کٹ جاتے جس کے بعد آدمی نہ مستقبل کا خواب دیکھ سکتا تھا اور نہ احساس حسن کی وہ دولت ہمارے پاس ہوتی، جو ماضی کے خزانے سے میسر آتی ہے۔ جس کے بغیر خالی سینے کو بھرنے کی کوئی صورت نہ پیدا ہوتی۔ ماضی کو اس کی ساری عظمت، جلال و جمال کے ساتھ قبول کرنے کے بعد ہی ایک ناول نگار کامیاب فن تخلیق کرتا ہے۔ دراصل ہر فن کار خود ایک کہانی بن جاتا ہے تاکہ اس کا فن زندگی کی صداقت بن کر ابھر سکے۔ اسی لیے تاریخ کے مقابلے میں ناول کسی قوم یا ملک کی حقیقی زندگی کو پیش کرنے میں زیادہ کامیاب ہے۔ اور اسی سبب سے ایک ناول نگار کا نقطۂ نظر ایک مورخ کی حقیقت بیانی سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس مقابلے سے ہمیں جس اہم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ناول بجائے خود زندگی کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھنے کا نام ہے۔

انجم اعظمی

# دستک

ایک جانب ریگِ صحرا، دوسری جانب ہے بحر
اور ان کے درمیاں
دستۂ گل کی طرح اُبھرا ہے شہر
دولتِ حسنِ بتاں سے
شہر اپنا خلد کی مانند ہے
کتنے خوباں اس میں بستے ہیں مگر
اس کے سائے میں ہیں وہ محرومیاں
جن کے پروردہ تقدس کو ابھی
خوابِ عصیاں کی طرح ڈستا ہے شہر

شاہراہوں پر دو رویہ یہ عمارات بلند
اپنے معماروں سے نادم
دیکھ کر ہیں اپنے آقاؤں کا حال
ان کی دیواروں کے پتھر چپ سہی
جانتے ہیں کون پھیلاتا ہے سارے شہر میں
نفعِ اندوزی کے جال

اک قیامت ان کے پس منظر میں ہے
دفتروں سے اور بازاروں سے جب
لوگ گھر لوٹے تو دل کے شور میں
روز گویا صورِ اسرافیل سُن کر سو گئے

کارخانوں سے نکل کر مرد و زن
آئے ہیں سڑکوں پہ یہ کہتے ہوئے
ہم تو خالی جیب کی مانند ہیں
قمقموں سے جگمگاتی شام کو حسرت رہی
دن کی محنت سے جو چہرے بجھ گئے
ان پہ آیا ہی نہیں رنگِ نشاط

ڈھل گیا دن، رات آئی ہے مگر
رات کا افسوں بھی کیا
ہوٹلوں میں روشنی کی اک لکیر
رقص کرتے نازنیں جسموں کو کرتی ہے اسیر
دور تک میزوں پہ بیٹھے ہیں
—— اندھیرے کے سفیر

شہر اپنے آپ میں گم، ہوش سے بیگانہ ہے
اپنی ہی رفتار کا دیوانہ ہے
زر ہے اور ایوانِ اہلِ زر جہاں
بند ہیں لوح و قلم
اور اس در کے بھکاری
نہ جوا پہنے جبّہ و دستار ہیں
منبر و محراب کی زینت بنے
اعلانِ حق کرتے رہے
بھوک سچی ہے شکم سچّا ہے جھوٹا ہے خدا

انقلابِ نو بہ نو کی داستانیں
جو چہار عالم سے آئی تھیں یہاں
خواب دکھلاتی رہیں
اور اداسی دل کی ہر تازہ خبر پر
اوس بن کر پڑ گئی
چاک ہے جب سے قبا امید کی
گوشہ گیروں کو جنوں کی فکر دامن گیر ہے
شہر کے در بند ہیں سارے
تو دستک ہی سہی
خواب بے تعبیر ٹھہرے ہیں
تو ان خوابوں کی لذت ہی سہی
انقلابِ نو بہ نو کی داستانوں سے مگر
دل کو بہلاتے ہیں ہم
اور کیا کیا عشرتِ فردا کا دے کر واسطہ
خود کو سمجھاتے ہیں ہم

جمیل ملک

# قریب و دور

پُل کے نیچے بہتا دریا
پُل کے اوپر ریل
ریل میں بیٹھا دیکھ رہا ہوں
دنیا کا یہ کھیل

ریل کے چھک چھک کرتے پہیے
غم ـــرائیں چلائیں
باہر آتے جاتے منظر
ابھریں اور چھپ جائیں

پُل کے نیچے بہتا دریا
اپنی اور بلائے
جانے ریل کی بیکل سیٹی
آج کہاں لے جائے

میں دریا کی جانب لپکوں
خود دریا ہو جاؤں
لیکن اپنے سینے میں
یہ تاب کہاں سے لاؤں

دریا پوچھے، مر کر جینا
تجھ کو نہیں منظور؟
ریل کی سیٹی شور مچائے
میری منزل دور ہے!

فارغ بخاری

# میرا ادب میرا فن

کس قدر محبوب ہیں، پیارے ہیں
مجھکو تیرے باغ و راغ
فصلیں، کھیتیاں، کہسار، صحرا
ندیاں، دریا، سمندر
وادیاں، دشت و دمن
اے وطن میرے وطن میرے حسیں پیارے وطن

تیری مٹی میں رچا ہے
میرے بچوں کا، جوانوں کا، مرے آبا کا خوں
تیرے رنگ و بو کے افسوں سے سدا مانوس ہے میرا جنوں
میں کسی کو خاک تک تیری نہ دوں
ایک اک ذرے کے بدلے
گر ملے لعل یمن
اے وطن میرے وطن میرے حسیں پیارے وطن
جو بھی دنیا کا سکوں لوٹے وہ دشمن ہے مرا

عافیت پر، امن پر
انسانیت پر
نغمہ و فن پر

جو بن کر راکھشس لوٹے وہ دشمن ہے مرا
جو اجاڑے خوشنما دھرتی کے گل بوٹے وہ دشمن ہے مرا
ایک ہیں میرے لیے کشمیر و ویتنام و عدن
اے وطن میرے وطن میرے حسیں پیارے وطن

میں ہوں شاعر سارے انسانوں سے مجھکو پیار ہے
امن کا پیغامبر ہوں
آج لیکن میرے ہاتھوں میں یہ پرچم
جنگجوؤں، جنگبازوں، سامراجوں، راجوں
کے لئے تلوار ہے
ہے یہی میرا ادب، میری سیاست، میرا فن
اے وطن میرے وطن میرے حسیں پیارے وطن

اللہ

<u>شعر انصاری</u>

# شکستِ تمنّا

تونے کیوں اے دلِ سکوں برباد
ان بہاروں کی آرزو کی تھی
جن بہاروں کی جلوہ سامانی
تیرے جذبات سے گریزاں ہے

بحر کی بیکراں محبت میں
تونے چاہا کہ لہر رُک جائے
تونے چاہا کہ وقت رُک جائے
حلقۂ روز شب کی وسعت میں
لہر ٹھہری نہ وقت ہی ٹھہرا
زخمِ جاں اور ہوگیا گہرا

تجھ کو اب اے دلِ سکوں برباد
اس تمنا سے کیا شکایت ہے
اس تمنا پہ کیوں ندامت ہے
ہر تمنا کا ہے یہی انجام
ہر تمنا کی ہے یہی تعبیر
ہر تمنا کی ہے یہی تقدیر

خیال مینائی

# گھانا

اشانٹی تیرے باغوں میں زندگی کے ورق
بصورتِ گل و لالہ بکھرتے جاتے ہیں
یہ گولڈ کوسٹ کا سونا یہ ناریل کے درخت
ترے شباب و جوانی کے گیت گاتے ہیں

اشانٹی ترے دامن میں زیرِ پرچمِ نو
سفید رنگ کے ناگوں کا نام ہے اب بھی
جواہرات کی کانوں، ربڑ کے باغوں میں
وہی نظام وہی انتظام ہے اب بھی

ترے شعور نے حبِ وطن کے صدقے میں
نئی سحر کا نیا راستہ بنایا تھا
عوام راج کی آواز کے اجالے میں
ترے افق پہ نیا چاند جگمگایا تھا

مگر یہ کیا کہ ابھی تک نظامِ فرسودہ
جواہرات کی کانوں میں زہر بھرتا ہے
سفید فام درندوں کی رہنمائی میں
نئی سحر کے اجالے کا دل دھڑکتا ہے

## طلعت اشارت

# ایک لمحہ

وہ ایک لمحہ
جو وقت کی وسعتوں میں گم ہو کے رہ گیا ہے
جو حاصل زندگی بنا ہے

جسے اگر ڈھونڈ ھ لوں میں
تو زیست کی نبضیں چھوٹ جائیں
جو مجھ کو اپنے امر بنا دے —
زماں، مکاں کے چہار جانب —
— مری طنابیں محیط ہوں گی

جو زندگی کا جمال ٹھہرے — جلال ٹھہرے
جو آرزو کا کمال ٹھہرے — !

بس ایک لمحے کا سلسلہ ہیں
یہ روز و شب
مہر و ماہ و انجم
بساطِ ارض و سما کے مہرے
(جو عالمِ جن و انس و حیواں پہ حکمراں ہیں — !)

انہیں کی خاطر
الاؤ میں نفرتوں کے انسان جل رہا ہے
انہیں سے انسان کی ذہانت —
تباہ کن کھیل کھیلتی ہے
بس ایک لمحے کا سلسلہ ہیں —

جسے اگر کائنات کی ساعتوں سے کوئی نکال پائے
تو جنبشیں منجمد — حدودِ خیال تک ہوں —
نہیں — خیال و عمل بھی تعراید کے اندر
اک آنِ واحد میں ڈوب جائیں

جسے اگر ڈھونڈ لوں تو مجھ کو
ملیں گے وہ سلسلے بھی سارے
جو ایک لمحے سے منسلک ہیں
کہ اس سے پہلے نہیں ہے کچھ بھی
اور اس کے دم سے ہی
وقت گردوں شکار ٹھہرا
وہ ایک لمحہ — جو آفرینش کی ابتدا ہے
وہ ایک لمحہ — کہ جو — خدا ہے — !

فضل تابش

# جنگ کے بعد

میز اک پاؤں
گنوا بیٹھی ہے

تکیہ
کرسی سے الگ رکھا ہے
وار چوکا کا تھا
صراحی کا گلا شاہد ہے
کاپیوں اور کتابوں پہ
پڑے نیلے داغ
کہہ رہے ہیں
کہ دوات الٹی تھی

منّی
ٹوٹی ہوئی چوڑی کے لئے روتی ہے
منّا روتا ہے کہ
گھوڑے کی کمر ٹوٹ گئی
مرغیاں چنتی ہیں پھیلے گندم
کچھ نہ سمجھی ہیں تو خوش خوش سی نظر آتی ہیں
وہ جو گھوڑا تھا گلی کے منہ پر
جیسے کمرے میں چلا آیا ہے
میں بھی کچھ ٹوٹا ہوا بیٹھا ہوں
تم بھی کچھ کم سے نظر آتے ہو
کل بھی اتنا ہی بڑا تھا کمرہ !

عرفانہ عزیز

# ترا پیام

زبانِ بادِ سحر پر ترا پیام لیے
حیاتِ تازہ نوا سنج ہے فضاؤں میں
سنہرے خواب پُر افشاں ہیں اس کی پلکوں پر
لکیر جیسے خطِ نور کی خلاؤں میں

اُبھر رہی ہے ضیا سرمئی ترنّم کی
شعاع پوش ستاروں کے آستانوں سے
برس رہا ہے امیدوں کا رنگ نغموں پہ
نوا فروشِ ازل کے نگار خانوں سے

ترے پیام سے بیدار چشمِ لالہ و گُل
ترے کلام سے جوشِ نمو بہاروں میں
ترے سخن سے تبسّمِ گُل شگفتہ تر
تری صدا سے ترنّم حسیں نظاروں میں

نویدِ صبحِ بہاراں نَفَس نَفَس تیرا
پیام جشنِ چراغاں نظر نظر تیری
مہ و نجوم ترے ضو فشاں نشانِ قدم
فروغِ مہرِ مبیں خاکِ رہگزر تیری!

واحد بشیر

# سوئے رہگذر

اک آرزو کی کہکشاں  مدت سے ہے پیوستِ جاں
اک عمر سے ہے موجزن  احساس کا سیلِ رواں

لیکن حیاتِ معنوی  اس پر بھی ہے دامن تہی
زنجیر سے بوجھل قدم  ہونٹوں پہ مہرِ خامشی

آرام جاں ہے چشمِ تر  وجہِ سکوں، سوزِ جگر
پابند ہے ہر ہر نفس  سہمی ہوئی اک اک نظر

گرمِ سفر ہے قافلہ  آتی نہیں آوازِ پا
مسموم ہے موجِ صبا  بے رنگ ہے ساری فضا

اٹھتی ہے سناٹے میں اک  لوہا کھنکنے کی صدا
کٹتے نہیں ہیں مرحلے  گھٹتا نہیں ہے فاصلہ

انفاس ہیں مدت نہیں  جذبات ہیں شدت نہیں
جینے کو جیتے ہیں مگر  جینے سے کچھ اُلفت نہیں

میں شاعرِ پُرخوں جگر  باندھے ہوئے تارِ نظر
اشکوں کو اپنے روک کر  تکتا ہوں سُوئے رہ گذر

ابن انشا

# انشائیے

## علم کی گولیاں

امریکہ سے کئی قسم کی گولیوں کی ایجادوں کی خبریں آئی ہیں۔ ایک قسم ایسی ہے کہ انسان صبح و شام پانی کے ساتھ کھائے تو دانش ور بن جائے ان کو علم کی گولیاں یا "حبوب علمیت" کہا جائے گا۔ دوسری قسم ایسی ہے کہ کوئی چند دن تک باقاعدگی سے استعمال کرے تو اپنا نام تک بھول جائے۔ دوسروں سے پوچھتا پھرے ان کو حبوب فراموشی یا بھولنے کی گولیوں کے نام سے یاد کریں گے۔ تیسری قسم کی گولیاں اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ یہ بندوقوں کے لئے ہیں ویسے غور کیا جائے تو ایسی خارج بھی نہیں۔ کیونکہ نتیجہ ہر طرح کی گولیوں کا ایک سا ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کی گولیاں رفتہ رفتہ اثر کرتی ہیں اور ان کے لئے فیس بھی دینی پڑتی ہے۔ اور بندوق کی گولی فوری اثر کرتی ہے

ناکامیٔ عشق یا کامیابی! دونوں کا حاصل خانہ خرابی

علم کی گولیاں تازہ ایجاد ہے اور اس کے فائدے حد قیاس میں نہیں آ سکتے۔ اب اسکولوں، اسکول ماسٹروں اور ان کی قمچیوں کا کھڑاگ نہیں رہے گا نہ سردیوں کی راتوں میں کتابیں شانوں پر لیشان کرنے کے دن ہوتے ہیں۔ الجبرے اور تاریخ انگلستان کے گھوٹے لگانے پڑیں گے۔ خلاصوں سے کام بہت کچھ آسان ہو گیا تھا۔ لیکن گولیوں کی اور بات ہے ایک گولی کھائی اور ذہن میں خاندان مغلیہ کی تاریخ آن موجود ہوئی۔ دوسری گولی سے الجبرے کے سب اشکال حل کر دیئے تیسری سے انسان کانٹ کے فلسفے پر قادر ہو گیا اور چوتھی کھا کر فارسی فر فر بولنے لگا و شامن کی طرح ان گولیوں میں بھی اے۔ بی۔ سی۔ ڈی وغیرہ شاخیں چلیں گی۔ کوئی انجینئرنگ کی گولیاں ہیں کوئی وکالت کی۔ کوئی جغرافیئے کی۔ کوئی سیاست مدن کی۔ گولیاں نہیں ہیں تو انجکشن بھی بنیں گے۔ جن گولیوں کے دو ہفتے تک استعمال کی ہدایت ہے ان کا نعم البدل ایک ہی انجکشن ہو جائیگا۔ بی۔ اے۔ ایم اے کی ڈگریاں بھی کتابوں کا کورس نہیں بلکہ گولیوں کا کورس پورا کرنے پر ملا کریں گی۔

فراموشی کی گولیاں بظاہر بے کار سی معلوم ہوں گی لیکن یہ بھی بڑے فائدے کی چیز ہیں بالخصوص سیاستدانوں کے لئے یہ کامیاب امیدواروں میں سے تو بہت سے تو الیکشن ختم ہوتے ہی اپنے وعدے بھول جاتے ہیں لیکن بعضوں کو بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔

نیو یارک سے خبر آئی ہے کہ ایک ایسا آلہ بازار میں آگیا ہے جس کا بٹن دباتے ہی ایک ٹیپ ریکارڈ سے تالیوں اور خیر مقدم کی آواز گونجنے لگتی ہے۔۔اسی آلے سے نعروں اور تالیوں کا ایسا شور پیدا ہوتا ہے جو ایک ہزار کے مجمع کے نعروں اور تالیوں سے پیدا ہو سکتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہمارے سیاسی مقرر بلکہ شاعر بھی حاضرین کے محتاج نہ رہے۔ یہ حاضرین تھے بھی بڑی ٹیڑھی کھیر۔ جو بعض اوقات حلق سے نیچے اترنی مشکل ہو جاتی تھی۔ اب ان کے ناز اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ اسٹیج پر آلہ فٹ کیا اور تقریر یا کلام ارشاد کیا۔ ایک چھوٹا سا آلہ مکرر ارشاد مکرر ارشاد کہنے کے لئے بھی ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔ تالیوں کی گونج میں اسٹیج پر سے گئے۔ تالیوں کی گونج میں اتر آئے۔ نہ انڈے نہ ٹماٹر۔ نہ ہوٹنگ نہ اوٹ پٹانگ سوال۔

## رہنمائے گداگری

آج کل کراچی میں ناظم آباد کے علاقے پر مچھروں، گداگروں اور چندہ مانگنے والوں نے یلغار کر رکھی ہے جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ تینوں مختلف چیزیں ہیں لیکن عام لوگوں کو ایک کا دوسرے پر اکثر گمان ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ کہ بعض بعض تینوں میں مشترک ہے چمٹنے اور چمٹے رہنے کی خصوصیت بھی ایک سی ہے۔ اور ڈی ڈی ٹی ان میں سے کسی پر اثر انداز نہیں ہوتی مچھروں میں کچھ تو مشتق ضرور ہیں جن کی طبیعت ڈی ڈی ٹی سونگھ کر منغض ہو جاتی ہے۔ لیکن زیادہ تر ایسے ہیں کہ ان کی خوراک ہی ڈی ڈی ٹی ہے۔ جہاں چھڑکو پرے کے پرے آن موجود ہوتے ہیں۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ مچھر جب قصد خوں کو آتے ہیں تو پہلے پکار کے آتے ہیں۔ گداگر وغیرہ اس ضابطۂ اخلاق کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے۔

خیر مچھر ایسی مردم آزار چیز نہیں ہے۔ اور پھر ڈیل ڈول اور شکل و شباہت کی بنا پر اسے الگ پہچاننا زیادہ مشکل نہیں لیکن گداگر اور چندہ مانگنے والوں میں فرق زیادہ دشوار ہے ہاں بعض نشانیاں الگ بھی ہیں۔ چندہ مانگنے والا بالعموم سفید پوش ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ شرط ضروری بھی نہیں۔ کیونکہ یتیم خانے کا چندہ مانگنے والوں کو حسب حال بھیس بنانا پڑتا ہے۔ پھر دونوں کی صدا میں فرق ہے۔ ایک اللہ کے نام پر مانگتا ہے۔ دوسرا کسی اور نام پر۔ گداگر تھوڑے پر قانع ہو جاتا ہے اور دعا دیتا ہے، چندہ مانگنے والا اپنا معیار اونچا رکھتا ہے اور دعا کے بجائے رسید دیتا ہے۔ بعض چندہ مانگنے والے یہ امتیاز بھی اٹھا دیتے ہیں اور اگر کوئی چندہ نہ دے تو کہتے ہیں کہ پھر کچھ کھانا وانا ہی کھلوا دیجیے۔ سگریٹ ہی پلوا دیجیے۔

جس طرح سائنس "علم دریاؤ ہے" اسی طرح گداگری کے بھی اتنے گر ہیں کہ ان پر "رہنمائے گداگری" یا "گھر بیٹھے گداگر بن جاؤ" قسم کی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ایک بزرگ کا ذکر ہے کہ چوک میں کھڑے آنکھیں بند کئے مانگ رہے تھے۔ ایک صاحب انہیں دیکھ کر ٹھٹکے اور بولے۔ آپ تو غالباً رئیس اللہ صاحب ہیں۔ جن کی تصنیف لطیف دولت کمانے کے ایک سو ایک نسخے اتنی مشہور ہے وہ بولے۔ جی ہاں۔ یہ فقیر رئیس اللہ ہی ہے۔

حیرت ہے کہ اس کتاب کا مصنف بھی بھیک مانگے۔ گدائے سر راہ نے کہا۔ حضرت۔ یہ کاروبار ان ہی ایک سو ایک نسخوں میں ہے۔

آپ نے ریل میں چھوٹے بچوں کو ایک مطبوعہ کارڈ تقسیم کرتے دیکھا ہوگا جو وہ ہر مسافر کی جھولی میں ڈالتے جاتے ہیں اور اس کے بعد کارڈ کے ساتھ ساتھ بھیک اگاہتے جاتے ہیں۔ مضمون کچھ اس قسم کا ہوتا ہے: "یہ لڑکا گونگا ہے۔ اس کی ماں بھی گونگی ہے۔ اس کا باپ ریلوے میں تھا جو مر گیا لہٰذا ریلوے نے ان کا کرایہ معاف کر رکھا ہے۔ مسلمان بھائی اس کی مدد کریں اور یہ کارڈ ملاحظہ کرکے واپس کر دیں"

ویسے تو اس دنیا میں ہر طرح کے اتفاقات ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ عجب اتفاق ہے کہ ان سب لڑکوں کے باپ ریلوے میں ملازم تھے، کوئی ڈاک خانے یا چنگی گھر میں نہ تھا۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ کسی مخیر نے اس مضمون کے اشتہار چھپوا رکھے ہیں۔ جن کا جی چاہے پانچ روپیہ سیکڑہ کے حساب سے منگوا لے اور اپنا نام بھر کر استعمال کرے۔ ایک بار ہم نے بھی رحم کھا کر ایسے ایک لڑکے کو چونی دی تھی اور دلاسا دے کر پوچھا کہ بیٹے تم گونگے ہی ہو یا کوئی اور بھی خرابی ہے۔ وہ جھٹ سے بولا۔ جی بہرا بھی ہوں۔

لاہور میں تو عوام کو جعلسازوں سے خبردار کرنے کے لئے ایک انجمن بھی بنائی گئی ہے جس کا نام ہے 'خاندانی فقیروں کی انجمن'۔ یہ لوگ مانگنے کو نکلتے ہیں تو ایک ہاتھ میں سونٹا' دوسرے میں کشکول اور جیب میں شجرہ نسب ہوتا ہے کہ دیکھ لیجئے، نجیب الطرفین ہیں کہ نہیں۔ سو پشت سے ہے پیشہ آبا گداگری۔ آج تک پرکھوں میں سے کسی نے کما کر نہیں کھایا۔ اگر کسی نے چپکے سے پیسے نکالے تو کشکول آگے کر دیتے ہیں۔ اور اظہار خوشنودی بھی کرتے ہیں۔ اگر کسی نے ہیر پھیر کی تو سونٹا سنبھال لیتے ہیں کہ ہم کوئی تمہارے باپ کے نوکر ہیں جو اتنی دور سے مانگنے آتے ہیں۔ لاؤ دو کچھ فقیر کو۔

## لاہور لاہور ہے

ہم نے عمر عزیز کا ایک معتدبہ حصہ لاہور میں ضائع کیا ہے۔ لیکن وہ ہماری کمزوری کبھی نہ بن سکا۔ ہم نے اپنے دوستوں سے رفع استعجاب کے لئے کئی بار پوچھا بھی کہ یارو اس بستی میں ایسی کون سی نادر بات ہے۔ ہم سے کیا پردہ۔ ہمیں بھی بتاؤ۔ لیکن ہر بار یہی جواب ملا کہ تفصیل میں مت جاؤ۔ بس لاہور لاہور ہے۔ اس قسم کی بات دلی والوں سے سنی کہ۔ اور بستی نہیں یہ دلی ہے۔ لکھنؤ والے بھی یونہی آئیں بائیں شائیں کرکے ٹالتے ہیں کہ خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے۔ غالب کلکتے گئے تھے۔ توقع تھی کہ اس کا کچھ حال بتائیں گے۔ وہ ذکر پر یہی بول اٹھے کہ،

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

ہمیں حسرت ہی رہی کہ کوئی اپنے دعوے کو مثالیں دے کر ثابت کرتا۔ اتنی ہی بات ہے تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ چوہڑکانہ چوہڑکانہ ہے۔

## اور بستی نہیں یہ ٹیکسہ ہے

خدا آباد رکھے ٹوبہ ٹیک سنگھ کو پھر غنیمت ہے۔ جمیل الدین عالی راوی ہیں کہ ایک صاحب جو دلی کی پرانی معاشرت پر ریسرچ کر رہے تھے، ایک روز استاد بیخود کی خدمت میں یہ پوچھنے گئے کہ حضور یہ جو کتابوں میں پالکی اور نالکی کا ذکر آتا ہے، ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ استاد نے برجستہ معلومات کے موتی رولتے ہوئے فرمایا۔ برخوردار پالکی پالکی ہوتی ہے۔ نالکی نالکی ہوتی ہے۔ پالکی نالکی کیسے ہو سکتی ہے اور نالکی پالکی کیسے ہو سکتی ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ مجھے اپنے شاگردوں کی غزلیں بنانی ہیں۔

باہر والوں سے کراچی کی یہ برائی ہمیشہ سنی کہ یہاں کے لوگ بہت مصروف رہتے ہیں۔ جسے دیکھو اپنے کام سے بگٹٹ بھاگا جا رہا

ہے یہ نہیں کہ آرام سے چنڈو خانے میں بیٹھے۔ چسکی لگائے، پونڈے چھیلے، امیر حمزہ کی داستان سنے سنائے اور بیٹر لڑائے۔ یہ بات سچ ہے۔ کراچی کے لوگ اور کچھ بچائیں نہ بچائیں وقت بچانے کے چکر میں ضرور رہتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کو ریاح کی تکلیف تھی۔ ڈاکٹر نے ان سے کہا کہ روزانہ صبح دو گھنٹہ پیدل چلا کرو۔ بس یہی علاج ہے۔ دو دن تو طوعاً و کرہاً گئے تیسرے روز کیا دیکھتے ہیں کہ کار میں بیٹھے اسی راستے جا رہے ہیں۔ ہم نے کہا حضرت یہ کیا۔ بولے۔ میاں اتنا وقت کس کے پاس فالتو ہے دو گھنٹے میں پانچ میل چلتا تھا۔ کار میں یہی فاصلہ دس منٹ میں طے کر لیتا ہوں ہم نے کہا۔ یہ ڈیڑھ پونے دو گھنٹے بچا کر آپ کریں گے کیا بولے دفاعی فنڈ میں دیدوں گا۔

ایک اور صاحب کو جب حکیم نے ہدایت کی کہ روزانہ ایک سو بیٹھک لگایا کرو تو انھوں نے دو روپیہ روز کا ایک نوکر رکھ لیا۔ اب یہ کرسی پر دراز ہو جاتے۔ وہ سامنے کھڑا ہو کر ان کی طرف سو بیٹھک لگاتا پورے گن کر اسے دو روپیہ دے دیتے۔ ایک روز فرمایا سو بیٹھک روزانہ سے واقعی میرے بدن میں چستی آگئی ہے۔ واقعی حکیم صاحب کا مشورہ صائب تھا۔ دو روپے روز میں یہ علاج مہنگا نہیں ہے ہمارے ایک اور سیٹھ دوست ہیں۔ یہ عدیم الفرصتی کا شکار ہیں۔ ایک روز ہم دوپہر کو ان کے کارخانے پہونچ گئے اور سلام علیک عرض کی۔ کچھ نہ بولے۔ شام کو آئے اور بولے۔ وعلیکم السلام بھیا۔ اس وقت میں مصروف تھا۔ تمہارے سوال کا جواب نہ دے سکا۔ انہی بزرگ نے رمضان شریف میں ایک دن میں تین تین روزے رکھے۔ عدیم الفرصتی کے باعث اس مرحلے پر ہمیں ایک کروڑپتی کی حکایت یاد آتی ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے یار آشنا ہمسایہ وغیرہ سب دنیا کا چکر لگا آئے ہیں اور ڈینگیں مارتے ہیں تو اس نے پورا جہاز کرائے پر لیا۔ اور پائلٹ سے کہا میاں ہمیں بھی دنیا دکھا دو۔ ذرا جلدی ہے پائلٹ یورپ پر نان سٹاپ اڑان کرتے ہوئے ان کو بتانے لگا۔ کہ اب ہم ہالینڈ پر ہیں۔ یہ ادھر بلجیم ہے اب فرانس کی سرحد آگئی پیچھے یہ اٹلی رہا تو سیٹھ صاحب نے منغض ہو کر کہا۔ ہمارا وقت مت ضائع کرو۔ فقط بر اعظم بتاتے جاؤ فرداً فرداً ملک گنوانے کی ضرورت نہیں:۔

انیسہ جلال

# بھنور اور ساحل

"سدا خون جگر میں نے پیا ہے"

آپی نے بے وقت ریڈیو کھول دیا۔ سہگل کی آواز سارے برآمدے میں گونج اٹھی "کیا میں نے کیا ہے کیوں مجھ سے خفا ہے"

کیا میں نے کیا ہے — کیا میں نے —

پھوپی اماں کا دل دہل اٹھا۔ جنے آج کل کی لڑکیوں کے سر میں کیسے سودے سمائے رہتے ہیں۔ بھلا جب دونوں وقت ملتے ہوں ریڈیو کھول کر ایسے گانے سننا دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔

اور پھر یہ نجھو ہے کہ رات کے اندھیرے رینگ رہے ہیں پر ابھی تک درختوں سے ٹنگی ہوئی ہے۔ ہزاروں لاکھوں دفعہ منع کیا ہے پر نجھو کے دماغ کی کوئی کل سیدھی بھی تو نہیں۔ پھوپی اماں بے چاری اس اکلوتی لاڈلی کے ہاتھوں کس قدر ستائی ہوئی تھیں۔ انھیں کا دل جانتا تھا۔ "کیا میں نے کیا ہے" پھوپی اماں کا دل چاہا کہ جا کر اس موئے ریڈیو کا گلا گھونٹ ڈالیں۔ آپی کی یہ عادت انھیں بری طرح کھلتی تھی۔ ان بے چاری کا دل یونہی بات بے بات لرزا کرتا تھا۔ پھوپا ابا خدا غریق رحمت کرے کیا بے وقت مرے تھے۔ "کیوں مجھ سے خفا ہے" "اری نجھو" پھوپی اماں نے دہل کر چیخ ماری۔

نجھو کی پیشانی سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو ہونٹوں پہ وہی ڈھٹائی والی مسکراہٹ تھی۔ "سدا خون جگر میں نے پیا ہے"۔ پھوپی اماں لرز اٹھیں۔ "اری یہ کیا ہو گیا۔" انھوں نے نجھو کو کلیجہ میں بھر لینا چاہا۔ بے تاب ہو کر اس نے انھیں سینے سے چمٹا لیا تو انکی سفید بے داغ ساڑی پر نجھو کے سرخ سرخ خون کے دھبے بن گئے۔

اماں منصور منحوس نے اتنی زور کا پتھر مارا ہے! نجھو کی آواز مارے جوش اور غصے کے بھرائی سی ہو رہی تھی۔

ہائے ہاتھ ٹوٹیں کم بخت کے۔ پھوپی اماں مارے بولاہٹ کے منجھلے بھائی کے اکلوتے لاڈلے کو کوسنے لگیں۔

مغرب کے ملگجے اندھیرے میں نجھو نے ہلچل مچا دی۔ پھوپی اماں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے انکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح نجھو کے ابل ابل کر بہتے ہوئے خون کو روکیں۔ اگر آپی ان کی مدد کو نہ آتیں تو شاید وہ دیوار سے سر ٹکرا کر اپنا ہی ماتھا پھوڑ ڈالتیں۔ پر نجھو ایسی بے غیرت کہ ذرا سی دیر میں پیشانی پر سفید پٹی سجائے منصور سے بھڑی ہوئی تھی۔ "سادھے منصور کے بچے آج تو تو بچ گیا پر اب تیری خیر نہیں" بے حیا نجھو اپنے سے کم از کم چھ برس بڑے کی ایسی درگت بنا رہی تھی اور منصور کا بس نہ چلتا تھا کہ اسے کچا چبا جائے۔ بدزبان کہیں کی۔

بے نجمو کی زبان ہیں یہ مرچوں کی سی تیزی کہاں سے آگئی تھی۔ پھوپھی اماں ایسی خاموش اور ڈرپوک کہ اگر مردانے میں چھوٹے بھائی کے دوست زور کے قہقہے لگاتے تو یہ لرز جایا کرتیں، اور یہ نجمو تھی۔ ایک زبان دراز اور پھوہڑی کہ گھر بھر کا ناک میں دم تھا۔ اس کے آگے تو بڑی ممانی تک ہیچ تھیں کہ جن کے دم خم کے آگے بڑے ماموں کی سٹی گم ہو جایا کرتی تھی۔ پھر نجمو نے جو سارا دن بڑی کوٹھی میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولا کرتی کسی سے ڈرنا نہ سیکھا تھا۔ گھر بھر کے بچے ہر وقت اپنی کوششیں اچھے بچے بننے پر صرف کر دیتے تھے۔ بے چارے صبح صبح منہ اندھیرے بستے اٹھائے اسکولوں کا رخ کرتے اور نجمو ٹھاٹ سے اونچے اونچے پیڑوں کی ڈالیوں پہ جھولا کرتی اور اس کے قہقہے بڑی دور تک ان کا پیچھا کرتے۔ "پھوپھی اماں کبھی نجمو کو باندھ کر اسکول میں کیوں نہیں چھوڑ آتیں۔" بچے ایک دوسرے سے پوچھا کر بڑبڑاتے کیونکہ اس گھر کے اچھے بچے کھلم کھلا نجمو کے متعلق گفتگو نہیں کر سکتے تھے اور ان تمام اچھے بچوں میں ایک بچہ جو سب سے اچھا تھا وہ ہی منصور تھا جس کی گت نجمو کے ہاتھوں یوں بنتی رہتی یوں پھوپھی اماں نے بھی نجمو کو اچھی بچی بنانے کی کبھی کوشش نہ کی تھی یہ جیسے اتنے سارے اچھے بچوں کے ہجوم میں بھی یہ کیسولا اتنا مشکل ہو گیا تھا۔ پھوپھی اماں نے نجمو کو اسکول میں داخل کروایا تو چار ہی دن میں کئی بچوں سے لڑائی ہو گئی۔ دو چار کی مار پٹائی بھی نجمو کا اپنا فرض تھا سو وہ بھی اس نے پورا کر لیا اور پھر خوشی خوشی اپنے گھر میں آگئی۔ ان درختوں سے گلہری بھوتنی کودتی پھرتی نجمو بڑی خوش رہتی۔ درختوں سے لٹکتی ہوئی نوکروں کے بچوں سے لڑتی پھرتی اور سارے بچوں اور فضول سی اچھائی سے دور۔ نجمو بڑی خوشی سے اپنی زندگی گزارتی رہتی۔ اچھے بچے اپنی ماؤں کے ڈر سے اس کے قریب نہ آتے اور اچھے بچوں کو وہ خود اس قابل نہ سمجھتی تھی کہ ان سے کوئی ڈھنگ کا کھیل کھیل سکے۔ یہ صاف ستھرے بچے نہ تو کبڈی کھیل سکتے تھے نہ اندھا پانسا اور نہ نجمو کی طرح زمین پہ لوٹیں ہی لگا سکتے تھے۔ ٹانگ ہاتھ ٹوٹنے کے ڈر کے مارے درختوں کے قریب تک نہ جانے والے بچے نجمو کے معیار پہ پورے نہ اترتے تھے یہ تمام ارمان تو نجمو نوکروں کی اولاد ہی کے ساتھ پورے کیا کرتی تھی۔ پھر یہ ننھے منے بچے دیکھتے ہی دیکھتے بڑے ہو گئے اور نہایت اچھے نکل آئے سبھی صاف ستھرے کھیل کھیلنے والے اور پڑھنے لکھنے کے شوقین پر ان سب سے الگ نجمو بھی ایک دم بڑی ہو گئی۔ اتنی حسین نکلی کہ سب اچھے بچے حیران رہ گئے۔ پر اس کا بے ڈھنگا پن ذرا جو گیا ہو۔ اب اس دن جو منصور نے کچی پکی کیریاں توڑنے کے لئے درخت پر پتھر مارنے شروع کئے تو بپھر گئی کہ یہ تو میرا درخت ہے۔ تم اپنے لئے اس جھاڑ سے کیریاں توڑو ناجی" اس نے حوض کے کنارے لگے ہوئے ایک بگنے سے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ منصور کو ہنسی آگئی وہ نچا ہوا درخت تو کچھ تمہارا ہی لگتا ہے ہر وقت تم ہی ننگی رہتی ہو۔ اے میاں ہوش میں آؤ۔ خبردار جو ایک بھی کیری توڑی اس پیڑ سے۔ نجمو بپھر کر بولی۔ پر منصور بھی موڈ میں آئے ہوئے تھے اور آج یوں بپھری ہوئی نجمو ایک دم بہت پیاری سی لگ رہی تھی۔ انھوں نے پتھر اٹھایا۔ اور ایک کچی کیری کو نشانہ بنایا۔ خدا جانے کس سے نجمو آگے آگئی منصور لرز اٹھے اس کی پیشانی پر بہت پہلے بھی تو انھوں نے ایک چوٹ لگائی تھی۔ اس کی پیشانی کا ننھا سا داغ منصور کو ہمیشہ ایک بہت پرانی سی تنبیہہ کی یاد دلاتا تھا۔ چاند کا داغ۔ اس کی چمکتی ہوئی سپید پیشانی نے انہیں ہمیشہ پیاری پیاری باتیں سجھائی تھیں۔

اونہہ منصور کے بچے اب کے تم بچ نہیں سکتے۔ منصور کے کانوں میں نجمو کے برسوں پرانے الفاظ گونج رہے تھے۔ اور جب وہ درخت سے اتری تو واقعی منصور کو لگا کہ اب وہ نہیں بچ سکتے۔ مارے تکلیف کے اس نے ہونٹوں کو دانتوں تلے داب رکھا

تھا اور پیشانی سے ایک سرخ لکیر اس کے داہنے گال پر آگئی تھی۔ آنکھوں میں رکے ہوئے آنسوؤں کا زبردست طوفان۔ خلاف امید وہ چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف ہولی اور منصور ششدر رہ گئے۔

ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ ایک اچھے بچے کی طرح منصور اس واقعہ کو بھی بھلا دیتا جیسا کہ اس نے بہت پہلے بھی کیا تھا۔ لیکن وہ منصور ہی کیا جو چاند کو دیکھ کر بہکے نہ۔ نجو اتنی حسین نکل آئی تھی کہ پھوپی اماں اس کے پھوہڑپن اور جہالت سے بھی بے پرواہ ہو گئی تھیں نجو نے یونہی بیٹھے بیٹھے بھری پچپسی الٹ ڈالی" ہٹاؤ بھئی یہ کھیل ویل۔ ہمارا دل نہیں لگتا" اور چاند اس کی اور حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ پتہ نہیں نجو بی بی کو کیا ہو گیا ہے۔ بڑی نانی نے جو بھری پچپسی کو یوں الٹا دیکھا تو ان کی سانس رکی کی رکی رہ گئی۔ " اے بی بی بھرے گھر میں بھی بھلا کوئی یوں پچپسی الٹے ہے" پر اتی۔ نجو جیسے جاگ پڑی " ہوں بھر آپ سے مطلب! خدا کرے یہ بھرا گھر ایک دم خالی ہو جائے"۔ نجو زندگی میں پہلی بار یوں ہر چیز سے بولائی جا رہی تھی" اللہ بھئی یہ ہمارا دل کسی بات میں کیوں نہیں لگتا"۔ نجو کا جی چاہا کہ بس پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ آج کل اسے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی تو پیشانی سے چپکی ہوئی پٹی نے اسے بہت کچھ یاد دلایا۔ اور اس کا جی چاہا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پھر اسی باغ میں چلی جائے جہاں اس کا ازلی بیری منصور تاک تاک کر نشانے لگا رہا ہو۔ کبھی ماتھا کبھی دل۔ اور پھر اس کا دل بھی کیا بیری ہو گیا تھا۔ اس کا اپنا دشمن۔ نجو نے آج تک کوئی روگ نہ پالا تھا۔ زندگی ایک رفتار سے گزر رہی تھی۔ نہ کوئی بڑا دکھ اور نہ بہت ساری خوشی یوں پھوپا ابا کا دیا ہوا دکھ مٹانے ہی کو تو نصرت چڑچڑی اور بد مزاج بن گئی تھی۔ رہی سہی کسر پھوپھی اماں کے لاڈ نے پوری کر دی تھی پر جب اس کے اپنے دل نے بے ایمان ہو کر سوچا تو نجو بڑی بوکھلائی " منصور بھئی یہ ہیں کیا تک رہے ہو" نجو نے گویا لٹھ سا مارا جواب میں منصور بہت اترا کر بولتے" ہم تو بھئی چاند کو دیکھ رہے ہیں" وہ واقعی چاند کو تک رہے ہوتے۔ نجو چاند کو کہ جس کی پیشانی بھی داغدار تھی۔ نصرت کا جی چاہتا کہ صاف صاف کہہ دے مگر اس نے کر وہ نہ کہہ سکتی۔ اب وہ بہت سی باتیں پی جاتی۔ اور منصور اتنے اچھے لڑکے ہونے کے باوجود ایسے ڈھیٹ ہو گئے تھے کہ بہت سے اچھے بچوں نے انہیں اپنی فہرست سے خارج کر دیا تھا۔

چاند یہاں کہاں ہے بھئی۔ نجو تنگ آ کر پوچھتی۔

حد ہے تمہیں یہ اتنا بڑا سا چاند بھی نظر نہیں آتا۔ منصور بالکل اس کی آنکھوں میں جھانک رہے ہوتے۔ یہ کیا بالکل میری آنکھوں کے سامنے ان کا ہاتھ بڑی بے تکلفی سے نجو کی طرف اٹھ جاتا۔

نصرت اور منصور کی چاند کی تلاش میں یہ آنکھ مچولی اتنی بڑی کوٹھی میں بھی چھپ نہ سکی۔ منصور تو خوش ہی ہو گئے پر نصرت جھلا کر رہ گئی۔ اور ممانی کو ہوش آیا کہ منصور کیا حماقت کر رہے ہیں۔ منجھلے ماموں بلائے گئے۔ ممانی نے آنسو بہائے۔ منصور نے آنکھیں دکھائیں۔ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں کیں۔ ممانی کے آنسو بھی بے اثر ہو گئے تو انھوں نے وعدہ کر لیا کہ منصور جرمنی ہو آئیں ممانی کی دلی آرزو پوری کر دیں پھر جو چاہیں سو کریں۔ منصور بڑے خوش ہوئے۔ اپنا مستقبل بنانے وہ جرمنی اڑ گئے جاتے ہوئے ڈھیروں وعدے کئے گئے اور نصرت نے یوں سر جھکا کر سنا جیسے اسے ان وعدوں پر بالکل پکا اعتبار ہو۔ اور اس نے اپنے سارے آنسو آنکھوں میں چھپا لئے۔

تم تو یہ سمجھو کہ بس میں یوں گیا اور یوں آیا" منصور چٹکی بجاتے ہوئے بولے۔ نجو کو ہنسی آ گئی۔ منصور برسوں کا فاصلہ چٹکی بجانے میں طے کر رہے تھے۔ یہ تو نصرت ہی جانتی تھی کہ اسے یہ برس اپنے دل پر جھیلنے ہوں گے، ایک ایک لمحہ کا حساب رکھنا ہو گا وہ اللہ

جو منصور کے بغیر بیتیں گے۔ بھلا ان کا اس کی زندگی میں شمار کیسے ہو گا۔

منصور کے خط ممانی کے پاس آتے رہے۔ "امی میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ ذرا اب تو لگتا ہے میرے آنے میں کتنے دن رہ گئے ہیں اور۔۔ اور۔۔ نصرت کو سلام۔"

ممانی کو پتہ نہیں کیا سوجھی کہ انہوں نے۔۔ کپڑوں میں کھوئی ہوئی نصرت کے ہاتھ میں منصور کا خط تھما دیا۔ نصرت کو سلام نصرت کو سلام۔ یہ مجھے کیوں سلام لکھتے۔ نجو جیسے جاگ پڑی۔ تم دس بیس دنوں کا حساب لگا کر منصور صاحب۔ نصرت کو سلام نصرت کو ۔۔۔ نصرت کی آنکھیں دھندلا گئیں اور اس نے منصور کا خط ممانی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "منصور ویسے کیا مطلب ممانی" اور نجو زور سے ہنس پڑی۔

"اے بی بی دلہنیں بھی بھلا کبھی ایسے ہنستی ہیں" نانی کبھی حیرت کے اظہار کو نہیں روک سکیں۔

"ہاں نانی آج کل کی دلہنیں ایسے ہی ہنستی ہیں۔ نصرت اب پھر وہی پرانی نجو تھی۔ ممانی چپ چاپ اٹھ کر چل دیں (اب میں بھی جلدی منصور میاں کا بیاہ کر دوں گی۔ یہ شادی ختم ہو کسی طرح تو نواب عزیز جنگ کے یہاں جاؤں گی۔ ان کی بیٹی کیسی پیاری ہے میرے منصور کی دلہن تو بھئی وہی سجتی ہے۔ منصور بھی تو اب لوٹنے ہی والے ہیں ممانی اپنی سوچ میں گم تھیں)

منصور نے پردیس میں یہ دن چاہے جیسے بھی بتائے ہوں نجو تو جہنم میں جا پڑی تھی۔ رشید کوئی اچھا آدمی نہ تھا پھوپی اماں نانی کے آگے ایسی بے بس ہوئیں کہ انہوں نے بے سمجھے بوجھے رشید کی ماں کی جھولی میں اپنی پھول سی بچی ڈال دی۔ اور نصرت نے جب رشید کو دیکھا تو لرز کر رہ گئی۔ آنکھوں میں کیسی رعونت تھی۔ یوں جیسے دنیا میں ہم ہی سب کچھ ہیں اور عورت کو تو وہ واقعی پاؤں کی جوتی سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا۔ اس جہنم میں رہ کر نصرت جیسے سن ہو کر رہ گئی۔ اس جہنم نے اس کے اندر کی آگ کو برف بنا دیا اتنی ٹھنڈی ہو کر رہ گئی کہ کوئی نہ مانے کہ کبھی یہ جو خاموش سی مورت ہے۔ یہ وہی پھوپی اماں والی نجو ہے۔

حد یہ کہ وہ تو اس وقت بھی نہ چونکی جب اسے اماں بی نے یہ خبر دی کہ منصور واپس آگیا ہے اور تمہیں بہت پوچھ رہا ہے۔ "نصرت بیٹی۔" اماں بی آنسوؤں بھری آواز میں بڑبڑائیں۔ "کہتا ہے امی نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مجھ پہ یہ ستم ڈھائیں گی۔ نصرت کیسی ہے پھوپی اماں۔" اماں بی کو منصور کی سسکتی ہوئی آواز کی یاد نے دھاڑیں مار مار کر رلا دیا۔ پر نصرت نے تو جیسے کچھ بھی نہ سنا ہو۔

رشید چاہے جیسا ہو اس کے منے کا باپ تھا اور جب نصرت منے پر واری نثاری جاتی تو نہ جانے کیوں اسے رشید بھی اتنا برا نہ لگتا اور بھئی وہ ہی کون سی بہت اچھی تھی۔ لیکن نصرت یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ رشید کا ساتھ اتنا کچا ہے کہ ایک ہی جھٹکے میں ٹوٹ جائے گا۔ رشید نے اسے یوں بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا کہ پھر زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں وہ تنہا رہ گئی۔ نصرت کی آنکھوں سے آنسو تو اس وقت ٹوٹ کر برسے جب رشید کا لہو لہان جسم اس کے سامنے پڑا تھا۔ برسوں کے رکے ہوئے آنسو برستے رہے اور ان کے ساتھ نجو کا سہاگ بھی بہہ گیا اور اس کی زندگی کی ہر خوشی ڈوب گئی۔ منے کو سینے سے لگا کر اس نے بڑے دکھ سے سوچا کہ یہ بھی میری طرح بے باپ کا ہو گیا۔

ممانی نے منصور کو دھوکہ دیکر خود بہت دکھ اٹھایا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ منصور انہیں یوں ستائے گا۔ ان کے آنسو، آہیں، منتیں سب بیکار گئیں منصور پتھر بن چکا تھا اور ممانی نے اس سے نصرت کو چھین کر گویا اس کی زندگی چھین لی تھی۔ اس کی

خاموشی ایسی اذیت ناک تھی کہ ممانی خون کے آنسو روتیں پر منصور نصرت کا وفادار رہا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

اور نصرت اپنے منے میں گم تھی اس بات سے بھی بے نیاز کہ منصور اس کے لئے اپنے آپ کو کیونکر مٹا رہا ہے۔
گزرتے دنوں کے ساتھ منا بڑا ہو رہا تھا۔ اس نے گھٹنیوں چلنا شروع کیا تو نصرت سارے دن کے لئے مصروف ہو گئی
ہر وقت اس کے آگے پیچھے پھرا کرتی۔
جس دن منا اپنے قدموں چلنے لگا اس دن نصرت کی ننھی زندگی میں خوشی نے قدم رکھا بالکل پہلی بار کیونکہ نصرت کبھی اپنا
بہت خوش نہیں ہوئی تھی
منا بولنے لگا تو نصرت کو بھی جیسے بہت دنوں بعد زبان مل گئی ہر وقت منے سے باتیں کرتی رہتی۔ یہ نوتا ہوا منا اسے دنیا کی
ہر چیز سے پیارا تھا پھر دنیا بھر کی باتیں وہ منے سے کر ڈالتی اور خود منا بھی بہت باتونی ہو گیا تھا۔
ممی رانی کے خرگوش کے اتنے پیارے سفید سفید سے بچے ہیں۔
باغ میں کتنے ڈھیر پھول کھلے ہیں۔
امی آپ ہمیشہ یہ سفید ساڑی کیوں پہنتی ہیں۔
ممی۔ ممی۔۔ ممی۔۔۔ نصرت ہر وقت منے کی باتیں سنا کرتی۔
ایک دن منا بہت چپ چاپ تھا نصرت نے بہلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ چپ ہی رہا نصرت نے پاس جا کر گلے لگایا تو یہ
دیکھ کر تڑپ اٹھی کہ منے کی شفاف آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔
میرے راجہ بیٹے تجھے کس نے رلایا ہے، نصرت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور نصرت یہ سنکر لرز اٹھی کہ منا اپنے پپا
کے لئے رو رہا ہے (اماں میرے ابا کہاں ہیں؟ آپ انہیں بلاتی کیوں نہیں۔ اماں اماں اماں۔ نصرت اماں کے کندھے سے
لگ کر سسک رہی تھی اور اماں کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ تیرے ابا بہت دور چلے گئے ہیں بیٹی اب وہ
اس دنیا میں نہیں اور نصرت کو ایکدم یوں محسوس ہوا جیسے وہ بہت بڑی ہو گئی ہو۔ کیا مرے ابا مر گئے ہیں اماں۔ اپنے
آواز کے پکے پن پر نصرت کو حیرانی سی ہوئی۔ اور دوسرے ہی لمحے اس کے آنسو خشک ہو گئے اب کوئی امید میرے ابا کے
آنے کی نہیں۔ نصرت کے دل نے بہت مایوس ہو کر سوچا) منا اس کے کندھے سے لگا ہوا سو رہا تھا اس کے گالوں پر آنسوؤں
کے واضح نشان موجود تھے۔
نصرت تڑپ اٹھی۔ اس نے سوچا کہ اگر میں منے کو یہ بتا دوں کہ اس کے پپا اس دنیا میں نہیں تو اس کا ننھا سا دل کیا سوچے
گا۔ نصرت کسی قیمت پر منے کو اتنا بڑا دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہی دکھ جس نے اس کی زندگی تباہ کی تھی منے کی زندگی پر بھی
اندھیرا بن کر چھا جائے۔ نصرت کو یہ گوارا نہ تھا۔ نصرت نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اپنا ماتھا تھام لیا۔ اس کے ہاتھوں نے اس
کے ماتھے پر ابھرے ہوئے داغ کو چھوا تو اسے منصور یاد آ گیا جسے اس نے اپنی دنیا سے نکال دیا تھا۔ پپا تجھے منصور بہت
پوچھتے ہیں۔ اسے ممانی کی رندھی ہوئی آواز یاد آ گئی۔ جو ہر طرف سے مایوس ہو کر بہت دن ہوئے پھر انہی کی طرح ہو گئی تھیں
اب کسی طرح میرا بیٹا ہنستے بولنے لگے انھوں نے ایک ماں کے ممتا بھرے دل سے سوچا تھا) اور نصرت نے یوں منہ پھیر لیا تھا جیسے

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

احسان ملک

# بہترین کارکن

آج اس کے چہرے پر غیر معمولی بشاشت، اندازِ طمانیت، سکون اور کامرانی عیاں ہے۔ خلافِ معمول اس نے جو کالی عینک لگائی ہے اس سے وہ کسی ہوائی کمپنی کا وجیہہ پائلٹ نظر آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بہت نفیس بریف کیس ہے اور وہ بہترین لباس زیب تن کئے شہر کی سب سے بڑی سڑک پر چلا جا رہا ہے۔

محسن عظیمی اس عظیم صنعتی شہر کے عظیم غیر ملکی ادارے جانسن اینڈ ٹمولسن بینک لمیٹڈ کا عظیم کارکن ہے۔

اس بینک نے ملک کی بے اندازہ خدمت کی اور تجارت و صنعت میں ایک اہم کردار سرانجام دیا ہے۔ نظم و ضبط، کارکردگی اور اقتصادی امور میں مہارت کے لحاظ سے اسے دنیا بھر کے صفِ اوّل کے بینکوں میں شمار کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ بینک ابتک اربوں روپیہ کا منافع بدیس پہونچا چکا ہے۔

بینک کی مقامی شہرت کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ اس عظیم صنعتی شہر کی حسین ترین ٹائپسٹ لڑکیاں یہیں پر ملازم ہیں۔ لڑکیاں، جن کے سینے افتاں و خیزاں، جن کی پنڈلیاں سڈول، جن کی مسکراہٹیں دلربا اور جن کے دل بے وفا ہیں!

چوراہے پر آکر محسن عظیمی نے بکمال تمکنت سے ایک ٹیکسی ٹھہرائی "ایئر پورٹ پلیز" آج اس کی ہر حرکت، ہر ادا اس کی چال ڈھال اور بول چال بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ ٹیکسی میں اطمینان سے بیٹھتے ہوئے اس نے جیب سے امپورٹڈ سگرٹوں کا ڈبہ نکالا اور ایک قیمتی لائٹر سے سلگا کر دھواں چھوڑتے ہوئے ڈرائیور کو حکم دیا "تیز چلو" ڈرائیور نے ٹیکسی کی رفتار تیز کر دی۔

وہ بڑے رکھ رکھاؤ کا سلیقہ شعار اور کمال کا محنتی انسان ہے۔ بینک کا سارا عملہ اس کی کارکردگی کا معترف، تمام افسر اس سے خوش ہیں اور ہر اچھی بات میں اس کی کارگزاریوں کا حوالہ دیا کرتے ہیں۔ اس کی شرافت کا یہ عالم ہے کہ اس نے آج تک مس ڈلیوما کی جیسی پنڈلیوں کو ایک نگاہ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھا۔ مس ڈلیوما جنرل منیجر کی خوش طبع، حسین و جمیل پرائیوٹ سیکریٹری ہے۔ عظیمی پچھلے تین برسوں سے بینک کے "بہترین کارکن" کا خطاب حاصل کر رہا ہے اور عملے کے تمام افراد جان گئے ہیں کہ جب تک وہ زندہ ہے ان میں سے اور کسی کو یہ اعزاز حاصل نہ ہو سکے گا۔

ائیرپورٹ پہونچکر اس نے ڈرائیور کو دس کا نوٹ دیا اور شاہانہ سطوت کے ساتھ ہاتھ کے اشارے سے اسے چلے جانے کو کہا۔ ڈرائیور یہ انعام پاکر تعظیم سے جھک گیا۔

پھر ٹیکسی کو یوں واپس لے گیا گویا اسے اپنے معزز گاہک کی رضا منظور تھی، ورنہ وہ تو سارا دن وہیں کھڑے رہنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا
اس بے انتہا خلیق اور تابعدار ٹیکسی ڈرائیور کے چلے جانے کے بعد اس نے چشمہ اتار کے جیب میں رکھ لیا اور خراماں خراماں ایئر پورٹ کے جنت بدوش ایئر کنڈیشنڈ بار روم میں جا پہونچا۔

برفیلی سرد وھسکی کے دو گھونٹ بھر کے اس نے شام کا اخبار ایوننگ پوسٹ دیکھا اور پھر ایک عجیب وغریب خیال کے زیر اثر مسکرانے لگا۔ ایسے لگتا تھا کہ ابھی ابھی وہ دل کھول کر قہقہے لگانا شروع کردے گا۔ بار روم کا باادب بیرا بہت دیر تک اس کے قہقہوں کا انتظار کرتا رہا، لیکن محسن عظیمی کی مسکراہٹ جہاں کی تہاں ٹھہری رہی، جیسے کوئی خوبصورت سی موٹر کار کسی کھائی کے دہانے پہ آکے رک جائے۔

بار روم کے مائیکروفون پر طیارے کی روانگی کا اعلان ہوا تو وہ چونک کے اٹھا اور ایئر پورٹ کے لمبے اور وسیع وعریض برآمدے سے گزرتا ایک ہاتھ میں اپنا خوبصورت بریف کیس جھلاتا خراماں خراماں چلتا طیارے میں سوار ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا دہاڑتا ہوا جیٹ کا مٹ زقند بھر کے سفید بادلوں میں غائب ہوگیا۔

نہ معلوم کیا بات تھی محسن عظیمی آج جانسن اینڈ نکولسن بینک کی سالانہ تقریب میں شرکت نہیں کرسکا۔
بینک کے صدر دفتر کی کوہ پیکر فلک بوس عمارت کو رنگ برنگ قمقموں سے سجایا گیا تھا اور ان جلتے بجھتے ننھے ننھے قمقموں سے بڑے دلچسپ اور نظر فریب خاکے بنائے گئے تھے۔ ایک طرف بہت بڑا پہیہ گھوم رہا تھا۔ یہ صنعت کا سمبل تھا اس پہیے پر روپوں کی تھیلی بنی تھی جس میں سے اس پہیے کے ہب میں روپے گرتے ہوئے دکھائے گئے تھے گویا صنعت کا پہیہ دولت کے دم قدم سے ہی چل رہا ہے اور یہ دولت بینک مہیا کرتا ہے۔ دوسری جانب ایک جہاز بنا تھا جس میں کرین سامان لاد رہے تھے۔ یہ تصویر گویا تجارت اور درآمد وبرآمد کا منظر تھی۔ اوپر ایک چیک کی تصویر قمقموں سے بنی تھی، دوسری طرف ایک ہاتھ نے اربوں روپیہ کا ڈرافٹ تھام رکھا تھا یہ بینک کی مستحکم مالی حالت کو ظاہر کرتے تھے ننھے ننھے رنگ برنگے جلتے بجھتے بجلی کے قمقموں سے ترتیب دیئے ہوئے یہ خاکے کچھ اس قدر حیرتناک اور عجیب وغریب تھے کہ دیکھنے والے کو خدا کی خدائی سے منکر کرکے معجزہ ہائے دولت کا معترف کردیں۔

جانسن اینڈ نکولسن بینک کی فلک بوس اور عظیم الشان عمارت کے اندر کا احوال باہر کی رونق سے بھی سوا تھا۔ بینک کے بڑے ہال میں ہزاروں کا عظیم اجتماع تھا، بیرے مکلف لباسوں میں ادھر ادھر بھاگے دوڑے پھر رہے تھے اور پھول والی ٹرے پر کیک، پیسٹری، گرما گرم پکوڑے، آئس کریم، چائے، سوڈا لیمون، تقسیم کر رہے تھے۔

اس تقریب کو رنگا رنگ پروگراموں نے چار چاند لگادیئے تھے۔ صبح سے طرح طرح کے مقابلے منعقد کئے جا رہے تھے ادھر ادھر انعامی فہرستیں بن رہی تھیں۔ کہیں تجارتی خط لکھنے کا مقابلہ تھا، کہیں ٹائپ کرنے کا، کہیں شارٹ ہینڈ کا، کہیں فینسی ڈریس کا۔
آج بینک کی ملازمت کے سب سے بڑے اعزاز "بہترین کارکن" کا اعلان بھی پروگرام میں شامل ہے۔ لیکن حاضرین تھوڑی دیر کے لئے اس سب سے اہم آئٹم کو بھول کر فینسی ڈریس کے مقابلے کی دلچسپیوں اور رنگینیوں میں کھو گئے ہیں۔ حاضرین مس ڈیوٹا کے حسن کرشمہ ساز پر انگشت بدنداں ہیں جو ایک دیہاتی لڑکی کا بھیس بدلے ایک ٹوکری میں سرخ سرخ سیب لئے کھڑی اسٹیج پر مسکرا رہی ہے۔ حاضرین حیران ہیں، پریشان ہیں، ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ٹوکری میں رکھے ہوئے سرخ وسفید سیبوں کی تروتازگی پر غور کریں یا مس ڈیوٹا کے عارض گلگوں کا مشاہدہ کریں۔ سیبوں کی رنگت نے مس ڈیوٹا کے گلاب سے رخساروں کے ساتھ شرط [illegible] دیا تھا۔ وہ اس

لباس میں بے انتہا مسرور تھی۔ اس قدر مسرور کہ اگر وہ سچ مچ کی دیہاتی لڑکی بھی ہوتی تو اس قدر شادمان کبھی نہ ہو سکتی۔

مس ڈیو جب اسٹیج سے چلی گئی اور تالیوں کا ڈونگرا ختم ہوا تو بینک کا ایک سمارٹ سپروائزر ایک بڈھے ڈاکیے کا بھیس بدل کر نمودار ہوا اور انتہائی ماہرانہ اداکاری سے حاضرین میں خط تقسیم کرنے لگا۔ سب لوگ اس کی اداکاری سے بہت ہی محظوظ ہوئے اور ایسے میں انھیں یہ بالکل یاد نہ رہا کہ وہ آج کے سب سے بڑے آئٹم "بونس" اور اس کے بعد "بہترین کارکن" کے اعزاز کا اعلان ابھی باقی ہے۔

اور جب بینک کے انتہائی فرض شناس لائق و فائق غیر ملکی جنرل منیجر نے گزشتہ سال کے بونس کا اعلان کیا تو قمقموں سے جگمگاتے ہال میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا، ٹوپیاں اچھالی گئیں، بعض افراد نے ترنگ میں آکر ناچنا شروع کر دیا اور شور و غوغا سے بینک کی فلک بوس عمارت کو سر پہ اٹھا لیا، جب یہ طوفان تھما تو غیر ملکی جنرل منیجر نے اطمینان سے اپنی ٹائی درست کی اور مسکرا کے حاضرین سے پوچھا۔

"خواتین و حضرات کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اب کی برس بہترین کارکن کون رہا؟" جواب میں مجمع سے ایک غل برپا ہوا "محسن عظیمی۔ محسن عظیمی۔ محسن عظیمی۔"

"ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے" غیر ملکی جنرل منیجر نے ہنس کر کہا "آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بینک کے ارباب اختیار نے محسن عظیمی کی خدمات سے متاثر ہو کر ان کو ترقی دینے کا فیصلہ کیا ہے" یہ خبر سن کر سارا ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ تالیوں کا شور جب تھم گیا تو جنرل منیجر نے اعلان کیا "محسن عظیمی کی بے مثال خدمات سے متاثر ہو کر انھیں کلرک سے سپروائزر بنا دیا گیا ہے" جنرل منیجر کی آواز اب کی بار پھر تالیوں کے بے پناہ شور میں دب گئی اور عملے کے افراد نے اس قدر غل مچایا کہ توبہ ہی بھلی۔ جنرل منیجر کھنکارے اور بولے "مجھے افسوس ہے کہ محسن عظیمی ناسازیٔ طبع کے باعث اس پرمسرت تقریب میں شامل نہ ہو سکے لیکن انھوں نے ایک خط روانہ کیا ہے جو میں ابھی آپ سب کو پڑھ کر سناتا ہوں۔" مجمع میں سے کسی کی آواز آئی "ہیئر ہیئر" جنرل منیجر نے لفافہ چاک کر کے خط نکالا اور کھنکار کر اسے پڑھنا شروع کیا۔ لیکن ایسے میں وہ اچانک ایک جگہ رک گئے۔ ان کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی، ماتھے پر پسینہ آ گیا، انگلیاں تھرتھرانے لگیں، سارا بدن رعشے سے کپکپانے لگا۔ محسن عظیمی کا خط مختصر تھا: "جناب والا میں نے بینک سے ساڑھے پانچ لاکھ روپے کا فراڈ کیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے مجھے برسوں بہترین کارکن کا رول ادا کرنا پڑا۔ میں آپ سب کے اخلاص کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ فقط آپ کا محسن عظیمی۔"

عفرا بخاری

# مسکراہٹوں کی چاندنی

اپنی سوکھی کالی ٹانگوں پر کھڑا وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ یہ تھرتھراہٹ مسرت انگیز جذبات کی وجہ سے بھی تھی۔ اور اس وجہ سے بھی تھی کہ اس نے پچھلے بیس گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس کے پیچھے دفتر اطلاعات و نشریات کے دروازے میں تین فوجی سپاہی خاکی وردیوں میں ملبوس بے ترتیبی سے کھڑے محاذ کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ اس کے بائیں ہاتھ پہ باہر جانے اور اندر آنے کا بڑا گیٹ تھا۔

پسلیوں کے ساتھ خالی غبارے کی طرح چپکے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر اس نے سوچا وہ باہر کیوں نہیں چلا جاتا۔ بھوک سے اس کی آنتیں مروڑ رہی تھیں اور اس کا جسم نقاہت کی وجہ سے لڑکھڑا رہا تھا۔ صبح سے سرکاری نل کا پانی پی پی کر اس کے خالی معدے میں اینٹھن سی ہونے لگی تھی۔ اس کا ارادہ کسی نچلے درجے کے ہوٹل میں بیٹھ کر پیٹ بھر کر کھانا کھانے کا تھا۔ لیکن پھر کسی نامعلوم جذبے کے تحت وہ وہاں کھڑا رہ گیا تھا۔

وہاں کھڑے ہونے کے بعد یہی خیال بار بار اس کے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ وہ واپس پلٹ جائے۔ آہستہ آہستہ سر کو کھجلاتے ہوئے اس نے بڑی بے دلی سے سر کو ذرا سا گھما کر پیچھے دیکھا تینوں بے ترتیبی سے کھڑے فوجی اپنی باتوں میں منہمک تھے۔ وہ فوراً سیدھا ہو گیا اور سامنے دیکھنے لگا۔ سامنے سے تین چار فوجی جیسے جیسے قدم بڑھاتے اس کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے انہیں یوں تیزی سے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اسے پہلی بار احساس ہوا کہ آج وہاں اس طرح نمایاں اور مشتبہ طور پر بے سبب کھڑے ہونا ٹھیک نہ تھا اس نے بڑے چپکے پن سے ایک سمت دیواروں کی طرف دیکھا۔ پھر ایک بے ڈھنگی چال سے واپس پارک کی جانب بڑھنے لگا سامنے ایک بڑی سی لوہے کی بنچ دیکھ کر وہ اس پر مطمئن سا ہو کر بیٹھ گیا۔

آسمان نکھرا ہوا تھا۔ دھوپ بڑی چمکیلی اور گرم تھی۔ اس کے پاؤں کے نیچے سوکھی گھاس بھی گرم تھی اور اس کے پھٹے پرانے کوٹ کی جیبوں میں ٹھنسے اس کے دونوں ہاتھ بھی گرم تھے۔ اور اس کا دل بھی حرارت سے بھرپور تھا۔

یہ سنہری موقع بہت دنوں بعد اس کے ہاتھ لگا تھا۔ اور بہت دنوں بعد اس نے زندگی کی حرارت کو اپنے اندر اور اپنے باہر محسوس کیا تھا۔ اور شاید بھرپور مسرت کے ان والہانہ لمحات نے ہی اس کی اذیت پسند طبیعت کو وہاں رکنے پر آمادہ کیا تھا۔ اس کے سامنے پیچھے دائیں اور بائیں دور دور بڑی بڑی بنچوں پر بہت سے لوگ نمائش کے میلے جھمیلے سے تھک کر ستانے کو بیٹھ گئے

تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ مرد اور بچے بھی تھے۔

اس کے سوکھے چمرخ جسم اور خستہ حالی نے بہت جلد بہت سی نظروں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اتنی بہت سی نظریں اس کی طرف اٹھیں تو اس کے دل میں ہلکا سا اضطراب پیدا ہوگیا۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر باہر جانے کا گیٹ کھلا تھا۔ آخر وہ باہر کیوں نہیں چلا جاتا۔ ایک بار پھر اس نے خود سے پوچھا۔

ایسی احمقانہ حرکت پہلے تو کبھی اس سے سرزد نہ ہوئی تھی۔ جائے وقوع سے فوراً دور ہٹ جانا چاہیے یہ اس کے فن کا ایک اہم اصول تھا۔ پھر موقع بھی ایسا آسان اور بے خطر تھا۔ وہ بڑی آسانی سے گیٹ سے نکل کر اپنے آپ کو باہر کی کسی گمنام گلی یا کسی بارونق بازار میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گم کر سکتا تھا۔ پھر وہ اس لوہے کی بنچ پر خالی بیٹ بیٹھا کیا سوچ رہا تھا کہ جو کچھ ہوگیا تھا وہ کافی نہ تھا۔ "نہیں" کسی نے جیسے اس کے اندر بڑے زور سے انکار میں سر ہلایا۔

"یار یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ سب کچھ ہوگیا۔ پھر بھی جیسے کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ محسوس ہی نہیں ہوا۔ نہ خوف نہ ڈر نہ خوشی جیسے بغیر نمک کا سالن پکا کر کوئی سامنے رکھ دے۔ اس نے ایک بار پھر اپنے ارد گرد بظاہر بے پروائی سے مگر درحقیقت بڑی چوکسی سے دیکھا۔ ابھی تک بہت سی نظریں اس کے گرد منڈلا رہی تھیں۔ خالی اور بے مطلب نظریں۔ یہاں پھنس جانے کا امکان تو سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ اور وہ بھوکا ہونے کا باوجود ٹانگیں پھیل کر بیٹھ گیا۔ جیسے فی الحال اس کا ارادہ وہاں کافی دیر بیٹھنے کا ہو۔

اب اس کی نظریں سامنے فخر سے ٹرنک پر چلی گئی تھیں جو کسی بڑے سیاہ ہاتھی کی مانند کچی زمین میں اپنے ہی زور میں دھنسا ساکت کھڑا تھا۔ اور بے شمار لوگ چیونٹیوں کی طرح اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ اس کے اوپر اتنے لوگ چڑھے کھڑے تھے کہ اب مزید لوگوں کے چڑھ جانے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ پھر بھی بہت سے لوگ اس پر چڑھنے کا فخر حاصل کرنے کے لئے سر توڑ کوشش میں مصروف تھے۔ اور اس کے گرد جمگھٹا بنا کر کھڑے تھے۔ اور ٹرنک کے سیاہ موٹے لوہے کو چھو کر ہی فاتحانہ جذبے سے مسکرا رہے تھے۔ جو لوگ اس کو چھونے کے قابل نہ تھے وہ دور سے ہی اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ بھیڑ بہت تھی۔ مگر باوجود اتنے لوگوں کے اس نے بڑی آسانی سے انہیں دوبارہ دیکھ لیا۔

وہ ایک عورت۔ ایک بچہ اور ایک مرد تھا۔ عورت نے بڑی بے نیازی سے بازو میں ہلکے آسمانی رنگ کی نائیلون کی تھیلیوں والی نازک اور خوبصورت ٹوکری لٹکا رکھی تھی۔ تینوں ٹرنک کے قریب پہنچنے کی کوشش میں تھے تبھی عورت کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔ وہ بچے کا ہاتھ تھامے تیزی سے آگے بڑھی اور اپنے ہاتھ سے بچے کا ہاتھ پکڑ کر اس نے ٹرنک کے موٹے ٹھنڈے لوہے سے چھوا دیا۔ بچہ بغیر کچھ سمجھے مسکرایا۔ عورت خوش ہوکر مسکرائی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مرد عورت کو مسکراتا دیکھ کر خود بھی مسکرا دیا۔

وہ دور بیٹھا ان دونوں کو مسکراتا دیکھ کر نہ صرف مسکرایا بلکہ اس نے اپنے گردوپیش سے بے خبر ہوکر ایک چھوٹا سا قہقہہ بھی لگا دیا۔ مگر پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ واہ ری بھولی اور بے خبر دنیا تو اپنی مسکراہٹوں کی حقیقت سے بھی آگاہ نہیں ہے۔ ایک بار پھر اس کا جی چاہا کہ وہ ہنس پڑے۔ یہ تجربہ اس کے لئے انوکھا اور دلچسپ تھا۔ مگر وہ دوبارہ نہیں ہنسا بلکہ سنبھلا رہا۔ عورت بھیڑ سے باہر نکل آئی تھی۔ بچہ شرارت سے آگے آگے بھاگا۔ عورت مسکراتی ہنستی اس کے پیچھے تیز قدموں سے چلی۔ اور ان دونوں کے پیچھے کالے سوٹ میں ملبوس مرد شان استغنا سے آگے بڑھا۔ وہ اس کی طرف آرہے تھے۔ وہ ذرا سا کسمسایا۔ اپنے شانوں کو جھٹکا ایک بار پلٹ کر باہر نکلنے کے راستے کا جائزہ لیا۔

لیکن اس کا اندازہ غلط تھا۔ وہ سیدھے چلتے چلتے اچانک دائیں جانب گھوم گئے اب وہ نرنجن پرشاد کی جیپ کے پاس کھڑے تھے۔ بچے نے شاید سواری کے لئے ضد کی تھی۔ مرد ٹکٹ دینے والے سے بات کر رہا تھا۔ عورت نے ذرا پیچھے کھڑے مسکراتے ہوئے بازو سے ٹوکری نکالی اب وہ ان کی طرف ہمہ تن متوجہ تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جیبوں میں ٹھنسے اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں اور سوکھی گھاس پر اس کے پاؤں سختی سے جم گئے تھے۔ ٹوکری اب عورت کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس کو بے فکری سے ہلا رہی تھی اچانک مرد نے عورت سے کچھ کہا۔ عورت مسکرائی اور ٹوکری دوبارہ بازو میں ڈال دی ـــ اس نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ جیسے تختہ دار تک پہونچتے ہوئے مجرم کو اچانک عمر قید کی سزا کا حکم سنا دیا جائے۔ اسی طرح کا اطمینان اس نے بھی محسوس کیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ اور زمین پر جمے پاؤں بھی حرکت میں آ گئے۔ اور اب وہ آہستہ آہستہ ایک پاؤں ہلا رہا تھا۔

مرد نے چند سکے اپنی جیب سے نکال کر ٹکٹ دینے والے کو دیئے۔ وہ تینوں جیپ میں سوار ہو گئے۔ اور جیپ فوراً روانہ ہو گئی جیپ جب اس کے پاس سے گزری اس نے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ عورت کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے خالی پیٹ پر چلا گیا۔ لیکن اب کے اسے اپنے پیٹ کے بیٹل گھنٹوں سے خالی ہونے کا احساس نہیں ہوا بلکہ یوں لگا جیسے عورت کے ہونٹوں کی مستقل مسکراہٹ اور اس کے بے فکر قہقہوں سے اس کا پیٹ حلق تک بھر گیا ہو۔ وہ کچھ دیر تک کسی گہری سوچ میں ڈوبا پھٹے پرانے کوٹ کے اوپر سے خالی پیٹ کو سہلاتا رہا۔ آخر اس عورت نے مسکراہٹوں کے یہ بھرے خزانے کہاں سے حاصل کئے تھے "تم بھی احمق ہو یار جیب گرم ہو۔ تن پہ کپڑا ہو۔ پیٹ بھرا ہو تو قہقہے لگانا کون سا مشکل کام ہے۔ جی چاہے تو دونوں ہاتھوں سے یہ خزانہ لٹاؤ۔ تمہاری طرح ان کا پیٹ بھی بیٹل بیٹل گھنٹے خالی رہے تو کم از کم اگلے دس سال تک تو مسکراہٹوں کا کوئی نشان ان کے ہونٹوں پر نہ مل سکے گا۔ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ اپنے مسکراہٹوں سے بھرے خالی پیٹ کے خیال نے اس کے دبے غصہ کو ابھار دیا اس کا جی چاہا۔ ابھی۔ اسی وقت جیپ کے پیچھے جائے اور انہیں حقیقت حال سے آگاہ کر کے مسکراہٹوں کو ان سے چھین لے اور خود بھاگ کر گیٹ سے باہر نکل جائے۔

لیکن کون جانے یہ حقیقت ان کے لئے کوئی حقیقت رکھتی بھی یا نہیں۔ کیا معلوم یہ سب کچھ جان کر بھی عورت کے ہونٹ مسکراہٹوں سے تر و تازہ رہیں۔ اس خیال نے جیسے اسے پاگل کر دیا۔ وہ ہاتھ جھٹک کر اٹھ کر کھڑا ہوا۔ امیر لوگ جہاں اپنے سے بہت سی باتوں میں مختلف ہوتے ہیں وہاں اپنی اور ان کی حقیقتوں میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہ اب بھی باہر نہیں گیا بلکہ اندر کی طرف گھستا چلا گیا۔ یوں جیسے سچ مچ ہی ذست ہو گیا ہو۔ اور اسے کسی نئے شکار کی تلاش ہو۔ لیکن اس کی ضد سے بھرپور نظریں صرف ان کی تلاش میں تھیں تھوڑی سی تلاش کے بعد زندہ ایمونیشن کے کٹہرے میں جہاں سرخ تحریر میں احتیاط کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ ایک بار پھر اس کے سامنے آ گئے۔ وہ جیپ سے اتر گئے تھے۔ بغیر کسی ارادہ یا سوچ کے وہ خاصا فاصلہ لے کر ان کے پیچھے چلنے لگا۔ اب وہ گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے کیا وہ یوں ہی گھر چلے جائیں گے اس نے اضطراب سا محسوس کیا۔

"لیکن تم کیوں بے چین ہو" اس نے گویا ٹوہ لینے کو اپنے آپ سے پوچھا۔ "لمبے لمبے قدم مارتے ان سے پہلے باہر نکل جاؤ اور کسی ہوٹل میں چین سے بیٹھ کر ادل نمبر کھانا کھاؤ۔ اس نے اپنے آپ کو مشورہ دیا۔ لیکن آج تو جیسے وہ اپنی واردات کی تفصیلات میں جانے کا تہیہ کر بیٹھا تھا۔ وہ ان کے پیچھے چلتا گیا۔

اب وہ تینوں گیٹ سے باہر نکل گئے تھے۔ تینوں مسکرا رہے تھے۔ ذہنی، روحانی اور جسمانی طور پر ہلکے پھلکے اور خوش تھے

بچے نے پیار بھری خوشامد سے باپ کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اور اپنی فرمائشوں کو بار بار دہرا رہا تھا وہ کیا کیا خریدے گا۔ لیکن باپ بکی ہوئی پہ زندہ دلی سے سر ہلا رہا تھا۔ وہ گیٹ سے نکل کر تانگوں اور ٹیکسیوں کی اوٹ میں جا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے جیب سے ایک مڑی تڑی بیڑی نکالی جو کسی قدر نم آلود تھی۔ اور اسے بمشکل تمام سلگا لیا۔

مرد اور بچے سے ایک قدم پیچھے عورت گیٹ سے نکلی اور آگے بڑھنے سے پیشتر اس نے اپنا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ اس نے پہلے ایک سرسری نظر ٹوکری پر ڈالی پھر فوراً ٹھٹھکی۔ رکی اور ٹوکری کو بازو سے اتار کر ایک ہاتھ ٹوکری کے اندر ڈال دیا وہ اندر پڑی چیزوں کو الٹ رہی تھی۔ چند سنگترے تھے جو شاید بچے کے لئے رکھے گئے تھے۔ ایک رومال تھا۔ ایک درمیانی سائز کی ڈائری تھی۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے سے بھی پہلے عورت نے ان چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ لیا اس نے بیتابی سے مرد کو اشارہ کیا۔ مرد اور بچہ اس کی طرف پلٹے اور اب وہ دونوں آمنے سامنے ٹوکری کا جائزہ لے رہے تھے۔ مرد کا چہرہ بھی فق تھا۔ مسرت، اطمینان۔ اور بے فکری کا جو مصنوعی غازہ انہوں نے اپنے چہروں پر لتھیڑ رکھا تھا۔ وہ پانی کے ایک چھینٹے سے ہی اتر گیا تھا۔ اور اب ان کے اصلی کھلائے ہوئے چہرے صاف نظر آ رہے تھے۔

تانگے کی اوٹ میں بیڑی کا لمبا کش لے کر وہ اطمینان سے مسکرایا۔ تو وہ ناکام نہیں رہا تھا۔ کسی اذیت پسند کی طرح محسوس کرتے ہوئے اس نے سوچا۔

آٹھ آنے کا ٹکٹ خریدنے والے نمائش گاہ میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنے کے خواہاں تھے۔ اس لئے باہر کوئی نہیں آ رہا تھا اندر بھی اکا دکا لوگ ہی جا رہے تھے۔ یوں وہ جس جگہ کھڑے تھے اکیلے ہی تھے۔ اب ان کی آواز بتدریج اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دونوں شاید اس نقصان کا ذمہ دار ایک دوسرے کو ٹھہرانے کی کوشش کر رہے تھے ان کے چہروں کی پہلی ترمی ملائمت اور خوشگواری غائب ہو چکی تھی۔ اب ان کے چہروں پر ایسا کھنچاؤ۔ چڑچڑا پن اور بیزاری تھی۔ جو شدید ذہنی اور روحانی اذیت اٹھانے کے بعد ہی پیدا ہو سکتی تھی۔ اب وہ دو جانی دشمنوں کی طرح آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اور ان کے متعلق یہ تصور کرنا بھی محال تھا کہ صرف چند لمحے پیشتر وہ ایک دوسرے کے لئے محبت اور التفات کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ اگر بدنصیبی مجسم ہو کر ان کے سامنے آ جاتی تو دونوں ایک ساتھ اس پر پل پڑتے لیکن چونکہ ایسا نہیں تھا۔ اس لئے وہ اپنی بدقسمتی کا غصہ ایک دوسرے پر ہی نکال سکتے تھے ان کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ عورت نے ایک بار جھک کر پھر ٹوکری کا جائزہ لیا پھر اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے راستے پر گھوم کر ایک مایوس سی نگاہ ڈالی پھر وہ دونوں تانگوں اور ٹیکسیوں کی جانب بجھے بجھے قدموں سے بڑھنے لگے۔ جیسے وہ آگے نہ بڑھنا چاہتے ہوں۔ جیسے وہ اپنی بدنصیبی پر وہیں اسی جگہ پاتال میں دھنس جانا چاہتے ہوں لیکن کوئی غیر مرئی طاقت انہیں آگے کھینچ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ گھر کی طرف۔ جہاں پہونچ کر وہ اپنے اپنے دل کی بھڑاس زیادہ آسانی اور مطمئن طریقے سے نکال سکتے تھے۔ بیڑی کے دھیمے دھیمے کش لیتے ہوئے وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

چھوٹا بچہ جو اس دوران ایک طرف کھڑا سہما ہوا حالات کی اس اچانک تبدیلی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ آگے بڑھا اس نے لپک کر باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ مسکرایا جیسے وہ اپنی محبت بھری مسکراہٹ سے حالات میں پہلے جیسی ہمواری پیدا کرنی چاہ رہا ہو۔ اور سامنے سے ایک خوانچے والے کو آتا دیکھ کر اس نے اپنی فرمائش دہرائی۔ باپ نے اچانک جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اور چٹاخ سے ایک بھرپور طمانچہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ بچے کی آنکھوں میں فوراً آنسو اتر آئے۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا۔ اپنا چھوٹا سا ہاتھ اپنے سزا یافتہ

گال پر رکھ کر ماں اور باپ دونوں سے پیچھے رہ گیا

اس نے بیڑی کا باقی ماندہ ٹکڑا ہونٹوں سے کھینچ کر نکالا۔ اور یوں ہی جلتا ہوا دور پھینک دیا۔ اس کا منہ کڑواہٹ سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے دوبارہ کھنکار کر تھوکا۔ پھر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اب وہ اس سے بہت کم فاصلے پر تھے۔ اور اس نے پہلی بار انہیں جانچنے والی نظروں سے دیکھا۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ مرد کا سوٹ جو دور سے شاندار دکھائی دے رہا تھا خاصا پرانا اور استعمال شدہ تھا۔ عورت کے سوئٹر کی آستینیں آگے سے گھسی ہوئی تھیں بچے کے جوتے خاصے بوسیدہ تھے اور مرد نے اپنے بوٹوں کی ٹھوکروں کو چھپانے کے لئے ڈھیر ساری پالش تھوپ کر انہیں محنت سے چمکایا تھا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ حیران تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ کتنے شاندار دکھائی دے رہے تھے لیکن اب ان کی شخصیت کی وہ چمک دمک کہاں غائب ہو گئی تھی۔ لمحوں کا یہ ہیر پھیر کیسا تھا۔ چند لمحے پیشتر ان کی شخصیت سر سے پیر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس بوسیدگی کو وہ کیوں نہیں دیکھ سکا تھا۔ اب وہ کیسے شکستہ سے دکھائی دے رہے تھے۔ نہ جانے کتنے دنوں بعد وہ اس سستی سی تفریح کے لئے گھر سے نکلے اور اتنے عرصے بعد اپنے دکھوں اور غموں کو بھول کر انھوں نے یہ قہقہے لگائے تھے۔ کچھ لمحے پیشتر جب ان کے چہروں پر مسکراہٹوں کی چاندنی چھلکی ہوئی تھی تو ان کے چہرے کیسے شاداب۔ تر و تازہ اور خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن اب مسکراہٹ نہیں رہی تھی تو وہ مسلسل اٹھائی ہوئی محرومیوں دکھوں اور اذیتوں کی چھاپ کو بآسانی اور بخوبی ان کے چہروں پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ شاداب چہرے اس کے لئے اجنبی تھے لیکن یہ سُتے ہوئے کملائے ہوئے بیزار چہرے اس کے لئے نئے اور اجنبی نہ تھے۔ وہ انھیں پہچانتا اور جانتا تھا تانگوں کی طرف بڑھتے ہوئے مرد نے کچھ سوچا، پھر وہ فٹ پاتھ پر پیدل چلنے لگا۔ وہ اس وقت عورت اور بچے سے بالکل بیگانہ ہو چکا تھا۔ عورت بہت بے دلی سے چل رہی تھی اور مرد سے کافی پیچھے تھے۔ بچہ سب سے آخر میں تھا وہ اب بھی رو رہا تھا۔ اور اپنے خاموشی سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی ننھی منی کومل ہتھیلیوں میں جذب کئے جا رہا تھا۔۔

کیا مفلسی اتنی ظالم بھی ہو سکتی ہے وہ بے چین نظروں سے باری باری تینوں آگے پیچھے چلنے والوں کو دیکھنے لگا۔ اچانک عورت نے پیچھے مڑ کر دیکھا بچے کو اپنے سے بہت دور دیکھ کر وہ رک گئی۔ اس نے اپنا چہرہ نقاب سے ڈھک لیا یوں جیسے اس کی آنکھیں بھی امڈ آئی تھیں اور اس نے سر بازار اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔ بچہ قریب آیا تو عورت نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے نزدیک کھینچ لیا بچہ اس کی محبت کی گرمی پا کر اونچی آواز سے سسکنے لگا تھا۔ عورت نے ٹوکری سے رومال نکال کر اس کے بہتے آنسوؤں کو پونچھا پھر نرمی سے اسکا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ چلنے لگی مرد بہت آگے نکل چکا تھا۔

اور وہ بغیر کسی ارادے کے مسکرایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کے پیچھے ہو لیا تا کہ انکی مسکراہٹیں انھیں لوٹا دے!

## اعتذار

افکار کی گذشتہ خاص اشاعت غالب نمبر میں پروفیسر احمد علی کا مضمون — 'غالب ایک مابعد الطبیعاتی شاعر' دراصل انگریزی میں تھا جس کا ترجمہ محمد علی صدیقی نے کیا تھا غلطی سے مترجم کا نام شائع نہ ہو سکا جس کے لئے ادارہ محمد علی صدیقی سے معذرت خواہ ہے

— ادارۂ افکار —

محمد صدیق سالک

# اس کے پڑھنے سے ——
# بہتوں کا بھلا ہوگا

میں روزانہ اخبار پڑھنے کا عادی ہوں بشرطیکہ روزانہ مفت ملتا رہے۔ اس عادت سے میرے ذہنی دریچے کھلے ہوں یا بند ہوں ایک الگ بات ہے لیکن یہ تسلیم ہے کہ میں روزانہ اخبار پڑھنے سے ایک کامیاب انسان کہلانے لگا ہوں۔ میری تعلیم، ملازمت اور شادی جیسے اہم معاملات میں جتنی راہنمائی مجھے اخبار سے ملی شاید ہی کسی سرپرست سے نصیب ہوئی ہو۔ سب سے پہلے مجھے اس کی افادیت کا احساس اس وقت ہوا جب میں میٹرک کا طالبعلم تھا۔ امتحان سر پر تھا اور رہبر تالوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ مجھے پر امن حالات سے وحشت اور امتحان سے دحشت آتے لگی درسی کتابیں دیکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بے دلی سے ایک باسی اخبار کھا ٹھا کر قلموں کے اشتہار دیکھنے لگا۔ فلمی چہروں سے تیرتی ہوئی نظر ان الفاظ پر آ رکی "میٹرک کے طلبہ کے لئے خوشخبری" —— میں ایک ہی سانس میں سارے کا سارا خبر نما اشتہار یا اشتہار نما خبر پڑھ گیا۔ خوشخبری یہ تھی کہ "میٹرک کے امیدوار (بالخصوص مستقل امیدوار) نگینہ کیس پیپر منگوا کر استعمال کریں۔ اس سے نہ صرف کامیابی یقینی ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ کالج میں داخلہ کے لئے نمبر بھی مل جائیں۔ میں نے یہ نسخہ استعمال کرنے کا فوراً فیصلہ کر لیا اور اسے تیر بہدف پایا صرف ایک ماہ کے استعمال سے امید بر آئی۔

میٹرک کی سند حاصل کرنے کے بعد تلاش معاش کا مرحلہ آیا تو پھر اخبار کی طرف رجوع کیا اور "ضرورت ہے" کا کالم بلا ناغہ پڑھنے لگا اس کالم میں اپنے ہونے والے آقا کا نام تلاش کرتا تو پوسٹ بکس نمبر ؟ سے ملاقات ہوتی اور فوراً "مائی ڈیئر پوسٹ بکس نمبر" کو مخاطب کرکے اپنی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ بھیجتا اور ملازمت ملنے کی صورت میں اپنی ایمانداری اور اپنے خاندان کی نمک حلالی کا وعدہ بھی کر دیتا۔ کافی عرصہ تک میں درخواستوں پر درخواستیں پوسٹ بکس میں یوں ڈالتا رہا جیسے چڑیوں کو دانا ڈالا جاتا ہے لیکن وائے قسمت کہ پنجرہ بدستور خالی رہا —— میں نے پینترا بدلا اور آئندہ درخواستوں میں اپنے ہونیوالے آقا اور اسکی ہر دلعزیز فرم کی تعریف میں قصیدہ لکھنا شروع کیا۔ یہ حربہ مقابلتاً کارگر ہوا۔ کم از کم ہر درخواست کا جواب آنے لگا اور وہ بھی معذرت کے ساتھ۔ بھلا ایک بے روزگار کے لئے اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی کہ ایک فرم اپنی کسی حرکت کے لئے اس سے معذرت کرے میں بھی ان جوابوں سے ایک طرح کی تسکین پانے لگا اور شکر اور نمک کے کارخانوں سے لے کر کوئلے اور صابن کی فرموں تک سب کو درخواستیں بھیجتا رہا لیکن ہر ار میری امیدوں کا وہی حشر ہوتا رہا جو سوہنی کے گھڑے کا ہوا تھا۔ لیکن عشق میں پختگی اور استقلال ہو تو منزل مل ہی جاتی ہے۔ پختگی تو فاقہ مستی نے پیدا کر دی تھی، پیہم ناکامیوں نے استقلال بھی پیدا کر دیا اور میں مستقل دانہ پہ دانہ پھینکتا اور درخواست

پر درخواست دیتا رہا۔ اور بالآخر ایک دن خاکی کپڑوں والا ڈاکیہ فرشتۂ رحمت بن کر آ گیا اور ملازمت کا پروانہ تھما کر چلا گیا اور اس طرح غنچۂ امید بکشاد۔ ملازمت ملنے سے میں یہی سمجھنے لگا کہ مجھے لعل مل گیا ہے۔ بس گھوڑا اور تانگہ ملنے کی دیر ہے۔ زندگی کی گاڑی چل پڑے گی۔ لیکن گھوڑا تو کجا اس کی دم بھی ہاتھ آتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے مایوسی کو کفر جانا اخبار کو مرجع گردانا اور "کرایہ کے لئے خالی ہے" کا کالم پڑھنا شروع کیا۔ اس کالم میں بڑی بڑی کوٹھیوں، چھوٹے چھوٹے فلیٹوں، وسیع و عریض بنگلوں اور تنگ و تاریک مکانوں کے اشتہار ہوتے۔ ہر اشتہار اتنا جاذب نظر ہوتا کہ میں سمجھنے لگتا کہ اب دل کا ارمان نکلنے ہی والا ہے۔ لیکن کرایہ پڑھ کر پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی۔ لیکن فقر دردمند جو تھا ہمت کیسے ہار جاتا۔ پھر ہر اشتہار ایسے غور سے دیکھنے لگا جیسے لڑکے والے لڑکی کو دیکھتے ہیں۔ میں ہر بنگلہ، کوٹھی، مکان اور فلیٹ کو دیکھنے کے بعد ناپسندیدگی کا برملا اظہار کر دیتا۔ ایسا کرنے سے پتہ نہیں کیوں میری انا کو تسکین ملتی اور میرے دل کے لڈو پھوٹنے لگتے کہ سرمایہ داروں نے لاکھوں روپیہ خرچ کرکے جو عالیشان عمارتیں کھڑی کی ہیں انھیں ایک مزدور کا دل قبول نہیں کرتا۔ لیکن پھر معاً خیال آیا ممکن ہے ان مکانوں کے کرایہ سے کسی کی روزی وابستہ ہو اس لئے اتنی تنگ دلی بھی اچھی نہیں۔ کسی مکان کو کرایہ پر لینے سے صاحب مکان کو نہیں تو کم از کم ایجنٹ کا تو بھلا ہوگا۔ چنانچہ میں کسی نہ کسی کا بھلا کرنے پر تل گیا۔ ایک مکان کا اشتہار ایسی تندہی سے پڑھا کہ اس کا نقشہ فوراً ذہن نشین ہو گیا۔ اشتہار کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے:

"شہر کے ہنگاموں سے الگ، تین کمروں کا ایک مکان، کھلی ہوا، وافر پانی، کرایہ معقول"

شہر میں مکان مجھے ویسے بھی پسند نہیں تھا۔ خواہ مخواہ مہمان رات گزارنے کے لئے آ پہنچتے ہیں۔ تین کمروں کا مکان میری جملہ ضروریات کے لئے کافی تھا۔ ہوا اور پانی کی ضرورت کو ویسے بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا لیکن اس اشتہار میں جو بات مجھے خاص طور پر پسند آئی وہ معقول کرایہ والی تھی۔ میں جھٹ کرایہ کا سائیکل لے کر کرایہ کا مکان لینے چل پڑا۔ اور چلتا ہی گیا۔ آخر ایک کچے راستہ کے موڑ پر مالک مکان میرے استقبال کے لئے کھڑا نظر آیا۔ اپنے برق رفتار سائیکل سے زمین پر اتر آیا۔ مالک مکان نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور فوراً مکان دکھانے لے گیا۔ مکان میں واقعی تین کمرے تھے۔ ایک رہنے سہنے کے لئے ایک کھانا پکانے کے لئے اور ایک ناقابل التوا ضروریات پوری کرنے کے لئے۔ کھڑکیاں اور روشن دان ابھی نہیں لگے تھے۔ البتہ دو کواڑ سینے سے سینہ ملائے دروازے میں کھڑے تھے۔ مالک مکان کے ایک ہی دوہتھڑ سے جدا ہو گئے ہم اندر چلے گئے اور یوں محسوس ہوا جیسے ابھی باہر ہی کھڑے ہیں کیونکہ ہوا کا بکثرت آنا جانا تھا۔ پانی کا ذخیرہ نہ صرف مکان کے اندر اور باہر تھا بلکہ اس کے گرد و نواح میں بھی پانی کے کئی جوہڑ تھے جن سے ہنگامی ضروریات پوری کی جا سکتی تھیں۔ جب کرایہ پوچھا تو خلاف اشتہار نہایت غیر معقول نکلا (مالک مکان نہیں۔ کرایہ)۔ ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی اور سائیکل کا کئی گھنٹوں کا کرایہ مفت میں پڑ گیا۔ اس ناکام مہم کی خبر پاتے ہی کئی دوستوں نے اپنا اثر و رسوخ بلا کمیشن پیش کیا۔ لیکن میٹرک میں کامیابی اور ملازمت کی دستیابی میں مجھے جو مدد اخبار سے ملی تھی اس سے میں قائل ہو چکا تھا کہ اب بھی میرا بھلا اخبار پڑھنے سے ہی ہوگا۔ چنانچہ میں پڑھتا رہا اور صدق دل سے پڑھتا رہا۔ اور بالآخر ایک کوٹھی کا جزو لاینفک جس کو عرف عام میں اینکسی Annexe کہتے ہیں مل گیا۔ جس میں نہ صرف ہوا اور پانی نہ صرف ضرورت کے مطابق تھا بلکہ کرایہ بھی معقولیت اور غیر معقولیت کے بین بین تھا۔

مکان کو گھر بنانا آسان کام نہیں۔ اس معراج کے کئی مرحلے ہوتے ہیں۔ پہلا مرحلہ ضروری سامان کی فراہمی کا تھا۔ ترو تازہ فرنیچر خریدنے کی بجٹ اجازت نہیں دیتا تھا۔ اور خریدے بغیر چارہ نہ تھا۔ میں اسی پیچ و تاب میں تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں،

اگر کروں تو کیوں کر کروں اگر نہ کروں تو گزارہ کیسے کروں ؟ - میں ابھی کوئی حل سوچ نہ پایا تھا کہ اخبار میں پرانے سامان کے نیلام کا اشتہار نظر آیا۔ مقررہ دن مقررہ وقت پر مقررہ جائے وقوع پر پہنچ گیا۔ مقابلہ سخت تھا۔ لوگوں نے طرح طرح کی بولیاں بولیں کوئی ریفریجریٹر کے لئے بڑھ چڑھ کر بولی دے رہا تھا کوئی ائیر کنڈیشنر لینے پر تلا ہوا تھا۔ جن اجزا میں مجھے دلچسپی تھی وہ الگ پڑے لوگوں کا منہ دیکھ رہے تھے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میری جیب میں پیسے ٹٹول رہے ہوں۔ میں نے غیر ارادی طور پر کوٹ کے بٹن فوراً بند کر لئے اور جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسوں کی موجودگی کا بھی اطمینان کر لیا۔ میں نے اپنے پسندیدہ سامان کی ایسی ایسی بولی دی کہ کسی اور کو بولنے کی جرات نہ ہو سکی - نتیجتاً دو پلنگوں کے پیچھے چلاتے فریم، تین کرسیوں کے اعضائے رئیسہ، ایک میز کی ٹانگیں (اوپر کا تختہ لگوانا اگلے پلان میں تھا) اور ایک الماری کے کواڑ لے کر گھر چلا آیا۔ قسطوں پر اجرت دے کر مرمت کروائی اور اپنے ہاتھوں حسب منشا ارنش کی۔

جب گھر بسنے کے ابتدائی مراحل طے ہو چکے تو ایک "چیز" کی کمی کا ذکر سب دوستوں نے کیا۔ احساس تو مجھے بھی تھا لیکن اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے اظہار سے شرماتا تھا۔ اب سارا بوجھ دوستوں پر ڈال سکتا تھا' لہذا میں اپنے محبوب اخبار میں "ضرورت رشتہ" کے تحت چھپنے والی خبریں پڑھنے لگا۔ ان خبروں میں بنت حوا کی اتنی قسمیں بیان کی گئی تھیں کہ انتخاب مشکل ہو گیا۔ دراصل مجھے خود معلوم نہ تھا کہ مجھے کس محل وقوع، کس حدود اربعہ اور کن عناصر کے مرکب کی ضرورت ہے۔ کسی تجربہ کار دوست سے مشورہ لینے سے ویسے جھینپتا تھا خود فیصلہ کرنا دشوار تھا۔ اتنے میں اخبار میں ایک مضمون پر نظر پڑی جس کا عنوان تھا "شادی سے پہلے کن باتوں کا خیال رکھنا چاہئے" میں نے اسے تائید غیبی جانا اور کئی دفعہ اس کا ورد کر کے جزو دماغ بنا لیا۔ اس میں کوئی مذہبی حوالہ تھا ورنہ میں اس کا تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لیتا۔ بہرحال یہ مقالہ کسی بڑے ہی کہنہ مشق خاوند کے تجربے کا نچوڑ اور اثر خامہ تھا اس مقالہ کا نچوڑ درج ذیل ہے۔

(۱) اگر آپ انسانی ڈیل ڈول کے مالک ہیں تو زیادہ "عقلمند" رفیقہ حیات تلاش مت کیجئے۔

(۲) شادی سے پہلے کسی دنیادار عامل سے ایک تعویذ "دافع بلا اور حفظِ جان و مال" حاصل کر کے کالے دھاگے سے دائیں بازو پہ باندھ لیں خدا اس ہاتھ میں دفاعی طاقت دگنی کر دے گا۔

(۳) شادی کے لئے مذاکرات میں اس بات کا بار بار ذکر کیجئے کہ آپ نے اپنی زندگی کا بیمہ ایک لاکھ روپیہ میں کرا رکھا ہے اور آپ کو اکثر دل کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ ویسے ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔

(۴) اگر خدانخواستہ آپ کے والد صاحب دار فانی سے کوچ کر کے آپ کو اپنی پسند کی شادی کرنے کا موقع فراہم کر چکے ہیں تو ان کی چھوڑی ہوئی قیمتی جائداد کا تذکرہ بھی مفید رہے گا۔

(۵) کالج کی بہترین مقررہ اور بہترین اتھلیٹ دونوں مضر صحت ہو سکتی ہیں۔ ان کے انتخاب میں احتیاط برتئے۔

(۶) حفظ ماتقدم کے طور پر کھانا پکانا، ٹوٹے ہوئے بٹن ٹانکنا، ساڑھی استری کرنا اور روتے بچوں کو پل بھر میں چپ کرانا سیکھ لیں۔ وقت پڑنے پر یہ ہنر کام آئیں گے۔

(۷) کلب کی عادی بیوی کا کم از کم ایک فائدہ ضرور ہوگا کہ آپ کو آرام کے لئے کچھ وقت مل جایا کرے گا۔

(۸) اگر آپ والدہ صاحبہ کے سائے سے محروم ہو چکے ہیں تو بزرگ قسم کی خاتون کا انتخاب نفسیاتی طور پر آپ کے لئے مفید رہے گا

(۹) اگر آپ مکان نہ ملنے سے تنگ آ کر اس امید پہ شادی کر رہے ہیں کہ سسرال کی کوٹھی میں سر چھپانے کو جگہ مل جائیگی تو شادی سے

پہلے اس بات کی تصدیق کر لیجئے کہ کہیں وہ اس امید پر لڑکی کی شادی نہ کر رہے ہوں کہ داماد کے بنگلے میں جا بسیں گے۔

(۱۰) شادی سے پہلے ایک بار پھر سوچ لیجئے کہ کیا اس کے بغیر آپ کی زندگی زیادہ آرام سے نہیں گزرے گی۔

اس پُر مغز مقالے نے میری قوت فیصلہ پر ما را لعم کا اثر کیا۔ سب سے پہلے میں نے ہدایت نمبر دس کے مطابق اپنے سارے منصوبے پر نظر ثانی کی۔ اس کے معاشرتی اور مالی پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ خطرۂ جان کے امکانات جانچے لیکن دوستوں کے اصرار پر شادی کرنے کے فیصلے سے باز نہ آیا۔ اور اس مقالہ کی روشنی میں "ضرورت رشتہ" کا کالم پھر سے پڑھنا شروع کیا۔ لیکن فیصلہ آسان نہ تھا کیونکہ ہر مشتہر خاتون کے کوائف میں ایک نہ ایک پہلو ایسا ضرور نکل آتا تھا جو میرے مقررہ معیار سے اوپر یا نیچے چلا جاتا تھا۔ اس ریسرچ سے یہ انکشاف ضرور ہوا کہ ماشاءاللہ ہماری مملکت خداداد کی ہر خاتون خداداد صلاحیتوں کی مالک ہے۔ بالخصوص ہر عورت خوبصورت، نیک سیرت، پابند صوم صلوٰۃ، تعلیم یافتہ اور امور خانہ داری میں ماہر ہے اس حوصلہ افزا انکشاف کا حوصلہ شکن پہلو یہ تھا کہ اتنی باصفات خواتین بن بیاہی رہ گئیں یقیناً حضرات نے کوئی متحدہ محاذ بنا رکھا ہوگا۔

ایک روز اسی موضوع پر تحقیق کے دوران ایک اشتہار پر نظر رک گئی۔ اشتہار کی عبارت کچھ اس قسم کی تھی۔

"ضرورت ہے ایسی نوجوان خاتون کی جس کی تعلیم کم از کم ایف۔ اے اور عمر بیس اور پچیس سال کے درمیان ہو۔ اسلامی نظریۂ حیات رکھتی ہو۔ تجربہ کار　　　خواتین کو ترجیح دی جائیگی" اس اشتہار کے آخری جملے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے سارا اشتہار دوبارہ پڑھا۔ ذرا غور کیا تو پتہ چلا کہ یہ اشتہار "ضرورت رشتہ" کے تحت نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی "ضرورت استانی" کے عنوان سے چھپا ہے۔ مجھے خجالت ہوئی۔ ادھر ادھر دیکھا لیکن خوش قسمتی سے پاس کوئی نہیں کھڑا تھا۔

اسی طرح کے کچھ اور اشتہار پڑھے، کچھ مشورے دوستوں سے لئے۔ کچھ رہنمائی "دفتر خانہ آبادی" سے حاصل کی۔ اور بالآخر ایک کوالیفائڈ مگر ناتجربہ کار دوشیزہ کا انتخاب کر ڈالا۔

شادی بیاہ کی تیاری امتحان کی تیاری سے زیادہ حوصلہ شکن نکلی۔ اس میں نہ ہڑتالیں کام آسکتی ہیں اور نہ گیس پیپر۔ اگر کام آسکتا ہے تو روپیہ اور ہونے والا دولہا۔ لیکن اگر ایسا ہو جاتا تو لوگ مشہور کر دیتے کہ دولہا کو شادی مرگ ہوگئی ہے حالانکہ اسے مرگ شادی کہنا زیادہ درست ہوتا۔ لیکن ابھی عشق کے کئی امتحاں باقی تھے۔ اور میں یہ امتحان دینے کے لئے زندہ بچ گیا۔ جہاں تک پیسہ کے کام آنے کا تعلق تھا وہ بیچارہ کہاں کام آتا کیونکہ اس کا معاملہ تو بقول "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے" والا تھا یعنی مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں اس کا وجود ہوتا تھا درمیانی اور انتہائی تاریخوں میں عنقا ہو جاتا تھا۔ بالآخر روپیہ کی فراہمی کا مسئلہ بھی اخبار کی وساطت سے حل ہوا۔ ایک بنک کی طرف سے ایک اشتہار نکلا۔ جس میں قرضہ حاصل کرنے کے آسان طریقے اور معمولی قسطوں میں واپسی کی خوشخبری درج تھی۔ بنک سے فوری طور پر رابطہ قائم کیا۔ (اب تک رابطہ پیدا کرتے کرتے میں اچھا بھلا رابطہ افسر بننے کے اہل ہوگیا تھا) بنک والوں نے چند شرائط پوری کرنے کی خواہش ظاہر کی اور پیسے والے کی خواہش کون پوری نہیں کرتا۔ میں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ اپنا ساری منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد جس میں سیکنڈ ہینڈ سکوٹر بھی شامل تھا ضمانت کے طور پر لکھ دیا اور مجھے قرضہ مل گیا۔

"شادی بیاہ پر ہماری خدمات حاصل کیجئے" کا اشتہار کئی دفعہ میری نظروں سے گزر چکا تھا اور اس تحریر والے بڑے بڑے سائن بورڈ بھی کئی گلی کوچوں میں ٹنگے دیکھے تھے لیکن اس کا مطلب کبھی پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا تھا بلکہ ان کے جلی حروف کو دیکھ کر اکثر شرم آتی تھی۔ میں اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اسے بھی "پوشیدہ امراض" کے معالج کے اشتہار سے مشابہ سمجھتا تھا لیکن

## شادی سے انکار

کہ وہ لوگوں کو ان کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ میں نے سوچا مجھے اپنی شادی پر بیانیے لوگوں کی خدمات کی بھلا کیا ضرورت؟ شادی تو ایک ذاتی، جذباتی بلکہ جنسیاتی معاملہ ہے اس میں شرکتِ غیرے چہ معنی؟ لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ شادی کے لئے ایسے ایسے درمیں دیکھنے پڑتے ہیں جو عام حالات میں ایک خوددار انسان دیکھنا پسند نہیں کرتا یہی حشر میرا ہوا۔ مجھے بھی کراکری، شامیانے، کرسیاں اور دریاں کرایہ پر لینے کے لئے ان کے پاس جانا پڑا۔ کیونکہ جس طرح گراؤنڈ، گیند اور بلے کے بغیر کرکٹ نہیں کھیلا جا سکتا اسی طرح ان لوازمات کے بغیر شادی بھی نہیں ہو سکتی لہٰذا طوعاً و کرہاً یہ مرحلہ بھی طے کیا اور ـــــ میرا گھر بس گیا۔

دراصل شادی سے متعلق قصے کہانیاں اور مضامین پڑھ پڑھ کر میں شادی سے خوف کھانے لگا تھا اور یہی بات یہ ہے کہ شروع شروع میں شادی سے ذرا دور دور رہا۔ لیکن چند دنوں میں تمام خطرے اور وہم ایسے دور ہو گئے جیسے پیر کامل کا تعویذ باندھنے سے آسیب دور ہو جاتا ہے۔ اس وادی کو جتنا میں پُرخار سمجھتا تھا یہ اتنی ہی گلزار نکلی۔ میں نے اسے بھی اخبار بینی کی بھلائی کے راز پوشیدہ ہونے کا احساس دلایا اور بتایا کہ آج کے مہذب دور میں اخبار نہ صرف خبریں مہیا کرتا ہے بلکہ لوگوں کو میٹرک پاس کراتا، نوکری دلاتا اور شادی بھی کراتا ہے کیوں نہ ہم اپنی زندگی میں بھی اس سے نور ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس نے "ہدایت نامہ خاوند" اور "ہدایت نامہ بیوی" کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے مدلل طریقے سے بتایا کہ یہ اس پسماندہ دور کی باتیں ہیں جب اخباروں نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ اب تو نہ صرف ان دو کتابوں کی بلکہ کسی کتاب کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ اخبار میں اب ہر موضوع پر علم کے دریا بہائے جاتے ہیں۔ جس دریا سے جتنا پانی پینا چاہو پی لو۔ بلکہ چاہو تو پانی کو چھوئے بغیر سیر ہو جاؤ۔ اس کا آسان اور ہر دلعزیز طریقہ یہ ہے کہ کتابوں پر تبصرہ پڑھ لیا کرو۔ اس کے بعد آپ ہر ادبی محفل میں ہر مصنف کی ہر تخلیق پر سیر حاصل بحث کر سکتی ہیں۔ محترمہ قائل ہو گئیں (اسے میری بہت بڑی ڈپلومیٹک فتح کہئے)۔ اور ہم دونوں نے اکٹھا اخبار پڑھنا شروع کیا اور خاص طور پر "عورتوں کا صفحہ جسے مرد بھی پڑھ سکتے ہیں" زیر مطالعہ آنے لگا۔ اس صفحہ میں ہمیں کئی گوہر نایاب ملے مثلاً یہ کہ کس کے مرنے پر کون سا لباس پہننا چاہیئے یا میاں تلخ مزاج ہوں تو کونسی سویٹ ڈش تیار کرنی چاہیئے اور کیسے؟ اگر میاں کو زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے باہر رکھنا مقصود ہو تو گھر کی سجاوٹ اور اپنا میک اَپ کیسا کرنا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بھلا ہو ان خواتین و حضرات کا جو اپنے تجربوں سے ہم جیسے نو بیاہتا جوڑوں کی رہنمائی کے لئے اخباروں کے کئی کالم بھر دیتے ہیں انہی مشوروں میں سب سے قیمتی مشورہ وہ تھا جس میں "خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز" بتایا گیا تھا۔ رفاہِ عامہ کے لئے یہ مجرب نسخہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

اگر آپ گھریلو تلخیاں مٹانا اور اپنی بیوی کی نظروں میں عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو نہ صرف "ان" کی تعریف میں صبح سویرے نہار منہ ایک قصیدہ کہا کریں (ضروری نہیں کہ قصیدہ منظوم ہو، آزاد اشعار بلکہ آزاد نثر میں بھی ہو سکتا ہے) بلکہ اٹھتے بیٹھتے یہ بھی کہتے رہیں کہ "آپ کی ممی ماشاء اللہ کافی اسمارٹ ہیں"۔ "آپ کے ڈیڈی کو دیکھ کر ناواقف سے ناواقف آدمی بھی یقین سے کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے بہترین اتھلیٹ رہے ہیں"۔ "آپ کی انٹی تو بالکل ٹین ایجر دکھائی دیتی ہیں" اور "آپ کے برادرِ ان-لا ہر لباس میں ہینڈسم لگتے ہیں"۔ وغیرہ۔ اگر محترمہ جوابی کارروائی کے طور پر یوں ارشاد فرمائیں کہ "آپ کی

والدہ کا [illegible] CONSERVATIVE [illegible] جاتے ہیں۔ آپ کے والد صاحب ایک [illegible]
(S.T.C.) [illegible] آپ کی [illegible] مگر یہ کام [illegible] تو آپ نے صرف ان باتوں کو [illegible]
بغیر [illegible] کے تجربات کی دل کھول کر داد دی۔

میں ان تمام اصولوں کے علاوہ ہر اس مشورہ پر عمل کرتا ہوں جو اخبار کے ذریعہ مجھ تک پہنچتا رہتا ہے۔ اگر کہیں [illegible] پیدا ہوتا ہے تو میں ایک نئے زبان خاوند کے قلمی نام سے اپنا [illegible] خواتین کے صفحہ کے ایڈیٹر کو بھیج دیتا ہوں اور ان کی اشاعت کے بعد ہم دونوں اسے مل کر پڑھتے ہیں اور دل کھول کر داد اور جواب دیتے ہیں۔ [illegible] کا مضمون ماخوذ نظر آتا ہے۔ اسے ہم اکٹھے پڑھتے ہیں اور مجھے خواہ مخواہ شک ہونے لگتا ہے کہ کہیں یہ تحریر میری [illegible] کی تو نہیں جو اخبار کی افادیت کی قائل ہو گئی ہے اور اب اپنے تجربات اخبار کو بھیجنے لگی ہے۔ کہ اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو۔

اب اخبار ہماری زندگی کا ناقوت لائف بن چکا ہے اور پروگرام یہ ہے کہ ہم خود مر جائیں گے لیکن اس سے جدا نہیں ہوں گے۔ اپنے آئندہ آنے والے بچے کی تصویریں اخبار میں چھپوائیں گے اس کو اسکول میں داخل کرانے کے لئے بہترین مدرسہ کا انتخاب اخبار کی مدد سے کریں گے۔ [illegible] میٹرک [illegible] پاس کرانے کے لئے جدید ترین گیس پیپر خرید کر دیں گے پھر ملازمت دلائیں گے اور [illegible] شادی کروائیں گے۔

---

# بھنور اور ساحل

(صفحہ ۹۲ سے آگے)

اس تذکرے سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

[illegible] نے نیند میں سسکاری بھری۔ نصرت نے اس کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں [illegible] اس نے پریشانی سے سوچا۔ میں کیا کروں؟ میں بہت کچھ کر سکتی ہوں بہت کچھ بھول سکتی ہوں میرے بیٹے مگر تجھے یہ دکھ نہیں دے سکتی اس نے [illegible] سے سوچا۔

اور جب سوتے ہوئے بیٹے کو اٹھا کر وہ منصور سے ملنے کے لئے چلی ہے تو زندگی میں پہلی دفعہ آیا کے [illegible] ساتھ کھو لنے والی عادت نے اسے بڑی پریشانی سے نجات دلا دی۔ [illegible] میں رفیع کی آواز گونج رہی تھی۔

بہت قریب سے میں نے تمہیں پکارا ہے؟

اور جب نصرت نے منصور کے [illegible]
[illegible]
آنسو [illegible] نصرت نے [illegible] سانس لیا۔

دلشاد انجم

# آگ، روشنی اور لکیر

بہار کا آخری پھول بھی اس طرح شاخ سے گر چکا ہے جیسے کوئی بیوہ اپنے سہاگ کی آخری چوڑی توڑ کر پھینک دے اور درختوں کی ٹہنیاں تنہا ہیں کسی بیوہ کی ننگی کلائیوں کی طرح زرد اور ویران ہو چکی ہوں۔ ہر طرف ویرانی اور اداسی کا تسلط ہے روز کی طرح یہ سوگوار شام بھی لمحہ لمحہ کر کے ڈھلتی جا رہی ہے۔ اور میں معمول کے مطابق کھڑکی کے قریب رکھی اس کرسی پر بیٹھی باہر خلا میں نظریں جمائے ہوئے ہوں۔ میرے ہاتھوں میں تمہارا خط ہے جو ابھی ابھی ڈاکیہ مجھے دے کر گیا ہے۔ تمہارے خط کے مضمون میں کوئی بھی نئی بات نہیں ہے وہی گھسے پٹے عشقیہ جملے اور وہی پرانا سوال جو پچھلے دو سال سے تم مجھ سے پوچھتے آ رہے ہو۔ زبردستی محبت کا اقرار کرانے کا یہ انداز بھی نرالا ہے۔ مگر میرے نا سمجھ ہمدم عورت کا دل کوئی خالی فریم نہیں ہوتا جس میں حسب ضرورت نئی تصاویر لگائی جا سکیں۔ مجھے یقین ہے تم میری اس بات پر حیران نہیں ہو گے کیونکہ میرے ماضی سے جو شخص وابستہ ہے وہ کبھی تمہارا قریب ترین دوست تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی زندگی کے اس اہم راز سے کسی حد تک تم واقف نہ ہو یہ دوسری بات ہے کہ تم نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میرے ماضی کو نظر انداز کر کے مجھ سے محبت کی بھیک مانگی ہو میرے بجائے اگر کسی اور لڑکی کے آگے تم یہ سوال کرتے تو وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی۔ تم باتجربہ ملک کے ایک عظیم اور نامور فن کار ہو۔ جس کی آواز پر نوجوان لڑکیاں جان دیتی ہیں۔ جس کے نغموں میں جوان دلوں کی دھڑکنیں شامل ہوتی ہیں۔ اور [illegible] میں بھی کبھی تمہاری آواز کی دیوانی تھی۔ مگر صرف ایک عقیدت مند کی حیثیت تک۔ اس سے آگے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ گھنٹوں میں نے اپنی سہیلیوں سے تمہارا تذکرہ کیا ہے۔ پہروں تمہارے گائے ہوئے گیتوں پر تبصرے ہوتے ہیں۔ ہم سب سہیلیوں کو کتنا ارمان تھا تمہیں قریب سے دیکھنے کا۔ مگر اب جب کہ انجانے طور پر تم میرے اتنے قریب چلے آئے ہو تو میں [illegible] رہ گئی ہوں۔ میرے [illegible] نے تو کبھی بھولے سے بھی تمہارے بارے میں اس طرح نہیں سوچا۔ زندگی میں کبھی کبھی کیسے عجیب حادثے ہو جاتے ہیں۔ اور میں [illegible] زندگی کی سیدھی سادی پگڈنڈیوں پر چلنے کی عادی تھی ایک ایسے ہی عجیب حادثے کا شکار ہو کر حیات کی بھول بھلیوں میں بھٹک چکی ہوں۔ یہ زندگی کا ایسا ریگستان ہے جس میں دور دور تک آرزوؤں کا کوئی [illegible] نظر نہیں آتا [illegible] کی حسرتیں۔ میں نے جیسے زندگی کے احساس تک کو چھین لیا ہے۔ ویرانی اور سنگلاخی کا ایسا بھیانک ماحول۔ جہاں [illegible] جاتے۔ اور میں۔ میں اسی ماحول میں خود کو سمیٹے زندگی کی خاردار جھاڑیوں سے الجھتی عمر کی منزل کی طرف [illegible] نہ معلوم اس سفر کا اختتام کہاں پر ہو گا۔ اب تو ان راہوں پر چلتے چلتے میرے پاؤں بھی زخمی ہو چکے ہیں۔ میں [illegible]

کر بیٹھی تھی۔ جو میرے دل میں مچل رہا تھا۔ چاندنی رات کی دھندلی روشنی میں عشق پیچاں کی بیلیں ایک حسین سا پس منظر پیش کر رہی تھیں۔ اور میں خلاؤں میں نظریں جمائے نہ معلوم کہاں کھوئی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے اپنے کاندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ میں گھبرا کر مڑی تو میرے سامنے اقبال کھڑا تھا۔

میں نے آہستہ سے نظریں اٹھائیں اس کے ہونٹوں پر وہی بے باک اور پراسرار مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جس سے نہ معلوم کیوں میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور پلکیں خود بخود جھک گئیں اور دوسرے ہی لمحے میں تیز تیز قدم رکھتی ہوئی صحن پار کر کے اپنے کمرے میں داخل ہو گئی اور اپنے کمرے میں داخل ہو کر بستر پر گر پڑی۔ جانے کیسا احساس تھا جس نے نس نس میں ایک پیار بھری سی مسرت اور سرخوشی بھر دی تھی۔ وہ ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ صبح اٹھ کر ابھی میں غسل خانے سے نکل ہی رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا سامنے اقبال کھڑا تھا میں نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں وہ چند لمحے میری جانب دیکھتا رہا پھر آہستہ سے میرے کان کے قریب منہ لا کر شرارت آمیز آواز میں سلام کیا اور تیز تیز قدم رکھتے ہوئے اندر چلا گیا۔

معمول کے مطابق اس نے ہم سب کے ساتھ ناشتہ کیا اور شطرنج کی بازی جم گئی اس کے بعد تاش کھیلے گئے پھر کیرم ہر بار اقبال میرا پارٹنر رہا۔ یہ سب کچھ کوئی نئی بات نہیں تھی مگر اس روز نہ معلوم کیوں سب کچھ نیا نیا سا معلوم ہو رہا تھا۔ اور میری جھکی جھکی پلکوں نے اقبال کی شرارت آمیز باتوں اور بیباک مسکراہٹوں نے بڑی آپا کو شک و شبہ میں مبتلا کر دیا مگر انہوں نے اس کی ان باتوں کو اس کی عادت سے تعبیر کر کے کوئی اہمیت نہ دی۔

اس کے بعد دن رات جیسے پر لگا کر اڑنے لگے۔ میں اس کی محبت میں کھو کر دنیا و مافیہا کو فراموش کر بیٹھی۔

کئی بہاریں آئیں اور گزر گئیں۔ کئی بار خزاں کے بے رحم ہاتھوں سے بہاروں کا سہاگ اجڑا وقت کی گردش نے کتنی ہی زندگیوں میں انقلابات پیدا کئے۔ مگر ہم لوگ ہر شے سے بے نیاز اپنی اپنی منزل کی طرف بڑھتے گئے ہماری محبت ہر انقلاب سے بے پرواہ پروان چڑھتی رہی۔

کہا جاتا ہے کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ وہی ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ اقبال کی دیوانگی اور میری جھجک نے ہی شک کی بنیاد گھر والوں کے دلوں میں ڈالی تھی۔ دوسروں کی زبانی ہماری چوری چھپے ملاقاتوں کی خبروں نے اسے یقین میں تبدیل کر دیا اور اس یقین کے ساتھ ہی اچانک میری زندگی میں انقلاب آ گیا۔ سنجھلے بھیا نے ممی کو خوب برا بھلا کہا ان کے خیال میں میری اس بدنامی میں ان کی دی ہوئی آزادی کو دخل تھا۔ میں بڑے بھیا اور انو بھائی کی محبت کو ترس گئی۔

انو بھائی کو مجھ سے اس حد تک نفرت ہو گئی کہ ان کی [illegible] کے وقت جب سب کے ساتھ میں [illegible] گئی تو انہوں نے میری آنکھوں سے بھیگی آنکھیں دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا۔

[illegible]

[illegible]

محبت کو ... کا انتظار کر رہی ہوں مگر اب تو محبت بھی میرے قریب آتے ہوئے گھبراتی ہے۔ کیسی ... تشنگی تھی ... ہے۔ اور میں تو اس صدی کی سب سے زیادہ بدقسمت لڑکی ہوں۔ لیکن تم ایک خوش قسمت اور عظیم انسان آخر میری بدقسمتی کا سایہ اپنی زندگی پر کیوں ڈالنا چاہتے؟ بولو! — تمہارے سامنے تمہارے فن اور شہرت کی حسین منزل ہے تمہارے چاروں طرف خوشیاں ہیں، روشنیاں ہیں اور تم جان بوجھ کر ایک اندھیرے کے باسی کا ہاتھ تھام لینا چاہتے ہو۔! یہ جذباتیت نہیں تو اور کیا ہے۔ تم مردوں کی محبت ایسی ہی اندھی اور جذباتیت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔

آج مجھے تمہارے خط کے الفاظ پر ہنسی آ رہی ہے۔ محبت کا یقین دلانے کے لئے ان گھسے پٹے الفاظ کا سہارا لینا، عشق کا یہ انداز پرانا ہوتے ہوئے بھی کتنا نیا ہے۔ بالکل وہی الفاظ وہی انداز بیان۔ تمہارے ان الفاظ نے میرے ذہن کے دھندلکوں کے درمیان ماضی کے دریچے کھول دیئے ہیں۔ یہ اب سے آٹھ سال پہلے کی بات ہے۔

وہ بہار کی ایک خوشگوار شام تھی۔ گرمیوں کی تعطیلات میں سب بہن بھائی گھر آئے ہوئے تھے [illegible] آپا، انو بھیا، اختر اور میں سارا سارا دن بیٹھ کر تاش کھیلتے پکنک کے پروگرام بناتے۔ رات گئے تک بیٹھ کر [illegible] کی محفلیں جمتیں۔ اقبال ہر پروگرام میں ہمارے ساتھ شریک ہوتا۔ بائیس سال کا سانولا سا دبلا پتلا وہ لڑکا ہمارا بچپن کا ساتھی تھا ہم لوگ بچپن سے ساتھ پلے بڑھے تھے اس لئے ہمارے درمیان تکلف کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اسکی حیثیت گھر میں وہی تھی جو انو بھیا اور اختر کی تھی۔ اس کی امی میری ممی کی منہ بولی بہن تھیں اور اس رشتے نے دو خاندانوں کو ایک جان دو قالب بنا دیا تھا۔

اس شام اقبال کی چھوٹی بہن نیما کی منگنی تھی۔ اس کا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف تھی۔ بڑی آپا اور انو بھیا اقبال کی بڑی بہن کے ساتھ باورچی خانے میں نوکروں سے کام لے رہے تھے۔ اور ممی سہیلیوں سے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

رات کو ۹ بجے جاکر کہیں مہمانوں سے نجات ملی۔ ہم سب کا تھکن کے مارے برا حال تھا۔ رات کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا نوکروں نے میز لگا دی۔ اقبال میرے برابر ہی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی اس سے پہلے بھی بیسیوں بار ایسے مواقع پیش آئے تھے۔ لیکن اس رات اسکی آنکھوں میں کوئی انجانا سا پیغام تھا۔ کئی بار کھانے کے دوران میری اس کی نگاہیں ملیں اور اسکی آنکھوں میں خلاف معمول ایک انجانی سی چمک دیکھ کر میں نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ اور کھانے کے بعد جب چائے آئی تو اس نے ایک بڑی عجیب سی حرکت کی۔ میں نے ابھی آدھا ہی کپ پیا تھا کہ اس نے پیالی میرے آگے سے اٹھالی "اور چائے نہیں لو گی کیا؟" اسنے عجیب سے لہجہ میں مجھ سے پوچھا۔

میں خاموش رہی اور اس نے سب کی نگاہ بچا کر اپنی جھوٹی چائے میرے آگے رکھ دی۔ میں نے گھبرا کر اسکی جانب دیکھا مگر اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیسی چمک تھی۔ التجا اور حکم کا ملا جلا سا امتزاج۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرا ذہن بے قابو ہو رہا ہے بے اختیار میرا ہاتھ پیالی کی طرف بڑھ گیا اور دوسرے ہی لمحے غیر ارادی طور پر وہ پیالی میرے ہونٹوں سے آلگی۔ جب چائے ختم کر کے میں نے پیالی میز پر رکھی تو ایک عجیب سی شرمندگی کا احساس میرے ذہن پر چھا چکا تھا اور اقبال کے ہونٹوں پر ایک پر اسرار مسکراہٹ رقصاں تھی میں گھبرا کر میز سے اٹھ گئی اور باہر آکر برآمدے کے ستون سے لگ

زندگی کی روشنی ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ لیکن ایک تاریک حسین ۔۔۔ نے مجھے نگل لیا ۔ مگر میں ایک کٹی پتنگ کی مانند وقت کی ٹھوکروں میں الجھ کر رہ گئی۔

کافی عرصے سے اقبال کی دلچسپی اور وارفتگی میں کمی محسوس کر رہی تھی۔ اسی طرح ایک دن اس کی حقیقت بھی کھل کر سامنے آ گئی جب کالج سے واپسی کے وقت بس اسٹاپ سے اس کی سیاہ کار گزری۔ مجھے چند لمحوں کے لئے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا اس کی کار میں ساجدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ ہمارے سامنے کے فلیٹ میں آنے والے نئے کرایہ دار کی اکلوتی بیٹی تھی۔

مجھے چند لمحوں کے لئے اقبال سے نفرت ہو گئی آخر مجھ میں کیا کمی تھی جو ایک معمولی شکل و صورت کی لڑکی کو اس نے مجھ پر ترجیح دی۔ میں ساجدہ سے کسی طور پر بھی کمتر نہ تھی میں ایک معزز خاندان کی چشم و چراغ حسین اور خوبرو تھی لیکن مرد کے دل اور برسات کی دھوپ کا اعتبار ہی کیا۔ میں نے اسے ایک حادثہ سمجھ کر اسے فراموش کرنے کی کوشش کی مگر ماضی سے وابستہ حسین یادیں بھلا دینا کوئی آسان کام نہیں۔ میں نے لاکھ اسے فراموش کرنے کی کوشش کی مگر کسی طرح کامیاب نہ ہو سکی۔

اس وقت میں نے یہ جانا کہ محبت کوئی سرور بخش نغمہ یا حسین چشمہ نہیں جس کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی روح کو سکون بخشتا ہے بلکہ یہ ایک آگ ہے جو بھڑک کر صرف چند لمحات کے لئے روشنی دیتی ہے۔ اور اس کے بعد صرف اندھیرے اور تاریکی نامراد انسان کا مقدر ہوتی ہے۔

انہی دنوں جبکہ میری زندگی حالات کی کشمکش سے تنگ آ کر خودکشی پر آمادہ ہوا چاہتی تھی۔ ساجدہ اور اقبال کی منگنی کی خبر نے مجھے ناامیدی کے منجدھار سے مسرت کے ساحل پر لا پٹکا۔

دو چار روز بعد اقبال اپنی بہن کے ذریعہ مجھ سے ملا۔ اس کا خیال تھا میں اسے معاف نہیں کروں گی لیکن اس احمق کو کیا پتہ کہ ایک عورت کا دل مرد کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع ہوتا ہے ایثار اور عفو کا جذبہ خدا نے صرف عورت کو ہی فراخدلی سے بخشا ہے۔

شکوے شکایتیں ہوئیں اور دو بچھڑے ہوئے دل پھر ایک ہو گئے چند دن ہنسی خوشی گزرے۔ [illegible] کی لڑکی آسیہ کی شادی میں ہم لوگوں کو راولپنڈی جانا پڑا۔ وہ دو ماہ کا عرصہ میں نے کس طرح گزارا اسے شاید میں الفاظ میں ادا نہ کر سکوں ہر تیسرے روز اقبال کا خط ملتا اور میں بھی گھر کے ہنگاموں سے بے نیاز ہر روز اسے لمبے چوڑے خط لکھتی انہی خطوں میں وہ خط بھی شامل ہیں وہ کئی بار میں نے اپنی کلائی کاٹ کر اپنے خون سے لکھے تھے کس قدر دیوانی ہو گئی تھی میں اس فریبی انسان کے لئے۔

دو ماہ بعد جب ہم راولپنڈی سے کراچی آنے کے لئے ٹرین میں سوار ہوئے تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ دو ماہ میرے واسطے دو صدیوں کے برابر تھے۔ اقبال سے ملنے کا تصور ہی میرے لئے [illegible] اسلئے [illegible] ملنے والی تھی۔ جی چاہتا تھا پنکھ ہوں اور میں اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ میں نے [illegible] کو اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ [illegible] کراچی [illegible] میری [illegible] چاروں طرف [illegible] نہیں [illegible] دیکھ [illegible] معلوم تھے [illegible]

اور سب سے پہلے جس کے گھر گئی گھر میں داخل ہو کر میں اقبال سے کمرے میں داخل ہونا ہی چاہتی تھی کہ اندر سے کسی کی آواز سنائی دی
یہ چھٹی کیا تم اب اس سے مت ملا کرنا جبکہ اس کی منگنی ہو چکی ہے" اس کی بہن کی آواز میرے ذہن پر بجلی بن کر گری۔
اور میں مردہ قدموں سے واپس لوٹ آئی۔ مگر جب اقبال نے مجھے دیکھا تو ایک بار پھر اس کے سوئے ہوئے جذبات نے کروٹ
لی وہ بھڑک اٹھا اور جلد باز تو وہ تھا ہی۔ دوبارہ اس نے جذبات میں بہہ کر منگنی کی انگوٹھی ماں کے سامنے اتار کر پھینک دی اور
منگنی توڑ دینے کا کہہ دیا۔

اس کی اس بات سے اس کے سب گھر والے پریشان ہو گئے اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر اس کی ماں نے مجھے بلوایا اور بہت سمجھایا۔ بالآخر
ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے میں وہ کچھ کرنے پر تیار ہو گئی جس کے لئے میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے بھیگی پلکوں اور
افسردہ دل کے ساتھ ان سے یہ وعدہ کر لیا کہ اقبال کو میں ان کی مرضی کے مطابق شادی کے لئے تیار کر لوں گی اور آئندہ کبھی اس سے
نہیں ملوں گی۔

دوسرے روز میں پھر اس کے گھر گئی وہ کمرے میں مسہری پر خاموش لیٹا تھا میں اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا
اور مجھے محسوس ہوا کہ میری قوت گویائی ختم ہو گئی ہے۔ ہزار کوشش کے باوجود میری زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو سکا۔ اس نے میرا ہاتھ
تھام لیا اور پیشتر اس کے کہ وہ مجھ سے کچھ کہتا مجھے اچانک اپنا وعدہ یاد آ گیا۔ میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اور ایک گھنٹے
بعد جب میں سوجی ہوئی آنکھیں اور بے مردہ دل لے کر واپس آئی تو مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنا وعدہ وفا کر کے میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔
پھر ایک ہفتہ بعد اس کے دروازے پر شہنائیاں بجیں وہ دولہا بنا مگر وہ بارات میرے دروازے پر آنے کے بجائے عصمت کے دروازے
پر گئی اور میں ترسی ہوئی پلکوں میں آنسو چھپا کر اس کی شادی میں شرکت کی۔

آج سوچتی ہوں تو مجھے خود پر حیرت ہوتی ہے آخر میرے پاس اتنا بڑا دل کہاں سے آ گیا تھا۔ ایک بزدل اور کمزور سی لڑکی نے اتنی
ہمت کیسے کر لی زندگی کا اتنا بڑا حادثہ کس بے جگری سے سہہ لیا۔ اپنی زندگی کی کہانی کا اتنا دردناک انجام ان آنکھوں نے کیسے دیکھا
مگر وہ کہانی ختم ہو گئی اس کا دردناک انجام بھی دیکھے زمانہ ہو گیا۔

اور آج تم پھر اسی جیسی ایک کہانی کا کردار مجھے بنانا چاہتے ہو تم پھر اسی راکھ کو کریدنا چاہتے تھے جس میں دبی ہوئی چنگاریاں
بھی خاکستر ہو چکی ہیں اور میں بذات خود ارمانوں اور آرزوؤں کی جلی ہوئی راکھ بن چکی ہوں جس میں اب کوئی ایسی چنگاری نہیں جو بھڑک کر چند لمحوں
کے واسطے شعلوں میں تبدیل ہو کر میری زندگی کو منور کر دے۔ میرے آگے صرف اندھیرے ہیں۔ تاریکیاں ہیں اور روشنی کا دور دور تک
گذر نہیں۔ تم ان اندھیری راہوں پر میرے ساتھ بھٹکنے کی ناکام کوشش نہ کرو۔ عورت زندگی میں صرف ایک بار کسی کو دل دیتی ہے
اور اپنی ساری زندگی اسی پہلی اور آخری محبت کی یاد کو سینے سے لگائے گزار دیتی ہے۔ میری زندگی میں وہ لمحہ آ چکا ہے میں اپنا سب
کچھ کسی اور پر نچھاور کر چکی ہوں اب میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ بھی تو نہیں۔ لوٹ جاؤ میرے مخلص دوست لوٹ جاؤ۔ کہیں میری
زندگی کے اندھیرے تمہاری روشن زندگی پر اثر انداز نہ ہو جائیں۔ تم قوم کی امانت ہو۔ تم کو کسی ایک ہستی کے لئے اپنے فرائض کو
نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ اسی خیال کے پیش نظر آج میں تمہارا شہر چھوڑ کر جا رہی ہوں اور کوشش کروں گی کہ زندگی کے باقی دنوں کے
دوران دنیا کے کسی موڑ پر تم سے ملاقات نہ ہو سکے۔ اچھا میرے مخلص دوست خدا حافظ۔

اعتبار ساجد

# رات، جگنو اور تنہائی

وہ یکایک چونک کر اٹھ بیٹھا۔ کمرہ تنہائیوں سے لپٹا بھائیں بھائیں کر رہا تھا!

ابھی ابھی عالم خواب میں اسے یوں لگا تھا جیسے نجم نے اسے پکارا ہو۔ ادھ کھلی خواب آلودہ آنکھیں پوری طرح کھول کر وہ آہستہ سے اٹھا۔ نجم کا خالی کھٹولا دیکھ کر اسے کمرے میں غیر معمولی تنہائی اور سناٹے کا احساس ہوا وہ دبے دبے ننگے پاؤں چلتا ہوا کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باہر گہری سیاہ، نقرئی تاروں بھری رات تھی اور اندر کمرے میں اور اس کے دل میں ایک لمبا خلا کا احساس تھا۔

"نجم۔!" اس نے باہر پھیلے ہوئے اندھیروں میں گھورتے ہوئے آہستہ سے کہا: "نجم ـــ نجم بیٹے!"

اس کی لرزتی کانپتی اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی آواز چپکے سے ہانپتی ہوئی کمرے میں لوٹ آئی۔ کوئی جواب! ـــ کوئی آواز!!

اس نے آہستہ سے گردن گھما کر بڑے اذیت ناک انداز میں کمرے میں نظر دوڑائی۔ پلنگ پر نجم کے میلے کپڑے پڑے تھے شیلف میں نجم کی کاپیاں کتابیں بکھری پڑی تھیں فرش پر نجم کی دوات اوندھی پڑی تھی۔ کھلی ہوئی الماری میں اس کے کھلونوں کا خالی ڈبہ اوندھا پڑا تھا۔ دیوار پر نجم کے ہاتھوں سے بنی ہوئی بلی کی ایک بھدی سی رنگ دار تصویر لٹک رہی تھی اور ... تنہائی کا پھیلا ہوا چپ دار جال بڑے واضح انداز میں اس کے احساس تنہائی کو فروغ دے رہا تھا۔ آہستہ سے جھک کر اس نے فرش پر الٹی ہوئی دوات اٹھائی اور کانپتے ہاتھوں سے شیلف پر رکھ دی۔ دوات اٹھاتے ہوئے اسے یوں لگا تھا جیسے نجم نے سہم کر غیر یقینی انداز میں دوات کا سہارا لیا ہے اور اب وہ بائیں ہاتھ کی تھرتھراتی انگلیوں میں نجم کو پکڑے ہوئے [illegible] پکڑ رہا ہے ـــ دوات کے بعد جب اس نے پلنگ پر ٹنگی ہوئی نجم کی قمیص اتاری تو یکایک قمیص کی جیب میں سے کانچ کی رنگ دار گولیاں کھٹاکھٹ فرش پر گر کر بکھریں اور بیٹھ گئیں ـــ اپنے مخصوص انداز میں فرش پر بکھری ہوئی گولیاں [illegible] نے کمرے میں پھیلی ہوئی تنہائیوں سے کہا "نجم کہیں نہیں" ـــ اس کے ہر نقش سے ابھی بھی حسرت و بیکراں تنہائی ٹپک رہی تھی۔

ـــ وہ سر تھام کر [illegible] جب نجم سے پہلی بار ملا تھا ـــ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کی روح تو ہل گئی ۔ لیکن سکون نہ تھا ۔ خالد میرا اکلوتا بیٹا جب وہ شام کو اپنے فلیٹ میں آ کر پلنگ پر
[illegible] بیک اور گھٹن ہو گی تنہائیاں اس کے احساس سے لپٹ لپٹ کر اسے مجبور کر جاتیں ۔ اسے تو مرحوم بیوی اور معصوم خالد
یاد آتا ۔ اور تب وہ سوچتا کہ آزادی کے اس ترازو میں کسی نے زندگی اور کسی کے مقدر کا پلڑا تھام لیا ۔ ربایہ رات سے گئے تک جاگتا
[illegible] وہ ہاتھوں میں آزادی کی ترازو ہے ۔ جس میں ایک طرف اس کا گھر بار بیوی بچے تل رہے ہیں اور دوسرے پلڑے میں [illegible]
میں خالد [illegible] مکان، خوراک اور لباس دے کر دونوں پلڑوں کو برابر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔
خیالات سے بے پناہ ہجوم سے تنگ آ کر وہ شہر کی سڑکوں پر یونہی بلا مقصد ٹہلنے نکل جایا کرتا ۔ مکمل سات سال سے وہ تنہائی
بے کیف اور لوگوں کا ازدحام دیکھتے دیکھتے وہ اکتا گیا ۔ یکسانیت نے اس کے رگ و پے میں بے انجمن اور گھٹن کا ایک تہہ در تہہ
جال سا پھیلا دیا ۔ کرۂ ارض اسے ربڑ کے گیند سے کمتر محسوس ہونے لگا آسمان کی نیلاہٹیں اور شفق کی لالی اسے اپنے ارمانوں کا خون
معلوم ہونے لگیں اور ایک ازلی ابدی جمود اسے خود پر پھیلتا محسوس ہوا پھر گلی میں کھیلنے والوں بچوں میں ہر ایک کے چہرے پر اسے
خالد کی صورت کا گماں ہونے لگا ۔ ہر بچے کی چال ڈھال اور بول چال میں اسے خالد کی پرچھائیاں سی نظر آتیں اور [illegible]
میں خالد کا کٹا ہوا خون سے لبریز گلا اور خوف سے پھٹی ہوئی ابا کو پکارتی ہوئی آنکھیں نظر آنے لگیں۔

اب اس میں ایک نمایاں تبدیلی ہوئی ۔ پہلے وہ بچوں کو نظر انداز کر کے خاموشی سے اپنے خیالوں میں گم گزر جایا کرتا تھا [illegible]
لمحوں کے ساتھ ساتھ وہ بچوں میں بڑی گہری دلچسپی لینے لگا ۔ ہر وہ بچہ اس کی توجہ کا مرکز بن جاتا جس میں خالد کی ہلکی سی جھلک بھی اسے محسوس
ہوتی ۔ کچھ لوگ اس کی حد سے بڑھی ہوئی محبت کو غلط رنگ میں پیش کرتے ۔ کچھ شادی کر کے گھر بسانے کا مشورہ دیتے ۔ اور کچھ ایسے بھی تھے
جو اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس کی خانہ بربادیوں اور تنہائیوں پر غم کا اظہار کرتے ۔ لوگوں سے اپنی داستان غم بیان کرتے کرتے اکثر وہ
بڑے حسرت بھرے لہجے میں کہتا "میرا جی چاہتا ہے کہ میں شادی کر لوں ۔ لیکن پھر مجھے عذرا کا خیال آ جاتا ہے ۔ مرتے دم اس نے کہا تھا
کہ خالد کے مستقبل کے لئے آپ کو شادی کا خیال دل سے نکال دینا ہوگا ۔ لیکن خالد کی اجل اس کے سر پر کھڑی ہنس رہی تھی ۔ عذرا رخصت ہوئی
تو اجل کے بے رحم ہاتھوں نے مجھ سے میرا خالد بھی چھین لیا ۔ میرا سکون بھی چھین لیا ۔ میری خوشیاں میری تمنائیں بھی چھین لیں ۔
شادی میں اس لئے نہیں کرنا چاہتا کہ مجھے محشر میں عذرا کو بھی منہ دکھانا ہے ۔" اس کی یہ سرد پا طولانی منطقیں لوگوں کی سمجھ میں نہیں
آتی تھیں ۔ وہ شرعی جواز پیش کرتے کرتے تھک گئے تھے لیکن یہ عجیب آدمی ان کے علم و ادراک سے واقعی بالاتر تھا۔
[illegible] سرمئی غبار آلود وہ سی شام جب پہلی بار اسے نجم ملا تھا ۔ نجم کو دیکھ کر فرط حیرت و مسرت سے اس کے سارے جسم پر لرزہ سا طاری ہو
گیا تھا ۔ نجم تو بالکل خالد کا ہم شبیہ تھا ۔ وہی ہونٹ ۔ وہی آنکھیں ۔ وہی بھورے بھورے بکھرے بال ۔۔۔
اور جب نجم نے بوٹ پالش کا ڈبہ کھڑکھڑا کر کہا "بوٹ پالش" کی صدا بلند کی تو اس کے لطیف و نازک خواب کے آبگینے پر جیسے
سے کوئی پتھر گرا تھا۔
بیٹے ۔۔۔!" اس نے جذبات کے تلاطم پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بڑی مسرت [illegible]
تھا "تم کہاں رہتے ہو بیٹے ۔ تمہارے ماں باپ ہیں ۔۔۔ میرے ساتھ چلو گے بیٹے ۔ بولو ؟"
اور جب نجم نے خالد کے سے انداز میں بڑے بھولپن سے بتایا تھا کہ اس کا اس بھری پری دنیا میں کوئی نہیں [illegible]
محسوس ہوا ۔ نجم کی کہانی بڑی دردناک تھی ۱۹۴۷ء کے خونیں ہنگامے میں ایک رات پاکستان کی جستجو میں ایک تنہا سا گھبرایا ہوا گھر [illegible]

کے بل چلتا ہوا' پہریدار سپاہیوں کی ٹانگوں میں الجھتا ہوا مملکت خداداد میں بغیر اجازت داخل ہو گیا۔ اور تب سے اب تک وہ بڑھتے شعور کے ساتھ ساتھ بدستور بادِ صبا کے لطیف جھونکے کی طرح دیوانہ وار پھرتا رہا تھا۔

نجم کے ساتھ ساتھ ایک شور مچاتے نالے کے پل پر سے چلتے ہوئے اس نے نجم کے گلے میں لٹکا ہوا بوٹ پالش کا سیاہ ڈبہ فضا میں اچھال کر نیچے شور مچاتے اور جھاگ اڑاتے نالے میں پھینک دیا تھا۔ اور نجم کے چہرے پر بکھری ہوئی مایوسیاں دیکھ کر بڑے عزم سے کہا تھا "بیٹے آج سے اپنی پرانی زندگی کی تمام تلخیوں کو بوٹ پالش کے اس سیاہ ڈبے کی طرح نالے میں پھینک کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو — اب تم بوٹ پالش نہیں کرو گے میرے خالد بن کر رہو گے۔ اب تمہیں ایک نئے ماحول میں ایک نئے سانچے میں ڈھلنا ہوگا — اور نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تم اپنے وجود سے ماضی کا سارا بوسیدہ لباس نوچ کر پھینک دو —"

اس نے نجم کو اپنے چھوٹے سے گھر کی ہر شے دکھائی۔ "یہ میرا کمرہ ہے۔ یہ غسل خانہ ہے۔ یہ کھڑکی ہے۔ یہ الماری ہے۔ یہ تپائی ہے یہ شیلف ہے۔ اور یہ —" اس نے دیوار پر فریم میں لگی ہوئی خالد کی ایک بڑی سی تصویر دکھائی — "اور یہ میرے خالد کی تصویر ہے"

نجم بڑی دیر تک خالد کی تصویر دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں پھیلی ہوئی حیرت دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ آئینہ دیکھ رہا ہے۔

نجم کو سدھارنے میں اسے خاصی وقت پیش آئی — شروع شروع میں نجم اسے بابوجی کہا کرتا تھا — یہ خطاب اسے پگھلے ہوئے سیسے سے زیادہ گرم اور ننگی گالی سے زیادہ اذیت ناک محسوس ہوا۔

"اونہہ — یہ بابوجی کیا ہوا" اس نے ہونٹ بیکر کر مصنوعی ناراضگی سے کہا تھا۔ "تم مجھے اباجی کہا کرو — سمجھے — کہو ابا — جی؟ ابا —؟" نجم کو یہ لفظ بڑا غیر مانوس سا معلوم ہوا۔ آج تک وہ ہر سفید پوش کو بابوجی کہتا آیا تھا۔ تاہم اس نے اپنی حیرت پر قابو پا کر اس کی خوشنودی کے لئے اسے اباجی کہنا شروع کیا۔ نجم کے ہونٹوں سے "اباجی" کا گرانقدر خطاب سن کر وہ فرطِ مسرت سے بے قابو ہو جاتا اس کی انگلیاں تھر تھرا تھرتھرا کر نجم کے بالوں میں پیار سے کنگھی کرتے رہتیں اور اسے ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اپنے امرتسر والے گھر میں ہے اور خالد کے بالوں میں پیار سے کنگھی کر رہا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے وہ ماضی کی تمام تلخیاں' سارے دکھ' سارے داغ بھول جاتا اسے یوں لگتا جیسے وہ کبھی آگ اور خون کے سیلاب نما سمندر سے نہ گزرا ہو جیسے اس کی ہر شے ہر احساس ہر خوشی صحیح سلامت ہو۔ کتنی آسودگی' کتنا سکون' کتنی اپنائیت تھی اس تخاطب میں۔ اباجی —!

نجم نے اسے اباجی کہنا سیکھ لیا تو اس پر ایک نیا انکشاف ہوا۔ نجم سگریٹ نوشی کا عادی تھا۔ ایک' دو بار اس نے یونہی نظر انداز کر دیا۔ پھر ایک دن اس کی سگریٹ کی ڈبیا باہر پھینک آیا۔ نجم کی متلاشی آنکھوں میں چھپا ہوا اضطراب دیکھ کر اس نے بڑے پیار سے کہا۔ "بیٹے نجم! تم بہت اچھے بیٹے ہو — اور اچھے بچے سگریٹ نہیں پیا کرتے — ہے نا — ہاں دیکھو میری بات سنو — آج سے تم سگریٹ کو ہاتھ تک نہیں لگاؤ گے — وعدہ رہا نا —؟"

نجم کے لئے اس نے شیر فروش کو خاص ہدایات دیں۔ اب نجم کو صبح و شام گاڑھا' میٹھا' لذیذ دودھ اور سرخ سرخ شیرہ ٹپکاتی جلیبیاں ملنے لگیں — ڈھکے چھپے اس نے ایک آدھ بار عادت سے مجبور ہو کر سگریٹ پیا بھی لیکن پھر رفتہ رفتہ عادت خود ہی چھوٹ گئی — بے فکری اور خوراک کی فراوانی نے نجم کے سانولے گالوں پر گہرے سرخ گلاب سے کھلا دیئے۔ مسلسل نکتہ چینیوں سے اس کا اکھڑ لہجہ شستہ اور لطیف ہو گیا۔ نجم تو گویا بالکل ہی بدل گیا —!

لیکن نجم کے ساتھ ساتھ اس میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ پہلے وہ شام کو یا رات کو تھکا ہارا دفتر سے آیا کرتا تھا اب اس کا زیادہ

تو وقت گھر میں بسر ہونے لگا۔ ملنے جلنے والوں نے اس کی یہ نمایاں تبدیلی محسوس کر کے اس سے استفسارات کئے تو وہ بڑے فخر بڑی مسرت سے بولا "بھئی معاف کیجئے گا۔ گھر میں میرا بیٹا انتظار کر رہا ہوگا۔ اب چلتا ہوں کہیں اسے بھوک نہ لگی ہو" اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا احباب کو حیران و ششدر چھوڑ کر دور تک پھیلی ہوئی سڑک کی نیلاہٹوں میں گم ہو جاتا۔ سینما ہال ہو یا تھیٹر، سرکس ہو یا میلہ، جلسہ حمایت الاسلام ہو یا بڑے غلام علی کی کلاسیکی موسیقی، نجم ہر جگہ ہر مرحلے ہر تقریب میں اس کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ بڑے فخر سے گردن اکڑائے نجم کی انگلی پکڑے چلتا تھا۔ اس کی اس ڈکٹیٹر شپ پر نجم کو بڑی کوفت ہوتی۔ وہ خیر سے بارہ برس کا تھا کیا اسے خود پیدل چلنے کا آزادانہ حق نہیں تھا "اونہہ۔ نک اباجی!" وہ اپنی انگلی چھڑاتے ہوئے کہتا "مجھے چھوڑئیے نا۔ میں چل تو رہا ہوں نا۔ نہیں خالد" وہ نجم کو بعض اوقات اپنی رو میں خالد کہہ جاتا تھا "نہیں بیٹے! تم اسی طرح میری انگلی پکڑے چلتے رہو۔ ہاں!"

احباب سے وہ نجم کا تعارف کراتے ہوئے وہ نجم کے بالوں پر آہستہ آہستہ پیار سے ہاتھ پھیر کر کہتا "یہ میرا بیٹا ہے۔ نجم الدین خالد!" نجم الدین خالد اس کی ذہنی اپچ تھی۔ یہ الگ بات کہ نجم اس خطاب پر حیرت سے پلکیں جھپکا کر رہ جاتا۔ اسکول کے رجسٹر میں بھی اس نے یہی نام لکھوایا تھا "بولو۔ نام نجم الدین خالد۔ ولدیت؟" نجم کے کلاس ٹیچر نے عینک پیشانی پر چڑھا کر پوچھا تھا۔

"میرا نام لکھئے صاحب" اس نے بڑے اعتماد سے نجم کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا تھا۔ اور ولدیت کے خالی خانے میں اس کا نام جگمگانے لگا۔ سفید پتلون اور سرخ کوٹ میں ملبوس بستہ گلے میں ڈالے جب وہ نجم کو اسکول جاتے دیکھتا تو بے ساختہ "چٹ" سے بارہ برس کے نجم کی پیشانی چوم لیتا۔ اور جب تک نجم ٹریفک کی بھیڑ بھاڑ میں گم نہ ہو جاتا وہ دروازے کے پٹ سے ٹیک لگائے نجم کو دیکھتا رہتا۔ دیکھتا رہتا!!!

ایک دن نجم اسکول سے واپس آیا تو بہت چپ چپ، اداس اداس تھا۔ بستہ الماری میں پھینک کر وہ چپ چاپ خاموشی سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ نجم کو دیکھ کر وہ چونکا "کیا ہوا بیٹے۔ کیا بات ہے۔ ایں۔ کسی نے مارا ہے۔؟"

"اوں۔ ہونہہ!" نجم نے کپکپاتے ہونٹوں سے کہا پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

"ارے۔ ارے تم رو رہے ہو۔؟" وہ جلدی جلدی نجم کے آنسو پونچھنے لگا! نجم نے ہچکیاں لے لے کر بتایا کہ بہت سے لڑکے اسے جانتے ہیں اور "بوٹ پالش والا" کہہ کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس پر آوازے اور پھبتیاں کستے ہیں! اسے اپنے سینے میں درد کا سمندر انگڑائیاں لیتا محسوس ہوا۔ نجم کے آنسو پونچھ کر اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلا کر وہ احساس کی تلخی دور کرنے کے لئے نجم کو پڑھانے بیٹھ گیا۔ لیکن نجم کے کہے ہوئے الفاظ اسے کچوکے دیتے رہے "اور اباجی لڑکے کہتے ہیں تیرا کوئی باپ نہیں ہے تو تو بوٹ پالش کرنے والا چھوکرا ہے۔ تجھے پڑھائی سے کیا مطلب۔ بوٹ پالش کر۔"

اگلے دن وہ نجم کے ساتھ اس کے اسکول گیا۔ لان میں کھیلتے ہوئے بہت سے بچوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں "وہ بوٹ پالش والا آ گیا۔ بوٹ پالش والا۔" اس نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو ساری داستان سنائی۔ وہ بڑی فرعونیت سے اپنی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر بیٹے "بات یہ ہے جناب کہ ہمارے سکول میں شرفا کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں اس سچوایشن میں۔ میرا مطلب ہے ایک مچھلی سارے تالاب کو۔ دراصل بات یہ ہے کہ جناب آپ نے دھوکہ دہی سے کام لیا ایک تو ولدیت کے بارے میں فراڈ کیا دوسرے ایسا تھرڈ کلاس لڑکا......" "خبردار" اس نے گرج کر کہا تھا "زبان سنبھال کر بات کیجئے ورنہ میں آپ کی زبان کاٹ کر پھینک دوں گا۔ ہونہہ تھرڈ کلاس لڑکا۔ ذرا مجھے فرسٹ کلاس لڑکے کو تو دکھایئے۔ ذرا جائزہ تو دیجئے کہ ہیڈ ماسٹر بننے سے پہلے آپ کیا تھے۔ آپ مجھ سے بات کرنے چلے ہیں۔ مجھ سے؟"

اور وہ تیز تیز چلتا ہوا نجم کی انگلی پکڑے گھر آگیا تھا —!!

اس رات نجم اپنے کھٹولے پر لیٹا کروٹیں بدل بدل کر سسکیاں لیتا رہا اور وہ نجم کو روکھے پھیکے سپاٹ لہجے میں لطیفے سنا کر ہنسانے کی کوشش کرتا رہا خود اسے رونا آرہا تھا۔ دل میں جیسے جوار بھاٹا اچھل اچھل کر اسے رونے پر مجبور کر رہا تھا لیکن وہ رویا نہیں اپنے آنسوؤں کو بے روح مسکراہٹوں کے پردے میں چھپا کر وہ نجم کو تسلیاں دیتا رہا۔ پھر جب دور گھڑیال نے بارہ بجے کا اعلان کیا تو نجم کو نیند آگئی — زرد بلب کی روشنی میں اسکی بند آنکھوں سے ابھار دار گالوں تک آنسوؤں کی نمی چمک رہی تھی۔ سوتے میں اس کے ہونٹ بڑی معصومیت سے نیم وا ہو کر ہلکا سا خم کھا گئے تھے اور اس کے چہرے پر چودہ ماہ کے بچے کا ہلکتی بھولپن بکھرتا چلا گیا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ نجم کی پڑھائی کچھ عرصہ کے لئے چھوٹ گئی نئے اسکول میں بھی یہی مصیبت پیش آئی۔ اسکول کا خزانچی نجم کو جانتا تھا تھوڑے تھوڑے وقفہ سے نجم نے کئی اسکول بدلے۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی لڑکا اس کی گزشتہ زندگی سے واقف ہوتا اور یوں وہ دوسرے لڑکوں کے مذاق کا ہدف بن جاتا۔ تنگ آکر نجم نے اسکول کی پڑھائی کا خیال چھوڑ دیا۔

جب وہ شام کو تھکا ماندہ گھر آتا تو نجم کو گلی میں اوباش لڑکوں کے ساتھ کھیلتے دیکھتا۔ نجم ایک بار پھر اپنی گزشتہ زندگی میں دھیمے دھیمے لوٹ رہا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ تعلیم سے محرومی کی بنا پر ہوا تھا۔ نجم کے میلے کپڑے اور بکھرے بکھرے بال دیکھ کر اسے بڑا دکھ ہوتا ایک بار پھر نجم کی بگڑتی عادتیں دیکھ کر اسے تشویش ہونے لگی۔ اکثر وہ نجم کو بڑے پیار سے سمجھایا کرتا کہ کھیل کود میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اسے پڑھائی میں دل لگانا چاہیئے۔ لیکن نجم پر صرف چند لمحوں کے لئے اس کے پند و نصائح کا اثر ہوتا اور بس — جیسے نیلش لائٹ کے جھماکے سے ایک لمحے کے لئے سارے میں چکاچوند روشنی پھیل جائے اور پھر دوسرے ہی لمحے گاڑھا سیاہ گھور اندھیرا پھیلتا چلا جائے !—

ایک شام اسے فرش پر ادھ جلی سگرٹوں کے متعدد ٹکڑے نظر آئے۔ نجم نے ایک بار پھر سگریٹ نوشی شروع کر دی تھی۔ چند لمحوں تک وہ خاموش کھڑا نجم کو دیکھتا رہا۔ پھر جھک کر اس نے ادھ جلی سگرٹوں کے ٹکڑے جمع کئے اور انہیں کھڑکی سے باہر پھینک کر بولا "نجم بیٹے! کل سے تم میرے ساتھ دفتر چلا کرو گے!" "کیوں۔ کیوں ابا جی" نجم نے اپنی پلکیں جھپکتے ہوئے پوچھا۔

"بس یونہی —" وہ بس کو لمبا کرتے ہوئے بولا "تمہارے بغیر میرا جی کام میں نہیں لگتا بیٹے۔ تم میرے پاس بیٹھ کر اپنا سبق یاد کرو گے اور میں دفتر کا کام کیا کروں گا۔ ٹھیک ہے نا بیٹے؟" —

اگلے دن وہ نجم کو اپنے ساتھ دفتر لے گیا — نجم سارا دن بڑی خاموشی بڑے انہماک سے اس کے قریب بیٹھا سبق یاد کرتا رہا۔ چھٹی ہوئی تو اس نے نجم کا تعارف اپنے دوستوں سے کرایا۔ "یہ میرا بیٹا ہے — نجم الدین خالد!"

الیاس صاحب اسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے آہستہ سے بولے — "شاید میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے —"

اس کا دل دھڑکنے لگا۔ بٹ صاحب چٹکی بجا کر بولے — "ارے یہ — یہ تو بوٹ پالش کرتا تھا پہلے — کیوں لودھی صاحب یاد ہے وہ "ٹیشن" والی بات؟" لودھی صاحب کو ٹیشن والی بات یاد تھی! بولے — "ہاں ہاں — جب یہ بوٹ پالش کے آٹھ آنے مانگتا تھا حالانکہ عام ریٹ دو آنہ ہے۔ کیوں الیاس صاحب؟" اس کے دل میں جیسے آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اس نے بڑی بے بسی بڑی بے چارگی سے نجم کو دیکھا۔ نجم کی آنکھوں میں آنسوؤں کے کئی قطرے جھلملا رہے تھے! ایک لمحہ کے لئے اسے یوں لگا جیسے بھرے بازار میں کوئی بے غیرتی

ہاتھ اس کے جسم پر سے لباس کھینچ رہا ہے ۔ وہ عریاں ہو رہا ہے ۔۔ وہ بھرے بازار میں عریاں ہو رہا ہے ۔۔!!
درد کی کئی لہریں اس کے چہرے پر سے بل کھاتی گزر گئیں ۔ نجم آہستہ سے پلٹا اور سر جھکائے تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ گیا!
" نجم بیٹے ۔۔۔ !" اس کے اندر چھپے ہوئے حساس باپ نے تڑپ کر کہا " نجم بیٹے ۔ نجم بیٹے ۔" !!! وہ نجم کے تعاقب میں بھاگنے لگا ۔ ایک جگہ ایک کر جا لیا اور پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان بولا " تت ۔ تم ۔ کہاں جا رہے ہو بیٹے ۔؟"
نجم چپ رہا ۔ البتہ اس کی آنکھوں سے پارہ کی طرح لرزتا ہوا آنسو کا ایک قطرہ ٹپ سے آستین پر گر پڑا ۔ وہ نجم کو تقریباً گھسیٹتا ہوا گھر آیا ۔
گھر آ کر نجم دھم سے کھٹولے پر گر پڑا اور پھر اسکی آنکھوں کا رکا ہوا بند ٹوٹ گیا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا!
نجم کی ہچکیوں میں بے پناہ درد تھا ۔ سسکیوں میں فریاد کا سا انداز تھا اور آنسوؤں میں طبقاتی تقسیم کے خلاف ٹھوس اور اٹل احتجاج تھا!
وہ نجم کو بہلانے لگا' اس کے آنسو پونچھنے لگا' اس کے بالوں پر دھیمے دھیمے ہاتھ پھیرنے لگا ۔ لیکن نجم کی ہچکیاں نہ تھمیں' اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا ۔ دل کے نازک آبگینے پر جب پے در پے شدید چوٹیں لگتی رہیں تو اس کی سالمیت خطرے میں پڑ جاتی ہے جب داغوں میں اضافہ ہوتا چلا جائے' جب زندگی معصوم مسکراہٹیں چھینتی چلی جائے جب محبت کو زنجیروں اور دیواروں میں محبوس کر دیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ آنسوؤں کی صورت میں نکلتا ہے ۔ اور نجم کے پاس آنسوؤں کے سوا اور کیا تھا؟
وہ نجم کو منانے کے لئے اس کا احساس غم مٹانے کے لئے باہر پھل اور مٹھائی لینے چلا گیا ۔ کل ہی اسے تنخواہ ملی تھی اور آج اسکی جیب خاصی بھاری تھی ۔ اس نے نجم کے لئے رنگ ارنگی والے خوشبودار چاکلیٹ خریدے' گلاب جامنوں کا ایک لفافہ خریدا' سرخ کشمیری سیب خریدے اور گلی کے موڑ سے گزرتے ہوئے اس کے لئے نئے چمک دار بوٹ خرید لئے ۔ کچھ آگے چل کر اسے کچھ خیال آیا تو وہ کلکتہ ریڈی میڈ سینٹر میں داخل ہو گیا ۔ یہاں سے اس نے نجم کے لئے ایک رنگین پھولدار بوشرٹ اور نیلی پتلون خریدی پھر وہ اسباب سے لدا پھندا گلی میں آیا ۔ اس نے سوچا ؛ نجم اتنی ڈھیر ساری چیزیں دیکھ کر کتنا خوش ہو گا ۔ فلیٹ کی چوبی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص لہجہ میں زور سے پکارا ! " نجم بیٹے ۔ دیکھو میں تمہارے لئے کیا لایا ہوں !"
اس کی آواز چوبی زینے سے ٹکرا کر فلیٹ میں گھوم کر واپس پلٹ آئی ۔۔ خلافِ توقع نجم نہیں آیا ، اور جب وہ سامان سے لدا پھندا فلیٹ میں داخل ہوا ۔۔۔ وہاں کوئی نہیں تھا ! تپائی پر کاپی میں سے پھاڑا ہوا ایک ورق پھڑ پھڑا رہا تھا :

" ابا جی ! آپ بہت اچھے ہیں ۔۔ بہت بہت اچھے ہیں ۔ اور ابا جی میں تو بہت برا لڑکا ہوں میں بوٹ پالش والا چھوکرا ہوں نا اسی لئے میں جا رہا ہوں ۔۔۔ اب میں کبھی نہیں آؤں گا !

آپ کا بیٹا ۔ نجم الدین خالد بوٹ پالش والا

یکایک اس نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر زور سے پکارا " بیٹے ۔ نجم بیٹے ۔ میرے نجم بیٹے !"
اس کی لرزتی تھرتھراتی آواز تاریکی میں ڈوبی ہوئی گلیوں سے ٹکرا کر واپس لوٹ آئی ۔ اور تب اس نے سوچا کہ وہ کرۂ ارض کے گلوب پر بالکل تنہا کھڑا ہے اور اس کے گرد ازلی ابدی گھور اندھیرا اور تنہائی ہے ۔ گہری اور یخ بستہ اور منجمد تنہائی !! ۔۔۔

---

یوسی دیووف

ترجمہ

سید رضا کاظمی

# نیا سورج

(روسی کہانی)

اُفق کی گہری لکیر سے لگی ہوئی کھمبوں کی قطار اس طرح نظر آ رہی تھی جیسے کہیں ختم ہی نہ ہوگی۔ ندی پر سے گزرتی ہوئی بڑے بڑے پہاڑوں پر چڑھ کر میدانوں میں اترتی ہوئی ایک ایک گاؤں کو پرکھتی ہوئی کسی موڑ یا چوراہے پر اپنا رخ بدل دیتی اور پھر سر اٹھائے۔ اتراتی۔ اٹھلاتی بہتی چلتی ٹیلوں پر چڑھنے لگتی۔ بڑے بڑے پہاڑوں کی طرف بڑھنے لگتی!

بوڑھی انکا نے بھی ایک دن جب اس قطار پر نظر ڈالی اور اس پر غور کیا تو انھیں بھی ایسا ہی احساس ہوا۔ انھوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ مگر یہ — یہ اتنا تانبہ ان لوگوں کو کہاں سے ملا ہو — افوہ — اتنی لانبی قطار۔ اتنا سارا تانبہ — آخر کہاں سے ....؟

اس دن سے پہلے وہ ان قطاروں کے نیچے سے بس یونہی گزر جاتی تھیں بغیر ان کے بارے میں کچھ سوچے۔ یہاں تک کہ ایک کھمبہ خود ان کے اپنے احاطے میں گاڑ دیا گیا۔ انھوں نے سوچا کہ یہ سب کچھ تو بس امیروں کے لئے ہے کہ وہ لوگ ان تاروں کے ذریعہ ایک دوسرے سے باتیں کر سکیں۔ ایک دولتمند اس سرے پر دوسرا اس سرے پر۔ اور دونوں چیخ رہے ہیں زور زور سے تاکہ ایک دوسرے کی باتیں سن سکیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

لیکن اس کے بعد جب انھوں نے یہ دیکھا کہ تاروں کو کسی کے مکان تک کھینچ دیا گیا اور چھت میں شیشے کی نہ جانے کیا گول سی چیز لٹکا دی گئی۔ پھر ایک ننھا سا بٹن دبایا — اور کھٹ سے روشنی ہو گئی تو بوڑھی انکا کی حیرت و پریشانی کی حد نہ رہی۔ انھوں نے جلدی سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا!

آخر کار جب روشنی نے خود ان کے گھر پر دھاوا بولا اور ان کا سارا گھر روشنی سے بھر گیا۔ مرغا اڑ کر ڈیوڑھی پر جا بیٹھا اور بانگ دے دے کر مہمانوں کو خوش آمدید کہنے لگا تو بوڑھی انکا نے جلدی سے جھاڑو اٹھالی اور گھر کی صفائی کرنے لگیں — تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ وہ سگھڑ نہیں ہیں۔

اور پھر ان کے گھر ایک آدمی آ ہی پہونچا۔ وہی قطاریں لگانے والا بجلی کا مستری جو بیل کی طرح پلٹنے والے تاروں کے گچھے لیکر مکانوں کی چھتوں پر چلا کرتا تھا! — وہ اندر آیا۔ ایک نظر میٹھی روشنی پر ڈالی پھر بوڑھی انکا کے جھریوں بھرے چہرے کو دیکھا اور بولا: "اب ٹھیک ہوا۔ سن کا ڈبہ غائب اور اس کی جگہ آپ کی چھت میں سورج آکر لٹک گیا"

"ہاں اب ٹھیک ہوا"

پھر اس مستری نے بوڑھی انکا کے حق میں یہ دعا کی کہ اس سورج اور اس روشنی تلے وہ بہت دنوں تک زندہ رہیں۔ اور جب تک کہ اس

نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔

یہ تمام باتیں بوڑھی النکا کی سمجھ میں نہ آئیں ـــ پہلے روشنی بخشنا اور پھر ان کے ہاتھوں کو بوسہ دینا ـــ آخر یہ سب کیا ہے ؟ ـــ وہ صرف بڑبڑا کر رہ گئیں ـــ تم ـــ تم تو بالکل میرے شوہر دردمیداؤن کی طرح ہو۔ وہ بھی یونہی شرمایا کرتے تھے۔ الھڑ دوشیزاؤں کی مانند!

اور جب بجلی والا چلا گیا تو بوڑھی النکا کمرہ کے وسط میں کھڑی کھڑی ہنس پڑیں ـــ ارے مجھ پر خدا کی مار!

اور ساتھیں ایکدم افسوس ہونے لگا کہ وہ اتنی بوڑھی ہو گئی ہیں اور اس وقت اتنی بڑی خوشی میں شریک ہونے والا کوئی نہیں ہے وہ باہر نکل گئیں اور پڑوسیوں سے کہنے لگیں کہ سورج ان کے گھر میں اتر آیا ہے لیکن پڑوسیوں نے کندھے اچکا کر صرف اتنا ہی کہا ـــ تو کون سی بڑی بات ہو گئی جیسے ہمارے گھروں میں تو سورج تھا ہی نہیں!

بوڑھی النکا گھر واپس چلی آئیں اور بنچ پر بیٹھ گئیں تو احساس ندامت سے ان کا جسم پسینہ سے شرابور ہو گیا۔ ہائے۔ وہ بجلی والے کے سامنے صرف ہکلا کر رہ گئیں تھیں کمرے میں ادھر ادھر پھڑپھڑاتی پھریں جیسے کوئی مرغی نشہ میں ہو۔ باہر سڑک پر جا کر اترانے لگیں اور یہ نہ کیا کہ جلدی جلدی سب کام کر لیتیں اور بجلی والے کے لیئے "آلونسی" (ایک قسم کا پڈنگ) پکا کر تیار کر دیتیں تاکہ اس لڑکے کو یہ پتہ چل جاتا کہ وہ کیسی گھر گرہست ہیں۔ اس وقت تو وہ کہیں اور بیٹھا ہوا دعوت اڑا رہا ہو گا ـــ اف کیسی غلطی ہو گئی یکا یکی دوسرے نے اسے کھانے کی دعوت دیدی ہے ؟ ـــ انھیں چین نہ آیا اور وہ پڑوسیوں کے گھروں میں جھانکنے لگیں۔

ہر جگہ پردوں سے روشنی چھن رہی تھی ـــ وہ بجلی والا کس گھر میں کھانا کھا رہا ہو گا ؟

دفعتاً انھوں نے دیکھا کہ بجلی والا میم پلمر کے گھر میں داخل ہو رہا ہے۔ بوڑھی النکا کو سخت غصہ آیا اور وہ اپنے آپ کو کوسنے لگیں ـــ دیکھا النکا ! تو ہمیشہ دیر سے جاگتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا تیرے بجائے پلمر کی بیوی کو یہ سعادت نصیب ہوتی کہ بجلی والے کی دعوت کرتی ؟

وہ سخت طیش کے عالم میں اپنے گھر واپس ہوئیں۔ جونہی انھوں نے بٹن دبایا کمرہ روشنی میں نہا گیا اور انکی نظریں اپنے شوہر کی پرانی تصویر پر جا کر ٹھہر گئیں۔ دونوں نے بہت کم دن ساتھ گزارے تھے۔ تقریباً تین سال۔ اور عین اس وقت جب ان کے اچھے دن آنے والے تھے بادشاہوں نے ایک دوسرے کو منھ چڑانا شروع کیا۔ منھ چڑاتے چڑاتے ایک دوسرے کو گالیاں دینے پر اتر آئے اور پھر انھوں نے تلواریں کھینچ لیں اور تلواریں یہاں تک کھنچی رہیں کہ سیکڑوں بیگناہ انسان گردن گردن خون میں ڈوب گئے!

بوڑھی النکا کے شوہر نے بھی اپنے تھیلے میں بھنی مکئی کی روٹی ڈالی۔ تھیلا کاندھے پر لٹکایا اور ڈیوڑھی سے نکل کر النکا سے کہا ـــ "اگر میں واپس نہ آؤں تو تم دوسری شادی کر لینا" ـــ اور وہ ایسا گیا کہ پھر اسے واپس آنا نصیب نہ ہوا!

کئی سال بعد جب خون پی پی کر بادشاہوں کی پیاس بجھ گئی تو انھوں نے اپاہجوں اور ساندھوں۔ قبرستانوں اور جلے ہوئے گاؤں کے اوپر سے ہاتھ بڑھا کر اپنے ہاتھ ملائے ا ـــ جب بادشاہ کھا پی کر سیر ہو چکے تو ایک دن بوڑھی النکا کو میئر کے ہاں سے بلاوا آیا۔

میئر نے کھڑے ہو کر النکا کو ایک تصویر دی جو حضرت عیسیٰ کی صلیبی تصویر کے مانند تھی اور اس کے چاروں طرف حاشیوں پر سونے کا پانی چڑھایا گیا تھا۔

النکا ایک دم اچھل پڑی کیونکہ وہ اس کے شوہر کی تصویر تھی۔ فوجی وردی پہنے۔ سفید گھوڑے پر سوار۔ ہوا میں تلوار گھماتا ہوا وہ نہایت جری انداز میں ایک بڑے قلعہ کی طرف گھوڑا دوڑاتا ہوا حملہ کر رہا تھا۔!

النکا نے ہجے کر کے پڑھا ـــ گھڑ سوار دستہ کا جانباز دوردمیداؤن ریولائی!

اس کے بعد میئر نے النکا کو تانبہ کا ایک تمغہ دیا جس پر ایک عقاب کندہ تھا۔ جس کی چونچ میں تلوار تھی۔ وہ اپنے زبردست پر پھیلائے مخالف ہواؤں کو چیرتا ہوا اڑ رہا تھا!

النکا نے ہولے سے کہا: "یہ دونوں چیزیں بہت خوبصورت ہیں لیکن میں تو پھر بھی یہی کہوں گی کہ آپ میرے شوہر کو مجھ سے ملا دیتے تو زیادہ اچھا ہوتا"

"دیکھو بات یہ ہے کہ ــــ یعنی" میئر ہکلانے لگا ــ "اس نے تو اپنی جان اس لئے دی کہ ۔۔۔۔۔۔"

"کہ بادشاہ لوگ عیش کریں؟ ــــ النکا کے منھ سے الفاظ آہستہ آہستہ پھسل رہے تھے ــ "میرا مظلوم دور میدون اگر اسے مرنا ہی تھا تو ۔۔۔۔۔۔

لیکن یہ تو برسوں پہلے کی بات ہے!

اس وقت النکا کمسن تھی اور اس کے دل میں یہ احساس قائم رہا کہ عہد پر عہد گزرتے جا رہے ہیں اور دور میدون اب تک اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا اس نامعلوم مستحکم قلعہ پر حملہ کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ تصویر کھینچنے والے نے کس طرح دور میدون کی تصویر کھینچی ہوگی جبکہ وہ تلوار سونتے ۔ گھوڑے کو ہوا میں اچھالتا ہوا قلعہ کے میناروں کی جانب لپک رہا تھا ــــ اور وہ اسی طرح اپنا گھوڑا دوڑاتا رہا ــــ دس سال گزرے ۔ بیس سال گزرے ۔ تیس سال گزرے ۔ اور وہ ابھی تک اپنی منزل پر نہ پہونچ سکا!

اس طرح کی خیالی تصویروں کو اپنے دل میں جگہ دے دے کر کمسن النکا اپنے شوہر کی موت کے درد کو دباتی رہی۔!

تصویر کے حاشیے پر چڑھے ہوئے سونے کے پانی کی جلا اڑ گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ کاغذ کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ بادشاہوں کے قلعہ پر حملہ کرنے والا بہادر دور میدون کے وجود میں صرف تلوار کی نوک ۔ کہنی کا ایک حصہ اور فراٹا بھرتے ہوئے گھوڑے کی اٹھی ہوئی ریشمی دم کی پھنگ باقی رہ گئی ۔ لیکن تانبہ کے تمغہ کو وقت کیونکر دھندلا سکتا تھا! وہ ابھی تک اسی جگہ ٹنگا ہوا تھا۔ عقاب کے پاؤں اسی طرح دیوار پہ پھیلے ہوئے تھے!

اسی شام بوڑھی النکا نے تمغہ کیل پر سے اتارا اور اسے رگڑ رگڑ کر مانجھا یہاں تک کہ تیز روشنی میں وہ جھلمل جھلمل کرنے لگا۔ پھر انھوں نے جست کے تمام برتنوں کو خوب مانجھا گھر میں ایسی عمدہ روشنی ہو اور پھر بھی گھر کی چیزیں آئینے کی طرح نہ چمکیں تو شرم کی بات ہے۔

آپ ہی آپ بڑبڑاتے ہوئے انھوں نے پیرافین سے جلنے والے لیمپ کو اس طرح اٹھایا جیسے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہہ رہی ہوں ــــ اب وہ دن گئے جب تمہاری قسمت کا ستارہ چمکا کرتا تھا!

لیمپ تنور پر رکھتے ہوئے ان کی کہنی سن کے ڈبہ سے ٹکرائی اور انھیں بجلی والے کی بات کا دھیان آیا ــ اب سن کا ڈبہ غائب اور اس کی جگہ سورج خود آکر آپ کی چھت سے لٹک گیا ہے ــــ ہاں اب ٹھیک ہوا!

"ہاں اور کیا؟" بوڑھی النکا نے دل ہی دل میں کہا ــــ اور رات گئے تک یہی خیال ان کے دماغ میں منڈلاتا رہا۔

ان کو یاد آیا کہ ان کے والدین کس طرح چقماق پر لوہا مار مار کر آگ جلایا کرتے تھے ــــ لیکن یہ تو پرانی بہت ہی پرانی بات ہے!

انھیں یہ بھی یاد آیا کہ جب وہ بالکل ننھی سی بچی تھی تو جہاں آج لہلہاتے سرسبز کھیت ہیں وہاں گھنا اندھیرا جنگل تھا اور اس میں شاہ بلوط کے بڑے بڑے درخت تھے جن کے تنے پیپوں کے برابر موٹے تھے۔ وہیں ان کے باپ نے اپنا گھر بنایا تھا۔ جب ان کی چھوٹی اور النکا کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا اندھیری تنہائیوں کی چوکیداری ہی ان کا کام تھا۔

بوڑھی النکا نے ایسی جگہ اپنا بچپن گزارا تھا جہاں ہرنوں کے غول دوڑتے دکھائی دیا کرتے تھے اور جاڑے کی طویل راتوں میں بھیڑیوں کی چیخیں دور دور تک گونجا کرتی تھیں۔ وہاں آگ کی ایسی حفاظت کرنی پڑتی تھی جیسے آنکھ کی پتلی کی۔ خاص طور پر اس وقت جب ان کے ابا جان ہرنوں کو جنگلی جانوروں کی دست برد سے بچانے کے لئے جنگل کے دوسرے حصوں میں چلے جایا کرتے تھے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ جلتی آگ پر ایک نیا اور موٹا لکڑی کا کندا اٹکا کر بچے سو گئے۔ بڑی گہری نیند میں۔ انھیں اتنی گہری نیند کیونکر آگئی یہ کسی کو نہیں معلوم۔ شاید درختوں کے سرسراتے پتوں نے انھیں لوری دی ہو یا گرمی کی خنک رات نے تھپک تھپک کر سلا دیا ہو۔ لیکن جب وہ جاگے تو آگ بجھ چکی تھی۔ اور لکڑی کا وہ موٹا کندا کسی درندے کی لاش کی مانند پڑا ہوا تھا۔ بچے گھبرا گئے اور دم بخود کھڑے رہے۔ جو شے انھیں گرمی بخشتی تھی ان کا کھانا پکاتی تھی۔ جاڑے کی طویل راتوں میں ان کے لئے روشنی فراہم کرتی تھی — وہ مر گئی تھی۔ کسی دوسرے گھر سے آگ مانگ لانے کا سوال ہی نہ تھا اس لئے کہ برف کے طوفان سے گزر کر کون جاتا اور راہ میں جنگلی جانوروں کا نوالہ بننے کا خطرہ کون مول لیتا؟

سب سے پہلے لکڑی کے ڈول میں رکھا ہوا پانی جما پھر بڑے کنڈال کا پانی جما اور پھر جب رات ہوئی تو سب بچے ایک دوسرے سے چپٹے رہنے کے باوجود کانپنے لگے۔ تین دن اور تین راتیں اسی عالت میں گزریں۔ انھوں نے لکڑی کے دو ٹکڑوں کو رگڑ کر آگ پیدا کرنے کی کوشش بھی کی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ بھلا ننھے ننھے ہاتھوں میں اتنی قوت کہاں تھی کہ لکڑی کے ٹکڑوں کو رگڑ کر آگ پیدا کر سکتے!

ابا جان سفر پر جاتے ہوئے کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے لانبے سے بھونپو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ گئے تھے — "اگر کبھی بہت زیادہ خطرہ محسوس کرنا تب ہی تم لوگ ڈیوڑھی میں نکلنا اور اسے بجا کر مجھے آواز دینا۔ میں کسی ایک جگہ تو ٹھہروں گا نہیں اس لئے سب سے پہلے مشرق کی طرف منھ کر کے بجانا اگر میرا جواب نہ سنائی دے تو مغرب کی طرف اور اگر پھر بھی جواب نہ ملے تو شمال کی جانب۔ سمجھ گئے؟"

چونکہ ابا نے کہا تھا کہ جب شدید خطرہ ہو تب آواز دینا اس لئے بچوں نے انتہائی فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے رات کی ٹھنڈ اور اندھیرے کو برداشت کرنا گوارا کر لیا۔ اور انھیں آواز نہ دی۔ بھوک کم کرنے کے لئے مکئی کے دانے اور پھلوں کے سوکھے چھلکے چباتے رہے۔

لیکن انھیں سب سے زیادہ خوف اندھیرے سے معلوم ہوتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کھڑکی سے روشنی چھنتی رہے تو بھیڑیے پاس نہیں پھٹکتے لیکن اب تو انہیں اپنے جھونپڑے کے آس پاس بھیڑیوں کے غرانے کی آواز سنائی دینے لگی تھی بلکہ دروازہ پر ان کے پنجوں کی سرسراہٹ اور چوکھٹ کترنے کی آہٹ بھی آنے لگی تھی!

جب بھوک اور ٹھنڈ برداشت سے باہر ہو گئی تو انھوں نے مجبوراً دروازہ کھولا لیکن بھیڑیوں کے نوکیلے دانتوں سے کتری ہوئی چوکھٹ نظر آئی تو سہم کر فوراً دروازہ بند کر دیا۔ بالآخر وہ سب چھت تک پہنچے اور بڑی دقت سے بھونپو کو چھت کی چمنی میں مشرق کی جانب پھیلایا لیکن بھونپو سے تیز آواز نہ نکلی بلکہ دیر تک ایسی آوازیں نکلتی رہیں جیسے بھونپو آہیں بھر رہا ہو سسکیاں بھر کر پکار رہا ہو — ابا۔ آ جاؤ! تب دوسرے بچے نے بھونپو میں منھ لگایا لیکن نتیجہ وہی رہا۔ ہلکی ہلکی سسکیاں! پھر النکا کی باری آئی۔ اس نے سانس کھینچ کر بھونپو پر اپنے ہونٹ جما دیئے۔ اس بار بھونپو نے آہیں نہ بھریں نہ سسکیاں لیں بلکہ اس سے ایک تیز آواز نکلی جو قلعہ جیسی پہاڑیوں کو پار کرتی ہوئی نیچے وادیوں میں گونج اٹھی۔ النکا بھونپو بجاتی رہی اور تمام جنگل اس کی آواز سے گونجتا رہا۔ جب النکا رک گئی اور باہر سناٹا چھا گیا تو بچوں نے مشرق کی جانب کان لگا کر سننے کی کوشش کی لیکن ابا کی آواز سنائی نہ دی۔ النکا کے ہونٹ چھل گئے تھے۔ بھونپو کے منہ پر

خون لگا ہوا نظر آرہا تھا لیکن وہ ہمت نہ ہاری کیونکہ اسے تو اس بات کی فکر تھی کہ تھوڑی دیر میں رات ہو جائے گی ۔ ہوا، طوفان اور اندھیرا ۔ برف بھی گرنے لگی تھی ۔ لیکن ابا کا جواب نہ ملا تھا!

اس کے بعد النکا نے شمال کی جانب بھونپو رکھا لیکن ادھر سے بھی ابا کا جواب نہ آیا ۔ جنوب کی سمت سے بھی کوئی جواب نہ ملا۔ تھک ہار کر وہ چھت کے پاس سے اتر آئی اور اپنے بھائی بہنوں سے لپٹ کر ٹھنڈے اندھیرے میں لیٹ رہی۔ بس اب طوفان کی چیخیں سنائی دینے لگی تھیں اور جھونپڑے کو زلزلہ سا آنے لگا تھا۔

بوڑھی النکا کو اچھی طرح یاد تھا کہ دوسرے دن شام کے وقت ان کے ابا کے بگل کی آواز سنائی دی تھی اور کچھ دیر بعد وہ واپس آگئے تھے آتش دان کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر انھوں نے آتشگیر سن کو چقماق پر رکھ کر جو لوہا مارا تو چنگاریاں ایک دم پھوٹ پڑی تھیں اور ریشمی دھاگے کی طرح باریک دھوئیں کی لکیر سن کے اندر سے نکلنے لگی تھی ۔

آگ آگ، سب بچے خوشی سے چیخ اٹھے تھے ۔ پھر سن کے گچھے سے شعلہ لپکنے لگا تھا اور بچے چپ چاپ کھڑے دیکھنے لگے تھے کہ شعلہ کس طرح لکڑی کی چیلیوں میں گھس گیا ۔ ننھی ننھی لکڑیوں سے کھیلتا ہوا ۔ جیسے کوئی بھوت ہو ۔ چٹختا ۔ چھپتا ۔ نکلتا ۔ مضبوط سرخ رنگ کا شعلہ یہاں تک کہ پورا آتش دان آگ کی لپکتی ۔ اچھلتی ۔ پھدکتی زبانوں سے بھر گیا! ۔۔۔ پھر تنور پر چراغ جلایا گیا اور کمرہ گرم ہو گیا ۔ !!

"واقعی" بوڑھی النکا نے سوچا "کل سن کا گچھا اور آج صرف ایک بٹن دبانے سے سورج ؟ ۔ کتنا اچھا ہوتا اگر آج تنور پر الونسی تیار کی جاتی جیسی ہر سال تہوار کے دن تیار کی جاتی ہے ۔ لیکن اسے یہ خیال پہلے کیوں نہ آیا؟ ممکن ہے کل بہت دیر ہو جائے ۔ کون جانے کل شاید اس گاؤں کا کام ختم ہو جائے اور بجلی والا کسی دوسرے گاؤں کو چلا جائے ؟"

وہ پھر باہر نکلیں ۔ انھوں نے دیکھا کہ بجلی والا تاروں کا گچھا پھیلائے ایک قریبی مکان میں کام میں لگا ہوا تھا ۔ وہ فوراً واپس آئیں تنور گرم کیا اور مکئی کا آٹا گوندھنے لگیں ۔ آٹا گوندھ کر اسے گوبی کے پتوں پر سجا کر تنور کے اندر رکھ دیا اور خود میز پر برتن لگانے لگیں ۔ اس سے فارغ ہو کر انھوں نے کمرے میں احتیاط سے جھاڑو دی ۔ الونسی کی لطیف خوشبو کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر نکل کر درختوں اور پھولوں کی خوشبو میں گھل مل گئی!

"ہاں ۔ اور کیا؟ سن کا ڈبہ غائب اور اس کی جگہ خود سورج آکر آپ کی چھت سے لٹک گیا ہے" ۔۔۔ بوڑھی النکا کو پھر بجلی والے کی بات کا خیال آیا اور انھیں گزرے زمانے کی باتیں یاد آگئیں ۔ ان کی زندگی میں یہ سورج آنے سے پہلے نہ جانے کیا کیا گزر چکا تھا ۔ لیکن یہ سورج آخر آیا کہاں سے ؟ تاروں پہ چلتا ہوا کہاں سے نکل آیا؟ خدا ہی جانے اسے کس نے پیدا کیا ہے؟ نہ جانے سب سے پہلے کس کے دماغ میں ایسی مشین ایجاد کرنے کا خیال آیا ہوگا اور پھر نہ جانے کتنا تانبہ استعمال کیا گیا ہوگا اور اتنا تانبہ کہاں سے حاصل کیا گیا ہوگا ۔۔۔ وہ چاہتی تھیں کہ نہایت اطمینان سے یہ تمام باتیں پوچھیں اور اس کا جواب سنیں ۔ لیکن بجلی والے کے سامنے تو وہ صرف اتنا ہی کہہ سکیں ۔۔۔ "کیا کہا! میں تو مرغی کی مانند ادھر ادھر پھڑپھڑاتی پھری جیسے کوئی زندہ جنت میں پہونچ جائے اور پھر ۔ ۔ ۔ ۔ "

"کیا بات ہے ؟ کیا روشنی میں کوئی خرابی ہے؟ بجھ تو نہیں گئی ؟" بجلی والے نے حیرت زدہ لہجہ میں پوچھا۔

"نہیں میرے بچے ۔ خدا تمہیں سلامت رکھے ۔ بجھنے کیوں لگی ۔ میں تو تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ میرے گھر چل کر تھوڑی سی چکھ لیتے ۔ یہ تو مجھے کل ہی کہنا چاہئے تھا لیکن میں تو ادھر ادھر مرغی کی طرح پھری جیسے کوئی زندہ جنت میں پہونچ جائے ۔۔۔ ہاں تو تم میرے گھر کب آؤ گے؟

آلیفا پتنا رد پاس ہی کھڑی تھی ۔ اپنی عادت کے مطابق چہک کر بولی "ماں ۔ جیسے ہم لوگ تو پردیسی ہیں ۔ آج دعوت کا کھانا ہمارے یہاں کھائیں گے ۔

سمجھیں؟ بوڑھی النکا کا دل چاہا کہ آلینا کی آنکھیں نکال لے۔ وہ تو ایسی ایسی باتیں کہہ سکتی تھیں کہ آلینا غیرت سے ڈوب مرے لیکن وہ یہ سوچ کر چپ رہیں کہ غیر آدمی کے سامنے جھگڑا کرنے سے کیا فائدہ۔ لہٰذا انھوں نے بجلی والے سے کہا "اچھا تو رات کو میں نے ایسی لذیذ الونسی بنائی ہے کہ ـــ اور اوپر سے شہد بھی لگایا ہے اور ....

دفعتاً سوتیا درمیان بیچ میں بول پڑی ـــ "آج رات یہ ہمارے مہمان ہیں اور پھر شہد لگی کونسی ایسی نعمت ہے؟ ہر گھر گرہست عورت پکا سکتی ہے"

"تو پھر کل ...."

"کل تو میں یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا" بجلی والے نے اظہار افسوس کے طور پر کہا "دوسرے گاؤں میں بھی تو بجلی لگائی جانے والی ہے۔ بہر حال آپ کی دعوت کا شکریہ"

بیچاری بوڑھی النکا خاموش رہ گئیں لیکن جاتے وقت انھوں نے آلینا اور سوتیا کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے انہیں کچا ہی چبا جائیں گی۔

آلینا اپنی تیز آواز سے چیخی ـــ "اے ہے۔ تم تو ہمیں یوں گھور رہی ہو جیسے ہم نے تمہاری اولاد کو آگ میں پھینک دیا ہو"

بجلی والے کی نظریں بوڑھی النکا کے اداس چہرہ پر جم گئی تھیں "اچھا اچھا" کہتی ہوئی بوڑھی النکا اپنے گھر واپس چلی گئیں۔

گھر پہنچیں تو آنگن بالکل سنسان محسوس ہوا۔ ڈیوڑھی میں چند سفید مرغیاں چگ رہی تھیں۔ بوڑھی النکا نے انکی طرف ایک پتھر پھینکا تو وہ ادھر ادھر بکھر گئیں۔ پتھر پانی کے گھڑے پر لگا اور پانی بیچ کمرے میں پھیل کر بہنے لگا۔

ان کی نظریں سامنے ٹنگی ہوئی تصویر پر پہونچ گئیں جس میں صرف تلوار کا دستہ اور بادشاہوں کے قلعہ پر حملہ کرتے ہوئے گھوڑے کی ریشمی دم کی جھلک دکھائی دے رہی تھی ـــ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں ـــ دور میدون! ـــ میرا حال دیکھ رہے ہو؟ جب سے تم بادشاہ کے حکم پر مجھے چھوڑ کر چلے گئے میری زندگی میں کونسی مسرت باقی رہ گئی ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ بچپن میں جب میرے بھوبھیو سے جنگل کو بھیج اٹھاتا تھا تو بھیڑیوں نے مجھے پھاڑ کر کھا لیا ہوتا!

گھر میں بجلی آجانے سے النکا کے دل میں جوانی کی جو امنگ جاگ اٹھی تھی وہ مرگئی تھکن سے چور ہو کر وہ بیچ پر بیٹھی فرش پر بکھرے پانی کو وہ گھورتی ہوئی سوچنے لگیں ـــ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے یہاں بیٹھنے کے بدلے اپنا کفن تیار کرنا چاہیے!"

پھر انھوں نے تمغہ اٹھایا۔ یہی ایک چیز انھیں دنیا میں سب سے زیادہ پیاری تھی۔ وہ غور سے دیکھنے لگیں اس عقاب کو جو مخالف ہواؤں کو چیرتا ہوا اڑ رہا تھا ....!

بجلی نے کیا واقعی ان کی راتوں کو روشن کر دیا تھا؟ کیا انھیں بجلی کی ضرورت تھی؟ اور وہ بجلی والا! کیا وہ محض چند لمحوں کے لیے ان کے گھر الونسی کھانے نہیں آسکتا تھا؟ آخر الونسی بھی تو کافی محنت سے پکائی جاتی ہے۔ برساتی مینڈک کی طرح پانی سے اچھل کر تو نہیں نکل آتی؟

دفعتاً ڈیوڑھی میں آہٹ ہوئی اور ایک نرم آواز سنائی دی ـــ "کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

ارے تم خدا تمہیں زندہ و سلامت رکھے۔ آؤ۔ آؤ ـــ لیکن آلینا کا کیا ہوگا؟

بجلی والا پہلے ہنسا پھر حسب عادت شرمانے لگا "آپ کو بھلا کیا معلوم کہ مجھے الونسی کتنی پسند ہے؟"

"کیا واقعی! ـ اچھا تو یہاں بیٹھ جاؤ اور جی بھر کر کھالو"

"بیٹے۔ کیا میں تم سے ایک سوال پوچھ سکتی ہوں؟ دیکھو.....:" اور بوڑھی النکا نے باہر جھانک کر دیکھا۔ کھمبوں کی مسلسل قطاریں گاؤں کے باہر تک چلی گئی تھیں اور ندی کو پار کر کے پہاڑی پر چڑھ گئی تھیں ــــ "یہ کھمبے کہاں سے شروع ہوتے ہیں؟۔ کیا تم کبھی وہاں گئے ہو؟ اس آخری سرے پر جہاں سے یہ کھمبے شروع ہوتے ہیں وہاں کیا ہے؟ اور ان تاروں کے لئے اتنا بہت سا تانبہ کہاں سے مل جاتا ہے؟"

بجلی والا ان کے سوالوں کی سادگی پر مسکرانے لگا ــــ "النکا ماں۔ میں وہیں سے آیا ہوں جہاں سے یہ کھمبے شروع ہوتے ہیں وہ جگہ یہاں سے چالیس کلومیٹر کے فاصلہ پہ ہے اور یہ فاصلہ طے کرنے کے لئے ایک دن ایک رات چلنا پڑتا ہے"

"کیا کہا؟ ایک دن اور ایک رات؟ لیکن ان تاروں کے لئے اتنا بہت سارا تانبہ کہاں سے آتا ہے؟"

"یہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے النکا ماں۔ ایک دن اور ایک رات کے فاصلہ کے لئے کوئی بہت زیادہ تار درکار نہیں ہوتا۔ بعض تار تو پہاڑوں پر سے گزرتے ہیں تاکہ دور افتادہ دیہاتوں اور شہروں میں بجلی پہنچائی جا سکے۔ ان تاروں سے انجن بھی چلتے ہیں مشینیں بھی چلائی جاتی ہیں۔ اسکولوں میں بھی روشنی ہوتی ہے"

"او خدایا تاروں میں روشنی! جس کسی نے سب سے پہلے اسے ایجاد کیا ہوگا وہ یقیناً بہت بڑا نجومی رہا ہوگا! کون ہے وہ؟ کیا ابھی تک زندہ ہے؟ اگر زندہ ہے تو لوگوں کو اس کے سامنے جا کر ادب سے جھکنا چاہیئے اس کے قدموں تلے ریشم بچھانا چاہیئے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں"

بجلی والے کی باتیں سن کر بوڑھی النکا کو بے پایاں مسرت کا احساس ہوا۔ بہت سی باتیں تو انکی سمجھ میں نہ آئیں لیکن وہ اتنا ضرور سمجھ گئیں کہ بجلی پانی سے پیدا ہوتی ہے اس کے جانے کے بعد میز صاف کرتی ہوئی النکا کے کانوں میں اسکی ہی باتیں گونج رہی تھیں۔ سمجھ گئیں آپ؟ جو سورج آپ کی چھت سے لٹک رہا ہے اس میں اور سن کے ڈبہ کے درمیان کتنا بُعد ہے!۔ اس سورج اور آپ کے بچپن کے سورج میں کتنا فاصلہ ہے وہ بچپن جسکی تفصیلات آپ نے ابھی ابھی مجھے بتلائی ہیں۔ یہ ایک طویل فاصلہ۔ ایک لانبا راستہ ہے۔ آنسو اور پسینہ سے بنا ہمارا راستہ۔ لیکن بالآخر ہم روشنی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ روشنی تو ہمارا پیدائشی حق ہے!

لیکن یہ بات ابتک النکا کی سمجھ میں نہ آسکی تھی کہ روشنی لانے والے انجینئر اتنا تانبہ کہاں سے لائے کہ پورے ملک میں تاروں کا جال بچھا دیا؟

سوچتے سوچتے اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ لیکن انھوں نے فوراً اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر اس خیال کو نکال دینے کی کوشش کی۔ جس طرح کوئی چپٹی ہوئی شہد کی مکھی کو اڑانے کی کوشش کرے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خیال پھر آدھمکا۔ اگر ہر کوئی مدد کرے ــــ ہر کوئی ہاتھ بٹائے۔ اور انھوں نے پھر اس خیال کو بھگانے کی کوشش کی ــــ اگر ہر کوئی۔ جو کچھ اس کے پاس ہو وہ۔!

"میں بھی کیسی احمق ہوں ــــ لوگ مجھ پر ہنسیں گے۔ اور وہ بھی اس بڑھاپے میں ــ؟" لیکن شام ہوتے ہوتے انکی رائے پھر بدل گئی کوشش کرنے میں کیا برائی ہے۔ ہاں آخر ہرج بھی کیا ہے۔ انھوں نے تانبے کے تمغہ کو اچھی طرح صاف کیا۔ پھر شوہر کی تصویر پہ ایک نظر ڈالی۔ ان کا دل ڈوبنے لگا۔ جیسے وہ اس تمغے کو گھر سے باہر لے جا کر اپنے شوہر سے بیوفائی کر رہی ہوں۔ لیکن وہ اپنے آپ کو اچھی طرح پہچانتی تھیں وہ جانتی تھیں کہ اگر وہ فوراً یہ کام انجام نہ دیتی تو شاید پھر کبھی نہ کر سکیں۔!

انھوں نے تمغہ رومال میں لپیٹا اور تیزی سے باہر نکل گئیں۔

سوتیا دیودیا کے گھر میں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ بجلی والا میز پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ بوڑھی النکا نے دیکھا کہ میز پر پلیٹوں کے درمیان ایک ڈھیر بھی رکھا ہوا تھا۔ تانبے کے سکوں کا ڈھیر!

'اف۔ یہ سوتیا چڑیل۔ پھر مجھ سے بازی لے گئی۔'

اسی وقت آلینا بھی ایک گھنٹی لئے اسے بجاتی ہوئی داخل ہوئی۔ 'ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہ وقت ہو گیا۔ میں تو سمجھا کہ شاید بچوں نے گھنٹی کہیں پھینک دی مگر خیر مل گئی۔ لیجئے جناب۔ یہ اصل تانبہ ہے۔ بات یہ ہے۔ جناب کہ جب پورے ملک میں تانبے کے تار لگانا ہیں تو کچھ میں دوں۔ کچھ یہ دیں کچھ آپ دیں۔ آخر اسی طرح تو کام چل سکے گا۔'

بوڑھی النکا کو غصہ آگیا۔ 'مردار بس بکے جاتی ہے۔ ارے تانبے کے سکے اور تانبے کی گھنٹیاں کس نے نہیں دیکھے لیکن چمڑے کی پیٹی پر لگانے والے تانبے کے بٹن؟' سوتیا کے شوہر نے بات کاٹ کر کہا اور مٹھی بھر تانبے کے بٹن سکوں کے ڈھیر کے قریب رکھ دیئے۔

'لیکن کیا آپ لوگوں نے کبھی تانبہ کا تمغہ دیکھا ہے؟' بوڑھی النکا نے میز کے قریب پہونچکر کہا۔ 'لیجئے جناب۔ یہ تانبے کا تمغہ۔ اسے بھی بھٹی میں ڈال کر گلوا لیجئے گا۔ کم از کم ایک تار اس سے بھی بن ہی جائے گا۔'

سب لوگ اس تمغہ کو دیکھنے لگے جو سکوں اور بٹن کے ڈھیر پر سب سے اوپر رکھا ہوا تھا جیسے عقاب سارے ڈھیر کو اپنے پنجوں میں دبا کر مخالف ہواؤں کو چیرتا ہوا آسمان کی جانب اڑ جانا چاہتا ہو۔

'واقعی یہ تمغہ تو بہت خوبصورت ہے' کسی نے کہا

'اور نہیں تو کیا' بوڑھی النکا نے فخریہ لہجے میں کہا 'سکے اور گھنٹیاں تو ہر جگہ مل سکتی ہیں اور بٹن بھی لیکن تانبہ کا تمغہ۔۔؟'

'اوہو۔ ایسی محبت۔ اتنے سارے محبت بھرے دل' بجلی والے نے مسکراتے ہوئے کہا" یہ آپ لوگوں نے سوچا کیونکر؟ کیا آپ لوگوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا ہے؟"

'ارے بھئی یہ کوئی ایسی قیمتی چیزیں نہیں ہیں' سوتیا کے شوہر نے کہا" میں تو درحقیقت یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ چند بٹن سورج کی روشنی کا بدلہ ہو سکتے ہیں؟'

تانبہ کا تمغہ بٹنوں اور سکوں پر اپنا کنگورے دار دامن پھیلائے چمک رہا تھا!

اس دن سے آج تک جہاں جہاں اور جب کبھی بوڑھی النکا کی ملاقات ان کھمبوں سے ہوتی ہے تو وہ اُن کو دعائیں دیتی ہیں کہ جلد از جلد وہ تمام ملک میں اپنا راستہ طے کر لیں۔ یہ تو وہ نہیں جانتیں کہ کس تار کا کون سا حصہ ان کے تانبے کے تمغے سے بنا ہے۔ لیکن شاید اسی وجہ سے انہیں یہ یقین ہے کہ تانبے کا تمغہ ان تمام تاروں میں شامل ہے۔ جہاں کہیں بھی یہ تار کھنچتے چلے گئے ہیں۔ جہاں کہیں بھی رات کے اندھیرے میں اس نئے سورج کی روشنی اجالا کرتی ہو!۔

> **شعر نہیں**
> 'افکار' آپ کا بہترین رفیق ہے

## یزدانی جالندھری

جھلک رہا ہے ہر اک پرتوِ حیات اس میں
ہے آئینہ کبھی ماحولِ زندگی کی جھیل

ہماری بزمِ تخیّل میں کب سے روشن ہے
تمہارے حسنِ زرافشاں کی مہ بکف قندیل

روش روش پہ بہاروں کی داستاں ہے رقم
ابھر رہی ہیں بہر سو نگارشاتِ جمیل

ہمارے فکر و تصوّر کو گھیرنے کے لئے
کہیں حصارِ خرد ہے کہیں جنوں کی فصیل

نجات مل نہ سکی ظلمتِ زمانہ سے
سنا تھا ہم نے اندھیرے میں روشنی کی دلیل

نہ پوچھو داغِ جگر کا مقام یزدانی
رہِ وفا میں یہی تو ہے ایک سنگِ میل

## محشر بدایونی

جب تک ان کی بھی آنکھ تر نہ ہوئی
نسبتِ درد معتبر نہ ہوئی

گھر میں گھر کی سی بات اگر نہ ہوئی
شکلِ دیوار و در تو گھر نہ ہوئی

جاگنے دے ہوائے شب ہم کو
سو رہیں گے اگر سحر نہ ہوئی

چھاؤں بخشی شجر نے کس کس کو
چھاؤں خود قسمتِ شجر نہ ہوئی

زیست کانٹوں میں بھی گذرتی ہے
زیست پھولوں میں بھی بسر نہ ہوئی

کچھ تو ساقی سے مل ہی جائے گا
زہر مانگیں گے مے اگر نہ ہوئی

کتنی مشکل سے طے ہوا ہے سفر
جب کوئی مشکلِ سفر نہ ہوئی

دشمنوں کو بھی کچھ کہیں گے نہ ہم
دوستوں کی خوشی اگر نہ ہوئی

گذرے قیدِ مکاں سے ہم محشر
یوں کہ ہمسائے کو خبر نہ ہوئی

## جوہر سعیدی

کرتے رہے تلاش، جو شام و سحر، ہمیں
کہتے ہیں آج، وعدۂ نا معتبر، ہمیں

کچھ دوستوں کے ساتھ رہی تلخ، زندگی
کچھ دشمنوں نے پیار کیا عمر بھر، ہمیں

صحرا نورد کہہ کے پکارو نہ دوستو
آواز دے گی رونقِ دیوار و در ہمیں

اب زندگی ہے نام سکوت و جمود کا
کرنا تھا کم نہ فاصلۂ سنگ و سر ہمیں

کہتی ہے احتیاط ضروری ہے عشق میں
دیوانہ وار دیکھنے والی نظر، ہمیں

ہم مہرِ نیمروز ہیں، ہم ماہِ نیم شب
ڈھونڈے گی شام، یاد کرے گی سحر ہمیں

جوہر ابھی ہے تشنۂ منزل رہی جواں
گم راہ کہہ رہا ہے ابھی راہبر ہمیں

## حزیں لدھیانوی

جلتے جلتے راکھ ہوا جب بھنورا کوئی
پھول ہوا ہر ایک پریشاں، شبنم روئی

اس بستی میں فرزانے ہی فرزانے ہیں
اس بستی میں دیوانہ ہے کوئی کوئی

دار و رسن ہے، تعزیریں ہیں، لیکن پھر بھی
شہرِ ستم میں چل نکلی رسمِ حق گوئی

چُبھنے والے کانٹوں کی تقدیریں جاگیں
عین بہاروں میں پھُولوں کی قسمت سوئی

وادیٔ غم میں، دشتِ وفا میں، راہِ طلب میں
کس نے کی ہے ہم دل والوں کی دل جوئی

قلبِ حزیں کو سیلِ حوادث سے ٹکرا کر
تو نے ظالم خود ہی اپنی منزل کھوئی

## عزیز میرٹھی

چراغ بزم کی خاطر، کلی چمن کے لئے
مگر وہ دل کہ جلے تیری انجمن کے لئے

شفق کو خونِ شہیداں کہو شفق نہ کہو
وہ سرفراز ہیں جو سر کٹے وطن کے لئے

ہوئے شہیدِ وطن ابر نیلگوں ہی میں دفن
فلک سے نور برستا رہا کفن کے لئے

ہر اک کو تیشہ و کوہسار بے ستوں نہ ملے
کہ یہ مراحلِ ہستی ہیں کوہکن کے لئے

ملی ہے کس کو بھلا اس جہاں میں دادِ وفا
تڑپ رہا ہے ہر اک نل یہاں دمن کے لئے

وہاں کہے تو کوئی کیا کہے حکایتِ دل
جہاں ترستے ہیں اہلِ زباں سخن کے لئے

بھٹک رہے ہیں تم ایسے عزیز اور بھی لوگ
سوادِ شامِ تمنا میں اک کرن کے لئے

## نشتر لدھیانوی

ہر سحر افسردہ، ہر اک شام دھندلائی ہوئی
زندگی جیسے کوئی میت ہے کفنائی ہوئی

صرصرِ غم، یورشِ آلام، افسردہ دلی
اک تری چاہت میں کتنوں سے شناسائی ہوئی

ہر نفس اک تیر، ہر لمحہ بلاؤں کا نزول
اے عروسِ زندگی کیا تیری رعنائی ہوئی

خانماں برباد ہے صحرا بہ صحرا، کو بہ کو
قیس تو مجنوں تھا کیوں لیلےٰ بھی سودائی ہوئی

او تغافل کیش یوں محفل سے کون اٹھا ہے دیکھ
اشک آنکھوں سے رواں، آواز بھرائی ہوئی

اک جہاں دشمن تھا تو اک حرف تک آیا نہ تھا
ہاں مگر اے دوست یہ دل جس سے رسوائی ہوئی

شہر بھر کے دوستوں کا ساتھ چھٹ جانے کے بعد
یہ بھی کیا کم ہے رفیقِ حال تنہائی ہوئی

تیرے ہی انداز ہیں ہر شے میں اے جانِ قمر
تو نے کیا بدلی نظر دنیا بھی ہرجائی ہوئی

## تابؔ اسلمی

لفظوں کے پیرہن میں اُسے بھی اُتار لو
وہ چاندنی کہ جس کے لئے بے قرار ہو

مانا کہ اُس سے پیار نبھانا ہے ناگزیر
لیکن نہ اس قدر کہ اُسے پُوجنے لگو

یارو سکوت بھی تو علامت ہے موت کی
اظہارِ زندگی کے لئے کچھ نہ کچھ تو ہو

تاریکیاں ہیں دیدۂ و دل پر محیط اگر
جیسے بھی ہوسکے درِ خورشید کھول دو

کس روشنی کو ڈھونڈ رہے ہو قدم قدم
دشتِ شبِ فراق کے اندھے مسافرو

کیوں ہر صدا پہ چونک رہے ہو گلی گلی
دل میں جو گونجتی ہے اُسے بھی کبھی سُنو

روتا ہوں یاد کر کے جسے خلوتوں میں تابؔ
ڈرتا ہوں وہ بھی چھُپ کے مجھے دیکھتا نہ ہو

## جعفر شیرازی

دیکھوں تو مرے دل میں اترتا ہے زیادہ
شعلہ کہ تہِ آب نکھرتا ہے زیادہ

کیا جانیے کیا بات ہے اب دشت کی نسبت
دل خامشیٔ شہر سے ڈرتا ہے زیادہ

اندر کا وہی روگ اسے بھی ہے، مجھے بھی
بنتا ہے زیادہ وہ سنورتا ہے زیادہ

جو آنکھ کے جلتے ہوئے صحرا سے پرے ہے
بادل اسی رستے سے گزرتا ہے زیادہ

رخ شہر کی جانب ہوا جنگل کی ہوا کا
اور شور مرے دل میں ابھرتا ہے زیادہ

جعفر یہ لگا زخم محبت بھی عجب ہے
بڑھتا ہے زیادہ جو نہ بھرتا ہے زیادہ

## قائد سروش

دل کی شاہراہوں پہ رہ نوردِ اندیشے
دھڑکنوں میں پوشیدہ کتنے سرد اندیشے

جل رہی ہیں پلکوں پر آنسوؤں کی قندیلیں،
چھا رہے ہیں چہرے پر زرد زرد اندیشے

کیسے ان کو لوٹا دیں آپ ہی کے تحفے ہیں
یاس و زخمِ محرومی، رنج، درد، اندیشے

آنکھ کس طرح جھپکے بھوت بن کے پھرتے ہیں
نیند کے بیاباں میں شب نورد اندیشے

اک حسیں تبسم سے دھند چھٹ گئی ساری
ہو گئے سروش آخر گرد گرد اندیشے

## سیدہ حنا

شبِ غم آج بہ انداز دگر آئی ہے
شام ہنستی ہوئی آنگن میں اتر آئی ہے

قصۂ ہجر ابھی نصف تلک پہونچا ہے
رات کی زلف ابھی تا بہ کمر آئی ہے

دل میں جاگ اٹھی ہیں پھر کے اُمنگیں کیا کیا
روشنی سی سرِ منزل جو نظر آئی ہے

خندۂ گل کی قسم، نور کی، نکہت کی قسم
کتنا ترسا کے ہمیں آج سحر آئی ہے

مژدہ دیتی ہوئی گزری ہے ابھی بادِ صبا
کلیاں کھل اٹھی ہیں کچھ ایسی خبر آئی ہے

تنگ آ کر جو کبھی بھولنا چاہا دل نے
یاد وہ شے ہے کہ کچھ اور نکھر آئی ہے

کس کے عکسِ رخِ تاباں کی تجلی سے حنا
قطرۂ آب میں یہ تاب گہر آئی ہے

## اِدارہ

# نئی کتابیں

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

## تبصرہ و تعارف

- افکار پریشاں ــــــــ جسٹس ایم آر کیانی (مرحوم) ۔ ناشر: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی ۔ دی مال ۔ لاہور ۔ ۹/-
- اردو لسانیات ــــــــ ڈاکٹر شوکت سبزواری ۔ ناشر: مکتبہ تخلیق ادب ۔ آدم خاں مارکیٹ ۔ بندر روڈ ۔ کراچی ۔ ۹/-
- مجموعہ قوانین اسلام ــــــــ تنزیل الرحمٰن ــــ مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی ــــــــ کراچی ۔ ۱۰/-
- اردو ذریعہ تعلیم اور اصطلاحات ــــ آفتاب حسن ۔ شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی ۔ کراچی ــــ قیمت درج نہیں

علم و ادب کے موضوعات سے متعلق اس وقت پانچ کتابیں پیش نظر ہیں: "افکار پریشاں" کیانی مرحوم کی تقاریر پر مشتمل ہے جسے پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی نے شائع کرکے ادب کی گرانمایہ خدمت انجام دی ہے۔ ان تقاریر میں طنز و مزاح کی اعلیٰ سطح ملتی ہے۔ رشید احمد صدیقی بلاشبہ اس عہد کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں لیکن دوسرے مزاح نگاروں کے مقابلے میں کیانی کے مزاح میں نیاپن اور طنز میں گہرائی ہے۔ کیانی مرحوم نے باقاعدہ ادبی زندگی نہیں گزاری لیکن وہ ہماری ثقافت کی ثقہ روایتوں کے علم بردار تھے۔ جن کا بلیغ اظہار ان کے خطبات میں جابجا ملتا ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کو لسانیات کے موضوع سے خاص لگاؤ ہے۔ "اردو لسانیات" اسی لگاؤ کا حاصل ہے۔ اردو کی ساخت اور اردو صوتیوں کی بحث پر جو ابواب مشتمل ہیں وہ لسانی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ویسے یہ بات کہے بغیر چارہ نہیں کہ علم لسانیات سے عام طور پر لوگوں کو زیادہ آگاہی نہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کچھ عرصے سے جو لسانی مضامین لکھ رہے ہیں ان میں جدید لسانی نقطۂ نظر ملتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نقطۂ نظر سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔

تنزیل الرحمٰن صاحب نے "مجموعہ قوانین اسلام" شائع کرکے اردو کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے، کتب حوالہ و استفادہ دیکھنے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ تنزیل الرحمٰن نے بڑی کد و کاوش اور تحقیق و تجسس کے بعد اسلامی قوانین کو یکجا کیا ہے جن سے بیشتر استفادہ کیا جائے گا۔

"اردو ذریعہ تعلیم اور اصطلاحات" پر آفتاب حسن صاحب نے جو کتابچہ شائع کیا ہے وہ کئی لحاظ سے فکر انگیز ہے اس کتابچہ میں یہ ثابت کرنے کی سعی و کوشش کی گئی ہے کہ اردو ہر اعتبار سے ایک زندہ زبان ہے اور درس و تدریس، نشر و اشاعت، کاروبار غرض کہ ہر شعبۂ حیات کی بجا طور پر نمائندگی کا حق رکھتی ہے اور کوئی ایسا موضوع نہیں جسے اردو احاطہ نہ کر سکے۔ کاش بحث و تمحیص اور رد و قدح کے علاوہ اردو کے لیے عملی مساعی کا بھی جلد آغاز ہو جائے تاکہ ہم بھی اپنی قومی زبان پر فخر کر سکیں۔

---

- مُطربہ ــــ قتیل شفائی۔ ناشر: گوشۂ ادب۔ چوک انارکلی۔ لاہور ــــ ۴/۵۰
- زخم گل ــــ سرشار صدیقی۔ ناشر: ہمارا ادارہ بک ہاجرہ آباد۔ کراچی۔ ۲۵ ــــ ۲/
- قطار شیشہ ــــ خلش بڑودوی۔ ملنے کا پتہ: بزم توفیق۔ طائی اسٹریٹ۔ بڑودہ۔ (گجرات ــــ ۳/
- صہبائے سخن ــــ محمد عبدالحیٔ عارفی۔ ملنے کا پتہ: اشرف ہومیو ہال۔ رابن روڈ۔ کراچی ــــ قیمت درج نہیں
- شعلۂ جاں ــــ درد سعیدی۔ ناشر: سلطان حسین اینڈ سنز۔ بندر روڈ۔ کراچی ــــ ۴/
- بزم خیال ــــ پروفیسر تاج محمد خیال۔ ناشر: مکتبۂ کارواں۔ کچہری روڈ۔ لاہور ــــ ۲/۲۵

اس وقت چھ ایسے مجموعہ ہائے کلام زیر تبصرہ ہیں جو گزشتہ ایک دو سال کے اندر شائع ہوئے ہیں۔ طباعت و اشاعت کی سہولتوں کی وجہ سے یہ بات بالکل حیرت انگیز نہیں کہ بڑی تعداد میں مجموعے شائع ہو رہے ہیں۔ اگر میر و غالب کے عہد میں بھی اشاعت و طباعت کی ارزانی ہوتی تو ہزارہا ایسے مجموعے شائع ہوئے ہوتے جو زمانے کی دست و برد کا شکار ہو گئے اور جس کی وجہ سے آج ہمارے ادب میں تحقیقی کام کرنے والوں کو خاصی دشواریوں کا سامنا ہے۔ گمنام اور بے حقیقت شائع شدہ کتابیں بہر حال آسانی سے مل جاتیں لیکن ان کے مسودے کافی دشواری سے ہاتھ آتے ہیں۔

ان مجموعوں میں قتیل شفائی کے "مُطربہ" کو آدم جی ادبی انعام مل چکا ہے۔ طوائف پر اردو ادب میں خاصا لٹریچر موجود ہے۔ پھر بھی مطربہ میں قتیل نے جو تکنیکی تجربہ کیا ہے وہ کامیاب ہے۔ ہر نظم اپنی جگہ پر مکمل بھی ہے اور مربوط بھی۔ اس سے قبل قتیل کے پانچ مجموعے ہریالی، گجر، روزن، جھومر اور جلترنگ شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

"زخم گل" ـ سرشار صدیقی کی ایک طویل نظم ہے جو انھوں نے کافی عرصے پہلے لکھی تھی۔ اس سے قبل ان کا پہلا مجموعۂ کلام "پتھر کی لکیر" شائع ہو چکا ہے اور پسند کیا گیا ہے۔ اس نظم میں بھی وہ خوبیاں ملتی ہیں جو سرشار کے شعری مزاج کا خاصہ ہیں۔

"قطار شیشہ" بڑودہ کے ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر خلش بڑودوی کا مجموعۂ کلام ہے۔ اس مجموعہ میں غزل کے بعض اچھے شعر ملتے ہیں۔

"صہبائے سخن" ـ کراچی سے شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی ایک بزرگ اور گوشہ نشین شاعر ہیں۔ اس مجموعے میں ان کا وہ کلام جمع کر دیا گیا ہے جو انھوں نے زمانۂ طالب علمی میں لکھا تھا۔ صہبائے سخن۔ قدیم رنگ سخن کا آئینہ دار ہے۔

"شعلۂ جاں" درد سعیدی کا مجموعہ ہے۔ ان کے اس مجموعے میں بعض بہت اچھے شعر ملتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان کے یہاں یاسیت اور قنوطیت کا غلبہ ہے۔

"بزم خیال" — پروفیسر تاج محمد خیال (مرحوم) کا شعری مجموعہ ہے۔ آپ کی ساری عمر درس و تدریس میں گزری۔ آخر عمر میں آپ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہو گئے تھے۔ یہ مختصر سا مجموعہ آپ کے فطری ذوقِ شعری کا آئینہ دار ہے۔

ان شعری مجموعوں کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے کی طرح آج بھی غزل ہمارے شعرا کی محبوب صنف ہے۔ یہ ایک علیحدہ سوال ہے کہ ان میں سے کتنے شاعر پچاس سال بعد بھی شعر و ادب میں اپنا دائمی نقش چھوڑیں گے۔

○ **سائنس نامہ** — محشر بدایونی۔ ناشر: گلڈ انجمن کتاب گھر۔ ۱۶۔ بی۔ سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی — قیمت درج نہیں

"سائنس نامہ" محشر بدایونی کی ان نظموں کا مجموعہ ہے جو پچاس نامور سائنس دانوں کی زندگی اور کارناموں پر بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ محشر بدایونی غزل کے بہت اچھے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکا ہے جس میں ان کا اپنا منفرد انداز بیان ہے۔ وہ جدید غزل گویوں میں اپنی ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کے لئے انھوں نے بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی یہ نظمیں بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ ہمارے ادب میں بچوں کے ادیب بہت کم ہیں۔ اور کامیاب لکھنے والے تو تقریباً ناپید ہیں۔ محشر بدایونی نے اسمٰعیل میرٹھی اور حامد اللہ افسر وغیرہ کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ بچوں کے ادب میں یہ کتاب ایک اضافہ ہے۔ اس میں محشر بدایونی کے منفرد اندازِ بیان کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

○ بنگلہ اردو لٹریچر سے گرامر۔ مولانا قاضی محمد شہاب الدین۔ ناشر: باب الاشاعت۔ رابسن روڈ کراچی۔ قیمت ۔ ۲/۵۰

○ آسان بنگلہ تعلیم — سید وحید قیصر ندوی۔ ناشر: بیگم عذرا قیصر مکتبۃ العرفان سی/۲۷ ایوب ایونیو محمد پور ڈھاکہ۔ قیمت ۲/-

پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہے۔ مغربی پاکستان اپنے مشرقی حصے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ہے ایک کی زبان اردو اور دوسرے کی بنگالی ہے۔ فی الحال انگریزی کی مدد سے دونوں خطوں کے لوگ کام چلا رہے ہیں لیکن کب تک۔ ایک وقت آئیگا جب مغربی پاکستان والوں کے لئے بنگالی اور مشرق والوں کے لئے اردو ناگزیر بن جائے گی۔ اسی ضرورت کو محسوس کر کے یہ دونوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ انگریزی کی مدد سے بات چیت اور کاروبار میں فی الحال مدد مل رہی ہے لیکن انگریزی دونوں خطوں کے لوگوں کو ثقافتی زندگی سے کاٹ دیتی ہے اور قومی وحدت کے راستے میں سنگ راہ بن گئی ہے قومی نصب العین اگر کسی ملک کے شہری کے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے تو اردو والوں کو بنگالی اور بنگالی والوں کو اردو سیکھنی ہی پڑے گی اور اس بہانے ایک دوسرے کی ثقافتی اور سماجی زندگی میں گھل مل کر قومی نصب العین تک پہنچنا ہو گا۔ توقع ہے کہ یہ کتابیں زیادہ سے زیادہ مطالعہ میں آئیں گی اور مشرق و مغرب کا فرق ہمارے یہاں جلد سے جلد ختم کیا جائے گا۔ دونوں کتابیں اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر کافی مقبول ہوئی ہیں اور ان کی مدد سے اردو والے آسانی بنگلہ زبان سیکھ سکتے ہیں۔ مولانا قاضی شہاب الدین اور سید وحید قیصر ندوی اردو کے علاوہ بنگلہ زبان و ادب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں —

○ **براہوی کی لوک کہانیاں** — انور رومانی۔ ناشر: قلات پبلشرز مستونگ، (قلات ڈویژن) — قیمت ۲/۷۵

○ **بلوچی لوک گیت** — ترتیب و ترجمہ۔ عطا شاد، عین سلام۔ ناشر: قلات پبلشرز مستونگ (قلات ڈویژن) — قیمت ۲/۵۰

○ **سرائیکی لوک گیت** —— ڈاکٹر مہر عبدالحق : ناشر : بزم ثقافت ملتان —— قیمت —— ۲/۵۰

لوک گیت اور لوک کہانیوں پر کام صرف ایک آزاد ملک ہی میں ہو سکتا ہے۔ انگریزی حکومت کے دور میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ آزادی حاصل کرنا تھا۔ لیکن آزادی ملنے کے بعد اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مختلف علاقوں کی ثقافتی روایات پر سیر حاصل کام ہو، تاکہ ملک کے اندر ایک توانا تہذیب جنم لے سکے "بروہی کی لوک کہانیاں" "بلوچی لوک گیت" اور "سرائیکی لوک گیت" علاقائی ثقافتوں پر کام کرنے کے سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔ آزادی کے فوراً بعد صرف "افکار" نے بالالتزام علاقائی زبانوں کی نظموں کے ترجمے شائع کرنے شروع کئے تھے۔ اس کے بعد دیگر جرائد نے بھی اس طرف توجہ مبذول کی۔ "ماہِ نو" نے بھی اس سلسلے میں مطبوعات پاکستان کی جانب سے کئی کتابیں شائع کی ہیں۔ جو ہر لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ ان گیتوں اور کہانیوں میں بھی زمین سے بہت گہرا تعلق ملتا ہے جو ایک بار سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ معاشرہ کی تنظیم آدمی اور زمین کے بنیادی رشتہ ہی کے تحت ہونی چاہیئے۔ سائنسی ترقی کے اس عہد میں اگر ہم یہ بھول گئے کہ آدمی زمین کا بیٹا ہے۔ تو ہزارہا مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا جیسا کہ آج کی زندگی میں ہمیں تجربہ ہو رہا ہے۔ اسی لئے ان کتابوں کی اشاعت ایک تہذیبی ضرورت بن کر سامنے آتی ہے متذکرہ بالا تینوں کتابوں کے مرتبین نے جس جانفشانی سے ثقافتی ورثے کو کتابی صورت میں محفوظ کیا ہے۔ اس کے لئے وہ لائق صد تحسین ہیں۔

## رسالے

○ **اوراق** —— ادارہ: وزیر آغا - عارف عبدالمتین - ملنے کا پتہ: ماہنامہ اوراق - چوک اردو بازار - لاہور ۲/

○ **اردو (سہ ماہی)** —— ادارہ: جمیل الدین عالی شفیق خواجہ - ناشر: انجمن ترقی اردو - بابائے اردو روڈ کراچی - ۲/۵۰

○ **کاروان سائنس** —— مدیر: عظمت علیخاں: ناشر مجلس تحقیقات سائنس و صنعت پاکستان - ۲۹ - گارڈن روڈ کراچی ۱/۵۰

○ **تعلیم کا مسئلہ** —— مرتبین: ظہور احمد، تمنا احمد، عارف الحق - ناشر: ادارہ مطبوعات جمعیت - ۳۳ - اسٹریچن روڈ کراچی ۲/

چار رسالے "کاروان سائنس" "اردو" "اوراق" اور "تعلیم کا مسئلہ" چار مختلف رنگ کے رسالے ہیں۔ اوراق نیا ادبی جریدہ ہے۔ جس میں نظم و غزل کے ساتھ ساتھ افسانے اور تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں۔ "اردو" خالص علمی پرچہ ہے اور علمی تحقیقی مضامین کے پڑھنے والوں کے لئے غذا کا کام دیتا ہے۔ "تعلیم کا مسئلہ"۔ تعلیمی مسائل پر فکر انگیز مضامین کا ایک جامع مجموعہ ہے جس میں موجودہ نظام تعلیم کی خرابیوں اور آئندہ تعلیم کے لائحہ عمل پر واضح روشنی ڈالی گئی ہے۔ "کاروان سائنس" کی اشاعت اردو کے لئے ایک اچھا شگون ہے سائنس کے موضوعات اور سائنسی فکر پر اردو میں لٹریچر کی کمی ہے۔ جس آب و تاب کے ساتھ اس پرچے کی دو تین جلدیں شائع ہوئی ہیں اس سے امید بندھتی ہے کہ ہمارے یہاں زندگی میں سائنسی نقطہ نظر پیدا کرنے میں اس پرچے کے لکھنے والے مددگار ثابت ہوں گے۔ یہ رسالہ سائنس کے طالب علموں میں سنجیدگی اور علمی شغف پیدا کرنے کا ایک وسیلہ بن سکتا ہے۔

---

جاپانی

یونی جیرو لوگوچی
ترجمہ
پیر علی محمد راشدی

# زندگی کی تاریخ

میرے ہاتھوں کی طرف دیکھو....
اُن کی خشک اور موٹی ہڈیاں تم کو ایسی نظر
نہیں آ رہی ہیں ...
جیسی سردیوں کے مارے بانس کی
سوکھی گانٹھیں!

میرے ہاتھوں کی سخت کھال ....
کیا یہ نہیں بتا رہی ہے کہ میرے آباؤ اجداد
بھی محنت کش تھے؟
میرے ہاتھوں میں یہ سُرخ ناخن ....
کیا تم کو دیہاتی لونڈے کے لال گالوں کی
یاد نہیں دلا رہے ہیں؟

میرے بزرگ پچھلے چار سو سال سے....
اس زمین کے آئینے سے منہ لگائے ہوئے...
اُن پودوں کی پرداخت کرتے رہے جو انہوں
نے لگائے تھے؟

میں احسان مند ہوں اپنے بزرگوں کا
انہوں نے ہی حلال کی کمائی کا یہ طریقہ
تجویز کیا
ہل کے وسیلے، درانتی کے ذریعے!

محبت کا جو سرمایہ انہوں نے
اس سرزمین پر لگایا
وہ رائیگاں نہیں گیا
اس کی وجہ سے ہم پس ماندوں کو بھی فطرت
کا قرب حاصل رہا
ان کے لگائے ہوئے سرمائے کا منافع
اس طرح ہم تک پہونچتا رہا!

دیکھو میرے ہاتھوں کی طرف دیکھو
ان سے ثابت ہے کہ میں صحیح خلف ہوں
اس خاندان کا...
جو خاموشی سے اس زمین سے دعائیں
مانگتا رہا۔
جن دعاؤں کا فائدہ....
آج مجھ کو حاصل ہو رہا ہے!

دیکھو ان ہاتھوں کی طرف
انگلیوں کے بیچ میں لکھی ہوئی
نظر آئے گی
سادی مگر ایماندارانہ زندگی کی تاریخ
جس کی ترتیب میں میرے بزرگوں نے
اتنا عرصہ محنت کی!

اندریس سلادکووچ
ترجمہ
نصیر احمد زبیری

سلواکی

# جوانی - بڑھاپا

جوانی تو زندگی کی دھنک کو جنم دیتی ہے

جوانی تو خواہشات کا پہاڑ ہے

جوانی تو آس اور امید کی تصویر ہے

جوانی تو زندگی کا دوسرا کنارا ہے

جوانی تو محبت کا عروج ہے

تو اپنی گرمی سے ان برفیلے ارادوں کو جگا دے

جو ٹھنڈے دل میں طاقت کو چھپائے ہوئے ہیں

تو اپنے سینے میں وہ طاقت چھپائے ہوئے ہے

جس پر بڑھاپے کا بدن بھی

رنجیدہ تجربوں کے پہاڑوں پر کپکپاتا ہے

انگریزی

شیلے
ترجمہ
امیر چند بہار

# نغمہ شبینہ

(شیلے کے ایک گیت INDIAN SERENADE کا ترجمہ)

بہکی بہکی ہوائیں چلتی ہیں — نور افلاک سے برستا ہے
رات کی خامشی میں رہ رہ کر — مجھ کو تیرا خیال ڈستا ہے!

نیند کی گود سے لپک کر میں — جانِ من! بے قرار آیا ہوں
کھینچ لایا ہے مجھ کو اک جذبہ — اور بے اختیار آیا ہوں!

دیکھ سیمیں ندی کے سینے پر — توڑتی ہیں ہوائیں دم اپنا
بوئے گل اس طرح پریشاں ہے — جیسے خواب و خیال کی دُنیا

بلبلِ بے قرار کا نغمہ — ڈوب جاتا ہے دل میں ہی گھٹ کر
میں بھی ایسے ہی گھٹ کے مر جاؤں — تیرے سیمیں صبیح سینے پر!

مجھ کو درکار ہے سہارا اَب — تیری سیمیں گداز باہوں کا
دل کے زخموں کی چارہ سازی کر — غم سے سینہ فگار ہے میرا!

میرے گالوں پہ مُردنی سی ہے — دل کی دھڑکن بھی تیز ہے ہمدم
اس طرح بھینچ مجھ کو سینے سے — ختم ہو جائے شورشِ پیہم

لوک گیت
ترجمہ
مشتاق شاد

امریکی

# دُھوپ چھاؤں

کل بازار میں پھیری والا
مٹی کے دو چار کھلونے
سر پہ اٹھائے بیچ رہا تھا

"آؤ بچو بھاگ کے آؤ، اب نہ لگاؤ دیر
ایک آنے میں ہاتھی لے لو، دو آنوں میں شیر

بندر لے لو، چیتا لے لو
راون لے لو، سیتا لے لو

دیکھو میں نے اس مٹی کو کس کس رُوپ میں ڈھالا ہے
سارے رُوپ بہت البیلے، ہر کوئی متوالا ہے

اس کی ذات کچھ اور بنائی اس کو نام کچھ اور دیا
اس کی اصل بھی مٹی نکلی جس نے خود پر مان کیا"

چلتے چلتے پھیری والے نے اک ٹھوکر کھائی
سارے کھلونے ٹوٹ گئے،

مٹی کے اک بندھن سے سب چھوٹ
جیون مایا سب کی پرائی

جگ میں جھگڑے رنگوں کے ہیں
لاکھ بکھیڑے جنگوں کے ہیں

سانجھ کسی کے مکھ پر ناچے اک پرچھایا
رنگ بنا دیتا ہے سب کی صورت ہی کو
دھوپ سبھی کے من کی مایا
لیکن چھایا!

چھایا بھی ہے اُس کی جس نے پھیلائی ہے
اصل میں دونوں ایک ہیں لیکن
ایک ہی شے کو اُس نے دیئے ہیں
— جانے کیوں دو رُوپ
ذرّے تارے
انت سبھی کا ایک ہے پیارے

ادارہ

# رفتارِ علم

ادبی و تہذیبی خبریں اور تبصرے

## ملک بھر میں یومِ پاکستان کی پُرشکوہ اور رنگارنگ تقریبات

### ادب و فن کی نمایاں خدمات پر سید امتیاز علی تاج، مس زبیدہ آغا اور نور جہاں کو صدرِ پاکستان کے خصوصی اعزازات

راولپنڈی ۲۳ مارچ پورے ملک میں یوم پاکستان کی رنگارنگ تقریبات منعقد ہوئیں۔ ان تقریبات میں پرچم کشائی، فوجی پریڈ، صدارتی انعامات کی تقسیم اور چراغاں وغیرہ شامل تھا۔ صدر پاکستان نے ایک خاص تقریب میں سرکاری اور غیر سرکاری اہم شخصیتوں کو ۱۰۹ اعزازات سے نوازا۔ ادب وفن کی گراں مایہ خدمات انجام دینے کے صلے میں اس بار تین فن کاروں کو صدر کے خصوصی اعزازات عطا کئے گئے ہیں۔ ان میں ملک کے ممتاز ادیب و ڈرامہ نگار سید امتیاز علی تاج، مشہور مصورہ مس زبیدہ آغا، مایۂ ناز موسیقار خاں صاحب محمد شریف خاں آف پونچھ اور مادام نور جہاں شامل ہیں۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے صوبائی دارالحکومتوں ڈھاکہ اور لاہور میں بھی خصوصی تقریبات منعقد ہوئیں، جہاں صوبے کے گورنروں نے اعلیٰ کارکردگی کے سرکاری اور غیر سرکاری اعزازات و انعامات تقسیم فرمائے۔

## پاک بھارت جنگ کی تاریخ مرتب ہوگی

راولپنڈی۔ اطلاع ملی ہے کہ عنقریب پاک بھارت جنگ کے دوران پاکستانی عوام کے جذبۂ حب الوطنی اور مسلح افواج کی شجاعت و دلیری کے تاریخی واقعات کو قلم بند کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ وزارتِ اطلاعات و نشریات نے اس مقصد کے لئے ملک کے دونوں بازوؤں کے ممتاز اہلِ قلم کی عارضی خدمات حاصل کرلی ہیں۔ ان اہلِ قلم کی بھاری تعداد بھارتی جارحیت سے براہ راست متاثر ہونے والے علاقوں سے تعلق رکھتی ہے۔ جنگ کے مختصر حالات، پاکستان کی مسلح افواج کے دلیرانہ کارنامے عوام کے بے پناہ احساسِ فرض، عزم و جرأت

اور جوش و جذبہ کے واقعات کا تاریخی ریکارڈ، قومی نوادر اور آثار کی حیثیت سے محفوظ کیا جائے گا۔ تاکہ آئندہ نسلیں ان سے مستفید ہو سکیں۔

پیر حسام الدین راشدی نے تجویز پیش کی ہے کہ ان ایک سو ایرانی شعراء کی نظموں کا مجموعہ بھی کتابی صورت میں شائع کیا جائے جنہوں نے حالیہ جنگ کے دوران اپنے پاکستانی بھائیوں کی ہمدردی میں رزمیہ نظمیں کہی تھیں۔ اس طرح پاکستان اور ایران میں دوستی کے رشتے مزید مستحکم ہو سکیں گے۔

## فیض احمد فیض ماسکو میں۔

### یومِ پاکستان کی تقریبات میں شرکت

ماسکو۔ ۲۳ مارچ کو یہاں فرینڈشپ پیلس میں یوم پاکستان کے موقع پر ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ اس موقع پر روس پاکستان سوسائٹی کا قیام بھی عمل میں آیا۔ واضح رہے کہ پچھلے دنوں کراچی میں بھی پاکستان روس سوسائٹی قائم ہو چکی ہے جس کے نائب صدر فیض احمد فیض منتخب ہوئے تھے۔ یوم پاکستان اور روس پاکستان سوسائٹی کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کے لئے پاکستان کا سات رکنی وفد ماسکو گیا ہے جس میں فیض احمد فیض شامل ہیں۔ فرینڈشپ پیلس کی تقریبات میں روس کے نائب وزیر اعظم، وزیر امور ارضیات، دوست ممالک کی انجمنوں کی یونین کی صدر مسز نینا پابوا کے علاوہ ممتاز لیڈروں، سماجی کارکنوں اور طلبہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ مسز نینا پابوا اور دیگر لیڈروں نے پاکستان اور روس کے درمیان خوشگوار اور مستحکم تعلقات کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ معاہدہ تاشقند کے بعد دونوں ملک ایک دوسرے سے زیادہ قریب آگئے ہیں۔ اس طرح دونوں ملکوں کے عوام کو نہ صرف اقتصادی، ثقافتی اور سائنسی تعلقات کے فروغ سے فائدہ پہونچے گا بلکہ عالمی امن کے استحکام اور باہمی مفاہمت میں بھی مدد ملے گی۔ آخر میں سفیر پاکستان صاحبزادہ اقبال اطہر نے کہا کہ اب روس و پاکستان کے باہمی روابط انتہائی خوشگوار ہو چکے ہیں۔

## پنجاب یونیورسٹی کا ۹۸ واں جلسہ تقسیم اسناد

### تمام کارروائی پہلی مرتبہ اردو میں ہوئی

### ایک طالبہ نے پانچ طلائی تمغے حاصل کئے

لاہور۔ پچھلے دنوں ملک کی قدیم ترین درس گاہ پنجاب یونیورسٹی کی ۹۰ ویں جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر تاریخ میں پہلی مرتبہ اجلاس کی تمام کارروائی قومی زبان اردو میں ہوئی۔ یہ تقریب نئے کیمپس کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ صوبائی وزیر تعلیم پنجاب خدا بخش بچہ نے اپنا صدارتی خطبہ بھی اردو میں ہی دیا۔ تمغے وصول کرنے والے کل ۹۴ طلبا میں سے ۱۶ طالبات تھیں۔ مجموعی طور پر ۹۷۲ طلبا کو اسناد دی گئیں۔ جن میں سے ۳۷۶ طالبات تھیں۔ تمغات وصول کرنے والوں میں جامعہ نصرت کی ایک طالبہ مس فیروزہ فیض نے پانچ طلائی تمغے حاصل کئے۔

## طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کی ادبی نشست

کراچی۔ انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کے زیر اہتمام ایک ادبی نشست ہوئی جس کی صدارت جناب اختر حسین صدر انجمن ترقی اردو نے فرمائی۔ نشست میں مشہور ادیب جناب سبط حسن نے اپنا مقالہ "جدید عہد آبادیوں پر" تعارفاً

# مشہور روسی ادیب میخائل شولوخوف کے لئے ۶۵ء کا نوبل پرائز

## یہ انعام قدرے تاخیر سے دیا گیا ہے ٥ سویڈش اکیڈمی کا اعتراف

## "اور ڈان بہتا رہا" اس عہد کا ایک عظیم ناول ہے

اسٹاک ہوم۔ سویڈش اکیڈیمی نے ۱۹۶۵ء میں ادب کا نوبل پرائز روس کے مشہور ناول نگار میخائل شولوخوف کو دیا ہے۔ انھیں یہ انعام ان کے مشہور آفاقی ناول "اور ڈان بہتا رہا" پر دیا گیا ہے۔ اس ناول پر پہلے ہی شولوخوف کو لینن انعام بھی مل چکا ہے۔ ادبیوں کے عالمی حلقوں کا خیال ہے کہ شولوخوف ایسے عظیم ناول نگار کو یہ انعام بہت دیر میں دیا گیا ہے۔ حالانکہ ان کا یہ ناول ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا خود سویڈش اکیڈمی کا کہنا ہے کہ "انھیں یہ انعام قدرے تاخیر سے دیا گیا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے اتنا تاخیر سے نہیں دیا گیا ہے کہ اسے نوبل انعام یافتگان کی فہرست میں ہمارے عہد کے ایک ممتاز ترین ادیب کا اضافہ نہ کیا جا سکے۔" (میخائل شولوخوف دوسرے روسی ادیب ہیں جنھیں نوبل انعام دیا گیا ہے۔ اس سے قبل بورس پاسترنک کو ان کے ناول "ڈاکٹر ژواگو" پر ۱۹۵۸ء میں نوبل پرائز ملا تھا جسے انھوں نے روسی حکومت کے احکام کے مطابق مسترد کر دیا تھا۔

(میخائل شولوخوف کی عمر ساٹھ سال ہے وہ ڈان کے ایک دیہات میں رہتے ہیں۔ ان کی قیام گاہ مرجع خلائق بنی رہتی ہے۔ لوگ ان کے افکار و خیالات سے محبت کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ شولوخوف ان کے دکھوں اور خوشیوں کو اپنے دکھ اور خوشیاں سمجھتے ہیں۔ شولوخوف کی عظمت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ انھیں لیو ٹالسٹائی کا ہم پلہ ادیب سمجھا جاتا ہے۔ وہ پچھلے پچیس سال سے دنیائے ادب کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ دنیا کی ۷۳ مختلف زبانوں میں ان کی تصانیف ۴۶ بار شائع ہو چکی ہیں۔ اور صرف سوویت یونین میں ان کی کتابوں کے ۴ کروڑ دس لاکھ نسخے فروخت ہوئے۔ انھوں نے اپنا دوسرا عظیم ناول ویرانے کی آبادی ۱۹۳۲ء میں لکھنا شروع کیا تھا جو چند سال پیشتر شائع ہوا۔ آج کل وہ ایک نیا ناول لکھنے میں مصروف ہیں۔

## اردو بنگلہ کتابوں پر یونسکو کے انعامات

کراچی ۶۳-۶۴ کے دوران ناخواندگی کے لئے لکھی جانے والی کتابوں پر یونسکو انعامات کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ انعامات کا فیصلہ نیشنل بک سینٹر آف پاکستان وزارت تعلیم کی نگرانی میں کرتا ہے ہر دو سال کے بعد منتخب کتابوں پر انعامات دیئے جاتے ہیں اور ہر انعام کی رقم ۴۰۰ ڈالر ہوتی ہے۔ یہ کتابیں حسب ذیل عنوانات سے متعلق ہوتی ہیں —

'اسان سائنس۔ بین الاقوامی مفاہمت اور معاشرتی ترقی۔ دستکاری کی تعلیم۔ اردو بنگالی کی جن کتابوں کو انعام دیا گیا ہے ان کے نام یہ ہیں اردو۔ بجلی کی کہانی۔ کیپٹن علی ناصر زیدی۔ نور تعمیر۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی۔ ماڈل باغ۔ عبدالوحید ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ زراعت گدو بیراج بنگالی۔ چلی۔ مینا ڈوئل۔ کوئل۔ کوی مسیم الدین بنداری تھیکے بنداری۔ ثناء الحق۔ اردو کی کتابوں کے لئے ججوں کی کمیٹی کے چیئرمین جناب ممتاز حسن تھے۔ پیر حسام الدین راشدی اور میجر آفتاب حسن

کمیٹی کے ارکان میں شامل تھے۔ بنگالی کتابوں کے لئے ڈاکٹر انعام الحق نے جج کے فرائض انجام دیئے دیگر ارکان میں صفدر حسین خان۔ زین العابدین اے ایم شرف الدین اور مسز زبیدہ خانم تھے۔

## آدم جی۔ داؤد اور نیشنل بنک کے ادبی انعامات

کراچی۔ پچھلے دنوں پاکستان رائٹرز گلڈ کی ساتویں سالگرہ کے موقع پر آدم جی ادبی انعام۔ داؤد انعام اور نیشنل بنک آف پاکستان کے انعامات برائے سال ۱۹۶۵ء کا اعلان کیا گیا۔ انعامات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ افکار پریشاں جسٹس محمد رستم کیانی مرحوم آدم جی انعام۔ دس ہزار روپیہ۔ (۲) محمد حسین آزاد۔ پروفیسر محمد اسلم فرخی۔ داؤد انعام۔ پانچ ہزار روپیہ۔ (۳) مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ سید انور داؤد انعام پانچ ہزار روپیہ (۴) اردو بنگلہ کے مشترک الفاظ پروفیسر تبیر علی۔ داؤد انعام پانچ ہزار روپیہ (۵) زراعت اور ہماری معاشیات پروفیسر قمر الحسن صدیقی نیشنل بنک ادبی انعام پانچ ہزار روپیہ۔ دوسری زبانیں (۶) اے شارٹ ٹرم ماڈل فار پاکستان اکنامکس۔ ڈاکٹر نور الاسلام۔ نیشنل بنک ادبی انعام۔ پانچ ہزار روپیہ۔ (۷) کھاگول پرچا۔ عبدالجبار نیشنل بنک پانچ ہزار روپیہ۔ (۸) پاکستان او تھا نیتی۔ غلام اعظم صدیقی۔ نیشنل بنک ادبی انعام پانچ ہزار روپیہ۔ بچوں میں بچت اور بنکنگ کی عادت ڈالنے کے لئے مختصر کہانیوں پر ماہ طلعت عابدہ کو ایک ہزار اور سید ضامن کو پانچ سو روپے کے انعامات دیئے گئے یہ مقابلہ بنکنگ پبلسٹی بورڈ کے زیر اہتمام رائٹرز گلڈ کے تعاون سے ہوا تھا۔

## ساہتیہ اکیڈمی کا انعام

نئی دہلی مختلف زبانوں کی ۱۲ منتخب کتابوں پر بھارت کی ساہتیہ اکیڈمی نے ۱۹۶۵ء کے انعامات کا اعلان کر دیا ہے۔ اردو کا انعام راجندر سنگھ بیدی کو ان کے مشہور ناول ایک چادر میلی سی پر دیا گیا ہے۔ انعام کی رقم صرف پانچ ہزار روپیہ ہے۔

**پروفیسر منصور کے لئے صدر کا وظیفہ**

ڈھاکہ صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے بنگلہ کے ایک ممتاز محقق پروفیسر منصور الدین کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار وظیفہ دینا منظور کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کی تمام زندگی بنگلہ زبان و ادب کی تحقیق و تدقیق میں گذری ہے وہ مسلم دور اور لوک ادب پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔

## جاگو ہوا سویرا کو ایک اور اعزاز

کراچی۔ کینیا کے بین الاقوامی فلمی میلے میں پاکستانی فلم "جاگو ہوا سویرا" کو ۱۹۶۵ء کا انعام دیا گیا ہے، اس فلم کی کہانی فیض احمد فیض نے لکھی ہے اس سے قبل بھی اس فلم کو بین الاقوامی اعزاز مل چکا ہے۔

## کشمیری ادب پر ایک اہم کتاب

راولپنڈی۔ کشمیری ادب کی مختصر تاریخ اور کشمیری زبان کے بنیادی قواعد پر مشہور کشمیری ادیب و صحافی جی۔ اے کشفی کی کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے اس کتاب کو بے حد پسند کیا گیا ہے۔ کتاب کا تعارف مشہور کشمیری رہنما میر واعظ محمد یوسف نے تحریر کیا ہے۔

## جاپانی خاتون کو پی۔ایچ ڈی کی ڈگری

جموں۔ پنسلونیا (امریکہ) کی یونیورسٹی نے جاپان کی ایک خاتون سکالر مسز نوریکو کوان کی کتاب "توی کی کہانیاں" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔ یہ مجموعہ جموں کی لوک کہانیوں پر مشتمل ہے۔ جس کا دیباچہ خود انھوں نے لکھا ہے مسز نوریکو نے ۱۹۶۲-۶۳ میں جموں کا دورہ کیا تھا جہاں انھوں نے ڈوگری زبان کے ایک شاعر پروفیسر رام ناتھ شاستری کے اشتراک سے ۴۳۹ لوک کہانیاں جمع کی تھیں۔

## استاد بڑے غلام علی کو نیا اعزاز

کلکتہ۔ عالمی شہرت یافتہ موسیقار استاد بڑے غلام علی خاں کو کلکتہ یونیورسٹی کی ایک خصوصی تقریب میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دی گئی ہے اس سے قبل انہیں سنگیت سمراٹ اور پدما بھوشن کے علاوہ صدارتی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

## امیر عارفی کو مجاز طلائی تمغہ

علی گڑھ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طالب علم اور اردو کے مشہور شاعر اسرار الحق مجاز مرحوم کے نام سے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی نے ہر سال "مجاز طلائی تمغہ" دینے کا فیصلہ کیا ہے یہ تمغہ ہر سال یونیورسٹی کے اس طالب علم شاعر کو دیا جائے گا۔ جس کی تخلیق کو یونیورسٹی کا مقررکردہ بورڈ سال کی بہترین تخلیق قرار دے گا ۱۹۶۵ء کے مجاز طلائی تمغہ کے لیے ایم اے سال آخر (اردو) کے طالب علم امیر عارفی کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان کو یہ تمغہ جلسۂ تقسیم اسناد میں دیا جائے گا۔

دہلی۔ پنجابی زبان کے ادیب کرتار سنگھ دگل کو ان کے افسانے اک چھٹ تر ساہتیہ اکیڈمی نے ۱۹۶۵ء کا انعام دیا ہے۔

## ایران و پاکستان کے تہذیبی رشتے

کراچی۔ پاکستان و ایران کلچرل ایسوسی ایشن کے صدر جناب ممتاز حسن نے پاکستان اور ایران کے عوام کے درمیان قدیم مذہبی تہذیبی اور ثقافتی تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے دونوں ملکوں کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے عوام میں آزادانہ تبادلہ خیال پر زور دیا ہے۔ انھوں پاکستانی مصنفین سے کہا ہے کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں تخلیقی و تاریخی کام پر صرف کریں اور برصغیر کے ممتاز مسلم مصنفین نے جو اعلیٰ روایات قائم کی ہیں ان کو برقرار رکھیں۔ انھوں نے کہا کہ ایران میں ادب و تاریخ کے شعبوں میں جو زبردست کام ہو رہا ہے پاکستانی مصنفین کو اس کی تقلید کرنی چاہیے۔ آپ پاکستان و ایران کلچرل ایسوسی ایشن کے مرکز میں فارسی کی ان چار سو کتابوں پر تبصرہ کر رہے تھے جو سید حسام الدین راشدی کو ان کے دورۂ ایران اور روس میں دونوں ممالک کی حکومتوں نے بطور تحفہ دی تھیں۔

## تلوک چند محروم کی وفات

دلی۔ اردو کے بلند پایہ شاعر پنڈت تلوک چند محروم پچھلے دنوں طویل علالت کے بعد دلی میں انتقال فرما گئے۔ آپ جگن ناتھ آزاد کے والد تھے۔ آنجہانی محروم نے تمام عمر اردو شعر و ادب کی گرانمایہ خدمات انجام دیں۔ ان کی وفات سے اردو ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔

## فخر ماتری رحلت فرما گئے

کراچی۔ یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ملت۔ لیڈر اور روزنامہ حریت کے چیف ایڈیٹر مسٹر فخر ماتری رحلت فرما گئے۔ وہ محب وطن چوٹی اور دیانتدار صحافی تھے ان کی موت ایک ایسا سانحہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مرحوم فخر ماتری صحافت میں آزادی خیال اور اظہار رائے کے بہت بڑے حامی تھے۔

## اقبال اکیڈمی کا تحقیقاتی پروگرام

کراچی ۔ اقبال اکیڈمی نے علامہ اقبال کے نظریات کے تحت، علوم فلسفہ ۔ اسلامیات اور عمرانیات پر تحقیقات کے لئے ایک وسیع و جامع پروگرام مرتب کیا ہے ۔ اقبال اکیڈمی جو ۱۹۵۳ء میں قائم ہوئی تھی اب تک ۳۸ کتابیں شائع کر چکی ہے اکیڈمی نے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قیمتی اور اہم مواد فراہم کر لیا ہے ۔ اس کے علاوہ اکیڈمی کی لائبریری میں علامہ اقبال پر دنیا کی بیشتر زبانوں میں لکھی ہوئی کتابیں بھی جمع کی جا رہی ہیں

## انسانی عظمت کا راز غور و فکر میں ہے

حیدرآباد ۔ سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب حسن علی عبدالرحمن نے پچھلے دنوں ادارہ تعلیم کے ہفتہ تعلیم کا افتتاح کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ انسان کی عظمت کا راز غور و فکر کرنے اور اس کے نتائج کو عملی شکل دینے میں مضمر ہے، انھوں نے کہا کہ معیار تدریس کو بہتر بنانے کے لئے اس قسم کے ہفتے منانا بہت ضروری ہیں ۔ معاشرے کو غام گرنٹ کورٹ سے فائدے کے بجائے الٹا نقصان پہونچتا ہے ۔

## خاطر غزنوی چین میں

پشاور ۔ پشاور یونیورسٹی شعبہ اردو کے لیکچرار اور مشہور شاعر جناب خاطر غزنوی چینی زبان کی تعلیم حاصل کرنے پیکنگ گئے ہیں وہ چین میں تین سال تک قیام کریں گے اور پاکستان واپس آکر پشاور میں چینی زبان کی تعلیم دیں گے ۔

## سعادت حسن منٹو کی یاد میں

راولپنڈی ۔ پچھلے دنوں حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی نے اردو کے مشہور ادیب سعادت حسن منٹو کی برسی منائی ۔ اس موقع پر ملک کے ممتاز ادبا و شعرا کا ایک اجتماع ہوا جس کی صدارت منٹو کی بیوہ بیگم صفیہ منٹو نے کی ۔ اس رجحان کو روکنے کے لئے کہ لاہور کے کچھ پبلشر منٹو مرحوم کے افسانے اجازت کے بغیر طبع کرتے رہتے ہیں ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں خالد حسن ۔ جمیل الدین عالی بیگم سکندرہ بابر اور حامد جلال شامل ہیں ۔ مسٹر اعجاز حسین بٹالوی ۔ مسٹر ناصر انوار ۔ اور مسٹر وحید قریشی کو قانونی مشیر مقرر کیا گیا ۔

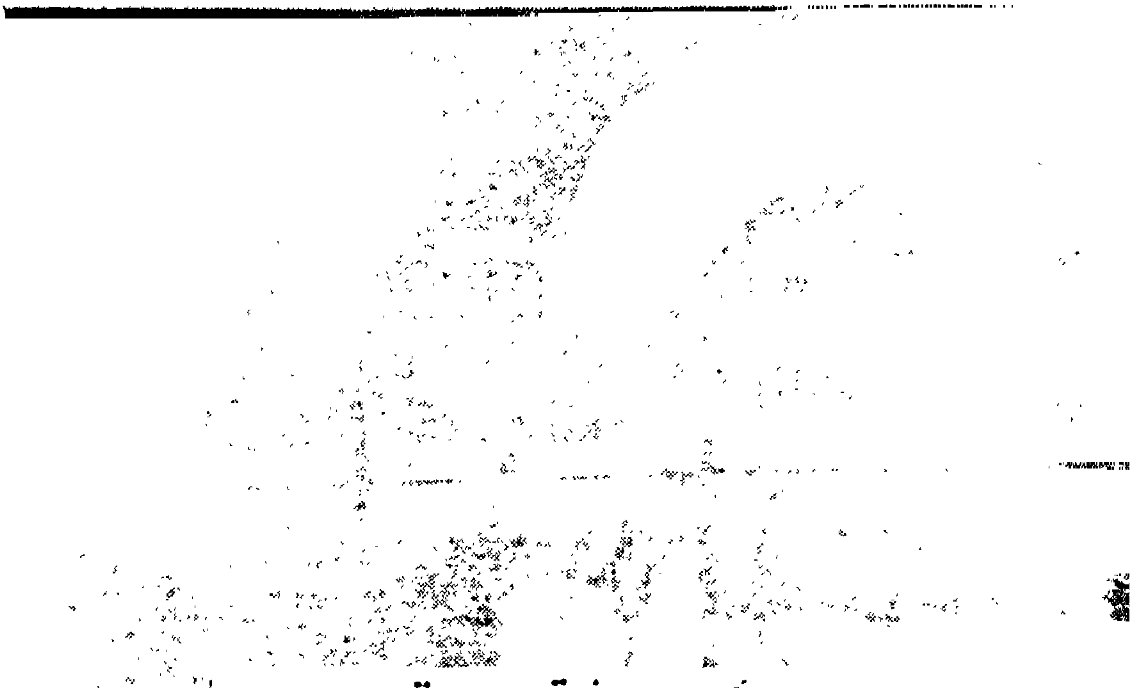
## اردو ہر پاکستانی کی زبان ہے

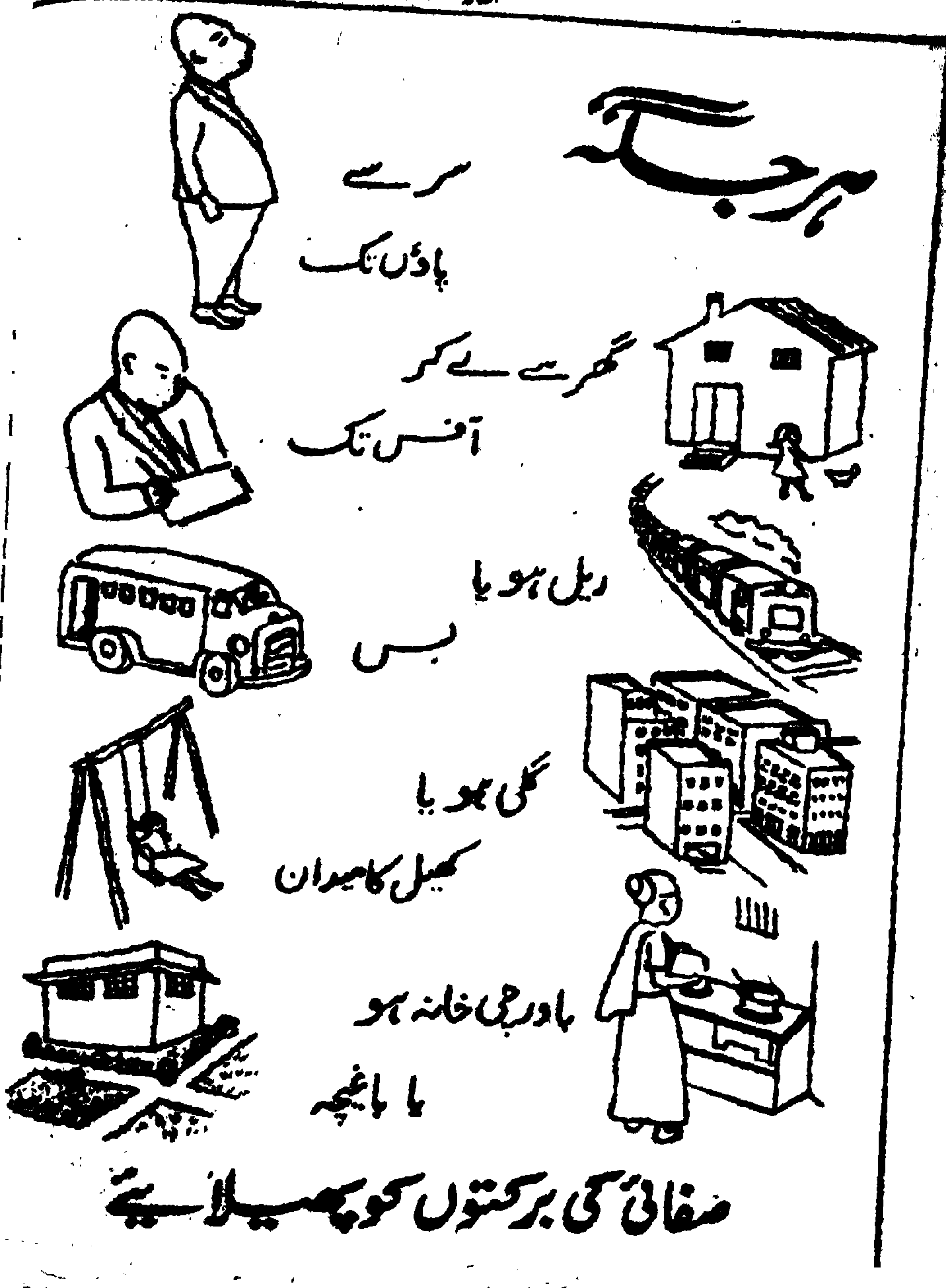
### جسٹس رحمان کا اظہار خیال

پشاور ۔ سپریم کورٹ کے مسٹر جسٹس ایس ۔ اے رحمان نے جو مرکزی ترقی اردو بورڈ کے صدر بھی ہیں اردو ترقی بورڈ پشاور شاخ کے قیام کے موقع پر ۔ دانشوروں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو نے قومی اتحاد کے سلسلہ میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اسی لئے ہم نے اس کی نشر و اشاعت کی ذمہ داریاں قبول کی ہیں اس کے باوجود کہ اردو ملک کے کسی حصہ کی زبان نہیں ہے وہ ہر پاکستانی کی زبان ہے ۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ ایک وقت آئے گا جب اردو اور بنگالی ملک کی دو قومی زبانیں سرکاری زبانوں کی حیثیت سے حکومت کے کاروبار کو چلانے کا ذریعہ ہوں گی ۔

دلی ۔ مجلس اشاعت ادب باڑہ ہندو راؤ دہلی نے اردو کے عظیم شاعر مصحفی کا کلام شائع کیا ہے ۔

مدیر: صہبا لکھنوی | طابع: مشہور آفسٹ پریس کراچی | دفتر: رابسن روڈ کراچی | اپریل سنہ ۱۹۶۶ء






جاری کردہ ۔ حکومت پاکستان

# نوشیروانِ عادل
# اور حاضر جواب بوڑھا!



سرزمین ایران کی ایک مشہور حکایت ہے کہ ایک روز نوشیروان عادل شکار کو جارہا تھا۔ راستہ میں اس نے ایک بڑھے کو ایک پودا لگاتے دیکھا۔ بادشاہ نے بڈھے سے پوچھا: "بابا! کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اس پودے کا پھل کھا سکو گے؟"

بوڑھے نے فوراً نہایت ادب سے جواب دیا: "عالم پناہ! ہم زندگی بھر دوسروں کے لگائے ہوئے درختوں کے پھل کھاتے رہے ہیں، اب ہمارے لگائے ہوئے درختوں کے پھل دوسرے کھائیں گے۔"

بوڑھے کی اس حاضر جوابی پر بادشاہ بیحد خوش ہوا اور اسے ۱۰۰ درنار انعام میں دیئے ۔ بوڑھے نے جھک کر سلام کیا اور کہا: "دیکھا عالی جاہ! میرا لگایا ہوا درخت تو میری زندگی ہی میں پھل لے آیا!"

اس پر نوتیرواں اور بھی مسرور ہوا اور مزید ۱۰۰ دینار بوڑھے کو مرحمت کئے۔ دوسرا انعام لیتے ہوئے حاضر جواب بوڑھے نے کہا: "دیکھئے حضور! دوسروں کے لگائے ہوئے درخت سال میں ایک ہی بار پھل لاتے ہیں مگر میرا درخت تو ایک دن میں دو بار پھل لے آیا!"

بادشاہ کو بوڑھے کی یہ بات بھی پسند آئی چنانچہ تیسری بار ۱۰۰ دینار بوڑھے کو انعام دینے کا حکم فرمایا۔

اس طرح حاضر جواب بوڑھے نے فیاض بادشاہ سے تین انعامات حاصل کر لئے۔

**لیکن انعامی بونڈ پر انعام پانے کے لئے حاضر جوابی کی ضرورت ہے اور نہ کسی بادشاہ کی فیاضی کی!**

**بیش قیمت انعامات پانے کیلئے فوراً ہر سلسلے کے بونڈ خریدیئے اور انعام حاصل کرنے کے بیشمار مواقع سے پورا فائدہ اٹھائیے۔ ہر سہ ماہی پر انعامی بونڈ کے ہر سلسلہ میں ۵۰ ہزار روپے کے نقد انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں**

ہر بار کے لئے
بچت کیجئے
اپنے وطن کے لئے

# انعامی بونڈ

وطن کی ترقی اور حفاظت کے لئے

تمام منظور شدہ بینکوں اور ڈاکخانوں سے مل سکتے ہیں

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات کراچی۔ لاہور۔ پشاور۔ کوئٹہ

جاری شدہ: ۱۹۴۵ء * ٹیلی فون: ۴۳۹۹۳

# افکار

سال: ۲۲ ○ شمارہ: ۱۷۸

مدیر

**صہبا لکھنوی**

| زرِ سالانہ | بیرونی ملکوں سے | | فی پرچہ |
| --- | --- | --- | --- |
| ۱۲ روپے | ۴۰ شلنگ | ۱۰ ڈالر | ایک روپیہ |

**مکتبۂ افکار**

رابسن روڈ کراچی

لندن آفس

۱۴۔ پرنسیز ایونیو۔ لندن۔ این۔ ڈبلیو ۹

افکار



شب خون ۵۵

## جون ۱۹۶۶ء کی تخلیقات

# اشاریہ

علم و آگہی کے بغیر کسی بھی ملک، کسی بھی قوم اور کسی بھی معاشرہ کی ہمہ گیر ترقی اور اس کا استحکام ممکن نہیں۔ پاکستان نے ایک نوزائیدہ مملکت کی حیثیت سے صنعتی اور اقتصادی میدان میں بلاشبہ قابلِ رشک ترقی کی ہے لیکن افسوس کہ علم و تعلیم کے میدان میں یہ رفتارِ ترقی کسی طرح بھی تسلی بخش نہیں۔ اسباب و علل خواہ کچھ بھی ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہماری نئی نسل جس پر ملک و قوم کے مستقبل کا تمام تر انحصار ہے انتہائی غیر مطمئن اور غیر تسلی بخش حالات میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

پچھلے دنوں تعلیمی کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ رپورٹ بھی ان تعلیمی مسائل کا تسلی بخش حل تلاش کرنے میں ناکام رہی ہے۔ جن سے طلبہ برادری ۱۸-۱۹ سال سے دوچار ہے اور جس کے نتیجے میں بارہا ناخوشگوار واقعات رونما ہوئے اور تعلیمی ادارے بند رہے۔ ایک مہذب، زندہ اور باشعور قوم کی حیثیت سے ہمارا یہ اولین فرض ہے کہ ہم تعلیم جیسی بنیادی ضرورت کی تکمیل پر اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیں کہ اس کے بغیر اقتصادی اور صنعتی ترقی بے معنی ہے۔ درس گاہوں کی افراط ہو، تعلیم عام ہو، فیسیں اتنی ہوں کہ والدین بآسانی ادا کر سکیں۔ تعلیمی نظام ایسا ہو کہ ہمارے قومی تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ ہمیں توقع ہے کہ اربابِ اقتدار تعلیمی کمیشن کی رپورٹ پر ہمدردانہ غور ہی نہیں نظرثانی بھی فرمائیں گے اور ان خامیوں اور کوتاہیوں کو دور فرمائیں گے جو دانستہ یا نادانستہ اس رپورٹ میں سرزد ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر مشنری اسکولوں کے قیام کی سفارش جو کسی طرح بھی ہمارے قومی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ نہیں۔

## آئندہ شمارے میں

○ دشتِ امکاں کا ایک سفر۔ اس عہد کے نمائندہ شاعر عزیز حامد مدنی کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ۔ دوسری قسط ○ کوثر چاند پوری اور سجاد نظر کی نئی کہانیاں ○ جمیل زبیری کا خوب صورت ڈراما۔ اپنا کھیل ○ انجم اعظمی اور آغا افتخار حسین کے فکر انگیز مضامین۔

انجم اعظمی

# شبلی کا نصب العین

ایک شخص جو سامنے سڑک پر گزرتے ہوئے ٹریفک کو دیکھ کر بچتا ہوا چلتا ہے۔ اپنے کمرے میں گری ہوئی سوئی کو ڈھونڈ لینا اس کے لئے اتنا آسان نہیں ہوتا اسی طرح شبلی کی زندگی کے حالات اور کتابوں سے واقفیت کے مقابلہ میں ان کے ذہن، نظریہ اور نصب العین کو ان کے حالات زندگی، تخلیقات اور اسلوبِ تحریر میں تلاش کر لینا نسبتاً دشوار امر ہے۔ شبلی، الفاروق اور شعر العجم جیسی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں جن کی خوشبو اردو داں حضرات کا حلقہ توڑ کر دنیا کے مختلف گوشوں تک پہنچ گئی ہے لیکن شبلی کی زندگی ایک بحرِ ذخار تھی ہم کو چاہیئے کہ اس سمندر کی تہہ میں ڈوب کر اس کی گہرائی کا صحیح اندازہ کریں۔ جہاں سے الفاروق شعر العجم اور سیرت نبوی کے علاوہ دوسرے کئی انمول موتی برآمد ہوئے ہم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ زمان و مکان کی کن وسعتوں کو اس سمندر کی گہرائی نے سمیٹ لیا ہے اور میٹھے پانی سے بھرے ہوئے بادل اس سمندر سے اٹھ اٹھ کر خشک کھیتوں کو کس آنے والے زمانے تک سیراب کرتے رہیں گے

شبلی اپنے عہد کے بہترین انشا پرداز تھے۔ اردو کی تخلیقی نثر شبلی ہی کی روایت ہے محمد حسین آزاد کی نثر بے حد خوبصورت اور دلآویز ہے۔ لیکن وہ منفرد اندازِ نگارش ہی کی حیثیت سے زندہ رہے گی۔ ہمارے عہد کے تقاضوں اور علم و فن کے موضوعات سے ہم آہنگ نہیں ہے بلکہ بجائے خود فن کا ایک اعجاز ہے؟ سرسید اور حالی کی نثر شبلی کی زبان کے مقابلے میں بے جان اور پھیکی ہے اسی لئے نثر کے ارتقا میں غالب کے بعد شبلی ہی کا نام آتا ہے وہ عالم بھی اتنے بڑے تھے کہ دنیائے اسلام میں ہندوستان سے مراکش تک ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔ اہل سیاست کی مکاریوں اور چالبازیوں سے ان کا تعلق دور دور تک نہ تھا لیکن سیاسی سوجھ بوجھ کے اعتبار سے درجہ اول کا ذہن رکھتے تھے۔ علی گڑھ آ کر سرسید کے کالج میں ملازم اور اصلاحی تحریک کے سرگرم کارکن بنے' لیکن ندوہ کا قیام بھی انہیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا وہ اردو اور فارسی دونوں کے بے مثل شاعر تھے۔ شاعری ان کی زندگی میں ثانوی حیثیت رکھتی تھی لیکن اردو میں مخصوص طنزیہ سیاسی اور اخلاقی نظموں کی طرف سب سے پہلے شبلی ہی نے توجہ دی۔ جوش اور اقبال جیسے بڑے شعرا ان کی نظموں سے متاثر ہوئے ہیں۔ ان کی فارسی غزلوں میں جذبات کی گرمی اس حد تک ہے کہ صرف ان کے تاثرات سے شبلی کی زندگی پر ایک افسانوی رنگ چڑھ جاتا ہے اور شبلی کی زندگی کا مطالعہ کرنے والا انہیں صرف اعظم گڑھ ندوہ (لکھنؤ) اور علیگڑھ ہی میں نہیں ڈھونڈھتا بلکہ بمبئی کا نام آتے ہی شبلی کا وہ عالم اس کے سامنے ہوتا ہے جب بمبئی سے دور رہ کر بمبئی کی یاد انہیں بیقرار رکھتی تھی اس پر پردہ ڈالنے کی نہ شبلی نے کوشش کی اور نہ ہمیں کرنی چاہیئے ورنہ شبلی کی عظیم شخصیت اور اس کا خالص انسانی پہلو' ان کی ذہانت کی آب و تاب اور علم و تجربہ کے وقار میں جو تڑپ' رنگینی اور رعنائی کے عناصر شامل ہیں اپنا سراغ مشکل ہی سے پانے دیں گے ہم سے اور آپ سے زیادہ اس کا شعور خود شبلی کو تھا۔ ان کے جگری دوست حبیب الرحمٰن شیروانی نے شبلی کو اس سلسلے میں مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ

ایسا سارا مواد تلف کر دیں جن میں حیات شبلی کی بعض نجی باتیں محرمانہ انداز میں موجود ہیں لیکن انھوں نے اس مشورے کو قبول نہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کے ہر رُخ سے دانستہ نقاب اٹھالی تھی وہ ایک عالم کی طرح حقیقت کا مطالعہ اور عاشق بن کر زندگی کے جمال کی پرستش کرتے رہے اسی وجہ سے ڈاکٹر خورشید الاسلام نے شبلی کے مزاج کو یونانی بتایا ہے لیکن انھوں نے شبلی پر جو مضمون لکھا ہے اس میں پوری طرح اس بات کو نبھایا نہیں گیا۔ انشا پردازی کی شعوری کوشش کی بنا پر خورشید الاسلام کی تحریروں میں انتہا پسندی کا رجحان ملتا ہے ورنہ یہ بات کہ شبلی مذہبی عقیدت کے بجائے آگہی تنگ نظری کی جگہ روشن خیالی اور ماضی کی پیروی کے بجائے دانش پسندی کی جانب مائل تھے حرف بہ حرف صحیح ہے ان کی زندگی کا آخری کارنامہ شبلی منزل اور شبلی اسکول اعظم گڈھ اور اب شبلی کالج ہو چکا ہے، کا قیام ہے۔ کراچی کی شبلی ویلفیر اسوسی ایشن ان کے آخری منصوبے کی ایک نئی کڑی ہے جو شبلی کے خوابوں کی تعبیر چاہتی ہے اور اس کے لئے کوشاں ہے۔ اسی لئے ہمارے سامنے آج کا سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اپنی کون کون مصروفیات تھے جن کے بہانے شبلی کیا چاہتے تھے ان کی روح اتنی بے تاب کیوں تھی وہ لگن ان میں کہاں سے آئی کہ ساری زندگی کام کر کے نہیں تھکے موت آئی تو موت سے بھی شبلی کو یہی گلہ رہا کہ میرے سارے کام ادھورے رہ گئے

جب تک شبلی علیگڑھ نہیں پہنچے تھے وہ مذہبی انتہا پسندی کا شکار رہے تھے سرسید نے ان میں وہ اعتدال پیدا کیا جس سے ملائیت ختم ہوئی اور ایک تربیت یافتہ ذہن علم و آگہی کی شاہراہ پر چل پڑا۔ سرسید عمر میں شبلی سے چالیس سال بڑے تھے۔ شبلی کے استاد نہ ہونے کے باوجود سرسید نے ان کے استاد مولانا فاروق چریاکوٹی سے زیادہ ان کی تربیت میں حصہ لیا اور ان کے رخ کو قدیم سے جدید کی طرف موڑ دیا۔ مولوی عبدالحق ساری زندگی شبلی کو سرسید کا مخالف ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہے حالانکہ سرسید کا شبلی سے بڑا مداح پیدا ہی نہیں ہوا۔ شبلی کی نظم و نثر دونوں ہی اس کے گواہ ہیں۔ البتہ یہ سچ ہے کہ سرسید سے انتہائی عقیدت کے باوجود شبلی ان سے دوسروں کی نسبت زیادہ ہی اختلافات رکھتے تھے لیکن اختلاف رائے کو مخالفت اور دشمنی سے جا ملانا مولوی عبدالحق جیسی نامور شخصیت کا کام تو ہو سکتا ہے مجھ جیسی معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا یہ جرات نہیں کر سکتا۔ ارسطو نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اسے اپنے استاد (افلاطون) سے محبت ہے۔ لیکن صداقت اسے اپنے استاد سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ سرسید سے شبلی کے اختلافات کی نوعیت بھی ایسی ہی تھی۔ سرسید کی زندگی میں نہ انھوں نے علی گڈھ چھوڑا اور نہ سرسید ہی نے ایسا چاہا۔ سرسید نے انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کی .... رہنمائی کی تھی (اس میں کوئی تعصب شامل نہیں تھا ہندو پہلے ہی اس جانب متوجہ ہو چکے تھے۔ ان کے غیر متعصب ہونے کا ثبوت اس سے واضح طور پر مل جاتا ہے کہ بعض ہندو اکابر سرسید اور علی گڈھ تحریک کے حامی تھے اور انکی مالی معاونت بھی کرتے تھے) شبلی کو معلوم تھا کہ سرسید کا پوری قوم پر یہ بہت بھاری احسان ہے۔ تحصیل علم کا جو سلسلہ ان کی زندگی میں آخر تک جاری رہا۔ اس میں سرسید کی تربیت کا بڑا دخل تھا۔ سرسید کا کتب خانہ شبلی کے ذوق علمی کی مخصوص عبادت گاہ تھی۔ اس سے متعلق علی گڈھ میں ایک واقعہ سنا تھا آپ بھی سن لیجئے۔ ایک روز وہ سرسید کی لائبریری میں کتابوں کو الٹتے پلٹتے کھڑے کھڑے کسی کتاب کے مطالعہ میں ایسے غرق ہو گئے کہ شام ہو گئی۔ انھیں وقت کے گزرنے کا کوئی احساس نہ ہوا جب تھک کر چور ہو گئے بے ہوش ہو کر گر پڑے تو دوسروں نے آکر انھیں اٹھایا۔ ایک دوسرا واقعہ وہ بھی ہے کہ لاہور میں ایک استاد سے انھوں نے ایک مشکل کتاب استاد کے ساتھ گھر سے کالج تک روزانہ قدم ملا کر چلتے ہوئے پڑھی۔ روزانہ صبح سویرے استاد کے گھر کے سامنے پہنچ جاتے تھے۔ اور جب وہ گھر سے نکلتے تو ساتھ ہو لیتے تھے۔ بھلا کسی کو اتنی لگن ہوگی کہ استاد کو فرصت نہ ہو تو یوں پڑھے۔ علم سے اتنے گہرے لگاؤ کے بعد جس کا اندازہ ان واقعات سے ہوتا ہے۔ ان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ انگریزی تعلیم اور اس کی خوبیوں کے منکر ہوتے۔ البتہ جس انداز میں انگریزی تعلیم کا مقصد نوکری حاصل کرنا قرار پا گیا تھا۔ شبلی کی نظر میں کھٹکتا تھا۔ اور شبلی پہ ہی کیا منحصر ہے نوکری ہی کی اہمیت ہے تو معاشیات ہی کے کسی معمولی پروفیسر سے پوچھ لیجئے کہ جس ملک میں تعلیم کا مقصد نوکری حاصل کرنا ہوگا قومی زندگی

یا اس کے کتنے سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا شبلی کی نگاہ میں تعلیم کے اعلیٰ مقاصد تھے جو سرسید کی نظر میں بھی تھے لیکن وقتی ضرورت کا شکار ہو گئے تھے۔ اس سطح پر سرسید سے شبلی نے اختلاف کیا لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ہم لوگ کیوں چپ ہیں کیا ہمارے ملک میں علم کا وہ معیار قائم ہو چکا ہے جس کے بعد کچھ کہنے سننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ بات بظاہر میں اپنی جانب سے کہہ رہا ہوں لیکن حقیقتاً یہ شبلی کی صدائے بازگشت ہے جس تعلیم کا آغاز سرسید نے کیا تھا وہ اب عام ہو چکی ہے۔ اس کے فوائد سے کون انکار کرسکتا ہے۔ لیکن جو اندیشے شبلی کے ذہن میں تھے وہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو چکے ہیں

علی گڑھ میں شبلی کے دوست آرنلڈ بھی تھے جن سے شبلی فرانسیسی سیکھ رہے تھے۔ انگریزی ہو یا فرانسیسی علم کا قدم جہاں بھی تھا شبلی کو اس سے گریز نہ تھا لیکن انگریزی حکومت کے بارے میں شبلی بالکل خوش فہم نہیں تھے یہیں سے شبلی اور سرسید کا سیاسی اختلاف رونما ہوتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد، حالی اور دوسرے حضرات سرسید سے اختلاف رائے رکھتے تھے لیکن سرسید جیسے جری، بیباک اور دھن کے پکے آدمی کے سامنے اختلاف کی جرات نہیں تھی شبلی اپنے علم اور فطرت دونوں ہی سے مجبور تھے۔ غلامی ان کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتی تھی۔ اسی لئے وہ انگریزی علم و ادب سے استفادہ کے قائل تھے۔ ثقافت اپنی چاہتے تھے اور اس کے لئے جو کوششیں وہ ساری زندگی کرتے رہے ان کا سب کو علم ہے۔ ان کا سر ارباب اقتدار کے آگے جھکنے کا روادار نہیں تھا مسلم لیگ تو الگ رہی اس زمانے کی کانگریس بھی ان کا معیار نہیں بن سکتی تھی۔ وہ ان کانگریس والوں سے خوش نہیں تھے جو حکومت سے حقوق کی بھیک مانگا کرتے تھے۔ ادھر مانگے ہوئے ٹکڑوں پر جن کا گزارا ہو رہا تھا مسلم لیگ کے بارے میں بھی اپنی رائے کا ایک خط میں اظہار کیا ہے۔ مسلم لیگ کی جماعت جاگیرداروں اور زمینداروں سے بھری ہوئی تھی۔ شبلی سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ لوگ قوم پر وقت آئے گا تو قربانیاں دے سکیں گے۔ بھلا اس وقت مسلم لیگ اس کا کیا جواب دیتی لیکن آج مسلم لیگ نے اس کا جواب مہیا کر دیا ہے۔ ہماری قومی زندگی میں جو شکست و ریخت، سیاسی بنیاد جس طرح غتا ہو چکے تھے سیاسی میدان کے سارے پہلوانے کھلاڑی اپنا اپنا ایمان بیچ کر ذاتی شان و شوکت اور امارت کے بندوبست میں لگے ہوئے ہیں یہ گمراہی کیا ہمیں شبلی کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے

در اصل سماجی انقلاب کا جو ڈھانچہ سرسید نے بنایا تھا اس کی نظری تکمیل شبلی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ بعض علی گڑھ والے سرسید کی ہر بات صحیح مان کر سرسید تحریک سے عدم آگاہی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ سرسید ایک عظیم رہنما تھے۔ انھوں نے غلطیاں بھی کی تھیں اور اپنے خلوص کی وجہ سے مصلحت کوش بھی رہے۔ شبلی ان غلطیوں کو تحریک سے الگ کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ سرسید سے ان کا مختلف الرائے ہونا قومی زندگی اور سرسید کی سماجی تحریک سے گہرے تعلق کا نتیجہ تھا۔ مسلمان قوم نے اس برصغیر میں اب تک سرسید سے آگے قدم نہیں اٹھایا ہے اور ان کی غلطیوں کو جوں کا توں قبول کر رکھا ہے لیکن اگر سرسید کے مشن کو پورا کرنا ہے تو ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم شبلی کے آدرش کو اپنا لیں۔ سرسید زبردست مصلح تھے۔ شبلی غالب کے بعد ہماری تہذیب کے دوسرے بت شکن ہیں جو ہمیں علم و ثقافت کی روشنی میں ایک باعزت قوم کا آزاد شہری دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے یہ بات شبلی کے سماجی، سیاسی، ثقافتی اور علمی تصورات کو سامنے رکھ کر کہی ہے۔ میں اپنے زمانے کے ان حضرات سے جنھوں نے لکھنے کی ذمہ داری قبول کرلی ہے۔ لیکن آج یہ کہہ کر لکھنا بند کر چکے ہیں کہ وہ کس کے لئے لکھیں اور کیا لکھیں جب کوئی کسی کی بات سننے یا ماننے کو تیار نہیں۔ یہ عرض کر دوں گا کہ سرسید کے زمانے میں شبلی اپنے علمی، سماجی اور سیاسی تصورات کی بنا پر ہمارے روایت پرست معاشرے میں قبول نہیں کئے گئے تھے۔ لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا تھا وہی آج ہمارے کام آنے والا ہے۔ تو آپ بھی آنے والے عہد کے لئے تحریری دستاویز چھوڑ جائیں اور اس الزام سے بری ہو جائیں کہ سرسید اور شبلی کی روایت کو آپ نے آگے بڑھانے میں مدد نہیں دی۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو وہ شبلی کے آدرش کو بخوبی سمجھتا ہے کہ موافق اور ناموافق حالات میں کمال تک پہنچنے کی کوشش اور علم و حقیقت کی تلاش ہی انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے اور ثقہ تحریروں سے تاریخ مرتب کرنا اپنے عہد کا سب سے معتبر کام ہے۔

آغا افتخار حسین

# روس میں اردو

سوویت یونین میں سائنس اکادمی سے ملحق مشرقی علوم کا ایک ادارہ ہے جہاں مشرقی ممالک کی زبان، ادب، تاریخ، تمدن وغیرہ کے بارے میں تحقیق کی جاتی ہے۔ اس ادارے کے پروفیسر رضا رؤف گذشتہ مارچ میں پاکستان آئے تھے۔ ان سے پریس کلب میں میری ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ سوویت یونین میں اردو زبان اور ادب کے مطالعے کے بارے میں مجھے کچھ اطلاعات فراہم کریں۔ موصوف نے چند روز ہوئے ایک نوٹ ارسال کیا ہے جو اس ادارے کے ایک محقق گلے بوف صاحب نے تیار کیا ہے۔ اس میں جو معلومات پیش کی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:-

دوسرے ممالک کے دانشوروں کی طرح روس کے اہل قلم بھی پاکستان اور ہندوستان کی ثقافت میں عرصے سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ انقلاب روس سے پہلے جن دانشوروں نے ہندوستان سے متعلق مطالعہ اور تحقیق کی اور مقالات تحریر کئے ان میں لیبے دوف، پیتروف، کوسووچ، میناییف، اولڈن برگ، شیر باتسکی کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے انیسویں صدی میں ہندوستان کی تاریخ فلسفہ، ادب، ـــــ مذہب وغیرہ پر مقالے شائع کئے۔ اردو زبان کے مطالعے میں بھی دلچسپی لی گئی اور سنہ ۱۸۹۰ء میں میرامن کی باغ وبہار کے کچھ حصوں کے ترجمے شائع ہوئے۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں حیدر بخش حیدری کی طوطا کہانی شائع ہوئی۔ اور اس کے ساتھ ایک اردو۔ روسی لغت بھی شائع ہوئی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں امیر خسرو کے کلام کا کچھ حصہ پہلی بار روسی زبان میں شائع ہوا۔

دور حاضر میں ہندوستانیات ( Indology ) کے بانی پروفیسر بارانی کوف ہیں۔ جنہوں نے دو سو سے زائد مقالے ہندوستان سے متعلق تحریر کئے ہیں۔ انہوں نے "اردو نثر کے نمونے" اور اس کے بعد اردو ادب پر ایک مقالہ سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع کیا، اور اردو شاعری اور دیگر تصانیف پر متعدد تبصرے تحریر کئے۔ یہ تصانیف اردو کے بارے میں جدید تصنیف اور تحقیق کی بنیادیں قرار دی جاتی ہیں۔ ان کے بعد اردو کے مطالعے کا شوق بڑھتا رہا۔ ایک خاتون ادیب کوندراتیا نے غالب کی چند غزلیات کا ترجمہ کیا۔ دیگر محققین نے بھی جدید شاعری اور نثر کی تنقید اور ادبی رجحانات کا غور مطالعہ کیا ہے اور مضامین شائع کئے ہیں۔

جن اداروں میں اردو زبان پر تحقیق کی جاتی ہے۔ ان میں ماسکو کا "ایشیائی عوام کا ادارہ" جو سوویت یونین کی سائنس اکادمی

سے طرح بے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس ادارے کی ایک شاخ لینن گراڈ میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ لینن گراڈ، ماسکو، اور تاشقند کی یونیورسٹیوں میں مشرقیات کے شعبوں کے اساتذہ اور دانشور بھی تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

حال ہی میں اردو کے بارے میں جو تحقیقی کتب اور مقالے شائع ہوئے ہیں، ان میں حسب ذیل خصوصاً قابل ذکر ہیں: "مغل شاعری کا مطالعہ" مصنفہ آنتونووا۔ "سرحدوں پر ہندوستانی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں" مصنفہ زوگراف۔ "اردو کی ترقی کے مسائل" جسے کئی محققین نے لکھا ہے۔ "ناول میں حقیقت نگاری۔ علی گڑھ تحریک اور اردو نثر کے ارتقا کے بارے میں سکوچیف کی تصانیف۔ "اٹھارویں اور انیسویں صدی کی اردو شاعری کی خصوصیات" مصنفہ گلے باف، وغیرہ۔ ان کے علاوہ اردو زبان وادب کی تاریخ پر سکوچیف اور گلے باف کی ایک گراں قدر تصنیف جلد شائع ہونے والی ہے اس کتاب میں امیر خسرو سے لے کر دور حاضر تک کی اردو تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔ سید احمد خاں اور ان کے رفقا، حالی، آزاد، شبلی اور اکبر کے افکار کا تفصیلی جائزہ، اور غالب اور اقبال کی شاعری کا سیر حاصل تجزیہ کیا گیا ہے، اور جدید نثر اور نظم پر کئی مقالے تحریر کیے گئے ہیں۔ اقبال کے فلسفیانہ اور شاعرانہ افکار کے ارتقا کے چند پہلوؤں پر انیکے یاوا کی تصنیف بہت اہم ہے۔ غالب کا مطالعہ بھی جاری ہے۔ غفور وف کی "غالب کی فارسی شاعری"۔ پلا نوا کی "غالب کے خطوط" اور غالب کی زندگی پر کالی کن کا مقالہ اس سلسلے کی اہم کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ گلے باف نے نظیر اکبر آبادی پر۔ سکوچیف نے نذیر احمد، سرشار اور شرر پر، اور بلی نا روف نے احمد ندیم قاسمی پر، اور گلے باف سنگانک نے فیض احمد فیض پر اہم تحقیقی مقالے شائع کیے ہیں۔

روسی ادیب قدیم اور جدید اردو شاعروں اور ادیبوں مثلاً ولی، میر تقی میر، حالی، آزاد، اکبر، مرزا رسوا، حسرت موہانی، احسان دانش، علی سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی وغیرہ کی تصانیف میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں، اور مضامین شائع کرتے رہتے ہیں۔ ہر سال قدیم اور جدید شاعری اور نثر کی کتابوں کی اشاعت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ باغ وبہار، امراؤجان ادا، اور پریم چند، کرشن چندر، بیدی، قاسمی، سجاد ظہیر وغیرہ کی تصنیفات کے نئے ایڈیشن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ افسانہ نگاروں مثلاً حیات اللہ انصاری، غلام عباس، منٹو، پطرس، قدرت اللہ شہاب، حمید اختر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر کے افسانے اکثر مجموعوں کی صورت میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ غالب، اقبال، فیض، احسان دانش اور قاسمی کا کلام علیحدہ جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اور جوش، فراق، حفیظ، جگر، حسرت، مخدوم، ساغر، کیفی جعفری اور بہت سے دیگر شعراء کا کلام مجموعوں میں شامل کیا گیا ہے۔ احسان دانش، سجاد ظہیر اور جعفری کی شاعری پر تنقیدی کتب بھی شائع ہوئی ہیں۔ سوویت یونین میں اردو شعرا اور اہل قلم سے متعلق اکثر تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ خصوصی ریڈیو اور ٹیلی وژن پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ مثلاً گذشتہ پانچ سال میں غالب، اقبال، پریم چند اور فیض سے متعلق سالانہ تقریبات منعقد کی جا چکی ہیں۔ سن ۱۹۶۰ء میں مولوی عبدالحق جب ۹۰ سال کی عمر کو پہونچے تو ان کی سالگرہ منائی گئی۔

اس مختصر سے جائزے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اردو دنیا کی مقبول ترین زبان ہے اور اس کا ادبی و شعری سرمایہ کسی بھی زندہ زبان سے قدر و اہمیت میں کم نہیں ۔ بدنصیبی یہ ہے کہ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں خود ہم نے اپنی زبان کی قدر و اہمیت کو کم کر رکھا ہے اور حقیقی دلچسپی اور توجہ اردو کو مزید وسعت دینے اور قومی سطح پر اس کو عام کرنے کے لئے درکار ہے۔ افسوس کہ ہم اس پہ توجہ نہیں کر رہے ہیں۔

سحر انصاری

# دشتِ امکاں کا ایک سفر

## عزیز حامد مدنی کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ

یونانی اساطیر میں لکھا ہے کہ معمار و ہندس ڈایڈیلس جب کریٹ کی قید و بند اور جلاوطنی کی زندگی سے تنگ آگیا تو آزاد فضا میں سانس لینے کے لئے اس نے اپنے بیٹے ایکرس (ICARUS) کی مدد سے پرندوں کے پر فراہم کرکے دو شہپر تیار کئے اور انھیں اپنے اور ایکرس کے بازوؤں میں باندھ کر آسمان کی سمت پرواز شروع کردی کہ فضا پر کریٹ کے بادشاہ کا اختیار نہ تھا۔ ایکرس پرواز کے جوش میں سورج کے بہت قریب پہنچ گیا اور سورج کی تمازت سے اس کے پروں کا موم پگھل پگھل کر اشکوں کے مانند زمین پر گرنے لگا اور اس کے شہپر ٹوٹ کر سطح خاک پر آ رہے ایکرس سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا فطرت کے جبر کو شکست دینے آزاد فضا میں سانس لینے اور ان دیکھی پہنائیوں میں پرواز کرنے کی خواہش ہر دور کے انسان میں کسی نہ کسی عنوان موجود رہی ہے تخلیقی ذہانت اور احساس و آگہی کی دولت بیدار رکھنے والے اس پرواز کے لئے مختلف شہپر اختیار کرتے رہے ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف آخر نے حساس ذہنوں میں جلاوطنی کی سی کیفیت پیدا کردی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اختراع و ایجاد کے پردے میں فطرت کا جبر بڑھتا جا رہا ہے۔ پھر اسی جبر میں بعض اوقات اختیار کے عکس بھی رقص کرتے نظر آتے ہیں جبریت کا احساس کم ہو جاتا ہے اور پھر کوئی حادثہ، کوئی خبر کوئی تجربہ اس اختیار کے چہرے پر نقاب ڈال کر جبر کی شکل اختیار کر لیتا ہے یہ عہد عجیب و غریب تضادات سے عبارت ہے۔ یہ دور دو عالمی جنگوں کی ہولناک تباہی کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے۔ پھر اس دور کے بطن میں سانس لینے والے با خبر انسان پر جبر و اختیار کی اس فضا میں یہ بات بھی منکشف ہے کہ نشر و اشاعت کے زود رفتار ذرائع نے انسان کے ذہن کو ایک جہانِ خود کار بنا دیا ہے جس میں سارا کا سارا کرۂ ارض اپنی روشنیوں اور سیاہیوں، اپنی آبادیوں اور ویرانوں، اپنے کتب خانوں اور قتل گاہوں، اپنے معلوں اور سیاسی معبدوں کے ساتھ زندہ اور سانس لیتا نظر آتا ہے آج چشمِ انسانی ہنر و علم کے ایسے ایسے کرشموں سے دوچار ہے کہ تیز رفتار وقت کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کے باوجود ہر گام پر یہ گمان ہوتا ہے کہ "یاں رہ گیا، واں رہ گیا" کائناتی وقت تو زماں گہرائی میں جانے کے بعد راستے میں ملتا ہے۔ لیکن ارضی وقت کی رفتار دیکھتے ہی دیکھتے اتنی تیز ہو گئی ہے کہ وقت کا بے رحم خدا اور بے رحم نظر آنے لگا ہے۔ وہ کسی کی شکستہ دلی اور آبلہ پائی سے متاثر نہیں ہوتا۔ جو اس کے گام بہ گام رہیں وہی اس کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ اس میں نہ رواداری ہے نہ خلوص۔ اس کو دنیا کی کسی شے سے کوئی لگاؤ نہیں۔ وقت کائنات کی ایک غیر جانبدار کیفیت ہے۔ جو ایک بیکراں سمندر کے مانند خود سے بے نیاز ہر شے کو بہائے لئے جاتی ہے۔ وقت کی اس رفتار کے ساتھ چلنے کے ان گنت طریقے ہیں۔ ایک طریقہ تخلیق بھی ہے۔ جو کائنات

کی ناانصافیوں اور بہت قریب آکر سماج کی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کے طور پر کسی حساس ذہن کا شعار بن جاتا ہے۔ شاعری کو اعلیٰ ترین تخلیقی فن کہا گیا ہے۔ اس میں انسانی علوم احساس اور جذبے کی نسبت سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ شاعری میں فکر احساس اور فکر جذبہ بن کر سامنے آتی ہے۔ شاعری میں آواز کو آنکھوں سے دکھا دینے کا فن شامل ہے

دورِ حاضر کے تضادات کی تفصیل پھر کسی موقع پر آئے گی لیکن ایک بات بہت واضح ہے کہ ان تضادات نے انسانی سماج کی سب سے بڑی قدر یعنی خود انسان کو بے قیمت بنا دیا ہے۔ ویسے بھی اس دور میں مذہب اور فلسفے کے بجائے اطلاقی سائنس یا ٹکنالوجی اور ارباب سیاست کا حربہ بن کر ہمارے سامنے آئی ہے۔ اور سوچنے والا ذہن جس قدر اس حقیقت سے آگاہ ہوتا جاتا ہے کہ انسانی سماج مشینوں اور سود و زیاں کا کاروبار چلانے والی عمارتوں کا سماج بنتا جا رہا ہے اسی قدر اس میں ایک احساس زیاں پیدا ہوتا جاتا ہے اس احساس زیاں کے ہاتھوں کچھ لوگ قنوطیت کا شکار ہو کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ اور کچھ اس عرصۂ اسباب و علل کی ناموافق طاقتوں کے خلاف نبرد آزما رہنے کو زندگی کا مسلک بنا لیتے ہیں اور اپنی فکر اور اپنے جذبے کے ذریعے ان کو شکست دینا چاہتے ہیں یہی حقیقت شاعری کی بنیاد ہے اور جب تک یہ کیفیت انسانی معاشرے میں باقی ہے شاعری کسی نہ کسی پیرہن میں موجود رہے گی۔

اس پس منظر کے ساتھ دورِ حاضر کے کسی صاحب نظر اور حساس شاعر کے بارے میں لکھنے کے لئے کتنی بار قلم ہات میں لے کر رکھ دینا پڑتا ہے اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے چاہا کہ عزیز حامد مدنی کے مجموعے" دشتِ امکاں" پر کچھ لکھوں۔ مدنی کے مجموعے" دشت امکاں" میں مجھے شاعری کی ایک بالکل مختلف فضا کا احساس ہوا۔ ان کی لفظیہ شاعری اپنی تمام جزئیات کے ساتھ جدید منفرد اور مشکل ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ مدنی کی شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کو یہ سمجھ کر مطالعہ کرنا ہوگا کہ مدنی اپنی شاعری میں ایک ایسے دور کو سمیٹ رہے ہیں جو اپنی کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے بہت پیچیدہ اور مشکل ہے۔ یہ دور مادے کا نہیں توانائی کا ہے کائنات کا میکانکی تصور ختم ہوا دیمقراطیس کا ذرہ جو مادی دنیا کی اصل اور اساس تھا۔ جدید دور کی آنکھ کے لئے خود ایک کائنات بن گیا ہے۔ جس میں الکٹران، پروٹان، نیوٹران و دیگر ذروں نے مل ایک نظام شمسی قائم کر لیا ہے۔ یہ دور آوازوں کا ایک سمندر ہے جس میں انسانی آوازوں کے ساتھ ساتھ مشینوں اور گردشِ سیارگاں کی آواز بھی شامل ہے۔ اس بحر مواج میں اپنی آواز کی لہر تلاش کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ اس مشکل کام کا جائزہ ہمدردی، خلوص اور سچائی سے لینا چاہیئے۔ یہ بات میں عارفوں کے لئے کہہ رہا ہوں۔ عامیوں کو اس سے کیا غرض کہ زمانے کی صداقتوں کو پہچاننے اور اس حساس سماجی اکائی کو سمجھنے کی کوشش کریں جو سرو کمال کو اپنے ہمراہ لے کر نکلتی اور اسے زندگی کے سارے نشیب و فراز سے گزارتی ہوئی آگے بڑھتی ہے

وصل و فراق و نیک و بد گردش صد ہزار و صد　　　　تجھ کو کہاں کہاں مرے سرو کمال لے گئی

دورِ حاضر کے پس منظر میں ہمارے یہاں جب کوئی بات کہی جاتی ہے تو اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ صنعتی دور یا سرمایہ دارانہ نظام کے ان مرحلوں سے ہمارا ادیب نہیں گزرا جن سے مغرب کے ادیب اور شاعر دوچار رہے ہیں اس لئے اسکو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ سرمایہ داری اور صنعتی چیرہ دستیوں کا اس طرح ذکر کرے جس طرح مغربی شعرا کرتے ہیں۔ اس کا جواب صرف اس قدر ہے کہ آج کی دنیا ہوا بند ٹکڑوں میں تقسیم نہیں ہے۔ کسی بھی گوشے میں ہونے والا سائنس کا کوئی کرشمہ اور سیاست کا کوئی افسوں ساری دنیا پر یکساں اثر انداز ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ بہت سے گرم و سرد کا براہ راست تجربہ ہماری نسل کو نہیں ہوا ہے لیکن تجربے سے قطع نظر ہمارے دور کے ذمہ دار شاعر کو ادراک و آگہی کی دولت میسر ہے۔ تجربہ بہت منفرد رہا ہے

لیکن ادراک و آگہی بعض اوقات تجربے کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ تجربہ آرائش خم کاکل کی حیثیت رکھتا ہے اور ادراک و آگہی اندیشہ ہائے دور و دراز سے عبارت ہیں۔ ویسے ان تمام حیلوں اور اعتراضات سے ایک بات ضرور طے ہو جاتی ہے کہ مسئلہ صرف ابلاغ کا ہے۔ انگریزی کے ایک بزرگ استاد جو اردو میں تنقید اور ناول لکھتے ہیں ایک دن کہہ رہے تھے کہ میں جب اقبال کا یہ شعر پڑھتا ہوں:۔

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں ۔۔ یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

تو مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور میں اس شعر کی معنوی گہرائیوں میں ڈوبنے لگتا ہوں۔ لیکن لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ اقبال کے بعد ترقی پسندوں کے ایک شاعر نے یہ شعر کہا ہے جو اس سے اچھا ہے

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے ۔۔ ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

تو میں اس شعر کو سن کر کچھ کراہیت سی محسوس کرتا ہوں اور حلقۂ زنجیر میں زبان کے تصور سے مجھ پر وحشت سی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ ذکر ہے فیض کی شاعری کا جن کے بیشتر استعارے اور علامتیں اردو شاعری کی روایت سے بہت قریب ہیں۔ ابھی جب بیشتر ناقدین اور قارئین کو فیض کی شاعری کا مکمل عرفان حاصل نہیں ہوا۔ اس سے آگے کی بات ان کے کیا سمجھ میں آئے گی۔ اور وہ اسے کس طرح محسوس کر سکیں گے۔ در اصل ہم ایک تہذیبی اعراف میں ہیں جہاں کبھی قدیم دور کا جھونکا آ جاتا ہے۔ اور کبھی صنعتی طرز پیداوار کا۔ یہ کیفیت تقسیم پاک و ہند کے بعد بہت واضح ہو گئی ہے اور گومگو کی اس عبوری کیفیت نے ہر شئے کا اعتبار ختم کر دیا ہے۔ اسی لئے گردش و رفتار کے حصار میں مصروف آدمی کو ادب کے مطالعے کے لئے جتنا وقت ملتا ہے اگر اس میں ادب اور شعر کی گتھیاں نہ سلجھ سکیں تو وہ سب پر لعنت بھیج کر ان شاعروں اور ادیبوں کی طرف رجوع کر لیتا ہے جو بہر حال عصر رواں کے پیچ و خم کا ساتھ نہ دینے اور لمحۂ موجود کے کرب کی عکاسی نہ کرنے کے باوجود بعض ذہنی مسرتیں یا آسودگیاں عطا کر سکتے ہیں۔ ہمارے دور کی ہیئت اس اسطوری کردار کے مانند ہے جس کا نصف دھڑ مچھلی کا اور نصف آدمی کا تھا۔ اب ادب کے بیشتر عارف اور عامی اس انتظار میں ہیں کہ ہمارا دور یا تو مکمل مچھلی بن جائے یا مکمل آدمی تاکہ وہ اس پر ایک حکم لگا سکیں، اس کے باب میں کوئی ایک فیصلہ صادر کر سکیں۔ تخلیقی ذہن کا رویہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ تخلیقی ذہن اپنی آگہی کے جبر کا شکار رہتا ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ سوچتا اور لکھتا رہتا ہے۔ چنانچہ وہ اس عبوری دور میں بھی لکھ رہا ہے۔ جب بے یقینی، سب سے بڑا یقین اور بے اعتباری سب سے بڑا اعتبار بن چکا ہے۔

آج کے شاعر کو سمجھنے اور محسوس کرنے کے لئے آج کے دور کو سمجھنے اور اس کا کرب سہنے کی ضرورت ہے بات ان شاعروں کی نہیں جو اخباری خبروں کی طرح نظمیں لکھ رہے ہیں ہر چند کہ روشن خیالی اس قسم کے تجربوں کو بھی معیوب نہیں سمجھتی ہے۔ ذکر ان شاعروں کا ہے جو اپنے احساس اپنے شعور اور اپنے عہد کے عرفان کو مقدم اور مقدس سمجھتے ہیں اور اپنی فکر کو انسانی تہذیب کے تمام معتبر چشموں سے سیراب کرتے ہیں۔ اب یہ شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کا کام ہے کہ وہ تجربے اور خبر اور صداقت اور بطلان میں فرق کریں۔

مدنی ایک ایسے شاعر ہیں جو تمام انسانی فکر کو فرد کی روایت سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں گوتم۔ صوفیائے چشت۔ اشوک۔ اکبر تاج محل، وید، گیتا، کالیداس، خسرو، عرفی، نظیری، فیضی، غالب، ہندوؤں کا قدیم فلسفہ، مسلمانوں کی معاشرت کا تازہ رخ بھی ہے اور سقراط، افلاطون، ارسطو، ہیرکلیٹس، ہومر، دانتے، شیکسپیئر، برونو، کیپلر، گلیلیو، ارشمیدس۔ نیوٹن اور آئن اسٹائن کے افکار بھی۔ جدید معاشرے سے ہم آہنگ ہونے کے لئے انھوں نے تاریخی شعور کو اپنا راہبر بنایا ہے۔ مدنی جب اس تاریخی شعور کی روشنی میں

جدید دور کو دیکھتے ہیں تو انہیں اربابِ سیاست کی شاطرانہ چالیں، سود و سرمائے کا کاروبار، سٹہ اور اسٹاک ایکسچینج، بڑے شہروں کی بے حسی اور صنعتی سرمایہ دار کی چیرہ دستیاں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے بے شمار روپ نظر آتے ہیں ویسے بھی یہ دور سائنسی صداقتوں کا دور ہے اور مدنی بڑی کامیابی سے اپنے کرب کو ظاہر کرنے کے لئے سائنسی علامات اور امیجز اختراع کرتے ہیں۔

اطلاقی سائنس سے تاثر قبول کرنے کی ایک روایت ہمارے یہاں غالب سے شروع ہوتی ہے جو صاحبانِ انگلستان کی کرشمہ سازیوں سے پیدا ہوئی تھی یہ شش جہت میں پھیلی ہوئی فکر کو سمیٹنے کے کسی انجانے جذبے ہی نے شاید غالب سے یہ کہلوایا تھا

کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

تاریخی طور پر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ خود انگلستان کے رومانوی شعرا نے سائنس کے نظریوں اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے باب میں مختلف ردِعمل کا اظہار کیا تھا۔ شیلے کے پاس سائنسی علم تھا اور اس نے اپنی نظموں میں متعدد سائنسی امیجز استعمال کی ہیں۔ اس کے برعکس کیٹس کو اس بات سے روحانی اذیت پہنچی تھی کہ نیوٹن نے شیشے کے منشور میں توسِ قزح کو محدود کر کے اس کا حسن ختم کر دیا ہے۔ آہنی فولاد کی دعوت و عزت کے دور میں ورڈز ورتھ کو فطرت سے اس قدر گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ صنعتی ترقی کی راہ استوار کرنے کے لئے جب سرسبز و شاداب تناور درختوں کو آرے سے چیرا جانے لگا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے درخت کے نہیں، زندہ انسان کے دو ٹکڑے ہو کئے جا رہے ہیں ہر دو قسم کے ردِعمل بالکل فطری ہیں بلکہ بعض اوقات تو ایک ہی ذہن پر متضاد کیفیتیں طاری ہوتی ہیں اس پر ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ جب وہ ایک پسندیدہ شے کو وقتی طور پر ناپسند کرنے لگتا ہے اور ایک ناپسندیدہ شے اسے دلکش لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اس ذہن کے حساس ہونے کی بات ہے جو برق پیما کی طرح ہلکی سے ہلکی برقی رو کو بھی محسوس کر لیتا ہے۔

اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اگر یہ دور سائنسی صداقت کا دور ہے تو نیوٹن، آئن اسٹائن، رودر فورڈ، ہائزن برگ اور نیل بوہر وغیرہ کی کتابیں براہِ راست کیوں نہ پڑھی جائیں۔ اس پر کسی کو اعتراض نہیں لیکن شاعر اور سائنس داں میں یہ فرق ہے کہ شاعر کا طرزِ اظہار تجربی EMPIRICAL نہیں ہوتا بلکہ داخلی اور ذاتی ہوتا ہے۔ ذات یا ذاتی سے یہ مطلب نہیں کہ شاعر کے گرد و پیش سے بے خبر ہو کر صرف اپنے خول میں بند رہتا ہے۔ اس لفظ کے مفہوم کو محدود کر دیتا ہے۔ شاعر کی ذات شہر پناہ کے دروازے کی مانند ہوتی ہے جس سے گزرے بغیر زندگی کا کوئی تجربہ اور کائنات کا کوئی مشاہدہ تخلیق کے شہر میں داخل نہیں ہو سکتا سائنس داں کی حقیقت پسندی اور عملی کارکردگی کے باوصف جب کسی سائنسی حقیقت کو احساس کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کیا جاتا ہے تو اس وقت سائنسی نظریے اور شعری پیرہن کا فرق محسوس ہو جاتا ہے۔ ہیرے کی مثال لیجئے نامیاتی کیمیا ORGANIC CHEMISTRY کے اصول کے مطابق ہیرا کاربن ہی کا ایک روپ ہے۔ ہیرے میں کاربن کے جوہر یا ایٹم غیر معمولی طور پر ایک دوسرے سے قریب اور چپاں ہوتے ہیں جن سے یہ ایک نسبتاً وزنی اور سخت معدنی شے بن جاتا ہے۔ اور اگر اسے مختلف زاویوں سے تراشا جائے تو اندرونی انعطافِ نور کے اصول کے مطابق اس کی روشنی کی شعاعیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ لیکن اگر ہیرے کو ۱۲۰۰ (بارہ سو) درجے سنٹی گریڈ سے زیادہ درجہ حرارت پر گرم کیا جائے تو اس کے ایٹموں کی باہمی چسپیدگی ختم ہو جاتی ہے اور ہیرا کوئلے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اپنی جوہری ساخت یا ماہیت میں ہیرا اور کوئلہ یکساں ہیں۔ ہیرے کو گرم کرنے کی بجائے اگر تراشنا مقصود ہو تو اس کی رگوں کو تلاش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کی رگ پر ضرب لگا دی جائے ہیرے کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ بیان کیمسٹری کی ہر چھوٹی بڑی

کتاب میں مل جائے گا اور ان حقائق کے پس پشت سائنسی تجربوں کا ایک طویل سلسلہ بھی ملے گا لیکن ان اصولوں کی روشنی میں یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ ہیرا اور کوئلہ اپنی کیمیاوی ماہیت کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ ایک شاعر کا ردعمل یوں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اپنی نظم "فروری" میں کہتے ہیں:۔

اے میرے دل ترا مول کب تک الگ
کوئلے کی سلوں میں رہے موجزن
ہیں ہیرے کی رگ تو بھی ہیرے کی رگ

اس میں دل کو مخاطب کر کے سائنسی حقیقت کو ایک داخلی جذبہ بنا دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ امتیاز و تعصب کی اس دنیا میں تاجرانہ اقدار اور سوداگرانہ ذہنیت سے پیدا ہونے والا تاثر بھی موجود ہے جو انسان کو ذرا سی دیر میں بے وقعت بنا دیتا ہے اس انسان کو جسے افلاطون نے میزان ہمہ اشیا کہا ہے۔ ان مصرعوں کے بعد یہ مصرعے آتے ہیں جو مشینی اور صنعتی عہد کی بے حسی اور ظلم کی تصویر مکمل کر دیتے ہیں۔

بینہ اعداد کے سرد اوزار سے
کاؤنٹر کی پری ایک ایڈنگ مشین
کاٹ سکتی ہے ہیرے کو اک وار سے
مرکزِ ثقل ہے اک دکاں خوش غلاف
نرخ بازار کے دائروں میں ترا
پستیوں کی طرف ہی رہے گا گراف

یہاں کوئلے اور ہیرے کی ماہیت کے ساتھ حسابی مشین اور کاؤنٹر کی پری کی بے حسی اور بے نیازی جو اس دور کی پیداوار ہے سرد اوزار کے پس منظر میں ابھرتی ہے۔ پھر ساتھ ہی یہ موازنہ بھی ہے کہ ہیرے کی اہمیت اس کے وزن اور ثقل اضافی کی وجہ سے ہے لیکن دل کا مول کچھ بھی نہیں ہے اس لئے جب وزن و پیمائش کی بنیاد پر دل کی قیمت کا اندازہ کیا جائے گا تو نرخ بازار کے دائروں میں دل کی قیمت کا گراف پستیوں ہی کی طرف رہے گا۔ ان مصرعوں میں سماجی شعور بھی ہے۔ سرمایہ داری دور کی پیدا کردہ بے حسی کا احساس بھی ہے۔ سائنس سے واقفیت اور اس سے اخذ و استنباط کا اعجاز بھی ہے اور معاشیات و تجارت سے آگہی کا عکس بھی۔

ایزرا پاؤنڈ نے شاعروں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک شعرائے محض (PURE POETS) اور دوسرا شعرائے دانش (INTELLECTUAL POETS)۔ مدنی کا شمار موخر الذکر گروہ کے شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں عمرانیات سیاسیات، اقتصادیات اور سائنس کے شعبوں مثلاً انجینیرنگ، فزکس، کیمسٹری اور میڈیکل سائنس سے آگہی کا عکس ملتا ہے۔ سائنسی ایجادات اور سائنسی طرزِ فکر سے انھیں خاص لگاؤ ہے۔ ان کے شعور کی تربیت سائنسی حقائق نے کی ہے۔ مدنی کی شاعری اپنی پیش رو شاعری کا اگلا ارتقائی قدم ہے۔ مدنی کی شاعری نے جس روایت میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ عملی سیاست سے تعلق رکھتی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کی تباہی کے بعد ساری دنیا میں ایک فکری انقلاب برپا ہو گیا تھا۔ اقوام متحدہ کی جدوجہد آزادی نے انسان اور سماج اور مشین کے نئے رشتوں پر غور و خوض کرنے کی دعوت دی۔ ترقی پسند تحریک نے ہمیں ان حقائق کی طرف متوجہ کیا جن سے اب تک ہمارے معاشرے نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ آج ترقی پسند تحریک میں خواہ کتنی ہی فروگزاشتیں تلاش کی جائیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ برصغیر میں ادب کی ساری جدید تحریکوں اور تمام جدید نظریات کا راستہ ترقی پسند تحریک ہی نے استوار کیا ہے۔ اس تحریک نے نہ صرف جاگیرداری نظام کی تمام برائیوں

کے بدن کا فرسودہ پیرہن چاک کیا بلکہ ایک سقہ ہونے ناسوروں کے خلاف ایک صحت مند نفرت کی فضا بھی پیدا کی۔ اور نفرت سے حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری شاعری میں واضح طور پر ایک نئے انقلاب کے انتظار کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ بدیسی سامراج پر کاری ضرب لگانے اور جاگیرداری سماج سے نبرد آزما ہونے کا رجحان پیدا ہو گیا ایک نظریاتی جنگ شروع ہو گئی۔ شاعری کی زبان اور اس کی تشبیہیں علامتیں اور استعارے جاگیرداری سماج کے بنے بنائے سانچوں سے اخذ کئے گئے یا ان سے ملتے جلتے سانچے بنائے گئے۔ تقسیم ملک کے بعد نو آبادیات شکنی کا دور شروع ہوا۔ ترقی پذیر ممالک بھی ترقی یافتہ ممالک سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ کر بین الاقوامی سیاست کی دوڑ میں شریک ہوئے ہمارے ملک کی عملی ضرورتوں نے ثابت کر دیا کہ ہماری زرعی معیشت تیزی سے صنعتی معیشت میں تبدیل ہو رہی ہے اور ہمارا جاگیرداری سماج صنعتی سرمایہ داری کے دور میں قدم رکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی تبدیلی کو نہ ایک دم محسوس کیا جا سکا اور نہ اس کے اظہار کے لئے الفاظ اور یہ علامتیں مل سکیں۔ فرسودہ استعارے اور تشبیہیں نئے کرب اور نئی فکر کا ساتھ دینے سے قاصر رہے۔ اور یہ گمان ہونے لگا جیسے کہی ہوئی باتوں کا بار بار اعادہ کیا جا رہا ہے، محض اصطلاحوں میں گفتگو کی جا رہی ہے اور یہ ساری شاعری (CLICHES) کا مجموعہ بنتی جا رہی ہے۔ جاگیرداری سماج کی شکست و ریخت اور ایک نئے سماج کی تشکیل کی نشان دہی کے عمل میں فیض کی شاعری نے اعتبار کی ایک فضا قائم کی اور بہتوں کو ان نقالی کا موقع مل گیا۔ یہاں تک کہ اپنی الگ آواز اور توانا لب و لہجہ رکھنے والے شاعر بھی بالآخر فیض ہی کے نرم لہجے میں بات کرنے لگے (اس موقع پر مجھے سردار جعفری کی نئی کتاب "ایک خواب اور" کی بیشتر نظمیں یاد آ رہی ہیں) شہرت کی خواہش اتنی عجیب چیز ہے کہ اس کے ہاتھوں انسان اپنا اسلوب اور اپنی وضع قطع تک بدل دیتا ہے۔ بیٹلیز کی شہرت سے متاثر ہو کر ہمارے بیشتر نوجوانوں نے بیٹلیز کی طرح اپنے سر کے بال بڑھا لئے (بہت سارے شاعر فیض کے لہجے میں شعر کہنے لگے۔ کچھ لوگ زندگی کی ان عملی صداقتوں سے آنکھ ملانے کا حوصلہ نہ پا کر جنس کا لبادہ اوڑھ کر اپنی داخلیت کے خول میں چلے گئے اور اس ابہام، اغراق اور PATHOLOGICAL تجزیئے کے پیچ در پیچ دھوئیں سے رابطہ بڑھانے لگے جس کا آغاز میرا جی نے کیا تھا۔ ایسے عالم میں کوئی نئی راہ نکالنا ایک تو بہت دشوار کام ہے اور پھر اس نئی راہ کو ہدف ملامت بنانے والوں کی انتہا نہیں رہتی سو آجکل یہی ہو رہا ہے۔ خول میں بند ہو جانے کی بات تو الگ ہے لیکن فرد اور سماج کے ناگزیر رشتوں اور بے شمار خارجی اور داخلی صداقتوں کی روشنی میں جب ہم اس دور کی شاعری پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ایک خاص قسم کی شاعری ایک خاص عہد کی نمائندگی کرتی ہے۔ فیض کی شاعری جاگیرداری سماج کے زوال کے لمحوں میں جوان ہوئی ہے۔ اب اس کے بعد جو تہذیبی اور سماجی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں ان سے پیدا ہونے والے کرب کو ظاہر کرنے اور انہیں سمیٹنے کے لئے فیض کی شاعری یا اس کے استعارے کام نہیں آ سکتے اس سے آگے نکلنے کی ضرورت ہے۔ فیض کے یہاں سرمایہ داری کے خلاف بغاوت کا ایک مجموعی اور مجرد رجحان ملتا ہے لیکن جب سرمایہ داری ایک منظم ادارے کے تصور سے ہٹ کر زندگی کی جزئیات پر اثر انداز ہونے لگتی ہے اور محض تصور کے بجائے ایک فعال طاقت بن کر قدم قدم پر ٹوکتی ہے تو ان جزئیات کو سمیٹنے اور ان کی متنوع تہوں میں نفوذ کر کے اپنی بات کہنے کی آرزو بیدار ہوتی ہے اور صنعتی تہذیب میں کارخانے، پٹرول کے چشمے، بنکوں کا کاروبار، بین الاقوامی سطح پر سرمایہ دار قوموں کی شاطرانہ چالیں، ان سب کا اظہار ایک نیا محاورہ اور ایک نیا اسلوب چاہتا ہے۔ برصغیر کے بیشتر بڑے شہر جدید عہد کی ان سفاکیوں کے آئینہ دار ہیں۔ مدنی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میری نظموں میں بڑے شہر کی زندگی ہے۔ اس کا تضاد ہے، اس کی بے روح و سفاک تند و تیز میلانات کی علامتیں ہیں ..... ابتدا ہی سے مجھے اس کا شدت سے احساس تھا کہ جدید معاشرے کا محاورہ بدلا ہوگا۔ اس کی ثقافتی تہذیبی زندگی ایک مختلف نہج کی ہے۔ اس میں آپریشن تھیٹر ہیں۔ اس میں پٹرول پمپ کے بے خواب اسٹیشن ہیں۔ ریلوے ورکشاپ ہیں۔ درس گاہوں کے اندھیرے ہیں ستونوں کی کڑی باہنوں میں آدمی بھیک گیا ہے۔ یہ ماحول

کیونکہ روایات ادب سے ملحق ہو سکتا ہے۔ اس کی کڑیاں ڈھونڈنی پڑیں" اس ضمن میں مدنی نے نئے امیج، استعارے اور علامتیں اختراع کیں تاکہ ان کے ذریعے تجربات کو محسوسات میں منتقل کر سکیں۔

مدنی کی شاعری میں شروع ہی سے شاہراہِ عام سے ہٹ کر چلنے کا رجحان ملتا ہے۔ وہ رجحان ۱۹۶۵ء کے بعد بہت قوی ہو گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مدنی اپنے مطالعے، شخصیت، احساس اور وجدان کا سہارا لے کر عہدِ حاضر کے ان تمام پہلوؤں کو بڑی کامیابی سے اپنی شاعری میں سمو رہے ہیں یہی مدنی کا نیاپن ہے اور بلاشبہ اردو شاعری میں وہ ایک جدید اسلوب کے بانی ہیں۔ یہ اسلوب میراجی، راشد، فیض، مجاز اور مخدوم سب سے الگ ہے۔ شاعری کے اس نئے رُخ کو سمجھنا فی الواقع اتنا آسان کام نہیں ہے۔ مسئلہ پھر ابلاغ کا آجاتا ہے اور یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ جب تک مخصوص ذہنی تربیت نہ ہو کسی شعر یا فقرے کا ابلاغ ناممکن ہے۔ مدنی کی شاعری کے مجموعے "دشتِ امکاں" کو میں نے ایک سفر کی طرح پڑھا ہے اور اس سفر کے دوران یہ سارا پس منظر میرے ذہن میں رہا ہے جس کا عکس میں نے گزشتہ سطور میں پیش کیا ہے۔ اس سفر کے آغاز پر مجھے مدنی کے دیباچہ "چشم نگراں" کے چند فقرے یاد آ رہے ہیں "ہم لوگ آپ اسے برصغیر کے نوعمر طلبہ کے گروہ کی ایک علامت سمجھیے۔ پہلی جنگِ عظیم کی مٹتی ہوئی یادوں سے دور، آزادی کی بڑھتی ہوئی رو کے ساتھ جہاں دوسری جنگِ عظیم کی ہولناک تباہیوں کا ... تھا۔ وارد ہوئے تھے میٹرک کا سرٹیفکیٹ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے آلاتِ حرب کی پیچیدہ ٹیکنک کے زر کامل عیار کا سیونگ سرٹیفکیٹ ہے۔ اسکول کے کمرے میں ہٹلر۔ اپی سینیا۔ انگریزی راج، گورے کالے چہرے، سیاست کی بساط، اور نیا ہنگامہ تھا۔ ریڈیو۔ اخبار افواہیں ابہام لیے ناپاک تھیں کہ دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ ہماری نوجوانی کا دور اور اس برصغیر کی آزادی ایک ہی افق سے جڑواں طلوع ہوئے تھے

مدنی کے پہلے مجموعے "چشم نگراں" میں رومانی نظمیں ملتی ہیں جن میں معاشرے کی ناہمواریوں اور وطن میں پھیلے ہوئے سیاسی انتشار کا احساس بھی ہے لیکن "دشتِ امکاں" کی نظموں کے خالق کی ذہنی تعمیر دوسری جنگِ عظیم کے تباہ کن اثرات کے سائے ہی میں ہوئی۔ وہیں اس نے انسانوں کے دشمنوں اور انسانیت کے دوستوں میں تمیز کرنا سیکھا۔ دوسری عالمی جنگ اور اس کے بعد اقوامِ عالم کے لئے امن اور سکون کے ایک فردِ کا پورا عمل مدنی کی نظم "صلیبوں کی اوٹ سے" میں ملتا ہے۔ یہ نظم اپنے ڈکشن اور فارم کے اعتبار سے پیچیدہ ہے اور اس کی بیشتر علامتیں چونکہ یورپی ہیں اور دوسری عالمی جنگ کے بعض تاریخی فیصلوں کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔ اس لئے یہ مدنی کی ایک مشکل نظم معلوم ہوتی ہے۔ ویسے بھی اتنی پیچیدہ اور مشکل ہیئت کی کوئی اور نظم مدنی کے مجموعے میں نہیں ہے۔ اس کا آغاز ہونے کے اور ... اور معنی خیز مصرعوں سے ہوتا ہے :۔

You know what makes my coffin
So great so hard to bear
It holds my love within it
And my too heavy care

اس نظم میں مدنی نے جنگ کے بعد کی فضا سے ابتدا کی ہے پھر جنگ کے گزرے ہوئے واقعات صدائے بازگشت کی طرح ابھرتے ہیں ان میں شعور کی لہر (STREAM OF CIOUSNESS) سا انداز نہیں ہے۔ بلکہ جیتے جاگتے تاریخی حقائق علامتی روپ میں سامنے آتے ہیں۔ جنگ کے بعد کا زمانہ سکون و شورش کا ایک سنگم ہے فضا میں ایک گھٹن سی ہے لیکن امن کا پرچم جو ہوا کی رو میں لرز رہا ہے اسی طرح سربلند ہے اور قفس میں روح آزاد کی مثال ہے۔ امن کو کشتی نوح بھی کہا ہے کہ کشتی نوح خطرات اور مصائب کے طوفان میں سلامتی و تحفظ کی علامت ہے

مہیب طوفاں میں کشتیٔ نوح
یہ بطنِ مادر میں جاگتی روح

یہ اک مقفل کواڑ پہ دستکوں کی اک خونچکاں کہانی
یہ ربط لوح و قلم سے اک حرفِ زندہ افکار کی جوانی
یہ اک ہمکتا ہوا سمندر ہے جزر و مد اس کا کس کے بس میں

یہاں نئے عہد کے میلاد کی نشان دہی ہے۔ یہ نیا عہد جنگ کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے۔ مقفل کواڑ پہ دستک، لوح و قلم کے ربط سے حرف زندہ افکار کی تخلیق اور ہمکتا ہوا سمندر رحم مادر میں بچے کی نشو و نما کی طرف اشارہ ہے۔ پھر جنگ کے اثرات کا ذکر ہے

قدم پٹختی ہوئی یہ ہواں تو از دیرانیاں ہزار سو
وہ سرد ٹوٹی ہوئی چٹانوں پہ تیر گندھک کی سنگتی بو

ذیل کا تخلیقی حوار یاتی پس منظر بھی ہے جس میں تاخت و تاراج کی پوری داستان ملتی ہے۔ اس کا اجمالی پر تو یوں پیش کیا ہے:

گزر گیا ہے جلال و جبروت کا شرر ریز دیو پیکر
تہس نہس کرتا ایک لشکر

اس کے بعد بڑی سیاسی طاقتوں میں "اٹلانٹک چارٹر" ایسے امن کے معاہدوں کا ذکر ہے:۔

کہیں کہیں وادیوں میں اک کھیل قلزموں میں اک عہد و پیماں

لیکن امن کی ان تمام کوششوں اور کاوشوں کی فضا میں بعض ایسے ذہن ناآسودہ ہیں جو اندیشہ ہائے دور و دراز سے عبارت ہیں اور سوچتے ہیں کہ بصیرت اور حکمت بھی بہیمیت اور بربریت کو نہیں روک سکتی۔

سوال کرتی اداس آنکھیں　　نہ آئیں دنیا کو راس آنکھیں
ہزار دیدہ وری کے خوابوں پہ تبصرہ کرتی رہی ہیں اب تک
ہزار آئینہ خانوں کی جیرتیں بکھرتی رہی ہیں اب تک!
کہیں لعابِ دہن سے دوشیزگی بنوں کی الجھ رہی ہے
ہزار خنزیر راہ میں ہیں ہر ایک کھیتی سمجھ رہی ہے

آخری مصرعے میں کیلٹی (CELTIC) دیومالا کے غول خنزیر کی طرف اشارہ ہے۔ جسے ایٹس (YEATS) نے بھی اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے۔ یہ غول خنزیر ہری بھری کھیتیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیتا تھا۔ مدنی کے یہاں یہ غول خنزیر ان جابروں اور ظالموں کی علامت ہے جو پر امن اور معصوم بستیوں کو جنگ کی آگ میں جھونک دیتے ہیں اور ان کی آسودگیوں کی کھیتی کو پامال کر دیتے ہیں۔ یہی علامت کئی سال بعد مدنی کی ایک اور نظم "خطِ کشت" میں آئی ہے:۔

اس فضا میں بھی ہے فساد ابھی
روندتا کھیتیوں کو گزرے گا
ایک انبوہ وحشی نژاد ابھی
دشت و در کی فضائیں کہتی ہیں
غول خنزیر کھیتیوں کی طرف
بڑھ رہا ہے ہوائیں کہتی ہیں

"صلیبوں کی اوٹ سے میں یہ اندیشہ باقی رہتا ہے کہ ارباب سیاست امن کی باتیں کرنے کے باوجود آلاتِ جنگ سے دستبردار نہیں ہوئے ٹینک ابھی ہیں اور آتشیں گولے اگلتی ہوئی توپیں بھی۔ مدنی نے ٹینکوں کو آہنی گھوڑے کہا ہے

انہی کی ٹاپوں سے سبز جامہ لہو بکھرتا چلا گیا ہے
زمیں کے سینے میں ایک چاقو کا پھل اترتا چلا گیا ہے

لیکن نئے دور کے طلوع کے پس پشت ان گنت قربانیاں ہیں۔ لہو میں ڈوبی ہوئی صلیبیں ہیں۔ اور وہ جذبہ ہے جسے ہائنے کے ابتدائی مصرعوں میں MY LOVE اور MY TOO HEAVY CARE کہا گیا ہے۔ بالآخر صلیبوں کی اوٹ اور زہر کے پیالے سے ایک نئی صبح کے طلوع ہونے کے آثار یوں نظر آتے ہیں:۔

غنودہ بے روح بستیوں میں
اجاڑ ویران بستیوں میں
سمٹ کے سرگوشیاں سی کرتی رہی ہے شبخون کی حزیں رات
وہ جس کے جابر سکوت کی منتظر تھی روحِ مسیح و سقراط
یہ اک طلوع سحر صلیبوں کی اوٹ سے زہر کے سبو سے
افق افق اک ندائے تازہ نفس سی ہے ساز کے لہو سے
یہ دورِ شبخوں طلوع جہرِ ندائے شعلہ نفس کی موجیں
یہ نرم جاں روشنی کی فوجیں"

مدنی نے نرم جاں روشنی کی فوجوں کو دیکھ کر رجائیت کے کلیے پر جنگ کی ہولناک داستان کا اختتام کیا ہے۔ اس تجربے کے بعد مدنی چاہتے ہیں کہ دنیا سے جنگ کے خطرات کو ختم کر دیا جائے انسان خواہ مشرق کا ہو خواہ مغرب کا مشترکہ طور پر زندہ رہنا چاہتا ہے۔ ہجری فراق اور روح سکندر سے نجات چاہتا ہے لیکن مشرق و مغرب کی اس تقسیم کے باوجود جو ان دونوں سیاست کے ہر گوشہ میں پائی جاتی ہے مشرق و مغرب کے انسانوں کو ابھی جنگ اور بے پناہ ہلاکت کا خوف یکساں طور پر لاحق ہے۔ تباہی کے بین الاقوامی ذہنی تصویر کے بعد جب گرد و پیش پر نگاہ پڑتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ وہ سرزمین بھی جنگ کے ہولناک شعلوں کی زد میں ہے جس کے ذرے ذرے سے شاعر کی ذات وابستہ ہے جس میں شاداب فصلیں اگتی ہیں اور زندگی کی مسرت کے گیت گائے جاتے ہیں۔ پھر یہ جذبہ سمٹ کر اپنے ماحول پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند بنیادی طور پر ایک ہی خطہ ہے۔ ایک کھیتی ہے جسے عالمی جنگ کا خطرہ لاحق ہے۔ مدنی چاہتے ہیں کہ اس کھیتی کی حفاظت کی جائے۔ یہی جذبہ "حفظ کشت" میں کارفرما ہے۔ زمین میں نمو کی قوت باقی ہے۔ حرف تازہ خیال کے اشکال ابھرتے ہیں۔ وصل آب و ہوا سے مٹی میں بالیدگی کا اضطراب موجود ہے۔

زندگی آفریدہ ہے اب تک
ریگ زاروں کے حبس میں خودرو
سبزۂ نو دمیدہ ہے اب تک

لیکن یہ سب کچھ دیکھ کر گمان گزرتا ہے کہ خضر بیروں کا غول اور بدمست ہاتھیوں کی فوج اس کشت سبز اور آب و گل کی بارگاہ وصال کو پامال نہ کر دے اور ہرے بھرے کھیتیوں کی اس ہلاکت میں کہیں ہر قدر سے برتر ایک قدر یعنی خود انسان ختم نہ ہو جائے۔

مٹ نہ جائیں کہیں یہ آثار
کم نہادانِ شوق نکلے ہیں
توڑنے خوشۂ درستِ عیار
آب و گل کی یہ بارگاہِ وصال
آشنایانِ عالمِ فطرت
بے سپر کھیتیوں کا کچھ تو خیال
یہ ہوا تیز تر نہ چل جائے
آدمی ہی تو ایک پودا ہے
حاصلِ کشت ہی نہ جل جائے

مدنی کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ حاصل کشت ہی نہ جل جائے۔ "دانش حاضر کے سوادمیں" وہ لکھتے ہیں۔ ... تہذیبیں جنگ و جدل سے بے اعتنائی سے تخریبی تساہل و کاہلی سے مٹ جاتی ہیں۔" مدنی کا کہنا ہے کہ ارتقا کی رفتار کو تیز تر کرنا چاہیے تاکہ دنیا رزم گاہ بننے کے بجائے امن و سلامتی کی آماجگاہ بنی رہے مدنی کہتے ہیں کہ "ایجاد و تخلیق نے اسی کا ثبوت دیا۔ آج راکٹ ہے جو چاند کے سینے کا داغ تلاش کر رہا ہے۔ آج کوبلٹ ریز ہیں جو سرطان کی ناگ پھنی کو بیماریوں کے جنگل سے مٹا رہی ہیں۔ آج حبشی نژاد فریادی دنیا کے سامنے اپنے گلے ہوئے بات دکھا سکتا ہے۔ آج نابینا بچے اپنی انگلیوں کی جنبشوں سے حرف و معنی کے جادہ شناس ہوتے جا رہے ہیں" مدنی تغیر کو زندگی کی تقدیر سمجھتے ہیں" وہ کہتے ہیں کہ "تغیر انسانی معاشرے کی دیومالا کی انمٹ علامت ہے۔ اس کا نام احمد و بادیہ ہو سکتا ہے۔ قطب نما بھی ہو سکتا ہے۔ راڈر بھی ہو سکتا ہے علامتیں انسانی ذہن کی تخلیق ہیں وہ اپنے خالق سے متعلق ہوتی ہیں اور اسی کی تابع ہوتی ہیں۔" یہی سبب ہے کہ مدنی اپنے احساس اپنے جذبے اور اپنی فکر کی تصویرکشی کے لئے نئی علامتیں تلاش کرتے ہیں۔ یہ علامتیں قدیم دیومالاؤں سے بھی اخذ کی گئی ہیں اور جدید صنعتی تہذیب سے بھی۔ ان علامتوں کے ذریعے مدنی ایک باخبر انسان کی طرح ذات کے رشتہ سے وابستہ رشتوں کا ذکر اپنی شاعری میں کرتے ہیں۔ مدنی کی نظمیں موضوعاتی نہیں بلکہ تاثراتی اور علامتی ہیں۔ ان کی ہر نظم میں ایک بنیادی خیال تو ہے لیکن اس طرح کہ خیال کی ایک یکسر سیدھی نہیں بلکہ اس میں جذبوں کی تیز یا آہستہ رو لہریں ملتی ہیں۔ طیف منشوری کی طرح اس میں ہلکے گہرے رنگ ہیں جن میں درجہ بدرجہ رنگوں سے ماورا رنگ بھی ہوتے جیسے طیف کی بالائے بنفشی (ULTRA VOILET) اور زیر سرخ (INFRA RED) شعاعیں۔ بہت سی باتیں ان کہی کہہ کر انہی کے پردے میں بہت سی باتیں کہہ جانے کا فن مدنی کو خوب آتا ہے۔ اسی فن کو میں نے رنگوں سے ماورا رنگ کا نام دیا ہے۔ مدنی کی ایک نظم "آبادی کے دائرے" اس تکنیک کی عمدہ مثال ہے۔ اس نظم کا آغاز بادلیئر کی نظم "قاری سے خطاب" یا (AU LECTEUR) کے آخری مصرعے HYPOCRITE LECTEUR—MON SEMBLABLE—MONFRERE) سے ہوتا ہے۔ بادلیئر کے اس مصرعے کو ایلیٹ نے بھی "ویسٹ لینڈ" کے پہلے قطعے کے آخر میں استعمال کیا ہے۔ مدنی نے جب اپنی نظم کا آغاز اس مصرعے سے کیا۔

اے برادر، رازداں، مکار قاری کچھ نہ پوچھ

تو بہت سی ان کہی باتیں کہتے ہوئے یہ مصرعہ لکھا ہے۔ اس لئے کہ اس کے پڑھتے ہی قاری کا وہ پورا کردار سامنے آجاتا ہے جو بادلیئر نے اپنی نظم میں بیان کیا ہے۔ ہمارے ذہن میں بادلیئر کی نظم کا مضمون ابھرتا ہے اور مدنی کے مصرعے کی معنویت اور تہہ در تہہ کیفیت کا

حال کھلتا ہے۔ بادلیئر نے قاری سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ حماقت، بدی، غلطی، کمینگی، گناہ اور شیطانی قوتیں ہمارے ذہنوں اور جسموں پر مسلط رہتی ہیں اور کٹھ پتلیوں کی طرح ہمیں نچاتی رہتی ہیں ...... اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ ہماری روح میں جرأت کی کمی ہے ...... ہماری بدیوں کے گندے حیوان خانے میں چیختے چنگھاڑتے دہاڑنے والے گیدڑوں، چیتوں، بندروں، کرگسوں، سانپوں اور عقربوں سے بڑھ کر بھی ایک بدباطن اور ناپاک ایک اور چیز ہے اگرچہ وہ اپنے خصائص کا اظہار ہذیانی اور وحشیانہ حرکات سے نہیں کرتی ہے۔ لیکن وہ چیز کرۂ ارض ...... کو کرنے پر (ظرفا کرنا) تیار ہو جائے گی اور ایک بار منہ کھول کر ساری دنیا کو بخوشی نگل جائے گی اس کا نام ہے بیزاری۔ پائپ پیتے وقت اپنی آنکھ میں ایک نارضامند آنکھو بھر کر یہ پھانسیوں کے خواب دیکھا کرتی ہے۔ اے قاری تو اسے جانتا ہے۔ تو اس نازک مزاج عفریت کو جانتا ہے۔ اے ریاکار قاری! اے میرے ہم جنس! اے میرے بھائی! اس پس منظر میں مدنی کی نظم کا آغاز کیجئے

اے برادر رازداں! مکار قاری کچھ نہ پوچھ
یہ سرِ قرطاس آبادی کے لاکھوں دائرے
کس کے یہ تابوت ہیں کس کی عماری کچھ نہ پوچھ

اس تمہید سے مدنی قاری پر یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اسے الفاظ کے شہر اور آبادیوں کے دائرے میں قدم رکھنے سے پہلے احساس اور کرب کی اس منزل سے گزرنا چاہیئے جس سے شاعر کا حساس ذہن اور وحشت مند شعور گزر رہا ہے اس کے بعد انھوں نے اپنے احساس کی تصویرکشی علامات اور تاثرات کی صورت میں کی ہے۔ اور آبادی کے ان دائروں کی حقیقت سے یوں نقاب اٹھائی ہے۔

دائرے تاریک، خونیں، آتشیں، ژولیدہ مو
آپ خود اپنا غیاب اور آپ خود اپنا حضور
جنبشِ پرکار کا دوڑا نہیں، جس میں لہو
نیشِ عقرب کی طرح حرص و ہوا کی بے کلی
دل زدوں کے دائرے، تیرہ طلب کی بارکیں
رشک کے تاریک کوچے، خوف کی اندھی گلی
ٹین کے ڈبے، پرانی بوتلیں، میراثِ جد
علم کی بے حس کمیں گاہیں، کہ جن کی اوٹ سے
کاٹ دی ہے دیمکوں نے زندگی کی تازہ حد

یہاں انھوں نے اس زوال آمادہ تہذیب اور فرسودہ فکر کا پس منظر پیش کیا ہے جو ورثے میں ٹین کے ڈبے اور پرانی بوتلیں چھوڑ گئی ہے اور بے حسی کی کمین گاہوں کی اوٹ سے دیمک کی طرح زندگی کی تازہ حد کاٹ دی ہے۔ لیکن اسی پس منظر میں اخلاقی قدریں بھی رہی ہیں۔ کیونکہ ہر دور نیک و بد سے عبارت ہوتا ہے اور ماضی کی اس روایت میں بھی ایک سمت اگر ہوشانِ نیم رخ کے دائرے اور عصیاں کے خواب ہیں تو دوسری طرف آسیا گرداں بتول اور مریم تنہا نشین بھی ہیں۔ اگر ایک طرف خواب زلیخا ہے تو دوسری جانب روزن زنداں کے خواب بھی ہیں۔ اس پس منظر کے بعد ایک عالم وحشت کا عکس ملتا ہے جو جدید و قدیم کا بھیانک امتزاج ہے۔ ان ہوٹلوں

اور رقص گاہوں کی تصویر ہے جو جدید تہذیب کے آئینہ خانے ہیں لیکن ان میں

اک بدن رقاص حبشی، آبنوسی اک شجر
طبل کی آواز سے جنگی درندوں کی عیاں
مہ وشان نیم عریاں کی بلوتی ہے کمر

یہ جدید تہذیب ہے جس میں بدن کی عریانی کا ایک روپ یہ بھی ہے۔ اسی میں ایک سمت جسم کی نمائش کے لئے انواع و اقسام کے اجسام ہیں۔ ہنگامہ پرور موسیقی ہے اور رقص گاہیں ہیں۔ دوسری جانب زندگی کا وہ رخ ہے جسے تہذیب کی سنگین حقیقتوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس میں مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ ہے۔ انسانی محنت کا سودا ہے اور تاریکیوں کا جال ہے جس میں خود کار آلات ہیں اور معیشت کے سارے وسیلوں پر گرگ ہائے ریشہ دار قابض ہیں۔ اس عالم کی تصویر کشی مدنی نے یوں کی ہے :-

سخت تریاکی دھوئیں میں خونفشاں محنت کی آنکھ
سوئیاں بیتاب، میٹر گیج ہیں محو شمار
پڑھ رہی ہے ایک تحریر رواں محنت کی آنکھ
ساحلوں کے جن میں خوابیدہ جہازوں کی قطار
پی رہے ہیں رات کی نیلی سیاہی میں لہو
دور تک پٹرول کے چشموں پہ گرگ ریشہ دار

تریاکی دھواں، خونفشاں محنت کی آنکھ بیتاب سوئیاں۔ میٹر گیج اور اس کے بعد خوابیدہ جہازوں کے لئے ساحلوں کے جن کی تشبیہہ اور شرق الاوسط کے پٹرول کے چشموں پر قابض سامراجی قوتوں کے لئے گرگ ریشہ دار تیز اور موثر علامتیں ہیں۔ ایسی علامتیں جو جذبے اور احساس کی تصویر سے زیادہ خود ایک تجربہ بن کر ابھرتی ہیں اس کے بعد فرد کی مابعد الطبیعیات ہے جو ارضی حقائق سے آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتی ہے یا یوں کہیے کہ گرد و پیش کی خبروں اور واقعات سے نگاہ بچا کر قدیم دیو مالا اور ماضی کے اساطیر کی طرف رجوع کرتی اور فرد کو ان کے تعلق سے پہچانتی ہے تو وہاں بھی کوئی مختلف عالم نظر نہیں آتا۔

نیم شب دل میں مگر رم خوردہ سیاروں کے کھیل
بازئی چوگاں خداؤں کی بساطِ خاک پر
خون منہ کو لگ گیا ہے ایسے اوتاروں کے کھیل

اس بند کے آخری دو مصرعے پڑھ کر مجھے شکسپیر کے ڈرامے "کنگ لیئر" کے یہ مصرعے یاد آ رہے ہیں

AS FLIES TO WANTON BOYS ARE WE TO THE GODS
THEY KILL US FOR THEIR SPORT.

عہد حاضر کے اس تمام بھیانک پس منظر اور ذات کے کرب کی اس داستان کے بعد پھر اسی قاری سے خطاب ہے۔ جو یار بھی ہے، رازدار بھی اور بھائی بھی۔

اے برادر یوں نہ چھا ان دائروں کے درمیاں

تیرتا ہے اس فضا میں اک ہجوم ارواح کا
اس طرف دوزخ کی آبادی کا آتا ہے دھواں

اس کے بعد نظم دانتے کے "جہنم" (INFERNO) کے پہلے بند کے ترجمے پر ختم ہو جاتی ہے :-

دائرے وہ زندگانی کے سفر کی راہ میں
راستہ کھویا ہوا تاریک جنگل کا محیط
روشنی آتی نہیں ہے علم بے آگاہ میں

احساس کی میزان سنبھالنے اور داخلی کرب کی روشنی میں کسی حساس شاعر کا کلام پڑھنے یا علم کی اقلیم میں قدم رکھنے کے لئے جس شرط کی ضرورت ہوتی ہے اسے اس نظم میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ خود شاعر کی ذات کے زخم اور محسوسات کے جلتے ہوئے داغ الفاظ میں سمٹ آئے ہیں اور نظم اس مرحلے پر آکر ختم ہو گئی کہ احساس اور آگہی کی مشعل جلائے بغیر تخلیقی شہ پاروں کو پڑھنے کی کوشش بے سود ہوتی ہے۔ اور یوں لگتا ہے جیسے ایک تاریک جنگل میں آکر راستہ کھو گیا ہو میرے خیال میں اس نظم میں تعمیم سے تخصیص کی طرف آتے ہوئے مدنی نے اپنی شاعری اور اپنے شعور کی تفہیم کے باب میں بہت کچھ کہہ دیا ہے۔

"کوئی شاخِ آشنا" بحر اور ہیئت کے اعتبار سے "آبادی کے دائرے" سے مشابہ ہے اور اس کے ابتدائی حصے میں بعض ایسی امیجز اور علامتیں استعمال ہوئی ہیں جو آبادی کے دائرے میں پہلی بار آئی تھیں ہر نظم میں ایک بڑے شہر کی زندگی اپنی تمام سفاکیوں اور بے رحمیوں کے ساتھ ابھری ہے۔ نظم کا نقطۂ آغاز شہر کی شام ہے۔ اس شام کا پیرہن مدنی کے الفاظ میں دیکھئے۔

شہر پر نیلے دھوئیں کی سامری زنجیر ہے
جل رہا ہے سینۂ خورشید میں داغِ غروب
روشنی مجروح طائر کی طرح دلگیر ہے

اس کے بعد حبشی نژاد غلامان کہن کی طرح پرچھائیاں ہیں۔ عصیاں کا سبک رفتار رتھ ہے۔ وقت کی جنبش ہے۔ بدی کا چاک ہے اور پھر شام جب رات کے بطن میں داخل ہوئی تو جیسے سارا شہر ایک نیلام گھر میں لاکر رکھ دیا گیا۔ ذرا شہر کی امیج ملاحظہ کیجئے :-

رات کے ہاتوں چلے جانے کو ہیں نیلام ہیں
شہر، بندرگاہ، سیارے، سمندر، روشنی
دور تک بکھری ہوئی اشیا ہیں اک گودام میں

اس نظم میں بھی جہازوں کے جن قطار اندر قطار ساحل کے قریب سو رہے ہیں۔ اور روحِ قزاق و سکندر محو گفتگو ہے۔ یہ دونوں استحصال کی علامتیں ہیں۔ اس موقع پر آپ کے ذہن میں سکندر اور بحری قزاق کا مشہور مکالمہ ہوگا۔ پھر کہتے ہیں۔

ان حریفانِ تلاطم سے بھی سر ہوتا نہیں
قلزم بیتاب کس کی آرزو میں محو ہے

یہ بیتابی ہے، گردش ہے، جنبش ہے، تغیر ہے۔ قلزم بیتاب ہے۔ دراصل زندگی ہے جو سارے قزاقوں اور سارے جابروں کی چیرہ دستیوں کے باوجود بیتاب اور رواں دواں ہے اس کا تلاطم ازل سے یونہی ہے بڑا صنعتی شہر بھی اس تلاطم کی ایک موج ہے

اب اس شہر میں کچھ لوگ جاگ رہے ہیں، کچھ سو رہے ہیں۔ شاعر اس لئے جاگ رہا ہے کہ زندگی کا اضطراب اور فطرت کا جبر اسے نہیں سونے دیتا۔ اور کچھ لوگ اس لئے بیدار ہیں کہ کارخانوں میں، ریلوے ورکشاپ میں راتوں کو کام کرتے ہیں۔ کسبِ معاش کی خاطر اپنے آرام کو تج دیتے ہیں۔ پچھلے پہر تک رات کی ہوا کا خدنگ شہر کے ہر باخبر وجود کے سینے میں اتر جائے گا اور اس کی خلش جاگتی آنکھوں کو اور بیدار کردے گی

دور تک ہے اس فضا میں خواب بیداری کی جنگ
شہر سے گزری ہے آوارہ ہوا ترکش بدوش
جانے کس سینے میں اترے آخرِ شب کا خدنگ
دور تاریکی کی چادر سے شرر اڑتے ہوئے
رات کے جنگل کا جادو ریلوے کی ورکشاپ
ایک دھویں میں آہنی نیلوں کے دل مڑتے ہوئے

اس بند میں تاریکی کی چادر سے شرر اڑتے ہوئے، رات کا جادو ریلوے ورکشاپ سے نکلتے ہوئے دھویں میں آہنی نیلوں کے مڑتے ہوئے دل بہت نمایاں امیجز ہیں اور ان میں جنبش و حرکت کا سا احساس ہوتا ہے۔ پھر اس فضا میں ذاتی زندگی کا کرب ہے جو ایک جسم کے قرب کی تمنا کا نتیجہ ہے۔ زندگی کی ضرورت بھی حسرت بنی ہوئی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے وصل و ہجوری دونوں حقیقتیں ہیں اور زندگی ایک ایسا پھل بن گئی ہے جو نصف تازہ اور نصف کرم آلودہ ہے۔

اس فضا میں وقت دردِ ہجر و آغوشِ وصال
اک ثمر جو نصف تازہ نصف کرم آلودہ ہے
اک حقیقت طالبِ قرب اور اک دوری جال

اس فضا میں احساسِ ذات کے کرب اور جبرِ آگہی نے اندر ہی اندر ایک انتشار برپا کردیا ہے جو جاں کنی کی ساعتوں سے کم نہیں۔ اور یوں لگتا ہے جیسے زندگی کا حساب درد کے اعشاریوں میں لکھا جا رہا ہے :۔

آرزوئے زندگانی ؛ اجتنابِ زندگی
کربِ تولیدِ دفشار۔ جاں کنی کی ساعتیں
درد کے اعشاریوں میں اک حسابِ زندگی

اس سارے ماحول کا جائزہ لینے کے بعد یوں لگتا ہے جیسے رات کی آغوش میں ہر شے کا کوئی نہ کوئی مسکن ہے لیکن شاعر کا دل اور بے تاب روح اس پرندے کی مانند آوارہ ہے جس کا کوئی آشیاں نہیں اور جو آخر شب کے لمحوں میں بھی بے خواب ہے۔ ایسے میں اس فطری خواہش کا اظہار بھی ہے کہ درد کے تنہا نشیمن کے لئے اب طائرِ دل کو بھی ـــــ کوئی شاخِ آشنا ڈھونڈ لینی چاہیئے ؎

اے دل، اے پامالِ جاناں اے مری بیتاب روح
ڈھونڈ تو بھی درد کے تنہا نشیمن کے لئے
کوئی شاخِ آشنا بے آشیاں بے خواب روح

رات مدنی کی شاعری میں ایک مستقل علامت ہے جو بار بار مختلف پس منظر کے ساتھ ان کی نظموں اور غزلوں میں آتی ہے رات کے

علامتی پہلو پر ذرا توجہ فرمائیے۔ رات شاعری کا ایک اہم موضوع بھی ہے اور زندگی کے بہت سے مظاہر کا استعارہ بھی۔ ہجر کی رات اور وصل کی رات کا ذکر تو دنیا کی ہر شاعری میں ہے لیکن اگر اس کے روایتی مفہوم سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رات وہ عرصۂ وقت ہے جس کے ہزار پہلو ہیں۔ رات سکون ہے۔ سکوت ہے۔ ایک ایسا عالم ہے جس میں گردش و رفتار سے عبارت زندگی کہیں تھک کر سو جاتی ہے۔ اور کہیں ناز و نعم کے سائبان تلے خواب عشرت سے ہم آغوش ہوتی ہے۔ نہ دھوپ کی خیرگی نہ سورج کی تمازت بے ہنگم اور بے ربط زندگی کا شور ختم ہو جاتا ہے اور اس وقت آپ اپنے گرد و پیش کو اس طرح دیکھ سکتے ہیں جیسے طوفان گزر جانے کے بعد عالم سکون میں ہر شے پر پوری توجہ اور جذبے کی فراوانی کے ساتھ آپ کی نگاہ پڑتی ہے۔ یہ وقت شگفتگی کلہائے ناز کا وقت بھی ہے اور اپنے دل کی دھڑکنوں کو شمار کرتے۔ گردش سیارہ کی آواز سننے، بساط عالم کی ان گنت مہرہ بازیوں کے باب میں سوچنے اور ذات اور کائنات کے درمیان حائل ہونے والی بے شمار خلیجوں کو عبور کرنے کے منصوبے بنانے اور اپنی تنہائی کو ایک جہان نو بنا کر کیف و کم کے سارے پہلوؤں کو جذب کرنے کا وقت بھی ہے۔ رات خواب بھی دکھاتی ہے بیدار بھی رکھتی ہے۔ رات کے سناٹے میں بیدار اور حساس انسان کا دل نیک و بد، نفع و ضرر، محرومی و آسودگی، رفاقت و مہجوری کے ان گنت داخلی کرب سہتا اور اظہار کے تار و پود بنتا ہے۔ رات تخلیق کے لئے سازگاری کا عالم ہے۔ رات گناہوں کی پردہ پوش ہے۔ ایک دم خوردہ ندی کی طرح نرم رو بھی ہے اور بعض شہر کی طرح سیاہ، بھیانک اور مضبوط بھی۔ پھر چاندنی رات کا روپ الگ ہے، تاروں بھری رات، برسات کی رات اور جاڑوں کی رات کی کیفیت اپنی اپنی جگہ بالکل الگ ہے۔ اس رات پر مدنی نے ایک قصیدہ بھی لکھا ہے "قصیدۂ شب"۔ اس کا انداز اردو کے روایتی قصیدوں کا سا نہیں ہے۔ اس میں رومانوی شعرا کی ODES کا انداز ہے۔ یہ نظم بھی ہیئت اور بحر کے اعتبار سے "آبادی کے دائرے" اور "شاخ آشنا" جیسی ہے۔ اس میں ہیئت کا وہی التزام ہے جو مدنی کی نظموں کا خاصہ بن گیا ہے اس ہیئت کی نظموں میں مدنی تین تین مصرعوں کے مربوط یا غیر مربوط بند لکھتے ہیں اس طرح کہ ہر بند کا پہلا اور تیسرا مصرعہ ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں اور دوسرے مصرعے میں یہ التزام نہیں ہوتا ہے" قصیدۂ شب" میں مدنی نے رات کو سکون و رم کا دام کہا ہے۔ ایک ایسی ماں کہا ہے جس کی اولاد قاتل۔ چور، مجرم، داغ، درد، شپرک، مار سیہ۔ خنزیر، ناخن۔ ڈنک اور زہر ہیں۔ پھر رات کی تاریکی کو سامان زخم و اندمال بھی کہا ہے اور ایک ایسا تازہ حریری اوس کا رومال بھی جو جلتے ہوئے زخموں کے لئے مرہم ہے۔ رات کی تیرگی احساس کو لوریاں دیتی ہے اور اس کے چشمے سے رستی ہوئی پانی کی کوئی بوند آدمی کی پیاس بجھا سکتی ہے۔ اس نظم میں بعض بہت خوبصورت ایمجز علامتیں تشبیہیں اور استعارے پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ اس کے ابتدائی مصرعے دیکھئے۔

رات اے نیلی سیاہی اے سکون و رم کے دام
تیرے بطن تیرہ میں ہیں نیک و بد کی کیاریاں
ہر تغیر کو تری موج نفس ہے اک نیام
تیرا بطن تیرہ مٹی کھیت کی سیراب وصل
آفریدہ تیری اندیشوں کی نازک بالیاں
روح فرد اسے ہم آغوشی کی طالب تیری فصل

اس میں نیک و بد کی کیاریاں۔ سیراب وصل۔ اندیشوں کی نازک بالیاں۔ بہت تازہ اور شاداب ترکیبیں ہیں۔ پھر

رات کا یہ رخ دیکھئے جس میں رات کو عورت کے روپ میں پیش کیا ہے اور اسے نسوانی نفسیات کے بعض باریک پہلوؤں سے متصف کردیا ہے:۔

سازشوں سے جلنے والی کوکھ شرمائی ہوئی
بستر اغیار کے بے سوز ہنگاموں کے بعد
جبر کے ہاتھوں تعلق کی سزا پائی ہوئی

رات کے نئے تشبیہیں دیکھئے۔ جو رنگوں اور خوشبوؤں کی لہریں ساتھ لے کر آئی ہیں:۔

سنگ اسود چشم سرمہ سا ہر اک تیری مثال
تجھ سے صندل کی مہک سانپوں کی مستی جسم میں
بوئے عنبر تیری خو تیری گرہ ناف غزال

پھر رات کے دامن میں گناہوں کی پردہ پوشی اور عصمت و عصیاں کی بے ترتیب نیندوں کا رمز یوں بیان کیا ہے:۔

خاک بر سر عشق کی بالین غم پر تیرا ہاتھ
عصمت و عصیاں کی بے ترتیب نیندوں کے لئے
ایک رمز پردہ داری ہے ترے دامن کا ساتھ

پھر یہ مصرعے دیکھئے:۔

تیری نرمی' اِک کلید قفل و چارہ ساز غم
ادھ کھلے احساس کے در پر سبک پرچھائیاں
خواب کے دامن پہ جب رکھنے کو ہوں پہلا قدم
تیری شبنم کی سبد رازوں سے پر ہوتی رہی
نرم ہونٹوں میں محبت بوسۂ اول کا بیج
عہد و پیماں کی حدوں میں ہو دنگ بوتی رہی

ان مصرعوں میں حریر و پرنیاں کی سی نرمی شبنم کی سی خنکی اور ایک انوکھی ارتقائی کیفیت ہے۔ ادھ کھلے احساس کے در پر سبک پرچھائیاں اور شبنم کی سبد رازوں سے بھرا اور نرم ہونٹوں میں محبت کے بوسۂ اول کا بیج بونا یہ ساری امیجز بہت خوبصورت حیاتی تصویریں ہیں۔ اسی رات کے اسرار و رموز میں ایک رمز زندگی کی ان سنگین حقیقتوں سے تعلق رکھتا ہے جو ارباب سیاست کی دین ہے:۔

تار بیلدر کی سلگتی آنکھ رہتی ہے گواہ
نیند مبیداری کی ملیناروں میں ہے صدا ماں
سوگئی ہے خندقوں میں جاگنے والی سپاہ

بحر و بر کے جنگی اسلحوں اور فوجی طاقتوں کی اس تصویر کے بعد آخر میں مرہم و اندمال کے اس دیلے کا قصیدہ اس مطلب اور مدعا پر ختم ہوجاتا ہے:۔

لوریاں دیتی ہے تیری تیرگی احساس کو
تیرے شیشے سے کوئی رستی ہوئی پانی کی بوند
اک نفس کو جو بجھا دے آدمی کی پیاس کو

میں نے محسوس کیا ہے کہ شہری زندگی کی امیج کے استعمال میں مدنی نے انگریزی شاعری سے خاصا استفادہ کیا ہے ایک اعتبار سے مدنی کا ذہنی تعلق اس نسل سے ہے جسے انگریزی میں AUDEN GENERATION (نسل آڈن) کہا جاتا ہے۔ اس میں آڈن، لوئی میک نیس، سی ڈے لیوس، اسٹفن اسپنڈر اور کرسٹفر اشرووڈ شامل ہیں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی مذہبی اور سریت پسند شاعری اور اس کی شکست خوردگی اور مایوسی کے خلاف تیسری دہائی کے ان شاعروں کے ذہن میں ایک نئی شاعری کی بنا ڈالنے کا خیال پیدا ہوا۔ ان شاعروں نے مابعد الطبیعیاتی شعرا اور ایلیٹ کے بجائے ہاپکنس اور ڈبلیو۔ بی۔ ایٹس کے چراغوں سے اپنی شاعری کا چراغ روشن کیا اور ایک نئے اجالے کی طرح ڈالی۔ ان شعراء کے طبائع اور مزاج مختلف تھے۔ مزاج کا یہی فرق مدنی میں بھی ہے۔ ہاپکنس اور ایٹس سے وہ بھی متاثر ہیں۔ لیکن مشرقی روایاتِ شعر اور ذاتی تخلیقی ذہانت اور اخذ و استنباط کی صلاحیت نے مدنی کی شاعری کو ان انگریزی شعرا کے کلام کا چربہ بننے سے بچا لیا ہے۔ تیسری دہائی کے شعرا کے صنعتی دور کا ہیرو ہوا باز تھا۔ آج وہ ہیرو کچھ اور آگے بڑھ کر زہرہ و ناہید سے سرگوشیاں کر رہا ہے۔ اب خلانورد ہمارے دور کا ہیرو ہے۔ ارضی سطح پر ریل گاڑی، مشینیں، کرینیں، اسکائی اسکریپرز کو جدید شاعری میں سمیٹا جا چکا ہے۔ اب بین السیاراتی رشتوں کی طرف شاعری نے آنکھ اٹھا کر دیکھا ہے۔ تسخیر کائنات کے اولین نقوش اب شاعری کی روایت بن کر سامنے آرہے ہیں۔ اردو میں مدنی نے اس گوشے کو بھی اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ رات کے سلسلے کی نظموں میں ان کی ایک نظم "ایئرپورٹ کی رات" ہے یہاں ایئرپورٹ بڑے شہر کی زندگی کے تضادات اور گوناگوں پہلوؤں کا استعارہ بھی ہے اور مشینی اور صنعتی عہد کی ایک اہم علامت ہوائی جہاز کی آماجگاہ بھی۔ اس نظم میں مدنی نے صنعتی زندگی اور مشینوں سے علامتیں اخذ کرنے کی ایک نمایاں، واضح کامیاب، موثر کوشش کی ہے۔ ایئرپورٹ ہر بڑے شہر کی زندگی کا اہم رخ ہے یہاں فضا کے دوش پر اترتے ہوئے طیارے چہار دانگ عالم کے مسافروں کو لاتے اور لے جاتے ہیں بیسویں صدی کی پروازی کوششوں کی ایک اہم علامت ہوائی جہاز ہے۔ یہ ہوائی جہاز خود ایک دنیا ہے جس میں مختلف شعبوں اور مختلف ملکوں کے لوگ ایک دوسرے کے ہم سفر اور ہم جلیس ہوتے ہیں۔ پرواز کے دوران زمین سے ان کا رشتہ صرف اس قدر رہتا ہے کہ کشش ثقل کی ایک غیر مرئی ڈور طیارے کے وزن کو تھامے رہتی ہے اور ہوا اسے ایک بڑے پرندے کی طرح بادلوں کے دیس میں لے جاتی ہے۔ اس دور میں آواز سے تیز طیارے ہیں۔ اور پھر ان کا اگلا قدم راکٹ ہے جو خلا کی تسخیر اور مصنوعی سیاروں کی ایجاد کے ابتدائی نقوش ہیں، بیسویں صدی کی اس اہم علامت کو مدنی نے بڑے شہر کے ایئرپورٹ کے پس منظر میں دیکھا ہے۔ ایئرپورٹ کی رات ایک مختلف روپ رکھتی ہے دور تک رن وے کا سیاہ آغوش وا نظر آتا ہے۔ اس کے حاشیوں پر سفید اور سرخ روشنیاں چمکتی ہیں۔ پائلٹ کاریں زود رفتاری سے دوڑتی اور طیاروں کی آمد کی خبر دیتی ہیں پھر اس مشینی پرندے کی پرواز کا ایک بے پایاں شور جس میں ہر آواز گم ہو جاتی ہے۔ ایئرپورٹ پر دورِ حاضر کی تاجرانہ چمک بھی ہے، کسٹم کی چوکی بھی ہے اور زندہ آدمی کا یہ احساس بھی کہ زندگی کی راہ آدمی کے دل کی لاکھوں وادیوں میں گھوم کر خانہ ویرانی کے در تک آ گئی ہے۔ اس نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے :-

یہ زمیں اے جاں ہوا بازوں کے بازو کا سواد

تازہ تر دشتِ جنوں سود و زیاں کی مملکت
رخصتوں کا حلقۂ آغوش جادو کا سواد

ایرپورٹ کو ہوا بازوں کے جادو کا سواد، سود و زیاں کی مملکت اور رخصتوں کا حلقۂ آغوش کہنا مدنی کی منفرد تصویر آفرینی کی اچھی مثال ہے۔ پھر ان مصرعوں میں آئینوں کی جھیل، نیم خوابیدہ سی پریاں، نیم آسودہ سے جن اور سرخ ہونٹوں میں غمِ منزل کی نیل کی امیجز دیکھئے۔

ذوقِ خود بینی سے پیدا آئینوں کی ایک جھیل
نیم خوابیدہ سی پریاں نیم آسودہ سے جن
سرخ ہونٹوں میں لرزتا کچھ غمِ منزل کا نیل

پھر طیارے کی پرواز جیسے میکانکی عمل کو بہت داخلی بنا کر پیش کیا ہے اور طیارے کو آہنِ تازہ خرام اور پرواز سے قبل طیارے کی آواز کو شہر کی چادر پہ لرزاں ایک شورِ بیکراں کہا ہے جس سے دوشیزہ زمینوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے VIRGIN SOIL کی ترکیب ہم میں سے بہتوں نے پڑھی ہے۔ لیکن مدنی نے دوشیزہ زمین کی ترکیب ایجاد کر کے اسے خالص مشرقی بنا دیا اور اسے سن کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دوشیزہ زمین کا تصور پہلی بار ذہن میں پیدا ہوا ہو مشینی امیجز پیش کرتے وقت مدنی الفاظ کے نرم و نازک پیکر تراشتے اور اپنی جمالیاتی حس کو برقرار رکھتے ہیں۔

پائلٹ کا رہی، نقیبِ آہنِ تازہ خرام
شہر کی چادر پہ لرزاں ایک شورِ بیکراں
نیند کر دیتا ہے دوشیزہ زمینوں پر حرام

پھر اسی نظم میں یہ تازہ تشبیہیں بھی آتی ہیں:

کچھ مسافر کو رئیر کچھ دور کے جاسوس سے
ایک تنہا طالبہ بارش میں اک ننھا پرند
اور محراب ہوا لرزاں غمِ ناموس سے

اس کے بعد سیاست کی لکنت آمیزی کی شکستہ پر صدا ہے اور فکر ساقطے سے پریشان موسیفر ہیں۔ تاجری کی تیسری آنکھ ہے۔ دل زدہ کسٹم کی چوکی ہے اور پھر یہ آخری تین بند:۔

زندگی اے جانِ جاں آخر ہے سیلِ بے پناہ
آدمی کے دل کی لاکھوں وادیوں سے گھوم کر
خانہ ویرانی کے در تک آگئی ہو جس کی راہ

خستگانِ رہ میں یہ صدیوں سفر کی یادگار

یہ سوادِ ابر یہ جولاں گہِ موجِ ہوا
بال و پر کے سلسلوں میں بال و پر کی یادگار

کچھ نہیں تو چادرِ گل میں چھپا کر لے چلیں
موم کے پر کے خدا کی میتِ بے نام کو
اس سوادِ تیز گامی سے اٹھا کر لے چلیں

ائیرپورٹ کی رات کو دیکھ کر اور اس کے تمام نمایاں پہلوؤں کا جائزہ لے کر تمدنی کا ذہن زندگی پر آکر ٹھہر جاتا ہے جو سیل بے پناہ ہر اور جنبش و رفتار سے عبارت ہے پھر ان کا تاریخی شعور ماضی کے رشتوں میں بال و پر کے سلسلے ڈھونڈتا ہے۔ اور انھیں یہ خیال آتا ہے گویا طیارے کا فضا میں اڑنا بال و پر کے سلسلوں میں بال و پر کی یادگار ہے۔ پھر موم کے پر کے خدا کی میت کہہ کر پردے ہی پردے میں خود ہمارے ذہن کو قاری کے ذہن کو اکیرس کی داستان کی طرف منبدل کرا دیا ہے۔ اکیرس کا اسطوری پس منظر میں اس مضمون کے شروع میں پیش کر چکا ہوں

(دوسری قسط آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیے)

عزیز حامد مدنی

# غروب

چند چھینٹوں سے جھکی گُل رہ گذا
دل میں اُتری سنبھلتی ہوئی دُور سے
تیز رو نیم رُخ ایک چہرے کی دھار
رات تاریک محضر میں روتی رہی
ہر ٹپکتی ہوئی بوند کچھ زخم کے
بیچ کھڑکی کے شیشوں میں بوتی رہی
اجنبیت کے احساس سے رُک گئی
ایک آہٹ ہوا میں بہت آشنا
آرہی تھی بہت پاس سے رُک گئی

تیرگی ہو گئی تیز رو اور کچھ
صیقل درد۔ ایک آئینہ کر گیا
عافیت کے مسِ خام کو اور کچھ

سرد قالین پر غول خانہ بدوش
رات کی رات ٹھہرے ہوئے کارواں
گرد اخبار تنکے پڑے ہیں خموش،
بیضوی بلب پر نیم لرزاں پتنگ
دائرے حال و فردا کے بنتے ہوئے
وقت ہی روشنی وقت ہی تیرہ رنگ

ختم ہے محفلِ دوش بیٹھے ہو کیوں
نیم رُخ ایک پرچھائیں آہستہ سے
پوچھتی ہے کہ خاموش بیٹھے ہو کیوں
کم کوئی دردِ ایام ہوتا نہیں
آؤ باہر چلیں حبس سے اور بھی
جی الجھتا ہے کچھ کام ہوتا نہیں

وقت کے اک کھنڈر سے ملتا رہا
بے حسی کا خنک کو کناری دھواں
ذہن بیدار میں گھر بنا تا رہا

بات اب صبح تک جاگنے پر گئی
خانۂ یاس کی مہرباں داشتہ
نیند اک نردباں سے اُتر کر گئی

کائی ہے. شاخِ مرجان کے قطعات ہیں
اس شبِ بادہ خواری کے قلزم میں بھی
کس قدر جان لیوا نباتات ہیں
رات کی ماہی گیری بھی کیا پائے گی
چند اسپنج اُترے ہوئے نشتوں کے
صبح دم جال میں لے کے آجائے گی

اے مرے دل! ترا تول کب تک الگ
کوئلے کی سلوں میں رہے موجزن
میں بھی ہیرے کی رگ تو بھی ہیرے کی رگ

چند اعداد کے سرد اوزار سے
کاؤنٹر کی پری ایک ایڈنگ مشین
کاٹ سکتی ہے ہیرے کو اک وار سے
مرکزِ ثقل ہے اک دکاں خوش غلاف
نرخِ بازار کے دائروں میں ترا
پستیوں کی طرف ہی ملے گا گراف

تیرے محور کی ساری کشش کھو چکی
میرے شعلے سے سورج تجھے کیا خبر
سلکِ نورِ ازل کوئلہ ہو چکی
گردشیں ہیں تری سب بگڑتی ہوئی
دیدۂ نم کو تاریکیاں چوم کر
بند کرتی ہیں در قفل جڑتی ہوئی
کتنے ذرّے جو سورج کی تقدیر تھے
بے ضیا در دکے نیل سے ہو چکے
لے کے داغِ غروبِ اجل آشنا
سو بھی جا اور خورشید بھی سو چکے

عزیز حامد مدنی

# آخری ٹرام

آخری ٹرام لڑکھڑاتی ہوئی
شل، پریشان نیند سے بوجھل
شیڈ کے بازوؤں میں جاتی ہوئی

زنگ آلودہ بریک کی فریاد
کر گئی چند ساعتوں کے لئے
رہ گزر کے سکوت کو آباد

کاسۂ یک خیال کے مانند
نیم روشن سی ایک بالکنی
اک نشانِ سوال کے مانند

پوچھتی ہے حسابِ طرزِ معاش
اک ہوا سے جو اس اندھیرے میں
سازِ فطرت کو کر رہی ہے تلاش

دُور پرچھائیوں کا اک بن ہے
راہ کی ناف سے سرکتا ہوا
اک طرف روشنی کا دامن ہے

اک طرف عافیت کا سرد حصار
گوشۂ چشمِ پاسباں کی طرح
عصمتِ زر پہ بینک کی دیوار

دشت و در میں مہیب شورِ سگاں
بے ضمیری ہوا کی کیا کہیے
بے محافظ ہے عصمتِ انساں

عزیز حامد مدنی

# درونِ خانہ

سرد نیلی اوس میں عریاں بدن
رقصِ بسمل کر رہی ہے آج رات
اک نشیب رہ گذر میں ہے مکاں
شپرک سایوں کی بے انفاس رَو
آبنوسی بازوؤں کے درمیاں
جھنگ لیتی تارگِ جاں آئی ہے
اور اس پتھر کی سل پر معتکف
بے حسی کی سرد بے جاں کائی ہے

دور کچھ بارکیں ہیں سرنگوں
آپ خود اپنی ملامت کا ہدف
خشت پردہ دار ہے زار و زبوں
کہنگی کی شرم پر منہ ڈھانپتی
زنگ خوردہ نیم خوابیدہ بسیں
بڑبڑاتی ، شکوہ کرتی ، کانپتی
گرد کی لرزاں فصیلوں سے اُدھر
ڈھونڈنے نکلی ہیں رمزِ زندگی
اک سوالِ عمر ہے یہ سودائے سر
کس سے پوچھے کوئی راہِ استوار

وقت کی گردش ہے اک طوقِ سوال
مہر برلب زندگی ہے سنگسار
نیم گرداں شمعیں ہیں گردابِ حال
شہر کے گوشے میں روشن تاریک
اک ہتھیلی پر ہے سیاحی کا جال
زندگی کی آرزو بازار میں
بے کرم بوڑھے یہودی کی طرح
قرض دیتی ہے جنوں کو یار میں
اک ندی بے آب فریادیٔ حزیں
ایک شیری ڈھول کی آواز ہے
بانجھ سناٹوں میں بے سوز یقیں
روح کبریتی کا آسیبی خرام
مال گاڑی کی جبیں کا چاند ہے
اوس کے آبی دھوئیں میں شعلہ فام

دور اک راڈار ہے چالاک دید
پُر عتابوں کے سرِ مژگاں لیے
آنکھ کے تل میں مسِ خام و حدید
آہنی بے اشک حسرت بے گداز

دوست سے محروم دشمن سے الگ
خجلتِ لفظا رگی سے بے نیاز
دانشِ حاضر کی سقّ کی لئے
آنکھ کے ذروں میں روحِ مخبری
دوڑتی ہے روحِ چالاکی لئے
سایۂ زر تک گئی ہے بے پَری
کھینچتی ہے ایک تازہ زاویہ
اک خطِ ساکن سے روحِ تاجری
اپنے خس خانوں میں روحِ احتیاط
نغموں کے تازہ ثمر رکھتے ہوئے
کھولتی ہے ایک بابِ ارتباط
نرم آوازوں میں دانائی کی دھار
گفتگو کی ایک تازہ قاش سے
محوِ دلجوئی سفیرانِ کبار

کس جگہ آئی ہے تو اے یادِ یار
وقت کے اس دشتِ غربت میں ابھی
تجھ سے کتنے خلوتی ہیں بے دیار
طائرِ ہجرت زدہ ہے زندگی
دشت اندر دشت قحطِ آب ہے
کچھ سرابوں سے ہے دم میں تازگی
دل کوئی حدِّ وطن رکھتا نہیں
آدمی اک آدمیت کے سوا
اور کوئی پیسر ہی رکھتا نہیں
وقت کے ذرّے ہوا میں گر گئے

عقربِ ساعت کی نیشِ تیز سے
نیل سے دیوارِ دل میں پڑ گئے
خانۂ تسلیمِ جاں ہے جس طرف
حرصِ قربت میں اک آوارہ ہوا
رخشِ جولاں آگئی ہے اِس طرف

دل کی دیوارِ ابد پیوند میں
ہم کنارِ خشت پردہ دار تھی
روحِ فردا اک لباسِ گرد میں
بے عناں موجِ ہوا کو ٹوکتی
منہدم ہوتی ہوئی دیوار کو
غم کے زخمی بازوؤں سے روکتی
منتیں کرتی کہ اے خونیں ہوا
یہ سراپردہ ہے بے نقشِ قدم
اے ہوا اس سمت ہے سوئی ہوئی
ساعتِ آئندگانِ تازہ دم
دل کی دیوارِ شکستہ سے اُدھر
سرکشی کی بیل میں کھلتی ہوئی
نرم کلیوں میں نمو ہے کارگر
تازہ بوسوں سے لبِ پیمانہ ہے گرم
دل کے سائے میں کھڑی ہے شادماں
روحِ آدم لے کے اک عصیاں کی شمع
اس سوادِ وقتِ بے زنجیر میں
تو کہیں اندر نہ رکھ دینا قدم
عرصہ گاہِ خانۂ تغییر میں

فضا ابنِ فیضی

# رُباعیات

## ؟

بکھرے ہوئے جذبوں کی کرن ہیں کہ آپ
اسباب دل آویزیٔ فن ہیں، ہوں کہ آپ
یہ تذکرۂ صنفِ غزل اور یہ لوگ
اس بزم میں موضوعِ سخن ہیں، ہوں کہ آپ

## بے مائگی

تیور تری باتوں کے کٹیلے ہوتے
اظہار کے انداز سجیلے ہوتے
ہے تلخیٔ احساس ہی کم کم ورنہ
کچھ اور ترے بول رسیلے ہوتے

## فن کار

زنجیرِ درِ گل ہوں، کھڑکتا ہوں میں
شعلے کی طرح روز بھڑکتا ہوں میں
تخلیقِ معانی کے لئے دل بن کر
الفاظ کے پہلو میں دھڑکتا ہوں میں

## کربِ تخلیقِ فن

دل خون ہو تب شعر کنول بنتا ہے
افکار کا اک تاج محل بنتا ہے
آساں نہیں تربیتِ وجدان و شعور
مشکل سے کوئی جذبہ غزل بنتا ہے

## شعلۂ چراغ افروز

ہر گیت ترا سہاگ بن جاتا ہے
نظروں کا سکوت راگ بن جاتا ہے
جب عشق بڑھا دیتا ہے جذبات کی لو
شاعر کا شعور آگ بن جاتا ہے

انجم اعظمی

# بن باس

روشنی اور اندھیرے میں مری نورجہاں !
میں تجھے پا کے بھی کیوں ڈھونڈھتا ہوں
تیری صورت کو۔ خط و خال کی رعنائی کو
قرۃ العین!
مری آنکھوں نے
آئینہ خانۂ عالم میں کبھی
جُز ترے اور کو دیکھا ہی نہیں
اے زلیخا ! مرا دامن اب تک
چاک ہے تیری محبت کا گواہ
تیرے ہی عشق کی لذت پائی
میں نے اس کوچۂ رسوائی میں
بنسری لَے میں سموتی رہی بے تابیٔ جاں
لڑکھڑاتے رہے رادھا کے قدم شوق کی مستی میں۔ جہاں
پیار کی ایک چھلکتی گاگر
عشق کی پیاس بجھا کر بھی بھری رہتی ہے
میرے انفاس کی خوشبو۔ مری سیتا! جس وقت
رام بن کر تجھے پایا تو اجودھیا سارا
خیر مقدم کے لئے شہر سے باہر آیا
شہر جنگل کی طرح تھا آباد
کھا گیا جس کو مرے عہد کا سوتیلا پن

انجم اعظمی — نگار — بن باس

اب اسی شہر میں بن باس ملا ہے مجھ کو
میں الگ۔ شہر کے سب لوگ الگ
ایک آشوب جہاں
درمیاں گردش و رفتار کے آج
کھینچ کر لایا ہے
سب کہتے ہیں
ٹوٹ جائے گا ہر اک رشتۂ جاں
دیکھ لے چہرۂ بیداد زمانہ تو بھی
اسی راون سے ہوں مصروف ستیزہ کاری

میرا بن باس مری جاں کیلئے
ہر طرف سیلِ بیاباں ہی سہی
تیری چاہت سے گلستاں بکنار
یہ مری خاک کا اندازِ نمو برسوں سے
منتظر ہے کہ نہیں آج تو کل
یاد آئیں گے مرے شہر کو بچھڑے ہوئے لوگ

اے مرے درد کی تابندہ لکیر
زندگی!
میرے جنوں کی تقدیر
حاصلِ عمرِ وفا۔ خوابِ تمنا میرا
توڑ کر حلقۂ گردابِ بلا
اپنے اس شہر کو آباد تو کرنا ہوگا
اور بن باس کے بعد
لوٹ کر تجھ کو مرے ساتھ ہی چلنا ہوگا
لیکن دشوار ہے کانٹوں میں زباں رکھ دیں گے
ہم کوئی اور ہی بنیادِ جہاں رکھ دیں گے۔

# آنکھ کا زخم

جھوٹ سچ کی ترقی معکوس ہے … ایک عریاں حسینہ کا ملبوس ہے
پھول امرت کی رنگیں کٹوری نہیں … کوئی صورت حقیقت میں گوری نہیں
حسن لالہ رخاں، ذہن کا کھیل ہے … لذتِ جسم و جاں ذہن کا کھیل ہے
ہم نے خوش تاب پتھر کو ہیرا کہا … بندگی کو گناہ و کبیرہ کہا
بن گیا وہم صد رنگ بھی دیوتا … پیڑ بھی، سانپ بھی، سنگ بھی دیوتا
نیلگوں آسماں کا یقیں کچھ نہیں … جس کا اول نہ آخر نہیں کچھ نہیں
کون دیکھے یہ فطرت کی باریکیاں … رات کی روشنی، دن کی تاریکیاں
چاندنی رودِ غم ناک ہے کیا کہوں … چاند "اک تودۂ خاک" ہے کیا کہوں
گرمیٔ خونِ دہقاں ہے سورج کی لو … آنکھ کا زخم ہے، خنجرِ ماہِ نو
ابر — مٹی کی اڑتی ہوئی پیاس ہے … بوئے گل اپنی ہی بوئے انفاس ہے
ہم نے دیکھا جدھر دیکھتے رہ گئے … رونقِ رہ گذر — دیکھتے رہ گئے
رہ گذر — زندگی — زندگی، رہ گذر … ہر قدم اک عدم، ہر نفس اک خبر
زندگی — جیسے چغتائی کا اک عمل … زندگی — جیسے کیچڑ میں ہنستا کنول
زندگی گنگناتی ہوئی سانس ہے … زندگی "موت کے قلب کی پھانس" ہے
ہر غمِ زندگی ہے خوشی کا سبب … ہر خوشی ہے غمِ زندگی کا سبب
ہر سبب جزوِ زنجیرِ اسباب ہے … ایک زندہ حقیقت ہر اک خواب ہے
میں کہ ہوں جنتِ خواب کا نغمہ گر … اپنی دھن میں یہ آج آ گیا ہوں کدھر
یہ عجب شہر ہے یہ عجب لوگ ہیں … اپنے اپنے "غلافوں" میں سب لوگ ہیں
سب کے سب ایک نشے میں سرشار ہیں … سب کے سب اک کہانی کے کردار ہیں

جو بھی کردار ہے، قابلِ غور ہے!
اس کہانی کا خالق — کوئی اور ہے!

---

لہ نقصِ قافیہ

احمد رئیس

# اجنبی شہر

(کراچی سے متعلق ایک تاثر)

اجنبی شہر ہے
اجنبی لوگ ہیں
پھر بھی لگتا ہے
جیسے ہوں سب آشنا
ہمدم و ہم نفس
ہمقدم، ہمسفر۔

اجنبی شہر کی
مہکی مہکی فضا
بھینی بھینی ہوا
دے رہی ہے سنو
اک پیامِ وفا
اک نویدِ خوشی!

اجنبی شہر کے
قصر ہائے بلند
اُونچی اُونچی ملیں
کارخانے، دوکانیں
جگمگاتے ہوئے جاگتے بام و در
دے رہے ہیں صدا
آؤ ہم سے اپنا [illegible] سودا کرو
آؤ اپنی مرادوں کو پورا کرو

احمد طاھر

# حادثہ

موسمِ گُل کی ایک صبح کو
ہنستی گاتی ہوئی دھوپ میں
وہ ملے راہ چلتے ہوئے
حادثہ تھا عجب روپ میں

مجھ کو دیکھا، رُکے، چل دیئے
گردشِ دہر تھم سی گئی
یک بیک فہم و ادراک پر
وقت کی دُھول جم سی گئی

دل تھا کمسن کھلنڈرا، سی گیا
نوشگفتہ ادا کے لئے
شہر در شہر رُسوا ہوئے
اک حسیں آشنا کے لئے

راجندر سنگھ بیدی

# صرف ایک سگریٹ

سنت رام کی آنکھ کھلی تو اس وقت چار بجے تھے، صبح کے
سونے سے پہلے وہ احتیاط کے ساتھ گھڑی سرہانے کے پاس رکھا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ اس کے نیچے سے
ملی جبھی..... جبھی رات بھر اسے صور ازل سنائی دیتا رہا تھا۔ سوتے میں گھڑی کیسے بھی سرہانے کے نیچے سرک جائے تو اس کی بے
بضاعت سی ٹک ٹک بھی اچھے خاصے گھڑیال کی آواز بن جاتی ہے اور شعور کی تہوں میں گھس کر اتنی دھنی معلوم ہونے لگتی ہے۔ آدمی
کو خواہ مخواہ اپنے عارف ہونے کا احساس ہوتا رہتا ہے۔

گھڑی کا ریڈیم بڈھا ہو جانے کی وجہ سے اپنی چمک کھو بیٹھا تھا لیکن وفاداری کے سلسلے میں اب بھی وقت کا اندازہ دیتا جاتا
تھا۔ اس وقت چار سے کچھ ہی منٹ اوپر تھے۔ سنت رام نے آنکھیں جھپکتے ہوئے پھر سے اندھیرے میں گھڑی دیکھنے کی کوشش کی۔ ایسا
کئی بار ہوتا ہے کہ گھڑی کی چابی کو آنکھوں کے سامنے برابر متوازی نہ رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے چھ بج گئے۔ آپ دانتن کلا کر کے نہا دھو لیتے
ہیں۔ پوجا پاٹ بھی کر ڈالتے ہیں تو حیران ہو کر دیکھتے ہیں —— چھ بجے ہیں!..... سنت رام کو بتی جلا کر اپنے اور ساتھ
والے بیڈ روم میں بچوں کی نیند میں خلل ڈالنے کی ضرورت ہی نہ پڑی کیوں کہ گھر کے سامنے کی پولیس چوکی میں گارد نے چار بجا
دیئے تھے۔ اس نے سوچا اتنے سویرے اٹھ کر کیا کروں گا؟ چنانچہ اس نے پھر سے سونے کی کوشش کی لیکن نیند اپنا پیٹ بھر
چکی تھی۔ اور بڑھاپے میں تو ایک بار جگ گئے سو جگ گئے، جیسے ایک بار سو گئے تو سو گئے۔ اس نے چادر اتار کر پائنتی کی طرف
پھینک دی اور یوں بستر سے نکل آیا جیسے تڑکے میں کھمب زمین سے باہر چلی آتی ہے۔

ساتھ کے بستر پہ دھرمن سو رہی تھی —— ایک بھلی سی دھرمن۔ سنت رام اپنی بیوی کو کہتا تھا۔ اس کا نام تو اچھا بھلا
دیپ تما لیکن سنت رام اسے اسی نام سے پکارتا تھا کیونکہ وہ لانڈری میں کپڑوں کی دھلائی کے خلاف تھی۔ گھر میں نوکر چاکر رہتا
کا دیا سب ہوتے سوتے وہ صابن سے کر بھاری بھاری چادریں تک گھر میں دھوتی تھی جب تھک جاتی تو سب سے لڑتی اور
لانڈری کے خرچ سے بہت مہنگی پڑتی۔ پھر رات کو سونے سے پہلے وہ ہمیشہ دبائے جانے کی فرمائش کرتی اس انداز سے کرتی کہ فرمائش اور حکم
میں کچھ فرق ہی نہ رہتا۔ دیکھئے اس مصیبت سے سنت رام تو کیا دھرمن کے بچے تک گھبراتے تھے۔ کوئی پانچ نہیں تو دس منٹ
دبوائے۔ لیکن یہ کیا کہ کئی گھنٹے بھر سے اور مرجھانے کا نام ہی نہ لے عجیب تماشہ ہوتا ... دبانے والے کو خود بے دم ہو کر لیٹ

جانا پڑتا تھا۔ ایک دن بڑی بیٹی لاڈو کے ساتھ یہی معاملہ تو ہوا۔ ماں کو دبانے کے بعد وہ ہانپتی کانپتی پلنگ کے ایک طرف جا گری اور بولی ——— اب تم مجھے دبا دو جی!

پھر اس دبنے دلوانے کے سلسلے میں ایک اور بڑی مصیبت تھی۔ دھوبن کو پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ اسے درد کہاں ہو رہا ہے جہاں ہاتھ رکھو درد ہمیشہ اس سے تھوڑا پرے ہوتا تھا اور یوں جگہ ڈھونڈواتے ڈھونڈواتے وہ سارا بدن دبوا لیتی تھی۔ کوئی کہے یہ اس کی چالاکی تھی۔ تو ایسی بات نہیں۔ اسے واقعی پتہ نہ چلتا تھا اور آخر یہ فیصلہ ہوتا کہ سارا بدن دکھ رہا ہے۔ اچھا دھوبن کو دبوانے ہی کا نہیں دبانے کا بھی شوق تھا ماشاءاللہ تو کرو اور وہ تیار۔ البتہ یہ کام اس سے کوئی کم ہی کرواتا تھا کیوں کہ اس کا ہاتھ کیا تھا، سنڑسی کی پکڑ تھی۔ جس سے اچھے بھلے آدمی کے نٹ بولٹ کستی۔ اور اس کی ڈھیری ٹائٹ کر دیتی تھی۔ اس کے بازوؤں کی گرفت نہ صرف مردانہ بلکہ پہلوانانہ تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آدمی کو نہیں دبا رہی، کوئی بیڈ کور نچوڑ رہی ہے۔ سنت رام تو اس کے دھوبی پاٹے سے بہت گھبراتا تھا۔ دھوبن ———...

ہاں، سنت رام نے اس کا یہ نام اس لئے بھی رکھا تھا کہ بچپن میں اس نے کلیڈواسکوپ میں بارہ من کی دھوبن دیکھی تھی۔ جو نیم برہنہ حالت میں پہلو پہ لیٹی، ہاتھ میں مور کے پروں والا پنکھا لئے ایک بھرپور عورت معلوم ہوتی تھی۔ کلیڈواسکوپ والا اپنے ڈبے پہ گھنگھرو بجاتا ہوا گلی پر آتا تھا اور آواز دیتا تھا ——— پیرس کی رات دیکھو، اپنی بارات دیکھو...... اور پھر ٹون بدل کر ——— دھوبن دیکھو بارہ من کی، گوری چٹی آما تن کی ——— آہا!...... اور سب بچے ماؤں سے ایک ایک پیسہ لاکر اس جادو کے بکس والے کے ہاتھ میں دے دیتے ہوئے اپنا چہرہ اور آنکھیں کلیڈواسکوپ میں ٹھونس دیتے تھے۔ اور نظاروں سے پورا پورا لطف اٹھاتے تھے۔ پیرس بارات سفید ریچھ، سرکس کے جوکر کے بعد جب دھوبن آتی تھی تو بچوں کو کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ سوچتے دھوبن کیوں اس بکس میں فٹ کر دی گئی ہے؟ مہینہ پہلے بھی وہ ایسے ہی لیٹی ہوئی تھی اور آج بھی لیٹی ہوئی ہے۔ ایک پہلو پہ لیٹے لیٹے کیا وہ تھک نہیں جاتی؟ دھوبن ایک تاسف سی طرح سے بچوں کو اچھی لگتی تھی وہ دماغ میں گھس جاتی تھی اور کہیں پندرہ بیس برس کے بعد باہر نکلتی۔

لیکن سنت رام کی وہ دھوبن جو شروع میں وزنی تھی اب من ڈیڑھ من کی رہ گئی تھی۔

ساتھ کے کمرے میں لاڈو۔ سنت رام کی ستدرو۔ اسکی لغت میں شادی شدہ لڑکی جو ایک روز پہلے اپنی سسرال سے آئی تھی۔ سو رہی تھی۔ کچھ ایسی بے خبری میں جیسے اس کا کوئی میاں ہی نہ ہو۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا کیونکہ رات کے پہلے پہر کمینے بابی، اس کے بچے نے اسے سونے ہی نہ دیا تھا۔ اور جب اسے نیند آئی تو سانس لینے کے لئے زیادہ ہوا کی ضرورت پڑی۔ لاڈو جیسے شادی کے چھ برس پہلے تھی ویسے ہی اب بھی تھی۔ بات کرنے میں منہ سے پانی کی پھوار سننے والے کے منہ پر پڑتی تھی۔ جیسے وہ بدھو تھی ویسے ہی من کی بھولی تھی سنت رام اور دھوبن کو یہی فکر تھی ——— یہ اتنی بھولی بیٹی ہماری بسے گی کیسے؟ اسے کوئی مشکل پسند میاں مل گیا تو مصیبت ہو گی۔ لیکن اسے میاں جو ملا تو اس نے کوئی شرط ہی نہ پیش کی۔ اور نہ اب پیش کرنے کا کوئی ارادہ رکھتا تھا۔ اور اس گھر میں ماں باپ کی نا چاقی تھی جبکہ لاڈو کی سسرال میں والدین کی کثرت محبت یا ایسے ہی دنیا کے مشترک ڈر نے دونوں میاں بیوی کو ایک مضبوط رشتے میں باندھ رکھا تھا۔ یہاں اور دونوں اتنے تھے کہ گھر میں چوہا کلکنے پر بھی چیختے چلاتے ہوئے ایک دوسرے کی پناہ ڈھونڈنے لگتے تھے۔ سنت رام انکے [illegible] رکھنے پر بہت خوش تھا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ بہت سے منفی جذبے زندگی کے لئے کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈر، کنجوسی، شرم وغیرہ لیکن یہ ڈر تو اولاد تک منتقل ہو رہا تھا۔ لاڈو کے ساتھ اس کا منا بابی سو رہا تھا ——— ماں کے گلے میں بانہہ ڈالے کہ جب ذرا نیند کھلتی تو اس کے کان ملنے لگتا جانے یہ کیا عادت تھی اسکی، جسے صرف اسکی ماں ہی برداشت کر سکتی تھی۔ سنت رام نے

جب بھی محبت کے جذبے سے مغلوب ہو کر دیتے تو ساتھ سلا یا کرتی تھی، ویسے ہی گھبرا کر اسے اٹھاتے ہوئے پھر اس کی ماں کے ساتھ ڈال دیا سوتے میں بانہہ گلے میں ڈالنے کی بات آتی نہ تھی۔ البتہ جب وہ اپنے ننھے ہاتھوں سے کان ملنے لگتا تو عجیب سی گدگدی ہوتی اور یکا یوں معلوم ہونے لگتا جیسے کوئی کنکھجورا کان میں گھس رہا ہے۔

چھوٹی عمر والے بچے لڑکا اور لڑکی اپنے ماموں کے ہاں گاؤں گئے ہوئے تھے۔ ان کے بستر خالی پڑے ہوتے بیکاری کے عالم میں پڑے چھت کو تکا کرتے۔ بڑا پال رہ گیا تھا جس کے خراٹے سنائی دے رہے تھے کیسے وہ دیکھتے دیکھتے بڑا ہو گیا تھا اور سنت رام کے تسلط سے نکل گیا تھا پہلے سنت رام اسے اس کی غلطی پر ڈانٹتا تھا، مختلف طریقوں سے احتجاج کرتا تھا۔ ماں سے لڑنے لگتا۔ چائے کے پیالی اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیتا۔ لیکن اب وہ باپ کی ڈانٹ کے بعد خاموش رہتا تھا جو بات سنت رام کو اور بھی کھل جاتی۔ سنت رام چاہتا تھا کہ وہ اس کی بات کا جواب دے اور جب وہ کبھی جواب دے دیتا تو سنت اور بھی آگ بگولا ہو اٹھتا۔ وہ چاہتا تھا بیٹا اس کی بات کا جواب دے اور نہیں بھی چاہتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آخر وہ چاہتا کیا تھا۔ سنت رام نے اپنے بیٹے پال کے سلسلے میں اپنی زندگی کا آخری چانٹا کوئی چھ برس پہلے مارا تھا۔ جب تک گھس چکا تھا اب تو وہ اس سے ڈرنے لگا تھا۔ آج بھی پال حسب معمول رات کے دو بجے آیا تھا۔ ڈپلومیٹ کے دو چار پیگ لگا کر وہسکی کی اصلی مہک تو گھر کے لوگوں نے نیند میں گزار دی تھی لیکن اب بھی اس کے الٹے سانسوں میں سے بو آ رہی تھی۔

پال چھبیس ستائیس برس کا ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ اندر ہی اندر کڑھتے اور گھولتے رہنے سے اس کے جسم پر بوٹی نہ آتی تھی۔ اس کے باوجود چہرے کی بناوٹ اور مونچھوں کی ہلکی سی تحریر کے ساتھ وہ مردانگی کے طور پر قابل قبول تھا۔ عورتیں اسے بہت پسند کرتی تھیں کیونکہ وہ بچوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ وہ شادی تو کیا ہر قسم کی ذمہ داری سے گھبراتا تھا۔ لیکن اس کے اب تک کنوارا رہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے ساتھ لو لگانے والی جتنی لڑکیاں تھیں سب شادی شدہ، ایک دو بچوں کی مائیں جن کے میاں اپنے بچوں سے پیار کرنے اور ان کے ساتھ کھیلنے کے بجائے خود ان کے سیکس سے کھیلتے تھے۔

کردار کے اعتبار سے پال ان تنگ بھرا تھا اور چاہ طلب۔ اس میں انا بے انتہا تھی۔ یہ انا جس کی وجہ سے اس کی ناک کے نتھنے پھیلتے جاتے تھے۔ اور وہ بڑے زور دار طریقے سے اپنے آپ کو پال آنند کے نام سے متعارف کراتا تھا جیسے وہ کوئی روایت ہو یہ روایت اس نے کہاں سے پائی تھی؟ اپنے باپ سنت رام ہی سے پائی تھی نا جو ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا مالک تھا اور جس نے اپنے بیٹے کو شہزادے کی طرح پالا تھا۔ اس کی ماں دھرمی سے چوری رقمیں دی تھیں۔ اور اس عمل میں اپنی بیوی سے اپنے تعلقات خراب کر لئے تھے۔ پھر اس نے پال کو عافیت کی چھت دی تھی ــــ ایک ایسے مکان کی چھت جس میں تین بیڈ روم تھے اور ایک شاندار ڈرائنگ روم جس میں استادوں کی پینٹنگ تھیں۔ ہر دن میں دو دو بار بدلنے کے لئے کپڑے۔ یہ سب اپنے باپ سے لے کر وہ کیوں اسے ہی بھول گیا تھا؟ صرف یہی نہیں اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اور یوں پاس سے گزر جاتا تھا جیسے وہ اس کا باپ نہیں کوئی کرسی ہو۔ اگر حکومت نے کوئی نیا قانون پاس کر دیا جس سے کمپنی فیل ہو گئی۔ تو اس میں سنت رام کا کیا قصور؟ زندگی میں نفع ہوتا ہے اور نقصان بھی۔ یہ کیا مطلب کہ نفع کے وقت تو سب شریک ہو جائیں اور نقصان کے وقت نہ صرف الگ ہو جائیں بلکہ گالیاں بھی دیں۔ لیکن اس میں پال کا زیادہ قصور نہ تھا۔ وہ آج کل کے زمانے کا لڑکا تھا۔ وہ صرف اسی شخص کی عزت کر سکتا تھا جو پاس پیسہ جیسا اس کے ڈھیر سارے پیسے بنانے بلڈنگیں کھڑی کرنے اور [illegible] کا امکان [illegible] ایک بار سنت رام کے

سپال نے یہ بات کہہ دی جس سے بوڑھے کو بہت ٹھیس لگی۔ اس کے اندر کیا کچھ ٹوٹ گیا۔ اس کا اسے خود بھی اندازہ نہ تھا۔ اس کا کتنا جی چاہا تھا کہ وہ کہیں چوری چکاری کر کے ڈاکہ ڈال کے یا بینک ہولڈ اپ کر کے لاکھ روپے بنائے اور اس بیٹے کے پاؤں میں پھینک کر اس کی اور اس کی ماں کی نظروں میں اپنی کھوئی توقیر پھر سے حاصل کر سکے۔ لیکن لاکھ روپیہ کمانے کیلئے نہیں شاطرانہ [illegible] ہے جس کی استعداد سنت رام میں نہ تھی۔ جب خسارہ ہوا تھا تو دھرمن یا لاڈو یا پال میں سے کسی نے اتنا بھی تو نہ کہا ــــــ ارے جی، یا پتا کوئی بات نہیں ایسا ہو جاتا ہے آپ جی میلا کیوں کرتے ہیں۔ جیسے کمایا ہے ایسے ہی پا بھی لیا جائے گا۔ جو پیسہ بنانے نکلتے ہیں کھو بھی دیتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ ہر نقصان اٹھانے والا بے وقوف ہوتا ہے۔ یہ تو ایسی بات ہوئی جیسے ہر پیسہ بنانے والا عقلمند ہوتا ہے۔ کیوں سب نے اسے بڈھا اور سٹھیایا ہوا سمجھ لیا اور بیسیوں بار اس کی طرف دیکھے بغیر پاس سے گزر گئے تھے۔ اور اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس دنیا میں اکیلا ہے۔ اس کا تو یہی مطلب ہوا نا کہ اگر پھر سے اس کی مالی حالت اچھی ہو جائے تو وہ ان گزری ہوئی سب باتوں کو دل میں رکھ کر ایک ہنٹر ہاتھ میں پکڑ لے اور کسی بھی مناسبت سے پہلے بیوی اور بچوں کو مار مار کر ادھ موا کر دے۔ نہیں یہ شوہر اور باپ کا کرتو نہیں لیکن یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ باپ کا کرتو یہ پیار دینا ہی ہے۔ لینا۔ نہیں۔ گویا اسے پیار کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ پیار کی ضرورت کیسے نہیں ہوتی؟ ایک سال کے بچے کو ہوتی ہے۔ تو سو سال کے بڈھے کو بھی اور تو اور اپنے کاکر سپینیل جمی کو بھی ہوتی ہے۔ جو اس وقت کہیں اپنے کمرے میں پڑا سو رہا ہے۔ اور بیچ بیچ میں کہیں سے کوئی آواز آنے پر چونک اٹھتا ہے۔ کیسے پیار کی نظریں اسکی نظروں سے ملتی ہیں تو ایک پیغام اس کے دماغ سے دم تک چلا جاتا ہے۔ جو کہ نہ صرف خود بے تحاشہ ہلتی ہے بلکہ سارے بدن کو ہلا ڈالتی ہے۔ جس دن اسے کوئی ایسی نظروں سے نہ دیکھے وہ کھانا چھوڑ دیتا ہے۔ گویا کہہ رہا ہے میں بھوکا رہ سکتا ہوں لیکن پیار کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور یہاں دھرمن، لاڈو، پال نے اسے جمی کے برابر بھی نہ سمجھا تھا۔

شاید سب اس لئے تھا کہ سنت رام نے زندگی میں صرف دینا ہی سیکھا تھا۔ اور اب یہ اسکی عادت ہو گئی تھی۔ وہ جب دیتا تھا تو جیتا تھا۔ لینے میں اسکی روحانی موت واقع ہو جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اسے کاروبار میں خسارہ کا اتنا غم نہیں جتنا اس بات کا ہے کہ اب وہ دے نہیں سکتا۔ اور جب گھر کے لوگ چپکے سے پاس سے گزر جاتے تھے تو وہ ان کی خاموشی کا عجیب الٹا سیدھا مطلب نکالتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ لینے والوں کو بھی عادت پڑ سکتی ہے ــــــ لینے کی۔ پھر دینا بذات خود ایک سامراجی عمل ہے جو لینے والوں، محکوموں کو تباہ و برباد کر ڈالتا ہے۔ اس سلسلے میں سنت رام بہت سفاک واقع ہوا تھا۔ اس نے کئی بار ادھار لے کر بھی بیوی بچوں کو تحفے دیئے جو انہوں نے لیکر رکھ لئے۔ اور بے شعوری کی کھڑکیوں میں سے باہر جھانکنے لگے۔ کسی نے شکریے کا لفظ بھی تو نہ کہا اور نہ تشکر کی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ سب نے کتنے کمینے اور بزدلانہ طریقے سے اپنی محبت روک لی تھی یا شاید سنت رام کو اپنے گھاٹے کا اس قدر احساس ہو گیا تھا کہ گھر کے لوگوں کی نگاہوں میں اسے اپنے لئے تحقیر کے سوا اور کچھ دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے لئے نفرت اور تحقیر ہی کو پسند کرنے لگا ہے۔ اور اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی حالت زار پہ چند آنسو نہ بہا لے۔ ۔ ۔ ۔

دھرمن کے چوبیس گھنٹے کی نیگنگ اور نصیحتوں کی سنت رام کو اتنی پرواہ نہ تھی۔ کیونکہ وہ ان پڑھ اور بے زبان ہونے کے ساتھ محنتی بہت تھی۔ اور اپنی صفائی پسند طبیعت سے بہت سی چیزوں کی تلافی کر دیتی تھی۔ لیکن ایک رات بڑے پیار کے لمحوں میں اس نے منہ پرے کر لیا۔ کیونکہ سنت رام کے منہ سے سگریٹ کی بو آتی تھی۔ لیکن وہ تو بچپن ہی سے سگریٹ پیتا تھا۔ اب

صدیوں کے بعد یہ بوکیسی؟ شاید وہ اسی خسارے کی بو تھی۔ یا شاید دھرتی بوڑھی ہو گئی تھی۔ اور ٹھنڈی اور خشک کیوں کہ یہ جوانی اور اس کی گرمی ہی تو ہے جس میں بو اُڑ جاتی ہے۔ اور روئے زمین کی سب خوشبو دل پہ چھا جاتی ہے۔ لیکن اگر دھرتی ٹھنڈی اور خشک اور بوڑھی ہو گئی تھی تو وہ خود بھی جوان نہ رہا تھا سنت رام! کیوں اسے اس عمر میں ہونٹوں کی طلب تھی؟ بوڑھے اور بے کیف ہونٹوں کی جن میں رس نام کو نہ تھا۔ ان پہ تو صرف جلی کٹی باتیں۔ اور کوسنے جن کے سوا اور کچھ آ ہی نہ سکتا تھا۔ دھرتی سیدھی سادی لونا وان عورت تو یہ بھی سہ جاتی تھی کہ جب ہونٹ چرا لئے جائیں تو مرد پہ کیا بیت جاتی ہے۔ سنت رام انہی کا تو میں رسا کر ان ہونٹوں پہ اپنے ہونٹ چار کرے تھے۔ جن پہ سوائے نجاست کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

یا شاید دھرتی کلیڈوسکوپ کی دھرتی پہ میوپاز چلا آیا تھا اور اس نے پہلو بدل لیا تھا۔ اور ریل اپنے سمجھ سے اٹھ کر مرد پنکھو کو ہاتھ سے پھینکتی ہوئی دیکھنے والوں کی طرف سے منہ موڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ نہ وہ جادو کے ڈبے والا رہا تھا اور نہ وہ معصوم دیکھنے والے یا خود سنت رام پہ وہ وقت چلا آیا تھا جب کہ جوانی ایک بار پھر عود کر آتی ہے۔ اور آدمی کئی بار بدنامی سے بال بال بچتا ہے۔ پہلے کی سی طاقت کے ساتھ شعور اور تجربات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ اور ایک خنکی اور سیدگی پا جانے سے انسان خود ہی اپنے آپ میں تعفن پیدا کر لیتا ہے۔ اور تھوڑے پانی والے پوکھر کی کیچ میں بھینس کی طرح لوٹنے لگتا ہے۔ یا غالباً اس کی وجہ بھی یہی گھاٹا تھی جو سنت رام نے اپنے کاروبار میں کھایا تھا۔ اور مالی طور پہ اپنے آپ کو غیر محفوظ پانے کا احساس محبت میں غیر محفوظ ہونے کے احساس میں بدل کر رہ گیا تھا۔

لاجو کی تو خیر کوئی بات ہی نہ تھی۔ وہ تو بیاہی برس گئی اور اپنے گھر جا بسی۔ وہ تو بابل کے آنگن کی چڑیا تھی۔ جو کہیں بھوے ہوئے دانوں کو چنتی ہوئی اڑ جاتی تھی لیکن پال تو یہیں تھا۔ اور اسے یہیں رہنا تھا ——— اسی گھر میں۔ اسی چھت کے تلے جہاں اسے ہو کو لانا تھا۔ اور اسے بسانا تھا۔ کہیں اور گھر لے لینے سے تو باپ کے گھر کی چھت نہیں بدلتی۔ وہ کیوں چند باتوں کو نہیں سمجھتا تھا یا سمجھنا ہی نہیں چاہتا؟ کیوں اس کے پاس اپنے بہن بھائیوں اپنے ماں باپ کے لئے چند منٹ بھی نہ تھے۔ امریکن فرم میں اگزکٹو ہو جانے سے کیا وہ خدا ہو گیا تھا۔ کیوں وہ اس فرم کے ذریعے سے پرائیویٹ کنٹریکٹ لینے اور یوں پیسہ پیدا کرنے میں کوئی عار نہ سمجھتا تھا۔ وہ کبھی تو باپ سے بات کرتا۔ نہ وہ اس سے پیسے تو نہ مانگتا تھا وہ تو فقط یہی چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا اس کے پاس بیٹھے وہ تین جسم اکٹھے ہوں جو ایک دوسرے سے نکلے ہیں۔ بدن صرف بدن کا لمس ہو۔ یہ نہ بھی ہو تو آنکھیں ملیں جو باپ ہی پہ نہیں آ یا دا جدا پہ گئی ہیں

پاس بیٹھ کر وہ آج کی نئی تعلیم کی باتیں کرے جس سے پرانے بہت پڑھے لکھے آدمی بھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ کچھ ان کی دنیا کا پتہ چلے کچھ اپنی دنیا انہیں دکھائی جا سکے۔ اس سے سیکھیں اور اسے بتا بھی سکیں کہ صرف تعلیم ہی بس نہیں تجربہ بھی ضروری ہے۔ اور چند حالات میں جینز بانڈ کے علم سے بہت اوپر ہوتا ہے۔ وہ کبھی کچھ تو مانگے۔ اور کچھ نہیں تو مشورہ ہی سہی۔ کیوں وہ ایکا ایکی اس قدر خود مختار اور بے نیاز ہو گیا تھا۔ یہ دلیل کافی نہیں کہ وہ بڑا ہو کر اب ماں باپ پہ کسی قسم کا بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ بوجھ ہی کی بات ہے تو وہ اب بھی بوجھ ہے کیسے وہ کپڑے اتار کر دھرتی کے سامنے پھینک جاتا ہے۔ اور پھر کی گھر میں کچھ پیسے دیتا ہے۔ اسی لئے ماں ماں ہی نہیں بنی بچے بچے دھرتی ہو گئی گھر میں بیہوں مہمان آتے جاتے ہیں۔ انہیں ایر پورٹ سے لینا یا [illegible] چھوڑنے جانا صرف ماں باپ ہی کا فرض ہے۔ یا [illegible] کو لینے ملنے چلا جائے۔ وہ اچھی بیٹی ہے۔ تو اس کی بھی بہو ہے۔ اگر پال یہ سب حرکتیں نا سمجھی کے عالم میں کرتا تو کوئی بات نہ تھی۔ لیکن وہ تو بلا کا ذہین تھا۔ اور ایک پل میں ہر معاملے کی تہ تک پہنچ جاتا تھا۔ پار سال جب ایک نہایت امیر باپ کی اکلوتی بیٹی سے اس کا رشتہ ہونے کی بات چلی تو کٹ سے اس نے انکار کر دیا اور بولا ———

دس سال مجھے آپ کے چکر سے نکلنے میں لگے ہیں۔ پپا! آپ چاہتے ہیں میں اور دس سال ایک امیر کی اکلوتی بیٹی کے چکر سے نکلنے میں گنوا دوں!'۔

کتنے پتے کی بات تھی۔ سنت رام تو اسے سن کر چکت ہو گیا تھا۔ اسے اس بات کا گورو بھی ہوا کہ وہ میرا بیٹا ہونے کے ناتے سے بہت خوددار بھی واقع ہوا ہے اور افسوس بھی۔ افسوس اس لئے کہ باپ کے چکر سے نکلنے کا مطلب کیا بیٹا باپ کے چکر سے نکل سکتا ہے یا باپ بیٹے کے چکر سے؟ کیا وہ ایک دوسرے سے کبھی الگ نہ ہو سکنے والا حصہ نہیں؟ کیا بظاہر کا فاصلہ ہونے پہ بھی وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں۔ آخر کون وہ اندھا ہے جسے وہ ڈور دکھائی نہیں دیتی جسے باپ بیٹے سے وقتی طور پہ یا ہمیشہ کے لئے جدا ہوتے ہوئے اپنے پیچھے چھوڑتا اور چھوڑتا ہی چلا جاتا ہے۔ بیٹا چاہے باپ کے جانے کے بعد بھی کہے کہ میرا باپ نالائق آدمی تھا۔ ہزاروں کا قرض مجھ پہ چھوڑ کر چلتا بنا۔ اس پہ بھی تعلق تو رہتا ہی ہے نا؟ نالائق باپ اور لائق بیٹے کا تعلق۔ میں تو مر ہی نہیں سکتا جب تک اپنی اولاد کے لئے کچھ چھوڑ کر نہ جاؤں ایسا ہوا تو ان کی ماں دھوبن تو مجھے وہاں خدا کے گھر تک نہ چھوڑے گی۔ اور میری روح کا تو پینگ تک ڈھونڈ لے گی۔ لیکن میرے ماں باپ نے کیا چھوڑا تھا؟ اس پہ بھی ان کی عزت میرے دل میں کبھی کم نہ ہوئی کیا پیسہ اور جائداد چھوڑنے ہی سے کوئی باپ کہلانے کا مستحق رہتا ہے؟ یہ بات نرا اعداد شماری سے غلط ہے۔ ایک باپ مقروض مرتا ہے جب کہ دوسرا جائداد بنا سکتا ہے نا؟ خیر میرا تو ابھی تعلق روڈ پہ ایک بنگلہ ہے۔ کیا ہوا گھوا لئے کے بعد اس پہ تھوڑا پیسہ لیا ہے کیا میں اتنا ہی گیا گزرا ہوں کہ مرنے سے پہلے اس کا رہن بھی نہ چھڑا سکوں؟ پھر گاؤں جنگ دلی میں زمین ہے دو سو بیگھہ جس میں سے کچھ پرکھوں کی ہے اور کچھ میں نے اپنے پیسے سے بنائی ہے کیا برا ہوا بھلا ہیں کہ آئی مصیبت آپڑنے پہ میں نے اس کا ایک انچ بھی نہیں بیچا۔ میں نے اس لئے نہیں بیچا کہ پرکھوں کی روح کو تکلیف نہ ہو اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میرے بیٹے مجھے کوسنے نہ دیں۔ پھر بیمہ ہے۔ بہت لٹ آئی تو خودکشی کر کے بیوی بچوں کو بیمہ دلوا سکتا ہوں جبھی سنت رام کو اپنا باپ یاد آیا اور اس کی موت کا وقت جس میں صدمے کی انتہا تھی۔ اور اس کے بیچ ایک عجیب سی پراسرار خوشی کی کہ اب جو بھی اچھا برا کریں گے، اپنا کریں گے۔ اور پال کے سلسلے میں اس بات نے سنت رام کو ایک عجیب طریقے سے مکت کر دیا آخر کون ہے جو اپنے دماغ کے کسی کونے میں اپنے باپ کی موت کی خواہش لئے نہ بیٹھا ہو۔

سنت رام کو ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا ساتھ کے کمرے میں آ کر اس نے زیرو پاور والا بلب جلایا اور اس کی مدھم سی روشنی میں لالہ اس کے بچے بابی اور سپریاں کا چہرہ دیکھا اور کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ اپنے بیٹے میں جی رہا تھا اور پھر اپنے پوتے پڑپوتے میں۔ ۔ ۔

جبھی سنت رام کو ایک سگریٹ کی طلب ہوئی۔

ارے یار! سگریٹ بھی کیا چیز ہے جس نے بھی اسے ایجاد کیا، حد کر دی کیا ایک ننھا سا رفیق زندگی کا جو آپ کے تنہا لمحوں میں کسی دوسرے کے موجود ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ اور اس کے دم سے آپ کبھی اکیلا نہیں محسوس کرتے۔ بلکہ وہ خود زندگی ہے جس کا ایک کنارہ خود زندگی ہی کی طرح دھیرے دھیرے سلگتا اور دوسرا موت کے منہ یا منہ کی موت میں پڑا ہوتا ہے وہ آپ کی ہر سانس کے ساتھ جیتا اور مرتا ہوا خود راکھ ہو جاتا ہے لیکن آپ کے بکھرے ہوئے خیالوں کو ایک نقطے پہ سمیٹ لاتا ہے۔ آپ چند ایسے راز بوجھ چکے ہوتے ہیں جن کے بعد اور کچھ بوجھنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی، لوگ کہتے ہیں اس سے کینسر

ہو جاتا ہے ـــــ ہوا کرے۔۔۔۔ جو لوگ سگریٹ نہیں پیتے وہ کونسی خضر کی حیات جیتے ہیں؟ دنیا کے ہر شخص کو آخر کوئی نہ کوئی بہانہ تو موت کو دینا ہے۔ سگریٹ کا بہانہ کیوں نہ ہو؟

رات جب سنت رام گھر لوٹا تو سگریٹ لانا بھول گیا تھا اور اس وقت ساڑھے چار بجے دکانیں بند تھیں اور سنت رام کی طلب کھلی جو کھلتی ہی جا رہی تھی۔ سامنے بیٹھے پال کے سگریٹوں کا پیکٹ پڑا تھا جس کے اوپر ماچس رکھی تھی۔ پال شہزادہ ہونے کے کارن اسٹیٹ ایکسپریس سے ادھر سگریٹ ہی نہ پیتا تھا۔ حالانکہ اس کے باپ سنت رام کو چار مینار سے لے کر کینچی اور گولڈ فلیک تک سب چلتے تھے۔ اسٹیٹ ایکسپریس پی لوں؟ کیا ضرورت ہے؟ کیا میں چھ ساڑھے چھ بجے تک انتظار نہیں کر سکتا جب کہ پان بیڑی کی دکانیں کھلنے لگتی ہیں؟ لیکن اگر انتظار کرنے دے تو پھر وہ سگریٹ نہیں، دودھ کا گلاس ہوا۔ سنت رام کا ہاتھ پیکٹ کی طرف لپک گیا۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں اس نے دیکھا۔ پیکٹ میں صرف دو ہی سگریٹ تھے۔ ایک تو باتھ روم کے لئے چاہئے تھی اور دوسرا کیا پتہ ایک سگریٹ سے اس کا کام نہ چلتا ہو اور دوسرے کی بھی ضرورت محسوس ہو۔ اس وقت نہیں تو ٹٹی کے بعد ہی یا ناشتے کے بعد اس علاقے میں اسٹیٹ ایکسپریس کہاں ملتے تھے۔ چرا لینے کے بعد دس بجے سے پہلے چوری چھپے رکھ دیئے جائیں، جب کہ پال اٹھتا تھا۔ رکھ بھی کیسے دیئے جائیں۔ کیوں کہ ان سگریٹوں کے لئے کناٹ پلیس جانا اور آنا پڑتا تھا جس کا مطلب تھا۔ آدھا گیلن پٹرول پھونک دیا جائے ـــــ ایک سگریٹ کے لئے! اس سے اچھا ہے کہ چھ ساڑھے چھ بجے تک انتظار کر لیا جائے۔

لیکن صاحب، سگریٹ جب بلاتا ہے تو اتنی زور کی آواز دیتا ہے کہ کانوں کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ وہ آواز پینے والوں کو سنائی نہیں دیتی۔ ان کے کان شریف نہیں ہوتے نا۔ کیوں نہ بھیکو اپنے نوکر سے سگریٹ لے لیا جائے؟ وہ تو بیڑی پیتا ہے۔ بیڑی ہی سہی لیکن بھیکو کو اس کی کمبھ کرن کی نیند سے جگانے کا مطلب تو یہ ہوا کہ پورا پہاڑ کھود ڈالو پھر اس سے ایک تنکے کی فرمائش کرو۔ کیوں کہ بھیکو ہمیشہ ہڑبڑا کر کیا ہوا کیا ہوا کہتا ہوا اٹھتا تھا جس سے گھر کے سب لوگ جاگ جاتے تھے اس کمینے کی نیند بدعنوانیوں کی وجہ سے کبھی نہ پکتی تھی۔ مارے ہاں باہر چوکیدار رکھا تو ہے سنت رام نے دروازہ کھول کر جھانکا اور بتیوں کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھا۔ چوکیدار کا کہیں تخم بھی نظر نہ آتا تھا۔ پونے پانچ بجے تھے۔ اور وہ اپنی سمجھ میں پانچ بجا کر اپنی ڈیوٹی پوری کرتے ہوئے کسی چیز کے ساتھ جا سویا تھا۔ بیکار ہی ہم لوگ اسے پیسے دیتے تھے۔ کون ساڈاکو پڑنے والا تھا جب کہ سامنے پولیس کی چوکی تھی۔ بھیکو چوکیدار یا چوکی کے کسی سنتری سے بیڑی مانگنے سے تو یہی اچھا ہے کہ اپنے بیٹے کا اسٹیٹ ایکسپریس پیا جائے لئے بلا تو لگے گا اگر جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔۔۔۔

چناں چہ سنت رام نے پیکٹ اٹھایا اور ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ ایک ہی کش سے سنت رام کا اضطرار آدھا رہ گیا تھا۔ دوسرے کش سے ایک چوتھائی اس حساب سے تو تیسرے چوتھے کش سے پوری تسلی ہو جانی چاہئے تھی لیکن سگریٹ کا کب حساب کتاب چلتا ہے۔ جیسے اضطرار کا اپنا لاجک ہے چوتھے کش کے بعد اضطرار کے کم ہونے کی رفتار گھٹ جاتی ہے۔ اور سگریٹ کے جلنے کی زیادہ۔ بہرحال بہت مزہ آیا۔ اسٹیٹ ایکسپریس اتنا سٹرانگ سگریٹ تو نہیں جتنا چار مینار، پھر اچھا ہے۔

پورا سگریٹ پی چکنے کے بعد سنت رام کو محسوس ہوا کہ اس نے برا کیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے ایک سگریٹ کے بغیر رہ سکتا تھا۔ نہیں جوانی میں آدمی اپنے حواس پر قابو رکھ سکتا ہے۔ بڑھاپے میں نہیں۔ آخر بیٹے کا سگریٹ پیا ہے نا، مجھے خوشی ہونی

صرف ایک سگریٹ ۔۔۔

## انکار

راجندر سنگھ بیدی

چاہئے اور اگر وہ میرا بیٹا ہے تو اسے بھی کیسا مزا آیا۔ چھوٹی چوری میں بہت مزا ہوتا ہے جبھی بابل کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ ماروں گا وہ خواب میں کسی سے لڑ رہا تھا۔ ملاؤ لے نے ادھ سوتے آدھے جاگے عالم میں اسے تھپکنا شروع کر دیا۔ سو جا بابل، سو جا بابل سو گیا اور وہ بھی سو گئی۔ پال کو کچھ پتہ نہ تھا۔ اس کے خراٹے تو جا چکے تھے۔ البتہ ناک میں کوئی چیز اڑے ہونے کے کارن سیٹی سی بج رہی تھی جبھی اندر سے دھوبن کی آواز آئی۔

"سگریٹ پی رہے ہو؟"

"ہاں" سنت رام نے دبی سے کہا۔

جس کے جواب میں وہ بولی ــــ "صبح صبح شروع ہو جاتے ہیں۔ دن تو چڑھنے دو۔ ۔ ۔ ۔ یوں کلیجہ جلانے سے بیمار ہو گئے کہ نہیں ہو گئے۔"

سنت رام نے دل ہی دل میں کہا ــــ میری بیماری کی جیسے بہت پروا ہے بڑے گھر کے لوگ جب پروا کرنی ہوتی ہے تو نہیں کرتے۔ اور جب نہیں کرنی ہوتی تو کرنے لگتے ہیں۔ اس نے اندر کے کمرے کی طرف منہ کر کے صرف اتنا کہا۔ "تم سو جاؤ ابھی سوا پانچ ہوئے ہیں۔"

دھوبن کی آواز اس انگڑائی میں سے چھن کر آئی۔ "نہیں مجھے ہیٹر لگانا ہے ــ پانی گرم کرنا ہے۔ بہت کپڑوں کا ڈھیر ہے۔ ۔ ۔"

جبھی دھوبن کے اٹھنے کی آواز آئی۔ ہاں صاحب جب عورتیں اٹھتی ہیں تو وہ اس بات کا رکھ رکھاؤ نہیں کرتیں کہ کھٹ پٹ سے کوئی ڈسٹرب ہو گا۔ وہ بستر کی چادر کو ۔ ۔ ۔ ۔ جھاڑ رہی تھی جیسے اس پہ کہیں ریت آ پڑی ہو اور پھر الماری کی کنیں سنائی دی اور اس میں سے دودھ کے لئے پیسے نکلے پھر سینڈل کی کھٹ کھٹ جو برسوں پہلے اچھی لگتی اور دماغ میں فتور پیدا کرتی تھی۔ اب یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہتھوڑے پڑ رہے ہیں۔

چادر جھاڑتے ہوتے دھوبن کی آواز آئی ــــ "اوف، اوف۔ ۔ ۔ دماغ جل گیا ہے، سگریٹ کی بو سے۔"

"اچھا اچھا" سنت رام نے کہا، "تمہیں بو آتی رہتی ہے۔"

دھوبن کو واقعی بہت بو آتی تھی۔ جو غالباً عمر کا تقاضہ تھا۔ چوتھے کمرے میں کوئی سگریٹ پئے اسے وہیں سے پتہ چل جاتا تھا۔ ایسے ہی وسکی شراب کا، چاہے کسی نے صرف چکھا ہی ہو اسے۔ اس کی کنجوسی، اس کے اخلاقی طور پر اس کا اچھا ہونے نے گھر کے سب لوگوں کو چور بنا دیا تھا۔ سب بے حال ہو کر علتیں کرتے اور پھر انھیں چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن دھوبن سے کوئی چھپا نہ سکتا تھا کئی بار ایسا ہی ہوا کہ آپ نے باہر نکل کر بالکنی پہ جا کر سگریٹ سلگایا لیکن جب مڑ کر دیکھا تو دھوبن موجود ہے جس سے سگریٹ کا مزا ہی جاتا رہا۔ اس کی اس روک ٹوک نے پال ایسی بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اب وہ کھلے بندوں سگریٹ پیتا تھا۔ بلکہ اس نے اسکاچ کی ایک بوتل گھر ہی میں لا رکھی تھی۔ باہر سے آنے پر جب اسے محسوس ہوتا شراب کم پڑی ہے تو ایک ایک ادھ پیگ گھر ہی میں لگا لیتا۔ ماں سے اس کی کئی بار لڑائی ہوئی تھی۔ دھوبن آخر اس سے ہار گئی تھی اس نے کہا بھی تو اتنا ــــ "مر گیا ہے؟ جو کرے گی، اپنی قسمت کو روتے گی۔"

سگریٹ ۔ ۔ ۔ دراصل مرد اور عورت کی بو کو ایک ہونا چاہئے ۔ ورنہ سب تباہ ہو جاتا ہے۔ اس تباہی کے کارن سنت لا

نے اپنی ٹانیسپٹ ڈولی کو پہلے سگریٹ پلا لیا تھا۔

پال اٹھے گا تو کہے گا؟۔ یوں ایک سگریٹ پی لینے میں تو کوئی بات نہیں۔ لیکن کسی عمل کسی ذائقے کا تکمیل نہ ہو... ہوتا ہے یا ایسے ہی ہے۔ جیسے دو محبت کرنے والوں میں کوئی تیسرا آجائے۔ پھر پال کی باتوں میں کس قدر کھنچنے سے۔ ایک بار اس کا جوتا پہن لیا تو وہ کتنا جھنجھلایا ہوا تھا۔ اس نے جوتے کو یکسر پھینک ہی دیا۔ اور کہنے لگا میرے اور پاپا کے پیر ایک ہیں کیا؟ اب یہ کھل گیا ہے اور میرے کام کا نہیں۔ سنت رام کو بہت دکھ ہوا۔ ایک بار بیٹے کا جوتا پہن لیا تو کیا ہو گیا؟ بیسیوں بار اس نے میرا چپل پہنا ہے میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ الٹا مجھے خوشی ہوتی اس احساس کے ساتھ میرے بیٹے نے میرا جوتا پہنا ہے۔ اور ریڈیوں کا یہ کہن بھی دماغ میں آیا کہ جب باپ کا جوتا بیٹے کو برابر آجائے تو پھر اسے کچھ نہیں کہتے چناں چہ جب سے میں نے سب کہنا سننا چھوڑ دیا۔ نہیں ایک بار اس نے کسی اسمگلر سے امریکی جرکن خریدی تھی جو مجھے بہت اچھی لگی۔ پال کو بھی اچھی لگتی تھی جبھی تو اس نے خریدی لیکن میں ہمیشہ کی طرح اپنے بڑھاپے کے کارن اپنے پہننے کے جذبے کو روک نہ سکا۔ چناں چہ میں نے پہن لی اس کے رنگ بڑے شوخ و شنگ تھے۔ اور مجھے اسے پہننے میں بہت مزا آیا۔ لیکن پہلے تو دھرن نے میرے منہ کو کرکرا کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنس دی۔

"کیا ہوا؟"۔ میں نے پوچھا۔

وہ اندر ہی اندر اپنی ہنسی دبائے ہوئے بولی۔ "کچھ نہیں..." اور پھر رہ بھی نہ سکی۔ اور کہنے لگی۔ "کیسے گھوم رہے ہو جیسے دیسی مرغا مرغی کے گرد گھومتا ہے۔"

یہ جذبات کا دھوبی پٹڑہ تھا۔ خیر،

لیکن رہی سہی کسر پال نے پوری کر دی۔ میں نے اپنا شوق پورا کرنے کے بعد اس جرکن کو بڑی احتیاط سے وارڈ روب میں ٹانگ دیا۔ لیکن صبح ہی تو پال جرکن کو میرے پاس لے آیا اور بولا ——— "پاپا! آپ ہی اسے پہن لیجیے۔"

میں نے مجرمانہ انداز سے کہا۔ "کیوں ——— تم کیوں نہیں پہنتے ہو؟"

"یہ میرے کام کا نہیں رہا۔" وہ بولا۔ "دیکھیے تو، آپ کا پیٹ بڑا ہے۔ آپ کے پہننے سے الاسٹک چلا گیا ہے، اس کا۔"

مجھے بے حد غصہ آیا اور میں اس پہ برس پڑا۔ میں نے کہا، میں تمہارا باپ ہوں جرکن پہن لی اور تمہارا نقصان کر دیا؟ تم نے سیکڑوں نہیں ہزار بار مرتبہ میرا نقصان کیا ہے میں نے کبھی تمہیں کچھ کہا ہے؟ الٹا میں نے ہمیشہ خوشی کا اظہار کیا۔ چلو یوں کہہ لو باہر سے ناراضی کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن اندر سے میں کتنا خوش تھا؟ تم سیکڑوں بار میری قمیص، میرا جوتا پہن گئے ہو۔ میں نے یہی کہا——— میرا بیٹا ہے۔ میرے کپڑے پہنتا ہے۔ اور تم نے اسی طرح اس دن تین گھوڑے والی بوسکی قمیص میرے منہ پر دے ماری تم نہایت کمینے، نہایت بے شرم ہو۔

بجائے اس کے کہ پال کو افسوس ہو۔ وہ میرے ساتھ دلیل بازی پر اتر آیا۔ "آپ بال کھاتے ہیں۔" وہ کہنے لگا۔ "اور اس کا کوئی نہ کوئی چھینٹا اس پہ پڑ جاتا ہے۔ کیا وہ قمیص پھر میرے پہننے کے لائق رہ سکتی ہے؟"

ان دنوں بھی لاڈو بیاہی اپنے مائیکے آئی ہوئی تھی۔ اس جھگڑے میں وہ بھی پاس آ کھڑی ہوئی اور بول اٹھی "پپا بالکل میری طرح ہیں ۔۔۔۔"

ان دنوں چھوٹے دونوں بچے جو اس وقت اپنے ماموں کے ہاں گڑگاؤں گئے ہوئے تھے، یہیں تھے۔ بھتیجی بیبیکو کی مدد سے بستر کی سلوٹیں نکالتی ہوئی بولی ۔۔۔ "ہاں! بات کرتے ہیں تو لاڈو دیدی کی طرح منہ کی ساری پھوار سامنے والے پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ تماشہ اس وقت ہوتا ہے جب کہیں پپا اور لاڈو آپس میں پلٹ کر رہے ہوں، تو ۔"

لاڈو ہنس رہی تھی دوسرے سب ہنس رہے تھے نہ چاہنے کے باوجود میرے چہرے پہ بھی مسکراہٹ چلی آئی تھی۔ بات سنجیدہ رہی تھی۔ اور نہ مضحکہ خیز۔ میں نے ٹالتے ہوئے کہا "بھئی تو آتنا ۔۔۔ ہاں آخر لاڈو کا باپ ہوں نا، اس پہ گیا ہوں۔"

اور لڑکا دوسرا، چھوٹا دوسرا بھی ہنس رہا تھا۔ بجلیوں کی طرح پھیپھڑے پیدائشی طور پر کمزور ہونے کے کارن وہ کبھی کھل کے نہ ہنسا ۔۔۔" ہی ہی، پان کھاتے ہیں نا پپا"۔ اس نے کہا، "تو قمیض پہ سامنے تو لگتا ہی ہے، لیکن پیٹھ پہ نہ جانے کیسے جا لگتا ہے؟" یہ سب سمجھتے تھے میں پان منہ سے تو کھاتا ہی نہیں قمیض سے کھاتا ہوں اس پہ طرفہ دھوبن منظرِ چلی آئی میرا خیال تھا ماں ہونے کے ناتے وہ باپ کا پکش لے گی۔ لیکن صاحب، اس نے الٹا بیٹے بیٹیوں کی تائید شروع کر دی: "کیا پوچھتے ہو ان کا؟" وہ بولی "بالکل باپ پہ ہیں دوسرے کھانا کھائیں گے تو سالن کرتے پہ گرا ہو گا۔ لکھنے بیٹھیں گے تو سیاہی۔ میں انکار کروں کیا ۔ پتہ تو مجھے چلتا ہے نا۔ دھوتے دھوتے جن کے ہاتھ رہ جاتے ہیں پر میری قسمت عمر گزر گئی میری ان کے داغ نکالتے نکالتے ۔۔۔۔"

صرف ایک بابی رہ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بانس تھا جس سے وہ "بڈھا بابا" کو بھگا رہا تھا۔ "تماشہ کرتا۔" وہ ڈھلا میں ہی ایک دشمن کو خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا بڈھا بابا اس کا خیالی دشمن میں ہوں۔ پھر جمی کے بھونکنے کی آواز آئی، جسے آپ اتفاقیہ بات کہہ لیجئے، بیبیکو بجلی کا بل چکانے چلا گیا تھا۔ ورنہ وہ اپنی منگنی بولی میں کہتا ۔۔۔ "ہم میاں بی بی کا جھگڑا ہے تم بیچ میں نہ بولو۔" اور یہ بات اور بھی میرے خلاف ہو جاتی۔ گھر بھر میرا دشمن ہو گیا تھا۔ ایسا پہلے تو نہ تھا۔ چند برس پہلے جب سے مجھے کاروبار میں گھاٹا پڑا ہے۔ دنیا ہی بدل گئی ہے۔ کسی کو میری بات ہی پسند نہیں۔ یا شاید میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اس لئے سب کو برا لگتا ہوں مجھے ان کے سامنے سے ٹل جانا چاہئے۔ اس دنیا سے ٹل جانا چاہئے۔ لیکن میں جاؤں تو کہاں جاؤں؟ میں نے اس گھر، ان لوگوں پہ اپنی جان بھی وار دی۔ نہ کسی کلب کا ممبر ہوا نہ ریس کورس پہ گیا۔ پیتا، کوئی پکچر بھی ڈھب سے نہ دیکھی۔ کام، کام اور کام تفریح کے لئے ایک لمحہ نہیں۔ اسی لئے میں ذہنی طور پہ بیمار ہو گیا ہوں۔ شاید پاگل، پاگل نہیں تو سنکی ضرور ہوں کبھی پاگل یا سنکی کو پتہ چلا ہے کہ وہ کیا ہے ہاں اسے تو صرف دوسرے جانتے ہیں کبھی کبھی اپنی شکلوں سے اپنی شکل کا پتہ چلتا ہے نہیں یہ بات نہیں خدا کسی کو خسارہ نہ دے۔ جوانی میں جو ہونا ہے ہو جاتا ہے لیکن اس ڈھلتی عمر میں نہیں جب کہ مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ بچوں کا فادر امیج گر جاتا ہے۔ اور بیوی کا بھی۔

---

پال آٹھ بجے اٹھ گیا تھا۔ اسے اٹھتے دیکھ کر سنت رام سنسنا گیا۔ ڈرنے کی ایک نشانی یہ ہے کہ آدمی سامنے یا دل میں کہنے لگے میں کسی سے ڈرتا ہوں۔ سنت رام پہ ابھی طرح واضح ہو چکا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے سامنے ڈرتا ہے وہ نہیں چاہتا تھا معاملے کو اس طرح پہ لے آئے جب سے بیٹا یہ کہے کہ میں اس گھر میں نہیں رہوں گا پال تو چاہتا تھا ایسا موقع پیدا ہو۔۔۔ کوئی سنے تو ہنسے بیٹے کا ایک صرف ایک سگریٹ پی لینے سے اتنا ڈر اور اتنی ذہنی بک بک؟

جاتے سے پہلے پال نے باپ کی طرف دیکھا۔ اور معمول کی نمسکار کی جس کے جواب میں سنت رام نے سر ہلا دیا۔ اور اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ وہ چاہتا تھا کہ پال ۔۔۔۔۔ دوسری طرف دیکھے۔ تو وہ اسکی طرف تکے لیکن پال نے برابر اپنا منہ باپ کی طرف کر رکھا تھا۔ جس سے گھبرا کر سنت رام نے اپنا چہرہ "ہندوستان ٹائمز" کے پیچھے چھپا لیا پھر اسے تھوڑا ہٹا کر دیکھا تو پال سڑک سڑک چائے پی رہا تھا جس کے بعد اس نے گھونٹ سے پیالی پیچ میں رکھی۔ پھر وہ سگریٹ کا پیکٹ تھامے باتھ روم کی طرف نکل گیا۔

اب تک تو سب ٹھیک تھا پال نے پیکٹ کھول کر نہیں دیکھا تھا نا۔ جب وہ باتھ روم جائے گا۔ تب اسے پتہ چلے گا اور سنت رام بیٹے کے باہر آنے اور اس کا چہرہ دیکھنے کے لئے یونہی ادھر ادھر ہوتا رہا۔ دھوبن نے کہا۔ نہاؤ گے نہیں؟ تو جواب میں جھلاتے ہوئے سنت رام نے جواب دیا۔۔۔ تمہیں نہانے کی پڑی ہے۔ ایک ہی بار نہاؤں گا۔

دھوبن حیرانی سے سنت رام کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس کی ہنکار کو معمول کی لایعنی سمجھ کر ناشتے کے دھندے میں مشغول ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں پال باتھ روم سے آیا تو اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ ماتھا کچھ اور پیچھے ہٹ گیا تھا وہ واش بیسن میں جلدی جلدی اپنے ہاتھ صابن سے دھو رہا تھا۔ اتنی جلدی کیا تھی؟ کیوں وہ جلدی بھاگ جانا چاہتا تھا۔ سامنے اس نے آئینے میں اپنے چہرے کی طرف دیکھا۔ منہ سے جھاگ لپٹ رہے تھے نہیں ہاتھ دھوتے دھوتے جھاگ اڑ کر چہرے پہ چلے آئے تھے چوں کہ ہاتھ ابھی صابن سے لتھے تھے اس لیے اس نے کرتے کے بازو سے جھاگ کو پونچھ دیا۔ اور پھر اپنا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس کے نتھنے پھول رہے تھے۔ دوسروں کو دیکھ کر نتھنے پھلانا تو سمجھ میں آتا تھا۔ لیکن اپنے آپ کو دیکھ کر نہیں بلکہ دھوتے ہوئے پال لوٹا تو دھوبن نے آواز دی ۔۔۔ "رات تم پھر پی کر آئے تھے۔"

پال نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اتنا کہا "ہاں آج پھر پینے والا ہوں۔"

دھوبن تن گئی وہ ایسی دبنے والی تھوڑی تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا ۔۔۔ آج پی کر آئے تو میں دروازے میں قدم نہ رکھنے دوں گی جس کے جواب میں پال نے کہا ۔۔۔ "نا کون چاہتا ہے اس جیل خانے میں؟ میں نے پہلے گریف لنکس میں ایک کمرہ دیکھا ہے" پھر دھوبن کی پائیدار آواز آئی۔ "نکل جاؤ۔ ابھی نکل جاؤ" جس سے سنت رام کی جان نکل گئی۔

"دیبی" سنت رام نے کڑک کر کہا: "کیا بکتی ہو یہ گھر تمہارا ہے؟"

اسی بنجم میں دھوبن نے جواب دیا: "ہاں میرا ہے۔ جانا ہے تو جائے تم بھی جانا چاہتے ہو تو جاؤ بھلا ہو تم باپ بیٹوں کا جنہوں نے جینا سکھا دیا" اور پھر رونے لگی۔۔۔

سنت رام اسی بات سے تو ڈرتا آیا تھا کہ ایسا موقع نہ آئے بیٹے کی بدعنوانیوں کو دیکھ دیکھ کر وہ اندر سے کڑھتا

رہتا تھا لیکن باہر سے کچھ نہ کہتا تھا۔ یہ کہنا تو بہت آسان ہوتا ہے چلے جاؤ مگر پھر واپس آ جاؤ کہنا مشکل ہے۔ پال کے باقی کام کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ وہ جلدی جلدی شیو بنا رہا تھا اور اپنی تھوڑی پر بے شمار قطرے لگا رہا تھا اور خون پونچھ رہا تھا۔ اس نے ماں کو ایسا جواب کیوں دیا؟ وہ ماں کو الٹی سیدھی کہتا تھا تو سنت رام کو تکلیف ہوتی تھی۔ اور ماں اُسے کچھ کہتی تو اذیت۔ لیکن ماں بیٹے کا رشتہ زیادہ قدرتی تھا جس سے وہ ایک دوسرے کو سن سنا کر پھر ایک ہو جاتے تھے۔ مگر آج پال کا اندازہ یہی تھا کہ وہ جائے گا تو پھر نہیں آئے گا۔ . . .

"آنا کون چاہتا ہے اس جیل خانے میں؟ ——" اس کا کیا مطلب، پال کچھ کہہ نہیں رہا تھا۔ لیکن اندر سے محسوس کر رہا تھا کہ اس گھر میں آنے کا کیا فائدہ جہاں کوئی چیز اپنی نہ رہ سکے۔ جوتا نہ جرکن اور نہ سگریٹ پھر پال جلدی جلدی نہایا اور کپڑے پہنتے ہوئے باپ کے پاس سے گزر گیا۔ سنت رام نے اسے بلانے کی کوشش کی لیکن اس نے ان سنی کر دی۔ اخبار بھی اٹھا کر نہ دیکھا اس نے اور اسٹیٹ ایکسپریس کا سگریٹ بلندی نفرت سے کھڑکی کے باہر پھینکتا ہوا وہ نکلنے لگا۔ دھوبن تو اس سے لڑ بیٹھی تھی۔ اس لیے اس لیے بیٹے کو ناشتے کے لئے بھی نہ پوچھا۔ سنت رام نے اسے روکنے کی کوشش کی اور آواز دی —————— بیٹا ناشتہ تو کر لو۔"

"نہیں" پال نے مصمم جواب دیا۔ اور باہر نکل گیا۔ جس انداز سے اس نے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا تھا اس سے روح تک میں تشنج پیدا ہو گیا۔

پال کے جاتے ہی دھوبن اور سنت رام میں ٹھن گئی وہ تو اُسے صرف اس نصیحت کے سلسلے میں طعن کر رہا تھا لیکن دھوبن ایک طرف روئے جا رہی تھی اور دوسری طرف کوسنے دے رہی تھی اسی سلسلے میں وہ نئے پرانے سب دفتر کھول بیٹھی اس کی باتوں سے تو ایسا پتہ چلتا تھا کہ اس گھر میں آکر اس نے کبھی کوئی سکھ ہی نہیں دیکھا۔ وہ بہت پھوٹی قسمت والی تھی۔ حالانکہ سنت رام سمجھتا تھا کہ اس دنیا کا کوئی سکھ نہیں جو اس نے بیوی کو نہ دیا ہو۔ اور اگر دکھ ہی دیکھا ہے تو ساتھ اس نے بھی تو دیکھا ہے۔ لیکن بیوی نہ صرف اپنے بلکہ پوری اولاد کو تباہ و برباد کرنے کا ذمہ دار سنت رام کو ٹھہرا رہی تھی وہ کہہ رہی تھی پہلے یتیم بھائی بہنوں کے سلسلے میں مجھے ڈانٹتے لڑتے جھگڑتے رہے میرے ساتھ پھر دوست مجھ پہ لاد دیئے۔ ایک ہاتھ سے بچہ کھلا رہی ہوں اور دوسرے سے روٹی پکا رہی ہوں۔ ان ٹکڑوں کے لئے اب تمہاری اولاد کے حوالے کر دیا۔ اتنی چھوٹ دے دی پیسے کپڑے کی جس سے وہ نالائق نکل آئے سب کے سب اور اب بیٹے کی یہ ہمت کہ وہ تمہارے ہوتے سوتے مجھے آنکھیں دکھائے۔

سنت رام حملے کے بجائے مدافعت پر اتر آیا۔ واقعی وہ کیا تھا جو بیوی کو بچوں سے نہ بچا سکتا تھا اور نہ بچوں کو بیوی سے جب تک لاؤ بھی جگ گئی اور آنکھیں پونچھتے ہوئے منظر کو دیکھنے لگی کاش وہ تھوڑی دیر پہلے اٹھ جاتی۔ اور اپنے بھائی کو جانے سے روک لیتی۔ وہ میرا بیٹا ہے تو اس کا بھی بھائی ہے لیکن ماں کو روتے دیکھ کر وہ اس کی طرف ہو گئی بظاہر اس نے ماں ہی کو چپ کرنے کے لئے کہا اور سنت رام کی طرف دیکھا صرف لیکن اس کے دیکھنے ہی میں کیا کچھ تھا جس سے سنت رام کے اور بھی اوسان خطا ہو گئے۔ اور اس کے بعد وہ بچے کو سنبھالنے لگی اور گھر میں اپنے میاں کو ٹیلیفون کرنے تاکہ وہ آئے اور اسے لے جائے اس کے بعد ایک خاموشی سی چھا گئی جس میں دھوبن کے سسکنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی

یہ خاموشی... لاڈو اور دوسرے بچوں نے بھی تو یہ سمجھ لیا تھا کہ رونکا معاملہ ہے کون اس پہ سر دھنے؟ یہ کیا میرا ہی معاملہ تھا۔ سنت رام نے سوچا گھر کے کسی اور بستر کا نہیں۔ یہاں تو پہلے ہی سے بھرا بیٹھا تھا ماں کے بات کرنے سے پہلے دھوبن کی بات تو صرف ایک بہانہ ہو گئی وہ نہ چاہتا تھا یہاں کوئی سا بھی بہانہ دے لیکن اس نے نہیں تو اس کی ماں نے اسے دے دیا کیونکہ وہ جل بھن گیا تھا۔ پیکٹ میں صرف ایک ہی سگریٹ پا کر.....

سنت رام دفتر میں داخل ہوا تو اس نے کسی کے علیک سلیک کا جواب نہ دیا۔ لیکن ان لوگوں کو کیا پرواتھی ؟ آج صاحب کا موڈ اچھا نہیں کسی نے کہا پھر دوسری طرف سے آواز آئی۔ اچھا کب ہوتا ہے۔

کیبن میں داخل ہوتے ہی چپراسی چندو سے سنت رام نے سگریٹ کا پیکٹ منگوایا۔ چندو ہمیشہ پہلے ہی سگریٹ خرید کر رکھتا تھا وہ اپنی جیب سے دام خرچ کر دیتا اور جب مالک سے مل جاتے تو جیب میں ڈال لیتا۔ سنت رام نے اپنا کوٹ ٹانگا پیکٹ پر سے کاغذ پھاڑا۔ سگریٹ نکالا سلگایا اور کام کرنے بیٹھ گیا۔ لیکن آج سنت رام کا جی کام میں نہ تھا۔ ایک شدید ڈر نے اس کے جسم و ذہن کو ماؤف کر دیا تھا۔ اس نے گھومنے والی کرسی پہ پیچھے ہٹتے ہوئے اپنی ٹانگیں میز پر رکھیں۔ اور سگریٹ کے دو چار لمبے لمبے کش لگاتے ہوئے سوچنے لگا۔ میں نے کیسے تباہ کر دیا ہے گھر کے لوگوں کو؟ بیوی اور بچوں کو؟ میں معمر ہونے کے باوجود پڑھتے رہنے کی وجہ سے آج کل کے زمانے کا ہوں میں نے شوہر اور باپ بننے کے بجائے ان سے دوستی رکھنے کی کوشش کی شاید یہی قصور تو نہیں میرا؟ میں نے بیٹی سے ایسی باتیں کیں جو پرانے خیال کے باپ نہیں کرتے۔ جب وہ کالج جا رہی تھی تو میں نے کہا تھا ——— وہاں مخلوط تعلیم ہے لاڈو وہاں لڑکیاں ہوں گی اور لڑکے بھی اور لڑکے قریب ہونے کی کوشش کریں گے۔ آج کل ہماری معاشرت میں ایک نئی چیز آ گئی ہے جسے گڈ ٹائم کہتے ہیں۔ گڈ ٹائم۔ گڈ ٹائم ہے۔ لیکن مرد اور عورت میں جو بنیادی فرق ہے اسے تم مت بھولنا مرد پہ کوئی ذمہ داری نہیں بشرطیکہ وہ اپنے اخلاق اپنی تہذیب سے اسے قبول نہ کرے لیکن عورت پہ بہت ہے کیوں کہ بچہ اسے اٹھانا پڑتا ہے۔ اسی لئے دنیا بھر میں عورتیں نہ صرف قدامت پرست ہیں بلکہ ان سے تقاضا کیا جاتا ہے، قدامت پرستی کا اور یہ ٹھیک ہے۔ انہیں کبھی اپنے آپ کو ایسے مرد کے حوالے نہیں کرنا چاہئے جو اس کی اور اس کے بچوں کی ذمہ داری قبول نہ کرے۔

دھوئیں کے مرغولے میں سنت رام کو اس وقت بیٹی کا چہرہ یاد آیا۔ وہ ٹکر ٹکر باپ کی طرف دیکھ رہی تھی کچھ سمجھ رہی تھی اور کچھ نہیں بھی۔ شاید وہ سوچتی تھی ——— پتا یہ آج کیا لے بیٹھے ہیں؟ اس بات کو آج کل کے زمانے کی ہر عورت، ہر لڑکی سمجھتی ہے پتا کتنے پرانے خیالات کے ہیں؟ اگر میں پرانے خیالات کا ہوں تو روز یہ قصے کیا سنتا ہوں؟ یہ تو ایک ایسی بات ہے جو بدھ کے زمانے میں بھی کہی جانی چاہئے تھی۔ اور آج کے زمانے میں بھی۔ کیا انسان عشق اور غلطی ہی سے سیکھتا ہے؟ لیکن اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلا جہاں اس محلے کے دوسرے گھروں نے بدنامیاں کیں وہاں میرے بچوں نے نہیں کم از کم لڑکیوں نے نہیں۔ یہ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ جو میں نے انہیں دی۔ تو پھر یہ تباہی کیسے ———

ہاں بچیس برس کا ہو گیا تھا جب میں نے براہ راست اس سے پوچھا کہ اسے عورت کے سلسلے میں کوئی تجربہ ہوا ہے؟ چونکہ وہ بیٹا ہونے کے علاوہ میرا دوست تھا اس نے سب کچھ کہہ دیا، بتا دیا۔ اب مجھے اس بات کی فکر پڑ گئی کہ وہ تجربہ کامیاب ہوا یا نہیں کیوں کہ جنسی فعل ایک بہت بڑی ذمے داری کی چیز ہے اس میں کوئی سی بھی غلطی پوری زندگی پر چھا سکتی ہے۔ اسی لیے تو ڈر

عورت کے بیچ محبت اور شادی کی چار دیواری کا تحفظ لازمی ہے۔ لیکن پال بھی میری طرف پٹر پٹر دیکھ رہا تھا۔ اور شاید جی ہی جی میں ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔۔۔ ہونہہ ذمہ داری!۔۔۔۔۔ پتا! بیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں۔ لیکن وہ سمجھتا تھا کہ بہت سی باتیں وہ نہ جانتا تھا اور میں نے اس کے دماغ میں جالے اور چھپوندیا اتاریں۔ اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ دنیا اور اس کے حادثات کا مقابلہ کر سکے۔ اور آج اس بیٹے نے اس کا ایک سگریٹ پی جانے سے منہ موڑ لیا مجھ سے!

نہیں، ہو سکتا ہے معمول کی طرح وہ کسی اپنے ہی دھن میں ہو۔ اور جلدی گھر سے باہر نکل گیا ہو۔ فرق یہی ہے نا کہ پہلے وہ دس کے قریب جاتا تھا۔ اور آج ساڑھے نو بجے نکل گیا تھا۔۔۔۔ کل میری ایک فرم سے لاکھ روپے کی ڈیل ہونے والی ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر پال خفا بھی ہو گیا ہے تو راضی ہو جائے گا۔ پھر سب مل کر کلو کے پہاڑ پہ چلنے کا پروگرام بنائیں گے۔

لیکن، ایک سگریٹ۔۔۔۔ صرف ایک سگریٹ۔۔۔۔

سنت رام کا خون بار بار کھول اٹھتا تھا۔ جیسے اس نے بیٹے کو معاف نہ کیا ہو۔ خود کو معاف نہ کیا ہو۔ مگر جو باپ بیٹے سے نفرت کرتا ہے۔ اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے۔ اور اس کا الٹ بھی درست ہے کہ جو بیٹا باپ سے نفرت کرتا ہے اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے۔ پال دراصل باپ سے نفرت نہیں کرتا تھا۔ خود سے نفرت کرتا تھا کیوں کہ مقابلے کی اس دنیا میں جب تک وہ باپ سے آگے نہیں نکل جائے گا خود کو معاف نہیں کرے گا۔ وہ باپ سے محبت اس وقت کر سکے گا جب وہ اسے نالائق اور بے وقوف ثابت کر دے۔۔۔۔۔

سنت رام نے گھنٹی پہ ہاتھ مارا اور چندو سے کہا۔ مس ڈولی کو بلاؤ۔

ڈولی اندر آگئی۔ آج اس نے بالوں کے پرم سنوار رکھے تھے۔ اور چست بلاؤز کے ساتھ ایک سفید رنگ کی ساڑی لپیٹ رکھی تھی۔ کیونکہ سنت رام کو سفید رنگ بہت پسند تھا۔ لیکن سنت رام نے رعب سے اس کی طرف نہ دیکھا۔ ڈولی جانتی تھی۔ آج کل بوس کھنچا کھنچا سا رہتا تھا۔ اس نے بھی دنوں سے بزنس کا انداز اختیار کر رکھا تھا۔ یہ تو اس کا کام تھا کہ ایک بڈھے آدمی سے باتیں کرتی تھی۔ وہ کام کرتی تو پیسے لیتی تھی۔ بیچ میں وافر باتیں بھی ہیں۔

اندر آنے کے بعد جب ڈولی نے یس سر کہا تو سنت رام نے پھسلتی ہوئی نظر اس پہ ڈالی اور اپنے آپ کو کہنے سے روک لیا کہ تم بہت خوبصورت لگتی ہو ڈولی!۔

لیکن ایک لمحے کے لئے اس کا دل جو کہیں بھی چھٹکارا پانے کے لیے تڑپ رہا تھا ڈولی کے خوبصورت بالوں میں اٹک گیا۔ یہ عورتیں بھی عجب ہیں۔ اگر مرد کا دل سیدھے بہاؤ میں نہ بہے تو اسے لہروں اور اس کے ہچکولوں میں ڈبو دو۔ مگر سنت رام نے جلدی ہی اپنی آنکھیں اس طوفانی بہاؤ اور پیچھے کے بھنور سے ہٹالیں۔ اور دائیں طرف در کشاس کے کلنڈر کو دیکھنے لگا جیسے اسے کوئی تاریخ دیکھنا ہو۔ ایسی حرکتوں کو عورت خوب سمجھتی ہے۔ اور اپنی نظریں اپنے شکار پہ گاڑے رہتی ہے۔ مرد جانتا ہے کہ اس نے عورت کی آنکھوں میں دیکھا تو گیا۔ اس لیے وہ پہلے سے اوپر سے ہی دیکھنے اور بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن کب تک؟ آخر منٹ کے سویں حصے کے لیے وہ مجبوری اور بے اختیاری کے عالم میں پھر اس کی طرف دیکھ لیتا ہے۔ اور یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جس میں اس کی آخری بیڑی بجھ کر ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

سنت رام نے ڈولی سے پوچھا — پرکنز کہاں ہے آج کل؟

— پرکنز ڈولی کا بھائی تھا، جاہن پرکنز۔

"یہیں ہے۔" ڈولی نے جواب دیا۔ اور تھوڑا مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ سنت رام کے اس سوال کو ادھر ادھر کی باتوں سے سمجھتی تھی۔ جو مطلب پہ آنے سے پہلے مرد ہمیشہ کرتا ہے۔ لیکن وہ تو سخت بزنس کا عمل جاری رکھنا چاہتی تھی۔ آخر کوئی مذاق ہے؟ جب چاہے بلا لو جب چاہے جھٹک دو۔ اتنے دنوں تک بات بھی نہیں کی۔ دیکھا تک نہیں اور گزر گئے۔ اور آج ایکا ایکی پرکنز یاد آیا ہے!

لیکن ڈولی بھی کب تک بزنس کا انداز رکھ سکتی تھی؟

سنت رام نے ڈولی کو نادانی کے عالم میں سگریٹ پیش کر دیا ایک لہر سی دوڑ گئی ڈولی کے بدن میں جو اس کے بالوں کے پرم سے زیادہ مضطرب تھی اس نے اپنے بڑھتے ہوئے ہاتھ روک دیئے اور بولی "نو تھینکس" اور پھر غصے اور شکایت سے اس کی چھاتیاں اوپر نیچے ہونے لگیں۔ سنت رام نے اس کی نظروں میں اپنی نظریں گاڑتے ہوئے ایک رُکنے انداز میں کہا — "ڈولی ۔ ۔ ۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سنت رام کہنے جا رہا ہے — دنیا نے میرے ساتھ یہ سب کیا ہے گھر کے لوگوں نے کیا ہے۔ ایک تم تھیں جو ایک معمولی سے 'ریز' کے لیے مجھے التفات کا دھوکا دے سکتی تھیں اور تم نے دھوکا دیا۔ اور وہ مجھے ایسی محبت لگی جو سچی محبت سے کہیں اوپر ہوتی ہے۔ اس میں وہی فرق تھا جو اصلی ریسے اور جوہری کے لاسے میں فرق ہوتا ہے جس میں پچھلا لاکھ روپے کا لگتا اور آنے والا لاکھ روپے کا نفع بڑے خوب صورت طریقے سے ایک دوسرے میں حل ہو جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ڈولی نے سنت رام کی طرف دیکھا۔ ورنہ وہ اور بھی بوڑھا ہو جاتا اور اسے ایک کی جگہ کئی اور گھاٹے پڑ جاتے، جن سے وہ خود بھی بے کار ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنے رحم کی آنکھوں سے سوچا، جو اس کی ماں تھا۔ اور دنیا بھر کے مردوں کی ماں چاہے وہ جوان ہوں یا بوڑھے پھر 'آل رائٹ' کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ سگریٹ کی طرف بڑھایا۔ سنت رام نے لائیٹر جلا کر ڈولی کا سگریٹ سلگایا۔ ڈولی نے کش لگا کر دھواں چھوڑتے ہوئے ایسے ہی سگریٹ کی طرف دیکھا پھر دوسرا کش لگانے کے بعد وہ اپنی سیٹ پر سے اٹھی پیچھے کیبن کے دروازے کی طرف دیکھتی ہوئی سنت رام کی طرف بڑھی ۔ ۔ ۔

جبھی سنت رام نے کہا: 'پرکنز شہر میں ہے تو اسے کہو ۔ ۔'

ڈولی وہیں رک گئی۔ اور اس کی طرف دیکھنے لگی تاکہ وہ اپنا فقرہ مکمل کر لے ۔ ۔ ۔ سنت رام نے کہا: 'مجھے اسٹیٹ ایکسپریس کا ایک کارٹن لا دے، پیسے پھر دے دوں گا'

"آل رائٹ"۔ ڈولی نے کہا۔ اور پیچھے ہٹتی ہوئی وہ کیبن سے باہر نکل گئی۔

سنت رام گھر پہنچا تو کارٹن کی قلعہ بندی کے باوجود مضطرب تھا۔ ایک نہیں بیسیوں لوگ تھے دامن گیر تھے۔ اس کے جن کے بارے میں وہ دھوبن یا لانڈری سے نہ کہہ سکتا تھا۔ اس کے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی پال چلا گیا۔ سنت رام کے بدن میں جو کپکپی پیدا ہوئی تھی بند ہو گئی۔ بلکہ ایک عجیب طرح کے سکون، نرمی اور گرمی کا احساس ہونے لگا جیسے سردیوں میں کوئی گرم کے

اندر بخاری جلا دے لیکن پھر یہی ڈر اس کے جسم و ذہن کا احاطہ کرنے لگا ——— کہیں اپنے لتّے کپڑے اٹھانے اور گورنمنٹ فلکس کے کمرے میں منتقل ہو جانے کے لئے تو نہیں آیا پال؟ مگر اس بات کے تو کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ پھر وہ آج جلدی کیوں چلا آیا تھا۔ وہ تو کبھی دو ڈھائی بجے سے پہلے نہیں آتا تھا۔ آج وہ ایک دو بجے سے پہلے!

کیا وہ اچھا بیٹا ہو گیا تھا؟ لیکن اچھا بیٹا ہونے کے باوجود وہ چپ کیوں تھا۔ وہ لاڈو کے ساتھ بات کر سکتا تھا اور نہیں تو پالی کے ساتھ کھیل سکتا تھا کیرم! کس قدر بغض سے بھرا ہوا تھا اس کا سینہ لیکن پال نے کوئی کپڑے وپڑے رکھے وہ گئے وہ ایک منٹ کے لیے اپنے کمرے کی طرف گیا اور پھر باپ کی طرف آیا اور جیب سے ایک پیکٹ نکال کر پیا کو پیش کر دیا سنت رام نے دیکھا اور پوچھا ——— "یہ کیا ہے؟"

"رتھمینز سوبرائنز۔"

رتھمینز سوبرائنز سگریٹ ... اور پورا پیکٹ! خون سنت رام کے کانوں اور آنکھوں تک آنے لگا ——— ایک سگریٹ تو کیا پی لیا ہے اس کا۔ اس کے عوض پورا پیکٹ لا کے دے رہا ہے۔ جوتا مار رہا ہے ایک طریقے سے سنت رام نے پیکٹ اٹھایا۔ اور پورے زور سے پال کے منہ پہ کھینچ مارا۔

"لے، شہدے، حرامی!" سنت رام کہہ رہا تھا "تو کیا سمجھتا ہے میں اپنے سگریٹ بھی نہیں خرید سکتا؟ تجھے خرید کر نہیں دے سکتا؟ اتنا تو نہیں مرا ہوں، جتنا تو سمجھتا ہے۔ ابھی تو تیرے ایسے سو کمینوں کو خرید کے رکھ لوں۔ اور جیب میں ڈال کے چل دوں ... باسٹرڈ!"

پال کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا اس نے اپنا ہاتھ ہونٹ پہ رکھ لیا جس پہ پیکٹ کے لگنے سے ایک کٹ سا چلا آیا تھا اور خون کا ایک نقطہ سا دکھائی دے رہا تھا اس نے کہا بھی تو صرف اتنا ——— پپّا!"

لاڈو بیڈ روم سے دوڑی ہوئی آئی اور اس نے بھی اتنا سا کہا ——— پپّا! پھر وہ ہرن مڑتی ہوئی سی بولی ——— "کیا ہوا جی؟"

"کچھ نہیں" سنت رام نے سب کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا "مجھے اس پلّے سے اپنا حساب برابر کر لینے دو۔ بہت دیر ہو گئی ہے اسے ٹکے ہوئے ... " پھر اپنے بیٹے کے چہرے پر خون کا قطرہ دیکھ کر سنت رام اور ڈر گیا اور بھی وحشتناک ہو گیا۔ کیوں کہ بیٹے کا خون دیکھنا کوئی آسان بات نہیں۔ دیکھنے والے کو وہ بظاہر بیٹے کا خون معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خون اسی کا ہوتا ہے جس کا وہ خون ہے ... اور بھی آگے لپکتے ہوئے۔ منہ پہ کف لاتے ہوئے۔ سنت رام کہہ رہا تھا ——— "میں تجھے جان سے مار دوں گا۔ آج چھوڑ دو، چھوڑ دو مجھے ——— یہ بھی ایک مثال ہو جانے دو۔ بیٹے باپ کا خون کرتے آئے ہیں آج باپ کو بیٹے کا خون کرنے دو۔ مادر ... میں نے تجھے کیا نہیں دیا؟ تو باہر پنجاب پڑھنے کے لیے گیا تو چار سو روپے مہینہ بھجتا رہا پھر تو وہاں سے بھاگ آیا اور میرے دوست نے دو برس تجھے اپنے ہاں رکھا اور تجھے تعلیم دی۔ میری وجہ سے اس نے تجھے اپنے ہاں رکھا ورنہ تجھے کون پوچھتا ہے ——— جیتھڑے کو؟ اور پھر بھی پیسے بھیجتا رہا، میرے بیٹے کو تکلیف نہ ہو۔ اور تو اس سے ہوٹلوں اور ریسٹورانوں میں جاتا۔ ہر قسم کی بد معاشیاں کرتا رہا۔ تیرے اپنے بکنے کے مطابق تیرے دوست تجھے شہزادہ کہتے تھے کیوں کہ تو باپ کے مال پہ عیش کرتا تھا۔ پھر تو نے بی اے میں کمپارٹمنٹ کی اور امتحان کو پورا کیا کیوں کہ تو ہندی میں فیل ہو گیا تھا۔

ہندی بھی کوئی بات تھی بھلا؟ میں نے تجھ سے کتنی منتیں کیں کہ ایک مضمون ہے پاس کر لے لیکن تجھے اس سے چڑ ہوگئی۔ پھر بھی میں نے تجھے کچھ نہ کہا چھبیس برس کی عمر تک تجھے گھر رکھا اور روٹیاں کھلاتا رہا۔ ہوتا کسی باہر کے ملک میں تو اٹھارہ سال پورے ہوتے ہی باپ تجھے لات مار کر باہر نکال دیتا جب تیری جیب میں پیسے نہیں ہوتے تھے تو تیری ماں سے چوری دس بیس پچاس ڈال دیتا تھا۔ لو آج یہ اسی کا صلہ ہے کہ وہ مجھے آنکھیں دکھاتی ہے اور کہتی ہے کہ میں نے اپنی اولاد کو تباہ و برباد کر دیا تیری وجہ سے میں نے اپنی زندگی تباہ و برباد کر لی یہ تیرا ہی فقرہ ہے نا کہ میری ماں جس قسم کی عورت ہے اس سے تو میرا باپ کوئی داشتہ رکھے ۔ ۔ ۔ یوں کہا نہیں تو نے جو بیٹا ماں کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے وہ باپ کی بابت کیا کہے گا۔ روز تو ماں کو گالی دیتا ہوا نکل جاتا ہے اور جانتا ہے وہ گالی کسے پڑتی ہے؟ وہ تجھے گالی دیتی ہے تو گالی کسے پڑتی ہے؟ کیا اس گھر میں کوئی مالک نہیں، کوئی باپ نہیں؟ بھلا ہوا جو ایک بار زندگی میں صرف ایک بار گھاٹا پڑ گیا۔ میں نے لاکھ روپیہ گنوایا ہے تو آج ہی لاکھ روپیہ کا کنٹریکٹ کیا ہے۔ جس میں سے کچھ نہیں تو تیس پینتیس ہزار بچ جائیں گے۔ جب تو تیری ماں بھی خوش ہوگی اور لاڈو بھی جو اس دن باپ کے بجائے مجھے انکل کہہ گئی۔ اور تو بھی خوش ہوگا اور فخر سے میرا نام لے گا میرے پاس ہو کر بیٹھے گا اور باتیں کرنے کی کوشش کرے گا لیکن میں ۔ ۔ ۔ میں تم سب کو سمجھ گیا ہوں۔ منہ تک نہ لگاؤں گا کسی کو ۔ ۔ ۔"

پال کے ہونٹ پھڑکنے لگے تھے اس نے ڈرتے ڈرتے کہا بھی تو صرف اتنا: "پر پتا جی میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم نے!" سنت رام اور بھی بلند آواز سے چیخا "تم نے مجھے گالی دی ہے جو کسی نے نہیں دی کسی کی ہمت ہی نہیں پڑی۔ سب جانتے ہیں نا۔ میں خالی ہاتھوں سے ان کی بوٹیاں اڑا دوں گا تیری یہ ہمت کہ ایک سگریٹ تیرا پی جانے سے تو پورا پیکٹ میرے منہ پر دے مارے؟"

"ایک سگریٹ؟" پال نے کہا

"ہاں" سنت رام نے کہا "مجھے پتہ چل گیا تھا، میں نے تیرا ایک سگریٹ اسٹیٹ ایکسپریس صبح پی لیا تھا ۔ ۔"

"نہیں ۔ ۔ ۔ مجھے تو کچھ نہیں معلوم"

اس سے پہلے کہ سنت رام جو کانپ رہا تھا نیچے گر جاتا بیٹے نے بڑھ کر تھام لیا۔ اور اس کے گلے لگ گیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور کہنے لگا "معاف کر دو مجھے معاف کر دو پتا"

---

اگلے روز سنت رام حسب معمول صبح کے چار بجے اٹھ گیا تھا۔ اسے پھر سگریٹ کی طلب ہوئی تو بنا کوئی شور کیے بغیر وہ ساتھ کے کمرے میں چلا آیا۔ جہاں پال لاڈو اور اس کا بچہ بابی سوئے ہوئے تھے۔ سنت رام نے زیرو پاور کا بلب جلایا اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ہلکی مدھم سی روشنی میں وہ سب فرشتے معلوم ہو رہے تھے۔ ایک سے ایک حسین اور خوبصورت۔ سلو تو خیر ہوا آج بابی کی بانہہ ماں کے گلے میں نہ تھی۔ وہ آزاد اور بے فکر سو رہا تھا۔

سنت رام نے سوچا۔ کالج بھیجنے سے پہلے میں نے اس بچی کو لکچر دیا تھا۔ لیکن اگر یہ کوئی بے راہ روی کرتی لڑکی میں اسے سڑک پر پھینک دیتا؟ پال کا تجربہ ناکام ہوتا تو میں اسے زندگی کا کھیل سکھاتا ہوں یہ اخلاق ۔ ۔ ۔ یہ تہذیب سب ایسی ہیں یہ اور یہاں سے باہر کے سب بچے ہیں۔ جو کھیلتے ہیں۔ گرتے ہیں پھر اٹھ کر کھیلنے لگتے ہیں ۔ ۔ ۔ دھوبن ۔ ۔ ۔ دھوبن یہ تو تھی ہے وہ نہیں جانتی کچھ سوائے کپڑے دھونے کے ۔ ۔ ۔

## صرف ایک سگریٹ

راجندر سنگھ بیدی

سنت رام نے اسٹیٹ ایکسپریس کا کارٹن نکالا اور اسے اپنے بیٹے کے سرہانے رکھ دیا۔ رات اس جھگڑے کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے کو دے ہی نہ سکا تھا۔ چلو یہ اور بھی اچھا ہوا جاگے گا تو ایک دم پورا کارٹن پا کر کتنا خوش ہوگا۔۔۔۔ پھر سنت رام نے بیٹے کے دیے ہوئے رتھمین سوبرانی کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکالا اسے جلایا اور دھوئیں کے بڑے بڑے کش چھوڑے۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی پہلے ہی کچھ نہیں ہوتی، اس پہ دھوئیں نے اور بھی منظر کو دھندلا دیا تھا۔ اور نیچے فرشتوں سے بھی زیادہ حسین لگنے لگے تھے۔ سنت رام کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر پال کا چہرہ چوم لے لیکن کہتے ہیں سوتے ہیں بچے کا چہرہ نہیں چومتے۔ جانے کیوں ؟ ۔ اس وقت تو سنت رام نے یہی سوچا کہ اگر اس نے ایسی حرکت کی تو وہ جگ جائیں گے۔۔۔۔

سوبرانین کے چوتھے کش میں کوئی نشہ تھا یا شاید سنت رام کی آنکھیں بیٹے کی شراب سے چڑھ گئی تھیں۔ اس نے دھواں صاف کرتے ہوئے ایک بار پھر سب کی طرف دیکھا اور کہا۔۔۔۔۔ "جیو جیو بیٹا! سکھ کی نیند سوؤ ابھی، چھت کے نیچے۔۔۔۔ میں باپ ہوں تو کسی برے خواب کو بھی نہیں آنے دوں گا! ۔۔۔"

(اردو ادب سے)

غلام عباس

# ایک سچّی کہانی

یہ افسانہ جس کا خیال ایک اطالوی افسانے سے لیا گیا ہے، اپنی موجودہ مختصر صورت میں ٹیلی ویژن کے لئے لکھا گیا تھا، اور اس صورت میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔

میری جیب میں جو تھوڑے سے پیسے رہ گئے تھے وہ سرِشام ہی میں نے کافی ہاؤس کی نذر کر دیئے تھے۔ مجھے امید تھی کہ کافی پی کر میرے تخیل میں جنبش ہوگی، اور میں کوئی فن پارہ تخلیق کر سکوں گا۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔

جس زمانے کا یہ قصہ ہے، مجھے روٹی کی بھوک تو رہتی ہی تھی، ساتھ ہی میں شہرت کا بھی بھوکا تھا۔ میں دنیا میں قلم کے زور سے نام پیدا کرنا چاہتا تھا۔ میرے والدین قضا کر چکے تھے۔ میں بے یار و مددگار تھا۔ ہاں ایک رسالے کا ایڈیٹر جو ایک فربہ، سیاہ فام، خاموش سا آدمی تھا۔ جب کبھی اس کے پاس رسالے میں چھاپنے کے لئے کوئی بہتر چیز نہ ہوتی وہ مجھ سے کہانی خرید لیا کرتا۔ وہ مجھے ایک کہانی کا معاوضہ دس روپے دیا کرتا۔ اور اس بات کا کچھ خیال نہ کرتا کہ کہانی کتنی لمبی ہے۔ یا کس پایہ کی ہے۔

وہ موسمِ سرما کی ایک شام تھی۔ تُند ہَوا نے سردی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ میں کافی ہاؤس کے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ میں نے کافی کی پیالی کو بہت دھیرے دھیرے ختم کیا تھا۔ اس دوران میں میرا ذہن سخت جدوجہد کرتا رہا تھا، کہ کوئی انوکھی بات مجھے سوجھ جائے، جس پر میں اپنی کہانی کا تانا بانا تیار کر سکوں۔ لیکن معلوم ہوتا تھا، اس شام میرے تخیل نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

اس رات میرے لئے ایک کہانی لکھنا اشد ضروری تھا۔ اول تو خود ایڈیٹر نے اس کی فرمائش کی تھی۔ دوسرے میرے پاس کوڑی تک نہ رہی تھی۔ اور لگے روز فاقوں تک نوبت پہونچ جانا لازمی تھا۔

آخر دو گھنٹے کی سعیِ لاحاصل کے بعد میں اپنا پراگندہ تخیل اور مضمحل دماغ لئے ہوئے کافی ہاؤس سے باہر نکل آیا۔ میں چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ اچانک ایک فقرہ میرے ذہن میں اُبھرا۔ یہ فقرہ میں نے ایک مضمون میں پڑھا تھا، جو فی

ناول نویسی کے بارے میں تھا۔ صاحب مضمون کا نام تو یاد نہیں آ رہا تھا۔ مگر وہ فقرہ یہ تھا:

"حقیقت افسانے سے زیادہ دل فریب ہے۔ اگر کسی عام
آدمی کی زندگی کی سچی کہانی بیان کی جا سکے یا لکھ
دی جائے تو وہ ایک عظیم ناول بن سکتی ہے۔"

میں نے دل میں کہا: "کیوں نہ اس نسخے کو آزمایا جائے۔ اور آج رات جس آدمی سے بھی مڈبھیڑ ہو، اُس کی منت خوشامد کر کے اُس کی آپ بیتی معلوم کی جائے۔ اور اس کو کہانی کے سانچے میں ڈھالا جائے۔"

اس خیال پر میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ اور فوراً اس پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔

آپ شاید یہ پوچھیں کہ میں نے اپنی آپ بیتی سے یہ فائدہ کیوں نہ اٹھایا۔ تو میں عرض کروں گا کہ میں پیشتر ہی اپنے واقعات زندگی کو اتنی مرتبہ لکھ چکا تھا کہ کوئی قابل ذکر بات رہ ہی نہیں گئی تھی۔

میں نے شہر کے ایک بارونق حصے کا رُخ کیا۔ جہاں سردی، تند ہوا اور آتی رات گذر جانے پر بھی امید ہو سکتی تھی کہ کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ مل ہی جائے گا۔

میں ایک چوراہے پر پہونچ کر رک گیا۔ اور بجلی کے ایک کھمبے سے ذرا ہٹ کر ایک رہزن کی طرح اپنے شکار کا انتظار کرنے لگا۔

سب سے پہلے جو شخص اس کھمبے کے پاس سے گذرا۔ وہ ادھیڑ عمر تھا۔ میلے کپڑے، خستہ حال، چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوئیں۔ میں نے دل میں کہا۔ اس سے کیا پوچھوں۔ اس کی داستان حیات تو اس کے چہرے ہی پر لکھی ہے۔ میں نے اُس سے تعرض نہ کیا۔ اور وہ اپنی راہ چلا گیا۔

اس کے بعد ایک نوجوان گذرا۔ سیاہ شیروانی، گریبان کھلا ہوا، داڑھی بڑھی ہوئی، سر پر لمبے لمبے بال ہوا میں اڑتے ہوئے۔ وہ سردی اور جھکڑ سے بے نیاز جھومتا جھامتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے بھانپ لیا۔ کہ حضرت شاعر ہیں۔ اور چسکی لگائے ہوئے ہیں۔ بھلا ان کو اتنا ہوش کہاں کہ میری بات پر دھیان دیں۔ اور میں ان سے بھی کنارہ کش ہی رہا۔

تیسرا شخص جو اُدھر سے گذرا، خاصا عمر رسیدہ تھا۔ مگر ابھی آنکھوں میں زندگی کی لَو مدھم سی باقی تھی۔ اُس کی چٹی داڑھی میں کالے بال اِکا دُکا ہی رہ گئے تھے۔ اس نے شلوار قمیص پر کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر ترکی ٹوپی تھی، جس کا پھندنا غائب تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا جیسے خواب میں چل رہا ہو۔ ساتھ ساتھ وہ ایک پنجابی لوک گیت بھی گنگناتا جاتا تھا۔ بڑے میاں کی وارفتگی بتا رہی تھی کہ انہوں نے اپنی جوانی عجیب رنگینیوں میں گذاری ہوگی۔ اور اس وقت بلاشبہ اُسی کی یاد میں یہ گیت اُن کے لبوں پر آیا ہوگا۔ لیکن بڑے میاں کی محویت کے اس طلسم کو توڑنے کی مجھے جرأت نہ ہو سکی۔ اور یوں وہ بھی میرے ہاتھ سے نکل گئے۔

رات بڑھتی جاتی تھی۔ بازار سنسان ہوتے جاتے تھے۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ آخر ایک سایہ اس روشنی کے نیچے سے گذرا۔ جہاں میں کھڑا تھا۔ اس کی وضع قطع چال ڈھال سے مجھے یقین ہو گیا کہ جس شخص کی مجھے جستجو تھی وہ یہی ہے۔ وہ اس طبقے کا نمائندہ تھا جسے عام لوگ کہتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر اس کی عمر کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ نہ بوڑھا

تھا نہ جوان۔ نہ خوب صورت نہ بدصورت، اُس کے چہرے سے سکون اور اطمینان جھلکتا تھا۔ داڑھی چٹ، چھوٹی چھوٹی کتراں مونچھیں۔ اس نے انگریزی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور گلے پر گلو بند لپیٹ رکھا تھا۔

میں اس کی طرف لپکا۔ وہ ٹھٹھر گیا، اور خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے فوراً اُس کی تشفی کردی،

"صاحب ڈریئے نہیں۔ میں چور اُچکا نہیں ہوں۔ میں فقیر بھی نہیں ہوں۔ مجھے آپ کے روپے پیسے کی ضرورت نہیں۔ میں جس چیز کا طالب ہوں۔ اُس پر آپ کی گرہ سے کچھ نہیں جائے گا۔ مجھے تو آپ کی آپ بیتی چاہئے"

یہ سن کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ دل میں سمجھا ہوگا۔ ضرور یہ کوئی سودائی ہے۔

میں نے بڑے ملائم لہجے میں کہا:

"حضرت۔ میں دیوانہ بھی نہیں ہوں۔ میں تو...... اب میں کیا عرض کروں۔ میں ایک گمنام سا افسانہ نگار ہوں مجھے آج رات ایک کہانی لکھنی ہے۔ اگر یہ کہانی نہ لکھ سکا تو کل مجھے فاقہ کرنا ہوگا۔ میرے پاس کہانیوں کے لئے جو مواد تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔ اور مجھے آپ کے واقعاتِ زندگی کی ضرورت آپڑی ہے۔ تاکہ میں اُسے ایک کہانی میں سمو سکوں۔ مجھے آپ کی ذاتِ گرامی سے امید ہے کہ آپ مجھے محروم نہیں کریں گے۔ کیا عجب کہ آپ کی آپ بیتی سے میں ایک لافانی شاہکار تحریر کرسکوں"

معلوم ہوتا تھا وہ شخص میرے لہجے سے متاثر ہوا ہے۔ کیونکہ اب اس نے جن نظروں سے مجھے دیکھا، ان میں خوف کے بجائے رحم کا جذبہ پایا جاتا تھا۔

اُس نے کہا،

"اگر میرے واقعاتِ زندگی سے آپ کا کام نکل سکتا ہے۔ تو مجھے سنانے میں کوئی عُذر نہیں۔ میری پیدائش کو ۲۵ برس گذر چکے ہیں۔ والد صاحب قبلہ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ میں اُن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ہم لوگ خاصے کھاتے پیتے، عزت دار سمجھے جاتے تھے۔

جب میری عمر چھ برس کی ہوئی، تو مجھے مسجد کے ملا کے پاس پڑھنے بھیجا گیا۔ پھر میں ایک اسکول میں داخل ہوگیا۔ سولہ برس کی عمر میں میں نے میٹرک پاس کرلیا۔ میں نے نہ تو کسی غیر معمولی ذہانت کا اظہار کیا تھا، اور نہ میں احمق ہی تھا۔ میٹرک کے بعد والد صاحب نے مجھے ریلوے کے دفتر میں ملازم رکھوا دیا۔ جب مجھے نوکری کرتے چھ مہینے ہوگئے، تو انہوں نے اپنی برادری کی ایک لڑکی سے میری شادی کردی۔ میں نے اپنی بیوی کو شادی سے پہلے نہیں دیکھا تھا، مگر وہ میری توقع سے کچھ اچھی ہی نکلی۔

مجھے ہر روز آٹھ گھنٹے دفتر میں کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے کسی خاص لیاقت یا ذہانت کی ضرورت نہیں، بس اچھے حافظے اور تن دہی کی ضرورت ہے۔ میری تنخواہ میں ہر سال چھ سات روپے کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ میں ۵۵ برس کی عمر میں ریٹائر ہوں گا۔ تو مجھے کوئی پونے دو سو روپے پنشن ملے گی۔

مجھے اپنے بیوی بچوں سے بڑا اُنس ہے۔ میری اولاد میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکے کی عمر اب دس برس کی

ہو چکی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اس کو انجینئر بناؤں۔ لڑکی کی عمر ساڑھے آٹھ برس ہے۔ ابھی اُس کے مستقبل کا فیصلہ کرنا مشکل ہوگا۔ لیکن اگر اس نے شوق ظاہر کیا، تو اسے بی اے۔ بی ٹی تک تعلیم دلواؤں گا۔

ہم لوگ سرکاری کوارٹر میں رہتے ہیں۔ جو نہ بہت تنگ ہے نہ بہت کشادہ۔ میں ہر روز صبح سات بجے اٹھتا ہوں۔ اور نہانے دھونے سے فارغ ہوکر نو بجے دفتر چلا جاتا ہوں۔ اور پانچ بجے لوٹ آتا ہوں۔ میرے چار پانچ دوست ہیں۔ ان میں دو ایک تو اسکول کے زمانے کے ہیں، اور باقی دفتر کے۔ ان کے ساتھ کبھی کبھی کافی ہاؤس چلا جاتا ہوں۔ وہاں کچھ دیر گپ شپ رہتی ہے۔ پھر وہ اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ میں اپنے گھر چلا آتا ہوں۔ کبھی کبھار کسی دوست کے اصرار پر ایک آدھ مشاعرہ بھی سن لیتا ہوں۔

"لو صاحب میں نے تمہاری فرمائش پوری کر دی۔ خدا کرے تم اس سے کچھ فائدہ اٹھا سکو۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ فی امان اللہ۔"

یہ کہہ کر وہ چل دیا۔ لیکن میں ابھی پورے طور پر مایوس نہیں ہوا۔ میں لپک کر اس کے پیچھے گیا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا آپ کی زندگی میں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی؟ کیا کبھی آپ پر کوئی حادثہ نہیں گذرا؟ کیا کبھی آپ کو کسی نے قتل کرنے کی کوشش نہیں کی؟ کیا آپ اپنی بیوی کی طرف سے کبھی بدگمان نہیں ہوئے؟ کیا آپ کے افسروں نے کبھی آپ کو جبر و استبداد کا نشانہ نہیں بنایا؟"

"نہیں صاحب ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔" اُس نے رکھائی سے جواب دیا۔ معلوم ہوتا تھا میرے آخری سوالوں سے وہ کچھ بُرا مان گیا ہے۔ "میری زندگی ہمیشہ پرسکون رہی ہے۔"

میں نے کہا "ذرا پھر سوچئے، اور غور کیجئے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ کی زندگی میں کوئی نشیب و فراز ہی نہ آیا ہو۔ اس کے بغیر تو آپ کی زندگی بڑی بے رنگ ہوگی۔"

اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ پھر بھی اس نے خوش اخلاقی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور بڑے تحمل سے کہا "آپ باور کیجئے کہ جن باتوں کا آپ نے ذکر کیا ہے ان میں سے ایک سے بھی مجھے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ البتہ آج آپ سے ملاقات میری زندگی میں ایک نئی بات ہے۔"

اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ وہاں سے چل پڑا۔ میں کئی منٹ تک گُم سُم اُس کے قدموں کی چاپ سنتا رہا، جو رفتہ رفتہ دھیمی ہوتی گئی۔ اور آخر رات کے سناٹے میں گم ہو گئی۔

ابنِ انشا

# انشائیے

## ڈاکٹر سے ڈائرکٹر تک

آج اخبار میں ایک سرخی نظر آئی "اعجاز میر کی رُسوائی" عجب تشویش ہوئی کیونکہ اعجاز میر صاحب سے ہماری بھی یاد اللہ ہے۔ اعجاز میر صاحب ڈاکٹر ہیں۔ علم و ادب والے یا فٹ پاتھ والے نہیں بلکہ سچ مُچ کے۔ وہ بھی ایسے ویسے نہیں، ماہرِ امراضِ چشم۔ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ اچھی بھلی پریکٹس چھوڑ فلم کے کوچے میں چلے آئے۔ ہم نے فلم سازوں کو فلم کے میدان میں ناکام ہونے کے بعد میرے کا سرمہ بیچتے، بلا درد دانت اکھاڑتے اور طوطوں اور لفافوں کی مدد سے لوگوں کو ان کی قسمت کا کچا چٹھا بتاتے تو دیکھا ہے لیکن یہ پہلا حادثہ ہے کہ ایک آنکھوں کا متخصص سمیت ڈاکٹر فلم کے میدان میں چلا آیا ہے۔ خیر خود کردہ را علاجِ نیست۔ یہاں رسوائی کے سوا کیا حاصل ؟

ع اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے

ڈاکٹر صاحب فلم کے کوچے میں کیوں آئے؟ ایک روایت یہ ہے کہ وہ ایک روز ایک مریض کی آنکھیں دیکھ رہے تھے۔ اس سے سوال کیا میاں کیسے خراب ہوئیں تمہاری آنکھیں اس نے کہا "جناب! شاید یہ وجہ ہو کہ فلمیں بہت دیکھتا ہوں روزانہ کا معمول ہے اور اگر مس نیلو کی فلم ہو تو دن میں ایک بار سے زیادہ بھی دیکھ لیتا ہوں" ڈاکٹر صاحب نے استفسار کیا "کیا بہت لوگ دیکھتے ہیں فلمیں؟" وہ بولا "جی بہت بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔ پولس کو لاٹھی چارج کرنا پڑتا ہے۔ آپ کے دواخانے کی طرح نہیں کہ کوئی اکا دکا مریض آتا ہو" ڈاکٹر صاحب کو متوجہ پاکر اس شخص نے انھیں فلم اور فلم سازی کے رموز پر ایک لیکچر دیا اور مختلف فلم اسٹاروں کے حالات، عمروں شادیوں کی تعداد اور اندرون خانہ خبروں سے آگاہ کیا۔ اگلے روز کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے کلینک پر تالا پڑا ہے اور ڈاکٹر صاحب ایسٹرن اسٹوڈیو میں گھوم رہے ہیں۔

. . . . . . . . .

خیر خبر پڑھنے سے معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحب کی صحت اور عزت وآبرو وغیرہ سب محفوظ ہیں۔ رسوائی ان کی فلم کا نام ہے جو خوب رش لے رہی ہے ہم ایسے نیک اور ہمدرد تو محض سرخی پڑھ کر ان کے ہاں پہنچ بھی گئے تھے اور آبدیدہ ہو کر بولے تھے "ہم سے آپ کی رُسوائی نہیں دیکھی جاتی" ڈاکٹر صاحب بہت بگڑے کہ میں نے اپنا آپ داؤں پر لگا دیا ہے اور تم کہتے ہو رسوائی دیکھنے کے لائق نہیں ہے۔ وہ سادہ لوح چپکا ہوا تھا داؤں کے نقطے سے [illegible] کہ کوئی جوئے دوئے کا قصہ ہے۔ زیادہ کریدنا مناسب نہیں۔

. . . . . . . . .

ان ساری غلط فہمیوں کی جڑ فلم کا نام ہے کتابوں کے ناموں میں بھی اس قسم کی بے احتیاطی سے ہتک عزت کا احتمال پیدا ہوتا ہے۔ منٹو مرحوم کا ایک پبلشر ان کی ایک کتاب کا اشتہار یوں دیا کرتا تھا۔

## سعادت حسن منٹو

## چغد

## قیمت پانچ روپے

ہم لوگوں نے اسے سمجھایا کہ منٹو صاحب سے تمہارا لین دین کا جھگڑا اپنی جگہ ہے۔ لیکن یہ کیا حرکت ہے۔ اس نے کہا صاحب ایسی کوئی بات نہیں میں تو چغد بیچتا ہوں۔ اور یہ میرا کاروبار ہے منٹو صاحب کا نام بطور مصنف نہ دوں تو آپ ہی کہیں گے کہ چغد پبلشر ہے مصنف کا نام غائب کئے دے رہا ہے۔ ہمارے محترم بزرگ ایم اسلم صاحب نے جب "لاجواب اُلّو" نامی کتاب لکھی تب بھی یہی مسئلہ پیدا ہوا تھا۔ پبلشر نے یہ وضاحت کرنا ضروری نہ سمجھا تھا کہ یہ ان کی کتاب کا نام ہے۔ اپنے دوست ابراہیم جلیس کو بھی ہم نے اسی لئے منع کیا تھا کہ اپنی کتاب کا نام" کالا چور" مت رکھو۔ لیکن آج کل کون کس کی مانتا ہے؟۔

. . . . . .

کبھی بار معاملہ زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ ایک پروڈیوسر نے جن کا نام خواجہ نعیم سے ملتا جلتا ہے، ایک بار ایک پُر درد اصلاحی فلم بنائی۔ نام تھا" ماں" ایک ملنے والے نے ان سے پوچھا کہئے آپ کی ماں کا کیا حال ہے؟" وہ بولے:" اب تو خیریت ہے۔ کھانسی تھوڑی باقی ہے۔ اس نے کہا جناب میں فلم کی بات کر رہا ہوں" دوسرے دن ایک دوسرے بزرگ نے یہی سوال کیا تو خواجہ صاحب نے فرمایا "ختم ہونے والی ہے آج کل تو میں اسے بیچنے کی فکر میں ہوں"۔ اس شخص نے کہا" لاحول ولا قوۃ۔ اپنی والدہ ماجدہ کے متعلق ایسے کلمات؟ زیادہ بدمزگی تب ہوئی جب انھوں نے ایک اخبار کے صفحہ اول ہی پر پڑھا۔" خواجہ نعیم کی ماں کی "۔ آنکھوں میں خون اتر آیا قریب تھا کہ ایڈیٹر کو قتل کر دیتے۔ اس نے کہا جناب غور سے دیکھئے۔ اس کے بعد صاف لکھا ہے" (باقی صفحہ آٹھ پر)"۔ وہاں لکھا تھا" شاندار کامیابی پر ہم ان کو مبارک باد دیتے ہیں۔" اب ایڈیٹر نے ان کو ڈانٹنا شروع کیا کہ ہم آپ کی پبلسٹی کرتے ہیں اور آپ ہمیں آنکھیں دکھاتے ہیں۔

. . . . . . .

اب جو بات پھر آنکھوں پر لوٹ آئی ہے تو ایک اور روایت ڈاکٹر اعجاز میر صاحب کے متعلق سن لیجیے۔ ڈاکٹر صاحب نوجوان خوبصورت آدمی ہیں مشہور جذباتی اداکارہ نگارہ نے ایک روز ان کو شانوں سے پکڑ لیا اور اپنی جذباتی دلچسپی کا اظہار ان لفظوں میں کیا کہ" ذرا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالئے آپ کو ان میں کیا نظر آتا ہے؟" اس کا معقول جواب یہ ہونا چاہیئے تھا کہ تمہاری آنکھیں محبت کا سمندر ہیں جن میں میرے دل کا سفینہ ڈول رہا ہے۔ یا یہ کہ ان میں جوانی کے کنول لہرا رہے ہیں وغیرہ۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا:" مجھے تو ککرے نظر آتے ہیں۔ روزانہ ڈیٹول سے انھیں دھویا کرو۔" اس نے اتنا برا مانا کہ ان کی فلم میں کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

## انیس دُم کا بھروسا نہیں

قارئین کرام جانتے ہیں کہ ہم کتنے عرصے سے انسانوں کا شمار حیوانات کے زمرے میں کرانے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ محکمہ بے رحمی حیوانات اور وٹرنری ڈپارٹمنٹ سے انسانوں کے لئے بھی وہی مراعات حاصل کر سکیں جو اس وقت دوسرے جانداروں یا جانوروں کو حاصل ہیں۔ جب کبھی ہم نے دعویٰ کیا محکمے والوں نے یہی کہا کہ ثبوت لاؤ کہ انسان اصل میں حیوان ہے۔ ہم نے بعض انسانوں کے اعمال و افعال کی طرف اشارہ کیا تو جواب ملا یہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن ہم تو جانور اس کو مانتے ہیں جس کے چار پاؤں

ہوں دُم ہو یا سینگ ہو۔ ہم نے کہا کسی کی دم کٹی ہو یا سینگ نہ ہوں جیسا کہ بعض کے نہیں ہوتے تو کیا آپ ایسے جانوروں کو انسان قرار دیتے ہیں؟ لاجواب سے ہو کر بولے :۔ پھر کچھ اور نشانیاں بھی ہوتی ہیں لیکن انسان کے تو نہ سینگ نہ دُم ۔ یہ کس برتے پر حیوانات میں نام لکھانا چاہتا ہے۔

. . . . . .

بارے اب باشے خاں کے سینگ نے ہمارے حق میں ایک ثبوت مہیا کر دیا ہے۔ باشے خاں ایک صاحب ہیں پشاور میں جن کے سر پر سینگ نکلا ہے اور اخباروں میں اسکی تصویریں چھپی ہیں۔ بے شک سب انسانوں کے سینگ نہیں ہوتے لیکن دیگ میں سے ایک چاول دیکھنا کافی ہوتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ لوگوں نے مل ملا کر اسے کٹوا دیا ہے۔ یہ حضرت انسان بھی خوب مخلوق ہے اس کی اکثریت جب دیکھتی ہے کہ کسی شخص میں کوئی نادر یا امتیازی بات پیدا ہو گئی ہے تو وہ اس فکر میں لگ جاتی ہے کہ یہ اس خداداد امتیاز کو کھو کر ہمیں سا اللہ دوا ہو جائے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ لوگ بھی اپنے اپنے سروں پر سینگ اگانے کی کوشش کرتے اس کے بجائے انھوں نے باشے خاں کا سینگ کٹوا دیا۔

سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یُوں　　"

. . . . . . .

ایک اور ثبوت جو محکمہ بے رحمی والے مانگتے ہیں دُم کا ہے۔ ہم نے کہا بھی کہ کیا دُم کٹے جانور انسان نہیں ہوتے انسانوں کو محض دُم نہ ہونے کی بنا پر دائرہ حیوانیت سے خارج کرنا زیادتی ہے۔ ہم نے ان کو ایک پرانے بادشاہ کی ایک تصویر بھی دکھائی جس میں درباری ایک لمبی سی چیز اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں لیکن اس کو انھوں نے دُم نہ مانا پھر ہم نے کہا کہ انسان کے دُم نہ ہوتی تو یہ محاورے کہاں سے آتے کہ فلاں شخص دم دبا کر بھاگ گیا۔ یا فلاں کی دم میں نمدا۔ وہ پھر بھی ہیچر مچر کرنے لگے آخر ہم نے اساتذہ کے کلام سے مثالیں دیں۔ یہ شعر غالباً میر تقی میر کا ہے۔

موت اک زندگی کا وقفہ ہے　　　یعنی آگے چلیں گے دُم لے کر

حضرت انیس تو ابھی پچھلی صدی میں تھے۔ فرماتے ہیں۔

انیس دُم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ

جس کا مطلب یہ ہے کہ دُم ہوتی ضرور تھی اگرچہ بھروسے کے لائق نہیں۔ جن لوگوں کے دم نہ ہوتی تھی تو وہ اس کی حسرت کیا کرتے تھے

چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دُم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

. . . . . . .

اس امر کے باوجود کہ آدمی کے بھی گدھے کی طرح (بالعموم) سینگ نہیں ہوتے ہم ذاتی طور پر گدھے اور آدمی کو ایک سطح پر رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ گدھے کا سا حلیم اور محنتی جانور ہمارے نزدیک کوئی نہیں۔ لیکن یہ بہرحال ہماری ذاتی رائے ہے۔ منطقی لوگ دو اور دو چار دیکھتے ہیں کہ

آدمی کے سینگ نہیں ہوتے　　　گدھے کے سینگ نہیں ہوتے

لہٰذا آدمی گدھا ہے اور گدھا آدمی۔ اس نتیجے کے دوسرے حصے کے متعلق تو ہم کچھ نہیں کہتے لیکن پہلے حصے کے تعلق سے ایک حکایت یاد آتی ہے کہ شروع میں سب جانداروں کی عمریں برابر یعنی تیس تیس سال مقرر ہوئی تھیں۔ گدھے نے کہا: جناب مجھے اتنی عمر نہیں چاہیئے کیوں کہ میری زندگی تو بوجھ ڈھونا اور چابک کھاتا ہے۔ انسان ٹھہرا لالچی۔ فوراً بولا کہ حضور اس کے دس بیس سال کاٹ کے میری عمر میں جوڑ دیجئے۔ مہربانی ہوگی۔ قسام ازل نے یہ مان لیا اور انسان کی زندگی کا آخری حصہ اصل میں گدھے کی جون ہوتی ہے۔ سنا تو یہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

## آپ کی ہابی کیا ہے؟

ہر انسان کی کوئی نہ کوئی ہابی یا مشغلہ ہوتا ہے کوئی ٹکٹ جمع کرتا ہے، کوئی پرانے سکے۔ کسی کو شطرنج کا شوق ہے۔ کوئی تتلیاں پکڑتا ہے۔ ہابی کی تعریف ایک طرح سے یہ ہوئی کہ بیکار مباش کچھ کیا کر۔ ہمارے دوست مولانا ملتع المعلیٰ دہلوی امام غزالی کی احیاء العلوم پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ لیکن دل بہلاوے کے لئے شطرنج کھیلتے رہیں۔ ان کے مقابلے میں ہمارے دوسرے دوست خانصاحب خوشباش خاں صاحب ہیں کہ پیشہ ور شطرنج باز ہیں۔ بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں اور اس سے خاصا کماتے رہیں۔ لیکن مشغلے کے طور پر وہ امام غزالی کو پڑھتے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ نہ مولانا ملتع المعلیٰ کی ریسرچ منڈھے چڑھی نہ خانصاحب کی شطرنج کا عالمی چمپین بننے کی آرزو پوری ہوئی جناب حفیظ جالندھری نے شاید اسی موقع کے لئے کہا ہے۔

ناکامیٔ عشق یا کامیابی
دونوں کا حاصل خانہ خرابی

. . . . . . .

اس سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کام وہ چیز ہے جسے کرنے کو جی نہ چاہے اور ہابی وہ جسے کرنے میں لطف محسوس ہو۔ ورنہ ہم جو کتابوں کی کمائی کھاتے ہیں۔ باغیچے میں گھاس کھودنے میں لذت کیوں محسوس کریں اور ادھر ہمارا مالی یہ کیوں کرے کہ جب اس کی نگاہ چوکی اس نے ابن صفی کا ناول پہلا اسرار مجبوبہ اٹھا لیا۔ لیکن یہ ہابیاں بے ضرر بھی ہیں اور بے فائدہ بھی۔ ہم سے سیٹھ اللہ رکھا بوتلوں والے اچھے ہیں جو ہمارے پڑوسی ہیں۔ ہمارے بھتیجے کو انھوں نے دیکھا کہ پرانے سکے جمع کرتا ہے مغلوں کے عہد کے۔ بولے بیٹے یہ تم نے جمع بھی کر لئے تو بازار میں انہیں کون پوچھے گا۔ نہ بنیا لے گا نہ دودھ والا۔ مجھے دیکھو میں بھی سکے جمع کرتا ہوں لیکن سکہ رائج الوقت کبھی دکان پہ آؤ تو اپنا سو سو روپیہ کے نوٹوں کا ذخیرہ تمہیں دکھاؤں۔

. . . . . . . .

لندن سے خبر آئی ہے کہ وہاں ایک پادری ہیں فادر آرنلڈ ہیمبر ڈومینکن نامی۔ کام تو ان کا وہی ہے جو واعظوں اور پادریوں کا ہوتا ہے۔ یعنی محراب و منبر پر جلوہ کرنا لیکن ہابی ان کی ہے تالے توڑنا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ کوئی تالا ایسا نہیں جسے وہ نہ کھول سکیں معلوم ہوا ہے کہ وہ جلد ہی اپنے اس فن کا مظاہرہ کرنے والے ہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کی بدنصیبی ہے کہ جو چیز ترقی یافتہ ملکوں میں ہابی یا شغل کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے کسب کمال پہ لوگ عزیز جہاں ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بعض لوگوں کے نزدیک ناقابل دعظا بلکہ بعض اوقات جرم ٹھہرتی ہے۔ اب اسی تالے توڑنے کی بات کو لیجئے۔ ہمارے ہاں استاد ننھے خاں بمبئی والے جو کچھ دنوں ایک مسجد میں امامت بھی کرتے رہے۔ اس فن کے امام سمجھے جاتے تھے۔ معمولی تالے کیا تجوریاں اور سیف تک ان کے ہاتھ لگاتے ہی کھل جاتے تھے لیکن نام و نمود

کا ان کو شوق نہ تھا لہذا بالعموم اس فن کا ریاض وہ رات کی تنہائی میں کرتے تھے اور تنہا۔ بجائے اس کے کہ ان کو کوئی تمغہ یا انعام وغیرہ ملتا پولس نے نہ صرف ان کے مظاہرے میں مداخلت کی بلکہ پکڑ کر بھی لے گئی اور اب کئی مہینوں سے وہ جیل میں ہیں یہ سطور ان کے وکیل کی نظر سے گزریں تو ایک بار پھر پادری ڈیبنکن کی نظیر دے کر اپیل کر دیکھیں۔ لوگوں کے روایتی تعصب کو دیکھتے ہوئے کامیابی کا امکان زیادہ نہیں لیکن کوشش میں کیا ہرج ہے۔

بعض اور ہابیاں ہیں جن پر ہمارے ہاں قدغن ہے۔ برکت اللہ بریلوی کا نام ہمارے قارئین نے سنا ہوگا ایسا صاحب کمال اور بابرکت نقب زن تھا کہ دیوار پر جہاں ہاتھ رکھا خود بخود چھید ہو جاتا اور جس گھر میں اس کا قدم پہنچتا صبح جھاڑو پھری ہوئی ملتی۔ کئی بار پولیس اور ظالم سماج کو ان کی اس ہابی پر اعتراض ہوا بلکہ دار و رسن اور حجرۂ زنداں کی آزمائش سے بھی گزرے لیکن۔

بڑھتا ہے یہاں ذوق گنہ ہر سزا کے بعد

اس شوق کو ترک کرنا منظور نہ ہوا۔ پچھلے دنوں جیل ہی میں ان کا انتقال ہوا چھجو خاں کلکتوی دفع الوقتی اور جی بہلاوے کے طور پر جیب تراشی کرتے تھے۔ ہجوم میں جدھر سے گزر جاتے کہرام مچ جاتا۔ ہمارا خیال تھا کہ اس فن عزیز میں ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے جو اب زوال پذیر ہے۔ گھریلو دستکاریوں کی کارپوریشن ان کے تحت کوئی تربیت گاہ وغیرہ قائم کرے گی لیکن معلوم ہوا پچھلے دنوں ان کو بھی پکڑ لیا گیا۔ حکومت اپنی مصلحتیں خود بہتر جانتی ہے۔ ممکن ہے اس کے پاس اس دار و گیر کا بھی کوئی جواز ہو لیکن اتنا کہے بنا ہم نہیں رہ سکتے کہ یہ پالیسی اہل حرفہ کی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ کیا ہمارے ہاں تالے توڑنے والے باکمالوں کی کمی ہے۔ ہمارے ناظم آباد ہی سے بیسیوں مل جائیں گے۔ کیوں نہیں ان کو ان پادری صاحب کے مقابلے کے لئے ولایت بھیجا جاتا؟ ہماری باتوں کو ارباب اقتدار نے اب کے بھی ہنسی میں اڑا دیا۔ تو ہمیں افسوس ہوگا۔

قیصر تمکین

# تو؟

میرے رقیب!

آج کی رات اندھیری ہے۔ کالی ہے۔ ٹھنڈی ہے۔ اکیلی ہے۔

سات سمندر پار سے تم کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔

میں دیس بدیس گھوما ہوں — نگر۔ نگر — پھرتا ہوں۔ گلیوں۔ گلیوں روتا ہوں۔ ہپی جو کے پب میں بیٹھا دن رات شرابیں پیتا ہوں۔

یہ خط اس لئے لکھ رہا ہوں کہ بہار آگئی ہے۔ چاروں طرف چڑیوں کی چہکار ہے۔ پھولوں کی بھرمار ہے اور کل زناٹے دار پچھوا ہوا نے میرے کان میں کچھ کہا تھا۔ میں نے ان غیر حقیقی اور ان بے معنی سرگوشیوں پر کبھی دھیان نہیں دیا۔ پر آج میں وہ سب تم سے کہہ رہا ہوں۔

اگر وہ کبھی تمہارے پاس آئے۔
تو خیال رکھنا کہ وہ شبنم سے زیادہ خنک ہے۔
اگر وہ تمہاری طرف دیکھ کر مسکرائے تو
یہ نہ بھولنا کہ وہ جوہی سے زیادہ نازک اور بیلے سے زیادہ بھینی بھینی ہے۔
اگر وہ تمہاری نظروں سے شرمائے تو
یقین کرنا کہ وہ ماہتابی شعاعوں سے جھکی ہوئی ہے۔
اگر وہ تمہارے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دے تو
یہ دھیان رکھنا کہ وہ سورج کی پہلی کرن سے زیادہ حیات بخش ہے۔

اس کا سونے کا بدن، چاندی کا سا جھلمل کرتا چہرہ، اس کی آنکھوں کے نیلم، اس کے ماتھے کی شبنم، اس کے ہونٹوں کی شراب اور اس کے گالوں کے گلاب جب تمہارے لئے ہوں۔ جب اُس کے بالوں کی خوشبو، ہاتھوں کی حنا اور چوڑیوں کی جھنکار تم تک پہونچ چکی ہو تو یہ نہ بھولنا کہ یہ حسن، یہ خوب صورتی تمہاری زندگی کے سارے تانے کو نقش اور جڑاؤ بنا سکتی ہے۔

اور جب تم اس حور سے ملنا، اس پری کو اپنانا اور اس اپسرا کے ساتھ اپنے لیے راس رسنا تو یہ یاد کرنا کہ۔

پروین کے دروازے پر جاکر کسی کی موت کی جھوٹی خبر سننے والا اور تیشہ مار کر خودکشی کرنے والا وہ کالا منحوس، سیاہی سے پُتا ہوا "میں" اب بھی تیزابی چشموں میں غوطے کھانے پر مجبور ہے، اور ان چشموں کے نگہبان ہزار منہ والے اژدہے بھوک قحط اور وباؤں کی شکل میں ہر ممکن امداد کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔

اور جب تم اس کے ہونٹوں کی شراب کشید کرنا تو یہ نہ بھولنا کہ "میں" "چیرنگ کراس اسٹیشن پر گٹار بجا رہا ہے۔ برف پڑ چکی ہے اور ہوا میں برچھیوں کی دھاروں کی سی تیزی اور تلواروں کی سی کاٹ ہے، پر "میں" واٹرلو کے ردی کے ٹوکروں میں سینڈوچ کے ٹکڑے تلاش کر رہا ہے۔

اور جب وہ تم سے نسیم سحری کی سی مدھرتا کے ساتھ کچھ سرگوشی کرے گی تو تم تصور کرنا کہ "میں" وینس کی گلیوں کے موڑ پر کھڑا ہوا ہر خوب صورت و حسین چہرے کو مسرت سے تک رہا ہے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی بیاترچے اِدھر سے گذری ہے اور "میں" کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا ہے۔

جب وہ کسی ادائے خاص سے مسکرائے گی۔ انداز محبوبی سے محجوب ہوگی اور پراسرار و لطیف لذتوں کے ہزار در واقعوں والے خزانوں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے گی تو تم یاد کرنا کہ کچھ نامعلوم انجانی، ان دیکھی وادیوں اور پُراسرار گھاٹیوں میں کچھ راز دفن ہیں۔ جب پچھوا ہوا اِدھر سے گذرتی ہے تو ان تہہ در تہہ وادیوں سے کچھ چُراتے ہوئے رموز لے کر آتی ہے۔ کل میں نے ان کو سُنا اور بھلا دیا مگر آج میں ان رموز کی الجھنوں میں مقید ہوں۔ اور اسی لیے تم کو اس رات یہ خط لکھ رہا ہوں۔ یہ رات جو بہت اکیلی، بہت اداس، بہت ٹھنڈی اور بہت کالی ہے۔

وہ "میں" کے پاس بھی کبھی آئی تھی۔ تب مہوا پھولنے کا موسم تھا اور میں ندی کنارے بیٹھا ریتیلی زمین پر بے مقصد نقش و نگار بنائے چلا جا رہا تھا۔

وہ چل پری تھی، کچے ریشم کی سادی سی ساری اس کے بدن سے چپکی ہوئی تھی اور کولہوں پر سے مسک گئی تھی۔ میں نے اس کو دیکھا اور مسحور ہو کر دیکھتا رہا ــــ وہ جا چکی تھی

میں نے کنارے کی ریت پر اس کا نام لکھ دیا۔ ہوا زور سے چلی اور وہ نام مٹ گیا۔ میں نے پھر ایک بار احتیاط سے کام لے کر وہی نام لکھا، اور اس بار کچھ مضطرب موجوں نے ساحل سے سر ٹکرا کر ان نقوش کو بھی مٹا دیا۔ اور میں نے کسی عالم خود فراموشی میں یہ تہیّہ کیا کہ وہ سات آسمانوں، سات قرنوں اور زمانوں اور سات سمندروں پر اس کے حسن صورت کے نادر قصائد لکھے گا۔

"میں" نے عالم بے خودی میں یہ قسم کھائی تھی اور ایک جلتے، تپتے، ریتیلے جہنم زار کی طرف قدم بڑھائے تھے، اور آج اس عہد اور اس قسم کا شراپ اس کو تیروں کی چتا پر کروٹیں بدلنے پر مجبور کر رہا ہے۔ ہزاروں برس سے وہ دہکتے ہوئے انگاروں پر چلتا آیا ہے۔ ان گنت صدیوں سے وہ عرفان و آگہی کی صلیب پر لٹک رہا ہے۔

آج کی رات جب میں تم کو یہ خط لکھ رہا ہوں تو "میں" بیبی جو کے پب میں بیٹھا پیانو پر پرانی اور فرسودہ دُھنیں بجائے چلا جا رہا ہے۔ وہ جب تھک جاتا ہے تو فلوسی کے سامنے جا کر اپنا گلاس سنبھال کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ فلوسی اس کو ہر ممکن

حد تک نظر انداز کرتی ہے۔ پھر جب ہیپی جو کے پب میں چیختی ہوئی موسیقی کی کمی محسوس کی جاتی ہے تو فلوسی "ہیں" کے گلاس میں ڈبل ڈائمنڈ کا آدھا پائنٹ انڈیل دیتی ہے اور زیر لب کچھ بڑبڑاتی ہے۔ "ہیں" بہرہ ہے، اس کے کانوں میں بیٹری کی مدد سے چلنے والا آلۂ سماعت جو وقت لگا رہتا ہے وہ بھی فلوسی کی بڑبڑاہٹ سننے میں اس کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔ وہ ایک بے نیاز اور زندگی و جذبات سے عاری طائرانہ نظر پب کے چاروں طرف ڈالتا ہے اور پھر اپنا سگرٹ کیس نکالتا ہے۔

یہ سگرٹ کیس ایک پرانا سگار کا ڈبہ ہے جس میں فلوسی ہر رات گاہکوں کے آدھے جلے سگرٹ احتیاط سے جمع کرتی ہے اور دوسرے دن شام کو "ہیں" کے سپرد کر دیتی ہے۔

"ہیں" سگرٹوں کے ٹکڑے پیتا ہے۔ ڈبل ڈائمنڈ کے گلاس غٹا غٹ کر کے چڑھاتا ہے اور گیارہ بجے تک برابر پیانو بجاتا رہتا ہے اور جب وہ چھڑی ٹیکتا ہوا دھیرے دھیرے باہر نکلتا ہے تو اس کی انگلیاں درد سے اکڑ چکی ہوتی ہیں۔

"ہیں" بے حس ہے (یہ کہا جاتا ہے) "ہیں" سماعت سے بے بہرہ ہے (یہ حقیقت ہے) وہ غیرت و حمیت سے عاری ہے (یہ سنا جاتا ہے)، پر "ہیں" کے بارے میں ہزاروں سال سے یہی کہا جاتا اور سنا جاتا رہا ہے اور "ہیں" ستائش اور صلے سے بے نیاز و بے پروا ہزاروں سال سے ارغنوں بجاتا رہا ہے۔ وہ آج ہیپی جو کے پب میں بیٹھا اپنی دھن میں پیانو بجائے چلا جا رہا ہے۔ اور آنے والی نجانے کتنی صدیوں تک اور سازوں کے پردے چھیڑتا اور نغمے بکھیرتا رہے گا۔

میرے رقیب۔

وہ جب تمہارے پاس آئے تو یہ دھیان رکھنا کہ جب ایک پہر رات جاتی ہے تو وہ دھیمی دھیمی سریلی موسیقی سے مدہوش ہو کر نیند کی آغوش میں سرک جاتی ہے۔ اور آج کی رات بھی جب تم اسٹال ڈورالٹی اور ڈینیل بیرن بوئم کے ہاتھوں کی لرزشوں سے جاگ اٹھنے والے سازوں کی تہہ سے شوپاں، چیکاوسکی، موزارٹ یا ہینڈل کی بانیاں سننا تو ان سب کے نام پر سگرٹوں کے ٹکڑے جمع کرنا نہ بھولنا۔

آج کی رات کتنی ٹھہری ہوئی، ساکن اور کتنی گمبھیر ہے۔

میرے رقیب!

وہ جب تمہارے خواب پرور نیلگوں روشنیوں والے شبستاں میں غنودگی کے عالم میں سرشار ہو تو زمین سے آسمان تک ساری فضا مسکت ہو چکی ہوگی۔ ستارے شرم سے مدھم پڑ چکے ہوں گے پر تم یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ لندن پیرس، روم اور قاہرہ کے شاد و آباد طرب زاروں، زندگی بردوش سے خانوں اور ہمہ نغمہ و ہمہ موسیقی شبستانوں میں گھومتے ہوئے بھی "ہیں" ۔۔ تمہارا انجانا ۔۔ ان دیکھا رقیب بھوک کی تلملاہٹ کا شکار رہے۔ اس کی جوانی پر افلاس کے سنگین پہرے ہیں۔ فاقوں کے عفریت آج بھی اس کی راہوں میں حائل اور ہر آنے والے دن کا ایک نیا استفہامیہ کسی ہولناک اسفنکس کی طرح آج بھی اس کے راستوں میں غرا رہا ہے۔

میرے رقیب۔

ہر حسن اضافی ہے۔ ہر زمین و آسمان سراب ہے۔ ہر حیات و کائنات مستعار ہے ۔۔ صرف بھوک ابدی ہے ۔۔

مثبت ہے — یہ ہمیشہ سے زندہ ہے — آج بھی پورے طنطنے کے ساتھ بیدار ہے۔ بھوک! جو بدن کی ایک ایک رگ میں کالے کے زہر کی طرح تیرتی ہے۔ وہ بھوک جب پیٹ میں کلنٹے دار جھاڑیاں سی اُگتی معلوم ہوتی ہیں۔ جب کمزوری سے قدم رُکتے ہیں۔ جب آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی اڑتی معلوم ہوتی ہیں۔ جب سارے منظر پر گہری اُداسی سی پھیلی معلوم ہوتی ہے۔ وہی بھوک، مثبت ہے۔ ازلی ہے، ابدی ہے۔ "میں" ہمیشہ اسی کے ہاتھوں مار کھاتا آیا ہے۔

"میں" کہتا ہے:

مفلسی جوہر ذاتی کو مٹا دیتی ہے
حسنِ اخلاق پہ ہوتا ہے تملق کا گماں

میرے رقیب —!

وہ جب تمہارے پاس محوِ خواب ہوگی۔ اور پچھلی رات کو مہک اٹھنے والی رات کی رانی کی خوشبو باسی باسی سی معلوم ہونے لگے گی تو تم اس عروس نیم شبی کو گلاب کے کٹوروں میں شبنم پلانا اور یاد کرنا کہ ٹھنڈک اور پالے میں سکڑتا ہوا، سہما ہوا، کوئی "میں" آج بھی ننگے پاؤں اسکول جانے والا ہوگا۔ وہی آنا کے بھرے بازاروں سے گذرتا ہوا —!

اور ہاں۔ تمہارے نزدیک ہی۔ بالکل پڑوس میں۔ کسی گل شاہ چھجڑا کے کسی سیلے، ٹھنڈے اور مقبروں جیسی مردہ بو سے بسے ہوئے کمرے میں کوئی "میں" آج بھی پھٹے پرانے لحاف میں لپٹا ہوا کانپ رہا ہوگا۔

میرے رقیب!

وہ جب تمہاری زندگی کے راستوں پر پھول بکھراتی ہوئی آئے تو اسے واپس جانے سے پہلے رات کے جادو میں اسیر رکھنا۔ اس کو صبح کا خیال بھی نہ آنے دینا۔ کیونکہ تم نہیں جانتے ہو کہ کوئی "میں" کہیں تڑپ اٹھے، کہیں بھڑک اٹھے، کہیں جل کر مر مٹنے کے انتظار میں کروٹیں بدلتا رہتا ہے!

میرے رقیب۔

جب صبح ہوگی۔ سارے جادو ٹوٹ چکے ہوں گے تو یہ نہ بھولنا کہ سیل ہوئی ڈبیا کے اندر بند دیا سلائی کی تیلی کبھی کبھی گرمی پاکر بھڑک بھی اٹھتی ہے۔

اگر کہیں ایسا ہوا تو — ؟

([illegible])

## بجھتے دیئے

(بقیہ صفحہ [illegible])

اس نے گھڑی دیکھی اور جلدی جلدی اپنا سامان درست کرنے لگا۔ خالہ دروازے میں کھڑی اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں اس کے شانے کچھ اور جھک گئے تھے۔ وہ دھیمے دھیمے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ آج رک جاؤ بیٹا کل عفت کی سالگرہ کا دن ہے۔ لیکن وہ سوٹ کیس بند کرتے ہوئے بولا۔ مجھے بہت ضروری کام ہے خالہ۔ ایک ہفتے کے اندر مجھے بیروت جانا ہے۔ میں سارے کام چھوڑ کر آگیا تھا، لیکن۔۔ اس نے بات کو ادھورا چھوڑ دیا۔ اور اس کی خالہ کی آنکھوں میں جلتا ہوا امید کا دیا جیسے ایک جھونکے میں بجھ گیا —!!

مریم حسین

# بجھتے دیئے

جانے کیوں اسے محلسی زندگی سے نفرت تھی' اسے اپنے کمرے کا نیم تاریک گوشہ بڑا ہی بھلا لگتا۔ جہاں صبح کو دھوپ کی بھولی بھٹکی کرنیں ذرا دیر آنکھ مچولی کھیل کر غائب ہو جاتیں۔ اور پھر بڑھتے ہوئے دن کے ساتھ اس کے کمرے میں کچھ عجیب سی ملگجی روشنی پھیلی سمٹتی رہتی' اور ٹیبل پر رکھے ہوئے منقش پیالے میں سورج مکھی کا اکیلا پھول چپ چاپ ہواؤں میں ڈولتا رہتا۔ اکثر اس کا جی چاہتا کہ کاش وہ ایک دم سے شاخ پر جھومتے ہوئے سورج مکھی کے پھول میں تبدیل ہو جائے۔" اسے بچپن میں سنی ہوئی سورج مکھی کی وہ کہانی یاد آئی۔ اسے کسی نے بتایا تھا سورج مکھی کا پھول ایک سندر راج کماری کا بدلا روپ ہے۔ وہ اپنے زرد ہاتھوں کو غور سے دیکھتی' جیسے وہ اس کے ہاتھ نہیں پھولوں کے ڈنٹھل ہوں۔ گھر میں لے دے کے تین ہی آدمی تھے۔ امّی ابا اور وہ' لیکن کالج کی چھٹیوں میں جب اس کی دونوں کزنز' شہلا آپی اور عالیہ باجی چچا ابا کے یہاں آگئیں' تو جیسے اس کے سکون اور قناعت کی دنیا میں زلزلہ آگیا۔ عالیہ باجی کا گلابی چہرہ' اور سنہرے بال' اور شہلا آپی کی سفید رنگت اس پر سیاہ بالوں کی تو بہ شکن گھٹائیں عجیب رومانٹک سی فضا بن جاتی' جب اس کی یہ دونوں مہ وش کزنز شام کے بہترین لباس میں' اس کے کمرے کے قریب سے ہو کر گزرتیں' شنیل نمبر فائیو کی بہتا ثیر مہک اور شیمپو کئے ہوئے بالوں میں ٹکے ہوئے دہکتے گلاب' اسے یہ سب کچھ ذرا بھی تو اچھا نہیں لگتا' پھر ادھر عالیہ باجی اور شہلا آپی آئیں اور ادھر ان کے سارے رشتے کے بھائی جو سال بھر انڈر گراؤنڈ رہنے کے بعد جانے کن کونے کھدروں سے نکل آتے' جیسے مصری کی ڈلیوں پر مکھیاں پل پڑتی ہیں۔ چمکتے ہوئے جوتے' برش کئے ہوئے بال اور بہترین سوٹ میں اکڑتے ہوئے امجد بھائی' اور رومانی عاشقوں کی طرح' سوکھا مارا چہرہ بنائے' اور پریشان بالوں والے مظفر۔ اپنا اپنا اسٹائل ہے بھئی۔ حد سے زیادہ سلیقہ بھی تو نگاہوں میں کھٹکتا ہے۔ بڑی قیامت کی محفلیں جمتیں' اس لئے وہ شام کی چائے بھی اپنے کمرہ میں ہی منگوا لیتی۔ اس کی ان ہی حرکتوں پر امی کا پارہ چڑھ جاتا' عجیب گھر گھسنی لڑکی ہے۔ جانے دنیا میں اس کا گزر کیوں کر ہو گا۔ وہ اس پھٹکار سے تنگ آ کر جب بھی اس زندہ دل گروپ میں شامل ہونا چاہتی تو برآمدے سے ہو کر لان کی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے' اس کی نظریں اپنے ملگجے لباس پر پڑتیں' اور پھر لاشعوری طور پر اپنے بالوں کو سمیٹنے لگ جاتی۔ اسے یاد آتا کہ نہ تو اسے کنگھی کرنے کی توفیق ہوئی ہے نہ اس نے کپڑے ہی بدلے ہیں۔ ایک تو معمولی سی شکل پھر لباس کی یہ سج دھج اسے بڑے زور کی ہنسی آتی — عالیہ باجی اور شہلا آپی کے سامنے تو وہ ٹھیک یوں لگے گی جیسے خوشنما محل کے سامنے کوئی جھونپڑا

سایہ وضع مٹی کا گھر دندا ہو' شکر ہے سمجھ آگئی۔ اور وہ تیز تیز چلتی اپنے کمرے میں واپس آجاتی۔ کمرے کی دھندلی روشنی میں اس کے لباس اور بالوں کا سارا عیب چھپ جاتا اور تب اس کی سمجھ میں آتا کہ وہ کیوں روشنی پہ اندھیرے کو ترجیح دیتی ہے' اور پھر اسی اندھیرے میں ایک اسرار کی کیفیت بھی تو ہے'۔ اندھیرے غاروں اور گپھاؤں میں بڑے بڑے سادھوؤں اور اللہ والے لوگوں نے حقیقت کی تلاش و جستجو کی ہے۔ اور اسی اندھیرے نے تو اسے بھی پناہ دی ہے' اور اس وقت تو واقعی اس کا دل چاہتا کہ چپ چاپ کسی اندھیرے غار میں اتر جائے۔ جب امی سر پہ ہاتھ مار کر کہتیں۔ خدا جانے کس گھڑی میں اس لڑکی نے جنم لیا تھا۔ ساری دنیا سے بیزار۔ بس خود میں گم' عالیہ اور شہلا بھی تو ہیں' دیکھنے والوں کا دل ٹھنڈا ہوتا ہے' اور ایک یہ صاحبزادی ہیں قسمت کا کھیل ہے۔ بھئی' جیسا باپ ویسی بیٹی' باپ نے کون سا سکھ دے دیا۔ ساری زندگی سیاست کرتے رہے" لاکھوں کی جائداد کو مٹا دیا" ہر وقت مفت خوروں کا مجمع رہتا تھا۔ کسی کو تعلیمی وظیفے دیئے۔ کسی کا جہیز بنوایا' امدادی کاموں میں جی جان مٹائے ہوئے ہیں۔ پاکستان بنا تو ساری قوم پرستی دھری رہ گئی' جسم کے کپڑوں سے ملک چھوڑنا پڑا" وہاں قوم پرست تھے' یہاں ایماندار ہیں' خاک کے لوگ یہاں آنکھوں کے سامنے لاکھ کے ہو گئے' مگر یہاں تو ایمان اوڑھنا ہے اور ایمان بچھونا۔ اسے کبھی اپنی جذباتی اور غصہ ور امی پہ بے انتہا ترس آتا۔ اور کبھی بے انتہا غصہ۔ وہ سوچتی' بیچاری امی کو راحت اور آرام کی زندگی کی کیسی حسرت ہے؟ اب تو گھر کا خرچ بھی مشکلوں سے چلتا ہے۔ بالائی آمدنی ہوتی کتنے ٹھاٹ سے زندگی گزرے۔ اور پھر وہ بھی ذرا سوشل ہو جائے تو اسکی امی جان کی کتنی فکریں کم ہوں۔ اباجی کے سامنے اکثر امی دبی زبان سے دکھڑا رو دیا کرتیں۔ اکثر اس نے امی کو کہتے سنا تھا۔ اب وہ زمانہ کہاں کہ ادھر لڑکی بڑی ہوئی' اُدھر پیغاموں کا تانتا بندھ گیا۔ اب تو وہ سب خواب کی باتیں ہیں۔ لڑکیاں خود اب اچھے لڑکوں کی تلاش میں رہتی ہیں۔ اور یہاں تو یہ حال ہے' روئے سخن اب اس کی طرف ہوتا۔ ملنے ملانے سے چڑ۔ کسی سے سیدھے منہ بولنا گناہ۔ بس ہر وقت کتابوں میں مگن' جانے کیا لکھا ہے ان موٹی موٹی کتابوں میں جسے پڑھ کر باپ کا دماغ بھی خراب ہوا اور بیٹی کا بھی۔ اور جب سلسلہ کلام یہاں تک پہونچتا' تو وہ ساری خود اعتمادی' اور ساری بلند آہنگی کے باوجود تکیہ میں منہ چھپا کر رو پڑتی' اور دل چاہتا کہ ان ڈھیر ساری کتابوں کو' جو تاریخ فلسفہ' سیاسیات ادب اور شاعری کے جواہر پارے ہیں' کسی اندھیری کوٹھری میں بھر کر موٹا سا قفل ڈال دے اور خود بازار میں بکنے والی رنگین گڑیا کی طرح سج سجا کر' عالیہ باجی کی قوم میں شامل ہو جائے۔ کیا فرق پڑتا ہے آخر' ذہن اور روح کی باتیں سب ڈھکوسلہ ہیں۔ وہ بھی گہرے میک اپ میں خود کو چھپائے نوجوانوں سے ملا کرے گی" اور اس کے سرسراتے ہوئے ریشمی لباس اور اڑتی ہوئی زلفوں کی مہک چاروں اور پھیل جائے گی۔ پھر کیا ہوگا۔ پھر کیا ہوگا۔ اس نے کمینگی سے سوچنا چاہا۔ امی کا دکھ تو ہلکا ہو جائے گا۔ بھلا کس کام کی وہ اولاد جو کلیجے کی پھانس بن جائے۔ سیدھے سجاد اگر آدمی ہے۔ اور ضمیر کو اگر مارفیا کا ایک انجکشن دے دیا جائے تو ہر چیز کی صورت نکل سکتی ہے۔ لمبی کاریں' بھڑکیلے لباس' چمکتے ہوئے زیورات' کلب اور جیم خانے کی رنگین شامیں ـــــــ!!

وہ بہار کی ایک چمکیلی شام تھی' آسمان کا رنگ کہیں گہرا اودا اور کہیں گہرا گلابی ہو رہا تھا۔ درختوں پہ بے تحاشہ کوئل بول رہی تھی اس کے درد بھرے نغمے میں بلا کا حزن تھا' وہ دریچے میں سر دیئے باہر کے منظر میں ڈوبی ہوئی تھی جیسے وہ خود بھی اسی منظر کا ایک جزو ہو۔ کھانے کے کمرہ کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ اور تب اسے یاد آیا کہ اسے کھانے میں شریک ہونا ہے۔ لیکن امجد بھائی اور ان کے بنے سنورے دوست اگر ہوئے تو' پھر بھی وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کھانے کے کمرے تک آئی۔ سب کھانا ختم کر کے جا چکے تھے۔ صرف اس کی امی

میز کے آخری سرے پر بیٹھی ہوئی نظر آئیں ۔ اس نے کچھ کہے بغیر کھانا شروع کر دیا ۔ کتنا مزیدار سالن ہے ۔ اور چاول سے کیسی اشتہا انگیز خوشبو آرہی ہے ۔ یہ تو صرف اس لئے ہے کہ اس کی امی سامنے بیٹھی ہیں ۔ اور وہ وہاں تنہا ہے ۔ مصنوعی سنبل اور پریشان کن خوشبوؤں کا بادل چھٹ چکا ہے ۔ کھانا کھا کر جب وہ امی کے پاندان سے الائچی لینے جھکی تو اسے لگا کہ آج امی کے چہرے پر تفکر اور چڑچڑے پن کی سلوٹیں کم ہیں ۔

اسے دیکھ کر امی نے کہا عفت ، میں تم سے ابھی کہے دیتی ہوں ۔ کل منجھلے بھائی کا لڑکا عامر یہاں آرہا ہے ۔ اب تک تو تم نے من مانی کی لیکن اس سے ذرا انسانیت سے مل لینا ۔ وہ آپ ہی آپ فکر مند ہو گئیں ۔ بیچاری امی ، یہ کیسی پڑی میرے اللہ انکار نئی ! اوّل تو عالیہ باجی اور رشیلا آپی کے چمکتے ہوئے حسن اور منجھی ہوئی اداؤں کے سامنے وہ ابھرنے سے رہی ۔ دوسرے عامر فارن سروس کے مقابلے میں منتخب ہو چکا تھا ، اور اس نے سن رکھا تھا کہ فارن سروس والے ذرا سوشل لڑکیاں پسند کرتے ہیں ۔ اور وہ تو آنتی دبو گھسو ہے ۔ اس لئے فکر کی کوئی بات نہیں ۔ لیکن جانے کیوں امی کا پریشان اور مستقل فکر مند چہرہ بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے آتا رہا ۔ کھڑکی پر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے ۔ لیکن دھوپ کی اکا دکا کرنیں پھر بھی پردے کی اوٹ سے سر نکالے جھانک رہی تھیں ۔ وہ کتابوں کو آس پاس پھیلائے یونہی بیٹھی رہی ۔ ہوا کے جھونکوں سے ورق الٹتے رہے ۔ سامنے لگے ہوئے آئینے میں اسے اپنی صورت نظر آئی تو یوں لگا جیسے چنگاریوں پر راکھ پڑی ہوئی ہو ۔ ململ کا دوپٹہ ، ننگی کلائیاں اور بجھی بجھی آنکھیں وہ خود کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز مدت کے بعد نظر پڑی ہو ۔ اچھا تو یہ میں ہوں ۔ میں یعنی فساد کی جڑ ۔ جو کبھی سورج مکھی کے پھول کی شکل لینا چاہتی ہوں اور کبھی تاروں بھرے آسمان کو دیکھ کر سوچتی ہوں کہ کاش میں ان میں سے ایک ہوتی ۔ لیکن دراصل منزل تو یہ تھی کہ امی کی لتاڑ سننے کے بعد سارے آورش اور آئیڈیل ریت کے ذروں کی طرح منتشر ہو جاتے ہیں اور چوری چوری یہ سوچا جاتا ہے کہ کیا حرج ہے اگر عامر رضا کے لئے ذرا نوک پلک سنوار لئے جائیں ؟ لعنت ہے ! اس نے آئینہ میں جیسے خود سے کہا ۔ ابا بیچارے تو قید فرنگ سے بھی نہ ڈرے ۔ اصولوں کے آگے دولت اور شہرت کو کبھی اہمیت نہ دی اور وہ جو ابا کی پیاری بیٹی ہے بھلا اس طرح زندگی سے ہار مان لے ناممکن !! ایسے ہزاروں عامر رضا آجائیں ، جب بھی نہیں ، اس نے پوری خود اعتمادی سے گردن کو جھٹکا دیا ۔ اور تیزی سے لکھائی میں جٹ گئی ۔

ادھر چند دنوں سے وہ اعصابی جنگ لڑتے ہوئے بے حد تھک چکی تھی ، لیکن اس سمے وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی لکھنے کا موڈ بھی بن گیا تھا ۔ اس لئے وہ لکھتی رہی ۔ دوپہر ڈھل گئی ۔ سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے لیکن وہ اپنے نیم تاریک کمرے میں ہتھیلیوں پر چہرہ لٹکائے بس لکھے جا رہی تھی ۔ کھٹ سے کسی نے کمرے کی روشنی جلا دی ۔ عفت نے ناگواری سے پیچھے مڑ کر دیکھا ۔ ایک اجنبی نوجوان اسکے قریب کھڑا تھا آنے والے نے ایک بار بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لیا ۔ کتابوں پر گہری نگاہیں پھینکیں ۔ اور ایک لمبا سا سانس لے کر بولا ۔ کیا آپ کے شہر کا یہی دستور ہے کہ آنے والوں کو خوش آمدید بھی نہیں کہتے ۔ وہ اس دلیرانہ سوال پہ سچ مچ بوکھلا گئی اور اسے محسوس ہوا کہ صفحے کے صفحے سیاہ کر دینا تو آسان ہے ۔ لیکن جب کوئی تنہائیوں میں آکر کچھ پوچھے تو جواب دینا اتنا آسان نہیں ہوتا ۔ آنے والے کو اپنے جواب کی کوئی پرواہ بھی نہ تھی ۔ وہ اطمینان سے آگے بڑھ کر کتابوں کو الٹ پلٹ رہا تھا ۔ ادبیات ، تاریخ ، شاعری ، خوب پڑھا کرتی ہیں ۔ خاصا بلند ادبی ذوق ہے آپ کا ۔ وہ اس کے ناول کے سیلکشن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ۔ عفت ہونٹوں سے قلم لگائے اسے خاموش نظروں سے تک رہی تھی ۔ شام ڈھلے بھی آپ پڑھا

کرتی ہیں اتنے اندھیرے میں ۔ لیکن آنکھوں کے لئے اتنی کم روشنی مضر ہے ۔ کمال ہے بھئی! اس نے جھک کر اسے غور سے دیکھا اور آپ کی آنکھوں پر چشمہ بھی نہیں وہ بے تحاشہ بولے جا رہا تھا۔ عفت کی حیرت ناگواری سے بدلتی جا رہی تھی۔ آپ کا نام تو مجھے معلوم ہے، عفت ہے نا۔ اب آپ بتائیں میرا نام! اور عفت جو اس ڈھٹائی پر اندر ہی اندر کھول رہی تھی اس عجیب تعارف پر ہنس پڑی۔ بھلا میں کیا جانوں؟ مجھے الہام تو نہیں ہوتا۔ وہ قدرے رکھائی سے بولی۔ میں بتاؤں سنیئے گا۔ مجھے عامر کہتے ہیں یعنی عامر رضا۔ وہ ایک دم سے چونک پڑی۔ اچھا تو یہ عامر ہے۔ اسے امی کی ہدایات یاد آگئیں۔ تشریف رکھیئے۔ اس نے کچھ اخلاق برتنے کی کوشش کی۔ گھنٹے بھر سے تو کھڑا ہوں اور اب نام سننے کے بعد کرسی پیش کی جا رہی ہے، خیر کیا یاد کریں گی آپ بھی لیجئے، بیٹھ گیا۔ وہ اس کے مقابل کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ میں سہ پہر کو یہاں پہونچا ہوں، جب سے آپ کی دونوں کزن نے بور کرنا شروع کر دیا۔ اور اس اندھیرے کمرے میں پناہ لینے کی غرض سے جو داخل ہوا تو کسی نیک روح کی طرح سادے کپڑوں میں آپ نظر آئیں۔ عفت کی چمپئی رنگت میں شرم اور غصہ کی ہلکی سی سرخی جھلک اٹھی اور پھر سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ وہ کمال دلیری کے ساتھ اسے دیکھے جا رہا تھا، جیسے کتابوں کے ڈھیر میں گھری ہوئی اس عجیب و غریب لڑکی کا ذہنی تجزیہ کر رہا ہو۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ عفت کو اس بیجا مداخلت سے کوفت ہو رہی تھی۔ آخر وہ اسے ٹالنے کی غرض سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہاں چلیں آپ! وہ اسے جاتا دیکھ کر بولا۔ کیا آپ اس کمرے سے باہر بھی نکلا کرتی ہیں۔ اور وہ اس ڈھٹائی پر جلی جا رہی تھی۔ باہر جاتے ہوئے بولی معاف کیجئے گا۔ مجھے لوگوں کے سر پر سوار ہونے کا ذرا بھی شوق نہیں۔ برآمدے کے سرے پر وہ اپنی تیزی میں عالیہ باجی سے ٹکراتے بچی۔ عفت، حد ہے بھئی، جانے تم کس مٹی کی بنی ہو۔ چائے پر چچی اماں اور عامر تمہارا اتنا انتظار کرتے رہے۔ اور جب تم نہ آئیں تو چچی اماں نے تمہارے بارے میں عامر کو سب کچھ بتلا دیا۔ عامر بڑا ہینڈسم ہے۔ سچ اب تک میں جتنے لوگوں سے ملی ہوں ان سبھوں سے زیادہ گرینڈ، مہذب اور خوش شکل۔ جانے وہ کیا کیا کہے جا رہی تھیں عفت نے کسی ایک بات کا بھی جواب نہ دیا اور نہ یہ بتانے کی ضرورت سمجھی کہ وہ گرینڈ اور ہینڈسم آدمی کو کمرے میں تنہا چھوڑ آئی ہے۔ عالیہ باجی نے اس کی خالی خالی آنکھوں سے جل کر اپنی راہ لی۔ اور وہ برآمدے کی سیڑھیوں سے اتر کر پچھواڑے کی طرف نکل گئی جہاں چنبیلی کی جھاڑیوں میں لاتعداد جگنو چمک رہے تھے۔ اور خوشبو دار ہوائیں اسے چھو کر گزر رہی تھیں اس نے کچھ سوچنا چاہا بے ترتیب خیالوں کا سہارا لینا چاہا مگر دماغ تو جیسے سلیٹ کی طرح صاف ہو رہا تھا۔ رات کے کھانے کے وقت تک وہ یونہی ٹہلتی رہی۔ اس کے آس پاس چکر کاٹتے ہوئے جگنو چراغوں کی طرح پلکیں جھپکا رہے تھے۔ چند لمحے یونہی گزرے پھر اسے یوں لگا کہ کوئی اس کی طرف آ رہا تھا۔ تاریکی میں اسنے دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ عامر تھا، وہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور پھر جیسے اپنے آپ سے بولا۔ کتنی سہانی رات ہے، ٹھنڈی ہوائیں، جگنوؤں کی دمک، خاموش فضا! اس بے وقت کی شاعری پر وہ سلگ اٹھی، اور جی نہ چاہتے ہوئے بھی خشکی سے بولی۔ بھلا کیا سہانا پن ہے اس تاریکی میں۔ قدموں تلے چرچراتے ہوئے خشک گھاس میں۔ اور بھوتوں کی طرح سائیں سائیں کرتے ہوئے درختوں میں۔ مجھے تو یہ سب کچھ ذرا بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ میں اندر جانا چاہتی ہوں، اس کے قدم آگے بڑھے تو عامر بھی ساتھ ہو لیا وہ جانے کیوں اس بد دماغ لڑکی کے سحر میں جکڑا جا رہا تھا، چلئے کمرۂ نشست میں چلتے ہیں۔ وہاں سب ہیں، خالہ اماں، شہلا، عالیہ اور امجد بھائی وغیرہ۔ عامر صاحب، وہ کچھ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ مجھے رات گئے تک محفل آرائی کا بالکل شوق نہیں۔ آپ خوشی

سے جا سکتے ہیں ۔ اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر وہ اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی ۔ عامر نے ایک لمحے کے لئے اسکی طرف دیکھا تھا اور بس وہ یہ سمجھنا چاہتا تھا کہ آخر وہ ہے کیا ؟ لیکن وہ اتنی ٹھوس اور بے لچک تھی کہ اپنے ذہن پر زور ڈالنے کے باوجود وہ کچھ نہ سمجھ پایا ۔

رات گہری ہوتی جارہی تھی ' اس کا دل چاہا کہ وہ کل ہی یہاں سے چل دے ۔ بھلا یہاں کیا رکھا ہے ۔ تضیع اوقات کے سوا ۔ لیکن صبح ہوئی تو اسے یوں چلے جانا اتنا آسان نظر نہ آیا ۔ وہ مغرور اور بد دماغ لڑکی جیسے اس کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی ۔ عالیہ اور شہلا دونوں بری طرح اسے متوجہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں ۔ عفت کا دور دور پتہ نہ تھا ۔ اور اسکی خالہ کا رنگ جانے کیوں زرد ہوا جارہا تھا ۔ بڑی دیر کے بعد عامر نے تردت سے پوچھا " تو وہ بھاری آواز میں بولی ' عفت اپنے باپ کے ساتھ ناشتہ کرتی ہے ۔ صبح کی سیر کے لئے وہ ساتھ ہی جاتے ہیں ' اور سورج نکلنے سے پہلے باغ کی روشوں پر ٹہلتے ہوئے وہ ناشتہ ختم کر لیتے ہیں ' اور وہ گھٹی گھٹی آواز میں بتاتی رہی ۔ دل کا سارا دکھ آنکھوں میں اتر آیا تھا ۔ افوہ ! کس قدر ذہنی ہم آہنگی ہے دونوں باپ بیٹی میں اسے اپنی خالہ پر ترس سا آیا ۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ اس بد دماغ اور مغرور لڑکی کو اپنے ذہن سے بالکل ہی خارج کردے ۔ لیکن جب وہ میز سے یہ تہیہ کر کے اٹھا تو وہ بد دماغ اور مغرور لڑکی گردن اونچی کئے " باغ کی طرف سے اندر آتی نظر آئی ۔ اس وقت صبح کی ٹھنڈی ہوا سے اسکا رنگ اور بھی گہرا سنولا نظر آ رہا تھا ململ کے سفید دوپٹے میں وہ قطعی غیر جاذب نظر لگ رہی تھی ۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیا خاص بات تھی کہ وہ اپنی نظریں اس پر مرکوز کئے رہا ۔ یہاں تک کہ اسے اپنی خبر تک نہ رہی ۔ شہلا جو میز سے اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے آئی تھی ۔ ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے کمرے تک لے گئی ' اور ذرا دیر بعد وہ شہلا اور عالیہ کے ساتھ کچھ جارہا تھا ' جیسے ان کے سامنے اس نے عفت کو بالکل ہی اہمیت نہ دی ہو ۔ عفت نے دیکھا وہ کار کا دروازہ کھولے کھڑا تھا ۔ لیکن اس کے چہرے پر سخت جھلاہٹ کے آثار تھے ۔ وہ دھیرے دھیرے قدموں سے اندر آئی تو امی نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا ۔ وہ الماری کی چیزیں الٹ پلٹ کرتے ہوئے بڑبڑاتی رہیں ۔ عفت کو عجیب سا لگا جیسے سارے ماحول میں اس کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں ۔ اس نے دن بھر نہ کتابوں کو چھوا نہ کھانے کی ضرورت محسوس کی ۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام آگئی وہ کرسی پر پیر اٹھائے بیٹھی تھی ' کسی نے پیچھے سے اچانک اسکے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ۔ ایک گرم اور بھاری ہاتھ ۔ وہ مڑی تو عامر ہنس پڑا ۔ ڈر گئیں نا ! اسے لگا جیسے یہ ہنسی طنزیہ ہو ۔ اندر کتنی گرمی ہے ' حبس ہے ۔ چلئے باہر چلتے ہیں ۔ ڈرائیو پر ۔ اتنی پیاری شام ہے ۔ وہ تلخی سے مسکرائی ۔ عامر صاحب ! بہتر ہے آپ اس چکر میں نہ پڑیں ۔ یہ سب کیا ہے ؟ کیوں ہے ؟ یہ سمجھنا آپ کے بس کا نہیں ۔ یہاں خاموشی ہے ' گرمی ہے ' اندھیرا ہے ' لیکن اندھیرے کے عادی روشنی میں جاکر بصارت کھو دیتے ہیں ۔ اور گرمی کے عادی لوگوں کو ٹھنڈی ہوائیں راس نہیں آتیں ۔ عامر کی بھویں تن گئیں ۔ افوہ کس قدر بد دماغ ہے یہ لڑکی ۔ اور وہ اسے بیحد غیر اہم اور غیر معمولی لگی ۔ جانے کیوں وہ اس " لبرل " لڑکی سے اتنا مرعوب ہو گیا تھا ۔ انتہائی بے بسی کے عالم میں اسے وہ ساری ' نفیس ' خوبصورت ' اور خوش مزاج لڑکیاں یاد آئیں جو اس کی راہوں میں آنکھیں بچھایا کرتی تھیں ۔ اس اندھیرے کمرے میں اس کا دم گھٹنے لگا ۔ وہ زندگی اور زندہ دلی کی تلاش میں باہر نکل آیا ۔ اسے بہت ساری بھولی ہوئی باتیں یاد آئیں ۔ کل شام کلب میں ایک خاص پروگرام ہے ۔ اور پھر لبنیٰ کی سالگرہ بھی تو ہے ۔ جسٹس زاہد کی بے حد اسمارٹ اور گریس فل لڑکی لبنیٰ ۔ وہ اس دو دن میں سب کچھ بھول گیا تھا کہیں انجانی اور خار دار راہوں پر اس کے قدم چل پڑے تھے ۔ مگر شکر ہے عقل آگئی ۔ اسے کاظمی کی بات یاد آئی ' اس کا عقلمند دوست کہا کرتا تھا ۔ محبت تو ایک ڈھونگ ہے ۔ حماقت کی سب سے بڑی نشانی ! اس کا مقولہ تھا

Love is a misunderstanding between two fools.

(باقی صفحہ ۷۷ پر)

## فراق گورکھپوری

وہ سازِ لب کی سحر نوازی نہیں رہی
اب داستاں نما وہ خموشی نہیں رہی

تم کیا چھٹے کہ چھٹ گئے ہم اپنے آپ سے
اب اپنی زندگی بھی تو اپنی نہیں رہی

وہ شامِ انتظار کی بے تابیاں کہاں
شب ہائے غم میں بھی وہ درازی نہیں رہی

اب عشق میں وہ شوقِ شہادت نہیں رہا
اب تیغِ ناز میں بھی وہ تیزی نہیں رہی

اب تیری یاد سے بھی تو محروم ہو گئے
اب غم کی زندگی بھی ہماری نہیں رہی

اب عشق میں وہ ذوقِ نظارہ نہیں رہا
اب حسن میں وہ جلوہ نمائی نہیں رہی

مجھ میں بھی صبر و ضبط کا یارا نہیں رہا
احباب میں بھی تابِ تسلی نہیں رہی

بیگانہ وار دیکھتے مجھ کو گذر گئے
اب تو بھری نظر بھی ضروری نہیں رہی

آپس میں لوگ دشمن دوست آج بھی تو ہیں
لیکن وہ اب دلوں کی صفائی نہیں رہی

صبحِ وطن میں کس لئے اب جی اُداس ہے
گو تیرگیٔ شامِ غریبی نہیں رہی

ہم زندہ ہیں ضرور مگر اس کو کیا کریں
اب زندگی شریک ہماری نہیں رہی

جس دم فراقؔ بزمِ سخن سے میں اُٹھ گیا
تب سے غزل بھی گنجِ معانی نہیں رہی

## جمیل مظہری

بدنام نہ کیوں ہو خمِ گردن یہ خودی کا
مارا ہے ازل سے تری سجدہ طلبی کا

جُھکنا بھی بُرا اور جھکانا بھی بُرا ہے
چوکھٹ سے مٹا داغ مری خیرہ سری کا

کچھ بھی نہ ملا ہاتھ کو کشکول بنا کے
یہ دستِ دعا کاسۂ خالی ہے خودی کا

جلوے ترے بسمل مری افسوں نظری سے
افسوں ترا قائل مری افسانہ گری کا

رہ رہ کے جو بھر آتی ہے اس آنکھ سے ساقی
بھرتے نہیں دیکھا کبھی پیمانہ کسی کا

نور آنکھوں میں آنا تھا کہ ہونے لگا معدوم
جلوہ کہ کرشمہ تھا تری بے بصری کا

سارے مرے جھگڑے ہیں جمیل اپنے خدا سے
منکر ہوں ائمہ کا نہ منکر ہوں نبی کا

## قمر ہاشمی

میں اپنے ہی خوابوں کے جزیرے کی سحر ہوں
میں اپنے ہی بیدار خیالوں کا سفر ہوں

سمٹا ہوں تو مہکا دیئے انفاس کے گلزار
پھیلوں تو بکھرتی ہوئی بوئے گل تر ہوں

ہر پاؤں کی تکلیف کا احساس ہے مجھ کو
ہر چند کہ میں سنگِ سرِ راہ گذر ہوں

پتھر ہوں تو کیا مجھ میں بھی سو رنگ نہاں ہیں
سینہ ہو اگر شق تو شبستانِ شرر ہوں

تخئیل نے آذر کی تراشا مجھے کیا کیا
معبود ہوں تاریکیٔ اوہامِ بشر ہوں

راتوں میں کبھی مشعلِ جاں کہتی ہے مجھ سے
میں ظلمتِ ہستی میں اُجالوں کی خبر ہوں

## احمد ہمدانی

یاد آتے ہیں یہ بھولے ہوئے پیماں کیسے
ہم ترے شہر میں پھرتے ہیں پریشاں کیسے

آج پھر ایک تھکن ہم نے سمیٹی دن بھر
شام کو آئے ہیں گھر گھر سے گریزاں کیسے

ہم نے بھی چاہا تمہیں تم نے بھی ہم کو چاہا
اور پھر سر سے گذرتے رہے طوفاں کیسے

تم سے مل کر بھی ہے تنہائی کا احساس وہی
کیسا موسم ہے شب و روز ہیں ویراں کیسے

لوگ تو آکے گذر جاتے ہیں دیکھے کوئی
ہم بھی بیٹھے ہیں یہاں سر بگریباں کیسے

اُن کے آنے کی توقع بھی نہیں ہے لیکن
سو گئے شام ہی سے نیند کے امکاں کیسے

## احمد صغیر صدیقی

مہکے گا جنوں سر میں، تو بہکیں گے قدم بھی
پایا جو کہیں تم کو، تو کھو جائیں گے ہم بھی

جیسے تری دوری میں کبھی قربت کے مزے تھے
مایوس گیا اب کے بہت "موسمِ غم" بھی

ٹوٹا نہ گیا زعم ترے کج کلہوں کا
کیا کیا نہ ارادوں میں رہی شامِ ستم بھی

کچھ اور ہی جادو تھا مگر کوئے بتاں میں
آئے ہمیں لینے کو سفیرانِ حرم بھی

کرتے کبھی تو کیا ہم جو سرِ دار نہ جاتے
تقدیر میں تھی پسِ درِ شش لوح و قلم بھی

## مرزا عقیل اشرف

ہر مکمل میں کچھ کمی دیکھی
نوعِ انساں کی آگہی دیکھی

آنکھ اُن کی بھری ہوئی دیکھی
دل پہ اپنے بنی ہوئی دیکھی

تیرے بے نام سے اشاروں میں
تیری چاہت چھپی ہوئی دیکھی

جانے کس گل پہ آنچ آئی ہے
آج کلیوں میں بے کلی دیکھی

دل میں یوں ان کو جلوہ گر دیکھا
جام میں جیسے چاندنی دیکھی

روشناسی میں ساری دنیا میں
سب سے بہتر تو آرسی دیکھی

دشمنی ہو گئی زمانے سے
ان حسینوں کی دوستی دیکھی

کس لئے تم نے پھیر لیں آنکھیں
میری چاہت میں کچھ کمی دیکھی

آج اشرف کو راس آیا غم
اُن کی آنکھوں میں بھی نمی دیکھی

ص ۔ ل

# فن اور فنکار

## غلام عباس

پیدائش ——— ۱۷ر نومبر ۱۹۱۹ء

بمقام ——— امرتسر

لدھیانہ آبائی وطن ہے بچپن امرتسر اور لاہور میں گزرا ابتدائی تعلیم دیال سنگھ اسکول لاہور میں حاصل کی بعض ناگزیر حالات کی بنا پر تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ لیکن بچپن ہی سے آپ کو علم و تعلیم کی لگن تھی۔ اس لئے آپ نے اپنے فطری ذوق کی تکمیل کا سلسلہ جاری رکھا۔ پرائیویٹ طور پر میٹرک، ادیب عالم اور ایف اے کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کرتے۔

۱۹۲۵ء میں آپ نے مشہور رسالہ "پھول" لاہور کی ادارت سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے علاوہ خواتین کے ممتاز رسالہ "تہذیب نسواں" کے معاون مدیر کی حیثیت سے بھی آپ نے ۱۹۳۸ء تک نمایاں خدمات انجام دیں۔

۱۹۳۸ء میں آپ دہلی چلے گئے۔ اور آل انڈیا ریڈیو کے رسالہ "آواز" (اردو) اور "سارنگ" (ہندی) کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ۱۹۴۷ء تک فرائض انجام دیئے۔

۱۹۴۷ء میں آپ پاکستان آ گئے۔ اور ریڈیو پاکستان کے رسالہ "آہنگ" کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۴۷ء تا جولائی ۱۹۴۹ء آپ نے بحیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز وزارت اطلاعات و نشریات فرائض انجام دیئے۔

جولائی ۱۹۴۹ء میں آپ لندن گئے۔ اور بی بی سی کے پاکستانی شعبہ میں تین برس تک پروگرام پروڈیوسر کی حیثیت سے کام کیا۔ قیام لندن کے دوران آپ نے انگلستان کے مختلف شہروں کے علاوہ اسپین اور فرانس کا دورہ بھی کیا اور وہاں کی علمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اور پیرس میں باقاعدگی کے ساتھ فرانسیسی زبان بھی سیکھی ۱۹۵۲ء میں پاکستان آ کر آپ پھر رسالہ آہنگ سے وابستہ ہو گئے۔ اور تا حال اس کے ایڈیٹر ہیں۔

عباس صاحب کو بچپن سے ہی ادبی شغف تھا۔ ابتدائی عمر ہی میں آپ نے ترجموں کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلا، قابل ذکر ترجمہ ٹالسٹائی کے ایک افسانے کا تھا جو "بدلا دن" کے عنوان سے جنوری ۱۹۲۵ء کے رسالہ "ہزار داستان" میں شائع ہوا۔ اس

اس وقت آپ کی عمر پندرہ سولہ سال تھی۔ اس افسانہ کی اشاعت سے آپ کا حوصلہ بڑھ گیا۔ چنانچہ آپ نے کئی اور افسانوں کے ترجموں کے علاوہ طبعزاد کہانیاں بھی لکھیں۔ جو اس دور کے ممتاز رسائل مثلاً "مخزن، ہمایوں، نگار، عالمگیر، کارواں اور دوسرے جرائد میں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔ آپ کی پہلی طبعزاد کہانی "مجسمہ" تھی جو مشہور مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کے مشہور رسالہ کارواں میں شائع ہوئی۔
دوسرے سال "کارواں" میں ہی آپ کی دوسری طبعزاد کہانی "محبت کے گیت" اشاعت پذیر ہوئی۔

ایک سوال کے جواب میں آپ نے بتایا کہ اُن کی ادبی زندگی کی تربیت میں جن ممتاز شخصیتوں نے حصہ لیا۔ ان میں،
ڈاکٹر تاثیر، سید امتیاز علی تاج، پطرس بخاری، عبدالرحمٰن چغتائی اور مولانا چراغ حسن حسرت بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔

شعر و ادب سے شغف کے ساتھ ساتھ مصوری اور موسیقی سے بھی آپ کو گہری دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ مصوری میں چغتائی سے، مشرقی موسیقی میں استاد عبدالوحید خاں سے اور قیام لندن کے دوران وہاں کے ممتاز مغربی ماہرین موسیقی سے بھرپور استفادہ کر کے آپ نے اپنے ذوق کی تکمیل کی۔ فکر و فن کے سلسلے میں جن ممتاز شخصیتوں کی تخلیقات سے آپ متاثر ہوئے یا استفادہ کیا ان میں ٹالسٹائے۔ دوستوفسکی، فلابیر، چیخوف، گورکی، موپاساں، ڈی، ایچ لارنس، حافظ، نظیری، میر، غالب اور اقبال شامل ہیں ——— اپنے جن معاصرین کی تخلیقات آپ کو پسند ہیں۔ ان میں فیض، راشد، عصمت چغتائی، بیدی اور محمد حسن عسکری قابل ذکر ہیں۔

رسالہ "پھول" کی ادارت کے دوران آپ نے بچوں کے ادب پر بھی خصوصیت سے توجہ دی۔ اور بچوں کے لئے دو سو ۲۰۰ سے زائد دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں اور ڈرامے لکھے۔

ریڈیو کی ملازمت کے دوران آپ نے نہ صرف ان گنت تخلیقات ریڈیو کے لئے تحریر کیں۔ بلکہ اپنے کئی ڈراموں اور فیچروں کو خود ہی پیش بھی کیا۔ آپ کی بیشمار ریڈیائی تخلیقات نشر ہو کر بے حد مقبول ہوئیں۔

ابتدائی عمر سے ادبی جد و جہد کے تقریباً ۴۰ سالہ دور میں آپ نے جتنا بھی ادبی سرمایہ اردو ادب کو دیا ہے۔ وہ اگرچہ تعداد میں بہت زیادہ نہیں لیکن اپنی اہمیت، مقصدیت اور ادب و زندگی کے واضح نقطہ نظر کی صداقت کی بنا پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ایک سوال کے جواب میں آپ نے کہا:۔

"زندگی کی تنقید اور اس کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی ہمیشہ میرا مطمح نظر رہا ہے۔ میں نے ادب کو پروپیگنڈا کا ذریعہ کبھی نہیں سمجھا۔ ہر چند کہ میں اس کا قائل ہوں کہ ادب کے ذریعہ انسانیت کے اعلیٰ معیار اور بلند اخلاقی اقدار کی نشر و اشاعت بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے مظلوم طبقہ کی ہمیشہ حمایت کی ہے اور اپنی کہانیوں میں عموماً زندگی کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ لیکن ان کا حل قاری پر چھوڑ دیا ہے۔ میری کہانیوں کے کردار میرے آس پاس کے لوگ ہوتے ہیں ——— میں نے کبھی خیالی پیکروں سے اپنی کہانیوں کے تانے بانے نہیں بنے۔ میری کہانیوں کا سب سے بڑا مقصد یہ رہا ہے کہ لوگ انہیں پڑھ کر میرے ساتھ خود بھی کچھ سوچیں، اور مسائل کا کوئی بہتر حل تلاش کریں۔ میں قاری کو خود سے الگ نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ اس

کے بغیر ہم ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو نہیں سمجھ سکتے۔ ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ ہم ادب، میں سچائی اور خلوص کا قائل ہوں جس کے بغیر میری دانست میں فن کا اعلیٰ معیار قائم نہیں ہو سکتا۔"

عباس صاحب فطرتاً نہایت سادگی پسند اور منکسر المزاج واقع ہوئے ہیں۔ ماشاء اللہ دو شادیاں کر چکے ہیں۔ دونوں بیویاں حیات ہیں۔ اور ایک ساتھ رہتی ہیں۔ دوسری بیوی کرسچین ولاسٹو ایک انگریز خاتون ہیں جن کا اسلامی نام زینب ہے۔ اور جو بہت اچھی ادیبہ اور مصورہ ہیں۔ دونوں بیویوں سے آپ کی چھ بیٹیاں اور دو بیٹے حیات ہیں۔ اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

غلام عباس صاحب ایک ممتاز اور مستند افسانہ نگار کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کی دو مشہور کتابوں "آنندی" اور "جاڑے کی چاندنی" کو ادبی انعامات مل چکے ہیں اور آپ کی کہانیاں مشرق و مغرب کی تمام مستند زبانوں میں ترجمہ ہو کر قبول عام حاصل کر چکی ہیں۔ آپ کے مشہور افسانہ آنندی کو چیکوسلواکیہ کے بین الاقوامی افسانوں کے مقابلے میں پہلا انعام مل چکا ہے۔

اس وقت تک آپ کی حسب ذیل تصانیفات شائع ہو چکی ہیں۔

## ناول و افسانے

۱۔ الحمرا۔ (افسانے) ۱۹۳۱ء

۲۔ آنندی۔ (افسانے) ۱۹۴۸ء — اس مجموعہ پر پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے سال کی بہترین تصنیف کا انعام دیا

۳۔ جزیرۂ سخنوراں (مختصر ناول) — پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ء۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۱ء۔

۴۔ گوندنی والا تکیہ (ناول) ۱۹۵۳ء

۵۔ جاڑے کی چاندنی (افسانے) ۱۹۶۰ء — اس مجموعہ پر آدم جی انعام حاصل کیا۔

ترتیب و تالیف: "انتخاب پھول" — رسالہ پھول کی ۴۴ سالہ جلدوں کا انتخاب جو ترقی اردو بورڈ کراچی کے تعاون سے شائع ہوا

## بچوں کے لئے:

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ گستاخ لڑکا | (ڈراما) | ۱۹۲۶ء |
| ۲۔ چاند کی بیٹی | (کہانیاں) | ۱۹۲۶ء |
| ۳۔ برف کی بیٹی | ( " ) | ۱۹۲۶ء |
| ۴۔ ننھیا کی گڑیا | (ڈراما) | ۱۹۲۶ء |
| ۵۔ سات ملکوں کی کہانیاں | (کہانیاں) | ۱۹۳۴ء |
| ۶۔ چاند تارا | (نظمیں) | ۱۹۶۵ء |
| ۷۔ بلبل | (مثنوی) | ۱۹۶۵ء |

## زیر ترتیب:

کن رس ۔ طویل افسانوں کا مجموعہ۔

ادارہ

## تبصرہ و تعارف

# نئی کتابیں

(تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا لازمی ہے)

**غالب** (بچوں کے لئے)
رضیہ سجاد ظہیر

ناشر: آئینۂ ادب، چوک مینار، انارکلی، لاہور۔
صفحات: ۱۰۶ | قیمت: دو روپے

رضیہ سجاد ظہیر نے بچوں کے لئے "غالب" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے وہ بلا شبہ امتیازی خصوصیات کی حامل ہے۔ جس سادگی سے انہوں نے غالب کی عظمت کا تصور پیش کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ بچوں کے ادب میں ایسی کتابیں شاذ و نادر ہی چھپا کرتی ہیں۔ اس میں غالب کی زندگی اور شاعری دونوں ہی کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اور ایسے تخلیقی انداز میں کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد غالب یقیناً سارے بچوں کا سب سے محبوب شاعر بن جائے گا۔ یہ کتاب اُن بڑوں کو بھی پڑھنی چاہئے جو غالب کو اس کی مشکل پسندی کی بنا پر اب تک نہیں سمجھ سکے ہیں —— رضیہ سجاد ظہیر کا اندازِ تحریر اس کتاب میں قابلِ رشک ہے۔

**امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر**
مسعود راہ

ناشر: علوی بک ڈپو، محمد علی روڈ۔ بمبئی نمبر ۳
صفحات: ۱۰۴ | قیمت: دو روپے

مسعود راہ نے امیر خسرو کی ہندی شاعری پر ایک اچھی تحقیقی کتاب لکھی ہے مسلمانوں کی تہذیب کے مطالعے کا ایک مکمل دور امیر خسرو سے غالب تک پھیلا ہوا ہے۔ دونوں فارسی کے بے مثل شاعر تھے۔ لیکن ہندوستان کی موسیقی پر بھی امیر خسرو کے زبردست احسانات ہیں۔ اُن کی شاعری میں ہندوستانی موسیقی کا بہترین رچاؤ ملتا ہے۔ خصوصاً ہندی شاعری میں۔ ان کی ہندی شاعری کا بیشتر حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ اس کا جس حد تک افسوس کیا جائے کم ہے۔ لیکن ان کے بعض ہندی اشعار کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ہندی کے بھی یقیناً ایک

بڑے شاعر تھے۔ لیکن صفدر آہ سے بھی ایک بات کی سہو ہو گئی ہے۔ خسرو کی ہندی شاعری دراصل فارسی شاعری کے مقابلے میں ہندی کہلاتی تھی ورنہ آج کی اردو شاعری کا وہی آغاز تھا جسے ہم امیر خسرو کی ہندی شاعری کہتے ہیں۔ علم و فن سے دلچسپی رکھنے والوں کو صفدر آہ کی یہ کتاب ضرور پسند آئے گی۔

## جدید اردو ادب کے دو تنقیدی جائزے

ابوالخیر کشفی

ناشر: اردو اکیڈمی سندھ، بندر روڈ، کراچی
صفحات: ۱۰۹ قیمت: دو روپے

یہ کتابچہ ابوالخیر کشفی کے دو تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو جدید اردو ادب سے متعلق ہیں۔ "حرفِ آخر" کے عنوان سے چند باتیں جو ان کے دوسرے مضمون "اردو ادب کے دس سال" (مطبوعہ افکار، دس سالہ نمبر ۵۵ء) کی تشنگی کو کم کرتی ہیں۔ کتاب کے آخری صفحات پر لکھ دی گئی ہیں۔ کشفی کراچی یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرر ہیں۔ ان کے یہاں درسی تنقید کا انداز بہت نمایاں ہے۔ ان کے دونوں مضامین میں اس بات کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے کہ موضوعات کو اس طرح سمیٹ لیا جائے کہ طالب علموں کو ان مضامین میں اپنے کام کی ہر بات مل جائے۔ اس کتاب میں دو ہی مضامین ہیں۔ لیکن تقریباً ان سارے چھوٹے بڑے ادیبوں کے نام موجود ہیں جو ادب کی کسی نہ کسی صنف سے وابستہ ہیں۔ اور ان کی تخلیقات کو جا بجا سراہا بھی گیا ہے۔ پڑھانے کے سلسلے میں اساتذہ جو مواد جمع کرتے ہیں۔ وہ اگر چھپتا بھی رہے تو اچھا ہے۔

## دودِ چراغِ محفل (ناول)

ذکاء الرحمٰن

ناشر: کلاسیک پبلشرز، ۴۲۔ دی مال لاہور
صفحات: ۲۴۰ قیمت: چار روپے

"دودِ چراغِ محفل" ایک بے حد عجیب ناول ہے۔ جس میں کوئی ہیرو نہیں، صرف ایک ہیروئن ہے "شہلا" جو ناول کے تہائی حصے سے زیادہ بڑے حصے میں کچھ نہیں کرتی، صرف اُداس اور بے چین رہتی ہے۔ اور اچانک اس میں "انقلاب" کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ ہیروئن کے باپ کو جو کمشنر ہے اس کے ساتھی انقلابی کی ٹولی قتل کر دیتی ہے۔ یہ ایسا واقعہ ہے جو کتاب میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ شہلا کا چچا زاد بھائی اور ایک انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا لڑکا گاؤں جا کر عیاشی کے لیے ایک لڑکی کا اغوا بھی کرتے ہیں اور اس سلسلے میں گاؤں کے چار آدمیوں کو اپنی گولی کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان دو واقعات سے ناول بھرا پڑا ہے۔ کتابت و طباعت بہت اچھی ہے۔

## شکیل بدایونی کی رومانی شاعری

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

ناشر: اسٹار پبلیکیشنز ۲۷۱۵ دریا گنج دہلی ۶، بھارت
صفحات: ۱۳۲ قیمت: تین روپے

شکیل بدایونی برِصغیر پاک و ہند میں کامیاب فلمی شاعر کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں۔ فلمی

تنقید لکھنے سے قبل وہ غزل لکھتے تھے۔ اُن کی غزلیں روایتی مضامین کی حامل تھیں۔ کچھ رومان کچھ خود نگری ان کی غزلوں کا خاصہ ہے۔ اب ڈاکٹر شکیل الرحمان ایم اے (ڈی لٹ) نے شکیل بدایونی کی رومانی شاعری پر ایک کتاب لکھی ہے جو تزئین و آرائش کے ساتھ بہت اچھے سفید کاغذ پر شائع ہوئی ہے۔ فاضل مصنف نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس پر ہمیں انگریزی کے ایک مقتدر نقاد کا یہ جملہ یاد آرہا ہے کہ اگلے وقتوں میں بڑے لوگوں نے بڑے لوگوں پر جو کچھ لکھا ہے آج چھوٹے لوگوں پر چھوٹے لوگ وہی لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر شکیل الرحمان کا انداز بیان تنقید شعر کے لئے بالکل موزوں نہیں۔ زبان بہت بے ربط اور کچی ہے۔ جگہ جگہ انگریزی اور اردو کے مشاہیر کے اقتباسات درج کر کے تحریر کو وقیع بنانا چاہا ہے لیکن اس کوشش میں شکیل بدایونی کی روایتی شاعری " روایتی " کہلانے سے کیوں محروم ہوتی۔ اس قسم کی کوششیں ـــ اس اعتبار سے مستحسن ہیں کہ ہندوستان میں غیر معروف شاعروں پر اردو کی خوب صورت کتابیں شائع ہو رہی ہیں لیکن اس طرح کی کتابوں سے اردو تنقید کے معیار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس قسم کی کتابیں اردو تنقید کے معیار کو پیچھے لے جا رہی ہیں۔

## وطن میں اجنبی

جگن ناتھ آزاد

ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی

صفحات: ۲۲۳　　قیمت: ۸ روپے ۵۰ پیسے

جگن ناتھ آزاد اردو کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ اُن کے کلام میں عام طور پر جو غنائیت ملتی ہے وہ اس مجموعۂ کلام " وطن میں اجنبی " میں بھی موجود ہے۔ وہ تاثر اور واقعہ دونوں کو ملا کر نظم لکھتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں جہاں جہاں وہ گئے ہیں اس کے متعلق انہوں نے کلام منظوم میں اظہار خیال کیا ہے۔ یہ کتاب واقعات اور تاثرات کے اعتبار سے مغربی پاکستان سے متعلق ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے جدید نظم میں کوئی تجربہ نہیں کیا۔ وہ بڑے خلوص سے لوگوں کا اور جگہوں کا تذکرہ اپنی نظم میں کرتے ہیں۔ نظم کی ہیئت ان کی کتاب میں وہی ملی ہے جو حالی، اقبال اور جوش وغیرہ کے یہاں ملتی ہے۔ اسی لئے وہ جدید عہد کے ان شعراء سے مختلف ہیں جو اپنی نظم میں نئی ہیئت کا استعمال، نئی تراکیب، نئی علامتوں اور نئے استعاروں کے ذریعے کرتے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کے اس مجموعۂ کلام میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ پاکستان کے لوگوں سے اخوت اور محبت کا جذبہ ہے۔

مایا کافنسکی
ترجمہ
ہربنس دوست

روسی

# میرے ادیب دوستو

مجھے ایسا لگتا ہے
تمہارے اس 'ہوسٹل' میں بیٹھ کر
چائے پینے کا میں کبھی عادی نہیں ہو سکوں گا
ایک قطار میں سجے ہوئے ان گلاسوں کو
میں منتشر کر ڈالوں گا، اور میز پر اچھل کر کہوں گا
میرے ادیب دوستو، سُنو!
تمہاری آنکھیں چائے کے پیالوں میں ڈوبی ہوئی ہیں
اور سیدھا گھسیٹتے گھسیٹتے تمہاری انگلیاں تھک گئی ہیں
ان بھرے ہوئے گلاسوں سے اپنی آنکھیں اٹھا کر دیکھو
ان اُلجھے اُلجھے کاکلوں کے پیچ و خم سے اپنے آپ کو الگ کر دو
بچا لیجیو، تم!
جو دیواروں اور دیواروں پر چپکے کاغذوں پر جمے بیٹھے رہتے ہو
تمہارے الفاظ کو کس نے محدود کر دیا ہے؟
فرینک والوں نے جب اپنا لکھنے کا کام بند کر دیا
تو پھر اپنے لوٹ مار کے کام میں جا لگا تھا؟
اور تم — جو سبزی کاٹنے کے چاقو دیکھ کر گھگھیانے لگتے ہو
ایک عظیم زمانے کے علم بردار بننے کا دم بھرتے ہو
آج کے لئے لکھنے کو تمہارے پاس کیا ہے؟
کسی بھی وکیل کا منشی
زندگی کو تم سے سو گنا دلچسپ محسوس کرتا ہے

میرے شاعر دوستو،
کتابوں کے ان صفحوں، ان عشق و محبت کے افسانوں
اور کنول کی ان کلیوں سے
تم ابھی تک اُکتائے نہیں ہو — !؟
اگر خالق ایسے ہوتے ہیں جیسے تم ہو
تو میں سارے فن پر تھوکتا ہوں
اس سے اچھا تو میں ایک دوکان کھولنا پسند کروں گا
یا سٹہ بازار میں چلا جاؤں گا
اور وہاں اپنی دونوں جیبیں موٹی موٹی تھیلیوں سے بھروں گا
یا چنڈو خانے کے پچھواڑے بیٹھ کر
نشے میں دُھت گیت میں اپنے ضمیر کی قے کر ڈالوں گا

کیا یہ بہتر — تمہارے بالوں میں اُلجھے جھنڈ کو بکھرا کر
کچھ جھنجھوڑنا نہیں
لیکن افسوس تمہارے بالوں کے اُلجھے گچھے کے نیچے تو
بس ایک ہی خیال ہے — آرائش — آرائشِ حُسن
اور آخر کس لئے — کب تک؟؟
صرف چند لمحوں کے لئے!
تمہاری محنت کی مقدار یہ آرائش نہیں ہے
اور دائمی آرائش
ناممکن ہے!

فریڈرخ ہالڈرلن
ترجمہ
شاہین غازیپوری

جرمنی

# اعتراف

یہ حقیقت ہے کہ میں پہلے بہت مغرور تھا

کھیلتا رہتا تھا اکثر کھوکھلے الفاظ سے
اور ملوث سا رہا کرتا تھا حرص و آز سے
تجھ کو میری ہر ادا لیکن بہت محبوب تھی
تیرے آگے فطرتِ ناخوب میری خوب تھی

اب کہ میرا دل تمام آلائشوں سے پاک ہے

تیری یہ بڑھتی ہوئی بیگانگی میرے لئے
راز بنتی جا رہی ہے (رازہی شاید رہے)
آہ! لوگوں کی نظر میں ہے وہی محبوب شے
جس کا تھوڑا سا بھی بازارِ ہوس میں مول ہے
اک حقیقت ہے کہ قید و بند میں جکڑے غلام
جابروں کا ہی کیا کرتے ہیں پیہم احترام

ذاتِ اقدس پر وہی ایمان رکھتے ہیں خدا
جن کی فطرت ہو بجائے خود تقدس آشنا

فرخ احمد
ترجمہ
افسر ماہ پوری

بنگلہ

# خونِ شہید

خونِ شہید سے ہوا رنگین کاشمیر
زندانِ ظلم میں ہے سراسیمہ زندگی
پیروں میں تیرے موت کی زنجیر سخت گیر

کن مشکلوں میں آج ہیں دنیا کی نیکیاں
بربادیوں کے خوف سے سہمی ہوئی اداس
بیدار چار سو شب غمناک و تار و تیر

خطرے میں میرے پاک وطن کی ہے آبرو
میدان میں، پہاڑ میں، صحرا میں، چار سو
آتے ہیں بیڑیوں میں نظر سیکڑوں اسیر

اے شیر دل مجاہدو، اُٹھ جاؤ شان سے
کردو اندھیری رات کی نیندوں کو چور چور
لہرا دو آج پرچم آزادئ ضمیر
خونِ شہید سے ہوا رنگین کاشمیر

مراٹھی

وی۔ایم۔کلکرنی
— ترجمہ —
بدیع الزماں خاور

# جینے کیلئے

چاہئے کیا اور، جینے کے لئے
اس جہاں میں
آدمی کو راس آجائے اگر
چار دیواروں کا اک چھوٹا سا گھر!

جس کے دروازوں سے مستانہ ہوا لہرا سکے
جس کے آنگن کے کنوئیں میں صاف پانی مل سکے
جس میں اطمینان سے وہ دال روٹی کھا سکے
غمزدہ دل، پھول کی مانند جس میں کھل سکے
ہو جہاں بے تاب اُس کے واسطے کوئی نظر!!

اس زمانے میں، یہی چیزیں مگر

چاہتا ہے آدمی جس وقت جینے کے لئے
یہ زمیں تُلتی ہے اس کا خون پینے کے لئے

ادارہ

# رفتارِ علم

آدبی و تہذیبی خبریں اور تبصرے

## پاکستانی اور چینی ادیبوں کے وفود کا تبادلہ

کراچی ۔ پچھلے دنوں پاکستان رائٹرز گلڈ کا ایک وفد جو نو ادیبوں پر مشتمل تھا چین کا تین ہفتے تک دورہ کرنے کے بعد واپس آ گیا ۔ اسی دوران میں چین کے ایک سہ رکنی وفد نے بھی پاکستان کا دورہ کیا ۔ اُن کے اعزاز میں کراچی لاہور اور ڈھاکہ میں خصوصی تقریبات منعقد ہوئیں ۔

## انجمن شعرائے کراچی

کراچی ۔ مشہور شاعر سراج الدین ظفر کی صدارت میں کراچی کے ممتاز و معروف شعراء کے ایک اجتماع میں "انجمن شعرائے کراچی" کا قیام عمل میں آیا ۔ تابش دہلوی کو اس انجمن کا کنوینر مقرر کیا گیا ہے اور ۵ اراکین پر مشتمل تنظیمی کمیٹی قائم کی گئی ہے جو دستور اور لائحہ عمل مرتب کرے گی ۔

## سبط حسن کی نئی کتاب "شہر آرزو"

کراچی ۔ مشہور ادیب سبط حسن کی نئی کتاب "شہر آرزو" عنقریب شائع ہو رہی ہے ۔ اس کتاب میں جن ممتاز شخصیتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سروجنی نائیڈو، قاضی عبد الغفار، مولوی عبد الحق، حفیظ جالندھری، مخدوم محی الدین، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ابراہیم جلیس، بادشاہ حسین وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں شخصیات کے علاوہ انجمن ترقی اردو، جامعہ عثمانیہ، نشر گاہ حیدر آباد، ترقی پسند مصنفین اور حیدر آباد دکن کے کئی مشہور اداروں کے متعلق چند خاص امور اور واقعات بھی شامل ہوں گے جو اس سے پہلے قلم بند اور شائع نہیں ہوئے ۔

## پاکستانی ادب، جرمنی میں

اسٹٹ گارٹ (جرمنی) ۔ اس دور کے ۲۴ نمائندہ پاکستانی ادیبوں کی تخلیقات پہلی بار جرمنی میں، پاکستان رائٹرز گلڈ کے تعاون سے کتابی صورت میں شائع کی گئی ہیں ۔

# قاضی نذر الاسلام کی سالگرہ

ڈھاکہ۔ پچھلے دنوں قاضی نذر الاسلام کی ۶۷ ویں سالگرہ پر مشرقی اور مغربی پاکستان میں متعدد تقریبات منعقد ہوئیں اور ان کی زندگی اور گراں مایہ ادبی خدمات پر انہیں خراجِ تحسین ادا کیا گیا

# میر تقی میر پر تحقیقات

لکھنؤ۔ نیپال کی کابینہ کے سابق چیرمین ڈاکٹر تلسی گری نے پچھلے دنوں آل انڈیا میر اکیڈمی کا یہاں افتتاح کیا۔ یہ اکیڈمی مشہور اردو شاعر میر تقی میر کے ادبی کارناموں اور حالات زندگی پر تحقیقات کر رہی ہے۔

# انجمن ترقی اردو (ہند) کے لئے

## زمین خرید لی گئی

نئی دہلی۔ اردو دوستوں کو اس اطلاع سے خوشی ہوگی کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کو راوس ایونیو نئی دہلی میں اپنا دفتر بنانے کے لئے زمین مل گئی ہے۔ انجمن دو سال سے اس کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈیڑھ دو سال میں اس زمین پر انجمن کے شایانِ شان عمارت تیار ہو جائے گی۔

# مختصر مختصر

○ کراچی یونیورسٹی کے زیر اہتمام پچھلے دنوں فلسفہ کانگریس کا تیرھواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا، جس کا افتتاح جناب ممتاز حسن نے فرمایا۔

○ ارجنٹینا کے سفارت خانے نے پہلی بار قومی دن کے دعوت نامے اردو میں جاری کرکے پاکستان کی تاریخ میں ایک نئی مثال قائم کی۔ افکار کے گذشتہ شمارے میں افتخار حسین نے اپنے مضمون "یوم اقبال اور اقبالیات" میں خاص طور پر سفارت خانوں کو اس جانب توجہ دلائی تھی۔

○ کراچی یونیورسٹی نے پہلی بار سید مسیح الامام کو ان کے فارسی مقالہ پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ یہ مقالہ شیخ شرف الدین یحییٰ اور ان کی ادبی خدمات سے متعلق ہے۔

○ پنجاب یونیورسٹی نے دیرینہ روایت کو ختم کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ آئندہ وہ ان تمام تحقیقی مقالوں کو کتابی صورت میں شائع کرے گی جو ایم اے اور پی ایچ ڈی کے لئے تحریر کئے جائیں گے۔

○ نئی دہلی میں گذشتہ دنوں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی ۳۰ ویں سالگرہ منائی گئی۔ جلسہ میں اردو، ہندی، انگریزی، بنگالی، تامل، ملیالم اور سندھی کے مصنفین نے شرکت کی۔ جلسہ کی صدارت سجاد ظہیر نے کی۔ صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم ہند نے تقریب سالگرہ پر خصوصی پیغامات ارسال کئے۔

**چھپتے چھپتے**

## نیاز فتحپوری اور سروش طباطبائی کی رحلت

کراچی۔ علمی و ادبی حلقوں میں یہ خبر نہایت رنج و غم کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے مشہور ادیب و نقاد جناب نیاز فتحپوری کا ۸۱ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

لکھنؤ۔ اردو کے خوش گو شاعر جناب سروش طباطبائی ۵۵ سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت فرما گئے۔

ادارۂ افکار مرحومین کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی   طابع: مشہور آفسٹ پریس کراچی   دفتر: رابسن روڈ کراچی   فون: ۳۹۹۳۰



# صداقت اور حقائق طبِ مشرق پر جدید تحقیقات

طبِ مشرق کی ہزارہا سالہ روایات صداقتوں اور تجارب کے رد میں سارا عالم مجتمع ہوا۔ اور تجارتی مفادات پر طب کے حقائق قربان ہوئے مگر آخر کار دنیا کو اب تسلیم کرنا پڑا کہ ادویہ غذائیہ قدرتی ذرائع و ذخائر اور جڑی بوٹیاں اور طبِ مشرق کے معالجات اہمیت کے حامل ہیں اور صحتِ انسانی کے لئے انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جدید تحقیقات کا رخ حقائق قدامت کی طرف موڑنے والے انسانیت دوستوں میں ہمدرد قدم بقدم اور پیش پیش ہے۔ رفعِ امراض کے لئے نباتات سے ادویہ دنیا بھر میں تیار ہو رہی ہیں۔ پاکستان میں ہمدرد اس اصول کا داعی ہے۔ ملیر میں پیدا ہونے والی جھاڑی سے یرقان کی مفید و موثر اور تقریباً یقینی دوا "اکثرین" ہمدرد کے ماہر حکیموں، ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کے اتحادِ ثلاثہ اور اشتراکِ عمل سے وجود میں آئی ہے اور صرف یہی اتحادِ ثلاثہ ہی ایسی ایجادات کر سکتا ہے اور قدیم معالجات کی سائنٹی فک توجیہات کر سکتا ہے جو پاکستان کے مسئلۂ صحت کے حل اور ادویہ میں خود کفالتی کے لئے ازبس ضروری ہے۔

---

**حیضونات** رحم سے شدید اور بے قاعدہ جریانِ خون کی قطعی بے ضرر دوا ہے۔ کثرتِ حیض، سن یاس کا غیر معمولی جریانِ خون، مستقل جریانِ خون، غیر معمولی رحمی جریانِ خون بحالت حمل اس دوا کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔

**ہمدرد س گرائپ واٹر** ننھے منے بالخصوص دانت نکالتے بچوں کی صحت مندی کے لئے ہاضمے کی تمام خرابیوں، پیٹ کے ہر قسم کے بے چین کردینے والے درد کو ساکن کرنے میں نہایت موثر ہے۔ دستوں کی شکایت۔ بالخصوص جو دانت نکالنے کے زمانے میں عام طور پر ہوجاتی ہے ہمدرد س گرائپ واٹر سے دور ہوجاتی ہے۔

**سنکارا** ایک تغذیہ بخش وٹامنوں والا ٹانک ہے جو متعدد ایسی جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے جن کی دوائی افادیت سے اہلِ طب اچھی طرح واقف ہیں۔

**نونہال بے بی ٹانک** بچوں کی صحت مند بڑھوتری میں مدد دیتا ہے اور انھیں تو مند بناتا ہے۔

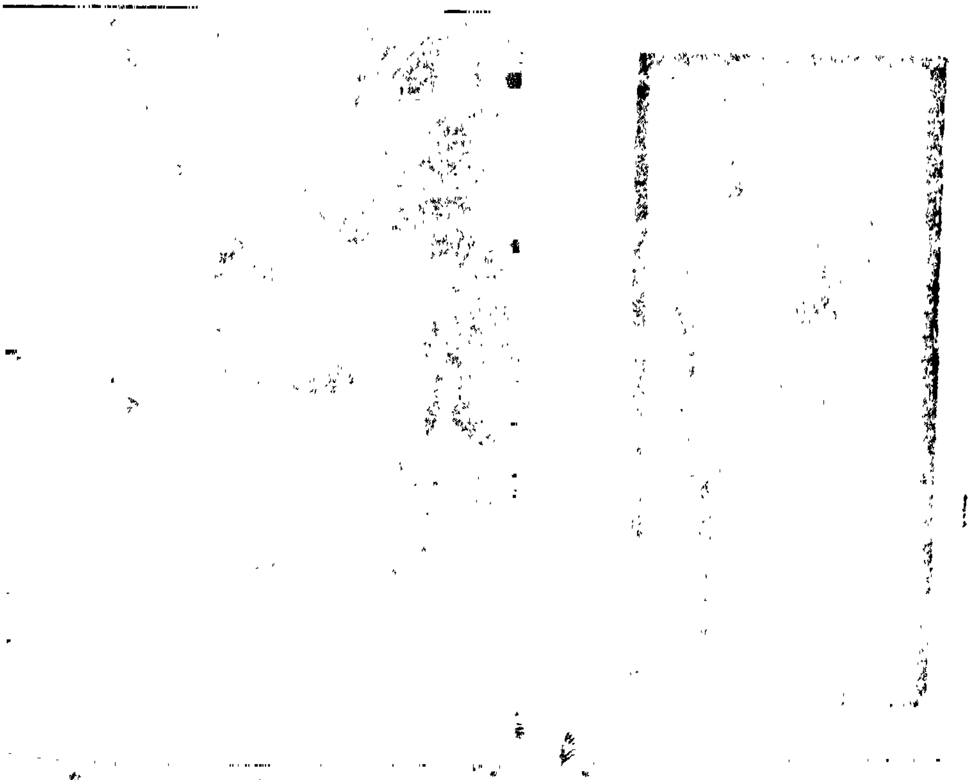
**سعالین** ایسی جڑی بوٹیوں کا ایک متوازن مرکب ہے جو کھانسی، زکام ا[illegible] کی شکایات دور کرنے میں زود اثر مانی جاتی ہے۔

**کارمینا** معدہ اور جگر کے فعل کی اصلاح کرتی ہے نیز ابیت سینے کی جلن، پیٹ کا بھاری پن اور پیٹ میں ہوائیں پیدا ہونا۔ بدہضمی، کھٹی ڈکاریں، دردِ شکم، متلی اور قے، بھوک کی کمی، قبض کی شکایات کے لئے اکسیر ہے۔

**صافی** خون کو صاف کرتی ہے اور سارے نظامِ جسمانی کو گردوں اور جلد کے ذریعہ فاسد مادوں کے اخراج کے لئے ابھارتی ہے۔

**خمیرہ [illegible]** دماغ اور اعصاب کو تقویت دیتا ہے مرکب ہے۔ اشتہا کو بیدار کرتا ہے۔ دل کو طاقت دیتا ہے اور عام جسمانی کمزوری کو بحال کرتا ہے۔

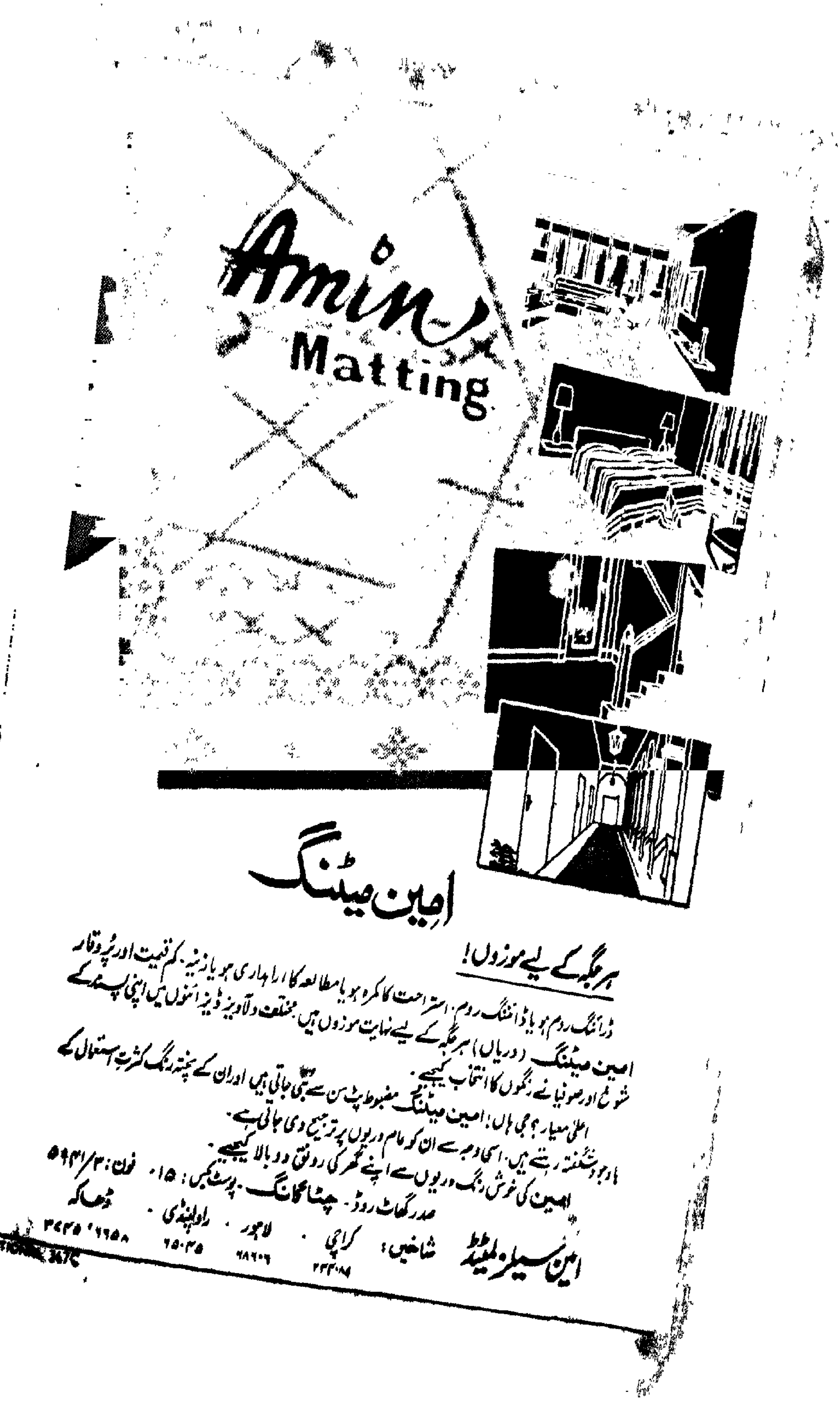
## [illegible] ہمدرد کی ادویہ [illegible] کے کونے کونے میں مل سکتی ہیں



فیض نمبر

قیمت

۱۲ روپے


Amin
Matting
امین میٹنگ
ہر جگہ کے لیے موزوں!
ڈرائنگ روم ہو یا ڈائننگ روم، استراحت کا کمرہ ہو یا مطالعہ کا، راہداری ہو یا زینہ۔ کم قیمت اور پُر وقار
امین میٹنگ (دریاں) ہر جگہ کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ مختلف دلآویز ڈیزائنوں میں اپنی پسند کے
شوخ اور صوفیانہ رنگوں کا انتخاب کیجیے۔
اعلیٰ معیار؟ جی ہاں! امین میٹنگ مضبوط پٹ سن سے بنی جاتی ہیں اور ان کے پختہ رنگ کثرت استعمال کے
باوجود شگفتہ رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کو عام دریوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔
امین کی خوش رنگ دریوں سے اپنے گھر کی رونق دوبالا کیجیے۔
امین سیلز لمیٹڈ صدر گھاٹ روڈ۔ چٹاگانگ۔ پوسٹ بکس: ۱۵۰ فون: ۵۹۴۱/۳
شاخیں: کراچی ۲۳۳۰۸ • لاہور ۶۸۶۰۶ • راولپنڈی ۶۵۰۳۵ • ڈھاکہ ۳۲۳۵، ۹۶۵۸
NATIONAL 367C

# آپکی بچت - قوم کی ترقی !




ظاہری چمک دمک پر نہ جائیے - سیونگ سرٹیفیکٹ
دیکھنے میں ہوسکتا ہے جاذبِ نظر نہ ہو-لیکن اگر آپ ذرا غور فرمائیں
تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کاغذ کے اس معمولی ٹکڑے میں
کس قدر تعمیری صلاحیتیں پنہاں ہیں

وطن کی ترقی - قوم کی خوشحالی اور آپ کی ذاتی مسرت

۵۰،۰۰۰/- تک سرمایہ لگایا جاسکتا ہے

ایک خاص حد تک سرمایہ پر بھی ٹیکس معاف

## سیونگ سرٹیفیکٹ

تمام ڈاکخانوں سے مل سکتے ہیں

Crescens

DFP-7/66

منظور شدہ محکمہ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ

جاری شدہ: ۱۹۴۵ء ⋆ ٹیلی فون: ۷۳۹۹۳

# افکار

سال: ۲۲ ۵ شمارہ: ۱۷۹

مدیر

صہبا لکھنوی

| زر سالانہ | بیرونِ ملک سے | | فی پرچہ |
|---|---|---|---|
| ۱۲ روپے | ۴۰ شلنگ | ۱۰ ڈالر | ایک روپیہ |

مکتبۂ افکار

رابسن روڈ کراچی

لندن آفس

۱۴- پرنسیز ایونیو۔ لندن۔ این۔ ڈبلیو نمبر ۹

## جولائی ۱۹۶۶ء کی تخلیقات

اشاریہ

# اردو کے نام پر

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق جب تک زندہ رہے کراچی اردو تحریک کا مرکز بنا رہا۔ اردو کے نام اور کام پر، اردو کی عظمت و اہمیت پر اور قیام پاکستان کے سلسلے میں اردو کی ناقابل تردید خدمات پر وہ اپنی تحریروں میں، تقریروں میں اور بیانات میں ایک جری سپاہی کی طرح ہمیشہ صدائے حق بلند کرتے رہے اور مطالبہ کرتے رہے کہ اردو کو اس کا جائز حق جلد سے جلد دیا جائے۔ ان کی وفات کے بعد کراچی میں سناٹا ہو گیا اور یہ تحریک کراچی سے لاہور منتقل ہو گئی۔ گذشتہ چند سالوں سے انجمن ترقی اردو لاہور، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ان کے رفقائے کار اردو تحریک کو اور بابائے اردو کی ساری عمر کے حاصل کو بچانے اور انگریزی زدہ ذہنوں کو بدلنے کے لئے سرگرم کار ہیں۔ وہاں جس خلوص، جس جذبے اور جس نیک نیتی سے اردو کے لئے عملی اقدامات کئے جا رہے ہیں — وہ پوری قوم کے لئے تازیانۂ عبرت ہیں۔ ۱۹ سال کے بعد بھی اردو بے گھر ہے، بے سروسامان ہے — اسکولوں، کالجوں میں انگریزی، دفتروں میں انگریزی، ذہن و دماغ پر انگریزی کا تسلط، گویا آزادی کے ۱۹ سال بعد بھی ہم ذہنی غلامی کے اندھیرے سے نہیں نکل سکے ہیں۔ کسی بھی آزاد، خود دار اور خود مختار قوم کے لئے اس سے زیادہ افسوسناک اور شرمناک بات کیا ہو گی کہ اس کی اپنی کوئی قومی زبان نہیں — اگر ہے بھی تو اسکی حیثیت صرف "کاغذی اعلانات" تک ہے۔ ہمارا نظام حیات ابھی تک سامراجی عہد کے مضبوط شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہم پاکستانی ابھی تک (۱۹ سال کا عرصہ گذر جانے کے باوجود) ........ اپنی قومی زبانوں اردو اور بنگلہ پر فخر کرنے کے اہل بھی نہیں ہیں اور اردو کے دردمند شیدائی دکان دکان جا کر یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ بھائیو! انگریزی کے بورڈ اتار دو۔ مراسلت اردو میں کرو — اردو کو اپناؤ — اردو کی قومی حیثیت کو تسلیم کرو۔ قومی دیوالیہ پن کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو گی؟!

لاہور بلاشبہ اردو کا ایک بڑا مرکز ہے۔ لیکن کراچی نے بھی گذشتہ برسوں میں اردو کی ترویج و ترقی میں جو حصّہ لیا ہے وہ کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ کیا انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) کا یہ فرض اور منصب نہیں کہ وہ بابائے اردو کی اس تحریک کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دفتری چہار دیواری سے باہر نکل آئے اور کراچی کے اردو دوستوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے ایک واضح منصوبہ کے تحت اردو تحریک کو ہمہ گیر تحریک کی صورت میں آگے بڑھائے تاکہ جو کام لاہور کی انجمن کر رہی ہے اُسے تقویت پہنچے اور مشترکہ جد و جہد سے ہم اپنی پیشانی سے انگریزی کا داغِ غلامی جلد مٹا سکیں۔

کاش ارباب انجمن اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں!!

سردار جعفری

# تم بھی آؤ

منزل دور اندھیری راہیں
کانٹے کانٹے، جنگل جنگل
خشک لہو کے پیلے صحرا
خوف کی بارش
سنّاٹوں کے بھاری پتھر
جیسے اولوں کا پتھراؤ
تنہا راہیں کٹ نہ سکیں گی
تنہا منزل مل نہ سکے گی
پاؤں کے چھالے
دشت کے دل میں
پھول کی صورت کھل نہ سکیں گے
خوف کی بارش رک نہ سکے گی
سنّاٹوں کے ہاتھ کے پتھر
ختم نہ ہوں گے
میں تنہا ہوں
تم بھی تنہا!
تنہا تنہا مرجائیں گے
میں آتا ہوں
تم بھی آؤ
تم بھی آؤ

## ظہور نظر

# شکستہ شاخ

طویل اور مسلسل علالت کے باعث
مرے ذہن کا چین غارت ہوا ہے
مری سوچ کی دھجیاں اُڑ گئی ہیں
مرے عزم اور حوصلے —
وسوسوں اور دھڑکوں کی سُولی پہ لٹکے ہوئے ہیں

یہ بچے —
یہ میرے دل وجاں کے ٹکڑے
مری رُوح بستی ہے جسموں میں جن کے
مرا خون جن کی رگوں میں رواں ہے
جنہیں چومتے، پیار کرتے، جھُلاتے
بُلاتے، ہنساتے، سُلاتے، جگاتے
مرے روز و شب کی کئی ساعتیں خوبصورت ہوئی ہیں
مری زندگی کے کئی تیرہ گوشے منوّر ہوئے ہیں
مجھے کیا خبر تھی
کہ اک دن یہی میرے دل کا قرار و سکوں چھین لیں گے!

میں اب جب انہیں پیار کرنا انہیں چومنا چاہتا ہوں
تو اس طرح لگتا ہے جیسے کسی نے
مرے دل کو مٹھی میں لے کر دبایا ہو،
مرے کلیجے میں خنجر اتارا ہو،
مری رگوں میں لہو کی جگہ زہر دوڑا دیا ہو!!

ہوا ڈرکے کہتی ہے
اتنا پریشان ہونے کی تو بات کوئی نہیں
کئی بار یوں بھی ہوا ہے کہ ٹوٹی ہوئی شاخ برسوں
لٹکتی رہی پیڑ سے اور اُس پر
نکلتے رہے سبز و شاداب پتے!
فضا جھجک کے کہتی ہے،
ممکن ہے ایسا نہ ہو، پھر بھی سوچو!
کہ تم بھی تو بس سات ہی سال کے تھے
کہ جب باپ کی اَن گنت شفقتیں، بے پناہ چاہتیں تم سے چھینی گئی تھیں
کسی طور سے بھی،
کسی حال میں بھی سہی،
آخرش تم بھی پل ہی گئے تھے!!

مگر میں یہی ——
بس یہی سوچنا تو نہیں چاہتا ہوں
کہ میری طرح سے بلکتے رہے ہیں میرے بچے
مرے دل کے ٹکڑے!!

جوہر سعیدی

# تشنگی

وقت کچھ، سُرعتِ رفتارِ نمو لیتی ہے　　　کچھ نظر، جائزۂ سیف و سبو لیتی ہے
جب ترے شہر سے آغازِ سفر کرتا ہوں　　　کوئی زنجیر، مرے پاؤں کو چھو لیتی ہے

آبروئے گل کی گلستاں سے نکل آتی ہے
زندگی، جبر کے زنداں سے نکل آتی ہے
جب میں ہوتا ہوں کبھی نالہ کشی پر مائل
نغمگی اپنے شبستاں سے نکل آتی ہے

مرا نشہ ہے، مرے خام ارادوں کا فسوں　　　میرے دامن کا محافظ ہے مرا دستِ جنوں
وقت کے کوہکنوں کا نظر آتا ہوں امام　　　میں کہ ہر سنگِ سرِ راہ سے ڈر جاتا ہوں

چلچلاتی ہوئی دھوپوں میں پریشاں سائے
چاندنی رات کی باہوں میں غزلخواں سائے
رقص کرتے ہیں شب و روز مری راہوں میں
جمع ہو کر مرے سائے سے گریزاں سائے

بے دلی درد ہے جس کا نہیں درماں کوئی　　　چھیڑتا ہی نہیں اب سازِ دل و جاں کوئی
وسعتِ ذہن ہے تپتا ہوا صحرا لیکن　　　ساحلِ فکر سے اٹھتا نہیں طوفاں کوئی

رنگ ہے، سنگ ہے، روغن ہے، صناکاری ہے
بحثِ داوراک کے افسوں کا عمل جاری ہے
کوئی تصویر مکمل نہیں ہونے پاتی
عالمِ خواب ہے یا عالمِ بیداری ہے

طائرِ فکرِ رسا، مائلِ پرواز نہیں　　　کیفیت ساز کوئی سازِ تنگ و تاز نہیں
کوئی نغمہ نہیں جو ہمسرِ مرے نالوں کا حریف　　　کوئی آواز، مری روح کی آواز نہیں

ادیب سہیل

# ایک حادثہ

ڈھلتا سورج چھپ گیا اسٹیڈیم کی اوٹ میں
قمقموں سے خواب کے بیدار ہو اٹھنے کا لمحہ آ چلا
کوئی دم میں شام جگمگ تھال میں دیپک لئے
اپنی خلوت سے نکل آئے گی جلوت گاہ میں

گلستاں، اسٹیڈیم، بیت المکرم اور خیابانِ جناح
شہر کے خوش پیکروں کی ہے حسیں تفریح گاہ

دل میں لے کر نت نئے چہروں کو پڑھنے کا سرور
میں کھڑا ہوں گلستاں کے قرب میں ریلنگ کے ساتھ
گلستاں میں چل رہی ہے گھر کی لاج

میری تنہائی سے اک پل کے لئے
کھا گیا ہے "کال گرلوں" کا حسیں جوڑا فریب

کار سے اُترا ہے پکچر دیکھنے اک میرا دوست
کار سے بہتر دمک ہے اس کی بیوی کے لبوں کے پینٹ میں

سامنے سے آ رہا ہے نو دمیدہ شب نگاروں کا ہجوم

اپنے اپنے پیرہن میں اس طرح سب ہیں اسیر
جسم کو اپنے اگر دینا بھی چاہیں خم تو دینا ہو محال
کھل کے ہنسنا اور لہرانا ہوا جن کے لئے خواب و خیال

یک بہ یک رکتی ہوئی گاڑی کے بھدّے شور نے
کاٹ ڈالی ہے مری سلکِ سرور
دوڑتے ہیں لوگ یہ کہتے ہوئے " اسٹیڈیم کے سامنے
حادثے کی زد میں کوئی آگیا "
میں بھی لمحہ بھر میں جا پہونچا وہاں
رُک گئی ہیں ہر طرف کاریں، بسیں، اِسکوٹریں
کچھ عجب منظر ہے رستے میں بپا
چند ساعت پیشتر
جا رہا تھا جلترنگوں سی ہنسی کے رنگ میں ڈوبا ہوا سرعت سے جو ہُنڈا۔
وہ اب رستے میں ہے اُلٹا ہوا
اس سے کچھ ہی فاصلے پر لستہٗ ملبوس، اک ہنس مکھ جواں بے ہوش ہے
اس کی محبوبہ کی ساری پچھلے پہیے سے بہت بے طور ہے لپٹی ہوئی
ساری سے دور
بے طرح بکھرا ہوا تازہ خراشوں سے رنگا ہے پھول سا رنگیں بدن، برہنہ ہے جس کا پیرہن
اور مجمعے میں کھڑے منظر زدہ سب مرد و زن ہیں بُت نما، بے چارہ جو بے دست و پا
مضمحل جیسے ہوئے اُن کے قویٰ
ہے سپاہی بھی کھڑا مصلوب عیسیٰ کی طرح
موٹریں اسکوٹریں ہیں بے صدا
تبھی اس پل اک ضعیف و ناتواں
لحظہ بے دست و پا کو ریلتا، سارے بتوں کو رَوندتا۔
مجمعے میں آ کر مُنا
اپنے سر کی ململی پگڑی کو بڑھ کر پھول کا محرم کیا!

رشید طیب

# اے مری عمرِ رواں

اے مری عمرِ رواں
کتنے مہتاب ڈھلے
تیرے قدموں کے تلے
اور تو نوحہ کناں
پسِ دیوارِ الم
دھوپ کے تیز دیئے
اپنے ہاتھوں پہ لئے
سست رو سست قدم
خواب آلود یقیں
شعلہ رو شعلہ بکف
ان منازل کی طرف
جو کہیں بھی تو نہیں
زخم کھاتی ہی رہی
رات زنداں میں کٹی
صبح مقتل پہ ہوئی
مسکراتی ہی رہی
اے مری عمرِ رواں

نثار ناسک

# اکیلی

جوانی کے زینے پہ تم کیوں ابھی تک اکیلی کھڑی ہو؟
تمہارے لبوں پر کسی آرزو کی کہانی نہیں ہے
تمہارے گلابی سے گالوں پہ کوئی نشانی نہیں ہے
تمہارے قدم ڈگمگانے کی لذت سے نا آشنا ہیں
تمہاری رگوں میں لہو کی کئی گھنٹیاں بے نوا ہیں
تمہارے بدن کے سمندر میں کوئی تلاطم نہیں ہے
تمہاری نظر میں کسی دوسرے کی نظر گم نہیں ہے
کسی دل کے اُجڑے ہوئے گھر میں تم سے اجالا نہیں ہے
کسی کے گلے میں تمہاری محبت کی مالا نہیں ہے
تمہاری یہ عادت
کہ تم اپنی جانب
ہر اک دیکھتی شکل پر طنز کی تلخیاں پھینکتی ہو
مری بات کو یاد رکھنا
کسی دن
تمہیں بازوؤں سے پکڑ کر
کہیں دور گذرے دنوں کے کھنڈر میں
گھماتی پھرے گی
یونہی تم اداسی کے زینے پہ بیٹھی
گئی رات تک چھپ کے رویا کرو گی
مری طرح تا دوپہر روز سویا کرو گی

انجم اعظمی

# تخلیقی ادب

تخلیقی ادب اور زندگی کے گہرے تعلق کی بابت جاننا ہو تو سنجیدگی سے کسی شاعر یا ادیب سے بات کر لیجئے کہ وہ اپنے عہد کے کتنوں دکھوں کو سمیٹے بیٹھا ہے ان دکھوں کے آئینے میں معاشرے کی ناانصافیوں اور تاریخ کے جبر کے ہزار پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ جن کو سمجھ کر آدمی ایک باشعور زندگی کا آغاز کرتا ہے اور اگر نا سمجھی کی باتیں کرنی ہیں تو اس کے لئے آپ جو زندگی گذار رہے ہیں کافی ہے۔

ذہنی آسودگی اور اطمینان چاہے بزرگوں کی دعاؤں سے ہی کیوں نہ حاصل ہوا ہو۔ ایک غیر تخلیقی اور بے شعور ذہن کی علامت ہے۔ اسی لئے مصائب کے زمانے میں کبھی کبھی ذہین اور طباع لوگوں کو بے شعوروں پر رشک آتا ہے جن کی زندگی کے مطالعے سے کم از کم ایک اہم بات کا پتہ چلتا ہے کہ احساس اور شعور کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا بے شعوری کی حالت میں آدمی کا احساس ناپختہ ہونے کے علاوہ سطحی بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ شعر و ادب کے معیار کی بنیاد ایسے جذبات و احساسات پر ہوتی ہے جس کی تربیت زندگی کے گہرے شعور نے کی ہو۔ وہ لوگ جو شاعری یا ادب کا مطالعہ صرف تفریح کے لئے کرتے ہیں۔ ادب و شعر پڑھنے کے بعد بھی اس کے اندرونی حسن سے نابلد رہتے ہیں۔ وہ ادیب یا شاعر کی فکر اس کے کرب، غم اور ان محرومیوں سے کبھی واقف نہیں ہو پاتے جن میں انصاف کی طلب، محبت کی ترنگ، حسن سے والہانہ لگاؤ، ماضی کا احترام اور ذاتی تعمیر کا تصور شامل ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں اگر اس عہد کے لوگ ادب سے بیگانہ ہیں تو اس کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ میر کا غم، غالب کا تفکر، اقبال کی بلند آہنگی اور یگانہ کا حوصلہ ان کی میراث نہیں بن سکا بلکہ اس کے دوسرے معنی ہیں اس سے بھی زیادہ تلخی ہے کہ وہ زندگی کی روایات سے بیگانہ ہو کر خلا میں دن بسر کر رہے ہیں۔ ان کے آپس کے رشتوں میں اعتماد، خلوص اور دیانت کی جگہ چالاکی، بے اعتمادی اور جھوٹ نے لے رکھی ہے۔ اور ہمارے معاشرے میں آدمی کا اب کوئی احترام باقی نہیں رہا کیونکہ شعور اور جذبے کی سطح آدمی کے کم اور زیادہ محترم ہونے کی سطح ہے اگر ایک پورا معاشرہ جذبے اور شعور سے عاری ہو تو ظاہر ہے کہ وہاں آدمی کے محترم ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ پھر کسی تہذیب یا ثقافت کا مطالبہ تو در کنار اس کی گفتگو بھی اکثر مذاق ہوا ثابت ہوتی ہے اور یہ انسانی آبادی مٹی اور لہو کا ایک ایسا جنگل معلوم ہوتی ہے جس میں تم، وہ اور میں سب زندگی گذار رہے ہیں لیکن ایک دوسرے کے پاس سے ایسے گزرتے ہیں جیسے ہم وہاں موجود ہی نہیں ہیں۔

انسانیت کش کرنسی دولتوں کی ہوس اور بھوکے لوگوں کی بے بسی اور ذلت سے ہمارے معاشرے کا اخلاقی نظام مرکب ہے۔ اس نظام میں شرافت اور انسانیت دونوں مضحکہ خیز چیزیں بن گئی ہیں۔ دولت واحد معیار ہے جس سے آدمی کو عزت والا سمجھا جاتا ہے شرافت، علم اور سچائی اب زندگی کے

ایسے بر سرِ معیار نہیں کہ ان میں دولت کا معیار اپنے لئے ثانوی حیثیت سے بھی کام نہیں آتے۔ اور ہر شخص اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ جلد از جلد وہ اپنی کوئی قیمت وصول کر لے ورنہ ہو سکتا ہے اس کے مشکل زوال کوئی اور چھین لے جائے۔ اس کو آبادی میں ہم نے سبقت لے جانے کا اصول قرار دیا ہے جس کا اس عہد کے واحد معیار "حصولِ دولت" کی حرص دلا کر آدمی میں امنگ اور آگے بڑھنے کی آرزو پیدا کرنے کا واحد ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ بھلا ایسے معاشرے میں ادب کا کیا کام۔ ادب آدمی اور آدمیت کا طرفدار ہے اور ہوس زدہ آدمی کی ذلت کو منافع خوری کے حق میں جائز قرار دیتی ہے۔ اس لئے نو دولتوں کا نظامِ حیات ادب کی آگاہی کو کفر سمجھتا ہے۔ وہ ادب کی تخلیق کے دروازے تو بند نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا تعلق براہ راست زندگی کے تخلیقی جوہر سے ہے جس میں ہر عہد کا انسان برابر کا شریک ہے لیکن ادب کے مطالعے کو بڑی حد تک بے معنی یا بے اثر بنا سکتا ہے۔ یہ بے معنویت مختلف رنگ اختیار کرتی ہے کبھی ادب کو تفریح بنا دیا جاتا ہے کبھی اسے زندگی سے کاٹ کر زبان و بیان کے حسن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کبھی اسے انسان کی ایک نفسیاتی مجبوری سمجھ کر برداشت کیا جاتا ہے یہی نہیں بعض ایسا دل حضرات (ادیب و شاعر) کے ذہنی مطالعے کے سلسلے میں ادب پڑھا جاتا ہے۔ کبھی ادب کاروبار بن جاتا ہے جس میں ادب کی ماہیت کی بحث سرے سے اٹھائی ہی نہیں جا سکتی۔ اس کے باوجود ادب کی تخلیق اور انسانی احساس و شعور کا دھارا مسلسل آگے بڑھتا رہتا ہے بظاہر مخالف حالات میں یہ بات ایک فلسفیانہ موشگافی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے معاشرے کی عریانی ہی ادب کی تخلیق کا بہانہ بن جاتی ہے زندگی کے گہرے دکھوں کے احساس سے ادب میں بھی ان کا رنگ گہرا ہو جاتا ہے۔ البتہ اس عہد کے لکھنے والے سے یہ بات ضرور کہنی پڑے گی کہ ان کی تحریر میں انصاف کی طلب اور بے انصافی کے خلاف انتہائی شدید احتجاج ملنا چاہئے جتنی زبردست رکاوٹ زندگی کی راہ میں نو دولتوں کا معاشرہ بنا ہوا ہے۔ کیونکہ کل اس عہد کے ادب کو پرکھنے کا یہی سب سے بڑا معیار ہوگا۔

ادب میں زندگی سے جس گہری وابستگی کا اظہار ہوتا ہے اس کا شعور لکھنے والا رکھتا ہے۔ اسی لئے وہ معاشرے کا ایک ذمہ دار شخص ہونے سے زیادہ باشعور فرد ہوتا ہے۔ ذمہ داری کا لفظ اخلاقی معنی میں اس حد تک استعمال کیا جا چکا ہے کہ اس سے چند چھوٹی چھوٹی ذمہ داریوں کے سوا احساس و فکر کی کسی بڑی ذمہ داری کا تصور نہیں پیدا ہوتا۔ لہٰذا ادیب یا شاعر کو باشعور فرد کہنا مناسب اور درست معلوم ہوتا ہے۔ بحیثیت ایک فرد کے ادیب یا شاعر اپنے عہد اور معاشرے کے متحرک ذہن کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کا ذہن ایک ایسے معاشرے کا ذہن بن کر سامنے آتا ہے جو ایک نظام کے تحت قائم ہے لیکن اندر سے بدلتے رہنا اس کی فطرت ہے۔ معاشرہ اور افراد میں ایک ساتھ تبدیلی ہوتی ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مسلسل تبدیلی دونوں کا ایک نامیاتی عمل ہے جس کا کوئی نقطۂ آغاز نہیں ہوا کرتا اس نامیاتی عمل ہی میں آدمی کی وہ زبردست قوت پنہاں ہے جو بڑے بڑے بحران پر قابو پا لیتی ہے۔ اور سخت سے سخت مرحلے کو آسان بنا دیتی ہے۔ یہی قوت شعور کی صورت میں شاعر یا ادیب کو میسر آتی ہے جسے وہ اپنے عہد کی منفی قوتوں کے خلاف سپر کے طور پر استعمال کرتا ہے اور زندگی کی نئی تعبیرات تک ہمارا رستہ ہموار کرتا ہے۔ اسی لئے انسانی ارتقا کی تاریخ میں جدید کا مفہوم اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ معاشرے کی رگوں میں وہ نیا خون دوڑنے لگا ہے جو منفی طاقتوں کو شکست دے کر اسے از سرِ نو بالیدگی عطا کرے گا۔ ادب ہر معاشرے کی بقا اور نشو و نما کا ضامن ہے۔ لیکن ادب کے بارے میں ایک مجموعی فلسفہ ہے جو ادب کے نام سے جو تحریریں چھپتی رہتی ہیں سب معیاری یا غیر معیاری ہو سکتی ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ادب کو جانچنے اور پرکھنے کا معیار کیا ہو یہ سوال مشکل ہے اور تفصیلی جواب چاہتا ہے۔ جس کے لئے ذہنی شعور، جذبہ، احساس اور ذوقِ جمال پر وضاحت سے لکھنا ہوگا۔ مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ انسانی رشتوں کو جس حد تک زندگی کی قدروں کی تجدید و تشکیل ادب کرتا ہے وہ اپنی کے اعتبار سے وہ معیاری اور بڑا ادب بن جاتا ہے۔ اور اگر کوئی تحریر زندگی کی قدروں کی تجدید و تشکیل میں حصہ نہیں لیتی تو وہ غیر معیاری ہو جاتی ہے۔ سچ پوچھئے تو زندگی کی قدریں ہی ادب کا معیار ہیں۔ میں یہاں فن کی بحث بظاہر چھوڑ گیا ہوں لیکن ادب کی صورت جن قدروں کی دریافت یا تعبیر کے سلسلے میں وضع ہوتی ہیں ان کا اظہار فن کا اعلیٰ درجہ بن جاتا ہے۔ اردو ادب میں بعض نقاد بلا۔ ضرورت مناسب ادب صالح کی ترکیب استعمال کی اس نے ابھی روایت کا آغاز نہیں کیا۔ اس ترکیب میں ادب کی فہم کم اور نعرہ بازی کا دخل زیادہ ہے۔ ادب کو

صحت مند اور غیر صحت مند ادب کے خانوں میں تقسیم کرنے کے بجائے معیار، ادب پر نظر رکھنے سے زندگی کی گہری جزئیات پر نظر پڑتی ہے۔ ویسے ادب کے نام سے کیا کچھ نہیں چھپتا لیکن یہ کوئی پریشان کن بات تھوڑی ہے۔ ہم جس معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں وہاں کھانے کو باسی ترکاری، باسی گوشت، اصلی گھی کے نام سے چربی، لکڑی کا برادہ ملا ہوا آٹا اور نہ جانے کیا کیا الا بلا ملتا ہے۔ پیٹ کی مصیبت ایسی ساتھ لگی ہوئی ہے کہ آدمی اچھے اور صاف ستھرے کھانے کا انتظار نہیں کر سکتا بھوک میں جو چیز ملتی ہے زہر مار کر لیتا ہے۔ لیکن اچھے اور صاف ستھرے کھانے کا خواب جس طرح ہر دل میں زندہ ہے اسی طرح اچھے اور برے ادب کی پہچان بھی باشعور لوگ رکھتے ہیں جن کے لیے ادب کی بھوک اور اچھے ادب کی تمنا بالکل ایسا ہی مسئلہ بن جاتی ہے جیسا عام آدمیوں کے لیے پیٹ کی بھوک اور اچھے کھانوں کی آرزو ہے۔ اور جس طرح خراب کھانوں کا شمار کھانوں میں کرنا آج ہماری مجبوری ہے اسی طرح ادب کے نام سے بھانت بھانت کی تحریریں پڑھتے رہنا اور ان کے پس منظر میں اس عہد کے بے شمار منفی پہلوؤں کا مطالعہ کرنا ہمارے لئے شاید ضروری ہے۔ اس کے علاوہ آج کی زندگی کی پیچیدگیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے "صحت مند ادب" کے نعرے سے بھی ڈرنا چاہئے۔ ایسا ہو چکا ہے کہ جس ادب کی صحت مکرر بتائی گئی تھی اس میں زندگی کے ادراک کے بعض پہلو موجود تھے اور جسے صحت مند ادب کا نام دیا گیا تھا وہ سطحی ثابت ہوا۔ دراصل ساری مصیبت "صحت مند ادب" کی اس ترکیب سے پیدا ہوتی جو بذات خود غیر ادبی فضا کی غماز ہے۔ ادب کو پرکھتے وقت تھوڑی بہت گنجائش ذہن میں ہمیشہ رکھنی ہی چاہیے ادب زندگی کے روشن اور تاریک پہلوؤں کو ملا کر تخلیق کیا جاتا ہے۔ اس میں لکھنے والے کا رویہ بھی شامل ہوتا ہے جس کے تصرف سے ہر فن پارہ اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے لیکن اگر ادب کے لئے لازمی ہے کہ وہ زندگی کی طرح متنوع اور رچا ہوا ہو اور ادراک و انکشاف کی صورت میں زندگی کے دھندلے اور واضح نمایاں کرے تو ہر فن پارے کو اسی میزان پر تولا جائے گا۔ وہ جس حد تک روایتی اخلاق یا دوسرے منفی رجحانات کے تابع ہوگا اسی کے مطابق اپنی قیمت کھو دے گا یا غیر معیاری ہو جائے گا یا مرجھا جائے گا۔

ہمیں تو اس صداقت کو معاشرے کا جز بنانا چاہئے جو ادب کے ذریعہ زندگی میں تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ اور ایسی اخلاقی روایات کو توڑتی ہے جو انسان کو تنگ نظری کی تعلیم دیتی ہیں۔ ادب چاہے کسی قوم کا ہو یا کسی عہد کا وسیع النظری ہمیشہ اس کا منصب رہا ہے۔ اس نے بندھے ٹکے اصولوں کے بجائے متحرک زندگی کا ساتھ دیا ہے۔ ہر آن بدلتی ہوئی زندگی میں انسانی معاشرہ بڑی تیزی سے اندر ہی اندر بکھرتا رہتا ہے اور ادب اگر ایسی قدروں کی تلاش نہ کرسکے جو ہر تبدیلی کے بعد معاشرے کی شیرازہ بندی کرتی رہیں تو وہ تخلیقی ادب نہیں ہوگا۔ تخلیقی ادب زندگی کی ساری قدروں کو ایک اکائی کی صورت میں دریافت کرتا ہے۔ اس اکائی کو چاہے معاشرے کے نام سے یاد رکھا جائے یا اسے آدمی کی ذات سمجھ لیا جائے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کیونکہ معاشرے سے مراد آدمی کی زندگی ہے اور آدمی کہہ کر انسانی معاشرے ہی پر گفتگو کی جاتی ہے ویسے کسی کے ذہن میں فرد اور معاشرے کی بحث نے سر اٹھایا ہے تو اس کے لیے وضاحت کرتا چلوں کہ آدمی کا لفظ فرد اور معاشرہ دونوں کے مفاہیم کا احاطہ کرتا ہے۔ فرد کا تذکرہ سیاسی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ جب معاشرے کا ذکر آتا ہے تو اس کے معنی بھی محدود ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب معاشرے کا لفظ علیحدہ سے استعمال ہوتا ہے تو وہ اپنے اندر وہی وسعت رکھتا ہے جو آدمی کے لفظ میں ہے۔ اگر اس سلسلے میں کسی کو کوئی شک ہو تو وہ مذہب، فلسفہ اور عمرانیات کی کتابیں دیکھ کر اطمینان حاصل کرے۔ تخلیقی ادب میں چونکہ متحرک معاشرہ ایک اکائی کی صورت میں موجود رہتا ہے۔ اس لئے زندگی کی ہر تبدیلی انسانی شعور کا حصہ بن کر اس میں ضم ہو جاتی ہے۔ البتہ کچھ عرصے کے بعد اگر معاشرے پر گہری نظر ڈالی جائے تو اس میں چند نئی جہتوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جو ماضی اور حال کے تقابل سے ابھرتی ہیں۔ لیکن معاشرے میں کسی وقت بھی زندگی کے تسلسل پر کوئی رخنہ نہیں پیدا کرتیں اگر کوئی چاہے تو اس سے ادب کی تخلیق کے بنیادی اصول بھی دریافت کر سکتا ہے۔ حال کا لمحہ زندگی گزارنے والوں کے لئے ماضی اور حال جہاں پوری طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں وہیں سے مستقبل کا دروازہ بھی کھلتا ہے اور وہی تخلیق کا اولین محرک ہے شاعر کی ذات میں ایک عظیم تہذیبی اور ثقافتی ورثہ سانس لیتا ہے جسے وہ زندگی گزارنے کی بنیاد بنا لیتا ہے۔ ماضی اور حال کی یہی ہم آہنگی

اپنے تجربوں کو جنم دیا ہے۔ جن میں زندہ ماضی کے ساتھ ساتھ زندگی گزارنے کی جدوجہد اور مستقبل کے خواب ہوتے ہیں۔ یہی تجربے ہی معیاری اور عظیم شاعری کی بنیاد بنتے ہیں اور انہی تجربوں کے سبب بڑے شاعر اپنے عہد کے نمائندے بن جاتے ہیں۔

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ شاعر پہلے ایک عام آدمی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک فرد بھی ہے جس کے ذاتی غم دوسرے انسانوں کے غموں سے مختلف نہیں ہوتے۔ وہ سماجی ناانصافیوں کا شکار ہوتا ہے۔ اپنی پسند کی زندگی گزارنے کی خواہش پوری نہیں کر سکتا۔ معاشی ناآسودگی، محبت کی ناکامی اور دوسرے دکھ اس کے حصے میں بھی آتے ہیں لیکن اسے چند ایسے دکھ بھی اٹھانے پڑتے ہیں جو خود تخلیق کی ذمہ داریوں کے سبب اس کے حصے میں آجاتے ہیں۔ فرد کی حیثیت سے اس نے جو دکھ اٹھائے ہیں ان کے تجزیے میں سارے انسانی دکھ اسے سہنے پڑتے ہیں اور ان کے اظہار کے سلسلے میں منفی قوتوں سے ٹکرانا پڑتا ہے یہ ٹکراؤ سیاسی معاشی، تمدنی غرض زندگی کے ہر شعبے میں ملتا ہے۔ جس کی وجہ سے ادب کی تخلیق کا مسئلہ مشکل ہو جاتا ہے اس دشواری پر قابو پانے کے لئے جس جرأت، دیانت، بصیرت اور فکر کی ضرورت پڑتی ہے اس کی پرورش شاعر کو اپنی ذات کے اندر کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے ہر [illegible] کسی نہ کسی حد تک بت شکن ہوتا ہے اور یہی شاعری بیشتر کسی مثبت تبدیلی یا انقلاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان ہمارے ادب میں جو نئی پود داخل ہوئی وہ اپنے پیشروؤں سے مختلف مزاج رکھتی تھی۔ علامہ اقبال نے جب اپنی فکر کو نئے اشعار میں اور علامہ کی تخلیق کے سلسلے میں یورپ کے دانشوروں اور شاعروں کا اثر قبول کیا تھا تو اس کی نوعیت بنیادی طور پر اپنانے تک محدود تھی خیالات کے رد و قبول کی حد تک ان کا تعلق یورپی تہذیب سے ہے۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے سامنے آزادی کے علاوہ جنگ [illegible] کے علاوہ ایک اور مسئلہ بھی تھا کہ وہ مشرق و مغرب کی حد بندیاں ختم کر کے اس انسانی معاشرے کا خواب ابھار رہے تھے جو مارکس اور فرائیڈ کے نظریات اور مجموعی طور پر یورپی تہذیب کے اثرات پر مبنی تھے جس نے ہمارے سماج کی اندرونی رشتوں اور بنیادوں کا کھوکھلا پن واضح طور پر ظاہر کر دیا تھا۔ مارکس کا اثر فرائیڈ کے مقابلے میں زیادہ گہرا اور وسیع پیمانے پر ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ معاشی مساوات کے مارکسی تصور پر ملکی انقلاب نہ صرف برپا ہو چکا تھا بلکہ اس کی جڑیں مستحکم ہو چکی تھیں۔ دوسرے فرائیڈ کے نظریات کو سمجھنے میں ایک دشواری یہ بھی تھی کہ جنس کے مسائل معاشی استحصال کی بنا پر جس حد تک الجھ گئے تھے اس میں فرائیڈ کے نظریات کی سائنٹفک بنیادوں کو سمجھنا آسان نہیں تھا اس لئے جن لوگوں نے مارکسی نظریات کو رد کرتے ہوئے فرائیڈ کے نام پر ادب میں کچھ کام کیا وہ یا تو ذہنی طور پر جنسی انحرافات کا شکار ہو گئے یا ان کی حیثیت زندگی کے بعض مثبت رجحانات کی مخالفت کرنے والوں کی ہو گئی۔ میراجی کی شاعری زندگی کی قدروں کا اثبات کرنے کے بجائے انحرافات کی نمائندگی کرتی ہے بعض لوگوں کو اس میں سچائی نظر آتی ہے چونکہ سچائی دنیا کی ہر شے میں کم و بیش پائی ہی جاتی ہے۔ اس لئے ہم بھی ان لوگوں کے خلوص سے انکار نہیں کر سکتے۔ راشد کی نظم "انتقام" اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

کہ راشد نے نہ تو فرائیڈ کے نظریات کو پوری طرح سمجھا اور نہ اسے آزادی حاصل کرنے والوں کے جذبہ کی صداقت ہی کی پوری خبر تھی۔ اس کی اس نظم میں ایک انگریز عورت سے جسمانی تعلق جیسے وہ ہندوستان کی آزادی سے متعلق کر دیتا ہے جنسی تشنگی کی عجیب و غریب مثال ہے۔ منٹو کے ہاں اور منٹو کے علاوہ دوسرے بعض افسانہ نگاروں اور شاعروں کے ہاں جنسی مسائل کے بےباکانہ اظہار میں اس عہد کی معاشرتی زندگی کے پیچیدہ پہلوؤں کی سطح پر ظاہر ہوئے اس عہد کا خوبصورت فن مجاز، فیض، کرشن، عصمت، بیدی، اور حیات اللہ انصاری وغیرہ کے یہاں ملتا ہے۔ عزیز حامد مدنی، اختر الایمان اور قرۃ العین حیدر کے نام اب ان کے ناموں میں شامل ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ ایک مشترک انسانی تہذیب کے خط و خال کا مطالعہ کرتے رہے ہیں جو آہستہ آہستہ مشرق و مغرب میں ہزار تعصبات کو مٹاتی ہوئی ابھر رہی ہے۔ ہمارا اپنا [illegible] اور شکست [illegible] ۱۹۶۰ء میں چھایا ہو چکا ہے۔ مارکس اور فرائیڈ کی فکر میں آئن اسٹائن کا نظریہ اضافیت بھی شامل ہو گیا

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

آغا افتخار حسین

# فرانس میں اردو

## پیرس میں مشرقی علوم کا ادارہ

فرانسیسی ادب اور ثقافت پر مشرقی زبانوں کے اثرات قرون وسطی بلکہ اس سے بھی پہلے شروع ہو چکے تھے لیکن سترھویں اور اٹھارویں صدی میں یہ اثرات بہت نمایاں نظر آتے ہیں [1] چنانچہ سترھویں صدی میں فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردہم نے مشرقی زبانوں کی تعلیم کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس کے وزیر اعظم کالبیر [2] (COLBERT) نے قانون مجریہ ۱۸ نومبر ۱۶۶۹ء کے ذریعہ یہ فیصلہ نافذ کیا کہ ہر سال نو دس سال عمر کے چھ فرانسیسی لڑکوں کو مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لئے استنبول اور سمرنا بھیجا جائے۔ ان لڑکوں کو "زبانوں کے لڑکے" (Jeunes de Langues) کہا جاتا تھا۔ یہ لقب دراصل ترکی زبان کے الفاظ (DIL OGLAM) سے لیا گیا تھا [3] ان لڑکوں کو سمرنا اور استنبول میں کاپوسین مشنریوں کے مدرسوں میں ترکی، عربی، فارسی وغیرہ کی تعلیم دلائی جاتی تھی اس تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ انہیں اسلامی ممالک میں مترجموں کی حیثیت سے یا سفارتی عہدوں پر مقرر کیا جائے ان لڑکوں کو ترکی اور فرانس میں تربیت دی جاتی تھی۔

---

[1] سترھویں اور اٹھارویں صدی کے فرانسیسی ادب پر مشرقی اثرات کے موضوع پر ایک گراں قدر تصنیف وہ مقالہ ہے جو پیر مارتینو (Pierre Martino) نے پیرس یونیورسٹی میں پیش کیا یہ مقالہ کتابی صورت میں بہ عنوان L'Orient dans la Litterature Francaise au XVII et XVIII Siecle ۱۹۰۶ء میں لبریری آشت (Librarie Hachette) کی طرف سے پیرس میں شائع ہوا۔

[2] کالبیر (COLBERT) (۱۶۱۹-۱۶۸۳ء) فرانس کی تاریخ میں بہترین وزرائے اعظم میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے ملک کے انتظامیہ، مالیہ، تعلیم اور دیگر شعبوں میں جو انقلاب آفریں اصلاحات کیں ان کے اثرات فرانس کے نظام حکومت میں اب تک پائے جاتے ہیں۔

[3] یہ الفاظ دراصل ترکی زبان کے الفاظ (DIL oglan) کا ترجمہ ہیں۔ ترکی زبان کے ان الفاظ کے معنی "زبان کے بچے" ہیں۔

اور اس کے لئے کالبیر کے حکم سے ایک علیحدہ مدرسہ موسومہ (Ecole des Jeunes de Langues) "زبانوں کے لڑکوں کا مدرسہ" قائم کیا۔ یہ مدرسہ انیسویں صدی کے شروع تک قائم رہا۔ اور اس کے بعد مشرقی زبانوں کے اس مدرسہ میں ضم ہوگیا جس کا اس مضمون میں کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا جائے گا۔

## مشرقی زبانوں کا مدرسہ،

انقلاب فرانس میں بیشتر وہ ادارے اور مدرسے ختم کردیے گئے جن کی تاسیس فرانس کے بادشاہوں نے کی تھی لیکن علوم شرقیہ کی تحصیل کی اہمیت کو انقلاب کے ارباب حل و عقد نے بھی محسوس کیا اور فرانس کے جمہوریہ بننے کے تین سال بعد انقلابی حکومت کے حکم مجریہ ۱۷۹۵ء کے تحت وہ مدرسہ قائم کیا گیا جس نے گزشتہ ایک سو ایک پچھتر سال میں مشرقی زبانوں ادب ثقافت اور تاریخ کی خدمت انجام دے کر عالمگیر شہرت حاصل کرلی ہے۔ اس مدرسہ کی مفصل تاریخ پروفیسر ژیں دینی (Jean Deny) نے لکھی ہے [1] اس مضمون میں پروفیسر دینی کی کتاب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

اس مدرسے کے قیام کا سہرا ایک فرانسیسی مستشرق لوئی لانگلے (Louis Langlès) کے سر ہے۔ لانگلے (۱۷۶۳-۱۸۲۴) عربی اور فارسی زبانوں کا عالم تھا۔ اس نے ۱۷۹۰ء میں حکومت کے سامنے تجویز پیش کی کہ مشرقی زبانوں کی تعلیم کیلئے پیرس دربار میں ایک مدرسہ قائم کیا جائے اس نے یہ تجویز ایک مضمون کے ذریعہ پیش کی جس کا عنوان تھا۔ تجارت کے نزدیک ادب اور سائنس کی ترقی کے لئے مشرقی زبانوں کی اہمیت۔ اس عرضداشت پر قومی اسمبلی نے خاطر خواہ توجہ نہ دی۔ لیکن لانگلے مایوس نہیں ہوا ۱۷۹۲ء میں وہ پیرس کے قومی کتب خانے بیبلیوتک ناسیونال شعبۂ مخطوطات کا نائب نگراں مقرر مقرر ہوا۔ یہ عہدہ سنبھالتے ہی اس نے مشرقی زبانوں کا مدرسہ قائم کرنے کی کوشش پھر شروع کردی اور قومی حکومت کی تعلیمی کمیٹی کے صدر لکانال (Lakanal) کو مدرسہ قائم کرنے کی تجویز میں اپنا ہم خیال بنالیا اور آخر کار قومی حکومت نے ۳۰ مارچ ۱۷۹۵ء کو مشرقی زبانوں کا مدرسہ پیرس میں قائم کرنے کی تجویز پر عمل درآمد کرنے کا حکم دے دیا۔

اس حکم کے فرانسیسی متن کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

قومی کتب خانہ میں مشرقی زبانوں کا خصوصی مدرسہ

قانون

منظوری دی جاتی ہے کہ قومی کتب خانہ کے احاطہ میں ایک قومی مدرسہ مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لئے قائم کیا جائے۔

مورخہ ۱۰ جرمینال سال سوئم (مطابق ۳۰ مارچ ۱۷۹۵ء) جمہوریہ فرانس واحد و ناقابل تقسیم

قومی حکومت نے مجلس تعلیم اور مجلس مالیات کی تجویز پر غور کرنے کے بعد حکم دیا ہے کہ

---

[1] ملاحظہ ہو۔ Jean Deny "L'Ecole Nationale des Langues Orientales Vivantes" مطبوعہ پیرس ۱۹۴۸ء Imprimerie Nationale de France

یہ کتاب مدرسہ کی تاسیس کے ڈیڑھ سو سالہ جشن کے موقع پر مرتب کی گئی تھی۔ پروفیسر ژین دینی اس وقت مدرسہ کے ایڈمنسٹریٹر تھے۔

۱۔ قومی کتب خانہ کے احاطہ میں ایک عوامی مدرسہ قائم کیا جائے۔ جس میں مشرقی زبانوں کی تعلیم دی جائے اور اس تعلیم میں سیاسی اور تجارتی مفوبات کو بھی مدنظر رکھا جائے۔

۲۔ مدرسہ میں حسب ذیل پروفیسر تعلیم دیں گے۔

(۱) ادبی اور عوامی عربی زبان کا پروفیسر

(۲) ترکی اور کریمیا کی تاتاری زبان کا پروفیسر

(۳) فارسی اور ملایا کی زبان کا پروفیسر

۳۔ پروفیسر کے تقرر اور تنخواہوں کے قواعد وہی ہوں گے جو مرکزی مدرسہ کے پروفیسروں کے لئے ہیں اور جن کی صراحت قانون مجریہ ۷ وینتوز میں کی گئی ہے۔

۴۔ مشرقی زبانوں کے مدرسہ میں پولیس کے قواعد کی تعمیل کی ذمہ داری مجلس تعلیم پر ہوگی۔[۱]

دستخط:۔ ایس۔ ای۔ موئل

پیلیے (صدر)

یہ حکم مارچ ۱۷۹۵ء کو صادر کیا گیا۔ اور دوسرے سال ۲۲ جون ۱۷۹۶ء سے مدرسے میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کا آغاز ہو گیا۔ تعلیم کے آغاز کے لئے جو حکم صادر ہوا اس کے فرانسیسی متن کا ترجمہ حسب ذیل ہے

حسب قانون محولہ بالا مشرقی زبانوں کی تعلیم کا کورس قومی کتب خانہ کے قریب ہم میسی دور سال چہارم (مطابق ۲۲ جون ۱۷۹۶ء) سے شروع ہو گا۔

معزز شہری لانگلے رکن مجلس سائنس فارسی زبان کے اس کورس کو جاری رکھیں گے جو انھوں نے کالج د فرانس میں شروع کیا ہے۔ وہ پہلے تیمور کے فوجی اداروں کے بارے میں تفصیلات بیان کریں گے[۲] اور اس کے بعد ان مذاکرات کا ذکر کریں گے جو شاہ رخ شہنشاہ ایران اور دے منگ شہنشاہ چین کے درمیان سیاسی اور تجارتی تعلقات قائم کرنے کے بارے میں ہوئے۔

معزز شہری سل وستر ساسی بھی انھی دنوں میں عربی زبان کے درس دیں گے۔ اس زبان کے بنیادی قواعد بیان کرنے کے بعد وہ قرآن کے چند ابواب کی شرح بیان کریں گے اور اس کے بعد کلیلہ کے مخطوطات میں سے کچھ کہانیاں سنائیں گے۔

---

[۱] پروفیسر ژبین دینی نے اپنی کتاب (بحوالہ ماسبق) میں حسب ذیل دو مزید دفعات کا ذکر کیا ہے۔

(۱) پروفیسر صاحبان اپنے شاگردوں کو ان سیاسی اور تجارتی روابط اور تعلقات سے روشناس کرائیں گے۔ جو جمہوریۂ فرانس اور ان ملکوں کے درمیان قائم ہیں جہاں یہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔

(۲) پروفیسر صاحبان ان زبانوں کی گرامر مرتب کریں گے جن کی وہ تعلیم دیتے ہیں یہ کتابیں قومی مجلس تعلیم کو پیش کی جائیں گی۔

[۲] اس سے امیر تیمور کی کتاب موسومہ "تزکات تیمور صاحبقراں فی تدبیرات الکشا فتہا" مراد ہے۔ اس کتاب کا درس کم از کم پانچ سال تک جاری رہا۔ کیونکہ ۱۸۰۰ء میں مدرسے کے کورس کے بارے میں جو اعلان ژبین دینی (بحوالہ ماسبق) کی کتاب میں شامل ہے اس میں بھی اس کتاب کا ذکر ہے۔

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

سحر انصاری

# "دشت امکاں" کا ایک سفر

## عزیز حامد مدنی کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ

(دوسری اور آخری قسط)

مدنی بعض اوقات کسی قدیم داستان یا دیومالا کے ایک کردار یا واقعے کو چن لیتے ہیں اور پھر اسے اپنے مخصوص انداز میں تاریخی شعور کے ساتھ بیان کرتے ہوئے عہد حاضر تک لے آتے ہیں اور پھر اپنے مجروح احساس کی تصویر اتارتے ہوئے سماجی ناہمواریوں کی بہت سی سنگین باتیں کہہ جاتے ہیں بعض اوقات عہد حاضر کی کسی علامت یا کسی واقعے کو نظم کرتے ہوئے کسی اسطوری علامت یا واقعے پر نظم ختم کرتے ہیں۔ "ایئر پورٹ کی رات" موخر الذکر کی ایک مثال ہے "سمندر کا بوڑھا خدا" اور "فرس تروجن" اول الذکر انداز بیان کی مثال ہیں۔ "سمندر کا بوڑھا خدا" میں مدنی نے یونانی دیومالا سے سمندر کے خدا کا تصور لیا ہے جسے باریش بزرگ، طاقتور اور قلزموں کے حکمراں کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ دیومالائی علامت دور حاضر کی ایک بڑی سیاسی طاقت انگلستان کی علامت بن جاتی ہے جس نے سمندر کے خدا کی طرح قلزموں پر حکومت کی لیکن اب یہ خدا بوڑھا ہو چکا ہے، اس میں ہر اعتبار سے انحطاط اور زوال آگیا ہے "سمندر کا بوڑھا خدا" زوال آمادہ انگلستان اور انگلستانی تہذیب فکر کے تنزل کی بہت جامع تصویر ہے۔ یہ نظم ہیئت کے تجربے کے باب میں بھی خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ پھر نظم کی بحر اس انداز سے منتخب کی گئی ہے کہ پڑھتے وقت سمندر کی موجوں کا بہاؤ، ان کے تھپیڑوں کا شور محسوس ہوتا ہے، کبھی ہلکا کبھی نرم، کبھی طوفانی، کبھی سبک سیر کبھی تند و تیز کبھی آہستہ رو۔ پھر چونکہ شاعر کو سمندر کے اس بوڑھے خدا کی تہذیب ایک فکری راہبر اور مینارۂ نور بھی معلوم ہوتی ہے اس لئے اسے اس کے فکری زوال کا غم بھی ہے۔ پہلے بند میں انگریز قوم کے کارناموں اور اس کی سربرآوردہ تاریخ کا حوالہ دیا ہے لیکن اس طرح کہ خود شاعر انگلستانی قوم کے تفاخر و مباہات کا حصہ بننے کے بجائے اس کی نوآبادیاتی چالوں کا پس منظر نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنے احساس کو پیش کرتا ہے:۔

تیری ارض وطن کل سمندر کے بوڑھے خدا کا نشیمن تھی اے جان جاں
اور سمندر کے بوڑھے خدا کی بہت تیز موج نفس سے سفینے تیرے ملک کے
بادبان گرہ خوردہ میں باندھ لیتے تھے موج ہوا کو
چیر جاتے تھے موج بلا کو
ہر دخانی سبک سیر کشتی کی آواز پر چونک اٹھتا تھا تاریک جغرافیہ، ایشیا کی
زمیں چونک اٹھتی تھی۔
کل ترے ملک کی تاجری قفل گودام میں جڑ گئی تھی

دیو قامت تنومند مشرق کے پائے طلب میں
حسابات کی ایک زنجیر سی پڑ گئی تھی

اس کے بعد سمندر کے بوڑھے خدا کا دوسرا رخ سامنے آتا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب اس کے سفینے بادبان گرہ خوردہ میں موج ہوا کو اسیر کر لیتے تھے۔ لیکن اب اس کے حریفوں میں وہی موج ہوا شامل ہے۔ اس کے سفینے کرم خوردہ اور اس کے بادبان سرنگوں ہو کر اپنا چہرہ چھپائے گریہ وزاری میں مصروف ہیں۔ ایک زمانے میں ہواؤں کے جن ایشیا کے بیابان سے خام اشیاء کو اس طرح اٹھا لاتے تھے جس طرح الف لیلوی جن حبشی کنیزک کو۔ لیکن اب ہواؤں کے وہ جن سو گئے ہیں۔ نوآبادیاتی نظام ٹوٹ چکا ہے۔ جس کی اقلیم میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ وہ کسب نور کے لئے چراغوں کا محتاج ہے۔ اس کے سفینوں پر عرصۂ حیات تنگ ہے۔ آج وہ زمانہ آگیا جب محکوم قوموں نے اپنا حق پالیا۔ اور حاکموں کو بھی عام انسانوں کی طرح محتاج بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ خود شاعر کے وطن میں جہاں اس نے دوسروں پہ عرصۂ زندگی تنگ کر دیا تھا سمندر کے بوڑھے خدا کو ایک ننھے پرندے کی طرح آشیاں سازی کے لئے آنا پڑا:

ایک ننھے پرندے کے مانند تو بھی میرے ملک میں آشیاں ساز ہے
دانۂ دوام کی عافیت میں گرفتار ہے۔

پھر ان حقائق کی طرف اشارے ہیں کہ شعلِ حیلہ گاہِ فرنگ کے بجھ جانے کے بعد سمندر کے بوڑھے خدا کی موج نفس بھی بھکاری بن گئی ہے انگلستان جیسے ملک کو بھی عالمی بینک جیسے اداروں اور امریکہ جیسے سرمایہ دار ملکوں سے قرض لینا پڑ رہا ہے اور وہ کاہن جو روح فردا پہ قابض تھے اب تنہائی میں بیٹھ کر فاؤسٹ کی طرح ایسے اعمال میں مصروف ہیں جن کے ذریعہ شیطان کے ہاتھ وہ اپنی روح فروخت کر سکیں یہ رمز شناس فطرت جو دراصل سرمایہ داری نظام کے وظیفہ خوار ہیں۔ یہ اہل دانش جو چیرہ دستی ظلم اور ناانصافی کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ ایسے ہیں جیسے کوئی خزانے کے منہ پر بیٹھے ہوئے سانپ کو دودھ پلا کر پال رہا ہو:۔

آج دریوزہ گر ہے سمندر کے بوڑھے خدا کی بھی موج نفس
خانہ مزد سے قرض لیتی ہے یہ قوتِ بازوئے بال افشاں کبھی
دادو بنیش کے رمز کہن کے جو کاہن تیرے ملک میں روح فردا پہ قابض تھے۔
فاؤسٹ کی مشق کرتے ہیں تنہائی میں
کاسۂ رمز جادوگری کے لئے
روح کو تولتے ہیں ترازوئے دانائی میں
صورتِ مار گنجینۂ زر پہ بیٹھے ہوئے تاجروں کو
پیالۂ کوئی شیر کا دے کے موج ہوا میں سموتے ہیں زہراب کو۔

پھر ایشیا کی بیداری کا ذکر ہے۔ چین اور ہندوستان محکومی کے دور سے نکل چکے ہیں۔ اب ان کی اپنی فراست کام آرہی ہے ہمالہ کی برف کہن سالہ بھی بیدار ہے

شعلۂ تند تر پا کیاں کچھ نہ پوچھ
آج بھی کوئی سلکِ فراست زمیں دوز بارود کے خط آتش نفس کی طرح کر رہی جا تا ہے

بے حس سلوں کو دو نیم

فکر کی اس قوت کو جو ڈائنا مائیٹ کی طرح بے حس چٹانوں کو دو نیم کر دیتی ہے بڑے منفرد انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ سمندر کا بوڑھا خدا اب اس قدر معذور و مجبور ہے کہ اسے :۔

کوئی تازہ ہوا کوئی موج نفس قرض دیتا نہیں
آج بوڑھے خدا کی لہو ریز آنکھوں میں طوفاں کی طاقت کی اک رو
کوئی دادرس قرض دیتا نہیں ۔

اس نظم کے آخر میں شاعر محکوم قوم کے باضمیر اور شریف انسانوں کی علامت بن جاتا ہے جنہیں چاہتے کہ حاکم قوموں کا اقتدار چھن جانے کے بعد ان کے عوام اور ان کی نسلوں کو ان کے ماضی کی ستم رانیوں کی سزا سہنی پڑے ۔ مدنی کہتے ہیں : تیرے وطن کا میں بھی نا قدر ہوں اور تو میرے ملک میں ایک طائر ہجرت زدہ کی طرح آشیاں ساز ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ ماضی کی کامیابیوں اور کامرانیوں پر فخر کرنے کے بجائے نئے حالات سے سمجھوتے کے بعد ایک ایسی پرامن فضا پیدا کرے کہ تیرا آشیاں بھی بیّے کے گھونسلے کی طرح بادصرصر کے تھپیڑوں میں قائم رہے پھر ان مصرعوں پر نظم ختم ہو جاتی ہے

بھول جا اب سمندر کے بوڑھے خدا کو دریدہ کہن بادباں کو ہوا کو
روحِ نیلسن پکارے تو کہنا تیرے ملک کی نا خدائی کا عہد گراں مایہ ـــــ
ساحل پہ اک عالم جانکنی میں ہے
آج آخر سمندر کے بوڑھے خدا کو وہی قلزموں کی سیاہی سلانے لگی ہے
ــــــ جو کل اس کا بیرق تھی !

" فرس تروجن " میں یونانیوں اور اہل ٹرائے کی جنگ کا نقشہ کھینچا ہے اور یونانی دیومالا کے مشہور چوبی گھوڑے کو اس نظم میں ریاکاروں اور آستین کے سانپوں کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے جو بظاہر آپ کے ملک میں ' آپ کے معاشرے میں بے ضرر اور خوبصورت معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر آپ کی تباہی کا سامان پوشیدہ ہوتا ہے ۔ یونانی فوج چوبی گھوڑے میں پوشیدہ تھی اور رات کو جب شہر ٹرائے کے باشندے سو گئے تو یونانیوں نے اسپ چوبی سے نکل کر ٹرائے کو آگ لگا دی اور اہالیان شہر کو تہہ تیغ کرنے لگے ۔ مدنی کے خیال میں سیاست عالم کے انہی خنیم نما دوستوں نے زمین پر کشت و خون برپا کیا ہے ۔ اس نظم کے آخری بند میں مدنی نے اپنے دور کی عکاسی کر کے اس دیو مالائی داستان کو عہد حاضر کی علامت بنا دیا ہے ۔ انھیں یوں لگتا ہے جیسے ہر قدم پہ اسی قسم کی خفیہ سازشیں باضمیر انسانوں کے خلاف کام کر رہی ہیں ۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی اس اسپ چوبی کے آہنی کواڑوں کو کھول کر آج بھی ہمارے معاشرے میں چوروں کی طرح داخل ہو رہا ہے اور آج بھی :۔

ہر اک قدم پہ حریفانہ سائے ملتے ہیں
اسی فرس کے رقیبانہ سائے ملتے ہیں

اس نظم کی فضا منظوم داستان کی سی ہے ۔ اور داستان کی جزئیات کو بڑے موثر اور پر تصویر الفاظ میں بیان کیا ہے اس نظم کو پڑھ کر ایلیس کی NOSECOND TROY یاد آجاتی ہے ۔ مدنی کی نظم ایٹس کی نظم سے بہت مختلف ہے ۔ لیکن دونوں میں جذبہ تقریباً

یکساں ہے کہ اب کسی اور ٹرائے کو نذرِ آتش نہیں ہونا چاہیئے۔

اس سے پہلے میں نے "آبادی کے دائرے" "کوئی شاخِ آشنا" اور "ایئرپورٹ کی رات" جیسی نظموں کا ذکر کیا ہے جو ہیئت بحر اور لہجے کے اعتبار سے یکساں ہیں اور چونکہ مدنی نظم میں تاثراتی اور علامتی تصویرکشی کرتے ہیں۔ اس لئے الگ الگ ہونے کے باوجود ان کی یہ نظمیں ذہن کی ایک خاص فضا کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان سب میں سماجی جبر، ذات کا المیہ اور کائناتی رشتے دورِ حاضر کی جدید ترین کیفیتوں اور صداقتوں میں سے ابھرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک اور نظم کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے — اے گھومتے لمحوں کے چاک — اس نظم کے پس منظر میں بھی رات ہے اور نظم کا آغاز اس فضا میں ہوتا ہے:۔

رات کی آوارہ روحوں کا شوالہ جاگ اٹھا
اک دھواں مجمر سے اٹھا ہے سوال اندر سوال
شبنمِ خفتہ کے مس سے داغِ لالہ جاگ اٹھا

رات کی آوارہ روحوں کے شوالے اور مجمر نے ایک پراسرار معبد کی سی فضا پیدا کر دی ہے اور دھویں کے پے بہ پے اوپر اٹھنے کی تصویر سے سوال اندر سوال کیفیت کا مرئی اور مادی اظہار ہو گیا ہے۔ آخری مصرعے میں ایک فوری اور بے ساختہ حرکت اور جنبش کا احساس ہوتا ہے۔

شبنمِ خفتہ کے مس سے داغِ لالہ جاگ اٹھا

شہر میں لگے ہوئے پوسٹروں کو سب نے دیکھا ہے لیکن آوارہ روحوں کے شوالے سے نکل کر جب مدنی اس منظر کی طرف نگاہ اٹھاتے ہیں تو ان کے حساس اور متجسس ذہن کو یوں محسوس ہوتا ہے گویا پھٹے ہوئے پرانے پوسٹر سے شہر کی روح جھانک رہی ہو۔ ہمارے یا کسی بھی بڑے شہر کی زندگی کی عکاسی کے لئے اس سے اچھی علامت مشکل سے ملے گی۔

دور اک واماندہ شب خستہ سگنل کے قریں
اک پرانے پوسٹر سے جھانکتی ہے روحِ شہر

پھر کاروباری شہر میں سٹے اور سود در سود سرمایے کے جال سے ابھرنے والی ایک نفرت بھی ہے جو یہ احساس دلاتی ہے کہ بے ضمیروں اور نفع خوروں نے یہ امتیاز بھی ختم کر دیا ہے کہ آب گہر کی یہ پردہ پوشی گوہر فروش کرتا ہے یا کوئلے کی روحِ تیرہ فام — اس پس منظر میں نظم کا یہ بند ملاحظہ کیجئے۔ اس میں تاجروں کی مخصوص ذہنیت اور نفع خوروں کی نفسیات کا تجزیہ بھی ملتا ہے اور ایک بے روایت اور بے ضمیر طبقے کی ہوس اور بے حیائی کی تصویر بھی:۔

بلیک کے سودوں میں روحِ تاجری ہے بے لباس
چور دروازے حسابوں کے ہوئے ہیں نیم وا
کھنچ رہے ہیں نرخ کے فیتوں پہ کچھ خطِ قیاس
کوئلے کی روحِ تیرہ فام یا گوہر فروش
قیمتِ آخر کی رو میں دل زدہ آب گہر
پوچھتی ہے کون میری اصل کا ہے پردہ پوش

مانگتی ہے روحِ شب بے خوابیاں تاروں سے قرض
بطن بے تقصیر کے لسیاں قبا شہری ہنوز
اک نہ اک نامِ پدر لیتے ہیں دیواروں سے قرض

اس سوداگرانہ اور تاجرانہ فضا میں ناانصافیوں اور حق تلفیوں کے ہاتھوں یوں لگتا ہے جیسے آگہی کی نرم جاں میزان پر کوہساروں کا بار ہو۔ اس وقت شاعر محسوس کرتا ہے کہ اسلاف کو اور پیش روؤں کو کرب اور تضاد کے اتنے بڑے امتحان سے نہ گزرنا پڑا ہوگا

آگہی کی نرم جاں میزاں پہ کہساروں کا بار
روح آبا طفلِ حیرت آشنا کی آنکھ سے
دیکھتی ہے اب سرِ مژگاں پہ دیواروں کا بار

ذہنی کیفیتوں کو مادی نیا دینے اور غیر مرئی احساس کو آنکھوں سے دکھا دینے اور بالفعل محسوس کرا دینے کا اس سے اچھا انداز اور کیا ہو سکتا ہے کہ روحِ آبا طفلِ حیرت آشنا کی آنکھ سے

دیکھتی ہے اب سرِ مژگاں پہ کہساروں کا بار

اس نظم کے ایک بند کو سمجھنے کے لئے ذرا دیر کو کیمسٹری کی تجربہ گاہ میں چلئے۔ مختلف غیر حل پذیر کیمیاوی مرکبات کو حل کرنے کے لئے انھیں کسی کیمیاوی محلول میں ڈال کر بیکر یا شیشے کے بادیئے میں انڈیل دیا جاتا ہے۔ پھر جب اس بیکر (BEAKER) کو اسپرٹ لمپ یا گیس برنر پر رکھتے ہیں تو کیمیاوی سفوف کے ذرات ایصالِ حرارت (CONDUCTION OF HEAT) کی وجہ سے بیکر کی تہہ سے اٹھ کر اوپر جاتے اور اوپر کے ذرات نیچے آتے رہتے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب منظر ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے محلول کی سطح اور تہہ کے درمیان کیمیاوی سفوف کے ذرات مشقِ خرام کر رہے ہیں۔ اب اس دنیا کو ایک بیکر تصور کیجئے۔ جس کا بالائی حصہ آسمان ہے۔ اور تہہ میں انسان یا دوسرے لفظوں میں ذرات ہیں۔ روحِ ایجاد نوی اس بیکر کو آگہی تلاش اور جستجو کی آگ پر رکھتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے مہر و ماہ کے درمیان ہم جو وقت کی طنابوں کو کھینچ کر سفر کرنے اور نئے نئے سیاروں پر قدم جمانے کی کوشش کر رہے ہیں ان ذرات کے مشابہ ہیں جو شیشے کے بادیئے یا بیکر میں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر حرکت کر رہے ہیں۔ اس بند میں کائناتِ بسیط میں انسانی وجود کی حیثیت کا ایک ہلکا سا عکس دکھایا گیا ہے۔ اب ذرا اس کی معنویت پر غور کیجئے:

آگ پر رکھتی ہے بیکر روحِ ایجادِ نوی
مہر و مہ کے درمیاں کرتی ہے اک مشقِ خرام
وقت کی زنجیر پر ذرات کی تازہ روی

اور یہ ساری کوشش یوں ہے کہ انسان جہانِ تازہ کی نمو چاہتا ہے۔ وہ تمنا کا دوسرا نقشِ قدم تلاش کر رہا ہے۔ انسان اگر ایک طرف عدل، امن اور مساوات کا متلاشی ہے تو دوسری طرف وہ خلائی سفر، تسخیرِ کائنات کے جذبے سے بھی سرشار ہے اور مصنوعی سیاروں کے ذریعے زمان و مکاں کے سربستہ راز بھی فاش کر رہا ہے۔ اسپتنک واشنگٹن اور لونا ٹہم اور دہم کے دور میں:۔

زندگی کو ہے متاعِ نارسیدہ کی تلاش
روحِ فردا کو ہے اندیشوں کی اس پہنائی میں

اک سہی قد پیکرِ ناآفریدہ کی تلاش

اس ساری جستجو کا حاصل انسان اور زندگی ہے۔ زندگی جو جنبش اور حرکت سے عبارت ہے اور جب تک زندگی میں توانائی اور جنبش کا عنصر موجود ہے فنا اس کے عزائم کو ختم نہیں کرسکتی۔ اسی لئے مدنی لمحوں کے چاک سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں :۔

اے دمِ آفاق وبالِ آتشین و روحِ خاک
زندگی جو تغیر ہے تو کیا خطِ اجل !
جانِ جنبش تو، ابد تو، گھوم اے لمحوں کے چاک

ان ماشراتی نظموں کے علاوہ مدنی کی بعض ایسی کامیاب نظمیں بھی ہیں جن کے تار و پود کسی ایک علامت کے گرد بنے گئے ہیں۔ ان میں "آپریشن تھیٹر" "رصدگاہ" "چوپال" اور "آخری ٹرام" قابلِ ذکر ہیں۔ آپریشن تھیٹر شہری زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ اس کا ایک مخصوص ماحول ہوتا ہے۔ بڑے ہسپتال میں صاف اور خاموش کمرہ۔ درمیان میں ایک میز، اس کے اوپر تیز روشنی کا ایک دائرہ۔ بے شمار قینچیاں اور چاقو۔ سرجن اور نرسوں اور مددگاروں کے سفید سفید لباس اور نقابیں۔ سارا سامان جراثیم سے پاک کیا ہوا اور پھر سرجن کا ہنرمند ہات انسانی جسم کے بہت ہی نازک حصوں کو مقراض و نشتر کی مدد سے قطع کرتا ہے۔ بیمار عضو کو الگ کرکے پھر انسانی جسم کو اسی طرح سی دیتا ہے۔ زخم مندمل ہوجاتے ہیں۔ اور کبھی کبھار جسم میں زہر پھیل جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جراثیم سے پاک اوزار کے باوجود یہ غیر مرئی مخلوق چور دنگی طرح جسم میں در آئی تھی۔ زخم ناسور بن جاتے ہیں اور اسی میں کچھ لوگ ہلاک بھی ہوجاتے ہیں۔ مدنی کی نظم آپریشن تھیٹر پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ذاتی زندگی کا کوئی نہ کوئی واقعہ آپریشن تھیٹر سے وابستہ ہے۔ اس کی تمام جزئیات کو انھوں نے غائر مشاہدے کے بعد نہایت خوبی سے نظم کیا ہے۔ نظم ختم ہوتے ہوتے یہ آپریشن تھیٹر خود سماج بلکہ پوری دنیا کی علامت بن جاتا ہے جس میں زہر آگیں جراثیم یعنی جنگ۔ افلاس، قحط، بیکاری اور بے حسی غنیموں کے روپ میں صحت مند ذہنوں پر حملہ کرتے رہتے ہیں نشتر جراح چارہ ساز بن کر آتا ہے۔ لیکن سازشیں ہر نئی کروٹ اور ہر تازہ تدبیر کو بے اثر بنا دیتی ہیں۔ اب ذرا مدنی کے مخصوص لب و لہجے میں آپریشن تھیٹر کے ماحول کو دیکھئے :۔

زخم کو آئینہ دکھاتی ہوئی
نیم گردوں ہے قرص نور افگن
جسم پر زاویئے بناتی ہوئی
دستِ جراح سے لپٹتی ہوئی
محو اک انقطاعِ درد میں ہے
تیز نشتر کی روشنی ہوئی
زخم کی تیرگی کو دھوتا ہوا
درد درمانِ درد ہوتا ہوا

اس ماحول میں، اس کیفیت میں چارہ گر حرفِ تسلی بھی ہے اور بہانۂ تاب چارہ جوئی بھی۔ پھر زہر آگیں جراثیم کا خیال بھی ہے انفاؤں کو مسموم اور جسموں کو معذور بنا رہے ہیں۔ یہ جراثیم تاریخِ انسانی میں دور تک نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ ہر دور

اور ہر زمانے میں کمین گاہوں میں چھپ کر بیٹھتے اور انسانی وجود پر اچانک یلغار کر دیتے ہیں۔ پھر یہ احساس ایک وسیع کینوس پر پھیل کر یہ رنگ اختیار کر لیتا ہے:۔

جنگ، افلاس، قحط، بیکاری
بے حسی کی فصیل اور انساں
حادثوں کی یہ تنگ دیواری
دور تک اک محاذ خاموشی
تیز جوڑے ہوئے غنیموں کی
چارسو خندقوں میں روپوشی
درد کے سیل بے پناہ میں ہے
ہر جری ایک رزمگاہ میں ہے

ہر باشعور فرد اس ماحول سے ان غنیموں سے نبرد آزما ہے لیکن یہ جبر اتیم ــــ انسانی معاشرے کے یہ کرم زہر آگیں مدافعت اور سلامتی کے تمام اسلحوں کو بیکار کر دیتے ہیں۔ ان کی ضرب سے تیغ کی دھار مڑ جاتی ہے اور آہنی ڈھال ٹوٹ جاتی ہے اور یہ جنگ اب تک جاری ہے:۔

قصۂ زخم و اندمال نہ پوچھ
جنگ جاری ہے ہم خیال نہ پوچھ

یہ پوری نظم اس دور کے ایک اہم رُخ سے نقاب اٹھاتی ہے اور وہ ہے سرد جنگ۔ بیسویں صدی کے نصف آخر کی سیاسی دنیا نے جو بہت سے قابل ذکر کارنامے سرانجام دیئے ہیں ان میں ایک سرد جنگ بھی ہے۔ اس عالم میں غیر محسوس طور پر اقوام کے مابین جنگ اور استحصال کا عمل جاری رہتا ہے۔ بساط سیاست کی اس مجرمانہ ہنر بازی کی کیفیت کو مدنی نے "آپریشن تھیٹر" میں بڑے نئے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ اس قبیل کی دوسری نظم "رصدگاہ" میں مدنی نے بظاہر علم فلکیات کے مرکز سے اپنی نظم کا موضوع اخذ کیا ہے۔ جہاں سے دوربینوں کی آنکھ خلائے بسیط میں رقص کرتے ہوئے دور افتادہ سیاروں کو دیکھتی ہے لیکن ذکر در اصل فنکار کی زندگی اور شاعر کے خلوت خانے کا ہے جہاں بیٹھ کر وہ اپنے محبوب کے بارے میں اس طرح سوچتا ہے۔ جس طرح ایک ماہر فلکیات دوربینوں سے سیاروں کے مدار، ان کی گردش اور ان کے فاصلوں، نیم روشن اور نیم تاریک چہروں کو دیکھا کرتا ہے۔ مدنی کی رصدگاہ در اصل صوت وحرف کی رصدگاہ ہے۔ جو کبھی بے در و دیوار خانۂ محبوب بن جاتی ہے۔ کبھی ایک ایسا کھنڈر جس میں ہزاروں چراغ روشن ہوتے ہیں۔ یہاں کبھی لوحِ سادہ پر حرفوں کے نیم دار روزن نظر آتے ہیں اور کبھی ایسی خلوتیں۔ جہاں نیند کی قنائیں استادہ ہوتی ہیں یہاں شاعر چہرۂ ساعت کی اوٹ سے محبوب کے نیم رخ چہرے کا پرتو دیکھتا ہے۔ یہیں کنار رجاں میں ایک شہر وصال آباد معلوم ہوتا ہے جہاں محبوب کی یاد سے پرچھائیوں کا ایک ہجوم دکھائی دیتا ہے۔ نظم کا پہلا بند یہ ہے:۔

رمیدہ وقت کے سایوں سے اس قدر آباد
یہ میرے فن کا فسردہ ملول ویرانہ

درِ سکوت پہ اس کے قضا نے حرف لکھے
سمجھ میں آنے لگا کچھ نہ کچھ کنایۂ وقت
ٹھہر ٹھہر کے وہ کلکِ ہوا نے حرف لکھے

نظم کی فضا بہت خاموش' دھیمی اور تنہا ہے۔ جس میں بنیادی طور پر صرف وقت اور ہوا کے گزرنے کا احساس ہے۔ ہجر کی ایک بظاہر غیر مضطرب لیکن بباطن متلاطم کیفیت طاری ہے۔ پھر وقت کے گزرنے سے فنا اور تغیر کا احساس بھی جاگ اٹھتا ہے۔ اس عالم میں ہوا کے رک رک کے چلنے کو کس خوبی سے کلکِ ہوا کا ٹھہر ٹھہر کے لکھنا کہا ہے

ٹھہر ٹھہر کے وہ کلکِ ہوا نے حرف لکھے

اس مصرعے کو پڑھ کر مجھے بیدل کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے

پریشاں می نویسد کلکِ موج احوال دریا را

ان دونوں مصرعوں میں ٹھہر ٹھہر کے اور پریشاں کا فرق مدنی اور بیدل کے مزاج کا فرق ہے

پھر اسی نظم میں محبوب کی شخصیت' اس کے خط و خال اور بدن کے زاویوں کا ذکر کیا ہے' ایک ایسا محبوب جس کی یاد لمحات گزشتہ کی بازگشت بن کر آتی ہے

یہ زاویے ترے رُخ کے' یہ فاصلوں کا قیاس
بسا رہے ہیں اک اسلوبِ تازہ سے مہ و سال
نئی نئی سی کئی بستیاں سرِ قرطاس
کہیں کہیں ترے قدموں کی آہٹیں اب تک
حروفِ سادہ میں لیتی ہیں کروٹیں اب تک

ہجر کی ان تمام کیفیتوں میں شاعر کا فطری جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ یعنی وصلِ محبوب۔ لیکن زندگی اس قدر سادہ نہیں۔ زندگی اختیار سے اس قدر عبارت نہیں کہ لمحے بھر میں ہجر کو وصل سے اور دوری کو قرب سے بدل لیا۔ رصد گاہ صوت و حرف بیٹھا ہوا ناظرِ انجم اور بینائے کوکب ایک شاعر ہے۔ معاشرے کا ایک حساس اور ذمہ دار فرد ہے جو یہ جانتا ہے کہ اس کی ذاتی زندگی میں بھی ایک ذہنِ عالم کا۔ فراہم اس کا جبر سوچنا' محسوس کرنا اور لکھنا ہے اس کے قلم سے صد ہزار تشنہ سوال الجھے ہوئے ہیں' اس کی ذات اور اس کے عہد کے مابین نیک و بد کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں ہٹلر ہے مسولینی ہے پہلی اور دوسری جنگِ عظیم ہے۔ ٹامس مان ہے۔ مارکس ہے۔ امریکہ ہے پال رابسن ہے۔ آئن اسٹائن ہے' جنرل فرانکو ہے' دنیا کے دو ارب فاقہ زدہ انسان ہیں $E = MC^2$ ہے' ایٹم بم ہے۔ ہیروشیما ہے۔ جاز کی موسیقی ہے' افریقہ کے محکوم قبائل کے نوحے ہیں' دیت نام ہے تائیوان ہے۔ تسخیر خلا ہے' اسپٹنک ہے' چاند کا اندیکھا رُخ ہے تیسری عالمی جنگ کا خطرہ ہے۔ کائناتِ اکبر (MACROCOSM) اور کائناتِ اصغر (MICROCOSM) پھر سود و سرمائے کا جال ہے۔ بینکوں کی بلند عمارتیں ہیں۔ سڑکوں کا سیاہ ضمیر ہے' انسان کے ایک خاص طبقے کی بے حسی ہے بسوں کا شور ہے۔ پٹرول کے چشمے ہیں۔ فردوسی اور غالب کا آدرش ہے' ہیملٹ ہے۔ کنگ لیئر ہے قلوپطرہ ہے۔ اور اپنے شہر کی اداس اور نیم برہنہ بھکارن ہے۔ ایسے عالم میں وصلِ محبوب کہاں ممکن ہے۔ زندگی اور ذہن کی توانائی ابھی انہی رشتوں سے پیدا ہونے والے سوالوں کا جواب دینے میں صرف ہو رہی ہے۔

فضائیں دشمنِ جاں ہیں ہوا حریفانہ
مزاجِ دانِ تغیر رہا ہے برسوں سے
یہ میرے فن کا فسردہ ملول ویرانہ
سمندروں کا مدو جزر دشت در کا غبار
قلم سے الجھے ہوئے صد ہزار تشنہ سوال
رم و سکون و طلوع و غروب کی پیکار
حدیثِ دل میں ہوئی کس حقیقی سو صرف پوچھ
سمو رہی ہے ابھی نیک بد کے ہنگامے
کن آئینوں میں رصدگاہ صوتِ حرف پوچھ

مدنی کو ان صد ہزار تشنہ سوالوں کا ہر لمحہ خیال رہتا ہے۔ ان کا یہ احساس غزل اور نظم کے اکثر اشعار میں ملتا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ کہنہ سوال ہیں اور بعض اوقات ان کا جواب دینے کے لئے سقراط کی طرح زہر کا پیالہ پینے اور عیسیٰ کیطرح کانٹوں کا تاج پہن کر مصلوب ہونے کی ضرورت ہوتی ہے

کھڑی ہے تاج پہنے شہر میں خار مغیلاں کا
جواب تازہ دینے زندگی کہنہ سوالوں کو
مئے کہن کو فسونِ مسیح دے ساقی
کہ گفتگو ہے حریفان بادہ پیما سے

دوسرے شعر کو پڑھ کر اس سے مختلف فضا کا حافظ کا یہ شعر بھی یاد آجاتا ہے

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر حریفان بادہ پیما را

بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے مدنی اندیشوں کے شاعر ہیں۔ انکی گرہ میں انسانی لغزشوں کی ایک طویل تاریخ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان غلطیوں اور لغزشوں کا اعادہ نہ ہو جو ماضی میں ہو چکی ہیں چنانچہ جب کبھی وہ سیاست کی سفاکی۔ تجارت کی بے ضمیری ارباب دولت کی بےحسی اور وقت کے تباہ کن تغیر میں سے کسی کی نیت کو بدلتا دیکھتے ہیں تو ان کے ذہن میں تمام اندیشے بیدار ہو جاتے ہیں اور ان کی روشنی میں مدنی کا شعور تباہی سے ڈرنے لگتا ہے وہ زندگی کے منفی راستے سے بچنا چاہتے ہیں۔ وہ بوئے گل، حرفِ بیاں کو سلامت رکھنا چاہتے ہیں مدنی کو بوسۂ نرم جاں کی حفاظت کا بھی اتنا ہی خیال ہے جتنا زلیخا کے کسی مرنہاں کا۔ ان کے حساس ذہن کو عافیت نام کی کوئی چیز پسند نہیں آسکتی بزم بادہ نوشی میں بھی وہ شعور کی گرفت سے آزاد نہیں ہوتے۔ انھیں یوں لگتا ہے جیسے قلزم بادہ خوار کا میں بھی جان لیوا نباتات (PARASITES) ہیں اور رات بھر اس قلزم میں جال پھیلا کر چلنے سے صبحدم صرف نشوں کے ابنخ ہاتھ آئیں گے — سی بے حاصل اذیاں کا احساس بڑھ جائے گا کرب کی اس جانکاہ کیفیت اور معاشرے میں بعض انسانی تدابیر کی ناکامی کی تصویر کشی کے لئے مدنی نے بحری حیاتیات (MARINE BIOLOGY) سے علامات اخذ کر کے ——— یہ مصرعے کہے ہیں:۔

کائی ہے۔ شاخِ مرجاں کے قطعات ہیں
اس شب بادہ خواری کے قلزم میں بھی
کس قدر رجاں لیوا نباتات ہیں
رات کی ماہی گیری بھی کیا پائے گی
چند اسپنج اترے ہوئے نشوں کے
صبحدم جال میں آ کے لے جائے گی

اسی طرح وصل محبوب کی ساعتوں میں بھی انہیں سماجی جبر اور وقت کی نامساعدت کا احساس رہتا ہے۔ زندگی ان کے لئے تشنہ سوالوں کا گرداب اور صد ہزار اندیشوں کا بھنور ہے۔ لیکن انہیں اس زندگی سے پیار ہے۔ اسی لئے وہ پوری ذمے داری اور جانفشانی کے ساتھ اس گرداب سے نکلنا یعنی تشنہ سوالوں کا جواب دینا اور اندیشوں کے کوکناری دھویں سے اپنے ذہن اور اپنے معاشرے کے اجتماعی ذہن کو بچانا چاہتے ہیں۔" رصدگاہ" کی طرح ایک رم خوردہ دریا میں بھی مدنی کو زندگی کے سنگین حقائق کا لحاظ ہے انہیں یہ احساس کہ آج کے آدم کا شجرِ ممنوعہ کے قریب جانا اس قدر آسان نہیں۔ وہ وصل محبوب کی ساعتوں میں اپنے احساس کی تصویریں پیش کرتے ہیں

جانِ من سوئیاں ساعتِ تازہ دم کی
ایک رم خوردہ دریا کی موجیں ہیں
ان کی سفاک جنبش کی رو میں شبوں کے گرہ بستہ در
رشتۂ شوق کے سیکڑوں سلسلے
نیند آدم کی ٹوٹی تھی جس کی گھنی چھاؤں میں اس شجر تک
پیچ در پیچ بکھرے ہوئے فاصلے
خار و خس کا اک انبار ہیں

انہیں یہ معلوم ہے کہ وقت کا رم خوردہ دریا جو وقت کا جبر ہے۔ حسن کے حق — میں بھی اتنا ہی بے رحم ہے۔ جتنا اس دنیا کی کسی اور شے کے حق میں۔

رو ند ڈالیں گی یہ سوئیاں ساعتِ تازہ دم کی
تیرے تازہ لبوں میں دھڑکتے ہوئے گرم بوسوں کی نوخیز فصل
تیرے شاداب چہرے کا رنگ

مدنی کو شدت سے اس بات کا احساس ہے کہ زندگی کی پر مسرت اور بہار آگیں ساعتوں تک پہنچنے کے لئے ذہن کو زندگی کی سفاکیوں اور بے رحمیوں کے دریا کو عبور کرنا پڑے گا جس کی موجیں ہر شے کو قعرِ تباہی میں لے جانا چاہتی ہیں۔

ان سیہ تند موجوں میں گرتے ہوئے سقف و بام
حادثے بے زمام
ڈھیر کے ڈھیر بوسیدہ اخبار
جن کے بے جان حرفوں میں گونجی گئی ٹینک کی گھڑگھڑاہٹ

لپٹ آگ کی —
یہ دکھ طفل و مادر کی نعشوں کے خاکے
نہ جانے کب سے یہ خندقوں میں وطن جن کے ایسے جواں
اور لاشیں رہیں بے کفن جن کی ' ایسے جواں

وقت کے اسی دریا کی تند موجوں میں کیمیاگر کے آلات ہیں۔ تیزاب اور زہر ایسے کیمیاوی مرکبات ہیں۔ ٹسٹ ٹیوب ہیں، جن میں مصنوعی تولید کے تجربے ہو رہے ہیں۔ سائنس سے پیدا ہونیوالے خطرات ہیں:۔

زہر و تریاق کی داستانیں
کیمیا گر کے آلات کا جال
نلکیوں کے سبک بطن میں مو ترکیب اجسام
تودۂ خاک کی داستانیں
ان سیہ تند موجوں میں ہیں

اس عالم میں شاعر کی سرزمین' ایشیا کی سرزمین' بے آب دریاؤں کی زمین معلوم ہوتی ہے اور بے آب دریا کے کنارے محبوب کا حسن نظر آتا ہے۔ ایک بے آب دریا کے بے حس کنارے پہ بکھری ہوئی ریت — کا ایک ذرہ ہے یہ حسن تیرا۔
یہ آزاد نظم کی ہیئت کا ایک جداگانہ تجربہ بھی ہے۔ مصرعوں کی صوتی ترتیب سے قطع نظر اس نظم میں RUN-ON-LINE کی ٹکنیک اکثر مصرعوں میں استعمال کی گئی ہے۔

مدنی کی مختصر علامتی نظموں میں مجھے "چوہا" اور "آخری ٹرام" بہت پسند ہیں۔ جب سے طبقات پیدا ہوئے ہیں مفلسی انسانی معاشرے کے ایک تکلیف دہ پہلو کی حیثیت سے قائم ہے اور حساس انسانوں کا موضوع فکر بھی رہی ہے۔ خود اردو شاعری میں دکنی کا یہ شعر ملتا ہے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

پھر میر نے اسے بہت داخلی بنا کر گویا معاشرے کی تصویر کشی بھی کر دی ہے:۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

پھر نظیر کا "مفلسی نامہ" ہے اور جوش صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ

مفلس ہو تو گدھے کا بھی سالا ہے آدمی

مدنی نے مفلسی کی معاشرتی اور معاشی وجوہ کو ذہن میں رکھا ہے پھر اس سے حساس اور ذہین فرد کی نفسیات پر جو اثر پڑتا ہے اس کی ایک تصویر اپنے تخیل میں بنائی — ایسا انسان کسب معاش کی الجھنوں میں گرفتار رہتا ہے۔ مفلسی اس کے لئے ایک ایسا اندھیرا بن جاتی ہے جس میں ادراک کا جغرافیہ جذب ہو جاتا ہے۔ مفلس انسان زود رنج۔ کم ہمت اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ پے درپے معاشی جدوجہد سے اس میں قوت عمل مفقود ہو جاتی ہے۔ ورنہ وہ بہت سی بنیادی تبدیلیاں بھی لاسکتا ہے۔ انجام کار ملول و حزیں فسردہ و بے عمل ہو کر

تنہائی کے اندھیرے میں اپنی صلاحیتوں کو زنگ لگاتا رہتا ہے۔ اس پورے نفسیاتی پس منظر میں مفلس انسان کی علامت کے طور پر مدنی نے "چوہے" کو منتخب کیا ہے کہ چوہا چالاک اور محنتی ہوتا ہے لیکن پس خوردہ اور ریزہ ہائے نان اس کی غذا ہے اس لئے وہ محتاج ہے ان گھرانوں کا جو اگر چاہیں تو اس کے کھانے کے لئے کچھ چھوڑ دیں اور چاہیں تو کچھ بھی نہ چھوڑیں۔ چوہا تاریک بلوں میں رہتا ہے۔ ذرا سی آہٹ سے خوف کھا کر بھاگ جاتا ہے۔ مفلس آدمی کی اس سے زیادہ نمایندہ علامت مشکل ہی سے ملے گی۔ اس نظم میں مفلس انسان کے سلسلے میں مدنی کا رویہ اہانت آمیز یا تمسخرانہ نہیں ہے بلکہ انہیں اس انسان سے بنیادی طور پر ہمدردی ہے جو جبرِ معاش کا شکار ہو کر اس نظامِ معیشت میں 'چوہا' بن گیا ہے۔ مدنی نے اس علامت پر بھرپور نظم کہی ہے اور آغازی مصرعوں ہی سے ساری فضا قائم کر دی ہے

مونسِ شب ردیہ دزدانہ خرام
ریزہ ہائے نان کی پیہم تلاش
ہر نفس الجھی ہوئی فکرِ معاش

پھر مفلسی سے پیدا ہونے والی حقیقتوں کا ذکر ہے

روح تاریکی میں پلتی ہی نہیں
جذب کر لیتی ہے سفاکی کے ساتھ
تیرگی ادراک کا جغرافیہ
یہ ندی رخ تو بدلتی ہی نہیں

پھر یہ احساس ہے کہ مفلسی کے سرد اندھے آئینے میں مفلس انسان اپنے چہرے کی خراش تک نہیں دیکھ سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ روحِ شمشیر جوہر دار بے اثر اور بے عمل رہتی ہے اور مفلس انسان تنہائی اور جانکنی کے عالم میں اپنی ہی ذات کے غموں اور یاس کے دھوئیں میں لپٹا رہتا ہے

تجھ سے وابستہ بلوں کی تیرگی
تیرگی میں اک گراں حبسِ دوام
جاں کنی کی گود میں سمٹا ہوا
نکبت و افلاس کا جغرافیہ
ایک خود ردِ یاس میں لپٹا ہوا

'آخری ٹرام' میں مدنی نے بڑے صنعتی شہر کی رات کے اس حصے کو اپنا موضوع بنایا ہے جس میں سارے ہنگامے دم توڑ چکے ہوتے ہیں روشنیاں گل ہو جاتی ہیں۔ راہگیروں اور سواریوں کا شور ختم ہو جاتا ہے۔ چند نفوس ہی شہر کی رات کے اس پہلو کو دیکھ پاتے ہیں۔ اس نظم میں ٹرام ہے جو محنت کشوں کی علامت ہے۔ ایسے محنت کشوں کی جو شہر کے سارے ہنگاموں کے فرو ہونے تک جاگتے، کام کرتے اور مشینوں کے زنگ آلود پرزوں کی طرح آپ ہی آپ فریاد کرتے رہتے ہیں۔ پھر ہوا ہے جو ایک غیر مرئی گرد اڑا رہی ہے اور رازِ فطرت کو 'تلاش' کر رہی ہے اور ان دونوں علامتوں کی روح خود شاعر ہے۔ جو کبھی ٹرام کے لڑکھڑانے کو دیکھتا اور بریک کی فریاد سنتا ہے اور کبھی گزرتی ہوئی ہوا کے لمس کو محسوس کرتا، پرچھائیوں کو دامنِ نگاہ میں سمیٹتا ہوا بینک کی دیواروں کو تکتا ہے۔ مہیب شورِ سگاں سنتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ بینک میں رکھی ہوئی دولت کی حفاظت کے لئے سنگ و خشت کے حصار ہیں، مسلح پہرہ دار ہیں۔ لیکن انسان کی عصمت

کا محافظ کوئی نہیں۔ اس نظم میں اقدار کا شعور بہت گہرائی کے ساتھ شامل ہوا ہے۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد شائد آپ بھی میری طرح اس نتیجے پر پہنچیں کہ اپنے ظاہری مفہوم کے علاوہ اس نظم میں ایک داخلی معنویت بھی ہے یعنی یہ نظم سات گئے شہر میں کسی نہ کسی عنوان ہونے والی عصمت فروشی کی ایک گھناؤنی لیکن اس معاشی نظام کی ایک ناگزیر حقیقت کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اپنی تہہ دار معنویت سے قطع نظر مدنی کی یہ نظم اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ اس میں مدنی کی شاعری کی چہار ابعادی (FOUR DIMENSIONAL) فضا ملتی ہے۔ میں نے مدنی کی نظمیں اور غزلیں پڑھنے کے بعد محسوس کیا ہے کہ ان کی شاعری میں رات، نیند، ہوا اور خود شاعر کا احساس بار بار ملتے ہیں۔ انہی کو میں نے مدنی کی شاعری کی چہار ابعادی فضا کہا ہے۔ رات کی علامتی اہمیت کے سلسلے میں میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ مناسب ہوگا کہ نیند اور ہوا کے علامتی پہلوؤں کو بھی مدنی کی شاعری کی نسبت سے سمجھ لیا جائے۔ نیند سکون، آرام اور انسانی وجود کی ایک ایسی لاشعوری کیفیت کا نام ہے جس میں وہ اپنے گرد وپیش کی خارجی حقیقتوں کو اس طرح نہیں پرکھ سکتا جس طرح عالم بیداری میں وہ اپنے حواس کی بنیاد پر انہیں جانچتا ہے۔ نیند رات کا ایک ناگزیر تلازم ہے۔ لیکن نیند کے بھی دو پہلو ہیں۔ نیند آنا اور نیند نہ آنا۔ ان کی کیفیتیں بہت مختلف ہیں۔ کبھی ان میں آسودگی اور طمانیت میسر آتی ہے اور کبھی کرب، کشمکش اور ابتلا۔ پھر نیند کا ایک اہم جزو ہے خواب۔ خواب میں انسان یوں محسوس کرتا ہے۔ گویا وہ حقیقی اور مادی دنیا کا عکس دیکھ رہا ہو۔ یا عالم مثال سے عالم تمثال میں آگیا ہو۔ خواب ایک پیچیدہ نفسیاتی عمل ہے۔ اس میں انسان شعور کی گرفت سے آزاد ہو کر ان اجسام، لمحات یا اوصاف کو مجسم دیکھتا ہے۔ جن کی آرزو یا تمنا اس نے عالم شعور یا بیداری میں کی تھی

اب خیالوں نے تجھے اپنا لیا
وقت اک طرارہ آہو سہی
خواب کی اک جست نے لہرالیا

خواب کا یہ حسن اور بے اختیاری میں یہ انوکھا اختیار احساس انسان کو اس قدر پسند آتا ہے کہ وہ عالم بیداری میں بھی خواب دیکھنے لگتا ہے کہ خواب ہی اس کے جہان ناآفریدہ کا جسم ہوتے ہیں۔ خواب دیکھنے والے کے ذہن کی مثال ٹائریسیس (TIRESEAS) کی سی ہے جو اپنے اختیار سے معزول ہے لیکن وجدان اس کا غلام ہے۔ بصارت سے محروم ہے۔ لیکن بصیرت اسے زمان ومکاں کی قید سے آزاد رکھتی ہے اور وہ وقت کے پورے بہاؤ کو ایک ہی نگاہ میں اس طرح دیکھ لیتا ہے جیسے ہم سمندر کے کنارے استادہ ہو کر ساحل سے حد افق تک سمندر کی موجوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ مدنی کی شاعری میں نیند بھی ہے ۔ نیند کی تمنا بھی۔ خواب بھی ہیں اور خواب کی آرزو بھی۔ رات ہوتے ہی نرم بستروں پر دراز ہو کر نیند کی آغوش میں چلا جانا ایک عام وظیفۂ حیات ہے۔ لیکن شاعر یا مفکر کے لئے نیند جہاں زخموں کا مرہم ہے وہاں ایک بے رحم دیوی بھی ہے۔ جس کی آمد کے لئے شاعر ترستا اور اضطراب کے عالم میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ ایسے عالم میں زندگی کی اور محرومیوں میں نیند بھی شامل ہو جاتی ہے۔ وقت کے گزرنے اور لمحوں کے رینگنے کا جانکاہ احساس گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ شعور اور ذہن پر ضربیں لگاتا ہے ایسے عالم میں ذہن سوچتے سوچتے تھک جاتا ہے۔ رات کا سناٹا ہوا یا تو خاموش ہے یا سائیں سائیں کر رہی ہے۔ نیم خوابی کی سی کیفیت طاری ہونے کے باوجود نیند نہیں آتی۔ دل کی دھڑکن سیکڑوں سوال کرتی ہے۔ فردا اور دوش کے قصے چھڑ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی گھر میں حبس ہونے لگتا ہے۔ اور یہ خواہش بیدار ہوتی ہے کہ باہر تازہ ہوائیں چلو:۔

ختم ہے محفل دو دش بیٹھے ہو کیوں
نیم رُخ ایک پرچھائیں آہستہ سے
پوچھتی ہے کہ خاموش بیٹھے ہو کیوں
کم کوئی درد ایام ہوتا نہیں
آؤ باہر چلیں حبس سے اور بھی
جی الجھتا ہے کچھ کام ہوتا نہیں

ایسے عالم میں ذات اور کائنات کے سارے رشتے سر اٹھاتے ہیں۔ ہر سمت ایک سوال آ دیزاں نظر آتا ہے ایک عالم کرب ابتلا اظہار و اشکال کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی عالم میں "خود کلامی" طاری ہو جاتی ہے۔ خود ہی خطیب۔ خود ہی مخاطب۔ خود ہی کلیم خود ہی سامع۔ زندگی اور وجود پر نگاہ پڑتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے انسان بھی نباتیات (BOTANY) کی تجربہ گاہ میں رکھے ہوئے پتوں اور پودوں کی مانند ہے۔ جیسے اس دور کی بے حسی نے انسان کے دل کو بھی برگ بریدہ سمجھ کر معمل کے مرتبان میں رکھ دیا ہو۔

خرد بیں، دیدۂ سفاک عمل
کھیل دانائے نباتات کا ہے
برگ نازک پہ اک آئین اجل
آدمی ایک ہدف ہے میری جاں
اک ورق نبض و نفس کا پابند
دیدۂ زیست میں برگ لرزاں
بے حسی سے کبھی چالاکی سے
مرتبانوں میں دلوں کے پودے
رکھ دیئے جاتے ہیں سفاکی سے
آگہی کا وہ صنم خانہ ہے
آدمی برگ بریدہ کی طرح
معمل زیست کا نذرانہ ہے
دل رقیب غم اور اک بھی ہے
خرد بینوں کی نگاہوں کا حریف
عشق کا دیدۂ نمناک بھی ہے

اس نظم میں مدنی نے سائنس کی ایک شاخ علم نباتات سے امیجز اخذ کی ہیں۔ لیکن یہاں ان کا ردعمل خالص رومانی اور اہل عقل سے زیادہ اہل دل کا ہے۔ وہ یوں محسوس کرتے ہیں کہ ادراک اور عقل کی برتری اور فوقیت مسلمہ امر ہے لیکن کبھی کبھی اس عمل میں زندگی کے نازک پہلو، دل کی نرم دھڑکنیں اور عشق کے دیدۂ نمناک کے شبنمیں آنسو نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔

آدمی کو پرکھ سکے نہ کبھی
دیکھنے والے خورد بینوں سے

اس صورت میں دل غم ادراک کا رقیب بن جاتا ہے، وہ دل جو اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ غم انسانی کا شمار کرنے میں عشق کی سانس اکھڑ جاتی ہے

میزبانی میں حسن دانی میں
عشق کی سانس اکھڑ جاتی ہے
اس شمار غم انسانی میں

میں مدنی کے یہاں نیند کے تلازمے کا ذکر کر رہا تھا۔ اس ضمن میں ان کی بعض نظموں کے عنوان اور چند مصرعے مزید پیش کرنا چاہوں گا تاکہ رات، نیند اور خواب کی علامتوں کے بار بار لوٹنے کا جو احساس مجھے ہوا ہے اس کی تائید آپ سے بھی حاصل کر سکوں مدنی کی چند نظموں کے عنوانات یہ ہیں:۔ نیند، ایک ابر آلودہ رات، نیند کی خفتہ باندی، سرما کی ایک رات، قصیدہ شب، آخری رات ائیرپورٹ کی رات۔ اس کے علاوہ بیشتر نظموں میں رات کا پس منظر ہے۔ اور نیند کے آنے یا نہ آنے کا احساس ہے۔ مختلف نظموں کے چند مصرعے ملاحظہ کیجئے:۔

رات کا طنز روشنی کا ہدف
ریگ ساحل سے پر غلیظ صدف
ایک بے خواب دھند میں مستور
اک معلق بجھا ہوا سا تنور
نیند نے ڈال دی ہے اپنی کمند

(پچھلے پہر کا چاند)

خواب ہی خواب کہاں تک جھلکیں
خستگی رات کی، اٹھتا ہوا درد
آ ہنی نیند کی بوجھل پلکیں!
نیند آنکھوں کی بکھر جاتی ہے
رات کٹتی نہیں کٹ جائے گی

——— (انتظار)

رات کی مانگ سی اجڑنے لگی
رات کی سرد وگنگ بستی میں
نطق کا کارواں بکھرنے لگا
دور ٹھہرا ہوا کوئی پرتو
خواب کی اوٹ سے گزرنے لگا

بس گئی نیند کے دھندلکوں میں
ایک بے خواب کائنات آخر

—— (ایک ابر آلودہ رات)

رہ گیا تیرا خیال جاں نواز
نیند کے صحراؤں میں خانہ بدوش

—— (ایک خط کے جواب میں)

نیند کی خفتہ باندی سے ادھر
دور اک شہر کے در و دیوار
خواب کی بستیوں کے سے آثار

—— (نیند کی خفتہ باندی)

رات آدھی ہوئی، نیتِ شب حرام
بوئے گل، حرفِ پیماں سلامت رہے

—— (وداع)

رات کے سلسلوں کی ایک نظم "آخری رات" میں مدنی کا لب و لہجہ ان کی نظموں کے عام لب و لہجے سے ذرا مختلف اور اس نظم میں اندیشے ہیں جو سیاسی جبر سے پیدا ہوئے ہیں۔ ماحول پر سیاسی گرفت ہے اور ہر راہ میں پوچھ گچھ یا INTROGATION کا جال پھیلا ہوا ہے۔ کوتوال شہر گشت کر رہا ہے۔ ایسے میں دل کی ویرانی سمجھاتی ہے کہ ہوش میں آؤ۔ باہر جانا ٹھیک نہیں ہے

آج مرے گھر کی ویرانی
دھیرے دھیرے بول اٹھی ہے
میرا کام نہیں سمجھانا
لیکن کس کو راس آیا ہے
ایسی رات میں باہر جانا
راہ سوالوں کا اک بن ہے
بے مشعل بے مونس چلنا
یہ سب اک دیوانہ پن ہے
گشت میں ہے کتوال نگر کا
اس کی آنکھوں میں نقشہ ہے
سب گلیوں کا سارے گھر کا
اور تم دیوانے ہو اب تک
پاؤں کا تم کو ہوش نہ سر کا

لیکن باضمیر انسان کی صداقت اور دل کی طاقت مصلحتوں کی پروا نہیں کرتی۔ جرمِ عشق کرنے کے بعد وعدۂ یار کی عزت رکھنا ضروری ہے۔ قید و بند اور تعزیر و سزا تو بہت پرانی رسوم ہیں۔ ان رسوم کو روا رکھنے والے تو شروع سے اندھے ہیں۔ اب ان اندھوں کے سامنے جلنے سے سچ کی عریانی کیسے کھل سکتی ہے۔ اس خیال کے حوالے سے مدنی دل کی ویرانی کو یوں جواب دیتے ہیں :۔

لیکن مجھ ایسے دیوانے
بیٹھ کے کیسے جی سکتے ہیں
ایسا عشق سبق دیتا ہے
مکتب کے دروازے ہی پہ
کفش و کلہ رکھوا لیتا ہے
حرفِ صداقت لکھواتی ہے
تختی لکھنا کھیل نہیں ہے
دل کی طاقت لکھواتی ہے
دل رکھے تو ہمت رکھے
جرمِ عشق کیا ہو جس نے
وعدہ یار کی عزت رکھے
عشق پہ ہے تعزیر پرانی
میرے لبوں سے کیوں رسوا ہو
اندھوں میں سچ کی عریانی

رات کو جاگتے رہنے تک یہ خیالات ذہن میں انتشار اور کشمکش برپا کرتے ہیں اور اگر پل بھر کو بھی آنکھ لگتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دل میں کوئی نازک خنجر گھوم گیا ہے۔ احساس کی گرفت اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ اس طرح عشق یا کسی نظریئے سے وابستگی سانس لینے کا عمل بن جاتا ہے جو سوتے جاگتے ہر عالم میں زندگی کا لازمی جزو بنا رہتا ہے

رات اندھیری ہے اندھیر
لیکن جب بھی آنکھ لگی ہے
کوئی کرن سا نازک خنجر
دل کے اندر گھوم گیا ہے
دستِ ستم سے پہلے آکر
میری چوکھٹ چوم گیا ہے

دل کے اندر خنجر گھومنے کی ترکیب سے شیکسپیئر اور دوسرے مغربی شعرا کی یاد آ جاتی ہے ـــــ ایلیٹ کے یہ دو مصرعے دیکھیئے :۔

PUT YOUR SHOES AT THE DOOR, SLEEP. PREPARE FOR LIFE
THE LAST TWIST OF THE KNIFE.

آخر میں مدنی کی شاعری کی ایک اور مستقل علامت یعنی ہوا کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے اس علامت کے تذکرے کے ضمن میں مدنی کی غزلیہ شاعری کا بھی کچھ عکس آجائے گا۔ جوان کی نظمیہ شاعری ہی کی طرح اہم جدید اور ایک تازہ اسلوب سے معمور ہے۔ قدیم یونانی شاعری سے لے کر جدید مغربی اور مشرقی شاعری تک مختلف شعرا نے ہوا کو مختلف علامت کے طور استعمال کیا ہے۔ ہوا عناصر اربعہ میں سے ایک ہے ارتقا کی معاون ہے۔ اس کا کام تعمیر بھی ہے۔ تخریب بھی۔ کبھی ہوا سموم و صرصر ہے۔ تو کبھی نسیم و صبا' کبھی ریگ بیاباں کا رقص نادیدہ کبھی قاصد بوئے زلف یار۔ کبھی ہوا شاعر کے احساس اور خیال کی [illegible] گلیوں میں آوارہ ہے کبھی اس کے ہاتوں کی طرح محبوب کے جسم سے قریب۔ مدنی نے ہوا کو اس کے الگ الگ نام نہیں دیئے ہیں۔ ان کے یہاں ہوا خود شاعر کی ایک غیر مرئی اور نادیدہ شخصیت ہے جو لمس اور حرکت سے عبارت ہے یہ ہوا کہیں نرم ہے کہیں تیز۔ کہیں وہ محبوب کے بدن سے آشنا ہو کر راز وصال لے جاتی ہے

نرم ہوا پہ یوں کھلے کچھ تیرے پیرہن کے راز
سب ترے جسم تا کمر رازِ وصال لے گئی

کبھی وہ بہار کے تازہ جھونکے کی طرح آکر دل کا ملال لے جاتی ہے

تازہ ہوا بہار کی دل کا ملال لے گئی
پائے جنوں سے حلقۂ گردشِ حال لے گئی

کبھی ہوا آشفتہ حالوں کو آشفتہ تر رکھنا چاہتی ہے۔ اور کبھی کشتگانِ شوق خود ہی ہوا کی زد میں اپنے خیالوں کو بے سپر رکھتے ہیں

ہوا آشفتہ تر رکھتی ہے ہم آشفتہ حالوں کو
برتنا چاہتی ہے دشتِ مجنوں کے حوالوں کو
نہ آیا کچھ مگر ہم کشتگانِ شوق کو آیا
ہوا کی زد میں آخر بے سپر رکھنا خیالوں کو

کبھی شاعر کا خیال اس کرۂ ارض کے عہدِ تخلیق کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ جہاں تیز ہوا کی چاپ سے تیرہ جنگلوں میں آگ لگ جاتی تھی اور ہوا روح تغیرِ جہاں کی علامت بن جاتی ہے

تیز ہوا کی چاپ سے تیرہ بنوں میں لو اٹھی
روح تغیرِ جہاں آگ سے فال لے گئی

کبھی ہوا بدلتی ہوئی اقدار کی علامت بن جاتی ہے۔ وہ اقدار جو محترم قدروں کی بے حرمتی کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ آندھیوں کی طرح رُخِ لیلیٰ پر گرد اڑانے سے بھی باز نہیں آتیں یہاں مدنی ہوا کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں

اے خبر گیر ناقۂ لیلیٰ
تیز چل راستہ بدل کے زرا
کروٹیں لے رہے ہیں لیل و نہار
رخِ صحرا پہ آندھیاں ہیں ہزار

ساربان غمگسار محرم راز
سخت کافر ہوا کے ہیں انداز
روئے لیلیٰ پہ گرد آنے لگی
راہ کے موڑ پر سنبھل کے ذرا

عرب اور عجم کے شاعروں کی طرح مدنی کو بھی ساربان اور لیلیٰ کی روایت ورثے میں ملی ہے لیکن مدنی کا ساربان سے تخاطب اس تخاطب سے کس قدر مختلف ہے اور یہی قدیم و جدید اقدار کا فرق ہے

اے ساربان آہستہ راں کارام جانم می رود
واں دل کہ با خود داشتم با دلستانم می رود

مدنی کی بعض نظموں میں ہواؤں کے جن میں اور بعض جگہ ہوا وہ طاقت بن گئی ہے جو بادبانوں کو سینۂ بحر پر کھینچ کرلے جاتی ہے کہیں ہوا ستم کی علامت ہے کہیں لطف و عنایت کی۔ اب ہوا کے چند اور روپ غزل کے ان اشعار میں دیکھئے جو مختلف معنویتوں کے ساتھ احساس کی مختلف تصویریں پیش کرتے ہیں۔

بوئے گل محو سفر خود ہے ہوا کے مانند
کون اس راز کو سمجھے گا صبا کے مانند
وادئ شوق میں چپ چاپ نکل جاتی ہے
جرس دور کی آواز ہوا کے مانند
دیکھ اس راہ میں اے زلف گرہ گیر نگار
اور بھی شوخ ہوائیں ہیں صبا کے مانند
الجھے گا آج بھی کہ ہوا پیچ پیچ ہے
بنتا نہیں کوئی رخ گفتار کچھ کہو
سب پیچ و تاب شوق کے طوفان تھم گئے
وہ زلف کھل گئی تو ہواؤں کے خم گئے

---

کوئی بتاؤ کہ ہے بھی تو اس قدر کیوں ہے
ہوا کو میرے گریباں سے دشمنی آخر

---

کبود و سرخ میں تھی نیک و بد میں داغ دو رنگ میں
ہوا سیاح تھی دیکھ آئی سب غم کے شوالوں کو

---

اے جادۂ خرام مہ و مہر دیکھنا
تیری طرف بھی آج ہوا کے قدم گئے

---

نرمی ہوا کی موجِ طرب خیز ابھی سے ہے
اے ہم صفیر آتشِ گل تیز ابھی سے ہے

---

اک ہوا ایسی ہے شہرِ غم میں ناخن در گرہ
دور تک افسانۂ بندِ قبا ہو جائے گا

---

ان کو اے نرم ہوا خوابِ جنوں سے نہ جگا
رات میخانے کی آئے ہیں گزارے ہوئے لوگ

مدنی کی غزل ایک علیحدہ مضمون چاہتی ہے۔ تاہم اس موقع پر میں مدنی کی غزل کے چند اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھیں میں نے ان کی غزلوں کے مطالعے کے دوران محسوس کیا ہے۔ مدنی غزل میں ایک نمایاں داخلیت کے ساتھ آتے ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری کی زبان نظموں کی زبان اور ڈکشن سے مختلف ہے۔ غزل میں وہ نئی علامتوں۔ نئی تراکیب اور نئے خیال کو اس طرح لاتے ہیں کہ غزل کی لطافت مجروح نہ ہونے پائے۔ نظم میں ان کی جدت طرازی ان سے اکثر اوقات انگریزی کے الفاظ اس طرح استعمال کرا دیتی ہے جس طرح فارسی اور ہندی کے الفاظ۔ لیکن غزل میں وہ بہت محتاط ہیں۔ اکثر حضرات کو مدنی کی غزلیں ان کی نظموں کے مقابلے میں زیادہ پسند ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مدنی کی نظمیں مشکل ہیں اور ان کی غزل کا سمجھ لینا نسبتاً آسان ہے۔ پھر بھی میری رائے یہ ہے کہ اصنافِ سخن کو ایک دوسرے پر فوقیت دینا بے معنی ہے۔ غزل اور نظم مدنی ہی کی شخصیت کے پرتو ہیں۔ اور ان دونوں آئینوں میں مدنی کا مزاج ان کا منفرد شاعرانہ اسلوب اور فنی دسترس اپنے اپنے خط و خال کے ساتھ اس طرح نظر آتے ہیں کہ اسے صرف آئینوں کی ہیئت یعنی اصناف شاعری کا فرق کہا جا سکتا ہے۔ غزلوں میں مدنی نے ایک ایسے حساس دل کی دھڑکنوں کو سمویا ہے جو کبھی محبوب کے قرب سے تیز ہو جاتی ہیں اور کبھی شیشیوں کا شور وصل سن کر۔ کبھی یہ دھڑکنیں محبوب کے ہجر میں اداس اور آہستہ ہو جاتی ہیں اور کبھی یہ محسوس کر کے کہ معاشرے کی بدلتی ہوئی قدروں نے انسان کی اہمیت کم کر دی ہے۔ غزل میں ان کا محبوب گوشت و پوست کا ایک ارضی و نسوانی پیکر ہے جسے وہ کوئی ماورائی یا آسمانی مخلوق سمجھنے کے بجائے نیک و بد کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اسی دنیا اور دانشِ حاضر کی سفاکیوں سے عبارت اسی معاشرے کا ایک حساس اور گاہ مجبور اور گاہ مختار فرد سمجھتے ہیں جس میں ایک بشر کی ساری خوبیاں اور کمزوریاں موجود ہیں:

ہزار اس کے تغافل کی داستانیں ہیں
مگر یہ بات کہ وہ بھی ہے آدمی آخر
یہ زندگی ہی تلون مزاج ہے اے دوست
تمام ترک وفا تیری بے رخی بھی نہیں

تعلقاتِ زمانہ کی اک کڑی کے سوا
کچھ اور یہ ترا پیمانِ دوستی بھی نہیں

اب حسن پہ خود اس کا تصور بھی گراں ہے
پہلے تو گراں خوابِ زلیخا بھی نہیں تھا

آئی ہے اس سے پچھلے پہر گفتگو کی یاد
وہ خلوتِ وصال وہ پردے چھٹے ہوئے

کچھ ایسے سوگ میں ڈوبا ہوا ہے پیکرِ دست
کہ اس کے بعد غمِ ہجر و وصل کیا کہیے

آئینہ لے کے گھوم گئی عمرِ نوخرام
تازہ رخی کا موڑ بلاخیز ابھی سے ہے

شاید کہ محرمانہ بھی اٹھے تری نگاہ
دلچسپ تری نگاہ دل آویز ابھی سے ہے

مدنی اپنی غزل میں عاشق کا ایک ایسا روپ ہیں جو محض عاشق نہیں ہے۔ یعنی معاملات دل کو محض وصل و ہجر تک محدود نہیں رکھتا زندگی اور اپنے عہد کی لطافتوں اور کثافتوں سے بھی وہ پوری طرح باخبر ہے پھر اس میں ضبط اور ظرف بھی بہت ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ ہر دور کے روشن نظروں کی طرح اسے بھی روشنیٔ طبع کے زخم سہنے پڑیں گے اور اسے بھی امتحان و آزمائش کی کڑی منزلوں سے گزرنا پڑے گا۔ وہ امتحان کبھی فطرت اور وقت کی طرف سے ہوں گے اور کبھی خود اس کے نظام اقدار کی طرف سے اور کبھی اس محبوب کی جانب سے جو شاعر کی طرح خود بھی بدلتی ہوئی سماجی معاشی اور تہذیبی قدروں کی زد میں ہے اس موقع پر مدنی سوچتے ہیں کہ غم کا اظہار اتنا آسان نہیں۔ غم دوراں یا غم جاناں کہہ دینے سے نہ غم جاناں کا حق ادا ہوتا ہے اور نہ غم دوراں کا :۔

غمِ حیات و غمِ دوست کی کشاکش میں
ہم ایسے لوگ تو رنج و ملال سے بھی گئے
ہم ایسے کون تھے لیکن قفس کی یہ دنیا
کہ پرشکستوں میں اپنی مثال سے بھی گئے

اس شعر کے لہجے اور انداز بیان پر مجھے غالب کا یہ شعر بے اختیار یاد آگیا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

مدنی کی عالی ظرفی ضبط اور اقدار کا پاس ایک خاص آداب عشق بن کر ان کی غزل میں آتے ہیں اور پھر جب وہ ان اقدار کی ہتک یا رسوائی یا بے حرمتی ہوتے دیکھتے ہیں تو ان پر عجیب پیچ و تاب کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور پھر ان کا انداز بیان کچھ یوں ہو جاتا ہے :۔

کس سے کہیے کہ عبادت گہ ارباب نظر
سنگ طفلاں ہے کہ زخم سر سودائی ہے

---

ہزار حیف کہ اب میکشوں کو یاد نہیں
روایتیں جو عبارت تھیں جام و مینا سے

اور اس شعر میں تو مدنی کے مزاج کی پوری نمائندگی ہوتی ہے۔ وہ حقیقت میں صحبتِ ناجنس کو برداشت نہیں کر سکتے:۔

ہم سفر برحق مگر ایک جائے رشکِ غیر ہے
آدمی کمبخت کوئی معتبر لایا کرو!

مدنی کی شخصیت میں نمود و نمائش نہیں ہے۔ اس اشتہاری دور (A DVERTISEMENT A GE) میں وہ بھی سنجیدہ، ثقہ اور متین افراد کی طرح گوشہ گیری، دبے دبے لفظوں میں عرض مدعا یا اجتناب عرض مدعا، ایمائیت، ایجاز، اختصار اور شائستگی کو عزیز رکھتے ہیں۔ معاملات عشق میں رسوائی یا تشہیر سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ ان کے مزاج کا یہ عکس بہت گہرے نفسیاتی پس منظر سے گزر کر غزل میں شامل ہوتا ہے چند شعر ملاحظہ کیجیے

کچھ کرم ہم گوشہ گیروں پر بھی فرمایا کرو
شہر میں آتے ہی رہتے ہو ادھر آیا کرو

---

دفترِ نامہ نویساں میں لکھی جائے گی
یوں ترے کام مرے دل کی لگن آئی ہے

---

تری قبا تری چادر کا ذکر کس نے کیا
مگر فسانہ ہوئی بات ان کہی آخر

---

گزر رہا ہے تو آنکھیں چرا کے یوں نہ گزر
غلط بیاں بھی بہت رہگزر میں ہوتے ہیں

محبوب کے سراپا اور اس کے آئینِ آرائش یا سادگی کے باب میں مدنی نے اعلیٰ جمالیاتی شعور کے شعر کہے ہیں ؎

بہت نازک ہے اس نوخیز کا آئینِ آرائش
حیا پہلے سے بڑھ کے اور سرِ ناخن حنا کم کم
حنائے پا سے کھلا اس کا شوقِ آرائش
نکل چلی تھی دبے پاؤں سادگی آخر

وہی ہیں آج بھی اس جسم نازنیں کے خطوط
جو شاخ گل میں جو موج گہر میں ہوتے ہیں

---

ہوا کی نرم روی سے عیاں ہوا ہے کوئی
فریب تنگ قبائی کا وقت ہے کہ نہیں

اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے علائق اور تعلقات اور حسن و عشق کی بہت سی ایسی کیفیات کو بھی بڑی خوبی سے غزل کے اشعار میں پیش کیا ہے جنھیں تشریح اور تفسیر کے بجائے محسوسات کے آئینے میں دیکھنا بہتر ہے۔

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزم خیال سے بھی گئے
چراغ بزم ابھی جان انجمن نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو ترے خط و خال سے بھی گئے

---

اے حریفانِ غم گردش ایام آؤ
ایک ہی غول کے ہم لوگ ہیں ہارے ہوئے لوگ

---

ایسی کوئی خبر تو نہیں ساکنانِ شہر
دریا محبتوں کے جو بہتے تھے تھم گئے

اس شعر میں کتنے بڑے المیے کو کس سادگی اور بے نیازی سے بیان کیا گیا ہے۔ اگر ضبط کی صلاحیت نہ ہو تو اس خبر پہ چیخ نکل پڑے۔ غزل کے ضمن میں چند ایسے شعر ملاحظہ کر لیجئے جو مختلف موڈ اور مختلف نفسیاتی کیفیتوں میں کہے گئے ہیں۔ یہ شعر اردو شاعری میں ایک بالکل نئی فضا اور نیا لب و لہجہ لے کر آئے ہیں:۔

سرکشتِ غیر کیا کیا یہ گھٹا برس رہی ہے
کوئی ہم سے آ کے پوچھے اثرِ دعائے باراں

---

شکستِ ساغر و مینا کو خاک روتا میں
گراں ابھی مرے دل کی شکستگی بھی نہیں

طلسم خواب زلیخا و دام بردہ فروش
ہزار طرح کے قصے سفر میں ہوتے ہیں

یہ بھی کم فرصتیٔ دل کا فسانہ تو نہیں
یہ جو اک روزنِ زنداں پہ کرن آئی کر

---

اک اور مرحلۂ قرب میں ہے عشق کی رات
شبِ وصال کے بعد اب تری تمنا سے

---

نافۂ آہوئے تتار زخم نمود کا شکار
دشت سے زندگی کی ردا ایک شال لے گئی

---

اندھیری رات میں اک دشتِ وحشتِ لے ندا نکلی
چلا جاتا ہوں دامانِ نظر دتیا اجالوں کو

---

احوال بھی پوچھا تو حریفانِ جنوں نے
اب دادِ طلب وحشتِ جاں آج کہ نہیں ہے
ٹوٹا ہوا دل جادۂ دریافت پہ رکھنا
بنیادِ تغیر مری جاں ہے کہ نہیں ہے

"وشتِ امکاں" کا سفر ختم ہوا۔ میں نے اس سفر میں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کی روداد پیش کردی۔ اس سفر کے دوران قدم قدم پہ مجھے حیرت ہوئی کہ اس دور کے اتنے اہم شعری کارنامے ابتک ادبی حلقوں کی جانب سے کسی خاص ردِ عمل کا اظہار نہیں ہو سکا ہے مدنی ان دور کی بہت اہم آواز ہیں اور یہ آواز اپنے زیر و بم کی تمام نفاستوں کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے۔ مدنی کی شاعری اردو کی شاعری کی روایت میں ایک نہایت اہم اضافہ ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جدید ٹیکنالوجی کا ایک تاثر غالب نے قبول کیا تھا پھر اقبال کے یہاں سائنس کی بعض اہم ایجادات یا نظریات کا ذکر ہے مثلاً ان کی نظم سرگزشت آدمؑ اس کے بعد کہیں کہیں جوش کی نظموں میں سائنس کے کرشموں اور اس کے پس پردہ انسانی کارناموں کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ برصغیر کے پورے شعری سرمائے میں ہمیں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی جس کی بنا مدنی نے ڈالی ہے۔ مجھے بیسویں صدی کے اردو شعرا پر حیرت ہے کہ وہ سائنسی صداقتوں کے اتنے اہم دور کو جس میں وہ سانس لے رہے ہیں اور جو ان کی تاریخ کا ایک حصہ ہے کس طرح نظر انداز کرتے رہے ہیں مدنی نے اردو شاعری کو ایک جدید ذہن سے آشنا کیا ہے۔ ذات اور کائنات کے رشتوں کو نئے زاویوں سے دیکھا ہے انھوں نے اردو زبان کو بعض بالکل اچھوتی اور جدید علامتوں اور تراکیب (PHRASES) سے روشناس کیا ہے مثلاً درد کے اعشاریے۔ تاجری کی تیسری آنکھ۔ ہواؤں کے جین۔ دوشیزہ زمین۔ سشرم عصیاں۔ آئین آرائش۔ شمارِ غمِ انسانی' دانش ماحر کی سفاکی۔ جاں نثاری کی شاخِ ابد آشنا۔ رخصتوں کا حلقۂ آغوش۔ محرابِ ہوا نیند کے لئے خانۂ یاس کی پہریاں داشتہ۔ رصدگاہِ صوت و حرف۔ شعلۂ دل بجھا بجھا' خاک زباں اڑی اڑی۔ آگ سے فال لے جانا

آئینوں کی ایک جھیل۔ طوق سوال۔ طائر ہجرت زدہ تتازہ حریری اوس کا رومال۔ شبنم کی سبد۔ اندیشوں کی نازک بالیاں، نیک د بدکی کیاریاں۔ آبادی کے دائرے، بادبان گرہ خوردہ، بے سپر کھیتیاں۔ حاصلِ کشت نیند کے حاشیے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی کہیں ہیں جو بالکل پہلی بار اردو شاعری میں پورے رچاؤ کے ساتھ آئی ہیں۔ یہ شاعری صرف مدنی کی شاعری ہے اور اس میں انھوں نے اپنے بہت سے پیش روؤں اور ہم عصروں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ مدنی نے شعور کی جس گہرائی۔ احساس کی جس نزاکت اور جدت طرازی کے جس وصف کے ساتھ "دشتِ امکاں" کی نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں اور جس طرح بیسویں صدی کی ہر لمحہ بدلتی ہوئی سیاسی، سماجی، معاشی اور سائنسی کروٹوں کو انسانی فکر کی روایت سے ہم آہنگ کرکے ایک بالکل نئی روایت بناکر پیش کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مدنی صحیح معنوں میں اردو کے پہلے جدید شاعر ہیں۔ جدید وہ ان معنوں میں نہیں ہیں کہ انھوں نے رڈار۔ ٹارمیک۔ سگنل۔ گودام۔ ردح تاجری، ایئرپورٹ اور آپریشن تھیٹر کے الفاظ اپنی شاعری میں استعمال کئے ہیں۔ یہ کام تو مدنی کی نقالی میں اور بھی بہت سے لوگ کررہے ہیں۔ اس کے برعکس مدنی ان معنوں میں اردو کے پہلے جدید شاعر ہیں کہ اس دور کی بات کہنے کے لئے جس میں کسی خیال کی شکل مشکل ہی سے بن پاتی ہے مدنی نے اپنی شاعری کے لئے ایک نیا محاورہ (IDIOM) دریافت کرلیا ہے اور اس کے پس پردہ ان کا گہرا مطالعہ۔ تاریخی شعور، حساس مشاہدہ اور جدید ذہن ہے۔ ایسے اہم اور نئے شاعر کے سلسلے میں جس کی شاعری عہدِ حاضر کی تمام سفاکیوں سے آنکھیں چار کرسکتی ہو ہر سمت ایک خاموشی ہے۔ ایک سکوت ہے، نہ جانے کیوں

یہ تیرے دور کا اک عہدِ خوش نوائی ہے
مگر سکوت ہے ایسا کہ مرحبا کہئے

---

# تخلیقی ادب

(صفحہ ۴۲ سے آگے)

ہے۔ اور جو جنگ معاشی آزادی، جنسی مسائل کو گناہ و ثواب سے الگ کرکے سائنسی بنیادوں پر سمجھنے اور سماج کے اضافی رشتوں میں زندگی کی رفتار پر اپنی ذہنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے لڑی جارہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس تصور تک پہنچ رہی ہے کہ یہ سارے مسائل اس عہد کے اصل بنیادی مسائل ہیں۔ اور ہمارا سب سے بڑا مسئلہ اس آدمی کو سمجھنا ہے جو آج زندگی گذار کر خوش نہیں ہے۔ لیکن زندگی گذارنے کی بے پایاں خواہش رکھتا ہے آدمی کے اس تصور میں مارکس، فرائیڈ اور آئن اسٹائن کے نظریات ایک دوسرے میں مدغم ہوگئے ہیں۔ آج کا تخلیقی ادب اس آدمی کو سمجھنے کے سلسلے میں ان سارے رشتوں پر ضرب لگاتا ہے۔ جو روایتی ہیں۔ اس کی زد میں وہ اخلاقی اصول بھی آتے ہیں۔ جو آدمی کو سمجھنے کے بجائے اس کو اپنی زنجیر میں جکڑ دیتے ہیں۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم نئے ناموں کی ادب میں تلاش کرتے ہیں تو ان کے علاوہ جن کا اوپر تذکرہ آچکا کئی نئے لکھنے والے بھی ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ پرانے اور نئے لکھنے والوں میں آئندہ کچھ اور نام شامل ہوجائیں گے اور کچھ ماضی کی تاریخ میں دب جائیں گے۔ لیکن تخلیقی ادب زندگی کے نامیاتی عمل کے اظہار میں ہمیشہ ان خوابوں کی تشکیل کرتا رہے گا جن سے ایک عہد دوسرے عہد میں ڈھل جاتا ہے اور مستقبل کا معاشرہ تعمیر ہوتا ہے۔ انہی میں وہ شکست پوشیدہ ہے جو بالآخر ہر ماضی پرست کا مقدر ہے۔

## عزیز حامد مدنی

تازہ ہوا بہار کی دل کا ملال لے گئی
پائے جنوں سے حلقۂ گردشِ حال لے گئی

جرأتِ شوق کے سوا خلوتیانِ خاص کو
اک تب غم کی آگہی تا بہ سوال لے گئی

شعلۂ دل بجھا بجھا ، خاکِ زباں اُڑی اُڑی
دشتِ ہزار دام سے موجِ خیال لے گئی

رات کی رات بوئے مے کوزۂ گل میں بس گئی
رنگ ہزار مے کدہ رُوحِ سفال لے گئی

تیز ہوا کی چاپ سے تیرہ بنوں میں لَو اُٹھی
روحِ تغیّرِ جہاں آگ سے فال لے گئی

نافۂ آہوئے تتار زخمِ نمود کا شکار
دشت سے زندگی کی رَو ایک مثال لے گئی

ہجر و وصال و نیک و بد گردشِ صد ہزار دہر
تجھ کو کہاں کہاں مرے سرو کمال لے گئی

نرم ہوا پہ یوں کھلے کچھ ترے پیرہن کے راز
سب ترے جسمِ ناز کے راز و وصال لے گئی

ماتمِ مرگِ قیس کی کس سے بنے گی داستاں
نوحۂ بے زباں کوئی چشمِ غزال لے گئی

## عزیز حامد مدنی

فراق سے بھی گئے ہم وصال سے بھی گئے
سبک ہوئے ہیں تو عیش ملال سے بھی گئے

جو بت کدے میں تھے وہ صاحبانِ کشف و جمال
حرم میں آئے تو کشف و کمال سے بھی گئے

غم حیات و غم دوست کی کشاکش میں
ہم ایسے لوگ تو رنج و ملال سے بھی گئے

گل و ثمر کا تو رونا الگ رہا لیکن
یہ غم کہ فرق حرام و حلال سے بھی گئے

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزم خیال سے بھی گئے

ہم ایسے کون تھے لیکن قفس کی یہ دنیا
کہ پرشکستوں میں اپنی مثال سے بھی گئے

چراغ بزم ابھی جانِ انجمن نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو ترے خط و خال سے بھی گئے

## عزیز حامد مدنی

نظر میں سلسلۂ روشنئ فردا سے
ہوئے ہیں تا بہ افق کچھ سواد پیدا سے
ہزار حیف کہ اب مے کشوں کو یاد نہیں
روایتیں جو عبارت تھیں جام و مینا سے
مئے کہن کو فسونِ مسیح دے ساقی
کہ گفتگو ہے حریفانِ بادہ پیما سے
کسی کی خاک سے مینا کسی کی گل سے سبو
جو مے کدے میں تھے لوٹ آئے جا کے دنیا سے
اک اور موجِ بلا کا سرودِ غرقابی
مرا سفینۂ غم چاہتا ہے دریا سے
ابھی بھی گردشِ پرکار آرزو جانو
وہ دائرے جو کھنچے میری لغزشِ پا سے
اک اور مرحلۂ قرب میں ہے عشق کی رات
شبِ وصال کے بعد اب تری تمنا سے

## عزیز حامد مدنی

کچھ کرم ہم گوشہ گیروں پر بھی فرمایا کرو
شہر میں آتے ہی رہتے ہو اِدھر آیا کرو

زندگی ہے دام اندر دام دل کی کیا مثال
اک گرفتارِ بلا کو لاکھ سمجھایا کرو

ہم سفر برحق مگر اک جائے رشک غیر ہے
آدمی کم بخت کوئی معتبر لایا کرو

ساکنانِ شہر میں ہی مے کدے کی جان ہوں
کچھ مرے حق میں دعائے خیر فرمایا کرو

دوزخ و جنت ہے آپ اپنی لب لعلیں کی آگ
نیک و بد کی بحث میں اس کو نہ اُلجھایا کرو

میں تو اس کا ذکر کا ہو کر رہ گیا اے ہمدمو
تم تلاشِ آدمی میں دُور تک جایا کرو

روحِ صد جاں دادگانِ ابر و باد آوارہ ہے
اس فضا میں شام سے پہلے ہی گھر آیا کرو

## راہی معصوم رضا

فصلِ جنوں ہے خوں میں تر، جشنِ بہار کم کرو
اٹھو اور اٹھ کے قصۂ دار و رسن رقم کرو

اہلِ جنوں کی کیا خطا، آیا پیام چل پڑے
بوئے سمن کو دو سزا، دستِ صبا قلم کرو

میں نے تو صرف یہ کہا جینے کی آرزو ہے شرط
جینے کی آرزو کے ساتھ جتنا بھی چاہے غم کرو

گھر سے اکیلے مت چلو، راہ ہے یہ بہت کڑی
ہے یہ سفر حیات کا، قافلہ اک بہم کرو

دامن برگ چھوڑ دو، خوش ہو نہ اوس چاٹ کے
دیکھو سمندروں کے خواب پیاس کا ذکر کم کرو

اس کی گلی سے ہو کے یہ شہرِ وفا تک آئی ہے
میرے جنوں کی آیتیں پڑھ کے صبا پہ دم کرو

## خورشید احمد جامی

اب کوئی پیار مہکتا ہے نہ جلتے ہیں بدن
آ گئی وقت کے چہرے پہ خیالوں کی تھکن

رات کچھ دیر ترے شہر میں رک جاتی ہے
اور ہو جاتے ہیں یادوں کے دریچے روشن

جب بھی حالات نے زخموں کو چھپانا چاہا
چیخ اٹھے ہیں امیدوں کے پھٹے پیراہن

زندگی آج بھی کچھ سوچ رہی ہے جیسے
ہر اداسی کو سمجھ کر ترے ماتھے کی شکن

اے صبا آج مرے گیت بھی تیری ہی طرح
درد کی آگ لئے پھرتے ہیں گلشن گلشن

یوں نظر آتے ہیں اب دور سے ماضی کے محل
جیسے ویرانے میں تاریک و شکستہ مدفن

ریگ زارِ غمِ ہستی میں سنا ہے میں نے
موسمِ گل نے چرایا ہے ترا سانولا پن

تلخیٔ دہر کو جی کھول کے رو لینے دو
بھیگ جائے تو سہی فکر و نظر کا دامن

ہار جاتا ہے اسی جانِ وفا سے جامیؔ
میرا فن ہو کہ مرا دعویٔ معیارِ سخن

## لیث قریشی

کیا زمانہ تھا کہ طشت از بام رازِ غم نہ تھا
سنگ بھی تھے۔ سر بھی۔ لیکن رشتۂ محکم نہ تھا

سوچتا ہوں میرے درپے کیوں ہوئے جھوٹے خدا
میری بربادی کو پندارِ خودی بھی کم نہ تھا

کیسی کیسی آزمائش ؟ کیسے کیسے امتحاں ؟
عمر بھر آئے مگر اے دوست ! میں بھی کم نہ تھا

ہو تو سکتے تھے کہیں گم کردۂ ظلمت بھی ہم
وہ تو یہ کہیے چراغِ آرزو مدھم نہ تھا

پھول مصروفِ تبسم تھے ، صبا محوِ خرام
کوئی گلشن میں شریکِ گریۂ شبنم نہ تھا

وائے محرومی ! کہ پائی بھی تو ہلکی سی خلش
غم بقدرِ ظرف اگر ملتا تو کوئی غم نہ تھا

وہ دلِ مایوس کی جانب نگاہِ التفات
ہم پہ وہ عالم بھی گذرا جب کوئی عالم نہ تھا

آپ دل برداشتہ ہو کر عبث رخصت ہوئے
لیث اتنا تو مزاجِ انجمن برہم نہ تھا

## بشیر احمد بشیر

ایسا تہِ افلاک خرابہ نہیں کوئی
اس دشت سے زندہ کبھی لوٹا نہیں کوئی

ہیبت وہ صداؤں میں کہ لرزے درودیوار
گذرے وہ شب و روز کہ سویا نہیں کوئی

ویراں سی ویران ہوئی دھیان کی بستی
چہرہ کسی چلمن سے جھلکتا نہیں کوئی

سر پھوڑ کے لوٹ آتی ہے جاتی ہے جو آواز
کیا گنبدِ آفاق میں رستہ نہیں کوئی

اک ایسی مسافت ہے کہ ساعت بھی کٹھن ہے
برسوں کا سفر اور کہیں سایہ نہیں کوئی

کھلتا نہیں بے اسم درِ گنج طلسمات
سطروں میں دفینے ہیں تماشا نہیں کوئی

دیکھی ہے بشیر اہلِ نظر کی بھی رسائی
باتیں مری سمجھے، مجھے سمجھا نہیں کوئی

## کوثر چاندپوری

# ناموس کا غبار

جاوید کو ایک پاگل کی حیثیت سے اسپیشل وارڈ میں داخل کیا گیا تھا۔ وہ آٹھ روز سے سویا نہیں تھا۔ دن رات جاگتا ہی رہا تھا۔ اس عرصے میں ایک منٹ کو بھی اس کی آنکھ نہ لگی تھی۔ آنکھیں لال انگارہ بنی ہوئی تھیں منھ پر وحشت برس رہی تھی، پاگلوں کی سی باتیں کر رہا تھا۔ جن لوگوں کی ہمیشہ عزت کرتا رہا تھا ان سے لڑنے کو تیار ہو جاتا۔ اس کے لئے تیمارداری کے مخصوص انتظامات کئے گئے تھے۔ جس نرس نے سب سے پہلے اس کی دیکھ بھال شروع کی اس کا نام مسز کپور تھا۔ وہ ذرا بھاری جسم کی خوبصورت اور باوقار عورت تھی۔ سفید لباس میں اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی مانند دمکتا رہتا تھا۔ جاوید اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اس نے بڑے تپاک سے مسز کپور کا خیر مقدم کیا۔ وہ غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی!

مسز کپور کافی تجربہ کار عورت تھی پھر بھی ایک نوجوان کے اس غیر معمولی جوش کو دیکھ کر ذرا شرما سی گئی اور دیر تک اس کی دلجوئی کرتی رہی۔ ڈرتے ڈرتے نیند کی گولی پیش کی جاوید اسے بے تکلف منھ میں ڈال کر پانی پی گیا۔ پھر منہ بنا کر بولا۔

بہت کڑوی ہے مگر آپ کے ہاتھ سے کھا ہی گیا۔ مسز کپور نے جھینپ کر چاروں طرف دیکھا وہاں کوئی اور نہ تھا جو ان کی باتیں سنتا۔ وہ اپنی تنہائی کا احساس کر کے اتنی لجائی کہ پانی پانی ہو گئی۔ سوچنے لگی یہ کیسا پاگل پن ہے۔ آنکھوں کی سرخی اور منھ پر بھیانک پن نہ ہو تو اسے بیمار نہیں کہا جا سکتا ذرا دیر بعد مسز کپور نے کہا۔

کتنے اچھے ہیں آپ! میری ہر بات مان لیتے ہیں۔ اب میں چاہتی ہوں کہ آپ آنکھیں بند کر کے چپ چاپ لیٹ جائیں۔ میں لائٹ آف کئے دیتی ہوں۔ اندھیرے میں جلد ہی نیند کی دیوی آپ کی آغوش میں آ جائے گی۔ اور آپ کو اپنی مرمریں باہوں میں جکڑ لے گی۔

کیا آپ نیند کی دیوی نہیں ———— دیوی تو ضرور ہیں لائٹ آف کرنے سے پہلے میں آپ کا نام جاننا چاہوں گا سچ مچ آپ کتنی اچھی ہیں ان کپڑوں میں چنبیلی کی کلی لگ رہی ہیں باتوں سے مٹھاس ٹپکتی ہے۔

مجھے مسز کپور کہتے ہیں۔

مسز کپور؟ وہ تیوری پر بل ڈال کر بولا، اگر تم مسز کپور ہو تو ابھی کمرے سے نکل جاؤ۔ میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا تم ایک دم فراڈ ہو، بھاگ جاؤ مکار عورت۔

اچانک اس کی حالت بدل گئی آنکھیں ابل آئیں۔ کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔ اور کنپٹی کی رگیں زور زور سے تڑپنے لگیں۔ وہ حیران و پریشان ایک جگہ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی کہ جاوید نے جھک کر چپل اٹھالی اور طیش میں بھر کر اسے مسز کپور کی طرف پھینک دیا۔ اس کے بعد وارڈ میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ وہ اپنے فرائض کی نزاکت کا احساس کئے بغیر نہایت خاموشی سے باہر چلی گئی احتیاط کے طور پر باہر سے زنجیر لگادی اسے ڈر تھا کہیں وہ اس کا پیچھا نہ کرے۔ مسز کپور سیدھی ڈاکٹر جمیل کے پاس گئی۔ اور سنجیدگی سے پورا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ جاوید بالکل حواس میں تھا اس کی حالت بہت اچھی تھی۔ لیکن میرا نام سنتے ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ مجھے مارنے کو اٹھا۔ ڈاکٹر میں اس کے پاس نہیں رہ سکوں گی۔ جان کا اندیشہ ہے جاوید بہت خطرناک قسم کا پاگل ہے۔

کوئی بات نہیں مسز کپور میں دوسرا انتظام کئے دیتا ہوں۔ میں نے تمہیں صرف اس لئے بھیجا تھا کہ تم جاوید کو قابو میں کر لوگی۔ شاید نفسیاتی طاقت سے کام لینا بھول گئیں۔

ڈاکٹر جمیل نے ایک میل نرس کو اس کی جگہ لگادیا۔ اس کا نام سداما تھا وہ بڑا کڑیل جوان تھا۔ اس کا رنگ بالکل آبنوسی تھا وہ بڑی دلیری سے زنجیر کھول کر جاوید کے وارڈ میں داخل ہو گیا۔ قریب پہنچ کر بولا۔

دیکھو جاوید میں سداما ہوں۔ تمہیں سلانے آیا ہوں میں حکم دیتا ہوں کہ فوراً لیٹ کر آنکھیں بند کر لو مانو گے میرا حکم؟۔

سداما سداما وہ زیر لب بولا کیا اچھا نام ہے۔ ضرور میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔ دوست آؤ تم بھی میرے پاس لیٹ جاؤ پہلے میں تمہیں سلانا چاہتا ہوں۔

شکریہ جاوید، مریضوں کو سلانے کی ڈیوٹی میری ہے تمہاری نہیں۔

کیا میں مریض ہوں، آخر کب سے؟

ذکر تمہارا نہیں جاوید تم تو بالکل بھلے چنگے ہو۔ دیکھئے سداما جی آپ مجھے سلانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ میں نہ جانے کب سے لگاتار جاگ رہا ہوں۔ مجھے مقالہ جلد ہی مکمل کرنا ہے میں ہر نصف گھنٹہ بعد شراب کا ایک پیگ لیتا رہا ہوں۔ شراب ختم ہو جانے پر کئی بوتل پھر پی گیا ہوں چوبیس گھنٹے میں سگریٹ کے دو ڈبے خالی کر دیتا ہوں آپ ہی بتائیے سداما جی مجھے نیند آسکتی ہے نیند کی سینکڑوں گولیاں بیکار ثابت ہوئی ہیں۔ روزانہ آٹھ دس انجکشن دیئے جاتے رہے ہیں۔ لیکن پلک سے پلک نہیں جھپکی۔ مشہور ہے جو سویا وہ کھویا۔ میں زندگی کا قیمتی چانس کھونا نہیں چاہتا۔ مجھے ہر قیمت پر تھیسس لکھنا ہے۔

میرے اچھے دوست جاوید میں تمہارا سر دباؤں گا۔ تلوے سہلاؤں گا۔ اور اچھی اچھی میٹھی میٹھی لوریاں سناؤں گا لو سنو۔

پیروں کو ہاتھ نہ لگائیے سداما جی۔ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔

سداما اسٹول پر بیٹھ گیا۔ جاوید کے پاس سگریٹ ختم ہو چکے تھے شراب بند کی جا چکی تھی۔ وہ بہت بے چین لو نڈہال

تھا اس نے سداما سے درخواست کی۔

سداما جی ایک ٹین سگریٹ کا لا دیجئے کہیں سے۔ ضرور لاتا دوست لیکن تم بھول رہے ہو شہر میں کرفیو لگا ہوا ہے اس وقت کسی کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں۔

کرفیو؟۔ اس نے چونک کر سوال کیا۔ کیا کوئی دنگا ہو گیا ہے۔

ہاں دو تین پاگلوں میں لڑائی ہو گئی۔

بھئی عجیب چیز ہوتے ہیں۔ یہ سنکی بھی یہ نہ ہوں تو دنیا میں ہر طرف امن ہی امن ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس جھگڑے میں مسز پیو کا ہاتھ ہے وہ بڑی لڑاکا ہے میں چاہتا ہوں اب وہ یہاں نہ آئے۔

وہ اب کبھی نہ آسکے گی میں نے اسے ہسپتال ہی سے نکال دیا ہے۔

کتنے اچھے ہیں آپ سداما جی۔

سداما سات گھنٹے جاوید کے پاس رہا۔ اسے نیند نہیں آئی لیکن وہ بہت زیادہ شائستہ اور پر امن رہا۔ اس نے کوئی بات پاگلوں کی سی نہ کی خوب ہنس کر باتیں کرتا رہا۔ اور جس وقت سداما ڈیوٹی پوری کر کے جانے لگا تو اس نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ اور مسکراتے ہوئے اسے رخصت کیا۔

تیسرا شخص جو اگلے سات گھنٹے کے لئے اس کی دیکھ بھال پر مقرر کیا گیا وہ ایک دبلا پتلا وارڈ بوائے تھا۔ اس سے کبھی کبھی خطرناک بیماروں کی نگرانی کرائی جاتی تھی۔ وہ بہت من چلا نوجوان تھا وہ کواڑ کھول کر اندر آیا ہی تھا کہ جاوید نے ڈانٹ کر پوچھا۔

کون؟

احمد بخش

جاوید کے چہرے پر نفرت اور حقارت کے ہلکے نقوش بنے اور فوراً ہی مٹ گئے وہ منھ ڈھانک کر لیٹ گیا احمد بخش سے اس نے کوئی بات نہ کی۔ احمد بخش نے دوا پلانے کی بہت کوشش کی لیکن جاوید نے اس کے ہاتھ سے گلاس چھین کر پھینک دیا احمد بخش تاک میں رہا کہ وہ حملہ کرے تو ذرا مزہ چکھائے۔ احمد بخش پاگلوں کو قابو میں لانے کا نہایت ماہر سمجھا جاتا تھا پہلے وہ ان کے حملے کا انتظار کرتا تھا پھر پچھاڑ کر خوب مرمت کرتا تھا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پاگل کیسا ہی خونخوار کیوں نہ ہو اس کے دیکھتے ہی کانپنے لگتا تھا۔ جاوید نے اس پر حملہ نہیں کیا۔ وہ جس طرح لیٹا تھا اسی طرح لیٹا رہا۔ کبھی کبھی آنکھیں کھول کر، احمد بخش کو دیکھ لیا کرتا تھا۔ پھر جلد ہی شدید نفرت کے ساتھ منھ پر کمبل ڈال لیتا تھا۔ احمد بخش اطمینان سے بیٹھا رہا۔ اس نے بظاہر جاوید کو اہمیت ہی نہ دی دوا پھینک دینے پر بھی کوئی باز پرس نہ کی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کھنچے رہے بارہ بجتے ہی ایک نرس آگئی احمد بخش اسے چارج دے کر چلا گیا۔ جاوید نے اس کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا۔ وہ اسی طرح خاموش پڑا رہا۔ پھر یکا یک آنکھیں کھول دیں۔ اور نرس کو اشارے سے قریب بلا کر دھیمی آواز میں بولا۔

پانی

اس نے گلاس میں پانی دیا جاوید نے آدھا پانی پی کر پوچھا۔

آپ کا نام؟

مس جوزف

اس نے غصہ میں ہونٹ کاٹ لئے اور گلاس مس جوزف کی طرف پھینک کر سخت آواز میں بولا۔

ناپاک لڑکی ۔ جلد یہاں سے چلی جاؤ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں تم قاتل ہو غدار ہو۔ وہ چند قدم اس کے پیچھے دوڑا مس جوزف تیزی سے چلی گئی۔ اس نے ایک سوئیپر کو اپنی مدد کے لئے پکارا۔ شور سن کر احمد بخش بھی آ گیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولا:—

دوست بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔

کوئی کام تھا؟۔

میرے ساتھ بڑی سازشیں ہو رہی ہیں پہلے مسز کپور کو یہاں بھیجا گیا پھر مس جوزف کو مجھے اندیشہ ہے کہ یہ مجھے زہر دے کر مار ڈالیں گی انھیں یہاں آنے سے روکئے۔

— اطمینان رکھئے ان میں سے کوئی یہاں نہ آ سکے گی۔

— بہت بہتر جی بھر کر سو سکوں گا۔

ان دونوں نے میری نیند حرام کر دی ہے ہر وقت سر پر سوار رہتی ہیں۔ دیکھئے نا، میں شاعر نہیں افسانہ نگار نہیں پھر بھی یہ عورتیں اعصاب پر مسلط ہیں۔

ان واقعات کی اطلاع ڈاکٹر جمیل کو دی جاتی رہی وہ نفسیات کا ماہر تھا اور جاوید سے بے حد دلچسپی لے رہا تھا وہ جاوید کے دوستوں عزیزوں اور ان لوگوں سے ملا جو کبھی اس کے ساتھ رہ چکے تھے۔ اسے یقین تھا کہ ان ناموں کے ساتھ ضرور کوئی تاریخ وابستہ ہے جن کو سنتے ہی جاوید بھڑک اٹھتا ہے۔ چند روز غور کرنے کے بعد وہ جاوید کو دیکھنے گیا اور مسکراتے ہوئے بولا:۔

جاوید صاحب آج کے ایوننگ نیوز کی خبر ہے کہ مسز کپور اور مسز جوزف کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ان پر نہایت شدید الزامات ہیں۔ مسز کپور نے ایک نوجوان کو اس کی محبوبہ سے جدا کیا تھا جس کے نتیجہ میں اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی اور مس جوزف نے ایک تاجر کو موت کے گھاٹ اتارا ہے وہ جمنا میں ڈوب گیا تھا۔

شاباش ڈاکٹر بڑی اچھی خبر سنائی۔

تیری آواز مکے اور مدینے۔

میں جلد ہی سننا چاہتا ہوں کہ جج نے ان دونوں کو پھانسی کی سزا دیدی۔

اور ایک روز ڈاکٹر جمیل نے اسے اطلاع دی کہ مسز کپور اور مس جوزف کو پھانسی دے دی گئی۔

جاوید تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ اس کی حالت بہت اچھی تھی۔ اور خیال کیا جا رہا تھا کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر ہی ہسپتال چھوڑ دے گا۔

ڈاکٹر جمیل نے ایک لیکچر میں بڑا حیرت انگیز انکشاف کیا۔ اس نے کہا۔

مسز کیو کالج میں لیکچرار تھی۔ جاوید اس کا طالب علم تھا۔ وہ ایک لڑکی سے والہانہ محبت کر رہا تھا۔ مسز کیو ان دونوں کے درمیان حائل ہو گئی۔ جاوید نے غصہ میں آکر کالج چھوڑ دیا۔ اس کی تمنا تھی کہ ڈاکٹریٹ کرے۔ یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اور مس جوزف نام کی ایک کرسچین لڑکی سے جاوید کا ایک دوست شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ جاوید اس کی مدد کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ مس جوزف اس کی بیوی بن جائے۔ اس نے وعدہ کر لیا تھا لیکن وہ کسی اور کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اور جاوید کا دوست جمنا میں ڈوب گیا۔ ڈاکٹر نے آگے چل کر کہا۔ یہ دونوں نام اب تک جاوید کے لاشعور کی لہروں پر بہتے پھر رہے ہیں۔ ان شخصیتوں کا پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟ مگر ناموں کا غبار اس کے ذہن پر چھایا ہوا ہے۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی سامنے آگئی تو ممکن ہے وہ دوبارہ اپنے حواس کھو بیٹھے۔!!

ابن انشا

# انشائیے

## گداگر لیبر بٹالین

لاہور میں کسی بڑے آدمی نے تجویز پیش کی ہے کہ یہ جو اتنے گداگر شہر میں مارے مارے پھرتے ہیں ان کی ایک بٹالین بنا دی جائے اور اس سے کچھ کام محنت مزدوری کا لیا جائے۔ ان لوگوں کو تنخواہ ملنے لگی تو پھر کیوں مانگنے کا دھندا کریں گے۔ نام ہوا اس کا لیبر بٹالین۔

- - - - - - - -

گداگروں کو منظم کرنے کی کوششیں اس سے پہلے بھی ہو چکی ہیں۔ اور اکثر اوقات خود ان ہی لوگوں کی طرف سے کراچی میں تو گداگروں نے اپنی ٹریڈ یونین بنا کر رجسٹرڈ بھی کرالی ہے جس کا آئین ضرورت مند حضرات دست سوال دراز کر کے منفعت حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کا سب سے پہلا مطالبہ تو یہی ہے کہ ہم کو گداگر نہ کہا جائے بلکہ سائل حضرات، شاہ صاحبان وغیرہ کہا جائے۔ ان میں سے کچھ جو زیادہ فیشن ایبل ہیں اپنا نام، انگریزی میں رکھنا چاہتے ہیں: "آل پاکستان بیگرز ایسوسی ایشن" لیکن اس پر اکثریت کو اتفاق نہ ہوا اور یوں ان لوگوں نے اپنی جماعت الگ کر لی۔ شہر میں جو حضرات کوٹ پتلون پہنے اور انگریزی کے کارڈ چھپوائے بنگلے میں انگریزی کی تختیاں لٹکائے نظر آئیں ان کو اس آخر الذکر یونین سے وابستہ سمجھا جائے یاد رہے کہ جن صاحبوں کی کاروں کے نمبر پلیٹ انگریزی میں ہیں ان کا اس جماعت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ شرفا لوگ ہیں کسی نے ان کے ہاتھ پر کچھ رکھنے کی کوشش کی تو بدمزگی کا اندیشہ ہے۔

- - - - - - - - -

معلوم ہوتا ہے صاحب موصوف نے جوان لوگوں کی فوج تیار کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ تو اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا معلوم ہوتا ہے وہ کبھی گداگر نہیں رہے۔ گداگر تو ایک طرف عاشق بھی نہیں رہے کہ گدائی کی لذتوں سے واقف ہوں۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نامی ایک خاندانی رئیس تھے۔ دبیر الدولہ نجم الملک کہلاتے تھے۔ اور صاحب ڈپٹی کمشنر کے دربار میں کرسی پاتے تھے۔ لیکن چونکہ شعر وغیرہ بھی کہتے تھے اس لئے اس کام کو اپنے لئے ذریعہ عزت نہ جانتے تھے۔ اس لئے ہم بھی ان کی اس حیثیت پر زور نہیں دیتے۔ خیر تو یہ رئیس عاشقی کے پردے میں گدائی یا گدائی کے پردے میں عاشقی بھی کرتے تھے۔ ان کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک روز اسی ہیئت گدائی میں محبوب کے ہاں پہنچے۔ سستے زمانے تھے اس لئے محبوب لوگ دربان ضرور رکھا کرتے تھے۔ دربان نے انھیں دیکھا تو چپ رہا کہ روٹی دال کا سوال کریں گے۔ لیکن انھوں نے اس کے قدم یعنی پاؤں پکڑنے کی کوشش کی اور یہ کچھ اچھا نہ ہوا۔ غالب تو صرف "مری جو شامت آئی" کا بلیغ استعارہ استعمال کر کے رہ گئے ہیں۔ لیکن ان کے شارحین کو چاہئے تھا کہ پوری تفصیل دیتے کہ جب دربان یہ تو نہ سمجھا کہ اس کا جوتا اٹھانے ہیں۔ شامت آئی کہ کرنے

میں معنی کا کتنا بگاڑ دیا بندہ ہے۔ وغیرہ۔ مقصود کلام ہمارا یہ ہے کہ اس کے باوجود وہ آخری دم تک گدائی سے دست کش نہ ہوئے ان کے کلام کے حوالے دینے کی یہاں گنجائش نہیں ہے

- - - - - - - - - - -

سو گدائی یا گداگری کا تعلق روزگار یا تنخواہ سے نہیں ابھی کل ہی ایک بزرگ پریشان حالی کا جامہ اوڑھے تشریف لائے کہ بابا کئی دن کا بھوکا ہوں کچھ ہماری خدمت کرو۔ فقط پانچ روپے کا سوال ہے۔ ہم نے کہا حضرت آج اگر تم ہمارے باغیچے میں پانی دیتے رہو تو تعمیل حکم میں عذر نہ ہوگا۔ کماؤ اور کھاؤ۔ ہنس کے بولے "جناب کام ہی کرنا ہوتا تو اور جگہیں تھوڑی تھیں۔ آپ خیرات دیتے ہیں تو دیجئے ورنہ میں اگلے گھر سے لے لوں گا۔ آپ کے مشوروں کی حاجت نہیں۔

- - - - - - - - - - -

گداگروں کی بیبرشابین سے ہمیں سودا کے شہر آشوب کا وہ بند یاد آگیا جس میں رئیسوں کا احوال بیان کیا گیا ہے ۔

گھروں سے اب وہ نکلتے ہیں لے کے یہ ہتھیار      بغل کے بیچ تو سونٹا ہے ہاتھ میں کشکول

سو یہ شابین بن بھی گئی تو غالباً اسی کیل کانٹے سے لیس ہوگی۔ اتنا فرق ہے کہ پھر بھیک بھی ٹیکس کی طرح فرض ہو جائے گی جس سے انکار جرم ہوگا۔ حکومت کو ایسا کرنا بھی چاہئے کیونکہ بھیک مانگنا اتنا آسان کام نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے ہم کئی روز سے پانچ سو روپے کے لئے کئی دوستوں کے سامنے ہاتھ پھیلا چکے ہیں۔ سبھی نے ٹکا سا جواب دے دیا ہے۔ لفقیر سے تو پھر بھی اخلاق برتتے ہیں کہ بابا معاف کرو ہمیں اس کا بھی سزاوار نہ سمجھا۔

## سروپا سے بے سروپا تک

کل ایک رومانی افسانہ پڑھ رہے تھے نام بتانے کی ضرورت نہیں کہ کس کا تھا۔ اس میں ہیرو ایک جگہ ہیروئن پر رال ٹپکاتے ہوئے کہتا ہے کہ ملی میرے عنقریب آکر بیٹھو۔ ہم لکھتے تو "قریب آکر بیٹھو" لکھتے۔ کام تو چل جاتا مگر بات میں وہ زور کبھی پیدا نہ ہوتا جو عنقریب کے لفظ سے پیدا ہوا ہے۔ ہم نے ورق الٹے کہ افسانہ نگار کا پورا نام پڑھا معلوم ہوا منشی فاضل ہیں بس یہی فرق ہے ایک عام آدمی اور منشی فاضل میں۔ اگرچہ بعض لوگ اس ڈگری کے بغیر بھی اس مقام کو پہنچتے دیکھے گئے ہیں۔ ہمارے دوست کا درزی ان کی شیروانی کا ناپ لے رہا تھا۔ ہم نے کہا بھیا ایک سوٹ ہمارا بھی سی دینا۔ بولا "جناب کسی وقت بندے کی دکان "دارالخیاط" پر تشریف لایئے۔ آپ کا آنا میرے لئے عین سوا ان روح ہوگا" ہم نے بعد میں اپنے دوست سے پوچھا کہ ان بزرگوار میں اس تبحر علمی کی وجہ کیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ دس برس کویت میں رہے ہیں۔ اگرچہ سیتے وہاں بھی کپڑے ہی تھے لیکن عربوں ایرانیوں کی صحبت اثر کئے بنا نہ رہی۔

- - - - - - - - - - -

ہمارے ایک دوست راوی ہیں کہ ایک بار میرٹھ میں ہم نے ملک اور قوم کی خدمت کے لئے ایک انجمن بنائی جس کے اہتمام سے کمپنی باغ میں ایک جلسہ بھی ہوا فارسی کے ایک ماسٹر اس کے پبلسٹی سکریٹری مقرر ہوتے جلسہ ختم ہوا تو اس کی روداد انھوں نے اخباروں کے لئے رقم کی اور ہمیں دکھائی۔ اس کا شروع کا فقرہ ہی یہ تھا "آج شام میرٹھ کے نام نہاد مسلمانوں کا ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا" ہم نے عرض کیا "مولوی صاحب جہاں تک ہمیں خیال پڑتا ہے نام نہاد کا لفظ عموماً اچھے معنوں میں نہیں آتا" بولے "میں خوب جانتا ہوں جناب نام نہاد کے معنی ہیں نامور یعنی مشہور میں نے اپنے طالب علموں کو ہمیشہ یہی سکھایا اور پڑھایا لیکن کسی نے مجھے نہیں جھٹلایا اتفاق سے کچھ اور لوگ بھی اس قضیے میں ہماری حمایت

پھر گئے اور ضد کرنے لگے کہ اس کا مطلب تو یہ ہے: "محض نام کا مسلمان۔" آخر یہ طے پایا کہ مولوی عبدالحق کو خط لکھا جائے اور ان سے انصاف کرایا جائے۔

کوئی مہینہ بھر بعد ہم نے ماسٹر جی سے پوچھا کہ "آپ نے بابائے اردو سے استصواب کیا؟ کیا جواب دیا انھوں نے؟"

فرمایا: "بابائے اردو لکھتے ہیں کہ یہ دونوں معنوں میں ٹھیک ہے لیکن ترجیح میرے بتائے ہوئے معنوں ہی کو ہے۔"

- - - - - - -

ہمارے مڈل کے استاد بابو رادھے شرما بڑے پڑھے لکھے آدمی تھے۔ انھوں نے برٹش انڈیا کی ہسٹری میں ہمیشہ ہمیں امیر البحر (رج ر) ہی پڑھایا۔ ایک بار ہم نے نہایت ادب سے گذارش کی کہ شاید یہ لفظ امیر البحر (ب ح ر) ہو۔ بولے "تمہارا کیا ہے تم تو جغرافیہ کو بھی جغرفیہ پڑھو گے برخوردار جو ہم پڑھاتے ہیں وہی صحیح ہے یہ لفظ جرابکا مخفف ہے۔

- - - - - - -

لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ علم ہمارے ماسٹر بابو رام شرما یا میرٹھ کے مولوی صاحب پر ہی ختم ہو گیا اب بھی پرانے زمانے کی پرانی یادگاریں باقی ہیں پچھلے دنوں اخباروں میں خبر چھپی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی تصویر بھی کہ لاہور کے قلعے میں جناب ممتاز حسن کو "سرِبیا" پیش کیا گیا۔ تصویر میں کچھ خلعت قسم کے کپڑے نظر آ رہے تھے۔ لیکن لفظ ہمارے لئے نیا تھا اس لئے ہم نے اپنے پڑوسی مولوی بلاغت اللہ سے رجوع کیا۔ بولے "تم نے بے سروپا" کا لفظ سنا ہے"۔ ہم نے کہا جی ہاں سنا ہے۔ "بس یہ وہیں سے نکلا ہے بے سروپا وہ شخص جس کے پاس سروپا نہ ہو۔ ہم نے کہا مولوی صاحب آپ کے پاس سروپا ہے یا آپ بے سروپا ہانک رہے ہیں؟ ناراض ہو گئے بولے "پہلے بزرگوں کا ادب کرنا سیکھو پھر میں اس سوال کا جواب دوں گا۔

## نیکی کر تھانے جا

کل ایک بزرگ پرانے خیال کے ملے جنہوں نے کہیں ابراہیم جلیس کی تازہ تصنیف لطیف نیکی کر تھانے جا۔ کا اشتہار پڑھا تھا بولے جناب کیا عالم بے چارگی ہے کہ ہم زبان کا خون ہوتے دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم نے کوکا کولا پلا کر ٹھنڈا کیا اور پوچھا۔ خیریت۔ فرمایا: "نیکی کر تھانے جا" کہاں کا محاورہ ہے۔ نیکی تو کر کے دریا میں ڈالی جاتی ہے۔ ہم نے کہا اگر دریا قریب نہ ہو تو آدمی کیا کرے؟ انھوں نے اس کے جواب میں کہا تھانہ قریب نہ ہو تو کیا کرے؟ بڑا ہے ہیچ یہ ہے کہ یہ بات نہ محاورہ بنانے والے نے سوچی نہ لگاڑنے والے نے کہ ایسے بھی تو گاؤں اور قصبے ہو سکتے ہیں جو نہ دریا پر واقع ہیں نہ کوئی تھانہ قریب ہے وہاں کسی کا نیکی کرنے کو جی چاہے تو کیا کرے؟ خیر ان بزرگ سے ہم نے کہا کہ جلیس کی کتاب تو اپنی جگہ پر ہے لیکن آپ ہماری سرگزشت سن لیجئے۔ کیا عجب آپ اپنا اعتراض واپس لینے پر راضی ہو جائیں۔

بولے سنائیے صاحب سنائیے لیکن آپ ایک پان زردے کا منگا دیجئے پر چونا برابر کا ہو۔

- - - - - - - - - -

بات کئی برس پہلے کی ہے ہم نے اخبار میں دیکھا کہ ایک کمپنی کو منیجر چاہئیں میٹرک پاس کوئی تجربہ ضروری نہیں۔ تنخواہ سات سو روپے ماہوار۔ کلرک بھی درکار ہیں جن کا مڈل پاس ہونا کافی ہے۔ ان کو تین سو روپے ملیں گے۔ چپراسی کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ تنخواہ پورے دو سو روپے ملے گی درخواست کے ساتھ خرچہ اشتہارات وغیرہ کے لئے پانچ روپے بھیجنے کی ہدایت تھی۔ ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ ایسے دریا دل اور لکھ لٹ کہاں سے آئے۔ انسپکٹر جنرل پولیس کو رپورٹ کی کہ ذرا اس بات کی تحقیق کیجئے۔ دال میں کالا معلوم ہوتا ہے۔

یہ رپورٹ کر کے ہم بھول گئے یعنی اپنی دانست میں نیکی کی اور دریا میں ڈال دی لیکن کوئی دو مہینے بعد ہم کیا دیکھتے ہیں کہ پولیس کا ایک پیادہ ہمارا پتہ مر رہا ہے اس نے پہلے تو محلے کے مختلف گھروں میں جا کر دریافت کیا کہ یہ صاحب کہاں رہتے ہیں۔ ان کا سمن ہے جب شہرت پوری خراب ہو چکی تو ہمارے مضمون اس کا کچھ اس قسم کا تھا کہ اے مسمی فلاں، فلاں تاریخ فلاں کو فلاں بجے پولیس کے دفتر میں حاضر ہو۔ کوئی عذر مسموع نہ ہو گا۔ بصورت دیگر نہ آنے پر وارنٹ دیا جائے گا وغیرہ۔ ہم نے ان صاحب سے پوچھا کہ جہاں تک ہماری یادداشت کا تعلق ہے ہم نے کوئی جرم ماضی قریب یا بعید میں نہیں کیا کیا ہے ل دست اندازی پولیس قسم کا نہ تھا یہ کیا ماجرا ہے۔ اس نے کہا آپ کا نام فلاں ہے؟ ہم نے کہا ہاں ہے تو بہی تو بولے۔ فوراً دستخط کیجئے ورنہ میں لکھ دوں شخص مذکور سمن لینے سے انکاری ہے۔

— — — — — — — —

ہم نے دفتر میں عرضی دی کہ ہمیں پولیس ہیڈ کوارٹر بلایا گیا ہے۔ ہمارے افسر اس وقت ہماری ترقی کی سفارش کر رہے تھے۔ ہماری عرضی دیکھ کر انہوں نے اس فائل کو دراز میں بند کر دیا اور بولے۔ اچھا تو آپ کی پولیس میں طلبی بھی ہوتی ہے۔ خیر پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچے تو ایک صاحب نے کہا وہاں جائیے وہ دوسرے کمرے والوں نے کہا یہاں جائیے۔ آخر ایک صاحب نے کہا۔ ہاں ٹھیک ہے۔ "کرسی تو ہے نہیں کہ آپ کو پیش کروں یہ کونے میں جو بوری پڑی ہے اسی پر بیٹھ جائیے۔ یوں بھی آپ کے تعلق اس بوری سے ہے۔" ہم نے کہا: "ذرا کھول کے بیان کیجئے۔" وہ بولے: "بوری کھولنے کا حکم نہیں اس پر مہر لگی ہے۔" ہم نے کہا: "بوری سے مراد نہیں ذرا کھول کے بیان کیجئے۔" اس پر انھوں نے پہلے ہمارے جذبۂ فرض شناسی کی تعریف کی۔ پھر کہا آپ کا خط آنے پر ہم نے چھاپہ مارا اور کمپنی مذکور کا ریکارڈ قبضہ کر لیا۔ کمپنی مذکور فقط ایک صاحب پر مشتمل ہے اور اس کا اثاثہ فقط ایک بٹر بکس ہے یہیں سے ضرورت مندوں کو ملازمتیں تقسیم ہوتی ہیں یہیں سے طلسمی ... طلسمی سرمہ سپلائی کیا جاتا ہے۔ دس روپے میں تین خوب صورت نہ چلنے والی گھڑیاں بھی یہی دیتے ہیں۔ اور لڑکوں کو چوہوں کو ڈرانے والا آٹومیٹک پستول جس کے لئے لائسنس کی ضرورت نہیں یہی صاحب عامل کامل بنگالی بابا ہیں جو تعویذ دے دیں تو بگڑے کام بن جائیں مقدمے میں فتح ہو محبوب ... قدموں میں آن گرے اور بھی —

ہم نے کہا قصہ کوتاہ کیجئے۔"

انسپکٹر صاحب بولے، "ہم نے آپ کے کہنے سے پہلے ہی ان صاحب کا قصہ کوتاہ کر دیا ان کا چالان عدالت میں پیش کر دیا ہے اب آپ کو گواہی دینی ہو گی بس اتنی سی تکلیف ہے پہلی تاریخ جمعرات کی ہے۔

ہم نے کہا یہ تو غضب ہوا جمعرات کو تو ہمیں اپنے بھائی کے بچے کی ختنہ میں شرکت کے لئے لاہور جانا ہے۔

انسپکٹر صاحب بولے یہ عدالت کا معاملہ ہے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے ایسے معاملوں میں وارنٹ گرفتاری جاری ہوتے دیکھے ہیں۔

— — — — — — — — —

اس نیکی کے ضمن میں ہم نے عدالت بھی دیکھ لی۔ اب تک عدالت ہم نے فقط اردو انگریزی فلموں میں دیکھی تھی جس میں ہیرو ہاتھ پھینک پھینک کر بحث کے جوہر دکھاتا ہے لوگ بھونچکے رہ جاتے ہیں۔ ہیروئن کے من کی آنکھیں کھلتی ہیں نج آبدیدہ ہو جاتا ہے اصلی مجرم کیفر کردار کو پہنچ جاتا ہے لیکن یہ ... اس سے مختلف نظر آئی ہمیں صبح آٹھ بجے آنے کی ہدایت تھی یہ بالعموم ہمارے بستر استراحت سے اٹھنے کا وقت ہے لیکن قانون کے احترام میں بجز ... کی سواری پکڑ کر ہانپتے کانپتے پہنچے بھی نہ کی تھی لہٰذا بعضوں نے تو حوالاتی خیال کیا۔ خیر ایک دو مقدموں کے بعد ہماری باری آئی۔ عدالت نے پوچھا ... صاحب کو جانتے ہیں؟

ہم نے کہا کن صاحب کو؟

ابن انشا

"یہی جو آپ کے سامنے حال کال بنگالی بابا المعروف انٹرنیشنل کنسلٹنٹ کمپنی عرف کلکتہ ٹریڈنگ کارپوریشن عرف دواخانہ بغدادیہ کھڑے ہیں۔

دیکھا کہ ایک صاحب ہیں کوئی پچیس تیس برس کے۔ سوٹ زیب تن ہے آنکھوں میں سرمے کی تحریر ہے سپاٹ میں ریٹ کیلٹ ہیں

ہم نے کہا۔ جی نہیں ان سے نیاز کبھی حاصل نہیں ہوئے۔

"آپ کو ان سے کوئی ذاتی دشمنی ہے؟"۔

"جی نہیں"

پھر آپ نے ان کی رپورٹ کیوں کی!۔

پہلے سوچا کہہ دیں کہ جی غلطی ہوئی اس کے بعد حوصلہ کر کے بتایا کہ اس اشتہار کو دیکھ کر یقین نہ آیا کہ کوئی میٹرک یا مڈل پاس لڑکوں کو اتنی تنخواہ دے سکتا ہے لہذا شبہ کی بنیاد پر شکایت کی۔

مجسٹریٹ صاحب نے کہا۔ ٹھیک ہے"

ہم شکریہ ادا کر کے جانے لگے تو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے کہا۔

"کل پھر آیئے کیونکہ یہ تو فقط ایک کیس میں گواہی ہوتی ہے۔ ان صاحب کے خلاف کوئی پچیس کیس ہیں اور ان سب میں آپ کی گواہی ضروری ہے"

ہم نے سوچا کہ اب جو نیکی کر بیٹھے ہیں تو یہاں سے سیدھے دریا پر جائیں اور خود کو اس میں ڈال دیں۔ پھر جرأت کر کے مجسٹریٹ صاحب سے کہہ کہ بندہ نوازجان کی امان پاؤں تو عرض کروں کیس کتنے بھی ہوں میرا بیان فقط یہی ہو گا کہ میں نے اخبار میں اشتہار دیکھا اور شبہ کی بنا پر عرضی دے دی۔ لہذا ممنون ہوں گا آئندہ کی حاضری معاف فرمائی جائے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ کسی ایسے معاملے میں نہ پڑوں گا۔

کیس کا تو مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔ ملزم کیفر کردار کو پہنچا کہ نہیں۔ آتا ہے کہ مجسٹریٹ نرم دل ہونے کی وجہ سے، ہم کیفر کردار کو پہنچتے پہنچتے رہ گئے۔

---

ایک صاحب کا کہنا ہے کہ اس محاورے کی ایک اور صورت بھی تو ہے نہ یہ کہ نیکی کر قبرستان جا۔ ہم نے کہا لے عزیزان بڑے میاں سے پوچھ لے یہ اجازت دیں تو تو بھی اپنی حکایت کہہ لے۔ ہمارے لئے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ نیکی نکالنے جاتی ہے یا قبرستان جاتی ہے۔ کیونکہ آئندہ ہم سے کوئی نیکی سرزد ہونے کا امکان بہت کم ہے۔

بڑے میاں نے زور سے ایک اور پان کی فرمائش کر کے بطیب خاطر اجازت دے دی۔

---

ان صاحب نے کہا۔ بندے کو ساتر کا تیوری کہتے ہیں۔ ساتر میرا تخلص ہے نہ موسیقی سے یا کسی گانے بجانے والے طائفے سے میرا کوئی تعلق ہے نہ گھوڑے کے ساز اور کاٹھی سے کوئی ربط۔ تربیت میری نہایت شائستہ اور مذہبی ماحول میں ہوئی۔ شجرۂ نسب میرا ننہال کی طرف سے۔۔۔

ہم نے کہا شجرے کی بات پھر سہی۔ اس وقت آپ وہ واقعہ سنائیے۔

بولے یوں سنیں گے تو حکایت بڑی مختصر ہے۔ وہ یوں کہ ایک روز سر راہے جاتے ہیں نے دیکھا کہ ایک جنازہ جا رہا ہے چار آدمی میت اٹھائے ہیں پانچ سات ان کے پیچھے ہیں میں بھی ثواب کی نیت سے ان میں شامل ہو گیا۔ بلکہ آگے بڑھ کر ایک صاحب کو چھٹی دی ——— اور ادھر اپنے کاندھے پر لیا۔

پندرہ بیس منٹ گزر گئے ——— اب ہم شہر سے باہر نکل آئے تھے۔ چلچلاتی دھوپ تھی کاندھا بھی اب آرام چاہتا تھا۔ لہذا میں نے

ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی اور صاحب ثواب کے خواہاں ہوں تو ان کو بھی موقع دوں لیکن یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ آگے پیچھے کوئی شخص نہ تھا۔ وہ چند بھلے مانس جو نظر آتے تھے راستے میں کہیں رہ گئے تھے۔ اب فقط ہم چار کاندھا دینے والے رہ گئے تھے۔ خیر آدھا گھنٹہ ٹہلے ہی۔ سیدھی سڑک چلتے رہے آخر میں نے پاس والے ایک صاحب سے پوچھا کہ "میاں یہ کس کی میت ہے اور کون سے قبرستان جا رہی ہے؟"

وہ بولے — "بھیا — مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں تو ہاشمی محلے سے شریک ہوا ہوں۔" ان دوسرے صاحب سے پوچھا انہوں نے بھی کہا۔ "حضرت مجھے علم نہیں" چوتھے صاحب نے بھی کہا کہ "میں کیا جانوں۔ میں تو ایصالِ ثواب کے لئے شریک ہوا۔ میت کس کی ہے — کہاں جائے گی — کچھ معلوم نہیں۔"

یہ جگہ اجاڑ بیابان تھی۔ دھوپ بھی کڑاکے کی تھی اور ہمیں چلتے چلتے تین گھنٹے ہو گئے تھے۔ آخر ایک طرف کو ایک مسجد نظر آئی وہاں جا کر ہم نے جنازہ اتارا۔ مولوی صاحب ان لوگوں سے مصروفِ گفتگو ہوئے میں نے کہا ذرا پیشاب کر آؤں۔ مسجد کی دیوار سے اوجھل ہوتے ہی میں نے طرارہ بھرا اور شہر کا رخ کیا تھوڑی دور جا کر پلٹ کے دیکھا کہ تینوں صاحب پیچھے آ رہے ہیں۔ اور لیجیو، پکڑیو کا شور مچا رہے ہیں۔ لیکن میں نے اپنی رفتار دھیمی کی نہ پھر پیچھے مڑ کے دیکھا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن پھر کبھی ثواب کمانے کو جی نہیں چاہا۔"

سجاد نظر

# کہانی کا ٹھہراؤ

جب سنگھار ختم ہو گیا تو مسز براؤن نے مسکرا کر آئینے کی طرف دیکھا اور آگے جھک کر آہستہ سے بولی: "بتا گونگے میں کتنی حسین ہوں۔؟"

آئینہ یکایک چھن سے ٹوٹ گیا۔ اور مسز براؤن کو لگا جیسے وہ سر سے پیر تک بھیگ گئی ہے۔ یہ آئینہ ٹوٹا تھا یا گھڑا پھوٹا تھا۔؟

اس نے گھبرا کے آنکھیں بند کر لیں۔ ندی بل کھا کر تیزی سے بہہ رہی تھی اور وہ سامنے ہی ہاتھوں میں پتھر لئے مسکرا رہا تھا۔

"کمینہ کہیں کا۔"

مسز براؤن نے یکایک آنکھیں کھول دیں۔ ٹوٹے ہوئے آئینے سے ندی کا پانی بہہ بہہ کر کمرے میں آنے لگا تھا، ۔ اُس نے دیکھا سنگھار میز بھیگ رہا ہے اور فرش پر اس کے لپ اسٹک اور کنگھیاں اور سینٹ کی شیشیاں بکھری پڑی ہیں۔

"مت بہو۔" اُس نے بے بسی سے اپنے ہاتھ آئینے پر رکھ دیئے۔ "میں نے ایک دن تمہارے ہی پانی میں ڈوب کر خودکشی کی تھی۔ اب میری لاش کو بہا کر کہاں لے جانا چاہتی ہو۔؟ پاگل میں مسز براؤن ہوں۔"

آئینہ پھر چھن سے ٹوٹ گیا؛ اور ایک چرخی کی طرح تیزی سے گھومنے لگا۔ اس نے دیکھا اس کی شکل ایک ملیکا رڈ کی طرح آئینے میں چکر کھا رہی تھی۔ اور ہر چکر میں زندگی کے بے شمار موڑ کاٹ کر مسز براؤن بن رہی تھی۔

"آئینہ تو پاگل ہے اور ندی بھی پاگل ہے۔ مگر مجھے اس سے کیا؟" وہ یکایک اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے تو کبھی ہاسٹل میں جانا ہے۔ مجھے پوجا کی تھالی اور چنبیلی کے پھولوں سے کیا مطلب۔ وہ اپنے ہی ہاتھوں کے پتھر سے سر پھوڑ کر مر گیا تو میں کیا کروں۔" مسز براؤن نے جھنجھلا کر اپنی بھیگی آنکھوں کو پونچھا، اور پیر پٹکتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

برآمدے کا دیوار گیر آئینہ اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔ "مسز براؤن تم بوڑھی ہو گئیں۔"

وگیا — ؟" مسز براؤن سر سے پیر تک کانپ گئی۔ ایک جھٹکے سے رک کر اُس نے اپنی دائیں کنپٹی کے سفید بالوں کو دیکھا جو اُس کے کان کے پاس لہرا بن کر جھول رہے تھے ——— " تو کیا ہوا ——— ؟ " مسز براؤن زبردستی مسکرا کر بولی۔

" اب تم سپنے جمع کرو گی، کیونکہ صرف سپنے ہی تمہارے ہیں —" آئینہ کھلکھلا اٹھا۔

" سپنے اندھے دیکھتے ہیں —" مسز براؤن نے پھر غصے سے اپنی ان آنکھوں کو جو آنسوؤں سے اندھی ہوئی جا رہی تھیں پونچھا اور تیزی سے چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی — دائیں دیوار پر ایک بڑا سا کلنڈر لٹک رہا تھا — اُنیس سو پینسٹھ — مسز براؤن کے دونوں پیر گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے —' یہ چودہ سال کا باسی سنگھار کئے میں کس سے ملنے جا رہی ہوں — ؟ "

کلنڈر کے جتنے کالے نمبر تھے یکایک آنسوؤں سے بھیگے کاجل کی طرح بہنے لگے اور جتنے سُرخ نمبر تھے خون بن کر قطرہ قطرہ ٹپکنے لگے ——— مسز براؤن کھڑی دیکھتی رہی ——— چودہ سال تک دیکھتی رہی ——— یہاں تک کہ کلنڈر کے سارے نمبر غائب ہو گئے، اور وہ ایک خالی اسکرین کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے ٹپکنے لگا ——— مسز براؤن نے محسوس کیا کہ اس کا قد دو اِنچ گھٹ گیا ہے اور اس کے کولہوں کا بھاری پن ہلکا ہو گیا ہے ——— اُس نے ایک اداسے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنا سینہ، گل گول، سڈول اور سخت محسوس ہوا، اور ایسا پھڑپھڑاتا ہوا محسوس ہوا جیسے کوئی آرزو سارے بند توڑ کر باہر آنے کی جستجو میں ہو۔

مسز براؤن نے مسکرا کر کلنڈر کے خالی اسکرین کی طرف دیکھا۔ وہ بچ دھج کر اپنے کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ میلی ساری کو تہہ کر کے اُس نے احتیاط سے الگنی پر لٹکا دیا تھا، اور اس لٹکتی ہوئی ساری میں اُس نے اپنی ماں کی کھانستی ہوئی بیماری کو بھی چھپا دیا تھا ——— پرانی چپل کو چارپائی کے نیچے رکھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ اس کی بہن کی شادی کا مسئلہ اس کی ایڑیوں میں دھول کی طرح لپٹا ہوا ہے ——— ننگے پیر اُس نے لہرا لہرا کر قدم اٹھائے اور طاق پر رکھے ہوئے باسی پھولوں کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا ——— پھول مٹی پر گر گئے، اور ساتھ ساتھ کرایہ ادا کرنے کا وہ خیال بھی نیچے گر گیا جو اُس کے سنگھار کو ادھر اُدھر سے نوچ رہا تھا۔

سبھوں کو دھکا دے کر اور سب کچھ چھوڑ کر وہ چلی اور ایسے چلی جیسے بالکل نئی ہو اور پہلی بار چل رہی ہو ——— دھیرے دھیرے ڈولتی ہوئی ——— اپنے ننگے پیروں کو فاختاؤں کی طرح اٹھاتی ہوئی ——— نیچے دالان میں اس کا ظالم بھائی بنل میں کلہاڑا رکھے زور و شور سے سو رہا تھا اور بغل کے کمرے میں اس کی بہن اپنے ہی سپنوں کا بوجھ اٹھائے اپنے کنوارپن کے تیز بلیڈ سے تھک تھک کر رات کاٹ رہی تھی ——— باہر دنیا چپ تھی، بس اونچے اونچے پیڑوں کے بے شمار پتے کمزور حاسدوں کی طرح سازش کر رہے تھے۔

وہ چلتی رہی ——— پیار نے اُسے پاگل کیا تھا اور اب رات نے اُس پر جادو کر ڈالا تھا ——— اُس کے گھر سے اس کے محبوب تک کا فاصلہ اتنا مختصر ہو گیا کہ اسے صدیاں لمحوں میں سمٹتی نظر آئیں ——— ایک کے بعد ایک ——— ہر قدم ایک وصال تھا ——— جب وہ بالکل باہر نکل گئی اور جب بیچ پگڈنڈی پر رک کر دھڑکتے ہوئے

اُس نے پلٹ کر اپنے گھر کو دیکھا تو وہ اُسے کیلے کے پتوں اور زرد پھولوں کی جھاڑیوں سے گھرا نظر آیا اور اتنا دور نظر آیا جیسے اُس سے رشتہ ہی ختم ہوگیا ہو —— اس نے سر اٹھا کر آسمان میں ستاروں کے میلے کو دیکھا اور تلاش کرنے لگی ان بے شمار آنکھوں کو جو خواب چُننے نکلی تھیں اور بھیڑ میں اِدھر اُدھر کھو گئی تھیں۔

"ہائے! وہ کہیں تھک کر سو نہ گیا ہو ——" وہ یوں بھٹک بھٹک کر قدم اٹھانے لگی جیسے خیالوں میں تیر رہی ہو۔

وہ اب تک جاگ رہا تھا، اور سر سے پیر تک خوشبو بنا ہوا تھا —— اُس کے قریب پہونچ کر وہ ایک لمحے کو رکی —— ایک لمحے میں اس کی سہمی ہوئی سوچ نے اسے ایک ربر کی طرح کھینچا اور کھینچ کر چھوڑ دیا —— دوسرے لمحے وہ ایک جھٹکے سے اس کے سینے سے جا لگی۔ بس یہی وہ لمحہ تھا جس کے لئے وہ زندگی کو اور زندگی کی ساری مُصیبتوں کو سہنے کے لئے راضی ہوگئی تھی —— ایسی ٹھنڈی ٹھنڈی آگ اُس کے سارے بدن میں لگنے لگی جیسے اس نے چنگاریوں کی ساری بُن کر پہن لی ہو۔

اور پھر اُس نے جنم جنم کے بعد جب محبت کی آگ میں راکھ ہو کر سر اٹھایا تو دیکھا کہ اس کی ماں مر چکی ہے اور اُس کا بھائی خون کرنے کے جرم میں جیل جا چکا ہے —— اُس کی بہن دروازے کے باہر اس کا انتظار کر رہی ہے اور وہ خود نرسوں سے گھری ہوئی اسپتال میں پڑی اپنے پیار کے مَرے ہوئے بچے کو جنم دے رہی ہے۔

مسز براؤن نے یکا یک گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں، اور اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا ——

"کتنی گھسی پٹی کہانی ہے —— کوئی کب تک سُن سُن کر بور ہوتا رہے —— ؟"

دوسرے لمحے اُس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں، اور دانت پیس کر سمت سے کلنڈر کی طرف دیکھا —— چاروں طرف سیاہ اور سُرخ نمبر بکھرے پڑے تھے —— کاجل اور خون کا کھیل ختم ہو چکا تھا۔

"مائی فٹ" اُس نے زور سے کہا، اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس کی نقلی پلکوں میں آنسو اب بھی جھلملا رہے تھے —— سیڑھیوں پر سے اُترتے ہوئے اُسے ایک تیز شور سُنائی دیا —— ایک لمحے کو رک کر وہ پلٹی۔ پھر واپس آکر بالکنی سے نیچے جھانکنے لگی —— باہر لان میں بہت سے بچے جن کی عمریں دس گیارہ سال سے زیادہ کی نہیں ہوں گی کھڑے چلا رہے تھے اور اس کا نام لے کر پکار رہے تھے —— مسز براؤن نے غصے سے ان سبھوں کو دیکھا اور چیخ کر بولی۔

"کون ہو تم لوگ —— ؟"

وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے —— "ہم سب اپنے اسکول سے آئے ہیں، اور تمہارے لئے تمہاری بہن کی لاش لائے ہیں ——"

اس نے چونک کر دیکھا۔ اُن سبھوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں اس کی بہن کا مردہ جسم اٹھا رکھا تھا —— مسز براؤن کا سارا غصہ پگھل کر ایک آنسو بن گیا۔

"کہاں ملی تم لوگوں کو یہ لاش —— ؟" مسز براؤن نے گھبرا کر پوچھا۔

"سڑک پر —— " ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر کہا —— "تم نے اسے جس گاڑی میں بٹھایا تھا، وہ اسی سے کود کر مر گئی ——"

سارے جہاں میں جیسے سناٹا چھا گیا —— بس یہی فرق تھا —— " اُس نے اپنی ہتھیلی سے پیشانی سہلاتے ہوئے سوچا —— " بس یہی فرق تھا کہ وہ مر سکتی تھی لیکن — میں مر نہ سکتی تھی —— اب اس کا فیصلہ کون کرے کہ کون جیتا اور کون ہارا —— ؟ "

بہت دیر بعد جب اُس نے سر اٹھایا تو دیکھا وہ لڑکا اب بھی سب سے آگے کھڑا اُسے حیرت سے تک رہا تھا۔ مسز براؤن نے اسے پیار سے دیکھا اور بولی:۔

"کون ہو تم —— ؟"

"میں تمہاری بہن کا بیٹا ہوں ——"

"کیا —— ؟" اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں —— " اس لڑکے نے سہم کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا —— ؟"

"میرا نام کڈا سٹریٹ ہے ——"

مسز براؤن کو پھر غصہ آ گیا ——

"مذاق کرتے ہو —— ؟" وہ چیخ کر بولی۔

"نہیں —— نہیں —— " وہ ڈر کر اپنے ہاتھ کو انکار میں ہلانے لگا —— "میں مذاق نہیں کرتا —— سچ مچ میرا نام کڈا سٹریٹ ہے —— میری آنکھوں میں دیکھو ——"

مسز براؤن نے جو اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھا اور پھر اس میں اُترتی چلی گئی —— اُس کی آنکھوں میں بہت دور تک ایک چوڑی روشن گلی تھی اور گلی کے موڑ پر لکھا تھا —— "کڈا سٹریٹ" —— ایک کے بعد ایک لیمپ پوسٹ اپنی اپنی روشنی کی سرحد بنا کر چپ چاپ کھڑے تھے —— مسز براؤن کو لگا جیسے وہ تمام لیمپ پوسٹ اس کی پیٹھ میں گڑے ہیں اور وہ اوندھی پڑی ہے اور اس کے جسم کی سڑک پر سے لوگ آ رہے ہیں، لوگ جا رہے ہیں —— وہ ایک ایک کا بوجھ محسوس کرنے لگی —— یہ قدم تھکے ہوئے ہیں اور بہت دور سے آ رہے ہیں، اور ان میں ایسے کانٹے چبھے ہوئے ہیں جو ایڑیوں سے ہو کر دل تک پہونچ گئے ہیں —— یہ قدم بہت تیز ہیں اور بہت ہلکے ہیں، یہ چھپ کر گھر سے نکلے ہیں اور اس سڑک پر جا رہے ہیں جہاں سے واپس آنے کو جی نہیں چاہتا —— یہ قدم کھو گئے ہیں اور دھول میں راستہ ڈھونڈ رہے ہیں —— اور یہ قدم کہیں سے ہمیشہ کے لئے واپس آ گئے ہیں، اور اب ہر سڑک پر جانے کے لئے راضی ہیں —— یہ بہکے ہوئے قدم ہیں، اور یہ شکست کھائے ہوئے قدم ہیں، اور یہ فلسفے میں ڈوبے ہوئے قدم ہیں —— جتنے قدموں کے جتنے جذبے تھے سب مل کر ایک ڈراؤنی تھکن بن گئے —— مسز براؤن کا ننگا سینہ زمین سے رگڑ کھا کر جلتا ہوا محسوس ہوا، اور اسے یوں لگا جیسے ناف کے نچلے

جسے میں ٹیس سی ہو رہی ہے۔

"بدمعاش کہیں کا ——" مسز براؤن نے اس بھوری مونچھوں والے بدصورت آدمی کو یاد کیا جس نے اُسے اس طرح الٹ پلٹ کر دیکھ دیا تھا جیسے کوئی دوا پینے سے پہلے شیشی کو زور سے ہلا دیتا ہے —— اُس نے اپنے پرس کو دیکھا جس میں ساڑھے اٹھائیس روپے تھے —— ڈیڑھ روپے کے اس نے پھول خرید لیے تھے —— مسز براؤن کو صرف اپنے گاؤں کے زرد جنگلی پھولوں سے محبت تھی، مگر وہ تو اب نہیں کھلتے تھے اس لئے اُسے اب پھولوں سے نفرت تھی —— شہر میں تو وہ پھول ایسے خریدتی تھی جیسے کوئی تالے کی کھوئی ہوئی کنجی خریدے —— مگر دوسرا گاہک پھر بھی ہاتھ نہیں آیا تھا۔

اس نے ان تمام سڑکوں کو یاد کیا جہاں وہ گاہک پھنسایا کرتی تھی، اور پھر سوچا کہ اگر وہ تمام راستے چھوٹے چھوٹے بچے بن جائیں تو وہ انہیں اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ انہیں نہلائے اور ان کی آنکھوں میں کاجل لگائے اور اپنا سینہ کھول کر دودھ پلائے اور کہے کہ کل جب کوئی بہت امیر بابو گذرے تو منڈی بن کر اُس کے پیر پکڑ لینا، اور مجھے دکھا کر کہنا کہ —— "یہ میری ماں ہے اور صرف پچاس روپے لیتی ہے، اور کنواریوں کی طرح مزیدار ہے —— میں نے اس کا دودھ پیا ہے —— میں جھوٹ نہیں بولتا ——"

مسز براؤن کو زور کی ہنسی آگئی —— وہ اتنے زور سے کھلکھلا کر ہنسی تھی کہ سارے لیمپ پوسٹ ڈگمگانے لگے تھے —— اسے اپنی پیٹھ بہت بھاری محسوس ہوئی، مگر اب وہ بہت تیز چلنے لگی تھی ——

گھر پہونچتے ہی اسے روز کی طرح احساس ہوا کہ وہ کٹ کر آدھی ہو گئی ہے۔ اس کا پہلا حصہ کمرے کے اندر رہتا ہے اور دوسرا حصہ کمرے کے باہر —— کمرے کے اندر اس کی بہن تھی اور کمرے کے باہر اس کی سڑکیں —— اسی لئے وہ اپنی بہن کو اپنے ساتھ نہیں لے جاتی تھی۔ اور کبھی کچھ نہیں بتاتی تھی۔

اس نے دیکھا وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے چراغ میں اپنے چہرے کو لو کی طرح لئے بیٹھی تھی اور کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ سامنے چھت پر وہ بنگالی لڑکا آج بھی وائلن بجا رہا تھا، اور اس کے ارد گرد محلے کے سارے بچے کھڑے تھے، اور حیرت سے اس کا وائلن سُن رہے تھے۔ ایسا آج دو مہینے سے ہو رہا تھا۔ اس کی بہن اس لڑکے پر مرمٹی تھی، مگر اُس چھوکرے کو سوائے اپنی وائلن کے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔

اُس نے آہستہ سے اپنی بہن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ یکایک مڑی، پھر ہنس پڑی۔

"میں نے تجھے منع کیا تھا نا ——" وہ بگڑی۔

"تو میں کہاں دیکھ رہی تھی ——" اس کی آنکھیں شرم سے جُھک گئیں۔

اُس نے ایک جھٹکے سے کھڑکی بند کر دی۔

"دیدی ——" وہ اُس سے لپٹ گئی، اور ایسے بولنے لگی جیسے خیال اور الفاظ کے درمیان ٹوٹا ہوا پُل ہو ——

"تم اُسے منع کیوں نہیں کرتیں —— وہ کیوں وائلن بجاتا ہے —— یہ کھڑکی آپ ہی آپ کھل جاتی ہے اور میرا دل ایک

سج بن کر دوڑتا ہوا اُس کے پاس چلا جاتا ہے ——— میں سچ کہتی ہوں اگر وہ میرے دل کے منڈھپ پر بیٹھی ہوئی دلہن کو دیکھ لے تو وائلن چھوڑ کر شہنائی سے پیار کر بیٹھے ——— تم دیکھ لینا جب میں مروں گی تو میرے جسم سے رگوں کے بجائے وائلن کے تار نکلیں گے ——— "

مسز براؤن نے آنکھیں بند کر لیں ——— اُسے لگا جیسے وہ ایک بہت بڑی وائلن میں بند ہے اور اس کی بہن اُسے اُٹھائے دھیمے سُروں میں بجا رہی ہے ——— اُس دن کے بعد سے اُسے پھر اس بات کا دکھ نہیں رہا کہ وہ اپنی بہن کی ماں نہیں ہے۔

لیکن ماں بھی تو خدا نہیں ہے اور خدا ماں کا دکھ کیا جانے ——— سو ایک دن ایسا ہوا کہ وہ وائلن جس کے اندر مسز براؤن بند تھی ٹوٹ گئی اور مسز براؤن لڑھک کر نیچے جا گری ——— اور نیچے ہی پڑے پڑے اس نے اوپر تکا ——— اُس بنگالی لڑکے کی چھت پر چاروں طرف رنگین بتیاں جل رہی تھیں اور شہنائیوں کی آواز اتنی تیز تھی کہ اس کی بہن کے دل کے منڈھپ پہ بیٹھی ہوئی دلہن دوڑتی ہوئی اس چھت پہ چلی گئی تھی اور وہیں سے کود کر مر گئی تھی ———

بہت رات گئے جب وہ بنگالی لڑکا ایک شعلہ کو لئے دولہا بن کر واپس آیا تو مسز براؤن نے دیکھا، اس کی گاڑی کے چاروں پہیئے خون سے سُرخ ہو گئے تھے ——— ایک سیکنڈ کے لئے اُسے اپنا محبوب یاد آگیا، مگر دوسرے ہی لمحے قہقہہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ——— کیونکہ یادوں کے سہارے جینے کے لئے صرف دو راستے ہیں ——— ہنسی کا راستہ اور آنسو کا راستہ ——— مسز براؤن نے اپنے لئے ہنسی کا راستہ چن لیا تھا اور عورت جتنا ہنس کر سہہ سکتی ہے رو کر نہیں۔

اُس رات اُس نے کھڑکی کو ہمیشہ کے لئے کیل ٹھونک کر بند کر دیا اور دوسری رات اس نے اپنی بہن کا جسم اور رُوح الگ کر دیا، ٹھیک ویسے ہی جیسے لکڑی جل کر آگ اور راکھ الگ الگ کر دیتی ہے۔ تیسری رات اس نے اپنی بہن کا سنگھار کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر، کڈ اسٹریٹ سے بھی باہر لے آئی، اور پھر اس کے کان میں جھک کر بولی۔

" تجھے معلوم ہے آج کون سا دن ہے ؟ "

" اتوار ——— " اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔

" نہیں ——— " وہ مسکرائی ——— " آج تیری شادی کا دن ہے ——— "

" کیا ——— ؟ " اُس کی بہن نے چونک کر گردن ہلائی۔

" ہاں ——— " وہ مسکرائی۔ اور اُسے ساتھ لے کر اُن سڑکوں پر آ گئی جہاں وہ گاہک پھنسایا کرتی تھی ——— " یہ سڑکیں دیکھتی ہے۔ یہ سب یہاں سے شروع ہوتی ہیں اور آگے جا کر دنیا کی ہر بڑی سڑک سے مل جاتی ہیں ——— آج سے میں یہ تمام سڑکیں تجھے جہیز میں دیتی ہوں ——— "

اتنا کہہ کر وہ رک گئی اور یاد کرنے لگی اُس بھوری مونچھوں والے کو جو ایک عرصے سے اُس کی بہن پر دانت گاڑے ہوئے تھا ——— وہ بہت دیر تک اُن سڑکوں پر گھومتی رہی ——— ایک ایک کر کے لوگ آتے رہے، جاتے رہے ——— ایک ایک کر کے مسز براؤن کو بہت سے غم یاد آئے، اور اس کے سامنے ایک بھیڑ سی لگ گئی ——— اُس نے سوچا کہ میں جو محسوس کر رہی ہوں، اگر یہ سڑکیں بھی وہی محسوس کرنے لگیں تو کیا ان کا سکھا کو تار پگھل کر لاوا بن کر

اُچھلنے لگا ——— ؟ ان ٹیلیفون کے تاروں کو اگر میں اپنے سینے سے لپٹا کر سو جاؤں تو کیا دنیا کے ہر فون کرنے والے کو میرے آنسوؤں کی آواز سنائی دے گی ——— ؟ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو ایسا کیوں نہیں ہو سکتا ——— ؟ کیوں کوئی اتنی بڑی دنیا میں اپنی مرضی کے مطابق نہیں جی سکتا ——— ؟

یکایک ایک بڑی سی گہرے رنگ کی کار اُس کے سامنے آکر رک گئی ——— اُس نے دیکھا اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھا وہی بھوری مونچھوں والا اُسے آنکھ مار رہا تھا۔

"کتنا آسان ہے ——— "اُس نے ایک سکنڈ کے ہزارویں حصے میں سوچا ——— "کتنا آسان ہے کہ کوئی کار تمہارے سامنے آکر خود بخود رک جائے ——— ایک ہاتھ بڑھے اور تمہارے ہاتھوں میں نوٹوں کی گڈی تھما دے ——— کتنا آسان ہے ——— لیکن شرط یہی ہے کہ تمہیں اپنی وائلن توڑنی ہوگی، اور تمہیں اپنی کھڑکی ہمیشہ کے لئے بند کرنی ہوگی اور تمہیں ڈیڑھ روپے کے پھول خریدنے ہوں گے ——— بولو منظور ہے ——— ؟"

وہ جانے کتنے تصورات سے جنگ کرنے کے بعد کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اپنی بہن سے بولی

"وہ دیکھ تیرا دولہا ——— "

اُس کی بہن جو اب تک شاید سب کچھ سمجھ چکی تھی آہستہ سے ہنس پڑی اور ایسے ہنسی جیسے کوئی جوگن زندگی بھر کا وعدہ ایک ہی دن میں توڑ کر ہنس دے۔

اُس بھوری مونچھوں والے نے آہستہ سے کار کا دروازہ کھول دیا اور اس کی بہن اس کا ہاتھ چھڑا کر کار کے اندر جا بیٹھی ———

مسز براؤن کو ایسا لگا جیسے اس کے خون میں کسی نے کانچ کوٹ کر ملا دیا ہو ——— اگر دل کے جذبوں سے اس دنیا میں کچھ ہو سکتا تو کیا سب کچھ ایسا ہی ہوتا جیسا آج ہو رہا ہے یا وہ بھیانک خلا جو جسم اور بھوک کے درمیان ہے مٹ جاتا ——— ؟

گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور ایک ناگن کی طرح پر پھیلا کر پھسلتی ہوئی دور تک چلی گئی ——— مسز براؤن نے سو سو کے کئی نوٹوں کو جو اُسے وہ بھوری مونچھوں والا دے گیا تھا غور سے دیکھا ——— اُسے لگا جیسے وہ نوٹے ہوئے پر ہوں جو اس باز کو پکڑنے کی کوشش میں اس کے ہاتھ میں رہ گئے ہوں ——— اب اس کا اس کی بہن سے بہت گہرا رشتہ قائم ہو گیا تھا ——— اب وہ ان نوٹوں سے اُسے بہت سی وائلن خرید کر دے سکتی تھی۔ مگر وائلن خرید کر کسی نے نغمہ کب خریدا ہے اور جب نغمہ نہیں خریدا جا سکتا تو پھر کیوں کوئی خود کو زندگی بھر بیچتا رہے ——— ؟

یکایک وہ گاڑی جو ہوس کی طرح بڑھتی چلی جا رہی تھی جھٹکا کھا کر رک گئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے پیچھے کی بس بھی چیخ کر رک گئی ——— مسز براؤن کے ہاتھوں سے سارے پر پھڑپھڑا کر اُڑ گئے ——— اور جب وہ ہانپتی ہوئی، دوڑتی ہوئی وہاں پہونچی تو دیکھا کہ اس کی بہن جو جانے کیوں چلتی ہوئی گاڑی سے کود گئی تھی اب بس کے نیچے کچل پڑی تھی اور زندگی کی آخری تڑپ کو جسم سے الگ کر رہی تھی

بھوری مونچھوں والے کا چہرہ جانے کس جذبے سے کاغذ کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ مسز براؤن کا جی چاہا کہ

وہ اس پر خون سے کچھ لکھ دے ـــــــ مگر ایسا کہیں ہوا ہے ؟

بہت دیر بعد جب سڑک پر لوگوں کی بھیڑ بڑھ گئی اور پولیس آ گئی اور شور ہونے لگا تو اس بھوری مونچھوں والے نے اسے اشارے سے بلا کر اپنی گاڑی میں بٹھا لیا، اور بہت دور جا کر اُس کے ہاتھوں میں نوٹوں کی ایک موٹی گڈی رکھ دی ـــــــ مسز براؤن یکایک ہنس پڑی اور سوچنے لگی ـــــــ یہ کس کی قیمت ہے ؟ اُس خونی شکھار کی جو میری بہن نے کیا ہے یا اُس خوف کا جو اس سیٹھ کا اندر ہی اندر گلا دبائے ہوئے ہے ـــــــ میں یہ روپے اپنے بیگ میں رکھ لوں یا اس بھوری مونچھوں والے کے چہرے پر دے ماروں ؟

اس کا فیصلہ کرتے کرتے کئی دن بیت گئے، اور ہر دن وہ سیٹھ اُسے کچھ نہ کچھ روپے دیتا گیا، یہاں تک کہ بہت سے دن گذر گئے اور آہستہ آہستہ پچھلی بات ایک ایسی چوٹ بن گئی جو بس یاد کرنے سے تو ذرا سا دکھ دے ورنہ اندر ہی اندر رہے ـــــــ سو ایک دن جب اُس بھوری مونچھوں والے نے اسے داشتہ بنا کر رکھنا چاہا تو وہ راضی ہو گئی، اور اُس کی ایک ہاں سے اس کا نام مسز براؤن ہو گیا، اور اس کی تیزی سے چلتی ہوئی کہانی ایک جگہ آ کر اس طرح رک گئی جیسے گھسے ہوئے ریکارڈ کا کوئی آدھا بول سوئی میں اٹک کر رہ جائے۔

بہت زیادہ سوچنے سے مسز براؤن کا دم آج کل گھٹنے لگتا تھا۔ اسی لئے آج بھی ایسا ہی ہوا، اور وہ گھبرا کر دوڑتی ہوئی واپس کملا اسٹریٹ سے اپنی بالکنی پر آ گئی ـــــــ اس کی ساری بالیں بھیگ گئی تھی، کیونکہ کملا اسٹریٹ کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

اُس نے سُنا جتنے بچے تھے سب چلا رہے تھے اور کہہ رہے تھے ـــ

"ممی ڈر گئی ـــ"

"ممی ڈر گئی ـــ"

"چُپ رہو ـــ" وہ زور سے چیخی اور دوڑتی ہوئی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے اُترنے لگی۔ نیچے اُتر کر اُس نے دروازے سے باہر جھانکا اور پھر اسے اندر سے بند کر دیا۔

اُس دروازے کو جسے مسز براؤن نے بند کیا تھا، اُسے مسٹر براؤن نے آدھی رات کو اندر آنے کے لئے توڑ دیا۔ وہ نشے میں نڈھال تھا اور پارٹی میں مسز براؤن کے نہ آنے سے بہت غصے میں تھا ـــــــ اندر آ کر اس نے دیکھا پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا ـــ کسی قدر لڑکھڑاتے ہوئے ٹٹول ٹٹول کر اس نے بتی جلائی اور پھر اُس نے دیکھا ـــــــ اُس نے دیکھا کہ برآمدے کا دیوار گیر آئینہ چور چور ہو کر فرش پر پڑا ہے اور اس کے سامنے ہی کا کلنڈر پُرزے پُرزے ہو کر آدھی رات کی سرد ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا ـــــــ اس کی خواب گاہ کا دروازہ کھلا ہے اور دروازے کی چوکھٹ پر مسز براؤن مردہ پڑی ہے، اور اس کے سامنے ہی سفید سفید بالوں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے گچھے بکھرے ہیں، جیسے شاید مسز براؤن نے مرنے سے پہلے اپنے سر سے کاٹ کاٹ کر پھینک دیا تھا۔

وہ ایک لمحے کے لئے کھڑا سوچتا رہا، پھر بہت تیزی سے اور بہت غصے سے بڑھ کر فون اٹھا لیا۔ اس وقت جب وہ نمبر ڈائل کر رہا تھا اُس کی نظر سنگھار میز کے آئینے پر پڑی۔ اُس نے دیکھا کہ آئینے کے اُس حصے میں جو کل نشے میں اُس کے ہاتھ سے ٹوٹ گیا تھا لپ اسٹک سے ایسی لکیریں بنی ہوئی ہیں جیسے کسی نے پانی کی لہریں بنانے کی کوشش کی ہو

"مائی فُٹ ——" اُس نے زور سے جھلا کر کہا۔

پھر للی کو فون کرنے لگا۔

"ہیلو للی —" اُس نے کہا۔

"یس ڈارلنگ ——" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"مسز براؤن مر گئی ——"

"کیا ——؟" دوسری طرف سے کوئی چیخا۔

"مسز براؤن مر گئی ——"

"پھر ——؟!"

"پھر کیا —— تم ابھی یہاں چلی آؤ —— میں اکیلا ہوں ——"

"او کے ڈارلنگ ——" دوسری طرف سے آواز آئی۔

اور اُس نے تھک کر فون رکھ دیا۔

فون رکھ کر للی نے اس خط کو آخری بار پڑھا، پھر اپنی آنکھوں کو پونچھا، اور پھر اسے پُرزے پُرزے کر کے کھڑکی سے باہر پھینک دیا —— اسے مسٹر براؤن یاد آیا، اور وہ جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگی —— کپڑے بدل کر جب وہ لپ اسٹک لگانے سنگھار میز کے قریب بیٹھی تو یکایک آئینہ ایک ریکارڈ کی طرح چکر کھانے لگا، اور ہر چکر میں کسی کے خط کے دھندلے دھندلے جادوگر الفاظ دکھائی دینے لگے۔

"پاگل —" وہ زور سے ہنسی — "میں مسز براؤن نہیں ہوں ——"

اُس نے لپ اسٹک سے آئینے پر ایک آڑی لکیر کھینچ کر اس پر ایک سیدھی لکیر کھینچ دی —— آئینے پر ایک سرخ صلیب بن گیا —— للی نے اس صلیب میں اپنا چہرہ آخری بار دیکھا اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔

## اعتذار

افکار کی گذشتہ اشاعت میں "فن دفن کار" کے عنوان سے غلام عباس کے تعارف میں ان کی تاریخ پیدائش کتابت کی غلطی سے ۱۷ر نومبر ۱۹۱۹ء شائع ہوئی ہے۔ اسے ۱۷ر نومبر ۱۹۰۹ء پڑھا جائے۔

ادارہ اس غلطی پر معذرت خواہ ہے۔

جی ایس پیری
انگریزی سے اخذ و استفادہ
سید رضا کاظمی

# ایک تصویر، ایک کتبہ

آج کا دن میری زندگی کا عجیب ترین دن تھا چونکہ آج کے تمام واقعات ابھی تک میرے ذہن میں تازہ ہیں اس لئے ضروری تھا کہ ان کی تمام تفصیلات کاغذ پر منتقل کر دوں!

سب سے پہلے تو میں یہ بتا دوں کہ میرا نام نیاز احمد چشتی ہے اور اس وقت میری عمر چالیس سال ہے۔ میری صحت بہت اچھی ہے اور پیشے کے اعتبار سے میں ایک مصور ہوں بہت مشہور تو نہیں لیکن تصویریں بنا کر اچھی طرح گذارا کر لیتا ہوں۔!

میرا کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہیں ہے۔ صرف ایک بہن تھی وہ بھی پانچ سال پہلے اللہ کو پیاری ہو گئی!

آج صبح میں نے نو بجے ناشتہ کیا تھا۔ اور سگریٹ سلگا کر اس امید پر بیٹھ گیا تھا کوئی اچھا سا موضوع ذہن میں آ جائے تو اسے پیکر تصویر میں ڈھال دوں!

میں جس کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس میں تمام کھڑکیوں کے دروازے اگرچہ کھلے ہوئے تھے پھر بھی حبس اور گھٹن تھی کئی بار دل میں آیا کسی ایئر کنڈیشنڈ ریستوران میں جا کر دو چار گھنٹے گذار آؤں ——— دفعتاً میرے ذہن میں ایک موضوع ابھرا۔

میں فوراً تصویر بنانے میں مصروف ہو گیا اور اس میں اتنا محو ہو گیا کہ مجھے کھانے پینے کی سدھ بدھ تک نہ رہی جس وقت میں تصویر مکمل کر کے اٹھا تو اس وقت شام کے چار بج رہے تھے!

اتنی عجلت میں بناتے ہوئے اس اسکیچ کو دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں یہ یقین ہو گیا کہ یہ میرا شاہکار ہے!

یہ تصویر عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے ایک ملزم کی تھی جسے ابھی ابھی جج نے سزا کا حکم سنایا تھا ملزم کا جسم بہت فربہ تھا اور اسکی ٹھوڑی کے نیچے گوشت کی کئی تہیں جھول رہی تھیں۔ داڑھی مونچھ صاف تھی گو کہ اس نے کئی دنوں سے شیو نہیں کیا تھا۔ اس کا سر گنجا تھا۔ اپنی موٹی موٹی انگلیوں سے وہ عدالت کا کٹہرا تھامے کھڑا دور خلا کو گھور رہا تھا۔ اس کے چہرہ پر خوف و دہشت سے زیادہ بیچارگی کے آثار نمایاں تھے۔

میں نے تصویر کو لپیٹ کر نہ جانے کیوں اپنی جیب میں رکھ لیا اور کچھ عجیب سی طمانیت کا احساس کرتے ہوئے اپنے گھر سے باہر نکل آیا۔

اس کے بعد کچھ یاد نہیں کہ میں کن راہوں سے گذرا۔ البتہ گرمی کی شدت مجھے پریشان کر رہی تھی اور تارکول کی سڑکوں سے اٹھ اٹھ کر گرمی کی لہریں بس میرے جسم کو بیمار کئے دے رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ آسمان کے ایک گوشے میں چھپا ہوا کالا بادل اگر برس جائے تو بہت اچھا ہو!

میں اس طرح پانچ چھ میل تک چلتا رہا ہونگا۔ دفعتاً ایک راہگیر نے مجھ سے وقت پوچھا تو مجھے ہوش آیا۔!

اس وقت شام کے سات بجے رہے تھے!

راہگیر وقت معلوم کر کے آگے بڑھ گیا تو میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا تاکہ معلوم کر سکوں کہ میں کہاں پہنچا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ میں جس مکان کے قریب کھڑا ہوں

سید رضا کاظمی

# انکار

اس کے دروازہ پر گہرے شربتی رنگ کا ایک پرانا سا سائن بورڈ لٹک رہا ہے جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی :-

مہر زیبا

کتبے بنانے والا

یہاں سنگ مرمر اور دوسرے پتھروں پر ہر زبان میں کتبے لکھے جاتے ہیں —————— !

مکان کے اندر سے چھینی پر ہتھوڑا مارنے کی آہٹ لگاتار آ رہی تھی کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر میں اس مکان میں داخل ہو گیا !

ایک موٹا آدمی میری جانب پشت کئے سنگ مرمر کی سل پر جھکا ہوا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ پا کر اس نے پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھا اور میرے پاؤں وہیں رک گئے !

یہ وہی آدمی تھا جس کی میں نے چند گھنٹے قبل خیالی تصویر بنائی تھی !!

وہی تصویر جو اس وقت میری جیب میں تھی !

ہو بہو وہی چہرہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت اس چہرہ پر وہ تاثرات نہ تھے جو تصویر والے چہرہ میں دکھائے گئے تھے !

میری جانب دیکھ کر وہ اس طرح مسکرایا جیسے ہم دونوں بہت پرانے دوست ہوں پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا۔

میں نے بغیر اجازت اندر آنے پر اظہار معذرت کیا "باہر گرمی اور لو کی شدت تھی۔ آپ کا مکان کچھ ٹھنڈا لگا اس لئے میں اندر آ گیا۔ . . . . . "

"جی ہاں آج تو قیامت کی گرمی ہے۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو اندر تشریف لے آئے۔ وہ مونڈھا کھینچ کر آرام سے بیٹھ جائیے —!

"یہ پتھر جس پر آپ کام کر رہے ہیں بڑا خوبصورت ہے" میں نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ایک لحاظ سے آپ کا خیال درست ہے یعنی اس پتھر کی سطح بہت صاف اور چکنی ہے۔ لیکن اس پتھر کے دوسری طرف بہت بڑا نقص ہے جسے شاید آپ پہچان نہ سکیں لیکن میں جانتا ہوں کہ میں اسے کسی کے ہاتھ فروخت نہیں کر سکتا کیونکہ یہ بالکل ناکارہ ہے۔ گرمی کے موسم میں تو یہ پتھر ٹھیک نظر آئے گا۔ لیکن اگر آپ اسے سردی کے موسم میں دیکھیں تو —— دراصل سنگ مرمر کا نقص معلوم کرنے کے لئے جاڑے کا موسم . . . . . . . . "

"تو جب یہ پتھر خراب ہے۔ اور بیچا نہیں جا سکتا تو پھر آپ اس پر محنت کیوں کر رہے ہیں ؟"

اسے ہونڈا سا قہقہہ لگایا۔

"شاید آپ کو یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں یہ کتبہ ایک مقامی نمائش کیلئے تیار کر رہا ہوں۔ جس طرح پھولوں، پھلوں، بطخوں اور گڑیوں کی نمائش لگتی ہے اسی طرح پتھر کے کتبوں کی بھی نمائش لگنے والی ہے"

وہ مجھے پتھروں کی مختلف قسموں کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ اس کے بعد اس نے مجھے ان مختلف پھولوں کے متعلق بتایا جو ساتھ والے باغیچے میں تو گملوں میں لگے ہوئے تھے —— وہ بولتا رہا لیکن میں نے ہوں ہاں سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ میں اس سوچ میں غرق تھا کہ ایک خیالی پیکر سے ملاقات کتنی .. حیرت انگیز تھی۔

کچھ دیر تک تو میں خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ میں شاید اس شخص کو پہلے کبھی دیکھ چکا ہوں اور اس کی شکل میرے حافظہ میں لاشعوری طور پر محفوظ رہ گئی تھی لیکن مجھے یہ احساس بڑی شدت سے ہوتا رہا کہ میں خود کو یقین دلانے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔

مہر زیبا نے کتبہ مکمل کر کے اطمینان کا سانس لیا اور پتھر میری جانب گھماتے ہوئے بولا "اب دیکھئے یہ کتبہ کیسا لگتا ہے"

میں نے پہلی بار کتبہ کی عبارت پڑھی —

نیاز محمد چشتی

پیدائش ۱۸ جنوری ۱۹۲۵ء

۲۱ جون ۱۹۶۵ء کو اچانک رحلت فرما گئے

× × ×

کون جانے زندگی کی راہ میں

موت کا موڑ کہاں آجائے

میں سکتہ کے عالم میں چند منٹ بالکل خاموش رہا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے پھر ہمت کرکے میں نے اس سے پوچھا کہ کیا نیاز محمد چشتی اس کے کسی دوست یا رشتہ دار کا نام ہے۔

"یہ نام؟ میں تو جانتا بھی نہیں کہ یہ کس کا نام ہے کتبہ تیار کرنے کے لئے مجھے کسی ایک نام کی ضرورت تھی اس لئے جو نام سب سے پہلے میرے ذہن میں ابھرا اسے میں نے اس پتھر پر کندہ کر دیا ۔۔۔ لیکن آپ اس قدر حیرت زدہ لہجہ میں یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔؟

"بڑی عجیب بات ہے۔ دراصل یہ میرا نام ہے!"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری جانب دیکھنے لگا۔

"اور یہ تاریخیں؟" کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اس نے پوچھا۔

ایک تاریخ کے بارے میں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل صحیح ہے۔ میری تاریخ پیدائش ۱۸ جنوری ۱۹۲۵ء ہے!

"۔۔۔ عجیب بات ہے" اس نے بڑی پریشانی سے کہا۔

لیکن اسے ابھی پوری بات کا علم نہ تھا۔ جب میں نے اسے صبح بنائی ہوئی تصویر کے بارے میں بتایا اور جیب سے نکال کر وہ تصویر اسے دکھائی تو اس کے چہرہ کے تاثرات تیزی سے تبدیل ہونے لگے اور جلد ہی اس کے چہرہ پر بالکل وہی تاثرات ابھر آئے جو تصویر میں نظر آئے تھے۔

"اور ابھی کل ہی کی بات ہے کہ میں خالہ جان سے کہہ رہا تھا کہ بھوت پریت کا کوئی وجود نہیں ہے"

اس وقت ہم دونوں میں سے کسی نے بھی اس کمرہ میں کوئی بھوت نہیں دیکھا تھا۔ مجھے بھی ان کا مفہوم سمجھنے میں دقت نہ ہوئی۔

"آپ نے میرا نام پہلے کہیں سنا ہوگا!"

"اور آپ نے مجھے کہیں دیکھا ہوگا۔ لیکن بھول گئے ہونگے۔ پچھلے سال آپ کراچی تو نہیں گئے۔"

"جی نہیں میں کراچی کبھی نہیں گیا"

کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے ہم دونوں کی نظریں کتبہ کی عبارت پر جمی ہوئی تھیں جس پر لکھی ہوئی ایک تاریخ بالکل درست تھی۔

"آیئے اندر چل کر کچھ کھا پی لیں" کچھ دیر بعد مہر دین نے کہا۔

اس کی خالہ چھوٹے سے قد کی بوڑھی عورت تھی۔ مہر دین نے اپنی خالہ سے کہا کہ میں اس کا پرانا دوست ہوں اور ایک کامیاب مصور ہوں۔

کھانے سے فارغ ہوکر ہم دونوں اسی کمرے میں واپس آگئے جس میں وہ سنگ مرمر کی سل پڑی ہوئی تھی۔

"اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"پوچھئے"

۔ آپ سے کبھی کوئی جرم تو سرزد نہیں ہوا جس پر مقدمہ چلا ہو ۔؟

۔ جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں ۔ میں اپنے گاہکوں کا بڑا خیال کرتا ہوں اور میرا کاروبار ٹھیک چل رہا ہے ۔

۔ آپ کہاں رہتے ہیں " سگریٹ کا طویل کش لیکر اس نے پوچھا اور میں نے اسے اپنا پتہ بتا دیا ۔

" آپکو اپنے گھر پہنچنے میں کم از کم ایک گھنٹہ لگ جائے گا کہیں جانے سے پہلے آپ اس بات پر غور کریں کہ گھر جاتے ہوئے ممکن ہے آپکو کوئی حادثہ پیش آجائے آپ کسی گھنڈر میں آ جا پڑیں یا ممکن ہے کیلے یا سنگترے کے چھلکے پر آپ کا پیر پھسل جائے یا کسی پرانے مکان کا چھجہ یا منڈیر آپ پر گر پڑے ........ "

اسنے بڑی سنجیدگی سے ان تمام حادثوں کا ذکر کیا جن کا میں شکار ہو سکتا تھا ۔ اور میں بڑی سنجیدگی سے ان پر غور کرنے لگا ۔

۔ میرے خیال میں مناسب یہ ہے کہ آج رات بارہ بجے تک آپ یہیں رک جائیں ۔ ادھر چلکر بیٹھینگے سگریٹ پئینگے اور گپ شپ کرینگے ۔ بارہ بجے کے بعد تاریخ بدل جائیگی اور اس وقت تک ٹھنڈی ہوا بھی چلنے لگے گی ....... ۔ اس نے انتہائی ہمدردانہ لہجہ میں کہا ۔

میں نے فوراً اس کا مشورہ قبول کر لیا گو کہ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوئی اس لئے کہ میں یہ سوچے سمجھے اپنے عزیز ترین دوستوں کے مشورے بھی قبول نہیں کرتا ۔

اب ہم دونوں برآمدے میں بیٹھے ہوئے ہیں ۔ اس کی خالہ اپنی کوٹھری میں خراٹے بھر رہی ہے ۔ اور وہ میرے سگریٹ پیئے جا رہا ہے اور قریب پڑے ہوئے پتھر پر کوئی اوزار تیز کر رہا ہے میں برآمدے کے کونے میں پڑی ہوئی میز پر بیٹھ کر یہ انوکھی داستان لکھ رہا ہوں ۔ میز کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے اور وہ ہل رہی ہے ۔ مہر دین اپنا اوزار تیز کر کے غالباً اس ٹوٹی ہوئی میز کی مرمت کرنے والا ہے ۔

— رات کے گیارہ بج چکے ہیں ۔ ایک گھنٹہ بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا ۔

— لیکن گرمی سے میرا دم گھٹ رہا ہے ۔

— مہر دین اوزار تیز کر رہا ہے ۔

— ان حالات میں کوئی بھی انسان پاگل ہو سکتا ہے ۔

---

# فرانس میں اردو

( صفحہ ۷۲ سے آگے )

ترکی زبان کا کورس بھی جلد شروع کر دیا جائے گا اور اس کا اعلان علیحدہ کیا جائے گا ۔

دستخط : بی نیشی "

اس مدرسے نے جلد مقبولیت حاصل کر لی ۔ فرانس کے متعدد معزز خاندانوں کے افراد نے اس مدرسے سے فیضان حاصل کیا ۔ مدرسے کے جن اساتذہ نے مشرقی ادب اور تاریخ کے گراں بہا تحقیقی کارنامے انجام دیئے ان میں عربی کے پروفیسر سلوستر دساسی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ پروفیسر دساسی عربی ادب کے فاضل تھے انھوں نے عربی قواعد پر ایک جامع کتاب لکھی ۔ اور قرآن حکیم کا درس ان کے تعلیمی نصاب کا ہمیشہ ایک اہم جزو رہا ۔ پروفیسر لانگلے کے بعد ۱۸۲۴ء میں دساسی مدرسے کے ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے اور تا دم آخر ۱۸۳۸ء تک اس عہدہ پر فائز رہے ۔ یہ موصوف ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۲۸ء میں مشرقی زبانوں کے مدرسے میں اردو زبان کی تعلیم کے لئے ایک پروفیسر کا عہدہ قائم کیا گیا اور اس پر گارسین دتاسی کا تقرر ہوا ۔

جمیل زبیری

# نیا کھیل

(سرکس کی موسیقی — بہت سے لوگوں کا ایک ساتھ شور — دور سے بہت سے لوگوں کی بات چیت کی ملی جلی آوازیں)

**عورت**:۔ ہائے بیچارہ گر پڑا

**مرد**:۔ اصل میں یہ اب بوڑھا ہو گیا ہے اور اس قابل نہیں کہ سائیکل کے کرتب دکھائے

**دوسری عورت**:۔ بیچارہ سائیکل چلاتے میں کیسا ہانپ رہا تھا۔

**پہلی عورت**:۔ میں تو شروع ہی سے ڈر رہی تھی

(آواز قریب آتی ہے، دور سے موسیقی کی ہلکی آواز سنائی دیتی ہے)

**منیجر**:۔ کیا ہوا رشید

**رشید** (گھبرائی ہوئی آواز میں)۔ وہ۔ میں۔ ذرا بیلنس خراب ہو گیا

**منیجر**:۔ دیکھو رشید۔ یہ تیسرا موقع ہے کہ تم اس طرح پبلک کے سامنے سائیکل سے گرے۔ اصل میں تم اب بوڑھے ہو چکے ہو۔ اور یہ کام تمہارے بس کا نہیں۔ کل سے تمہاری چھٹی۔

**رشید**:۔ (غمگین آواز میں) ایسا نہ کیجئے منیجر صاحب۔ آئندہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔

**منیجر**:۔ نہیں میں تمہیں سائیکل کے کرتب دکھانے کے لئے نہیں رکھ سکتا۔ اس سے سرکس کی بدنامی ہوتی ہے پبلک ہنستی ہے۔

**رشید**:۔ اچھا تو مجھے کوئی اور کام دیدیجئے۔

**منیجر**:۔ تمکو اور کام ہی کیا آتا ہے۔ سوائے اس کے کہ ہاتھی تمہیں پہچانتے ہیں۔ اور ان کے دو چار کرتب دکھا سکتے ہو۔

**رشید**:۔ اچھا تو میں ان کے ہی کرتب دکھایا کروں گا

**منیجر**: نہیں یہ کام بہت ذمہ داری کا ہے۔ یہ میں تمہارے سپرد نہیں کر سکتا۔ تم اب بوڑھے ہو گئے ہو۔

**رشید**:۔ (خوشامدانہ انداز میں) منیجر صاحب ایسا نہ کیجئے میں بھوکا مر جاؤں گا۔ میرے پاس روزی کمانے کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں نے بہت دن آپ کے سرکس میں کام کیا ہے۔ اس کا تو کچھ خیال کیجئے

**منیجر**: (کچھ سوچ کر) اچھا۔ تو ایسا کرو تم ہاتھیوں کے ساتھ دائرے میں آجایا کرو اور موجو کی مدد کیا کرو۔ مگر یہ سمجھ لو یہ کام بہت ہلکا ہے اور تمہیں

آدھی تنخواہ ملے گی اور یہاں صبح و شام ہاتھیوں کو
خوراک دیا کرو

رشید :۔ (مجبوری کے انداز میں) آدھی تنخواہ۔ اچھا بہت اچھا
آدھی ہی سہی۔

(وقفہ)

رشید :۔ منیجر صاحب۔ یہ میری بچی ہے۔ ریشما۔ اسے بھی
آپ سرکس میں نوکر رکھ لیجئے۔

منیجر :۔ مگر یہ تو ابھی چھوٹی ہے۔ یہ کیا کام کر سکتی ہے۔

رشید :۔ میں نے اسے گھر پہ بہت اچھی ٹریننگ دی ہے۔ میں
اسے زمین پر لٹا کر اس کے پیٹ پر کھڑا ہو جاتا ہوں
اور یہ آرام سے لیٹی رہتی ہے۔ پبلک اس کے کرتب
کو دیکھ کر بہت خوش ہوگی منیجر صاحب۔ اور پھر دیکھئے نا میں نے
شیرا کو جب دو سال پہلے رکھایا تھا۔ وہ بھی تو کچھ نہیں
جانتا تھا۔ اور اب کیسا پھرتیلا ہو گیا ہے۔

منیجر :۔ (سوچ کر) اچھا چلو آج سے اس کا کرتب بھی
دکھائیں گے۔ مگر تنخواہ —؟

رشید :۔ بس منیجر صاحب۔ میری آدھی تنخواہ جو آپ نے
کاٹی ہے وہ اسے دے دیا کریں۔

منیجر :۔ گویا تمہاری اور اس کی تنخواہ برابر۔

رشید :۔ منیجر صاحب میں بہت غریب آدمی ہوں۔ میرا اور
کوئی سہارا نہیں۔ تھوڑے دن میں ریشما بہت سے
کرتب سیکھ جائے گی

منیجر :۔ اچھا خیر۔ مگر تم بہت جلد اسے جھولوں کے کرتب سکھاؤ
تاکہ یہ شیرا کے ساتھ جھولنے لگے۔ ابھی سے کوشش کروگے
تب کہیں دو تین سال میں اس قابل ہوگی کہ پبلک
کے سامنے جھولے پہ جائے۔

رشید :۔ بہت اچھا۔ میں آج ہی سے اسے جھولوں کے انچارج
کے سپرد کئے دیتا ہوں

(وقفہ)

{ ریشما اور شیرا کے بڑے ہو جانے کے بعد سرکس کے
میوزک کی ہلکی آواز }

شیرا :۔ ریشما۔ کل رات تو تو نے کمال کر دیا۔ نیچے سے جال
بھی ہٹوا دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب تو اپنے جھولے
سے اچھل کر میرے جھولے پر آ رہی تھی تو تیرا ہاتھ پکڑتے
وقت میں ڈر رہا تھا۔ شاید تو بھی ڈر رہی تھی۔

ریشما :۔ ڈرنے کی کیا بات ہے شیرا۔ جب جھولے پر تو میرے
ساتھ ہوتا ہے نا تو مجھے بڑا اطمینان رہتا ہے۔ میں
بالکل نہیں ڈرتی۔

شیرا :۔ اور کودنے میں اگر تیرا ہاتھ میرے ہاتھ میں نہ آتا
جبکہ نیچے جال بھی نہیں تھا تو ——

ریشما :۔ تو کیا ہوتا!

شیرا :۔ مجھ سے کیوں کہلوانا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے جو ہوتا
مگر میں اپنی آنکھوں سے وہ منظر کیسے دیکھتا۔ دیکھو
ریشما یہ ٹھیک نہیں۔ آئندہ بغیر جال کے ہم نہیں جھولیں گے

ریشما :۔ کیوں؟ اور لوگوں کے ساتھ تو مجھے بغیر جال کے جھولے
پر کرتب دکھانے میں کوئی ڈر نہیں لگتا۔

شیرا :۔ اوروں کی بات چھوڑ دے۔ تیری بات اور ہے

ریشما :۔ کیوں؟ میری اور بات کیوں

شیرا :۔ یہ تو خوب جانتی ہے۔ اور اگر نہیں جانتی تو جھولے
پہ جب میرے ساتھ ہوتی ہے تو ڈر کیوں نہیں لگتا۔!

ریشما :۔ (شوخی کے انداز میں) مجھے کیا معلوم شیرا۔

شیرا :۔ دیکھ ریشما۔ ہم دونوں کو ایک ساتھ جھولا جھولتے
اور کرتب دکھاتے بہت دن ہو گئے۔ کیا ہم ساری عمر
اسی طرح جھولا جھولتے رہیں گے۔؟ یہ سرکس تو ہر تھوڑے
دن بعد ایک شہر سے دوسرے شہر چلا جاتا ہے۔ اور
میں اب گھر بنا کر ایک جگہ رہنا چاہتا ہوں

ریشما :۔ تو کیا تو میرا ساتھ چھوڑ دے گا ۔ ؟

شیرا :۔ تو کیا تیرا خیال ہے ۔ میں گھر بنا کر اس میں اکیلا رہوں گا

ریشما :۔ تو اور کیا

شیرا :۔ پگلی ۔ یہ سب باتیں میں تیری وجہ سے سوچتا ہوں جب بھی تو جھولے پر چڑھتی ہے تو میرا دل لرزنے لگتا ہے ۔۔!

ریشما :۔ سچ ۔۔

شیرا :۔ تیری قسم ریشما ۔ (گھنٹی کی آواز)

ریشما :۔ لے وہ گھنٹی بج گئی ۔ اب ہماری باری ہے ۔

شیرا :۔ چل اور دیکھ اگر آج نیچے سے جال ہٹوایا تو میں کوئی کرتب نہیں دکھاؤں گا ۔

ریشما :۔ (ہنس کر) تجھے سب لوگ ڈرپوک کہیں گے

(جھولوں پر چڑھنے کا وقفہ ۔۔۔ اس وقفہ میں سرکس کی موسیقی کی تیز آواز سنائی دیتی ہے ۔ پھر رفتہ رفتہ آواز کم ہو جاتی ہے)

شیرا :۔ میرا ہاتھ ہوشیاری سے پکڑنا ۔

ریشما :۔ تو فکر مت کر شیرا ۔ میں تیرے ہاتھ بڑی مضبوطی سے پکڑ لوں گی اتنے مضبوط کہ کبھی نہ چھوٹ سکیں

(تھوڑا وقفہ)

شیرا :۔ شاباش ۔ آج تو تو کمال کر رہی ہے

ریشما :۔ وہ دیکھ نیچے

شیرا :۔ کہاں ؟

ریشما :۔ وہ ادھر کونے میں آگے والی سیٹ پر جو میاں بیوی بیٹھے ہیں نا ۔ کیسے منہ پھاڑ کر ادھر دیکھ رہے ہیں

شیرا :۔ شاید پہلی مرتبہ سرکس دیکھنے آئے ہیں

ریشما : ایسا ہی جان پڑتا ہے

شیرا :۔ (حیرت سے) ارے یہ کیا ہو رہا ہے ۔ جال ہٹایا جا رہا ہے ۔ ضرور تو نے ہی جال ہٹانے کو کہا ہوگا

ریشما : بس ڈرنے لگا نا ؟

شیرا :۔ نہیں تو ۔ اگر تجھے مرنے کا ہی شوق ہے تو اور بات ہے

ریشما :۔ جب تک تو ساتھ ہے شیرا مجھے کچھ بھی نہیں ہو سکتا ۔

شیرا :۔ لے تیار ہو ۔ وہ جھولا آ رہا ہے ۔ چل

(ناظرین کی دبی دبی چیخوں اور سی سی کی آوازیں)

اوہ (کھینچ کر) دیکھا بچ گئی ۔ ابھی گر جاتی ۔ ایک ہاتھ کیسے چھوٹ گیا ۔ اب تو جھولے پر نہیں جائے گی ۔

ریشما :۔ (تیزی سے سانس لیتے ہوئے) اوہ مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا ۔ تو ٹھیک کہتا ہے شیرا میں اب نہیں جھولوں گی

(وقفہ)

شیرا :۔ آج تو بال بال بچ گئی ۔ اگر مر جاتی تو میں کیا کرتا

ریشما :۔ جب کسی کا کوئی مر جاتا ہے تو وہ کیا کرتا ہے ۔

شیرا :۔ اس وقت مذاق نہ کر ریشما ۔ میرا دل ابھی تک ٹھکانے نہیں آیا ۔ دیکھ میرے ہاتھ بھی کانپ رہے ہیں

ریشما :۔ ایک تو ہے ۔ مجھے دیکھ جیسے کچھ بھی نہیں ہوا

شیرا :۔ بس میں نے آج سے فیصلہ کر لیا ہے ۔ ہم دونوں جھولے کے کرتب اب کبھی نہیں دکھائیں گے

ریشما :۔ تو کھائیں گے کیا ؟

شیرا :۔ مجھے فاقے منظور ہیں ۔ تو آج ہی اپنے بابا سے بات کر لے بس اب ہم فوراً شادی کر کے کہیں دوسرے شہر چلے جائیں گے ۔ وہاں میں اور کوئی کام کر لوں گا ۔ یہ بڑا خطرناک کام ہے ۔ ہر وقت موت ساتھ جھولتی رہتی ہے

ریشما :۔ ہم کیسے جا سکتے ہیں ۔ بابا جو اکیلا رہ جائے گا ۔ پھر اس کا کیا ہوگا ۔

شیرا :۔ جب کوئی کام لگ جائے گا ۔ تو اسے بھی اپنے پاس بلا لیں گے

ریشما :۔ مگر وہ اتنے دن اکیلا کیسے رہے گا (کچھ سوچ کر) میں بتاؤں تو بابا سے کچھ دن میں ہاتھوں کو سدھا نا سیکھ لے

بس پھر منیجر صاحب سے کہہ کر تو بابا کی جگہ کام کرنے
لگنا۔ وہ اب بوڑھا ہو گیا ہے۔ ذرا سی دیر میں اس
کا سانس پھول جاتا ہے۔ اور میں بھی جھولے کا کام
چھوڑ کر دوسرے کرتب سیکھ لیتی ہوں

شیرا :۔ تو تو چاہتی ہے ہم سرکس نہ چھوڑیں۔ اور اسی
طرح زندگی خراب کرتے رہیں

ریشما :۔ یہ بات نہیں۔ میں بابا کی وجہ سے کہتی ہوں

شیرا :۔ تیرے خیال میں بابا مجھے ہاتھیوں کے کرتب
سکھا دے گا۔

ریشما :۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔ وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتا
میں آج ہی اس سے بات کروں گی۔ اور یوں بھی
تو وہ تیرا بہت خیال کرتا ہے۔ ایک روز کہہ رہا تھا
جب دونوں جھولے پر ہوتے ہو تو میرا دل زور زور
سے دھڑکتا رہتا ہے

شیرا :۔ سچ۔

ریشما : ہاں بالکل سچ۔

——(وقفہ)——

رشید :۔ (جمائی لے کر) کیوں ریشما آج ابھی تک سوئی نہیں

ریشما :۔ بابا مجھے نیند نہیں آ رہی —

رشید :۔ کیا بات ہے مجھے بتا تو سہی

ریشما :۔ آج میں جھولے سے گرتے گرتے بچ گئی

رشید :۔ کیوں۔ کیا نیچے جال نہیں تھا

ریشما :۔ نہیں بابا۔ میں نے جال ہٹوا دیا تھا۔

رشید :۔ (گھبراہٹ کی آواز میں) کیا کہا — کیا تو بغیر جال
لگوائے جھولتی ہے

ریشما :۔ ہاں بابا

رشید :۔ یہ کیا غضب ہے ایسا نہ کیا کر بیٹا۔ اگر خدا نہ
کرے تجھے کچھ ہو گیا۔ تو میں کیا کروں گا۔ تیرے
ساتھ جھولے پر دوسرا کون تھا ؟

ریشما :۔ شیرا۔ میں تو ہمیشہ اس کے ساتھ ہی جھولتی ہوں

رشید :۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) شیرا۔ شیرا کبھی تیرے
ساتھ تھا۔ وعدہ کر کہ آئندہ کبھی تو اور شیرا
بغیر جال کے جھولے پر نہیں جائیں گے

ریشما :۔ اچھا بابا۔ بابا

رشید :۔ ہاں

ریشما :۔ وہ جو شیرا ہے نا

رشید :۔ ہاں تو پھر

ریشما :۔ وہ کہتا تھا بابا سے کہنا کہ مجھے بھی ہاتھیوں کے
کرتب سکھا دے۔

رشید :۔ وہ کیوں ؟

ریشما :۔ اس لئے کہ وہ اب جھولے کا کام چھوڑنا چاہتا ہے
اور مجھ سے کہتا تھا کہ میں بھی چھوڑ دوں۔ بابا اس
اس میں ہر وقت جان کا خطرہ رہتا ہے۔

رشید :۔ مگر میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں بیٹا ہماری گذر کیسے ہو گی

ریشما :۔ وہ کہتا تھا (چند لمحوں کی خاموشی)

رشید :۔ ہاں وہ کیا کہتا تھا۔ کچھ بول تو —

ریشما :۔ (شرماتے ہوئے) وہ کہتا تھا کہ —
وہ اب شادی کرے گا

رشید :۔ کس سے ؟

ریشما :۔ بابا تو سمجھتا کیوں نہیں

رشید کیا وہ تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے

ریشما :۔ ہاں بابا۔ اور وہ کہتا تھا کہ بس شادی کے بعد
ہم لوگ سرکس چھوڑ دیں گے — اور کسی دوسرے
شہر میں جا کر رہنے لگیں گے

رشید :۔ تو تو نے کیا جواب دیا۔

ریشما :۔ میں نے کہا۔ پھر بابا کا کیا ہو گا۔ اس نے کہا

جب کوئی دوسرا کام مل جائے گا تو وہ مجھے بھی اپنے پاس بلالے گا

رشید :۔ مگر اس نے یہ نہیں کہا کہ میں اکیلا کیسے رہوں گا

ریشما :۔ اسی لئے تو میں نے اس سے کہا کہ وہ ہاتھوں کے کرتب سیکھ لے اور پھر تھوڑے دن بعد مجھ سے لے کر تیری جگہ کام کرنے لگے۔

رشید :۔ تو کیا تو پھر اکیلی جھولا کرے گی

ریشما :۔ نہیں میں کوئی اور کام سیکھ لوں گی ۔

رشید :۔ کام تو میں اس کو سکھا دوں مگر یہ کان کھول کر سن لے کہ تیری شادی اس سے ہرگز نہیں ہوگی ۔

ریشما :۔ (رنجیدہ انداز میں) کیوں بابا ۔ ؟

رشید :۔ بس میں نے کہہ جو دیا ۔ میں تو تیری شادی کسی بہت اچھے آدمی سے کروں گا

ریشما :۔ شیرا میں کیا برائی ہے بابا

رشید :۔ برائی ۔ برائی ۔ نہیں ۔ میں تیری شادی اس سے نہیں کرسکتا

ریشما :۔ (روہانسو ہو کر) نہیں بابا ۔ ایسا نہ کہو ۔

رشید :۔ کیوں ۔ کیا تو اس سے پیار کرتی ہے

ریشما :۔ ہاں بابا

رشید :۔ تو اس کا خیال چھوڑ دے ۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ۔

ریشما :۔ مگر کیوں

رشید :۔ اب بہت رات ہوگئی ہے ۔ تو سوجا ورنہ پھر کل ٹھیک سے کام نہیں ہوگا

ریشما :۔ بابا پہلے میری بات کا جواب دو ۔

رشید :۔ جواب دوں گا ۔ مگر آج نہیں ۔ پھر کبھی ۔ لے اب سوجا ۔ بہت دیر ہو رہی ہے ۔

ریشما :۔ مگر تو شیرا کو ہاتھوں کے کرتب تو سکھائے گا نا؟

رشید :۔ ہاں ۔ ہاں

(ہلکے ہلکے ریشما کی سسکیوں کی آواز آتی ہے)

——— (وقفہ) ———

ریشما :۔ شیرا او شیرا ۔ اٹھے گا بھی یا سارا دن سوتا ہی رہے گا

شیرا :۔ (نیند بھری آواز میں) ارے تو تو صبح ہی صبح آگئی

ریشما :۔ لے اٹھ ۔ میں نے بابا کو تیار کرلیا ہے ۔ وہ آج ہی تجھے ہاتھوں کے کرتب سکھانا شروع کردے گا

شیرا :۔ سچ ریشما

ریشما :۔ ہاں سچ ۔ اچھا میں چلی ۔ بس تجھے خوشخبری سنانے آئی تھی ۔

شیرا :۔ چلی کہاں ۔ بیٹھ ۔ کچھ کھا پی کر جانا ۔

ریشما :۔ نہیں ۔ بابا بغیر میرے کچھ نہیں کھاتا ۔ وہ میرا انتظار کرتا ہوگا ۔

شیرا :۔ اچھا میں ابھی آتا ہوں ۔

(جاتے ہوئے خود سے بات چیت)

ریشما :۔ ہائے وہ کتنا خوش ہوا ۔ مگر میں اسے یہ کیسے بتاؤں کہ بابا نے رات کیا کہا ۔ اگر بابا اپنی بات پر اڑا رہا تو نہ جانے کیا ہوگا ۔ مگر ۔ مگر ــــ وہ کیا بات ہے جو بابا نے نہیں بتائی ۔ شیرا سے پوچھوں ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ میں اسے ابھی کچھ نہیں بتاؤں گی ۔ کچھ بھی نہیں ۔ اگر میں نے اسے بتا دیا تو وہ کتنا دکھی ہوگا ۔ نہ معلوم پھر کیا ہو ۔

ریشما :۔ میں شیرا کو بتا آئی ہوں کہ تو اسے آج ہی سے ہاتھوں کے کرتب سکھانا شروع کردیگا ۔

رشید :۔ اتنی جلدی کیا تھی ۔ رات بھی اتنی دیر جاگتی رہی اور صبح ہی اٹھ گئی

ریشما :۔ وہ ابھی آتا ہوگا ــــ میں اس سے کہہ آئی ہوں ۔ مگر بابا ــــ

(ایک لمحے کی خاموشی)

رشید: ہاں کچھ بھی۔ خاموش کیوں ہو گئی

ریشما:۔ رات کی بات اس سے نہ کہنا تجھے میری قسم

رشید:۔ کون سی بات

ریشما:۔ جتنی بھی باتیں تونے رات مجھ سے کہیں ان میں سے کوئی بھی اسے نہ بتانا

رشید:۔ لیکن اگر اس نے شادی کی بات نکالی

ریشما (افسردہ ہو کر) نہیں وہ نہیں نکالے گا بابا میں اسے جانتی ہوں۔ وہ تو آج صرف ہاتھیوں کے کرتب سیکھنے تیرے پاس آئے گا اور تھوڑی دیر سیکھ کر چلا جائیگا

رشید:۔ اچھا خیر

ریشما:۔ بابا

رشید:۔ ہاں کچھ بول تو

ریشما:۔ تو مجھے وجہ کیوں نہیں بتاتا؟

رشید:۔ اچھا میں ذرا نہانے چلا۔

ریشما: بتا دے نا۔ بابا

رشید:۔ جانے دے مجھے دیر ہو رہی ہے۔

شیرا (آواز دیتا ہے) ریشما۔ ریشما۔

ریشما:۔ تو آ گیا شیرا بڑا اچھا ہوا۔ یہاں بیٹھ جا میرے پلنگ پر۔ بابا نہانے گیا ہے۔ ابھی آ جائے گا۔ پھر تو اس کے ساتھ ہاتھیوں کے پاس چلے جانا اور شیرا کل جو باتیں تونے مجھ سے کہی تھیں وہ ابھی بابا کو نہ بتانا۔

شیرا:۔ کیوں؟ میں اس سے شادی کی بات بھی کرنے والا ہوں

ریشما:۔ نہیں شیرا! تجھے میری قسم۔ ابھی نہیں۔ جب موقع ہو گا نا تو میں خود تجھے بتا دوں گی۔ پھر تو بابا سے بات کر لینا

شیرا:۔ اس میں حرج ہی کیا ہے

ریشما:۔ تو نہیں جانتا شیرا۔ اگر تو نے ابھی اس سے ایسی باتیں کیں تو وہ تجھے پھر ہاتھیوں کے کرتب نہیں سکھائیگا لے وہ بابا آ رہا ہے۔

رشید:۔ بیٹھو۔ بیٹھو۔ ریشما مجھ سے کہتی تھی تمہیں ہاتھیوں کے کرتب سیکھنے کا شوق ہوا ہے

شیرا:۔ جی! وہ بات یہ ہے کہ مجھے جھولے کے کرتب اچھے نہیں لگتے۔

رشید:۔ مگر تم ڈرو گے تو نہیں

شیرا:۔ تم ساتھ ہو گے تو پھر ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ہاتھی کتنے دن میں مجھے اچھی طرح پہچاننے لگیں گے

رشید:۔ جلد ہی پہچاننے لگیں گے۔ پھر آہستہ آہستہ کام بھی سکھا دوں گا۔

شیرا:۔ اور کرتب سیکھنے میں کتنے دن لگیں گے

رشید:۔ اگر ڈر گئے نہیں تو کچھ ہی مہینے میں سیکھ لو گے۔

شیرا:۔ میں سوچتا ہوں جب ہاتھی مجھ سے سدھ جائیں گے تو میں منیجر سے کہہ کر تمھاری جگہ لے لوں گا۔ پھر تمہیں نوکری کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اور یوں بھی اب تمہیں آرام کی ضرورت ہے

رشید:۔ مگر میں جو کام کرتا ہوں مجھے اس کی آدھی تنخواہ ملتی ہے۔ وہ جو موجی ہے نا سرکس میں۔ کرتب تو وہ دکھاتا ہے اسے پوری تنخواہ ملتی ہے۔ پہلے کبھی جب میں جوان تھا تو ہاتھیوں کے سب کرتب میں ہی دکھایا کرتا تھا یہ جو رانی ہے نا یہی سب سے زیادہ سدھی ہوئی ہے میرے سب اشارے سمجھتی ہے۔ میرے دو کرتب پبلک کو بہت پسند تھے ایک تو رانی مجھے اپنی سونڈ میں اٹھا کر پیٹھ پر بٹھا لیا کرتی تھی تو لوگ بہت تالیاں بجاتے تھے اور دوسرے جب میں زمین پر لیٹ کر اس کا پاؤں اپنے سینہ پر رکھ لیتا تھا تو بڑی واہ واہ ہوتی تھی۔

رلیشا :۔ ہائے اللہ ۔ اور جو اگر وہ کبھی زور سے دبا دیتی

رشید :۔ نہیں ۔ وہ اپنا پاؤں بڑی نرمی سے رکھتی تھی ۔ اور میرے ذرا سے اشارے پہ ہٹا لیتی تھی ۔ وہ بڑی سمجھدار ہے ۔ اب بھی میں ایسا کر سکتا ہوں ۔ جب تم سے وہ ذرا ہل جائے تو یہ دونوں کرتب تم بھی سیکھ لینا اس سے نیجر تمہیں فوراً موجو کی جگہ رکھ لیگا ۔ کیونکہ موجو یہ کرتب نہیں کر سکتا ۔ وہ اس کے پاؤں کے نیچے لیٹتے ہوئے ڈرتا ہے

شیرا :۔ ہاں ہاں ضرور سیکھ لوں گا ۔

رلیشا :۔ نہیں ۔ نہیں شیرا ۔ تو اس کے پاؤں کے نیچے نہیں لیٹنا ۔ اگر اس نے کبھی پاؤں زور سے دبا دیا ۔ تو کیا ہوگا

رشید نہیں میری موجودگی میں رانی ایسا کبھی نہیں کر سکتی ۔ اور پگلی تو کیا جانے کہ پبلک اس کرتب سے کتنی خوش ہوتی ہے اور کتنی واہ واہ کرتی ہے

رلیشا :۔ پھر بھی میرا دل ڈرتا ہے

شیرا :۔ ڈرنے کی کیا بات ہے ۔ اچھا بابا میں کس وقت آؤں

رشید :۔ بس میں کوئی ایک گھنٹے بعد خوراک دینے جاؤں گا تم بھی وہیں آجانا

شیرا :۔ رلیشا ۔ تو بھی بابا کے ساتھ آئیو

رشید :۔ نہیں رلیشا کا وہاں کیا کام

(وقفہ)

(ہاتھیوں کے چنگھاڑنے کی ہلکی آواز ۔ رشید انہیں تھپ تھپاتا ہے اور پیار کرتا ہے)

رشید :۔ لے رانی ۔ آج سے شیرا بھی میرے ساتھ آیا کریگا وہ اب کرتب سیکھے گا ۔ اور پتہ ہے رانی شیرا کیا کہتا تھا ۔ شیرا کہتا تھا وہ رلیشا سے شادی کریگا (ہنستا ہے) پاگل کہیں کا ۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے

یہ کبھی نہیں ہو سکتا رانی (سوکھی گھاس کی سرسراہٹ کی آواز) لے رانی یہ کھالے جب شیرا آجائے گا ۔ تو تجھے اس سے ملواؤں گا

شیرا :۔ کیا ہو رہا ہے بابا

رشید :۔ رانی سے ابھی تیری ہی بات ہو رہی تھی ۔ اچھا ہوا کہ تو آگیا ۔ آ ، یہاں قریب آجاؤ ۔ اور قریب آ ۔ ڈرو نہیں ۔ رانی تو بڑی نیک ہے ۔ کبھی کچھ نہیں بولتی

شیرا :۔ اور وہ دونوں

رشید :۔ ملکہ ذرا نٹ کھٹ ہے ۔ شربتی بھی رانی کی طرح سیدھی ہے ۔ اچھا لو ذرا یہ بالٹی لے کر اسے نہلاؤ ۔ مجھے بھاری بالٹی اٹھانے میں دقت ہوتی ہے

(ہاتھیوں کی ہلکی چنگھاڑ کی آواز ۔ پانی پھینکنے کی آواز)

رشید :۔ لے اب قریب آکر اس کی سونڈ پر ہاتھ پھیر ۔ تاکہ یہ تجھے پہچاننے لگے ۔

(سرکس کی موسیقی)

رلیشا :۔ شیرا آج کیا سیکھا تو نے

شیرا :۔ آج میں نے رانی کو نہلایا اور اس کی سونڈ پہ ہاتھ پھیرا

رلیشا :۔ تو ڈرا تو نہیں

شیرا :۔ نہیں بالکل نہیں ۔ بھلا ڈرنے کی کیا بات ہے اور پھر بابا جو ساتھ تھا ۔

رلیشا :۔ (ہنستی ہے) جھوٹا کہیں کا ۔ بابا مجھ سے کہتا تھا تو رانی کے پاس جاتے ہوئے بہت ڈر رہا تھا ۔

شیرا :۔ جھوٹی کہیں کی

رلیشا :۔ سچ

شیرا :۔ بابا مذاق کر رہا ہوگا ۔

رلیشا :۔ مذاق کی کیا بات ہے اتنے بڑے جانور سے سب ہی

ڈرتے ہیں کل تونے نہیں دیکھا تھا شیرا۔ جب رنگ
میں کنارے پر آکر ملکہ نے اپنی سونڈ پبلک کی طرف
بڑھائی تھی تو وہاں بیٹھی ہوئی عورتیں کیسی چیخ مار کر
بھاگی تھیں۔

شیرا :۔ وہ تو عورتیں تھیں۔ عورتیں تو ہوتی ہی ڈرپوک ہیں

ریشما : میں تجھے ڈرپوک دکھائی دیتی ہوں شیرا۔ اور وہ جوان
کے ساتھ مرد بیٹھے تھے نا۔ ان میں سے ایک آدمی تو مارے ڈر کے
کرسی کے نیچے چھپ گیا

(دونوں مل کر ہنستے ہیں)

شیرا :۔ مگر تو یہ سب کہاں سے دیکھ رہی تھی ؟

ریشما :۔ وہ جو کونے میں ایک کرسی ہے نا میں اسی پر بیٹھی تھی

شیرا :۔ مگر تو وہاں کیوں بیٹھی تھی

ریشما :۔ بات یہ ہے شیرا۔ جب بابا ہاتھیوں کے رنگ میں جاتا
ہے تو میں اسے دیکھتی رہتی ہوں۔ اچھا یہ بتا بابا نے میرے
بارے میں تو آج تجھ سے کچھ نہیں کہا۔

شیرا :۔ نہیں تو۔ کیوں۔ (ذرا رک کر) کل تو تو مجھ سے کہہ رہی
تھی کہ بابا سے اس بارے میں کچھ نہ کہنا۔ اور آج بھی یہی
بات پوچھ رہی ہے۔ مجھے کیوں نہیں بتاتی ؟

ریشما :۔ لے تیار ہو جا۔ اب کے ہماری باری ہے

شیرا :۔ میرا دل تو جھولے پر جانے کو نہیں چاہتا

ریشما : ایسی باتیں نہ کر۔ چل جلدی کر۔ اگر تو نہیں جائے گا
تو میں بھی نہیں جاؤں گی

شیرا :۔ پھر تو دونوں کی نوکری گئی

ریشما :۔ نوکری رہے یا جائے۔ میں تو تیرے علاوہ کسی دوسرے
کے ساتھ کرتب نہیں دکھاؤں گی

شیرا :۔ نہ جانے کیوں آج میرا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے

ریشما :۔ تیرا دل تو یونہی دھڑکا کرتا ہے۔ چل نا۔ جلدی کر
دیکھ بتیاں بھی اونچی ہو گئیں

(وقفہ)

(ہاتھیوں کی ہلکی چنگھاڑ اور گھاس کی سرسراہٹ)

رشید :۔ شیرا۔ اب رانی نہا بھی چکی۔ تیار ہو جا۔ میرا خیال ہے
اب تو رانی تجھے خوب پہچاننے لگی ہے۔ اور سونڈ میں
لپیٹ کر بھی اٹھا لیتی ہے۔ آج سے تو اس کے پاؤں کے نیچے
لیٹنا سیکھ لے تاکہ یہ کام بھی جلد ہی آجائے۔

شیرا :۔ میرے خیال میں ابھی کچھ دن اور ٹھہر جا۔

رشید :۔ میں سمجھتا ہوں تم اب بھی اس سے ڈرتے ہو۔ اچھا آؤ دیکھو
میں تمہیں لیٹ کر دکھاتا ہوں (پاؤں پر ہاتھ مارنے کی آواز)

رشید :۔ پاؤں اونچا کر رانی۔ ہاں شاباش۔ ایسے
(گھاس کی سرسراہٹ کی آواز)

---

بس اب ہٹا لے۔ شاباش۔ دیکھا شیرا۔ کتنا کہنا مانتی ہے
کتنی سیدھی ہے رانی۔ بس ایسا لگتا ہے جیسے سینہ پر ایک تکیہ
رکھا ہے۔ دیکھنے والے سمجھتے ہیں بڑا بہادر ہے۔ ہاتھی کے
پاؤں کے نیچے لیٹ گیا۔

شیرا : اچھا لاؤ میں لیٹتا ہوں

رشید :۔ ہاں ہمت کرو۔ رانی پاؤں اونچا کرو۔ شاباش
(گھاس کی سرسراہٹ) لیٹ جاؤ۔ لیٹ جاؤ۔ ایسے
(تیز تیز سانس کی آواز)

شیرا :۔ بس بابا۔ بس اس کا پاؤں ہٹاؤ۔ وہ مجھے دبا رہی ہے
میرا سانس گھٹ رہا ہے۔ میں مرا۔ میں مرا۔ جلدی کرو
رانی۔ رانی۔ بس پاؤں ہٹا لے

رشید :۔ رانی ذرا آہستہ

شیرا :۔ خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔ رانی مجھے مارے ڈال رہی ہے۔ رشید
رانی۔

رشید :۔ ابھی نہیں رانی شیرا اس کا پاؤں اب اس وقت ہٹے گا
جب تو مجھ سے وعدہ کرلے کہ تو ریشما سے شادی نہیں کریگا

شیرا :۔ خدا کے لئے ایسا نہ کرو۔ ایسا نہ کرو۔ مجھے بچاؤ

رشید :۔ وعدہ کر۔ شیرا وعدہ کر

شیرا :۔ (بوکھلائی ہوئی آواز میں) رحم کرو بابا۔ رحم کرو۔ میں مر رہا ہوں۔ مجھے بچاؤ۔

رشید :۔ پہلے وعدہ کر۔ تیری شادی ریشما سے نہیں ہوسکتی۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔

شیرا (گھبرائی ہوئی آواز میں) اچھا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔

رشید :۔ بس رانی ہٹالے پاؤں

(گھاس کی سرسراہٹ)

شیرا :۔ (کھڑے ہوتے ہوئے ہانپتی آواز میں) بابا تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ اچھا نہیں کیا۔ تم بہت ظالم ہو بہت ظالم

(کہتا ہوا چلا جاتا ہے)

(وقفہ)

منیجر :۔ رشید۔ موجو بیمار ہوگیا ہے۔ اس کے بجائے ہاتھیوں کے کرتب آج تم دکھاؤ گے

رشید :۔ جی! میرا مطلب ہے!

منیجر :۔ جی۔ دی۔ کچھ نہیں۔ اور شیرا بھی تمھارے ساتھ رنگ میں جائے گا۔ اسے بھی تو اب ہاتھی خوب پہچاننے لگے ہیں۔ میں نے اس سے بھی کہدیا ہے (گھنٹی کی آواز)

منیجر (پبلک سے) حضرات! آج ہم آپ کے سامنے ایک نئی چیز پیش کریں گے جسے دیکھ کر آپ حیرت میں رہ جائیں گے

(تالیوں کی آواز۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ۔ سرکس کی موسیقی)

رشید :۔ دیکھو شیرا۔ میں ہاتھیوں کے پہلے وہی کرتب دکھاؤنگا جو روزانہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی سونڈھ سے لپٹ کر اس کی پیٹھ پر بیٹھوں گا اور پھر اس کے پاؤں کے نیچے لیٹوں گا۔ اس وقت تم بالکل میرے قریب کھڑے رہنا

شیرا :۔ آج ریشما اپنی کرسی پر نہیں دکھائی دے رہی ہے ورنہ ہمیشہ تو جب تم رنگ میں آتے تھے تو وہاں سامنے بیٹھی رہتی تھی

رشید :۔ ہاں وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے خیمے کی طرف چلی گئی۔

(سرکس کی موسیقی)

(پبلک سے سی سی اور عورتوں کی ہلکی چیخوں کی آواز)

ایک آواز: ہائے اللہ میں تو ڈر گئی

دوسری: کھڑی کیوں ہوگئیں۔ بیٹھی رہونا

پہلی :۔ وہ دیکھو وہ دیکھو۔ ہاتھی نے اسے اپنی سونڈھ میں لپیٹ کر اٹھا لیا۔ کہیں مار نہ ڈالے

رشید :۔ چھوڑ رانی بس نیچے اتار دے۔ بس رانی۔ شیرا ذرا اس کے ایک آنکس تو لگا۔ اس کا آج ذرا دماغ خراب ہورہا ہے۔

پہلی آواز :۔ وہ دیکھو۔ وہ اب کیا ہو رہا ہے

دوسری :۔ وہ ہاتھی کا پاؤں اٹھا رہا ہے

تیسری :۔ شاید اس کے نیچے لیٹے گا

پہلی :۔ سچ مچ ارے وہ تو اس کے نیچے لیٹ گیا۔ اور ہاتھی کا پاؤں اپنے سینے پر رکھ لیا

دوسری :۔ کمال ہے

(تالیوں کا شور)

رشید :۔ بس رانی اب پاؤں ہٹالے

شیرا :۔ (گرجدار آواز میں) نہیں رانی۔ ابھی نہیں

رشید :۔ اس کا پاؤں جلدی ہٹاؤ۔ یہ مجھے دبا رہی ہے۔ میرا سانس گھٹ رہا ہے۔

شیرا :۔ آہستہ ذرا آہستہ

رشید :۔ جلدی کرو شیرا۔ جلدی۔ میرا سانس گھٹ رہا ہے

شیرا : اب اس کا پاؤں اس وقت ہٹے گا۔ رشید جب تم مجھے یہ بتادو کہ تم نے ریشما سے میری شادی کرنے سے کیوں انکار

کیا۔ تم نہیں جانتے رشید۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا
بتاؤ تم نے کیوں انکار کیا۔

رشید :۔ شیرا مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ

شیرا :۔ نہیں آج میری باری ہے۔ بتاؤ۔ نہیں تو تم جانتے ہو
کہ میرا ایک اشارا کیا کر سکتا ہے اب رانی میرے پنجے
میں ہے

رشید :۔ اچھا۔ بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔ تیری شادی اس سے
نہیں ہو سکتی شیرا۔ وہ تیری بہن ہے
سوتیلی بہن۔

(موسیقی کی آواز ۔۔ وقفہ)

(ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز)

رشید :۔ تو رو رہی ہے

رشیا :۔ نہیں تو بابا! ...... میں کب رو رہی ہوں۔
میں تو ...... میں تو سوچ رہی ہوں

رشید :۔ کیا سوچ رہی ہے بٹیا

رشیا :۔ بابا میں سوچ رہی ہوں۔ کل سے شیرا کہاں چلا گیا۔

رشید :۔ (ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے) وہ چلا گیا ......
وہ سرکس چھوڑ چلا گیا

رشیا :۔ (افسردہ لہجے میں) بابا تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا

رشید :۔ کیا ؟

رشیا :۔ یہی ... یہی نا ...... کہ شیرا میرا سوتیلا بھائی ہے

رشید :۔ پہلے کیا بتاتا بٹیا۔ دراصل میں نے تیری ماں کی زندگی
میں ہی اس سے چھپا کر ایک اور شادی کر لی تھی۔ مگر
یہ بات کب تک چھپتی۔ آخر ایک دن تیری ماں کو پتہ چل
ہی گیا۔ وہ مجھ سے بڑی محبت کرتی تھی۔ اسے بڑا دکھ
ہوا۔ اور یہ غم اسے گھن کی طرح لگ گیا۔ اور تیرے
پیدا ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد وہ ...... مر گئی

(وقفہ)

رشیا :۔ اور شیرا کی ماں

رشید :۔ خدا نے مجھے اس کی بڑی سزا دی۔ اسکے تھوڑے ہی
دن بعد شیرا کی ماں بھی اللہ کو پیاری ہو گئی ... اور

(وقفہ)

رشیا :۔ اور کیا ؟

رشید :۔ اور پھر میں نے ساری عمر اپنے کئے کی سزا بھگتی۔ مگر
میں نے عہد کر لیا کہ کچھ بھی ہو اس اس غلطی کو تم دونوں
سے ہمیشہ چھپائے رکھوں گا ...... مگر

(وقفہ)

رشیا :۔ مگر کیا بابا

رشید :۔ مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ قدرت مجھے اتنی سخت
سزا دے گی

(بشکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

ابن ابی مُلَیکۃ
ترجمہ
ڈاکٹر سید محمد یوسف

عربی

# طالب و مطلوب

ابن ابی مُلَیکۃ ایک بلند پایہ تابعی فقیہ اور قاضی تھے
ان کے ادبی ذوق کا نمونہ ملاحظہ ہو

| | |
|---|---|
| مَن عاشَ فی الدُّنیا بغیرِ حبیبٍ | جس نے بغیر محبوب کے گزاری |
| فحیاتُہ فیہا حیاۃُ غریبٍ | وہ دنیا میں ایسا ہی ہے جیسے کوئی اجنبی ۔ |
| مَا تَنظرُ العَینانِ احسنَ مَنظرًا | اس سے خوش تر اور کوئی منظر آنکھوں کو نصیب نہیں |
| مِن طالبٍ اِلفًا ومن مطلوبٍ | کہ ایک دوست طالب ہو اور دوسرا مطلوب ۔ |
| ما کان فی حُورِ الجنان لِاٰدمٍ | جنت کی حوریں آدم کی دل بستگی کا سامان |
| لولم تکن حَوّاءُ ، مِن مَرغوبٍ | نہ کر سکیں، جب تک حوا کا وجود نہ تھا ۔ |
| قد کان فی الفردوس یشکو وحشۃً | وہ فردوس میں وحشت و تنہائی کے شاکی رہے |
| فیہا ولم یأنَس بغیرِ حبیبٍ | اور ایک محبوب کے بغیر ان کا دل نہ لگا ۔ |

نا ظم حکمت
ترجمہ
محمد قاسم

شوکی

# تمہارے ہاتھ

غریب انسانو! میرے ساتھیو
تمہیں جھوٹ کے سہارے زندہ رکھا جاتا ہے
جب تم بھوک سے نڈھال ہوتے ہو
اور جب تمہیں روٹی اور گوشت کی ضرورت ہوتی ہے
تو ایک مرتبہ بھی شکم سیر ہوئے بغیر
تم اس دنیا کو خیر باد کہہ دیتے ہو
اس کے پھل دار درختوں سے رخصت ہو جاتے ہو

سوچو،
دنیا بیل کے سینگھوں پر قائم نہیں
اس کو چلانے والے تمہارے ہاتھ ہیں

سلواکی

اندری سلادکووچ
ترجمہ
نصیر احمد زبیری

# لیکن یہ ممکن نہیں!

ممکن ہے میں تیرے شیریں ہونٹوں کا منکر ہو جاؤں
ممکن ہے میرے ہاتھ تجھ تک نہ پہنچ سکیں
ممکن ہے مجھے رنج و غم میں دُور جانا پڑے
ممکن ہے مجھ سے کسی کو محبت نہ رہے
ممکن ہے میں پیاس کی شدت سے مر جاؤں
ممکن ہے میں تنہائی میں افسردہ رہوں
ممکن ہے میری زندگی مشکلوں کے ریگستان میں گھر جائے
ممکن ہے میں جی کر بھی نہ جیوں
ممکن ہے میں اپنی زندگی کا خود خاتمہ کروں
لیکن یہ ممکن نہیں کہ میں تجھ سے محبت نہ کروں

انگریزی

ڈریسٹن
ترجمہ
مہرنگار قریشی

# وداعِ محبوب

چارۂ وصل نہیں ہے تو بس اے دوست وداع
دلِ خوں گشتہ میں اک یاد لئے جاتی ہوں
پھر نہ پائے گا کبھی تو مجھے ان راہوں میں
عہدِ الفت کی میں روداد لئے جاتی ہوں

عہد و پیمان سبھی دل سے بھلا دوں یکسر
اور جو ہو جائے کبھی سامنا راہوں میں ندیم
اشک پلکوں پہ نہ تھرّائیں نہ لب پر آہیں
جیسے دو اجنبی رہروِ ملیں راہوں میں ندیم

یاس انگیز ہے اے زیست ترا رختِ سفر
دلِ برباد کے نالوں میں کہاں جذب و اثر
تھک گئی ہار گئی آج تمنائے حزیں
لُٹ چکا ہے مرے ارمانوں کا تابندہ نگر

تو اگر چاہے تو یہ زیست بدل سکتی ہے
ظلمتِ شب ہی سہی، شمع تو جل سکتی ہے

ادارہ

## تبصرہ و تعارف

# نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا لازمی ہے

**شاعری اور شاعری کی تنقید** | ناشر اردو دنیا۔ آرام باغ روڈ ۔ کراچی
**ڈاکٹر عبادت بریلوی** | صفحات ۴۱۶ قیمت :۔ بارہ روپے

ڈاکٹر عبادت بریلوی اردو کے بہت مشہور نقاد اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کتابیں اپنے موضوع کا بہت تفصیلی جائزہ پیش کرتی ہیں۔ یہ کتاب بھی سابقہ روایات کے مطابق ہے جس میں اردو شاعری کا ابتدا سے آخر تک مطالعہ موجود ہے۔ ولی، میر، غالب، جوش، اقبال سب ہی اس کتاب کی زینت ہیں۔ کتاب کے آغاز میں شاعری کی ماہیت اور تنقید شعر کے بنیادی اصولوں پر مضامین ہیں۔ جن کی زبان اور خیالات دونوں ہی عبادت بریلوی کے مخصوص رنگ کے حامل ہیں، کتاب میں خاص طور پر جو مضمون قابل ذکر ہے وہ " فاختہ کی آواز " ہے جس میں جوش کے فن کی مذمت اور حسن کے ایک پہلو کا استحسان ہے۔ اردو کے طالب علموں کو اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملے گا اور وہ اسے اپنے لئے بے حد مفید پائیں گے۔

**غالب شناسی** | ناشر: علوی بکڈپو۔ محمد علی روڈ، بمبئی ۳
**ظ۔ انصاری** | صفحات: ۱۶۴ قیمت تین روپے پچاس پیسے

حال ہی میں غالب پر پھر ایک اچھی کتاب شائع ہوئی ہے۔ جسے ظ۔ انصاری نے لکھا ہے۔ یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود اہم ہے غالب کی زندگی اور فن سے متعلق نہ صرف دوسروں کی تحقیق و تنقید کو جمع کیا ہے بلکہ خود بھی بالغ نظری کا سے غالب کے فن پر جامع تبصرہ مثنوی ابر گہربار کا ترجمہ کر کے ظ۔ انصاری نے غالب شناسی کے سلسلے میں ایک نیا قدم اٹھایا ہے۔ یہ مثنوی غالب کا ایک شاہکار ہے۔ ضرورت ہے کہ اس مثنوی پر تفصیل سے کوئی تنقیدی مضمون لکھا جائے۔

اس کتاب کی افادیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ غالب کے فن کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ظ۔ انصاری نے ان ساری کتابوں کا پس منظر پیش کیا ہے جن سے انہوں نے غالب کو سمجھنے میں مدد لی ہے۔ ظ۔ انصاری کی ذہانت اور طباعی کا اس

کتاب میں پورا پورا اظہار رہتا ہے ـــ

**انتخاب شعرائے بدنام**
**جلیل قدوائی**

ناشر:- اردو اکیڈمی سندھ بندر روڈ کراچی
صفحات:- ۲۳۲ - قیمت:- چار روپے

اس کتاب میں جلیل قدوائی نے جرأت، انشار، ناسخ، رند اور امانت کی شاعری کا انتخاب اور ان کی زندگی کے حالات مقدمے کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ ست کے سب لکھنؤ اسکول کے شاعر اور اس اسکول کے اہم نمائندے ہیں لیکن شعرائے بدنام کے عنوان سے کم از کم ناسخ کا نام جرأت و انشار کے ساتھ دینا مناسب نہیں تھا۔ ناسخ کا کلام غیر شاعرانہ ہے اور ان کی شاعری رعایت لفظی کی پیداوار ہے۔ جبکہ جرأت، انشار، رند اور امانت بہر حال شاعر تھے اور رعایت لفظی کے باوجود جا بجا ان کے کلام میں لطافت، اور لذت ہے۔ شعرائے بدنام کی رعایت اس مجموعے میں رنگین کا کلام بھی ہونا چاہیئے تھا۔ جن کا نام ریختی کی وجہ سے اردو شاعری میں ہمیشہ اہمیت رکھے گا۔ بہر حال یہ انتخاب جس محنت اور کاوش سے کیا گیا ہے وہ یقیناً قابل تحسین ہے۔ اس کتاب پر جلیل قدوائی نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ خاصا اہم ہے۔ اور یہ امر بھی کم دلچسپ نہیں کہ جلیل قدوائی کو خاص طور پر انھیں موضوعات سے دلچسپی ہے جو جرأت اور انشا کے یہاں ملتے ہیں۔ لہذا اس انتخاب کا حق بھی انھیں کو پہنچتا تھا۔

**آتش رفتہ (ناولٹ)**
**جمیلہ ہاشمی**

ناشر:- اردو اکیڈمی سندھ بندر روڈ کراچی
صفحات: ۱۶۷ قیمت چار روپیہ

آتش رفتہ جمیلہ ہاشمی کا تازہ ناولٹ ہے جسے اردو اکیڈمی سندھ نے شائع کیا ہے۔ یہ ناولٹ جمیلہ ہاشمی کی مخصوص زبان اور طرز اظہار کا آئینہ دار ہے اس کے تقریباً سارے کردار سکھ ہیں۔ سکھوں کے رہن سہن اور ان کی زندگی کے نشیب و فراز کا اس میں کامیاب عکس ملتا ہے۔ نسوانی کرداروں کے بارے میں جمیلہ ہاشمی خاص طور پر اچھا لکھتی ہیں۔ ان کی کہانیاں کردار اور واقعہ نگاری کے علاوہ دکھ کے احساس کی بھی ترجمان ہیں۔ جو تقریباً ان کی ہر تخلیق میں ملتا ہے شاید اس عہد کے ادیب کا مقدر ہی دکھ ہے۔ اس ناولٹ کا ماحول پنجاب کے دیہات ہیں جہاں جمیلہ ہاشمی نے ابتدائی عمر کا بڑا حصہ گذارا ہے۔

**واہگہ کے اس پار**
**رفیق چوہدری**

ناشر:- پنجاب پبلشرز۔ کچہری روڈ ـــ گوجرانوالہ
صفحات ۱۵۲ قیمت دو روپے

یہ ناولٹ پاکستان اور ہندوستان کی حالیہ جنگ کے تاثرات پر مبنی ہے۔ رفیق چوہدری نے اپنے ذہنی ردعمل کا ایک خاکہ اس ناولٹ میں پیش کیا ہے۔ اور ایک حب الوطن کی حیثیت سے پاکستانیوں کا نقطۂ نظر اس ناولٹ میں محفوظ کر دیا ہے۔ ان کی کہانی دلچسپ اور نصیحت آموز ہے۔ اس کا مرکزی کردار ایک اسمگلر ہے۔ جسے وطن کی محبت۔ اور ایک اچھا آدمی بنا دیتی ہے جو اپنی دولت دفاعی فنڈ میں دے دیتا ہے۔ اور مسلمان عورتوں کی عصمت کی حفاظت بھارت میں رہ کر کرتا ہے۔ اس میں ہندوستان اور پاکستان کے مختلف کردار یکے بعد دیگرے ابھرتے ہیں۔ اور سب مل کر اس ناولٹ کا مجموعی تاثر مرتب کرتے ہیں۔ پاکستان سے محبت کرنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

## یارانِ محفل

# محفل

ڈاکٹر صفدر آہ —— ڈاکٹر سلام سندیلوی
ادیب سہیلی —— اختر شاہجہانپوری
ڈاکٹر رب نواز مائل —— عرفانہ عزیز

## ڈاکٹر صفدر آہ —— بمبئی

افکار ملا ۔ " امیر خسرو " پر آپ کے گرانقدر تبصرے کے لئے دلی شکریہ ۔ ہندی یا ہندوی مسلمانوں کا دیا ہوا ایک لفظ ہے جس کے معنی ہیں ، ہندوستان میں بولی جانے والی کوئی بھی زبان ۔ خود امیر خسرو نے "نہ سپہر" میں ہندی کے یہی معنی بتائے ہیں ۔ فرماتے ہیں ۔

سندی و لاہوری و کشمیر و گبر ؛ دہور سمندی و تلنگی و گجر
معبری و گوری و بنگال و اودھ ؛ دہلی و پیرامنش اندر ہمہ حد
این ہمہ ہندویست ز ایام کہن ؛ عامہ بکار است بہر گونہ سخن

یہاں خسرو نے بارہ زبانوں کا ذکر کیا ہے اور ان سب کو ہندوی کہا ہے ۔ یہاں تک کہ ان میں غیر آریائی زبان تلگو (نمبر ۹) بھی شامل ہے ۔ فرقہ پرستوں نے آج جو ہندی کے معنی مقرر کئے ہیں وہ ایک سیاسی شرارت ہے آج کی نام نہاد ہندی سیاسی مقاصد کے پیش نظر بگاڑی ہوئی اردو ہے جو تقریباً ایک صدی کے اندر معرضِ وجود میں آئی ہے یہ مصنوعی زبان نہ تو دنیا کے کسی خطے میں بولی جاتی ہے اور نہ اس میں شعر و ادب کی تخلیق ممکن ہے ۔
(برج ۔ اودھی اور میتھلی وغیرہ کو ہندی اردو سے کوئی تعلق نہیں ۔) امیر خسرو کی دہلوی ہندوی (نمبر ۱۲) ہے جس کے معنی ہیں صرف اردو ۔ میں نے اپنی کتاب کے صفحہ ۴۶ سے صفحہ ۵۰ تک ایک اچھوتے اور نئے زاویئے سے دیکھا ہے کہ کھڑی بولی جس زبان کو کہا جاتا ہے وہ صرف اردو ہے ۔ اس بحث کی طرف توجہ کا خواستگار ہوں ہاں خسرو نے بھاکو میں کچھ گیت مزید لکھے ہیں ۔

## ڈاکٹر سلام سندیلوی ــــــ گورکھپوری

افکار کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اور بے پناہ خوشیوں کا پیغام لایا۔ اس شمارے نے آپ کی یاد دل میں تازہ کردی اور اس کے اعلیٰ معیار کے مواد نے طبیعت کو سرور بخشا ــــــ آپ جس انداز سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں تاریخ اسکو فراموش نہیں کرسکتی ہے۔ خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔

## ادیب سہیل ــــــ سید پور

غالب نمبر کو جس طرح آپ نے ترتیب دیا ہے۔ یقیناً اردو ادب میں انفرادیت کا حامل ہے۔ غالب پر اس سے بہتر مواد بھی مل جائے گا، ضخیم کتابیں بھی دستیاب ہو جائینگی لیکن غالب کے سلسلے میں اتنی ساری باتیں یکجا مشکل سے ہی کہیں دستیاب ہوں گی۔

## افسر ماہ پوری ــــــ ڈھاکہ

"افکار" کے شمارے پابندی سے آتے ہیں۔ اور آپ کی انتھک محنت و مشقت کا پتہ دیتے ہیں مگر ہمارے درمیان عرصے سے خاموشی کی دیوار حائل ہے۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے اور کسی "زندہ نامہ" کی تیاریوں میں مصروف۔ جوش، حفیظ اور فیض نمبر شائع کر کے آپ نے اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ "غالب نمبر" قدیم ادبی روایت کی ایک اہم کڑی اور آپ کی اردو پرستی کا خوبصورت اظہار ہے۔ خدا آپکو اردو زبان و ادب کی مزید خدمت کی صلاحیت و قوت دے۔ آمین۔

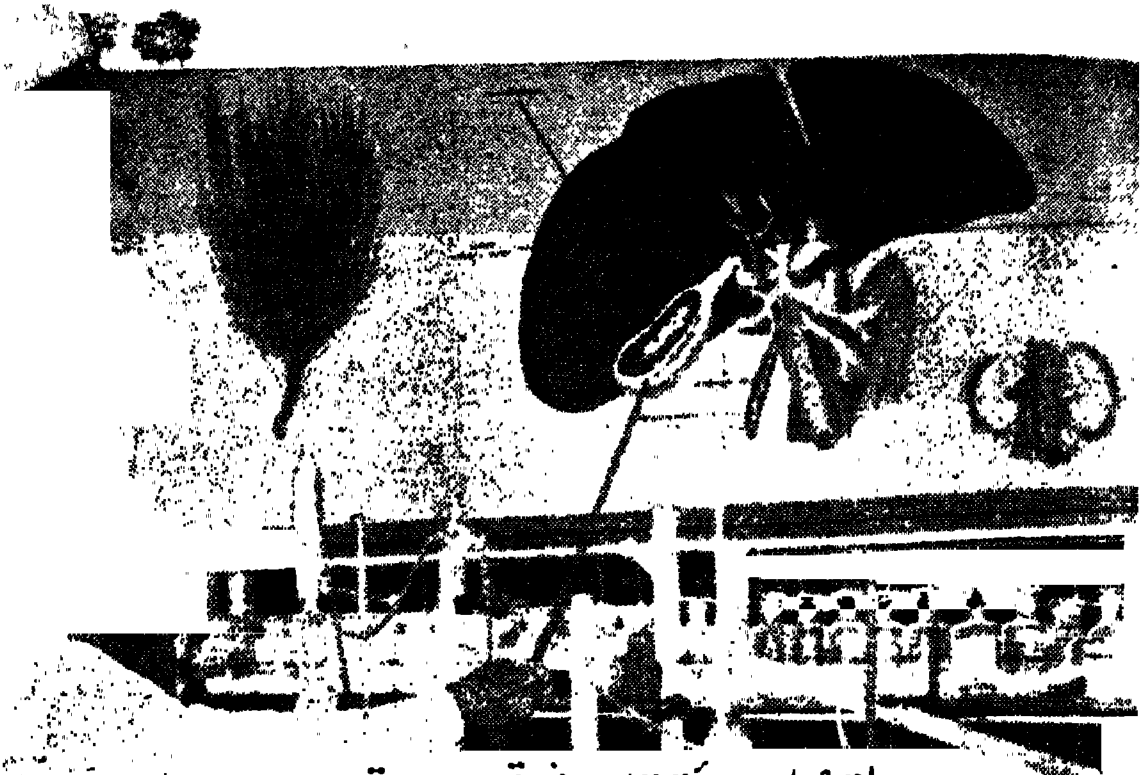
## ڈاکٹر رب نواز مائل ــــــ لورا لائی

غالب نمبر کے بعد دو اور پرچے بھی دیکھنے میں آئے۔ لیکن میں سر دست "غالب نمبر" کو بمشکل ختم کر پایا ہوں۔ یقیناً یہ ایک ایسی دستاویز ہے جسے غالب اور اس کے فن پر انسائیکلوپیڈیا قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ نے مجاز نمبر، جوش نمبر، حفیظ نمبر اور فیض نمبر کے بعد غالب نمبر نکال کر ایک نئی روایت قائم کی ہے زندہ اور زندہ جاوید ہر دو قسم کی شخصیتیں فن کے اعتبار سے سراہے جانے کے لائق ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ افکار نے یہ حق بخوبی ادا کیا ہے۔

## عرفانہ عزیز ــــــ کراچی

"افکار" باقاعدگی سے مل جاتا ہے۔ یہ رسالہ علم و ادب کی جو بے لوث خدمت انجام دے رہا ہے اسے ادبی تاریخ ہمیشہ یاد رکھیگی۔ افکار کی کارگزاری کو ہر لحاظ سے معیاری کہا جا سکتا ہے۔ اس کی تخلیقات میں افادیت اور مقصدیت ہوتی ہے میری دعا ہے کہ افکار کا اُجالا دور دور تک پہنچے اور "صبح نو" کا ترجمان ثابت ہو۔

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی ــــــ طابع: مشہور آفسٹ پریس کراچی
دفتر: رابسن روڈ کراچی ــــــ فون: ۷۳۹۹۳



# صداقت اور حقائق "طبِ مشرق" پر جدید تحقیقات

طب مشرقی کی ہزار ہا سالہ روایات صداقتوں اور تجارت کے رد میں سارا عالم مجتمع ہوا۔ اور تجارتی مفادات پر طب کے حقائق قربان ہوئے مگر آخر کار دنیا کو اب تسلیم کرنا پڑا کہ ادویہ غذائیہ قدرتی ذرائع و ذخائر اور جڑی بوٹیاں اور طب مشرقی کے معالجات اہمیت کے حامل ہیں اور صحتِ انسانی کے لئے انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جدید تحقیقات کا رُخ حقائق قدامت کی طرف موڑنے والے انسانیت دستور میں ہمدرد قدم بقدم اور پیش پیش ہے۔ بیخ امراض کے لئے نباتات سے ادویہ دنیا بھر میں تیار ہو رہی ہیں۔ پاکستان میں ہمدرد اس اصول کا داعی ہے۔ ملیریا میں پیدا ہونے والی جھاڑی سے یرقان کی مفید و موثر اور تقریباً یقینی دوا "اکثرین" ہمدرد کے ماہر حکیموں، ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کے اتحاد ثلاثہ اور اشتراک عمل سے وجود میں آئی ہے اور صرف یہی اتحاد ثلاثہ ہی ایسی ایجادات کر سکتا ہے اور قدیم معالجات کی سائنٹی فک توجیہات کر سکتا ہے جو پاکستان کے مسلہ صحت کے حل اور ادویہ میں خودکفالتی کے لئے ازبس ضروری ہے۔

---

**مینونات** رحم سے شدید اور بے قاعدہ جریان خون کی قطعی بے ضرر دوا ہے۔ کثرت حیض۔ سن یاس کا غیر معمولی جریان خون۔ مستقل جریان خون۔ غیر معمولی رحمی جریان خون بحالت حمل اس دوا کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔

**ہمدرد گرائپ واٹر** ننھے منے بالخصوص دانت نکالتے بچوں کی صحت مندی کے لئے ہاضمے کی تمام خرابیوں پیٹ کے ہر قسم کے بے چین کر دینے والے درد کو ساکن کرنے میں نہایت موثر ہے۔ دستوں کی شکایت۔ بالخصوص جو دانت نکالنے کے زمانے میں عام طور پر ہو جاتی ہے ہمدرد گرائپ واٹر سے دور ہو جاتی ہے۔

**سنکارا** ایک تغذیہ بخش وٹامنوں والا ٹانک ہے جو متعدد دیسی جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے جن کی دوائی افادیت سے اہل طب اچھی طرح واقف ہیں۔

**نونہال بے بی ٹانک** بچوں کی صحت مند بڑھوتری میں مدد دیتا ہے اور انہیں تنومند بناتا ہے۔

**سعالین** ایسی جڑی بوٹیوں کا ایک متوازن مرکب ہے جو کھانسی زکام اور برانکائٹس کی شکایات دور کرنے میں زود اثر مانی جاتی ہے۔

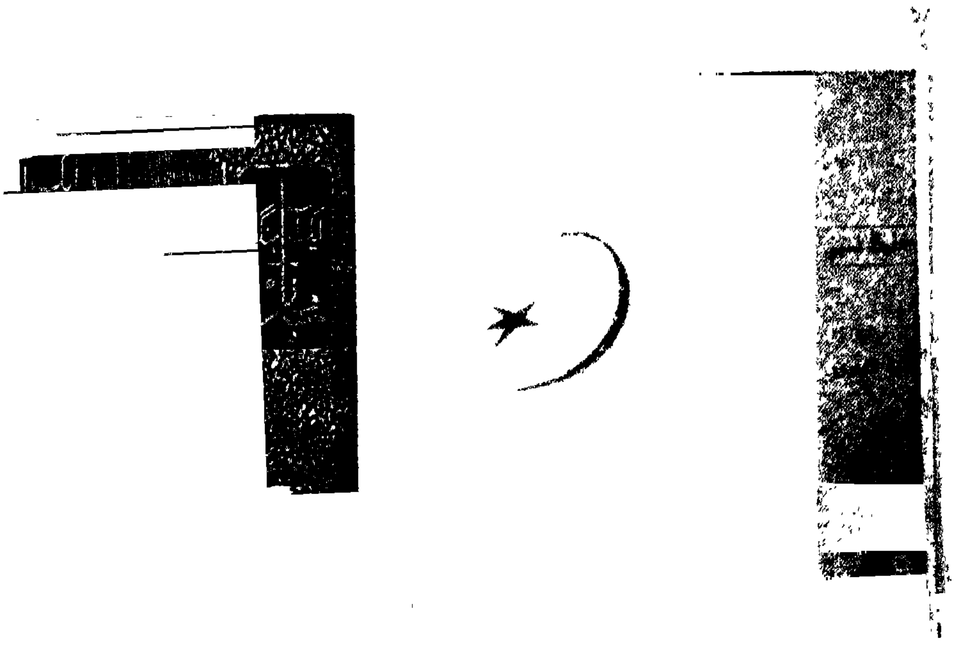
**کارمینا** معدہ اور جگر کے فعل کی اصلاح کرتی ہے تیزابیت۔ سینے کی جلن۔ پیٹ کا بھاری پن اور پیٹ میں ہوائیں پیدا ہونا۔ بدہضمی کھٹی ڈکاریں۔ درد شکم متلی اور قے۔ بھوک کی کمی قبض کی شکایات کے لئے اکسیر ہے۔

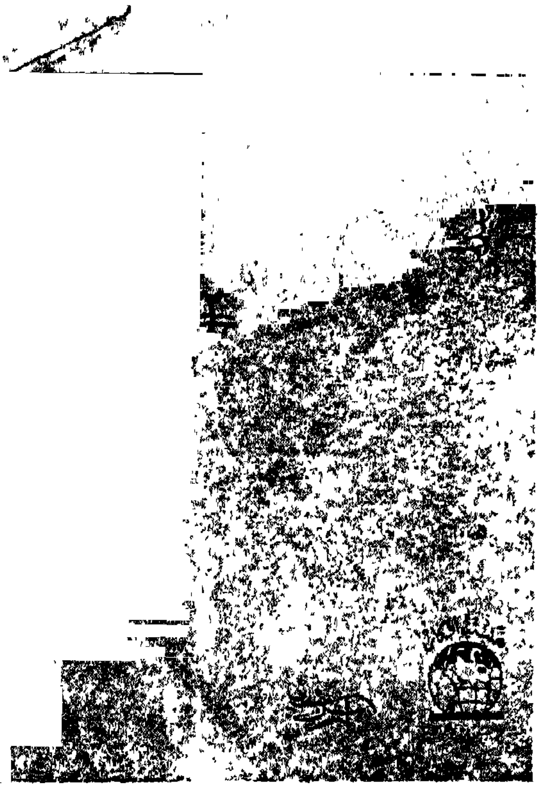
**صافی** خون کو صاف کرتی ہے اور سارے نظام جسمانی کو گردوں اور جلد کے ذریعہ فاسد مادے کے اخراج کے لئے ابھارتی ہے۔

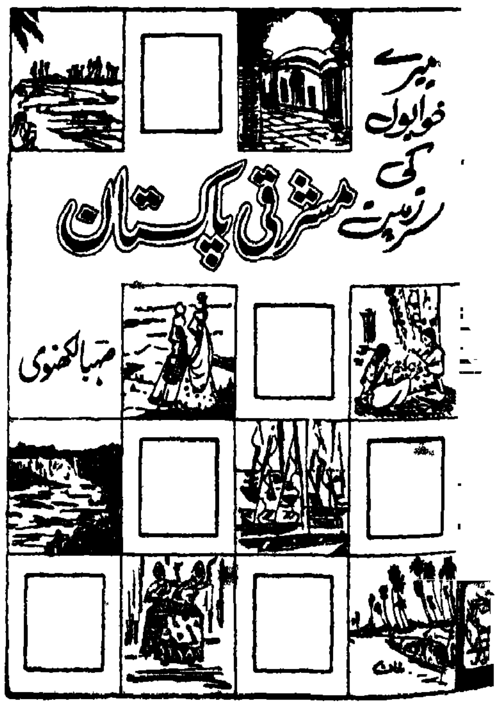
**خمیرہ ہمدرد** قلب و دماغ اور اعصاب کو تقویت دیتا ہے محرک ہے۔ اشتہا کو بیدار کرتا ہے۔ دل کو طاقت دیتا ہے۔ اور عام جسمانی کمزوری کو بحال کرتا ہے۔

ہمدرد کی ادویہ مُلک کے کونے کونے میں مِل سکتی ہیں








میرے
خوابوں
کی
سرزمین مشرقی پاکستان
صہبا لکھنوی



منظور شدہ محکمۂ تعلیمات کراچی لاہور پشاور کوئٹہ
جاری شدہ: ۱۹۴۵ء ★ ٹیلیفون: ۷۳۹۹۳

# افکار

سال: ۲۲ شمارہ: ۱۸۰

مدیر
## صہبا لکھنوی

| زرِ سالانہ | بیرونی ملکوں سے | | فی پرچہ |
|---|---|---|---|
| ۱۲ روپے | ۴۰ شلنگ | ۱۰ ڈالر | ایک روپیہ |

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ، کراچی

لندن آفس
۱۴- پرنسیز ایونیو- لندن- این- ڈبلیو نمبر ۹

## افکار دوستوں سے ایک اپیل

# افکار

## کو دس ہزار سالانہ خریداروں کی ضرورت ہے

مزید اس مہم میں حصہ لے کر
اردو کا حلقہ وسیع کیجئے!

یکم اگست ۷۶ء سے افکار کی خریداری مہم شروع کی جا رہی ہے جو ۳۱ دسمبر تک جاری رہے گی، افکار کو دس ہزار سالانہ ممبروں کی ضرورت ہے جو صرف افکار دوستوں اور اردو زبان و ادب کے بہی خواہوں کے عملی تعاون سے بآسانی فراہم ہو سکتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ تمام افکار دوست — دردمندانِ اردو اور ادب نواز حضرات اس ادبی مہم میں حصہ لے کر افکار کی رفاقت و اعانت فرمائیں گے دس کروڑ کے اس ملک میں اردو سے محبت رکھنے والوں کی تعداد کسی طرح پانچ کروڑ سے کم نہ ہوگی۔ اگر اردو زبان و ادب کا ہر شیدائی دو دو چار چار سالانہ خریدار افکار کو فراہم کر دے تو دس ہزار تو کیا، دس لاکھ خریدار بھی بآسانی دستیاب ہو جائیں گے اور اس طرح اردو کا ادبی حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوسکے گا

- تمام سالانہ ممبروں کو "نئی تخلیق نمبر" بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔
- خریداری مہم میں عملی حصہ لینے والے تمام حضرات کے اسمائے گرامی (بشرط اجازت) افکار میں شائع کیے جائیں گے۔
- کم سے کم دس سالانہ ممبر فراہم کرنے والے حضرات کی خدمت میں مکتبۂ افکار چند معیاری کتابیں بطور تحفہ پیش کرے گا۔ کتابوں کی قیمت بیس روپے سے کم نہ ہوگی

افکار — آپ کا اپنا رسالہ ہے
اس کی توسیع اشاعت میں عملی حصہ لے کر تعاون کیجئے

ناظم نشر و اشاعت
ماہنامہ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی

## اگست ۱۹۶۶ء کی تخلیقات

# اشاریہ

قیامِ پاکستان کو ۱۹ سال ہو رہے ہیں۔ یہ عرصہ اتنا کم بھی نہیں کہ ہم ملک کی ہمہ گیر ترقیوں کے ساتھ ساتھ ادبی اور تہذیبی رفتارِ کار کا جائزہ بھی نہ لے سکیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ صنعتی، اقتصادی، معاشی اور معاشرتی سرگرمیوں کے مقابلے میں علمی، تعلیمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا کیا مقام ہے؟ —— آیا ہم نے مسلسل کارخانے اور صنعتیں قائم کرنے کے ساتھ ساتھ قوم کی علمی اور فکری سطح کو بھی بلند کیا ہے! —— زبان و ادب کو وسعت دینے، اور قوم میں علم و مطالعہ کا ذوق عام کرنے کے لئے بھی عملی کوششیں کی ہیں! —— اچھے ادب کی سرپرستی، ترویج و ترقی اور حوصلہ افزائی کے لئے کتنی ایسی لائبریریاں اور کتنے ایسے مراکز قائم کئے ہیں، جن سے ۱۰ کروڑ کی یہ قوم مستفید ہو رہی ہے! —— کیا علم و تعلیم کے میدان میں ہماری رفتارِ ترقی تسلی بخش ہے؟! —— یہ چند سوالات ہیں جو سوچنے والے اور علم و ادب سے تعلق رکھنے والے افراد کے لئے آج بھی لاینحل مسئلوں کی حیثیت رکھتے ہیں، اور شاید اس وقت تک ان کا تسلی بخش حل نہ نکل سکے جب تک قومی بنیادوں پر شہر و قصبات میں لائبریریوں کا جال نہ بچھا دیا جائے، اور علم و تعلیم کو عام کر کے پوری قوم کو باشعور، مہذب اور تعلیم یافتہ بنانے کے لئے ایک واضح منصوبے کے تحت عملی اقدامات نہ کئے جائیں —— دنیا کے کئی نو آزاد اور ترقی یافتہ ملکوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارا پڑوسی ملک چین بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے جس نے ہم سے بھی کم مدت میں ہمہ گیر قومی ترقی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ پچھلے دنوں ہمارے کئی ادیب چین کا دورہ کر کے لوٹے ہیں۔ انہوں نے چینی قوم کے مثالی کارناموں کا جو حال سنایا وہ ہم سب کے لئے باعثِ تقلید ہے۔ وہاں کا ہر فرد باعمل اور جفاکش ہے اور قومی فریضہ کو عبادت سمجھ کر انجام دیتا ہے۔ پاکستان میں بنیادی جمہوریتوں کا نظام خامیوں کے باوجود کئی خوبیوں کا بھی حامل ہے اور اس نظام کے تحت شہر و قصبات کے ان گنت مسئلے بآسانی حل کئے جا سکتے ہیں، اسی کے ذریعے ہم ملک میں علم و تعلیم اور لائبریریوں کے قیام کے منصوبوں کو بھی روبہ عمل لا سکتے ہیں۔ ضرورت عزم و عمل اور خلوص و تدبر کی ہے —— ان تھک محنت، لگن اور ایثار کے بغیر دنیا کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا ہے —— چہ جائیکہ ایک نو آزاد ملک کی تعمیرِ نو کا مسئلہ۔ بہرطور مایوسی کی کوئی وجہ نہیں —— پاکستان ایک زندہ حقیقت ہے اور پاکستانی قوم اس کی رُوحِ رواں —— اگر اس قوم کا ہر فرد اپنی اپنی جگہ پر محنت، دیانت اور صداقت کو اپنا مطمحِ نظر بنا لے اور متحد ہو کر تعمیرِ نو میں سرگرمی سے حصہ لے تو کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ دس بیس سال میں یہ مملکت ایک مثالی مملکت نہ بن جائے۔

"عربی زبان و علوم کی اہمیت" (صفحہ ۲۱) ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا خطبۂ صدارت ہے جو پچھلے دنوں آپ نے اسلامیہ کالج گوجرانوالہ کی انجمن عربی کے سالانہ جلسۂ تقسیمِ انعامات کے موقع پر پڑھا تھا۔

علی جواد زیدی

# خوابوں کے جزیرے

اے امن و ترقی کے تنگ ظرف مریدو!
اے فکر کے میدان کے معزوضہ شہیدو!
کچھ منہ کا لٹکنا ہی تفکر تو نہیں ہے!
تم جس سے ہو خائف وہ تغیر تو نہیں ہے؟
تکلیف جہنم کی حزیں شام نہیں ہے
غم کچھ بھی سہی موت کا پیغام نہیں ہے
طوفان اٹھیں لاکھ بیابانِ ستم سے
لیکن مری دنیا نہ مرے گی کبھی غم سے
غم ساغرِ تعمیر میں ہے تلخیٔ بادہ
تلخی کو مٹاتا ہے شکر ریز ارادہ
اُس وقت سے واقف نہیں محدود نگاہیں
جب عیش کی شکلوں میں بدل جاتی ہیں آہیں
سنتے ہیں کہ ہونے نہیں دیتا ہے سویرا
افکار کے بادل کا گھٹا ٹوپ اندھیرا
جس مے کو سمجھتے ہو لہو چاٹ رہی ہے
صدیوں کے جمے میل کو وہ کاٹ رہی ہے
میداں کے ظفر مند و ظفر یاب سپاہی
پیمانوں سے دھو لیتے ہیں راتوں کی سیاہی

صد حیف کہ تم واقفِ لذات نہیں ہو!
افسوس کہ تم رندِ خرابات نہیں ہو!

محور پہ زمیں رقص میں ہے جھوم رہی ہے
تہذیب ہے گردش میں فضا گھوم رہی ہے
اک شعلۂ جوّالہ لرزتا ہے ہوا میں
یا ناچ رہا ہے کوئی مخصوص ادا میں
حکمت نے خزانوں کے دہن کھول دیئے ہیں
دامانِ تباہی میں گہر رول دیئے ہیں
اک زندگیٔ نو متصادم ہے سکوں سے
اک عقلِ جواں برسرِ پیکار جنوں سے
یہ آگ جو دھرتی پہ برستی ہے مسلسل
تکمیلِ تمنا کو ترستی ہے مسلسل
بجھ بجھ کے نئے سر سے چمک اٹھتی ہے گیتی
جلنے پہ تو کچھ اور دمک اٹھتی ہے گیتی
کیا رنگ ہیں آویزشِ محتاج و غنی کے
شاید یہی اوقات ہیں ناوک فگنی کے
خوابوں کے جزیرے جو نگاہوں سے نہاں ہیں
تاریخ کے بہتے ہوئے دھارے پہ رواں ہیں
کانٹوں سے بھری راہ میں چلنا ہے تو کیا غم؟
مٹی کو نمو کے لئے جلنا ہے تو کیا غم؟

اس فکر میں کیوں لذتِ امکاں کو بھلا دیں؟
زخموں پہ مئے ناب کا پھاہا تو لگا دیں!

فضا ابن فیضی

# رُباعیات

## کنجِ نشاط

یہ بربط و پیمانہ و شہد و انگور
ہیں جلوہ بہ جلوہ حور و غلمان و قصور
اے محتسبانِ شہر! چھیڑو نہ انہیں
صدیوں کی تھکن مٹا رہے ہیں جمہور

## تعزیر

مجروحِ فغاں ہے وہ نوا ہیں ہم لوگ
خود اپنی شکستوں کی صدا ہیں ہم لوگ
معصوم زمانے کو خبر کیا اس کی
خود اپنے گناہوں کی سزا ہیں ہم لوگ

## حاصلِ زندگی

حرمان و امید و پیش و پس بوتا ہوں
میں کشتِ حیات میں نفس بوتا ہوں
کیا حاصلِ زندگی ہے کچھ مت پوچھو!
میں کاٹتا ہوں حسرتیں ہوس بوتا ہوں

## تلخیٔ حالات

مرہم سے سحر کے نہ ابھرا رات کا زخم
چھینٹے جو پڑے جل اٹھا برسات کا زخم
شرمندہ ہیں خود چارہ نوازانِ حیات
تازہ ہے ابھی تلخیٔ حالات کا زخم

## خودسوزی

فرزانے سے دیوانے کی حالت اچھی
ہستی سے گذر جانے کی حالت اچھی
اوروں کو جلاتا نہیں خود جلتا ہے
ہے شمع سے پروانے کی حالت اچھی

منیب لدھیانوی

# زمین اور درخت

چیر کے دھرتی کے سینے کو
ننھی منّی کونپل پھوٹی
پی کر خون زمیں کا برسوں
پھولی پھلی، لہرائی، مہکی
پیڑ بنی، سرسبز ہوئی وہ
چوس کے اپنی ماں کی چھاتی

پنچھی تک پھل کھا کر اس کا
اپنی بھوک مٹا لیتے ہیں
رقصاں شاخ، غزل خواں پتّے
سب کو مست بنا دیتے ہیں

دھرتی کا کیا حال ہوا ہے
اونچے پیڑ کو کیا پروا ہے

مقصود عمرانی

# شرط یہی ہے

مُردہ تارے برف گھروں کے
آنچ بڑھاؤ پگھلیں گے
ہاتھ بڑھاؤ پگھلیں گے
کُنجی اپنے پاس ہے یارو!
سُورج اپنے ساتھ ہے یارو!
کالا سورج!
سُرخ سمندر!
چاند کی چوٹی سر ہوگی
ویرانوں میں پھول کھلیں گے
زہر کی یہ دیوار بہت ہے
درد بہت ہے وار بہت ہے
اپنی اپنی راہ تلاشو!
چپ کے بندھن ٹوٹ رہے ہیں!
تنہائی خود بول اٹھی ہے
دھوکا نہ دینا
دھوکا نہ کھانا
راہِ سفر میں
شرط یہی ہے!

قمر ساحری

# جہانِ ناتمام

کٹ نہ سکے آجتک خوف و جہالت کے دام
کوئی کسی کا اسیر، کوئی کسی کا غلام

سر بگریباں دماغ ششدر و مرعوب دل
کس کو مکمل کہیں، کس کو کہیں ناتمام

کوئی فریبی و حکیم، کوئی جلیل و کلیم
کوئی زمانہ شناس، کوئی ستارہ بہ دام

کوئی سمندر بکف، کوئی کہستاں بدوش
کوئی گلستاں بلب، کوئی سراپا پیام

کتنے چراغوں کا نور چھین لیا ظلمات نے
وقت نے کجلا دیئے کتنے خداؤں کے نام

پھر بھی مگر گامزن سلسلۂ رہرواں
دردِ تمنّا لئے محوِ تلاشِ مقام

دردِ تمنّا ہے کیا، اصل تمنّا ہے کیا
دشتِ گذرگاہ میں خوابِ دلِ تشنہ کام

جس سے جہاں تک بنا جس سے جہاں تک ہوا
اپنی زباں میں کیا دردِ تمنّا کو عام

دائرہ جہل ہیں دائرہ پیما ابھی
نور پرستانِ صبح، نجم شمارانِ شام

اپنی نواؤں میں گم اپنے خیالوں میں گم
صوفیٔ سادہ نوا، فلسفیٔ نو کلام

عقل بھی ہے سُرخرو، جہل بھی ہے سُرخرو
کس کے لہو سے ہوا، دشتِ وفا لالہ فام

کوئی کہے بھی تو کیا، کوئی سُنے بھی تو کیا
حرف ابھی بے صدا، لفظ ابھی ناتمام

علم ابھی نوزباں، عقل ابھی نوبیاں
فکر و عقیدہ ابھی مبتدیٔ تازہ گام

آگ ابھی نم ہے نم شعلہ ابھی تک ہے خام
"تو بھی ابھی ناتمام، میں بھی ابھی ناتمام"

منصور قیصر

# میں اور شہر لاہور

صبا کہہ رہی ہے کہ تم شہر میں ہو کہ تم شہر میں ہو
نیا رنگ لے کر چلی پھر ہوائیں
کسی نے بہت دور سے بنسری کی، لہو میں رچی، دُھن جگائی
کہ تم شہر میں ہو کہ تم شہر میں ہو کہ تم شہر میں ہو
میں پھولوں میں بیٹھا ہوا ہوں، یہی پھول جو اب مرا حافظہ ہیں
مرے حافظے میں کھلے پھول —
جیسے کسی لاش پر خون کے سُرخ چھینٹے
کھِلے پھول — جو ہیں علامت مرے شہر کی
ہاں مرا شہر صدیوں سے اب تک جواں
بے خزاں ہے —
مگر اپنے ہی حافظے پر یہ کیوں خون کے رقص کی یاد کو
پھر اک بار مٹی میں ملتے ہوئے دیکھتا ہوں
صبا کہہ رہی ہے کہ تم باغ میں ہو
کہ تم شہر میں ہو
مرے شہر میں ہو

امیر عارفی

# انتظار

زرد پتوں پہ چاند کی کرنیں
جیسے بیوہ کا حسنِ غم آگیں
تھکے پتوں پہ اونگھ جاتی ہیں
نیم عریاں درخت کی باہیں
اُن کو اپنے گلے لگاتی رہیں
سہما سہما ہوا ہے ہر پتّہ
کانپتا ہے ہر ایک جھونکے سے
جانے کب ہم سے زندگی چھن جائے
شاخ پر رہتے تو ٹوٹنے کا ڈر
شاخ سے گر کے بھی سکوں نہ ملا
اُڑتے پھرتے ہیں ہم اِدھر سے اُدھر
روندے جاتے ہیں' مسلے جاتے ہیں
برہنہ ٹہنیاں اُداس اُداس!
کب ملے ہم کو سبز پیراہن؟
کیسے چپ چاپ ہیں قطاروں میں
سہمے سہمے سے شرمسار درخت!
موسمِ گل کے انتظار میں ہیں

مشال رضوی

# مَن

من ہے کتنا مورکھ ہٹے
موتی دے کر پتھر لایا
پریت میں یہ پھل پایا
پریت میں یہ پھل پایا
اپنا آپ گنوایا
دنیا ہے اک ڈھلتی چھایا
رُوپ کسے راس آیا
ہر مورکھ پچھتایا
پگلے ساگر ہے سنسار
جوار کہیں ہے، کہیں ہے بھاٹا
لابھ کہیں ہے، کہیں ہے گھاٹا
کِس نے کیا کچھ پایا
تُو ہے ایسا مورکھ پاپی
تجھ کو گھاٹا آیا
جنم کرم کی مایا
موتی دے کر پتھر لایا
من آخر پچھتایا!!

ڈاکٹر سید عبداللہ

# عربی زبان و علوم کی اہمیت

جناب پرنسپل صاحب و صدر انجمن عربی!

میں آپ کی نوازش کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس کالج میں میں ایک مرتبہ پہلے بھی حاضر ہوا تھا، اب دوبارہ حاضر ہونے میں، لطفِ مکرر محسوس کر رہا ہوں۔

مجھے بیحد خوشی ہے کہ کالج میں عربی کا مضمون خاصا مقبول ہے۔ اور عربی کی انجمن، اس کو مقبول بنانے کے لیے ہر ممکن اقدام کر رہی ہے۔ میں نے رپورٹ کو سنکر، گہری خوشی محسوس کی ہے۔ عربی زبان و ادب کی ترقی یقیناً کالج کے مخلص پرنسپل صاحب کی ذاتی توجہ کی رہین منت ہے۔ اس کے لئے ہم سب ان کے شکر گزار ہیں۔

حضرات! اس کالج میں عربی کی ترقی اور مقبولیت کی رپورٹ سے مجھے جہاں مسرت ہوئی ہے۔ وہاں ملک میں عربی کے عام زوال کے بارے میں میرے دل میں بہت سے سوال بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لیے جہاں میں اس کالج کو مبارک باد پیش کر رہا ہوں وہاں میں عام حالت کے بارے میں تردد کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور میرا یہ تردد کسی ہیجان یا فوری جوش یا غیر معتدل جذباتیت کا نتیجہ نہیں بلکہ غور و فکر کے بعد اخذ کیے ہوئے نتائج پر مبنی ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ملک کی اہم سرکاری درس گاہوں میں عربی ادب کے ماہرین کی تعداد ۱۹۲۰ء کے مقابلے میں اب ایک فی صد بھی نہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ملک کی ایک اہم دانش گاہ کئی برسوں سے، کسی نامور عربی دان کی جستجو میں ہے مگر وہ اپنی تلاش میں ناکام رہی ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ عربی علوم کی تحصیل جو فاضل سلسلے کے توسط سے ہو رہی تھی۔ اب تقریباً متروک ہے ـــــ اور جس قدر ہے وہ اس لئے بیکار ہے کہ یہ فارغ التحصیل حضرات زندگی کے کسی شعبے کے لئے کارآمد نہیں سمجھے جا رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ پرائیویٹ انجمنوں کی طرف سے دینی مدرسے جاری ہیں اور ان میں پڑھنے والوں کی تعداد خاصی ہے۔ مگر ان کا سرکار دربار میں اور زندگی کے کسی باقاعدہ شعبے میں کوئی درجہ اور کوئی مقام نہیں۔

بہاولپور میں ایک جامعہ ہے اور اس کی تعریف بھی سنی گئی ہے مگر اس جامعہ کے سو ڈیڑھ سو طالب العلموں سے عربی کی بے رونقی دور نہیں ہوتی ـــــ کیونکہ اس جامعہ کا پڑھا ہوا آدمی بہت لمبی چھلانگ بھی لگائے تو امام، زیادہ بڑھے تو کسی بڑے صحن والی مسجد کا خطیب۔ فقط۔

اللہ اللہ! ایک زمانہ وہ تھا جب ملا قطب الدین اور ملا نظام الدین سہالوی، علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور بحر العلوم ملا جیون اور شاہ ولی اللہ عربی علوم کے راستے سے قوم کی روحانی اور معاشی زندگی کی رہنمائی کرتے تھے ـــــ اور سلاطین

وقت ان سے انتساب کو اپنے لئے باعث فخر خیال کرتے تھے۔ اب وہی ہم ہیں کہ خطیب بھی ڈھونڈنے پڑتے ہیں، اس کے لئے ہم اپنی حکومت وقت کے شکر گزار ہیں کہ اس نے اس گرتی ہوئی دیوار کو کچھ سنبھالا تو دیا ہے۔ ورنہ یہ خطرہ بھی ہو سکتا تھا کہ موزوں خطیبوں کی کمی کی وجہ سے اسوشل ورک کے فارغ التحصیلوں سے خطیبوں کا کام لیا جاتا جس طرح ایک ریاست کے بارے میں مشہور ہے کہ جب سول سرجن چھٹی پر جاتا تھا تو تحصیل دار کو حکم دیا جاتا تھا کہ وہ اس اثنا میں سول سرجن کے فرائض بھی انجام دے ۔۔۔ اور لطیفہ یہ کہ یہ تحصیلدار صاحب، اس کام میں، سول سرجن سے زیادہ کامیاب پائے گئے ۔۔!

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ان عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے جو ہماری تاریخ نے عربی علوم سے وابستہ کر رکھی تھیں ایک جامعہ بہاولپور کافی نہیں۔ میں نے اس درسگاہ کا نصاب دیکھا ہے۔ اور گزشتہ برسوں کی رپورٹیں بھی دیکھی ہیں۔ میں اس تجربے کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور حکومت کی نگرانی اور رہنمائی پر بھی تحسین و آفرین ہے ۔۔۔۔ مگر تکلیف یہ ہے کہ قوم اپنی سہل انگاری کی وجہ سے، ہر بوجھ حکومت پر ڈالتی رہتی ہے، جو اچھا برا کام حکومت سے ہو سکتا ہے وہ کرتی ہے، اس پر ... شکوہ و شکایت کی کیا گنجائش ہے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ مسئلہ پوری قوم کے سوچنے کا ہے، یہ اس کے تعلیم یافتہ طبقے کا فرض ہے کہ تعلیمی نظام میں عربی کے مناسب مرتبے اور حیثیت کے بارے میں حکومت کو مشورہ دے اور کوئی معقول پروگرام پیش کر کے قومی حکومت کا ہاتھ بٹائے اس وقت تک حکومت کو جتنے مشورے دیے گئے ہیں، ان میں سے بیشتر یک طرفہ اور جانبدارانہ مشورے تھے۔

پرانے قومی تعلیم کے کمیشن نے عربی اور فارسی کی تحصیل کو محض کاروباری سوال کی حد تک اہمیت دی اور اسی وجہ سے یہ سفارش کی کہ جدید عربی اور جدید فارسی پر زور دیا جائے اور اگرچہ جدید عربی اور جدید فارسی اپنی جگہ ضروری ہے۔ مگر اس سے عربی ادب اور عربی علوم کی تہذیبی اہمیت کا اعتراف نہیں ہوتا۔ گویا اس کمیشن کے فاضل ارکان اس بات کی تہہ تک پہنچ ہی نہیں سکے کہ عربی علم و ادب پر ہم اتنا زور کیوں دے رہے ہیں ۔۔۔ اور سچ پوچھئے تو اس کی ذمہ داری بھی ہم عربی والوں پر عاید ہوتی ہے۔ جو ابھی تک اپنے دعوے کو اچھی طرح مرتب ہی نہیں کر سکے تو اس صورت میں دوسروں کی بے التفاتی سے زیادہ، اپنی ہی بے عملی اور جمود کا شکوہ کرنا مناسب ہوگا۔

حال ہی میں ایک اور تعلیمی کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی ہے اور اس کے صدر مسٹر جسٹس حمود الرحمٰن تھے۔ اس رپورٹ میں عربی فارسی کی مخصوص اہمیت کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف مکتب اور مدرسہ کی تعلیم کے تحت بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مشرقی پاکستان میں دو قسم کے مدرسے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور مغربی پاکستان میں فاضل کا سلسلہ قائم ہے۔ کمیشن نے اس سے تعرض نہیں کیا اور کہا ہے کہ ان کے نصابوں میں جدید علوم کی کتابیں رکھی جائیں تاکہ " یہ مذہب کے لوگ " دنیا سے بھی باخبر رہیں ۔۔!

ہم کمیشن کی نیک دلی کے معترف ہیں لیکن مجھے یہ عرض کرنے میں باک نہیں کہ عربی فارسی زبان کی تحصیل و تعلیم کے اصلی مقصد کو فاضل کمیشن نظر انداز کر گیا ہے۔ مکتب اور مدرسے کے بارے میں ہمدردانہ رویے کا بھی شکریہ ہے مگر کیا عربی کی کل غایت یہ ہے کہ اس کے ذریعے اچھے خطیب یا " مذہب کے لوگ " پیدا کئے جائیں۔ کیا عربی کی تحصیل کی کل غرض یہ ہے ؟ کیا اس کے سوا اس کا کوئی اور مقصد نہیں ؟ ۔۔۔ یہ سب سوال ابھرتے ہیں اور ان کا اس رپورٹ میں کوئی تذکرہ نہیں ۔!

وقت کی تنگی کے باوجود میں یہ بتلانے کے لئے کہ ہم لوگ عربی کے مسئلے کو کیوں اور کیا اہمیت دیتے ہیں۔ اس مسئلے پر تھوڑی سی گفتگو

کرنا چاہتا ہوں۔

عربی کا مسئلہ ہمارے نزدیک محض ایک زبان سیکھنے کا مسئلہ نہیں، ہماری نظر میں یہ ایک تہذیبی مسئلہ ہے۔ اس کا تعلق ہماری تعلیمی روایت سے ہے۔ یہ شاندار تعلیمی روایت محمود غزنوی کے زمانے میں شروع ہوئی اور انگریزوں کے پنجاب پر قبضے تک جاری رہی۔ نئی تعلیم سے پہلے اس سارے ملک میں (بہ شمول ہندوستان) بڑے بڑے دارالعلوم موجود تھے ان درسگاہوں کے فارغ لوگ دینی اور دونوں قسم کے معاملات میں ماہر سمجھے جاتے تھے اور کل سلطنت انہی کی قابلیت سے چلتی تھی۔ انگریزوں نے نئی تعلیم جاری کرکے دینوی اور دینوی تعلیم کے دو کیمپ بنا دیئے ـــــ اور اپنی دسیسہ کاری سے ثابت کر دکھایا کہ دینی تعلیم صرف بیکار لوگوں کا مشغلہ ہے۔ اصل تعلیم وہ ہے جو دینوی نمونے کی ہے۔ گویا دینی تعلیم کی حیثیت اچھوت تعلیم کی سی ہے۔

پاکستان بن جانے کے بعد ہمیں توقع تھی کہ دینی اور دنیوی کا یہ فرق مٹا دیا جائے گا اور ہماری علمی و تعلیمی روایت کا از سر نو احیا ہوگا اور اس میں مثل سابق عربی و دینی علوم کو مرکزی حیثیت دیکر دنیوی علوم کو ان کے ارد گرد جمع کر دیا جائے گا ـــــ تاکہ دو الگ الگ کیمپ باقی نہ رہیں۔ (اور تخصیصی درسگاہوں کو چھوڑ کر) باقی ساری تعلیم یکجا ہو، اس انداز میں کہ مرکزی طور پر، ہر آدمی محمود الرحمن رپورٹ کے الفاظ میں "مذہب کا آدمی ساہی ہوگا۔ اور مذہب کا ہر آدمی، دوسروں کی طرح دنیا کا آدمی بھی ہوگا۔ کیونکہ وہ جدید تر علوم کا بھی عالم ہوگا ـــ"

افسوس ہے کہ پاکستان کے ماہرین تعلیم انگریزی دور کی غلط روایتوں اور وراثتوں کو چھوڑ نہیں سکے۔ وہ عربی اور دینی علوم کو ایک بڑی کوٹھی کی محض انیکسی (ANNEXE) اور اب تو شاید بالکل فالتو گودام خانہ سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ قومی احیا کے لیے تعلیمی روایات کے احیا کی ضرورت تھی تاکہ ہمارے یہاں پھر شاہ ولی اللہ، اور لطف اللہ مہندس پیدا ہو سکیں۔ پھر علی مردان خاں اور وزیر خاں نمودار ہوں اور وہ کچھ کر دکھائیں جو قدیم تعمیروں کے آثار سے ہمیں معلوم ہوتا ہے ـــــ عربی کو محض ملا پیدا کرنے کا ذریعہ بنانا، عربی علوم کی شدید ترین توہین ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہماری نظر میں، عربی علوم کی تحصیل کا مقصد اس تعلیمی روایت کا احیا ہے جس کو انگریزی تعلیمی حکمت عملی نے ختم کر دیا تھا ہم عربی زبان اور عربی علوم کو مرکزی اہمیت دلوانا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اس کو محور بنا کر، باقی علوم کسی معقول منصوبے کے تحت اس محور کے گرد منظم کر دیے جائیں، تاکہ خطیب سازی اور ملا سازی کی یہ مضحکہ خیز مہم جو غلط زاویہ نظر کی پیداوار ہے ختم ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ مقصد عربی کی موجودہ حیثیت کے ذریعے پورا نہیں ہو سکتا۔ اس وقت سرکاری نظام تعلیم میں عربی کی حیثیت وہ بھی نہیں جو انگریزوں کے زمانے میں تھی۔ نظام تعلیم میں، عربی کی پوزیشن ایک درماندہ اور زبوں حال مضمون کی ہے، انگریزوں کے زمانے میں، کم سے کم ایف اے میں اس کی حیثیت لازمی مضمون کی تھی، اب یہ ایک گرا پڑا مضمون ہے۔ فقط۔

میں عربی کی حمایت میں اور عربی علوم کی مرکزی اہمیت کے بارے میں، بہت کچھ کہہ سکتا ہوں ـــــ مگر میں یہ سب کچھ کس کے لئے کروں؟ یہ باتیں کس سے کروں؟ پرانے زمانے میں دیواروں پر لکھی ہوئی نصیحت کو بھی قبول کر لیا جاتا تھا ـــــ اور یہ بھی سنا ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے تھے ـــــ اب افسوس ہے کہ آدمیوں کے بھی کان نہیں۔ تو ایسے میں یہ باتیں کسے سناؤں؟ بہت سے لوگ محض یہ سنکر ہی دل کی کھڑکیاں بند کر لیں گے کہ میں عربی علوم کو پھر رائج کرانا چاہتا ہوں۔ حالانکہ وہ اب

زسودہ ہوچکے اور نئے مغربی علوم نے ان کی جگہ لے لی ہے ۔ میرا خیال ہے کہ یہی غلط فہمی ، ساری سوء المزاجی کی جڑ ہے ۔

حضرات ! میں نئے علوم کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر رہا ہوں ۔ میں تو فقط یہ کہہ رہا ہوں کہ ملک کا ہر طالب العلم اپنی علمی روایات اور اپنی علمی تاریخ سے باخبر ہو ـــــ اور اس کے ہمراہ نئی علمی ترقیات سے بھی شناسا ہو ۔ اصل مقصد مرکزی نظام اور محور قائم کرنا ہے ۔ محور کے گرد سارے علوم گھوم سکتے ہیں ۔ مگر یہ ساری گفتگو جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی ۔ کیونکہ ان کی انگریزی تربیت نے انھیں یہ سمجھا رکھا ہے کہ عربی علم سے آدمی ملا ہو جاتا ہے ـــــ اور بے خبری ساتھ ساتھ سرگوشی کرتی جاتی ہے کہ تہذیب اس ملک میں صرف انگریز کے دم قدم سے آئی اس سے پہلے ہم نرے جاہل تھے ۔ بس یہی بے خبری سارے فساد کی جڑ ہے اور جس دن ہماری یہ بے خبری دور ہو جائے گی اسی دن ہمارا نظام تعلیم بھی ٹھیک ہو جائے گا ۔

ہمیں بار بار متنبہ کیا جاتا ہے کہ اسلام کے سلسلے میں بھی پہلے باہر دیکھو اور سوچو کہ دنیا میں سائنس کیا کیا معجزے دکھا رہی ہے پھر اس سوچ کے سانچے میں اپنے اسلام کا ناک نقشہ درست کرلو یعنی پہلے اسلام کو نہ دیکھو کہیں سائنس کے آئینے میں اس کا چہرہ ٹیڑھا نظر نہ آئے ۔

ان واعظان با اقتدار کی خدمت میں عرض ہے ، ہم آپ کے ارشاد کے برعکس باہر دیکھنے سے پہلے ، اپنے آپ کو دیکھیں گے ، اسلام کے اندر پہلے جھانکیں گے اس کے آئینے میں دنیا کو دیکھیں گے ۔ اس آئینے میں دنیا کی تاریخ قدیم اپنا چہرہ خود بخود دکھا دے گی ۔ امریکی روسی اسپٹنک سے پہلے ہم اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں گے ۔ دوسروں کے اسپٹنک دیکھتے دیکھتے ، ہماری گردن کی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں ہیں ۔ اور آنکھیں پتھرا گئی ہیں ۔ مگر حاصل کچھ نہیں ہوا ، محتاجی اور ناچاری کی یہ مہم جس قدر جلد ختم ہو [illegible] ہی ہمارے لئے اچھا ہوگا ۔ کم از کم اقبال نے ہمیں یہی سکھایا ہے ـــ !

عربی علوم کے جواز کی گفتگو سے میں اقبال کی خودی پر آگیا ہوں مگر یہ بے محل نہیں ہوا کیونکہ خود اقبال کو سمجھنے کے لئے عربی علوم کی ضرورت مسلم ہے ـــــ ، میرا خیال ہے کہ ہم جس دن اقبال کو سمجھنے لگیں گے اسی دن عربی علوم کی روایت پھر تازہ زندگی پالے گی ، اسی دن ہمارا نظام تعلیم ، صحیح بنیادوں پر استوار ہو جائے گا اسی دن ہم اپنا سپٹنک بنا بھی سکیں گے اور اڑا بھی سکیں گے ، اسی دن یہ احساس جاگ اٹھے گا کہ ہم انگریزوں کے بنائے ہوئے مہذب نہیں بلکہ چودہ سو سال سے مہذب ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ چھوٹا سا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا کہ عزیب مگر مقدس زبان عربی کو ملکی نظام تعلیم میں کہاں کہاں لازمی رکھا جانا چاہیے دعا ہے کہ وہ دن جلدی آئے اور بہت جلد آئے ۔ اور اس دعا کے ساتھ شکریے پر میں تقریر کو ختم کرتا ہوں ۔

## یہ نہایت ضروری ہے

o جواب طلب امور اور مضامین نظم و نثر کی رسید یا واپسی کے لئے ٹکٹ یا جوابی لفافہ بھیجئے ،
o افکار ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں پوسٹ ہوتا ہے ۔ o ۱۰ تاریخ تک پرچہ نہ ملے تو اطلاع ضرور دیں ورنہ دوبارہ پرچہ کی ترسیل ممکن نہ ہوگی o منتخبہ مضامین نظم و نثر سلسلہ وار شائع ہوتے ہیں ، اس لئے کسی بھی تخلیق کی فوری اشاعت پر اصرار نہ فرمائیں ۔

انجم اعظمی

# اردو کا غنائی شاعر مجاز

شاعری کو کتابوں میں تلاش کرنے کی بجائے زندگی میں ڈھونڈا جائے تو شاید ہی ہمارے عہد میں کوئی ایسا شخص ملے جو مجاز سے بڑا شاعر ہو۔ مجاز نے زندگی کے کسی جھوٹ سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا، اسی لئے مجاز کی زندگی اس کے عہد کا سب سے بڑا المیہ بن کر ہمارے سامنے آئی۔ لیکن ایسے شاعر کی آواز میں لذت اور نشاط کا وہ آہنگ کہاں سے آیا، جس نے اسے اردو کا مقبول ترین غنائی شاعر بنا دیا۔ اس سبب کی تلاش بھی مجاز کے عہد اور اس کی شخصیت کو سمجھنے کا ایک ذریعہ ہے۔

مجاز کے ہم عصر شاعر فیض کے ہاں زندگی کی محبت اور قدروں کے شعور پر اُداس فضا چھائی ہوئی ہے جس میں نرمی اور کسک ہے۔ لیکن مجاز کی شاعری کی طرح ولولہ، تڑپ اور بانکپن نہیں ملتا۔ محبت کی شاعری ہو یا فردا کے خواب، مجاز نے آدمی کی ترنگ کو پوری قوت سے زندہ رکھا، البتہ اس کا نتیجہ یوں بھی برآمد ہوا کہ مجاز زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکا۔ کامیاب زندگی گذارنے کے لئے سمجھوتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجاز نے کامیاب زندگی گذارنے سے شعوری طور پر انکار کیا تھا۔ مجاز کی شخصیت میں اس کے عہد کا شاعر جاگ رہا تھا جو زندگی سے سمجھوتا کرنے کے بجائے آوارہ گرد ہو کر ان نغموں کی تخلیق کرتا رہا۔ جو اس کے زمانے کے سب سے سُریلے نغمے تھے اور کچلی ہوئی انسانیت کے لئے آنے والے اچھے دنوں کا پیغام تھے۔ وہ اچھے دن ابھی تک نہیں آئے۔ بعض ادیب اور شاعر جو مجاز ہی کی طرح کسی بڑے تہذیبی انقلاب کے منتظر تھے ایسے ناامید ہوئے کہ زندگی کا ہر جھوٹ انہیں گوارا ہو گیا۔ لیکن مجاز نے کتنے واضح طور پر کہا تھا کہ ابھی انسان نے "خواب سحر" دیکھا ہے۔ جس کے معنی یہ بھی تھے کہ سحر ابھی دور ہے۔ جلد بازوں کا خدا بھلا کرے کہ وہ خواب سحر کی الٹی تعبیریں کرنے بیٹھ گئے۔ دوسری طرف مجاز کے گہرے شعور کا اندازہ لگائیے۔ جس نے سحر کو دور پا کر بھی زندگی اور موت کی بازی قبول کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں محبت کا بانکپن خوش آئند فردا کا جمال اور زندگی کے مصائب سے ہنستے کھیلتے گذر جانے کا حوصلہ ملتا ہے۔

انسان میں ضبط اور شعور ہو تو کبھی کبھی انتظار بھی ایک عبادت ہے۔ انتظار کی یہ کیفیت میر کے غم اور غالب کی

خواب آفرینی دونوں میں یکساں طور پر موجود ہے۔ ہمارے عہد کے شعراء میں فراق کے ہاں اس کیفیت کا اظہار بار بار ہوا ہے لیکن فراق نے شعر کے موضوعات کی باقاعدہ تلاش کی ہے۔ کبھی فطرت کے جمال اور کبھی تہذیب کے چہرے سے روشنی لے کر انسانی روح کے خط و خال اُجاگر کئے ہیں۔ لیکن موضوعات کی تلاش میں اتنی باقاعدگی ہے کہ ہند آریائی صنم اور ساقیانِ افرنگ کا تاثر محاکات سے آگے نہیں بڑھا۔

فیض کے یہاں انتظار کی ایک سوگوار فضا ہے۔ اس سوگواری نے مستقبل پر اعتماد کے اس رنگ کو مدھم کر دیا ہے، جو مجاز کے یہاں بہت گہرا ہے۔ مستقبل پر اعتماد ہی کے نتیجے میں مجاز کو حوصلہ، توانائی اور بانکپن نصیب ہوا۔ اسی اعتماد کی بدولت مجاز نے ایک رند کی طرح زندگی کی رنگوں سے بھری ہوئی پچکاری اٹھا کر اپنی موت پر بھی چھوڑ دی۔ مجاز کا انتظار موت کے بعد بھی قائم ہے۔ کیونکہ یہ مجاز کی انفرادی زندگی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ اس آدمی کا انتظار تھا جو شاعر بن کر مجاز کی ذات میں سما گیا تھا، اور مجاز کے بعد ہماری روحوں میں بیٹھا ہمیں آنے والے زمانوں کے خواب دکھلا رہا ہے

کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے

مجاز کے عہد میں لوگ جس طرف دیکھ رہے تھے، غالب نے شعوری طور پر اسی جانب اشارہ کیا تھا ؎

میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

غالب نے ایک گلشنِ ناآفریدہ کا عندلیب بننا پسند کیا۔ اس ایک مصرعے میں مستقبل کے شعور کے ساتھ ساتھ اپنے عہد سے کتنا زبردست احتجاج ملتا ہے۔ مجاز نے اس گلشنِ ناآفریدہ کی تھوڑی بہت جھلک دیکھ لی تھی۔ اس کی صدی میں دنیا نے بہت بڑی کروٹ لی۔ مارکس، فرائڈ اور آئن اسٹائن کے نظریات نے زندگی کے قدیم ڈھانچے کو مسمار کر دیا۔ اسی لئے غالب کی رجائیت نے مجاز کی شاعری میں گہرے اور روشن اعتماد کی جگہ لے لی۔ غالب کا احتجاج اب زمانے سے ٹکراؤ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مجاز کی نغمگی میں مستقبل کے لئے خوش آمدید کا جذبہ ملتا ہے۔ شاعری کا ہر اچھا طالبعلم تجزیے کے بعد آسانی سے اس کا سراغ پا سکتا ہے۔

اس تجزیے کا ایک فلسفیانہ اور شاعرانہ رُخ یہ ہے کہ حال ایک لمحے کا نام ہے جس کے دونوں جانب ماضی اور فردا کے لامتناہی سلسلے میں یہ ایک لمحہ ماضی اور فردا کے خوابوں سے گراں قدر بن جاتا ہے۔ اسی کو روحِ عصر بھی کہتے ہیں اور لمحے کی ابدیت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ مجاز نے ماضی سے نغمگی، محبت اور اعتماد کی روایت لے کر اس لمحے کو تابناک اور منور کیا۔ مستقبل کو دھند سے الگ کر کے دیکھا اور حال کو ایک چہرہ عطا کیا۔ یہ چہرہ ماضی، حال اور مستقبل کو ایک لڑی میں پروتا ہوا روحِ عصر کا ترجمان بن کر اور اس آدمی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ جس کی تگ و تاز سے اس دیارِ رنگ و بو میں زندگی کے ہر لمحے نے حرارت پائی، اسی لئے مجاز کی شاعری زندگی اور اس کی قدروں کا بھرپور اثبات ہے۔ جس میں زبان و بیان کی روایت کے تسلسل کے علاوہ اس شعری صداقت کا تسلسل ملتا ہے جو کالیداس اور ہومر کے زمانے سے ہمارے عہد تک انسانی محبت کو زندہ رکھ کر زندگی کے تار و پود کو سلجھاتی رہی ہے اور آئندہ بھی معاشرے کو بکھرنے سے بچاتی رہے گی۔

لوگ کہتے ہیں کہ مجاز نے صرف محبت کی زندگی کی ہر قدر سے اور عالم کی ہر شے سے ۔لیکن مجاز نے ہر جھوٹ سے شدید نفرت کی جس کے بغیر محبت نامکمل رہتی ہے ۔کہا جاتا ہے کہ ہر شخص کو کسی نہ کسی جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے لیکن مجاز کی زندگی اس کلیئے کو باطل قرار دیتی ہے ۔ غالب نے سچ کی ماہیت کی بابت لکھا تھا کہ

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

ہم نے یہ عالم مجاز کی زندگی میں دیکھا ہے ۔بے سرو سامانی ہر حال میں اس کا ساتھ دیتی رہی ۔ وہ بے سرو سامانی جو شوق کا نصیب ہے اور جھوٹ سے نفرت کے مترادف ہے ۔ دنیاداروں کی نظر میں مجاز کی اس طرز حیات کی کوئی اہمیت نہ ہو لیکن کتنے ایسے جیالے ہوں گے جو مجاز کی طرح بے سرو سامان زندگی گذارنے پر آمادہ ہو جائیں گے ۔اس کے پس منظر میں مجاز کے وہ خواب تھے ،جو زندگی کے ہر دکھ کا مداوا بن کر آئے تھے ۔

ادیبوں اور شاعروں کا شعور ان کی ذات میں ان کے عہد کے تمام دکھوں کو سمیٹتا ہے اور ان دکھوں کو اپنا کر ہی مسرت کی طرف آدمی اگلا قدم اٹھاتا ہے ۔ یہ مسرت فردا کا خواب بن کر حال میں شامل ہو جاتی ہے ۔ انگلستان کے رومانی شاعر شیلے نے شاید اسی مسرت کو ذہن میں رکھ کر کہا تھا کہ دنیا کے سب سے خوش نصیب افراد وہ سچے شاعر ہیں جو ہزار دکھوں کے دریچے سے مسرت کا رخ زیبا دیکھتے ہیں ۔ یہ مسرت آدمی کی پہچان ہے ۔ اسی کی بدولت غم زندگی کی سب سے بڑی قدر اور شاعری انسانی مسرت کا لازوال خزانہ ہے ۔ میر تقی میر کو زندگی بھر غموں سے واسطہ رہا لیکن ان کے غموں سے اگر کسی مسرت کا تعلق نہ ہوتا تو عظیم شاعری کے لئے حوصلہ وہ کہاں سے لاتے ۔ دلی اجڑ گئی ، دل بھی اجڑ گیا ، لیکن محبوب کے خال و خط میں اور قدروں کے جمال میں انہوں نے عشق کے اس بے پناہ تبسم کو دیکھا تھا ، جو ایک عہد کی تہذیب اور ایک شاعر کی سب سے بڑی خوشی تھا ۔ آدمی کو بڑے سے بڑا دکھ اور ہولناک مصائب کبھی شکست نہ دے سکے ۔ زندگی کے ہر موڑ سے کامیاب گذر جانے والے انسان کی یہی سب سے بڑی مسرت ہے کہ وہ وقت پہ ہمیشہ غالب رہا ہے ۔مجاز کی بے سرو سامانی میں یہ مسرت ہزار رنگ بکھیرتی ہوئی آئی تھی ، اسی کو انسان کا واہانہ پن کہا گیا ہے ۔مجاز کی گفتگو شخصیت اور شاعری کے سارے رنگوں میں یہ انسانی مسرت ترنگ کی صورت میں نمودار ہوئی — فانی کو اپنی قنوطیت کی بنا پر یہ مسرت نہیں ملی ۔ اور ان کی شاعری سمٹ گئی ۔ یہ مسرت ذہن کی وسعت ، زندگی کے رنگوں کے تنوع اور جذبات کی فراوانی کی دلیل ہے ۔ مجاز کی شاعری اور زندگی دونوں میں ہمیں مختلف پہلوؤں سے اس مسرت کے عکس ملتے ہیں ۔

اختر شیرانی ،سلمیٰ کی محبت کے گیت گاتے رہے ۔ یہ محبت امرد پرستی کے خلاف ایک مثبت رجحان کی حیثیت رکھتی ہے ۔اختر کی محبت میں وصل کی لذت شامل نہیں ہے ۔لیکن سلمیٰ کا جسم بہر حال اس کی روح ہی کی طرح خوب صورت ہے ۔ اختر شیرانی سلمیٰ کے خوب صورت جسم کو دیکھتے ہیں اور جسمانی لذت سے الگ کر کے محبت کو ایک روحانی جذبے کی شکل میں پیش کرتے ہیں ، جو اختر کے نظریے کے مطابق ابدیت کا حامل ہے ۔مجاز کی محبت اختر شیرانی سے مختلف ہے ۔ وہ صرف امرد پرستی کے منفی رجحان کی تردید ہی نہیں کرتی بلکہ اس میں محبوب کے جسم کی خوشبو شامل ہے اور اس کی بنیاد جنس اور جنسی تعلقات پر ہے ۔ جن پر ذوقِ جمال کا سایہ ہے ۔ مجاز کے علاوہ فیض ، راشد ، مخدوم

اور سردار جعفری کے یہاں بھی محبت کا یہ ارضی تصور ملتا ہے۔ لیکن مجاز کی محبت کا ایک رُخ اور بھی ہے جو اسے اپنے عہد کے تمام شعرائے سے الگ کرتا ہے۔ یہ محبت کبھی ایک بوسے میں زندہ ہے اور کبھی زندگی داؤں پر لگا کر بھی اس کی قیمت ادا نہیں کی جاسکتی۔ نورا کی محبت ایک لمحے میں زندہ ہے۔ وہ ابدیت کی محتاج نہیں ہے۔ جذبے کی شدت، خلوص، بے ساختگی معصومیت اور احساس جمال کی فراوانی سے اس محبت کے سارے خط و خال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی اخلاق روایات کی کجی پر نورا کی محبت ایک بھرپور طنز ہے۔ اخلاقی روایات بہرحال ہمیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ معاشرے کی اساس میں بد اخلاقی اور بے ایمانی شامل ہے جس کو حد اعتدال میں رکھنے کے لئے اخلاقی روایات کی الگ سے ضرورت پڑتی ہے۔ ورنہ معاشرے کے سماجی، سیاسی اور معاشی اصولوں ہی میں وہ استواری ہونی چاہئے کہ ہمیں اوپر سے اخلاق اصولوں کی ملمع کاری نہ کرنی پڑے۔ اسی لئے نورا کی محبت ایک نئے معاشرے کے خواب تک ہماری راہ ہموار کرتی ہے۔ یہ محبت نئے عہد کے انسان کا ایک سچا اور بے باک تجربہ ہے جو ایک لمحے کے خلوص کو زندگی بھر کے جھوٹ پر ترجیح دیتا ہے۔
اسی خلوص کا دوسرا رُخ مجاز کی وہ محبت ہے جہاں زندگی داؤں پر لگادی جاتی ہے۔

جوش نے جب جامن والیوں اور مہترانی پر نظمیں لکھی تھیں تو لوگوں نے ان پر عریانی کا الزام لگایا تھا، حالانکہ اردو کے صوفی شاعر میر آثر کی مثنوی پر جس میں ؎

کھلتے جاتے ہیں ڈھانپتے جانا
ڈھیلے ہاتھوں سے مارتے جانا

جیسے اشعار کی بہتات ہے کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ تعجب ہے کہ ایک کو کلاسکی شاعری میں جگہ دی گئی، اور جوش کی جنسی شاعری کو عریاں کہہ کر رد کرنے کی کوشش کی گئی۔ کیا اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ جوش کی جنسی شاعری ہمارے معاشرے کی کھوکھلی اخلاقی روایات کو بے نقاب کرتی ہے، اور آثر کی مثنوی اس کے برخلاف صرف وصل اور معاملہ وصل کا بیان ہے۔ مہترانی سے ہمارا برہمنی سماج جو ذات پات اور اونچ نیچ کا قائل ہے اس لئے بھی خفا ہے کہ وہ نیچ ذات کی عورت کو عورت نہیں سمجھتا۔ ہند آریائی تہذیب میں عورت کو دیوی کا درجہ حاصل ہے اس کے باوجود اپنی بے پناہ بے رنگی کے سبب یہ عورت ارضیت میں دوسروں کو خود سے پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ لیکن وہاں بھی عورت سیتا، دروپدی اور پدمنی کے روپ سے آگے نہیں بڑھتی۔ شکنتلا کو بھی دربار میں جائے بغیر چارہ نہ تھا۔ جوش نے پہلی بار مہترانی کے کردار کو طبقاتی تعصب سے الگ کرکے خالص انسانی جذبے کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ جو لوگ شباب سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ اس نظم میں جوانی کی بھرپور عکاسی کی تعریف کریں گے۔ مجاز نے نورا کی محبت میں صرف نسوانی حسن کے غیر طبقاتی تاثر ہی کو پیش نہیں کیا بلکہ جوش سے ایک قدم آگے آکر انسانی خلوص کی سچائی کو ابدیت کی بے معنی قید سے آزاد کرکے انسان کو جینے کا نیا سلیقہ دیا ہے۔ اس محبت میں زندگی گذارنے کا نشہ ہے۔ یہ محبت لذت اور نشاط میں ڈوبی ہوئی ہے، یہ مجاز کے رندانہ کردار کا اظہار ہے۔ وہ رند جو زندگی کو داؤں پر لگا نا بھی جانتا تھا ؎

میں کہ خود اپنے مذاق طرب آگیں کا شکار

اس مصرعہ میں مجاز کے عہد کی محبت کا سب سے بڑا المیہ موجود ہے۔ فراق کی شاعری کا بڑا حصہ عشق کے موضوع

سے متعلق ہے۔ لیکن یہ المیہ مجاز ہی کی شاعری میں ڈھل سکتا تھا۔ یہاں صرف محبت کرنے کا سوال نہیں بلکہ زندگی ایک تاقِ طرب آگیں کے ہم معنی تھی جس نے مجاز کو اپنی بربادی کے غم سے بھی بے نیاز کر دیا تھا ؎

مری بربادیوں کا ہم نشینو!
تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

یگانہ کی شاعری سے انسان کا جو کردار اُبھرتا ہے اس میں بے پناہ طاقت اور حوصلہ ہے۔ لیکن وہ مجاز کی ترنگ اور سرمستی نہیں رکھتا۔ جو اپنی بربادیوں سے بھی بالکل بے پروا اور بے نیاز ہو کر گذر جاتے۔ یہی بے پروائی مجاز کی شاعری میں قدروں کی محبت کو نشاط کے جذبے میں ڈھال دیتی ہے۔ مذاقِ طرب آگیں کی شاعرانہ ترکیب میں مجاز کا مزاج جھلکتا ہے۔ جس نے محبت کو زندگی اور نشاطِ جاں سمجھا۔ اور اسی نشاطِ جاں کے کیف میں اپنی بربادی کے غم سے بے نیاز ہو کر مجاز نے اس المیے کی تخلیق کی جس نے مجاز کو بنگالی ناول نگار سرت چند چٹرجی کے کردار دیوداس اور میتھلی زبان کے شاعر ودیاپتی کی طرح ہماری محبتوں، غموں اور آنسوؤں کی بستی میں آباد کر دیا۔

مجاز اپنی طالب علمی کے زمانے ہی میں ایک اُبھرتے ہوئے شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکا تھا مگر اس شہرت کی بنیاد اس کا خوب صورت فن تھا جس میں بلا کی نغمگی موجود تھی۔ یہ نغمگی اس کے کردار سے براہ راست اُس کے دل میں آئی تھی۔ زندگی اور فن کی مکمل ہم آہنگی کی ایک اچھی مثال مجاز کی شاعری بھی ہے۔ اس کی شاعری میں ہیئت کے تجربے نہیں ملتے۔ کیونکہ مجاز جیسے شعراء ہیئت کے تجربوں کے لئے نہیں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے عہد میں انقلاب کا سب سے بڑا مغنی تھا۔ اس کا مختصر کلام اردو کی بہترین غنائی شاعری کا نمونہ ہے۔ میر کے یہاں عشق اور زندگی کے بڑے غم ملتے ہیں۔ غالب کی فکر ہماری تہذیب کی سب سے بڑی روایت ہے۔ لیکن جو غنائیت ہمیں مجاز کے یہاں مل جاتی ہے اُس کا پوری اردو شاعری میں کوئی جواب نہیں ملتا۔ حافظ فارسی کا غنائی شاعر ہے۔ مجاز اتنا بڑا شاعر نہ سہی لیکن اس کے غنائی لہجے میں جو رس، ترنم اور دل کشی ہے وہ کبھی مر نہیں سکتی۔ وہ اپنی محبوب شخصیت اور خوب صورت شاعری کی بنا پر نوجوانی ہی میں اتنی شہرت حاصل کر چکا تھا جس کی اس کے عہد کے دوسرے اچھے شعراء فیض اور مخدوم کو اُس وقت صرف تمنا تھی۔ فیض آج کے ایک اہم شاعر ہیں۔ لیکن مجاز کی شاعری کا بانکپن اور جمال کسی کے بھی حصہ میں نہیں آیا۔

اب دوسری جنگ عظیم کو گذرے ہوئے بیس سال سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ سرد جنگ نے ساری دنیا کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ایٹمی خطرات سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ معاشی استحصال کا برہنہ کھیل ہر طرف کھیلا جا رہا ہے۔ چین اور روس کی اشتراکی حکومتیں بھی قومیت کے عذاب میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے کی مخالف بنی ہوئی ہیں۔ مجاز کی موت کو بھی دس گیارہ سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس کے عہد کے جاگیرداری سماج کی قدریں دم توڑ چکی ہیں۔ آزادی ملنے کے بعد نو دولتوں کا لایا ہوا صنعتی معاشرہ زندگی کی ہر قدر کو منافع خوری کی بھینٹ چڑھا چکا ہے۔ اس معاشرہ میں جوش کی عظیم شاعری کا سفر جاری ہے۔ اور جدید شاعر عزیز حامد مدنی نے اسے ماضی کی روایت اور مستقبل کے خوابوں سے کٹ جانے سے بچا رکھا ہے۔ یا دوسرے نوجوان شاعر ہیں جو اپنا فرض پورا کر رہے ہیں۔ ان سب کے یہاں مجاز کی

انسان سے بے پناہ محبت اور غیر طبقاتی سماج کی بے لاگ آرزو ملتی ہے۔

یہی مجاز، "اندھیری رات کا مسافر" اور "آوارہ" کا شاعر ہے۔ ؎

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

"آوارہ" جدید اردو شاعری کی ایک بے مثال نظم ہے۔ یہ نظم ایک بے چین اور بے قرار روح کی آواز ہے۔ مجھے اس نظم کو پڑھ کر ہمیشہ غالب کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے۔ ؎

"دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک"

اس نظم میں ایک بے تاب روح کی "خونِ جگر ہونے تک" کی ان کہی داستان بھی شامل ہے۔ "آوارہ" کی صورت میں مجاز نے زندگی سے موت تک کا لائحہ عمل تیار کیا تھا۔ جس میں محبت، غم اور سرکشی کے عناصر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں۔ اس عہد کے ہر مخلص نوجوان کے دل میں "مجاز" موجود ہے۔ اس کی سرکشی نے ایک عہد کو سرکشی کی لذت عطا کی ہے۔ لیکن مجاز بننے کے لئے ہنستے کھیلتے موت کو گلے لگانے کی بھی ضرورت ہے۔ اس کی ہمت شاذ و نادر ہی کسی کو ملتی ہے۔ بھلا یہ ہمت کوئی کہاں سے لائے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب نے یہ مصرعہ مجاز کے لئے ہی کہا تھا ؎

ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

آغا افتخار حسین

# فرانس میں اُردو

پیرس میں مشرقی زبانوں کے مدرسے میں اردو زبان کے پروفیسر کا عہدہ ۱۸۲۸ء میں قائم کیا گیا۔ اور اس پر گارسیں دتاسی کا تقرر ہوا۔ اس سے پہلے کہ گارسیں دتاسی کی تدریس اور تصنیفات کے بارے میں تحریر کیا جائے چند ایسے امور کا مختصراً ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جن کا تعلق اس دور اور ان حالات سے ہے جن کے پس منظر میں اردو زبان کے پروفیسر کا پیرس میں تقرر ہوا۔

گذشتہ شمارے کے مضمون میں پروفیسر لانگلے کا ذکر کیا جا چکا ہے جنھوں نے مشرقی زبانوں کے مدرسے کی بنیاد رکھی۔ پروفیسر لانگلے جن زبانوں سے واقف تھے ان میں اردو بھی تھی۔ چنانچہ گارسیں دتاسی نے اپنے ۱۸۷۵ء کے مقالے میں لکھا ہے جب وہ ۱۸۱۷ء میں پیرس آئے تو انھوں نے پروفیسر لانگلے کے کتب خانے میں ہندوستانی کی اولین کتابیں دیکھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان کی پروفیسری قائم ہونے سے بہت پہلے فرانسیسی مستشرقین اردو میں دلچسپی رکھتے تھے۔ پروفیسر لانگلے کے بارے میں حسب ذیل اقتباس ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس سے نہ صرف پروفیسر لانگلے کی علمی خدمات پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اس حقیقت پر بھی کہ اس زمانے میں جبکہ برصغیر ہند و پاکستان میں برطانوی اقتدار ترقی کر رہا تھا اور فرانسیسیوں کو سیاسی اعتبار سے کوئی خاص دلچسپی اس ملک سے نہیں رہی تھی اس کے باوجود فرانس کی حکومت اور مستشرقین مشرقی زبانوں اور ہندوستان سے باخبر رہنا کتنا ضروری خیال کرتے تھے۔ یہ اقتباس اس اعلان کی تمہید سے لیا گیا ہے جو پروفیسر لانگلے کے درسی پروگرام کے بارے میں شائع کیا گیا تھا۔ فرانسیسی متن کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"معزز شہری لانگلے عرصے سے ہم پر واضح کرتے رہے ہیں کہ سیاسی اور تجارتی مقاصد کیلئے مشرقی زبانوں کے مطالعے کی کیا اہمیت ہے۔ ان کے خیال میں چھ زبانیں اہم ہیں۔ عربی۔ ترکی۔ فارسی ملایائی۔ مور۔ یا ہندوستانی۔ اور تاتار مانچوی جسے چینی زبان کے بجائے سیکھا جا سکتا ہے مصنف موصوف نے اپنے نہایت مفید نظریات دستور ساز اسمبلی کے اس خطبے میں بیان کئے ہیں جو ۱۷۹۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کا مقالہ ایشیائی اور بربری قوموں کی طاقت کی ایک حقیقت پسندانہ تصویر پیش کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ ان مختلف

حکومتوں سے فرانس کی جمہوریہ کو کیا مدد مل سکتی ہے۔ اور یہ کہ ان ملکوں سے تعلقات قائم رکھنے کیلئے اور سفارتی عہدوں پر کام کرنے کیلئے مشرقی زبانوں سے واقفیت کتنی ضروری ہے۔ ا

سب سے زیادہ ہندوستان ہمارے شریک کار کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتا ہے۔

وہ (پروفیسر لانگلے) اس راستے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو مصر کے راستے کسی زمانے میں فرانس نے اختیار کیا تھا۔ چاہے اس کا مقصد تجارت ہو چاہے ان غلطیوں سے سبق سیکھنا جو انگریزوں نے (ہندوستان میں) کی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ قومی کتب خانہ کے قریب مشرقی زبانوں کے خصوصی مدرسے میں کچھ مزید عہدے قائم کئے جائیں۔ تجارتی اور سیاسی دونوں مقاصد کے پیش نظر یہ ضروری ہے[۱]،،

اس اقتباس میں اٹھارویں صدی کے فرانس کے فکر و نظر کے جن گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اس کا اندازہ اہل نظر خود کر سکتے ہیں۔ ہمارے موضوع کیلئے اہم بات یہ ہے کہ اردو زبان کی اہمیت انقلاب فرانس کے فوراً بعد ہی محسوس کی جانے لگی تھی اور اس زبان کو مشرقی ممالک کی اہم زبانوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اس زبان کی اہمیت بڑھتی گئی۔ لانگلے کے بعد جب سلوستر دو تاسی مشرقی زبانوں کے مدرسے سے متعلق ہوئے تو انھوں نے بھی اسکی اہمیت پر زور دیا۔ پروفیسر میل لکھتے ہیں کہ

سلوستر دو تاسی کی رائے میں کلاسیکی مشرقیت کے نقطۂ نظر سے مشرقی زبانوں کے مدرسے کے پروگرام کی تکمیل اردو زبان کی تدریس ہی سے ہو سکتی ہے۔[۲]

اردو زبان کو نہ صرف مشرق کی اہم زبانوں میں شامل کیا گیا بلکہ بعض اہم مشرقی زبانوں پر بھی اردو کو فوقیت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ پروفیسر میل لکھتے ہیں کہ ۱۸۳۹ء میں پروفیسروں کی اسمبلی نے چینی اور ملایائی زبانوں کو جنھیں مشرق کی اہم زبانوں میں شمار کیا جاتا تھا مدرسے کے نصاب کے لئے غیر ضروری سمجھا۔ لیکن:—

"اس کے برخلاف ہندوستانی زبان کو نصاب میں شامل رکھے جانے کی خود مدرسے کی طرف سے تائید کی گئی۔ غالباً اس لئے کہ (یہ زبان) اسلامی تہذیب کی روایات کے زمرے میں شامل تھی اور اسلامی دنیا سے مراسم قائم کرنے کیلئے ضروری خیال کی جاتی تھی[۳]"

---

۱ ملاحظہ ہو "Memoires del'Institute National des Sciences et Arts. Littérature et Beaux-Arts."
جلد چہارم مصنف ولار Villar بحوالہ Jean Deny: L'Ecole Nationale des Langues Orientales Vivantes" صفحہ ۲۳۸

۲ Pierre Meile: "Les Langues de L'Inde à l'Ecole Nationale des Langues Orientales Vivantes" Imprimerie Nationale de Paris 1948. صفحہ ۱۱۳

۳ بحوالہ کتاب مذکورہ صفحہ ۱۱۳

۱۸۲۸ء میں مشرقی زبانوں کے مدرسے میں اردو کی تعلیم کی ابتدا ہوئی اور ۱۸۳۳ء میں باقاعدہ پروفیسر کا عہدہ اس زبان کی تدریس کیلئے قائم کیا گیا۔ اردو زبان کو داخل نصاب کرنے کی بعض حلقوں میں مخالفت بھی ہوئی جسکی مثال ولیوشیم ( DU CHAUME ) کا وہ پمفلٹ ہے جس میں اس نے سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی ہے کہ اردو زبان مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمان عیسائیت قبول نہیں کرینگے۔ اس لئے اس زبان کی ترویج پر روپیہ صرف کرنا بے کار ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ سنسکرت کی سرپرستی کی جائے اس قسم کے تعصب اور مخالفت کے باوجود اردو کو نصاب میں شامل کرنے کا خیر مقدم کیا گیا اخباروں نے اداریئے لکھے۔ اور اردو زبان کی اہمیت پر زور دیا [۱]

اس زمانے میں اردو زبان کو فرانس کے علمی حلقوں میں کتنی مقبولیت حاصل ہو رہی تھی اس کی طرف ایک لطیف اشارہ پروفیسر تسیں نے کیا ہے۔ میں اس اقتباس کے فرانسیسی متن کا ترجمہ اپنے ایک سابقہ مضمون میں دے چکا ہوں [۲] لیکن یہاں اس کا اعادہ ناموزوں نہ ہوگا۔ پروفیسر تسیں لکھتے ہیں۔

"کیا یہ محض اتفاق ہے کہ ۱۸۲۹ء میں (اردو زبان کا) کورس وکتر اوگو کے ORIENTALES کے شائع ہونے کے فوراً بعد شروع ہوا؟ ایسا نہیں ہے۔ یہ اتصال اس دلچسپی کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے جو مشرق سے واقفیت کے بارے میں عوام میں بڑھتی جارہی ہے۔ ORIENTALES کے دیباچہ میں وہ لکھتا ہے " قرون چہاردہم کی صدی "یونانی" تھی۔ موجودہ صدی "مستشرق" ہے"

اس تاریخی پس منظر میں فرانس میں اردو زبان کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ اردو کی پروفیسری پر گارسیں دتاسی کا تقرر ہوا وہ پچاس سال تک اس عہدے پر فائز رہے اور انہوں نے اس زبان کی نہایت شاندار خدمات انجام دیں۔ اردو [illegible] تالیفات اور تصنیفات شائع کیں غالباً اس ضمن میں برصغیر ہند و پاکستان کا کوئی فاضل گارسیں دتاسی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

---

[۱] ۵۲ - ان تحریروں کے بارے میں ملاحظہ ہو میرا مضمون بعنوان "اردو کی بابت فرانسیسیوں کی چند تحریریں" "اردو نامہ" مارچ ۱۹۶۶ء۔

[۲] ۵۳ فرانس کے شہرۂ آفاق شاعر اور ناول نگار وکتر اوگو اس نام کا تلفظ ہیوگو صحیح نہیں۔ فرانسیسی زبان میں H کی آواز الف کی ہوتی ہے ہ کی نہیں۔ Victor Hugo نے عربی، فارسی اور دیگر مشرقی زبانوں کی شاعری سے متاثر ہو کر مشرقی موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ میں نے چند نظموں کا ترجمہ اردو میں کیا ہے جو "بیاضِ مشرق" کے نام سے شائع ہوگا۔

آغا افتخار حسین کی نئی کتاب
یورپ میں اردو
تیار ہے [illegible]

## ابنِ انشا

رات کے خواب سُنائیں کس کو، رات کے خواب سہانے تھے
دھندلے دھندلے چہرے تھے، پر سب جانے پہچانے تھے

ضدّی، وحشی، الہڑ، چنچل، میٹھے لوگ، رسیلے لوگ
ہونٹ اُن کے غزلوں کے مصرعے، آنکھوں میں افسانے تھے

وحشت کا عنوان ہماری، ان میں سے جو نار بنی
دیکھیں گے تو لوگ کہیں گے، انشاؔ جی دیوانے تھے

یہ لڑکی تو اِن گلیوں میں روز ہی گھوما کرتی تھی
اِس سے اِن کو ملنا تھا تو اس کے لاکھ بہانے تھے

ہم کو ساری رات جگایا، جلتے بجھتے تاروں نے
ہم کیوں اُن کے دَر پہ اُترے، کتنے اور ٹھکانے تھے

## جگن ناتھ آزاد

جو تھا دل کا دَور گیا مگر ہے نظر میں اب بھی وہ انجمن
وہ خیالِ دوست چمن چمن وہ جمالِ دوست بدن بدن

ابھی ابتدائے حیات ہے، ابھی دُور منزلِ عشق ہے
ابھی موجِ خوں ہے نفس نفس ابھی زندگی ہے کفن کفن

مرے ہم نفس گیا دَور جب فقط آشیانوں کی بات تھی
کہ ہے آج برق کی راہ میں مرا بھی چمن ترا بھی چمن

نہ تری نظر میں بچے کبھی گل و غنچہ میں ہے جو دلکشی
جو تو اتفاق سے دیکھ لے کبھی خار میں ہے جو بانکپن

ترے بحرِ بخشش و لطف سے جو کبھی ہوئی تھی عطا مجھے
مرے دل میں ہے وہی تشنگی مری روح میں ہے وہی جلن

یہ زمین اور اس کی یہ وسعتیں نہ مری بنیں نہ تری بنیں
مگر اس پہ بھی یہ ہے ضد ہمیں وہ ترا وطن یہ مرا وطن

کروں سیرِ گل کا میں کیا بیاں کہ بس اس قدر ہے وہ داستاں
نہ ترے بدن کی شمیم تھی نہ تھی تیری نکہتِ پیرہن

وہی میں ہوں جس کا ہر ایک شعر اک آرزو کا مزار ہے
کبھی وہ بھی دن تھے کہ جن دنوں مری ہر غزل تھی دلہن دلہن

یہ نہیں کہ بزمِ طرب میں اب کوئی نغمہ زن ہی نہیں رہا
میں اکیلا اس لئے رہ گیا کہ بدل گئی ہے وہ انجمن

مری شاعری ہے چھپی ہوئی مری زندگی کے حجاب میں
یہ حجاب اٹھے تو عجب نہیں بنے مجھ پہ بھی نگہِ وطن

وہ عجیب شعرِ فراق تھا کہ ہے روحِ عالمِ وجد میں
"وہ نگاہِ نازِ زباں زباں، وہ سکوتِ نازِ سخن سخن"

## فارغ بخاری

زمیں سے اُگ کے فلک سے نظر ملاتے ہیں
ہمارے ارض و سما سے عجیب ناتے ہیں

نمو ہیں، رنگ ہیں، خوشبو ہیں، روشنی ہم ہیں
ہوا کے رُوپ میں دھرتی پہ پھیل جاتے ہیں

بہار بن کے بسے ہیں دلوں کے گلشن میں
ہم اپنے بھُولنے والوں کو یاد آتے ہیں

اسی غبار سے اُبھری ہیں منزلیں اکثر
کہ جس کو قافلے راہوں میں چھوڑ جاتے ہیں

ہوا میں رنگ نہ خوشبو نہ نغمگی کا فسوں
ترے بغیر تو موسم بھی رُوٹھ جاتے ہیں

ازل سے گونج رہی ہے جو سازِ ہستی میں
ہم اپنی لَے میں وہی راگنی سناتے ہیں

## افسر ماہ پوری

بیٹھے ہیں ہم مآلِ خریدار دیکھ کر
اب کیا کریں گے گرمیٔ بازار دیکھ کر

وہ بھی کسی کے گیسوئے برہم کا تھا فریب
ہم تو بڑھے تھے سایۂ دیوار دیکھ کر

اُن کی وفا پہ ہم کو بھروسہ تو ہے مگر
ڈرتا ہے جی، زمانے کی رفتار دیکھ کر

راہِ وفا میں آپ کہاں سے نکل پڑے
چلتے ہیں لوگ جادۂ ہموار دیکھ کر

کیا کیا گذر گئی دلِ فرقت نصیب پر
نکہت فروشیٔ گل و گلزار دیکھ کر

شعر و ادب کا قافلہ کس سمت ہے رواں
اہلِ نظر سمجھتے ہیں "افکار" دیکھ کر

افسرؔ، سخنوری سے طبیعت اُچٹ گئی
اپنے وطن میں قسمتِ فن کار دیکھ کر

---

ا؎ رسالہ "افکار" کراچی

## جعفر شیرازی

ارض و سما پہ رنگ تھا کیسا اُتر گیا
آندھی چلی تو شام کا چہرہ اُتر گیا

طوفاں کی زد نہ شورِ تلاطم مجھے بتاؤ
میں موج میں نہیں ہوں کہ دریا اُتر گیا

کیا کیا رہی کنارِ محبت کی دُھن مجھے
جن پانیوں میں اُس نے اُتارا اُتر گیا

اک کش مکش میں اب ہیں سمندر پڑے ہوئے
صحرا کی تہہ میں پھر کوئی پیاسا اُتر گیا

بکھرا پڑا ہے خاک پہ یوں چاندنی کا جسم
جیسے کہ میری رُوح میں تیشہ اُتر گیا

جعفر نہ یہ کبھی مرے وہم و گماں میں تھا
میں اور اُس کے دھیان سے ایسا اُتر گیا

## صادق مصور

اِک موجِ آتشیں میں فضا کو بھی ڈھال دے
تھوڑا سا رنگ اپنی قبا سے اُچھال دے!

نغمہ، شراب، شعر، شفق، چاندنی، بہار
شاعر ترے شباب کی کیا کیا مثال دے!

کب سے کھڑی ہے سر پہ کڑی غم کی دوپہر
سایہ ذرا سا گیسوئے شب گوں کا ڈال دے

ہر آگہی شعورِ خرد کی اسیر ہے
یارب نگاہِ دل کو شعورِ جمال دے

بڑھتے رہیں گے ذہن و مسرت میں فاصلے
چاہے بشر کمند ستاروں پہ ڈال دے

یوں جھانکتا ہے کوئی مرے فن کی اوٹ سے
جیسے افق میں ایک جھلک سی ہلال دے

## سیدہ حنا

سحر قریب ہے اُٹھو کہ گنگناتے چلیں
گلوں کو چھیڑتے، کلیوں کو گدگداتے چلیں
یہیں سے قافلۂ نوبہار گزرے گا
روش روش پہ چلو کہکشاں بچھاتے چلیں
بہار آئی ہے ہم بھی قفس سجا ڈالیں
جگر کے زخموں سے اس کو چمن بناتے چلیں
سُنا رہے ہیں جو صدق و صفا کے افسانے
خلوص ان کا ذرا آج آزماتے چلیں
خزاں کے جَور سے جو لوگ دل گرفتہ ہیں
بہار آنے کا مژدہ اُنہیں سُناتے چلیں
چھُپا کے رُوح میں محرومیٔ دوام کا غم
بڑے غرور سے ہم آج مُسکراتے چلیں
برنگِ موجِ صبا دہر سے گزر جائیں
جدھر سے گذریں ادھر پھول کچھ کھلاتے چلیں
یہ اشک آج جو پلکوں پہ تھرتھراتے ہیں
انہیں سے دل کے اندھیروں کو جگمگاتے چلیں
حناؔ دیارِ تمنّا پہ شام چھائی ہے
حسین یادوں کی شمعیں چلو جلاتے چلیں

## عرفانہ عزیز

ہر نفس وقفِ آرزو کر کے
کچھ بھی پایا نہ جستجو کر کے

مسکراتا ہی کیوں نہ رہنے دو
فائدہ چاکِ دل رفو کر کے؟

سو شگوفے کھلا دیئے دل میں
خندۂ گل سے گفتگو کر کے!

دلِ مشتاق، اے دلِ مشتاق
کیا ملا اُن کی آرزو کر کے!

کتنے نوخیز و نادمیدہ پھول
مر مٹے خواہشِ نمو کر کے

غیرتِ دل نے آہِ سوزاں کو
رکھ دیا سرمۂ گلو کر کے

## شُعلۂ رشک

جستجو سائے کی اب وجہِ سزا ٹھہری ہے
یہ بھی خورشیدِ قیامت کی ادا ٹھہری ہے

دوستو! مان بھی لو وقت کے دستور کا حکم
اب زمانے میں یہی شرطِ وفا ٹھہری ہے

میں تو اب کرب کا مٹتا ہوا پیکر بھی نہیں
جانے کیا دیکھنے مخلوقِ خدا ٹھہری ہے

زورِ دریا ہو تو بہہ جائے ہوا ہو تو اُڑے
زندگی ریت کی دیوار پہ آ ٹھہری ہے

پھول سہمے ہوئے پتوں میں چھپے جاتے ہیں
آ کے گلشن میں جو زہریلی ہوا ٹھہری ہے

کھل نہ جائے کہیں بے نور اُجالوں کا بھرم
تیرگی نور کی دہلیز پہ آ ٹھہری ہے

رضیہ فصیح احمد

# بابو نما صاحب اور حادثہ

ہر حادثے میں کوئی نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے۔ یا تو بہت معمولی حادثے میں سارے مسافر مر جاتے ہیں یا کسی بہت ہی سخت حادثے میں کسی کو خراش بھی نہیں آتی۔ بعض دفعہ ایسے لوگ جنہیں حادثے کو دیکھتے ہوئے مر جانا چاہئے تھا صحیح سالم نکل آتے ہیں اور جن کو زیادہ گزند نہیں آنی چاہئے تھی چپ چاپ چل بسے۔ چنانچہ یہ حادثہ بھی معجزہ تھا کہ گزوں اوپر سے پتھروں کی چٹانوں پر پٹ سے گرنے والی بس میں لوگ زخمی بھی ہوئے مرے بھی۔ مگر ڈرائیور کو ذرا بھی گزند نہیں پہنچی جبکہ عموماً ایسے حادثوں میں ڈرائیور سب سے پہلے مرتے ہیں۔ بابو نما صاحب کے بھی کوئی چوٹ نہیں آئی۔ وہ کاغذ جو انہوں نے لکھا تھا اور جس پر بس کے مسافروں سے دستخط کرائے تھے جوں کا توں ان کے پاس سے نکل آیا۔ اور انہوں نے بڑے فخر سے کورٹ میں پیش کیا۔ ڈرائیور نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اگلے پل پر سے دریا میں کود جائے گا، شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں تھی ——— حادثہ عمداً کیا گیا تھا ———

"انجمن ڈرائیوراں" کے تیور بگڑے ہوئے تھے جھٹ پٹ انہوں نے میٹنگ بلائی اور حفظ ما تقدم کے طور پر پہیہ ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ کوئی بس، کوئی ٹیکسی سڑک پر نہیں تھا۔ بسوں کے اڈے ماچس کی ڈبیوں کی طرح بسوں سے ٹھسا ٹھس بھرے کھڑے تھے۔ ڈرائیور، کلینر، مکینک، ہلپر، گیراجوں میں کام کرنے والے چھوکروں نے حالیہ ہڑتال میں ہونے والے میل سے چیکٹ کپڑے کے سلوگن نکالے ...... اور سڑکوں پر پھرنے لگے۔ "حادثے کی سزا موت نہیں ہوگی" "پھانسی کی سزا ختم کرو"

بقول عمر رسیدہ تبصرہ نگاروں کے یہ سلسلہ "ریکھڑ" اس کاغذ نے پایا تھا جو ان بابو نما صاحب نے ڈرائیور کے خلاف لکھا تھا اور لوگوں سے دستخط کرائے تھے۔ ان بابو صاحب کا یہ نعرہ تھا کہ ایک محکمہ میں جس کا نام لینا مصلحت کے خلاف ہے افسر تھے۔ مگر بیچاروں کی پرسنیلٹی نہیں تھی — اس لئے ہر کوئی بابو سمجھ لیتا تھا اس پرسنیلٹی کے ہاتھوں بیچارے کئی دفعہ رسوا ہوئے۔ اس کو سدھارنے کے لئے جد و جہد بھی کی۔ کبھی مونچھیں کٹائیں، داڑھی بڑھائی۔ کبھی داڑھی منڈائی مونچھیں بڑھائیں مگر وہ بابو بن نہ گیا۔ اور لوگوں نے انھیں پہلی نظر میں کبھی افسر نہ جانا۔ اس لئے مجبوراً انہیں اپنی افسریت جتلانے کی کچھ عادت سی پڑ گئی۔ اب ہوا یہ کہ جس دن یہ اپنی بیوی کے پاس جانے کے لئے بس میں بیٹھے۔ انہیں گھر سے نکلتے نکلتے دیر ہو چکی تھی، ادھر بس نے جیسے نہ آنے کی قسم کھا رکھی تھی جی۔ ٹی۔ ایس کے سنسان اڈے پر کھڑے کھڑے ابدیت کی آخری سرحد پر جا پہنچے۔ مگر بس نہ آئی۔ ہر آنے والی بس کو امید بھری نظروں سے دور سے تاکتے لیکن وہ کہیں اور کی نکل جاتی۔ انھیں بس والوں پر غصہ آنا شروع ہوا۔ جو وقت کا خیال نہیں رکھتے۔ پھر ان لوگوں پر تاؤ آیا جو بس اسٹینڈ پر ایک بنچ اور سائے کے لئے چھتری تک نہیں بنواتے ———

(غصے میں انھیں یاد نہ رہا کہ یہ پکا بس اسٹینڈ نہیں ہے) ابھی غصّے کا زور بڑھ ہی رہا تھا کہ دور سے ایک بس نے اپنا جلوہ دکھایا
ہر بس آتے ہوتے ان کے خیالات پر خنک پھوار اور پاس سے گزرتے ہوئے مٹی کا تیل بن کر گر رہی تھی۔ اسکو دیکھتے ہی خیالات
کی یلغار کم ہو گئی سانس روک کر اس کے نزدیک آنے کا انتظار کیا تاکہ اس کی پیشانی پر لکھی ہوئی اپنی تقدیر پڑھ سکیں۔ نزدیک آئی تو وہ
انھیں اپنے سفر کا ذریعہ نہیں منزلِ مقصود ہی معلوم ہوئی کیونکہ منزلِ مقصود اسکی پیشانی پر درج تھی ——— بس ٹھہری اور یہ اپنا مختصر سا
بیگ لیکر چڑھ گئے۔

کنڈکٹر نے جس نے ان کی پرسنیلٹی سے ذرا سا بھی رعب نہ کھایا تھا بڑھ کر بے نیازی سے پوچھا۔
"کدھر جانا ہے بابو جی؟" بس ملنے کی خوشی میں انہوں نے کنڈیکٹر کی بدتمیزی کو انگیز ہی نہیں محسوس ہی نہیں کیا۔ جگہ
کا نام بتا کر اور ٹکٹ لیکر کھڑکی کیطرف ہو بیٹھے کہ راہ کی دھول اور کانٹے دار جھاڑیوں سے دل بہلاتے چلیں ——
اب جو بس چلی تو دیکھا کہ ایک فوجی کنوائے ہے جو شیطان کی آنت کیطرح گزر رہے ہی چلا جا رہا ہے اسی سمت جدھر
انھیں جانا تھا۔ بڑے بڑے جہازی ٹرک جو کسی اکیسپائرز کے اچانک بلاوے پر بھاگے چلے جا رہے تھے۔ یہ سڑک سے اتر کر
مٹی میں چل رہے تھے کہ سڑک ان کے وزن کے آگے چڑمڑا کر نہ رہ جائے۔ ہر ٹرک کے پیچھے کھلے حصّے میں پانچ چھ سپاہی موٹے موٹے
جوتوں اور لوہے کے خوردوں میں اپ ٹو ڈیٹ اپنے بندھے بستروں سے ٹیک لگائے ٹیڑھے میڑھے بیٹھے تھے۔ انھیں میں
افسروں کی جیپیں تھیں جو وائرلیس سے لیس، ٹریلر کا دُم چھلا لگاتے اڑی جا رہی تھیں۔ ٹریلر میں افسروں کا سامان تھا
جس پر نفاست سے کینوس ڈھانک دیا گیا تھا۔ یہ سب کسی نامعلوم فرضی زنٹ کیطرف بالکل اسی انداز میں جا رہے تھے۔
جیسے سچ مچ "زنٹ" پر جا رہے ہوں۔ سڑک کے پہیّوں کی اڑائی ہوئی خاک بس کے مسافروں کے سینوں میں سمائی جا رہی تھی۔
مگر اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ ٹرکوں کی ایک لائن تھی جس کا اور نہ چھور ——— ٹرک اپنے خیال میں خواہ کیسے ہی چل رہے ہوں
"راکٹ بس سروس" کے لحاظ سے تو رینگ رہے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ اتنا راستہ نہ تھا جو گاڑی والا سر کے اور اپنی بس کو آگے بڑھالے جائے دوسری طرف سے گاڑیاں
بار بار آ رہی تھیں۔ مجبوراً وہ ٹرک کی لائن میں آ گیا اور یوں پھنس گیا جیسے چکی کے پاٹوں کے درمیان کوئی حقیر کیڑا۔ بس میں بیٹھے ہوئے اکثر لوگ منہ بنا رہے تھے ——
اور فوجیوں کو غصّے سے دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ مگر اب کوئی چارہ کار نہ تھا۔ وہ بدقسمتی کی طرح ٹرکوں کے
پیچھے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ بابو نما صاحب بھی اس صورتِ حال سے خاصے مکدّر ہوئے مگر ان کی پیش نہ گئی۔ چند فرلانگ
چل کر ایک گاؤں پر بس ٹھہر گئی۔ میلے تہمد میں گھٹنوں تک کھلی ٹانگوں اور سفید میلی قمیضوں اور چادروں میں عورتوں نے جو چڑھنا
شروع کیا ہے تو چڑھتی ہی چلی گئیں۔ اس کے بعد سفید تہمد اور نیلی قمیضوں میں ان کے آدمی چڑھنے شروع ہوئے تو بس یوں بھر گئی
کہ سانس لینا دشوار ہونے لگا۔ ہر عورت کے پاس دو گٹھریاں اور ہر مرد کے پاس ایک حقہ تھا۔ کنڈکٹر چلاتا رہا مگر یہ سب اپنی جگہ
خود بنا بنا کر بیٹھ رہے۔ بس چلی تو پھر اسی قطار میں پھنس گئی۔ آخر کئی میل چلنے کے بعد جب ایک ریلوے کراسنگ پر ٹرکوں نے اپنا
اپنا رخ موڑا اور سڑک چھوڑ کر ایک طرف مڑ گئے تو سب کی جان میں جان آئی۔ نہ جانے کب سے ٹرک اس سمت میں رواں تھے۔
کہ اس طرف افق پر گرد کے بادل تہہ در تہہ چھائے ہوئے تھے۔
"دیکھا او اسکم چاندی لے ہ" ——— ایک سپاہی نما شخص نے اپنے ساتھی سے گرد کے بادلوں کیطرف اشارہ کرکے کہا۔ اور
بابو نما صاحب نے سوچا کہ واقعی فوجیوں کی زندگی خاصی سخت ہے۔

اس گرد و غبار میں وہ افسر بھی جاتے ہیں جن کے گھر شیشے کی طرح صاف و شفاف اور عجائب گھر کی طرح سجاوٹ کی چیزوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور جن کی پارٹیوں میں جا کر آدمی مبہوت سا ہو جاتا ہے۔ بس رکی تو انھوں نے چونک کر دیکھا۔ سامنے ایک میل لمبا پل تھا اور گاڑیوں کا راستہ دوسری طرف کی گاڑیوں کیلئے کھلا ہوا تھا مگر اس طرف سے بھی کوئی گاڑی نہیں آ رہی تھی اس کا مطلب تھا کوئی بھینسا گاڑی اٹھلاتی بل کھاتی، نباتات درخت کے تنوں سے لدی چلی آ رہی ہو گی۔ ہو سکتا ہے وہ اس وقت پل کے درمیان میں ہو، ہو سکتا ہے ابھی اندر داخل ہی ہوئی ہو۔ اس کی رفتار سے ایک میل کے پل کو پار کرنا، اس کے بعد اس کے پیچھے کی بسیں گزریں گی پھر ان کا نمبر آئے گا۔ آدھ پون گھنٹے سے پہلے کسی طرح چھٹکارا نہیں مل سکتا تھا۔ اور ابھی صرف دس میل پہنچے تھے۔ سورج سامنے کی پہاڑی پر لٹکا ہوا سرخ ہو رہا تھا جیسے سولی پر چڑھا دیا گیا ہو۔ نیچے دریا کے موڑ پر پانی میں اس کا عکس جوں کا توں پڑ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ پہاڑی کے پیچھے غائب ہونے لگا، ابھی پون تھا، ابھی آدھا ہوا، وہ تہائی رہ گیا۔ پھر اس کا ایک کنارہ یوں پہاڑ سے نکلا رہ گیا۔ جیسے کسی خوبصورت بچے کا بسورتا ہوا نچلا ہونٹ، پھر وہ بھی غائب ہو گیا، پہاڑی اور پانی میں اس کے لہو کی سرخی تیرتی رہ گئی

اندھیرا نہیں ہو گیا تو وہاں کس وقت پہنچیں گے ـــــ بابو نما صاحب نے بے چینی سے کروٹ لی اور باہر کے سین سے منہ پھیر کر اندر کر لیا ـــ اس وقت ان کا موڈ نہیں تھا کہ دریا کے بازوؤں میں پھیلے ہوئے کھیتوں کی ہریالی کو دیکھ کر محظوظ ہوتے یا دور گہرے نیلے آسمان پر چبھنے والی گرجا کی نوک کو دیکھ کر سوچتے کہ یہ خدا سے کیا کہہ رہی ہے۔ بس کے اندر ایک قیامت ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ دو چار لڑکے گلے پھاڑ کر کانوں پر چلا رہے تھے۔ مالٹے آنے آنے . . . ! . . . ایک دیہاتی اُبلے انڈوں کی گٹھری اٹھائے بس میں گھوم رہا تھا۔ ایک صاحب انچ بھر کی گول شیشیاں اٹھائے راگ الاپ رہے تھے۔ دانت ہلتا ہو، خون نکلتا ہو، پیپ آتی ہو، مسوڑھا درد کرتا ہو۔ ایک چٹکی اس دوا کی منہ میں ڈال کر رومال سے منہ پونچھ لو آرام آ جائے گا انشاءاللہ دوائی مشہور حکیم نابینا کی بنائی ہوئی ہے۔ تو ایمان والو۔ ایمان چکھنے والے ہم تے شفا دینے والا خدا۔ ہے کوئی صاحب ؟۔....... دھڑا دھڑ شیشیوں کی مانگ شروع ہو گئی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے بس دانتوں کے مریضوں کے لئے ہی مخصوص تھی۔ چونی کے حساب بہت سی شیشیاں بیچنے کے بعد وہ بس کے آگے حصے میں چلا گیا۔

" اے بھائی کنڈیکٹر :۔ اے لڑکی ٹٹی پھرتے گی کیندی ہے ـــــ " ایک عورت نے پیچھے سے صدا لگائی ـــــ

" نہ مائی، ایک منٹ میں کھل جائے گا راستہ۔ چپ کر کے بیٹھ ـــــ " کنڈکٹر نے جواب دیا۔

ایک اور صاحب ہاتھ میں پلاسٹک کا تھیلا اور اس میں ہرے رنگ کی تکونی میٹھی گولیاں بھرے اندر داخل ہوئے ایک آنے میں چار۔ ایک آنے میں چار۔ گولی اندر اور کھک جالندھر اس مذاق پر بہت سے لوگ ہنس پڑے۔ ایک مسافر بولے۔ بھائی ایسا تو نہیں کہ گولی اندر اور دم باہر۔ اس مذاق پر مزید چند لوگ ہنسے اور دھڑا دھڑ ایک آنے میں چار گولیاں فروخت ہونے لگیں۔ یہ گولیاں بھی کسی مشہور حکیم کی بنائی ہوئی تھیں جو نزلہ، زکام، کھانسی سے لے کر تپ دق تک کے لئے مجرب تھیں۔ ذرا سی دیر میں بس شوں غٹرپ، چاپچپ کی آواز سے گونجنے لگی۔ " اے بھائی اتی اک دیر میں تو کڑی آ بھی جاندی " عورت نے پیچھے سے فریاد کی۔ جیب کر مائی نے وہ گڈا آ گیا۔ بس وہ کھلا راستہ " مائی پھر چپ کر گئی ـــــ مالٹے، انڈے، دانت اور کھانسی کی دوائی والے ابھی تک بس کا طواف کر رہے تھے۔ کچھ لوگ ذرا دور جا کر فراغت پاتے اور اپنی چادریں سنبھالتے دوبارہ چڑھ آتے۔ بابو نما صاحب کبھی پل کی طرف دیکھتے کبھی فضا پر چھائے اندھیرے کو۔ دوسری طرف سے گاڑیاں آنی شروع ہو گئی تھیں مگر مائی نے ایک دفعہ دہائی ڈالی " وے بھائی، پھر تو دکھنا سیٹ گندی

کردی ہاں ۔۔۔

اچھا چل چل مائی اتر ۔۔۔ مگر جلدی کرنا ۔۔۔ آخری جملے سے گھبرا کر کنڈکٹر نے کہا ۔ مائی لڑکی کو لیکر سیٹوں سے ٹکراتی ، مسافروں پر گرتی پڑتی نیچے اتر گئی ۔

۔ تو بہ کس قدر رش ٹریفک ہے ۔ یہ لوگ دوسرا پل کیوں نہیں بنواتے ۔ بابو نما صاحب نے غصے سے سوچا کم از کم صنعتی گاڑیوں کے لئے تو ہونا ہی چاہئے جو تیز رفتار گاڑیوں کا وقت کھوٹا کرتی ہیں ۔

پل پر کھڑے ہوئے سپاہی نے سبز جھنڈی دکھائی اور ۔ مائی جلدی کر، رستہ کھل گیا ، چل ، چل چل ، کی آواز سے بس گونج گئی ۔ اب بے چاری مائی عین حالتِ ذاغت میں لڑکی کو کیسے اٹھائے ۔ آخر جب چیخ پکار بڑھتی ہی گئی تو اس نے لڑکی کو زبردستی کھڑا کیا اور کمر بند باندھتی ، گاڑیوں سے کٹتے کٹتے بچتی بس میں چڑھ آئی ۔ جب بس چلی تو بابو نما صاحب نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا مگر پل پار کر کے گاڑی بس کے اڈے پر جاکر پھر جم گئی ۔ چادریں باندھے لوگ اُتر کر ہوٹلوں کے آگے بچھی ہوئی بنچوں پر اکڑوں بیٹھ کر چائے پینے لگے ، کوٹ پتلون پہنے ہوئے اصحاب کاؤنٹر سے لگ کر سگرٹ کا دھواں اڑانے لگے ۔ اب پوری طرح اندھیرا پھیل گیا تھا ۔ اور بابو نما صاحب کے ذہن پر اس کا بے حد برا اثر ہو رہا تھا ۔

یہاں سے چلے تو بس نے صحیح معنوں میں اسپیڈ پکڑی اور لوگ باتوں میں مشغول ہو گئے ۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو آدمی اس طرح بول رہے تھے جیسے ان میں کوئی آٹومیٹک مشین فٹ ہو ۔ پہلے ایک بولتا اور دوسرے کی صرف ہوں ہوں سنائی دیتی ، اچھے خاصے آٹھ دس منٹ گزرنے کے بعد وہ خاموش ہو جاتا اور دوسرا بولنا شروع کر دیتا ۔ بات کس چیز کے متعلق تھی ۔ بس کے شور میں اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا ۔ مگر ان کا اس قدر یکسانی سے باری باری بولنا اتنا مضحکہ خیز تھا کہ باوجود خراب موڈ کے بابو نما صاحب مسکرائے بغیر نہ رہ سکے ۔ ایک سائیں نما شخص جن کی داڑھی نومولود بچے کے عقیقے سے پہلے کے بالوں کی طرح نرم اور بھیگی بھیگی تھی اپنی شبیہ کو بس کے شیشے میں غور سے دیکھے جا رہے تھے ، اپنے آپ کو دیکھ کر وہ کچھ ایسے بے خود ہوئے کہ گانا شروع کر دیا ۔ اور ایک گاؤں والے نے اپنے سر سے پگڑی اتاری اور چادر کی طرح لپیٹ لی ، ذرا دیر بعد اپنے پاؤں بھی سیٹ پر رکھ کر انہیں چھپا لئے ، ذرا دیر گزری تو سر بھی غڑاپ سے چادر کے اندر ، اب یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ کوئی سفید گٹھڑی پڑی ہے یا کوئی آدمی دبکا ہوا ہے ۔ باہر اندھیرا تھا ۔ اندر روشنی تھی شیشوں کے پار کچھ نظر نہیں آ رہا تھا سوائے بس کے اندر کی چیزوں کے عکس کے ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے برابر میں دوسری بس چلی جا رہی ہو ۔ جس میں بے شمار لوگ اوڑھے لپٹے بیٹھے اونگھ رہے ہوں ۔ یا باتیں کر رہے ہوں ۔ ایک چادر باندھے ہوئے ملازم ہر اسٹاپ پر چڑھ رہا اور اتر رہے تھے ۔ ادھیڑ عمر کا ایک پولیس کا سپاہی وردی میں خاموش بیٹھا تھا ۔ سبھی کسی نہ کسی موقع پر کچھ کہتے ۔ مگر وہ خاموش رہتا ۔ کسی گاؤں کے ماسٹر ہاتھ میں کوئی رسالہ دبائے بیٹھے تھے ۔ کبھی کبھی وہ اسے کھول لیتے ، ذرا دیر پڑھتے اور پھر اسی طرح لپیٹ کر بیٹھ جاتے ۔ تین چار آدمی مونگ پھلیاں کھاتے ہوئے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کر رہے تھے ۔ ایک منتخب نہ ہو سکنے والے بی ۔ ڈی اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے شخص کو ہارنے کی داستان سناتے ہوئے ۔ فریقِ مخالف کی زیادتیوں کا حال سنا رہے تھے ۔

اس یکسانیت سے گزرتی ہوئی بس کے پیچھے اچانک زناٹے سے آتی ہوئی دوسری بس نمودار ہوئی اور زن سے برابر سے گزر گئی ۔ یہ وہ بس تھی جو اس بس سے تقریباً ایک گھنٹے بعد چلی تھی ۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ذلانگ بھر آگے بڑھ گئی ۔ بس میں چند نے فقرے

کیسے کہ اتنی دیر بعد چلنے والی بس ہم سے آگے نکل گئی ۔ دفعتاً ڈرائیور کو جیسے تاؤ آگیا ۔ گاڑی تیز ہوئی ۔ تیز اور تیز، دونوں بسوں کا فاصلہ کم ہونے لگا، لوگ سمجھ گئے ۔ مگر کسی نے کچھ نہ کہا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے بس برابر آ گئی ۔ اور دوسری بس سے آگے نکل گئی، اب اس سے آگے ہی رہنے کے لئے اسے کچھ اور تیز کرنا پڑا ۔ پچھلی بس کی رفتار بڑھی تو اگلی بس کی رفتار اس سے بھی تیز ہوئی ۔ وہی بس ۔ جو ایک معقول حد تک آہستہ چل رہی تھی ۔ آندھی طوفان بن گئی ۔ اندھیرے میں دونوں بسوں کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں تھا ۔ اگلی بس کی کشمکش تھی کہ یہ فاصلہ زیادہ ہو جائے ۔ پچھلی بس زور لگا رہی تھی کہ وہ اس فاصلے کو طے کر کے آگے نکل جائے ۔ مسافر سانس روکے بیٹھے تھے ۔ آپس کی باتیں، حالات حاضرہ پر تبصرہ بند ہو گیا تھا ۔ اپنے سراپے کو دیکھ کر گانے والے سائیں بابا نے گانا بند کر دیا تھا ۔ صرف پچھلی سیٹ کی دو ننھی مشینیں اسی طرح بول رہی تھیں ۔ جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوں یا وہ گنٹھری جوں کی توں پڑی تھی

مقابلہ سخت تھا اور جان لیوا ہو رہا تھا کہ یکایک اگلے شہر کی بتیاں نظر آئیں ۔ اور بس اسی تیزی سے چلتی ہوئی جا کر جھٹکے سے بس اسٹاپ پر ٹھہر گئی ۔ اس کے پیچھے دوسری بس بھی رک گئی ۔ بابو نما صاحب جھلاتے ہوئے اترے اور ڈرائیور سے بولے ۔

" تم ریس کیوں کر رہے تھے جی ۔ ؟ "

" کیسی ریس ؟ " اس نے بھولپن سے کہا ۔

" اس دوسری بس کے ساتھ ۔ "

" نہیں جی ریس ویس کوئی نہیں، ایک چائے دے بے ۔ " وہ پاس کے ہوٹل کے نوکر سے بولا ۔

" پھر تم اتنی تیز کیوں چلا رہے تھے ؟ ۔ "

" چڑھائی تھی، چڑھائی پر تیز کرنی پڑتی ہے ۔ "

" مگر تم اس گاڑی سے آگے کیوں نکلے ؟ "

" آگے نکلنے کا ہمارا حق ہے جی ۔ " ڈرائیور نے بگڑ کر کہا، اور بابو نما صاحب کا غصہ بڑھنے لگا ۔

" دیکھو فضول باتیں مت کرو، تم اس سے برابر ریس کر رہے ہو، وہ تم سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ آگے بھی تم ہی کرو گے ۔ "

ڈرائیور نے حقارت بھری نظر بابو نما صاحب کے سر سے پیر تک ڈالی اور بولا ۔ " ہنھ، خواہ مخواہ لے کے پیچھے پڑ گئے ۔ بابو صاحب اپنا کام کرو، دوسروں کے کاموں میں فضول دخل دینا اچھا نہیں ہوتا ۔ "

بابو نما صاحب کا غصہ اور بڑھا ۔ " یاد رکھو ۔ اگر اب ایسا ہوا تو میں جنرل منیجر سے تمہاری شکایت کروں گا، میں ان کا دوست ہوں ۔ "

" ہو گیا بابا کر دینا ۔ " ڈرائیور نے زور سے چسکی لی اور جیسے ہوا کو مخاطب کر کے بولا ۔ " ہنھ، بڑے آئے جنرل منیجر کے دوست ۔ "

اس وقت بابو نما صاحب غصے سے دیوانے ہو گئے ۔ یہ ان کی پرسنیلٹی پر زبردست چوٹ تھی ۔ دوسرے الفاظ میں ڈرائیور نے یہی کہا تھا ۔ " جنرل منیجر کے دوستوں کی شکل ایسی نہیں ہوا کرتی ۔ " وہ پلٹے اپنے بیگ سے ایک کاغذ اور قلم نکالا اور ہوٹل کی مجھی مجھی بتی کی روشنی میں کچھ لکھنا شروع کیا ۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" انھوں نے وہیں کھڑے کھڑے ڈرائیور سے پوچھا۔
آلم غلم خاں —

وہ پھر کاغذ پر جھک گئے۔ "راکٹ بس سروس کی بس نمبر پانچ سو پچپن کے ڈرائیور الم غلم خاں نے اپنی بس گاؤں پھلواڑیاں سے شہر پھلواڑیاں تک خطرناک حد تک تیز چلائی ہے اس دوران میں اس نے ایک پتلے پل پر دوسری بس کو اوور ٹیک بھی کیا۔ مندرجہ ذیل دستخط کنندگان اس کے گواہ ہیں۔" سب سے پہلے انھوں نے کچے کچے خط میں اپنے دستخط کئے یہ بات مشہور ہے کہ افسروں کی تحریریں کچا پن اور بابوؤں کی تحریریں پختگی ہوتی ہے۔ (شکر ہے کہ اس معاملہ میں ان کی تحریر نے ان کی پرسنیلٹی کیطرح ان سے غداری نہیں کی تھی۔) نیچے صاف صاف الفاظ میں انھوں نے اپنی افسریت کی نشان دہی کی اس کے بعد وہ پرچہ لئے جھلاتے ہوئے بس میں داخل ہوئے۔ "دیکھا آپ لوگوں نے، ایک تو اتنی تیز بس چلائی اور اوپر سے بدزبانی کرتا ہے، آپ سب گواہ ہیں کہ اس نے پھلواڑیاں سے یہاں تک کتنی تیز بس چلائی ہے۔ آپ ذرا اس کاغذ پر دستخط کر دیجئے۔ ایسے لوگوں کا کچھ نہ کچھ علاج ہونا چاہئے۔ چالیس پچاس جانوں کو لیکر سنی سٹھ کرتے ہیں، پھر کہتے ہیں ڈرائیور کو موت کی سزا نہیں ملنی چاہئے کہ وہ بے چارہ کیا کرے خدا کی مرضی اور مشین کے ہاتھ کی بات ہے" لوگ چپ چاپ ان کا لیکچر سنا کئے مگر کسی نے کاغذ کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔

"دیکھ لیجئے، اگر آپ نے اس پر دستخط نہ کئے تو انھیں اور شہ مل جائے گی۔ یہاں سے چلتے ہی پھر ریس شروع کر دیں گے" اب کے انھوں نے کاغذ ماسٹر صاحب کی ناک کے آگے بڑھا دیا۔ ماسٹر صاحب نے کچھ لمحے سوچا۔ پھر جیب سے قلم نکال کر اپنے دستخط کر دیئے یہ دستخط بھی انھوں نے بچپن میں کاپیوں کی کاپیاں اس ارمان میں بھری تھیں کہ ایک دن بڑی بڑی رقموں کے چیک پر کیا کریں گے۔ مگر بڑے ہونے کے بعد صرف بچوں کی کاپیوں پر کر کر کے اور بھی منجھ گئے تھے۔ انھوں نے اس تاریخی کاغذ پر کر کے بابو نما صاحب کے حوالے کئے۔ ان کے بعد جب بابو نما صاحب نے دوسرے مسافروں کی طرف کاغذ بڑھایا تو انھوں نے قلم نہ ہونے کا عذر کیا قلم ملنے پر انہوں نے کاغذ پر پری مکھی سی بنا کر چھٹکارا حاصل کیا۔

سائیں بابا کے پاس گئے تو انھوں نے ایک انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور منھ ہی منھ میں کچھ کہہ کر پھر شیشے میں اپنے رخ انور سے محظوظ ہونے لگے۔ ایک منشی جی نے کوئی دومنٹ میں بنا سنوار کر اپنے دستخط کئے۔ فوجی سپاہی نے قلم ہاتھ میں لیکر الٹی طرف سے اپنا نام سیدھا لکھ دیا۔ پولیس کے سپاہی نے ان کی طرف دیکھ کر معاف کرو بابا کچھ اس طرح کہا جیسے وہ کوئی فقیر ہوں غصے سے ان کا حال پتلا ہو گیا۔ آگے بڑھ کر بولے۔

"جو مفت سفر کرے گا۔ وہ کیسے ڈرائیور کے خلاف کچھ کہہ سکتا ہے ابھی اتار جو دے" سپاہی اس توہین کو خاموشی سے پی گیا۔ شاید وہ سچی باتیں پی جانے کا عادی تھا۔

ابھی وہ ایک اور مسافر کے پاس پہنچے تھے کہ ڈرائیور نے آکر زور زور سے ہارن بجایا اور چلا کر بولا "بس بلٹھوجی بہت ہو چکی فوجداری، چلے ہیں لیکر دستخط کروانے۔ ابھی اگلے پل پر گاڑی کو لیکر کود جاؤں گا، دیکھوں گا کیا کر لو گے تم —"

"دیکھا آپ لوگوں نے" بابو نما صاحب نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ اس کو کہتے ہیں چوری اور سینہ زوری، آپ لوگ گواہ رہیں۔ میں یہ الفاظ بھی اس میں اضافہ کر دیتا ہوں۔ انہوں نے کاغذ لے کر یہ الفاظ اصل تحریر کے آگے بڑھا دیئے "ابھی ابھی ڈرائیور الم غلم خاں نے دھمکی دی ہے کہ وہ اگلے پل پر سے گاڑی لیکر کود جائے گا۔" یہ الفاظ لکھ کر انہوں نے بڑے فخر سے کہا

"چلو اب، میں بھی دیکھتا ہوں کون مائی کا لال کود تا ہے پل پر سے "

بس چلدی۔ اب اس میں تکلیف دہ سناٹا تھا۔ صرف پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں آدمی اس طرح باری باری بولے جا رہے تھے۔ کہ اب ان کی آواز بس کے پہیوں کی آواز معلوم ہونے لگی تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ بس اپنے وقت سے کئی گھنٹے لیٹ تھی وہ اب بھی تیز تو ضرور چل رہی تھی مگر آندھی طوفان کی طرح نہیں پچھلی بس بھی معقول حد تک پیچھے تھی اور دونوں میں مقابلے کا کوئی جذبہ نظر نہیں آتا تھا کہ اچانک زلزلہ سا آیا۔ اور بس نے پل کی دیوار پھلانگی اور نیچے دریا کے اندر پڑے ہوئے بڑے بڑے پتھروں کے اوپر یوں جا پڑی جیسے کسی بچے نے پل پر کھڑے ہو کر ٹین کی بنی ہوئی بس نیچے اچھال دی ہو ـــــــ چیخ پکار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ و بکا ۔ ۔ ۔ ۔ نالہ و فریاد اور ذرا سی دیر میں بس کے اندر اور باہر خون ہی خون تھا ۔ . . . . .

"انی جانوں سے یوں کھیلنا ہنسی ٹھٹھا نہیں ہوتا۔ حکومت نے موت کی سزا کچھ سوچ سمجھ کر ہی رکھی تھی۔ اب دیکھوں گا کچو جی کیسے بچتے ہیں " بابو نما صاحب طیش میں ہر ایک کو سنایا کرتے ہیں۔ رہ رہ کر انھیں اپنی حاضر دماغی پر غرور کا دورہ سا پڑجاتا تھا " اسو قت مجھے خوب سوجھا جو میں نے سدی بات لکھ کر سب سے دستخط کروا لئے، ایسے پکے ثبوت کے آگے کسی کی کیا چل سکتی ہے " وہ مارے فخر کے دہرے ہوتے ہوتے کہتے ہیں۔

اس تحریر کے علاوہ اور بہت سے بیانات بھی ہیں، بس کے مسافروں کے بھی، ڈرائیور کے ساتھیوں کے بھی۔ ڈرائیور کی عادت خصلت کے متعلق بھی بہت سے لوگوں سے استفسار کیا گیا ہے تاکہ یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ حادثہ اتفاقی تھا یا جان بوجھ کر کیا گیا تھا۔ خود ڈرائیور نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ اس نے حادثہ جان بوجھ کر قطعی نہیں کیا ہے۔ اس نے تو یونہی جھلا کر بابو نما صاحب سے ایک بات کہدی تھی جیسے عموماً لوگ غصے میں کہہ دیا کرتے ہیں۔ اس وقت اس کے دل میں حادثے کا ذرا سا بھی خیال نہیں تھا۔

انجمن ڈرائیوران کی ہڑتال ابھی تک جاری ہے ۔

نصراللہ خان

# قلم قتلے

## ایک گدھے کا انٹرویو

## جو ریڈیو پاکستان سے نشر نہ ہو سکا

اعلان :- اس وقت ہمارے اسٹوڈیو میں شہر کی ایک معزز شخصیت موجود ہے

(صوتی تاثر - گدھے کی آواز)

اعلان :- ہم مسٹر گدھے سے آپ کی ملاقات کراتے ہیں۔

سوال :- عالی جناب گدھے! آپ کی تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ۔

ذرا یہ تو بتایئے کہ وہ جو آپ کے ساتھ آپ کا ایک ہم جنس ہوتا ہے۔ تو وہ کیوں ہوتا ہے۔

گدھا :- بات یہ ہے کہ کبھی کبھی گاڑی دھکیلنے کے دوران ہمیں یاد نہیں رہتا کہ ہم گاڑی دھکیل رہے ہیں۔ ہمیں یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم گاڑی سے آزاد ہیں۔

لیکن جب اس آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی کو گاڑی سے باہر دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہم گاڑی کے اندر ہیں اور ہم ہی گاڑی کو دھکیل رہے ہیں۔

سوال :- آپ میں اور اونٹ میں عقل کے اعتبار سے کیا فرق ہے۔

گدھا :- یہ فرق سائز کے اعتبار سے ہے۔

سوال :- فن لطیفہ میں آپ کو کون سا فن پسند ہے؟

گدھا :- موسیقی۔ ہمیں گانا سننے سے زیادہ گانا سنانے کا شوق ہے۔ اگر کہئے تو۔

اعلانچی :- جی بہت بہت شکریہ۔ بات یہ ہے کہ ہمارے اسٹوڈیو قابل نہیں ہیں۔

آپ کا گانا ہم نے بہت سنا ہے۔ کیا کہنے۔

گدھا :- آپ کی گدھا نوازی ہے، ورنہ . . . . . گدھا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی

اعلانچی :- معاف کیجئے ـــ ہم نے "گدا" سنا ہے۔ گدھا نہیں سنا۔

گدھا :- قبلہ اگر یہ "گدا" ہوتا تو اس کی شامت کیوں آتی۔ شامت تو بیچارے گدھے کی آیا کرتی ہے۔

اعلانچی :- آپ کو انسان سے کیا شکایت ہے۔

گدھا۔ کسی جانور کو کسی دوسرے جانور سے شکایت نہیں ہے۔ اور ہر جانور کو انسان سے شکایت ہے۔ یہاں تک کہ خود انسان کو انسان سے شکایت ہے۔ میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ جانور جانور ہے یا انسان جانور ہے۔!

عام جانور اور انسان جانور میں یہ فرق ہے کہ عام جانور میں جانوری کا کاروبار کرنے کی عقل نہیں ہوتی اور انسان میں یہ عقل اور عقل بہت ہوتی ہے۔ میں نے اچھے انسانوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ دیسے ان کی تعداد بھی بہت کم ہے اور اچھے انسان دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں۔

سوال:۔ مسٹر گدھے۔ آپ کے خیال میں انسان کو انسان سے کیا شکایت ہے۔؟

گدھا۔ دیکھئے نا! کتا انسان کو اس وقت کاٹتا ہے جب وہ باولا ہو جاتا ہے۔ اور گدھا اس وقت دولتی جھاڑتا ہے۔ جب وہ انتہائی پریشان ہو جاتا ہے۔

اب ذرا انسانوں کو دیکھئے۔

انسان انسانوں پر آئے دن بسیں اور ٹرکیں چڑھاتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے پر چھریاں اور چاقو چلاتے ہیں۔ آپ نے یہ بات گدھوں میں نہیں دیکھی ہوگی۔ آپ نے یہ نہیں سنا ہوگا کہ ایک گدھے نے دوسرے گدھے پر گدھا گاڑی چڑھا دی۔۔ یا ایک گدھے نے دوسرے گدھے کو دولتیوں سے ہلاک کر ڈالا۔ آپ نے ان انسانوں کو بسوں اور ٹراموں میں بھی بیٹھے دیکھا ہوگا۔

سچ پوچھئے تو ان کو بسوں اور ٹراموں میں بیٹھا دیکھ کر گدھے شرما جاتے ہیں۔

ایک کے پاؤں پر دوسرے کا پاؤں ——

ایک کے کندھے پر دوسرے کا سر۔

ایک دوسرے کو دھکیل رہے ہیں اور بس چل رہی ہے۔ اور جو چل رہی ہے وہ بھی کیا چل رہی ہے۔

سوال:۔ اچھا یہ تو بتایئے یہ کتا پاگل ہو کر زیادہ تر انسان ہی کو کیوں کاٹتا ہے۔

گدھا۔ اس لئے کہ کہیں انسان پہلے نہ کاٹ لے۔ کتا وفادار ہے لیکن پاگل ہوتے ہی وہ انسان کی بے وفائی سے ڈرنے لگتا ہے اور سچ پوچھئے تو وہ انسان کی بے وفائی ہی سے پاگل ہو جاتا ہے۔ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ انسان کو جانور نہیں مارتے۔ انسان کو انسان ہی مارتا ہے۔ اور انسان جانوروں کو بھی مارتا ہے۔

انسان اس دنیا میں موت بنتا جا رہا ہے۔ انسان انسانوں کو ایسے کھانے کھلاتا ہے جن کی وجہ سے کھانے والے اور ان کی آل اولاد گھل گھل کر مر جاتی ہے۔ یہ ایک دوسرے کو لوٹتے ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ ایک دوسرے سے مل کر ایک دوسرے کو برباد کرتے ہیں۔ آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ ان انسانوں میں بھی گدھے ہوتے ہیں۔

افسر لوگ —— اپنے ماتحتوں کو گدھا سمجھتے ہیں۔ اور ماتحت اپنے افسروں کو جو سمجھتے ہیں وہ صرف اپنے دوستوں کو بتاتے ہیں باپ بیٹے کو گدھا کہتا ہے۔ استاد شاگرد کو گدھا سمجھتا ہے۔ پولیس والے شہر میں لاٹھیاں لئے گھومتے ہیں۔ کچھ عرض نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں اتنے گدھے نہیں ہیں جتنی لاٹھیاں گدھے بناتی ہیں۔ اس دنیا میں جس کے ہاتھ میں لاٹھی نہیں ہے۔ وہ گدھا ہے ——

سوال:۔ آپ نے ہمارے لیڈروں کو بھی دیکھا۔

گدھا۔ یعنی وہ آپ کی بچپن ا جی خوب دیکھا ہے۔ اور ان کے نئے نئے فیشن بھی دیکھے ہیں۔ اب تو لباسوں میں ایسی عریانی آگئی ہے کہ سڑکوں پہ چلتے ہوئے گدھے بھی چلتے چلتے ٹھہر جاتے ہیں۔ اور
بہت سے تو سڑک ہی پر بیٹ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اونٹ کو سڑک پر کوئی نیا ماڈل دکھائی نہیں دیتا تو وہ فلیٹوں اور چوبارں میں گردن ڈال ڈال کر دیکھتا ہے۔

## سیاسی امراض کا ہمدرد دواخانہ

ہم نے کل رات ایک خواب دیکھا جس میں ہمارے خیال کو بھی دخل تھا ہم نے یہ دیکھا کہ جیسے ہر سیاسی پارٹی نے ایک عورت کی شخصیت اختیار کرلی ہے۔ اور یہ سب خواتین حکیم محمد سعید صاحب کے مطب کے ویٹنگ روم میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ یہ باری باری اندر جاتی ہیں اور اپنا حال سناتی ہیں۔

اب اندر کا نقشہ ملاحظہ کیجیے۔

یہ جو خاتون سب سے پہلے اندر تشریف لائی ہیں۔ یہ پرانے زمانے کا برقعہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ چوڑی دار مشروع کا پاجامہ پاؤں میں زری کی پھٹی سی جوتی۔

حکیم صاحب :۔ محترمہ آپ کا نام ؟

مریضہ :۔ اس ناچیز کو کونسل لیگ کہتے ہیں۔

حکیم صاحب :۔ عمر کیا لکھوں ؟

مریضہ :۔ سرسید کی جوانی۔ اقبال اور سر شفیع کا بچپن تھا جب میں پیدا ہوئی تھی۔

حکیم صاحب :۔ آپ کو کیا شکایت ہے ؟

کونسل مسلم لیگ :۔ میرے اعضا ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دیتے۔
دل بہت دھڑکتا ہے۔ دماغ کام نہیں کرتا۔ لو بلڈ پریشر ہے۔
اور اینیمیا تو ہے ہی۔

حکیم صاحب :۔ نیند کا کیا حال ہے ؟

کونسل مسلم لیگ :۔ نیند اب کہاں سے

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

آنکھ کھلتی ہے تو بوریا بھی دکھائی نہیں دیتا۔

حکیم صاحب :۔ دیکھیے۔ معجون فلاں فلاں چھ ماشے صبح اور چھ ماشے شام کھائیے۔
رات کو سوتے وقت سر پہ بادام روغن کی مالش کروایئے اور رات آرام کرسی پہ استراحت فرمایئے۔ اور ہر قسم کی کرسی سے پرہیز کیجیے۔

اور اب جو خاتون تشریف لائیں تو ان کے آنے سے پہلے کمرے میں خوشبو مہکی ۔ پھر اونچی ایڑی کی سینڈل کی کھٹاکھٹ کی آواز گونجی یہ الھڑ دوشیزہ ہیں ۔ ریشمی ساڑی زیب تن ہے ۔ رخسار گلاب کو شرمانے والے ۔ آنکھیں کنول ۔ چال مستانہ ۔

حکیم صاحب :۔ اسم گرامی ۔ ؟

مریضہ :۔ ہمارا نام کنونیشن مسلم لیگ ہے ۔

حکیم صاحب :۔ عمر ۔ !

مریضہ :۔ کونسی عمر بتائیں ۔ ہماری تو کئی عمریں ہیں ۔

حکیم صاحب :۔ خیر چھوڑیئے ۔ کیا شکایت ہے ؟

کنونیشن مسلم لیگ :۔ بس ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے قویٰ میں اضمحلال نہ آئے ۔ حسن کی دلکشی میں کچھ اور اضافہ ہو ۔

حکیم صاحب :۔ میں دعا کروں گا ۔

کنونیشن مسلم لیگ :۔ اور دوا ؟

حکیم صاحب :۔ آپ کو دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت ہے ۔

دوا تو آپ خود ہیں ۔ بلڈ پریشر کا خیال رکھئے ۔ ضرورت سے زیادہ تندرست مریض کو بڑھاپے میں اسی کا خطرہ رہتا ہے ۔
اچھا خدا حافظ ۔

---

حکیم صاحب :۔ جناب کا نام نامی ؟

مریضہ :۔ عوامی لیگ ۔

حکیم صاحب :۔ آپ کو کیا شکایت ہے ۔

عوامی لیگ :۔ جگر کا فعل خراب ہے ۔ یرقان رہتا ہے ۔ دماغ دل کا اور دل ۔ دماغ کا ساتھ نہیں دیتا ۔
دہنے اور بائیں بازو پر فالج کا اثر معلوم ہوتا ہے اور کبھی رعشہ بھی رہتا ہے ۔
جب مرض زور پکڑتا ہے تو چھ علامتیں ظاہر ہوتی ہیں ۔

حکیم صاحب :۔ آپ کے لئے بھی دعا کروں گا ۔

---

حکیم صاحب :۔ نام نامی کیا لکھوں ؟

مریضہ :۔ جماعت اسلامی ۔

حکیم صاحب :۔ کیا شکایات ہیں ؟

جماعت اسلامی :۔ کچھ اسلامی شکایات ہیں ۔

حکیم صاحب :۔ میں طبیب ہوں اسلامی مشاورتی بورڈ نہیں ہوں ۔
ڈاکٹر حکیم فضل الرحمٰن سے رجوع کیجئے ۔

(باقی صفحہ ۶۸ پر)

آثم میرزا

# اُڑتے بادل کا سایہ

استاد جی ۔ مولا کریم کی قسم ۔ اگر جھوٹ بولوں تو کافر ہو کر مروں ۔ میں کسی جرم کی پاداش میں جیل میں نہیں آیا ہوں ۔ آپ کو جیل کے اس حصّہ کے سارے قیدی ۔ استاد جی کہتے ہیں ۔ اس لئے آپ میرے بھی استاد ہی ہوئے ۔ آپ سے کیا پردہ ۔ ۔ ۔ آپ اپنے تجربے کی بنا پر ٹھیک فرماتے ہیں ۔ کہ اس دنیا میں آنے والا ہر قیدی خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ سو سو طرح سے یقین دلانے کے جتن کرتا ہے ۔ اپنی بے گناہی کا سکہ بٹھانے کی خاطر جھوٹ بولنے میں دوسروں پر سبقت لے جاتا ہے ۔

لیکن آپ تو جہاندیدہ ہیں ۔ آپ کو کسی کی بات پر یقین نہیں آتا ۔ آپ میری بات کو بھی جھٹلا سکتے ہیں ۔ لیکن میں پھر قسم کھا کر کہتا ہوں ۔ کہ میری کہانی میں کوئی ۔ ۔ ۔ مبالغہ نہیں ۔ میں کسی سنگین جرم کا مرتکب نہیں ہوا ۔۔۔ البتہ ۔۔۔ !۔۔۔

لیکن اس " البتہ " سے پہلے میں سارے حالات کیوں نہ بیان کر دوں ۔ ۔ ۔ میں سیٹھ صاحب کی گاڑی چلایا کرتا تھا ۔ وہ رات کو دیر سے گھر آنے کے عادی تھے ۔ جس وقت وہ رنگینیوں کے جھلملاتے عکس کو مدھم ہوتے دیکھتے ۔ تو سازوں کے بے ہنگم شور میں مجھے واپس چلنے کا حکم دیتے ۔ اس وقت ان کی زبان لڑکھڑا رہی ہوتی ۔ ان کا تنفس تیز ہوتا ۔ تھکن کا احساس گہرا ہوتا ۔ اور میں سنبھالا دے کر انہیں کار کی پچھلی سیٹ پر آہستہ سے لٹا دیتا تھا ۔ وہ مجھ پر بہت مہربان تھے ۔ میرا بہت خیال رکھتے تھے ۔ اور میں بھی پوری دیانت داری سے اپنے فرائض سر انجام دیتا تھا ۔ ان کا کوئی راز کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا تھا ۔ بیگم صاحبہ کرید کرید کر مجھ سے انکی بیرونی مصروفیات کے متعلق دریافت کرتی رہتی تھیں ۔ میں ان کے سامنے بالکل انجان بن جاتا تھا ۔ کیا مجال جو میرے منہ سے سیٹھ صاحب کے خلاف کوئی بات نکل جائے ۔ رات کو خواہ کتنی ہی دیر ہو جائے ۔ میں بیگم صاحبہ کے استفسار پر ایک ہی رٹ لگائے رکھتا کہ کاروباری مصروفیت کیوجہ سے دیر ہو جاتی ہے ۔ مجبوری کی حالت میں اتنی دیر تک باہر رہنا پڑتا ہے ۔ ورنہ سیٹھ صاحب تو گھر آنے کے لئے ہر وقت بے چین رہتے ہیں ۔ سیٹھ صاحب جتنے آزاد خیال تھے ۔ بیگم صاحبہ اتنی ہی قدامت پسند تھیں ۔ بے ضرورت کوٹھی سے باہر نہ نکلتی تھیں ۔ کوٹھی پر ہی نوکروں پر حکم چلاتی رہتی تھیں ۔ البتہ ایک بات آج تک سمجھ میں نہیں آسکی ۔ کہ سیٹھ صاحب کی جس حرکت پر وہ خفا ہو جاتی تھیں ۔ ان کی وہ ادا انہیں محبوب معلوم ہوتی تھی ۔ اس کا گہرا عکس اپنی جوان بیٹی سلمٰی کی جوانی میں دیکھ کر ان کی پیشانی پر بل پڑتا تھا نہ خیال آتا تھا ۔ جبکہ سیٹھ صاحب سے غیر حاضری پر شدت سے پوچھ گچھ کی جاتی تھی ۔ لیکن سلمٰی کے کسی پروگرام پر تنقیدی نظر نہیں ڈالی جاتی تھی ۔ اسے گھومنے پھرنے کی کھلی چھٹی تھی اسے نیم برہنہ لباس میں دیکھ کر بیگم صاحبہ ناک بھوں نہ چڑھاتی

تھیں بلکہ جب وہ بن سنور کر باہر نکلتی تو وہ نہال ہو جاتی تھیں ۔ اس کی بلائیں لیتی تھیں ـــــ یہ تضاد بڑا حیران کن تھا۔ بیگم صاحبہ کی شہ پر سلمٰی نوکروں کو تو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ ۔ ۔ دوسرے ملنے جلنے والے بھی اس کے متکبرانہ رویہ سے نالاں تھے ـــــ کسی کے ساتھ اس کا برتاو شریفانہ نہ تھا ۔ میں اس سے بہت دبتا تھا ۔ وقت بے وقت جلی کٹی سنانے سے باز نہ رہتی تھی ـــ میری بدبختی کا آغاز اسی دن ہوا ۔ جب اس نے بیگم صاحبہ کو اپنے لئے نئی کار خریدنے پر رضامند کر لیا۔ وہ ایک کے بجائے چار کاریں خرید سکتے تھے ۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ لیکن تقدیر پر رونا تو اس وقت آیا جب اس نے یہ مطالبہ بھی کر دیا کہ اس کی کار میں چلاؤں گا ـــ جی تو چاہا کہ نوکری چھوڑ دوں ۔ کہیں محنت مزدوری کر لوں لیکن سلمٰی کے قریب نہ رہوں ۔ مگر اس وقت بھی سیٹھ صاحب کی ہمدردی آڑے آگئی ۔ وہ تاڑ گئے تھے کہ میں سلمٰی کے سخت رویہ کو برداشت نہ کر سکوں گا اس لئے انہوں نے مشفقانہ انداز میں مجھے سمجھایا کہ فی الحال میں سلمٰی کے حکم کے سامنے سر جھکا دوں اس میں ان کی عزت محفوظ رہ جائے گی ۔ ۔ ۔ ورنہ بیگم صاحبہ یہی سمجھیں گی ۔ کہ میں تمہیں اپنے پاس رکھ کر کوئی سازش کر رہا ہوں ۔ اپنے کرتوت چھپانا چاہتا ہوں ۔ اس طرح گھر میں فساد برپا ہوگا ۔ گھریلو فضا مکدر ہو جائے گی اور چونکہ میری جائیداد کا بیشتر حصہ بیگم کے نام ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ کاروبار کی ساکھ بھی بگڑ جائے ۔

میں خاموش رہا۔ ان کی حکم عدولی میرے نزدیک جرم تھی اور میں ایسے مہربان مالک کی ناراضگی مول لیکر ساری عمر پچھتانا نہ چاہتا تھا ۔

سلمٰی کے لئے نئی کار خرید لی گئی ۔ اور میں اس کا شوفر بن گیا ۔ پہلے اگر وہ میک اپ پر ایک گھنٹہ صرف کرتی تھی ۔ تو اب تین گھنٹوں میں بھی اس کا بناؤ سنگار ختم نہ ہوتا تھا ۔ جب وہ باہر نکلتی تو بیگم صاحبہ صدقے واری ہوتے ہوئے باہر تک اس کے ساتھ آتیں ۔ یوں معلوم ہوتا جیسے اس کی عزت سلمٰی کے میک اپ کی ہی منت پذیری اس گھر کے وقار کی روشن علامت ہے ۔ دہی انہیں اندھیروں سے نکالنے کا ذریعہ ہے ۔ وہ بے مقصد شہر کے چکر لگاتی رہتی تھی ۔ ہر دوسرے تیسرے دن شاپنگ کے لئے جاتی تھی ۔ ۔ ۔ پندرہ بیس دن کے بعد ایک شام کو وہ مجھے مقبرہ میں لے آئی ۔ چاند طلوع ہو رہا تھا ۔ ہوا میں خنکی تھی اور مقبرے کے ماحول میں عجیب سرور کا احساس ہو رہا تھا ۔ مجھے بھی وہ اپنے ساتھ اندر لے آئی تھی ۔ سبزہ پر ٹہلتے ہوئے اس نے شاہانہ طریقے سے گردن کو جنبش دیکر کہا ۔

" تم جانتے ہو کہ میں نے محض اپنی ضد کی وجہ سے تمہارا انتخاب کیا ہے ! ۔ میں تمہاری جگہ کوئی دوسرا شوفر بھی ملازم رکھ سکتی تھی ڈیڈی بھی تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے ۔ ان سب باتوں کو جانتے ہوئے بھی میں نے کسی کی پرواہ نہیں کی ـــــ کیا تم جانتے ہو ایسا کیوں ہوا ۔ ؟

میں بت بنا اسے تک رہا تھا ۔ اس نے توقف کے بعد کہا ۔

" میں نے تم کو ہمیشہ وفادار اور خدمت گذار پایا ہے ۔ تم کو شاید علم نہیں کہ ڈیڈی کی سرگرمیاں مجھ سے پوشیدہ نہیں ہیں ۔ تم نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا ۔ ان کا کوئی راز کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا ۔ احداب ۔ تم میرے ملازم ہو اور میرے ہر راز کی حفاظت تم پر فرض ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے فرائض پوری طرح دیانت داری سے سر انجام دو گے ۔ ۔ "

میں نے سر جھکا دیا ـــــ میری یہ عادت ہے کہ جس کے سامنے سر جھکا لیتا ہوں ۔ اس کی عزت کی خاطر جان قربان کرنے سے بھی

دریغ نہیں کرتا ۔۔۔ واپسی کے وقت اس کے لہجے میں مٹھاس تھی ۔ اپنائیت تھی ۔۔ اگلے دن شام کو اس کے ایک دوست کے گھر دعوت تھی رقص کا پروگرام تھا ۔ اس کے میک اپ اور لباس کو دیکھ کر کئی بار میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر بے قابو ہو گئے تھے ۔۔۔ اس دن میں نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا تھا ۔ اب میں اس کا راز داں تھا ۔ میری کوئی حرکت اس کے نزدیک معیوب نہ رہی تھی ۔ دعوت کے اختتام پر اس کے ساتھ ایک خوبرو نوجوان تھا اور اس کے بازو کے سہارے کار تک آئی تھی ۔ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے ۔ پہلی بار اور شاید آخری بار میرے سینے میں رقابت کی لہر اٹھی ۔ لیکن جلد ہی میں نے خود پر قابو پا لیا ۔ میں نے اپنی حیثیت کا اندازہ لگا کر اس لہر کو پھیلنے سے روک دیا ۔ میں اپنے مقدر کو سوگوار نہ بنانا چاہتا تھا ۔ جیرنگ کر اس کے قریب اس نے مجھے کار روکنے کو کہا پہلے وہ خود نیچے اتری اور پھر اس نے نوجوان کو یاد د کا سہارا دیکر اتار لیا ۔ وہ نوجوان بدحواس سا دکھائی دے رہا تھا ۔ اس نے التجا کی ۔

۔ ڈارلنگ یہ مجھ پر زیادتی ہے ۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہ رات خوابوں کی تکمیل میں گزر جائے گی ۔ لیکن اب سلطے نے دونوں ہاتھوں میں اس کے رخسار لیکر کہا ۔

" امجد ! ۔ پہلی ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے ۔ کل پھر ملیں گے ۔ " وہ جلدی سے کار میں داخل ہوئی ۔ اور میں نے ایکسیلیٹر دبا دیا ۔۔

اگلی شام جس ہوٹل میں ملاقات کا وقت مقرر ہوا تھا ۔ وہاں ایک اور نوجوان سے ملاقات ہو گئی ۔ پہلے نوجوان کو آنے میں دیر ہو گئی تھی ۔ جب وہ آیا ۔ تو سلطے دوسرے نوجوان کے ساتھ کار میں بیٹھ چکی تھی ۔۔۔۔ وہ وہاں ٹھہرنا نہ چاہتی تھی ۔ کیونکہ وہاں اس کا باپ موجود تھا ۔ اس نے پہلے مجھے ہوٹل کا جائزہ لینے کے لئے اندر بھیجا تھا ۔ وہ اس جگہ ٹھہرنا نہ چاہتی تھی ۔ جہاں اس کے باپ کی موجودگی کا امکان بھی ہو ۔۔ پھر اس کا یہ معمول بن گیا ۔ کہ جس جگہ پہنچتی ۔ وہاں پہلے مجھے ماحول کا جائزہ لینے کے لئے بھیج دیتی ۔ اور جب پوری طرح سے تسلی ہو جاتی ۔ تو پھر وہاں قدم رکھتی تھی ۔۔۔۔ دوسرے نوجوان کے ساتھ فلم کا پروگرام بن گیا تھا ۔ فلم ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ اکیلی باہر نکل آئی ۔ اور کار میں بیٹھ گئی ۔ میں نے کار اسٹارٹ کی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ جیسے وہ نشے میں ہو پھر وہ آگے کی طرف جھک کر بولی ۔

" سب ہی نوجوان ایک جیسے ہوتے ہیں ۔ بے وقوف اور جلد باز ۔ " میں خاموش رہا ۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا ۔

" میرے معیار پر ابھی تک کوئی بھی جوان نہیں اترا ۔ دیکھتے نہیں وہ کیسے خوبصورت اور صحت مند نظر آتے ہیں ۔ لیکن بات کرتے وقت کوئی ناک سکیڑ لیتا ہے ۔ اور کسی کا نچلا ہونٹ ہنستے وقت لٹک جاتا ہے ۔ اگرچہ معمولی سی بات ہے ۔ لیکن میں اسے بہت اہمیت دیتی ہوں ۔ "

پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا ۔ " لیکن ! ۔ تم اس گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے ۔ ۔ یہ کہہ کر اس نے پشت کی جانب سیٹ پر خود کو گرا لیا ۔ اور میں سوچنے لگا یہ کیسی عجیب لڑکی ہے ۔ کسی کے جذبات کو انتہا تک پہنچا کر اسے تڑپنے کے لئے چھوڑ دیتی ہے ۔ اسے اپنے حسن پر بہت گھمنڈ ہے ۔

استاد جی ! وہ واقعی بے حد خوبصورت لڑکی تھی پانی پیئے تو حلق میں سے اترتا نظر آئے ۔ اسے گھمنڈ کیوں نہ ہوتا ۔ سیٹھ صاحب تو کاروباری آدمی تھے ۔ اس لئے ان کا بیرونی پیار بھی کاروباری قسم کا ہوتا تھا ۔ لیکن سلطے کو ایسا نہ ہونا چاہیے تھا ۔ اس کے ہرجائی پن سے مجھے کوفت ہوتی تھی ۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ کسی نئے نوجوان کو رقص میں یا کسی اور

پروگرام میں اپنا ساتھی بنا لیتی تھی اور پھر یوں اس سے علیحدہ ہو جاتی تھی جیسے اس نے کسی پرندے کے پر نوچ کر اسے تڑپتے ہوئے زمین پر چھوڑ دیا ہو۔۔۔ میں نہ جانے کیوں یہ چاہتا تھا کہ وہ کسی ایک کی ہو کر رہ جائے۔ نوجوانوں کو تڑپایا نہ کرے۔ اپنے حسن پر اتنا نہ اترایا کرے۔

ایک جگہ وہ اپنے حسن کے جلووں سے نوجوانوں کے حواس پر شبخون مار رہی تھی۔ کچھ امیرزادے میرے قریب آ کر رک گئے۔ ایک نے سلمٰی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بڑی سنگدل ڈارلنگ ہے۔ اس سے وفا کی امید رکھنا زبردست حماقت ہے"

دوسرے نے کہا۔

"یہ اڑتے بادل کا سایہ ہے۔ اس سے کوئی فیض یاب نہیں ہو سکتا۔"

پہلا گہرا سانس بھر کر بولا۔

"تم نے بہت اچھی مثال دی ہے۔ اڑتے بادل کا سایہ نہ تو کسی مسافر کو سکون بخش سکتا ہے۔ نہ ہی پیاسی زمین کو سیراب کر سکتا ہے"

دوسرے نے اداس لہجے میں کہا۔

"سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بغیر میری زندگی کے ویرانوں میں بہار نہیں آ سکتی۔"

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس نے قیمتی سوٹ پہنا تھا۔ صحت مند اور خوش شکل نوجوان تھا۔ لیکن بائیں آنکھ بھینگی تھی میں نے مسکرا کر دل میں کہا۔ "اے امیرزادے سلمٰی جو کسی کے معمولی سے نقص کو برداشت نہیں کر سکتی۔ تمہاری بھینگی آنکھ پر کیسے نظر ڈال سکتی ہے۔ تم ساری عمر بھی جدوجہد کرتے رہو پھر بھی اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔۔۔ لیکن میں نے اس بھینگی آنکھ والے نوجوان کو جس کا نام سہراب تھا۔ اپنی ضد کا پکا پایا۔ وہ سائے کی طرح سلمٰی کے تعاقب میں لگا رہتا تھا۔ جہاں وہ جاتی۔ سہراب وہیں پہنچ جاتا۔ اس کی مالی حالت سلمٰی سے بہتر تھی۔ اس کا لباس بہت قیمتی تھا۔ اس کی کار بہت لمبی تھی۔ لیکن اس کی قسمت پیار کے معاملے میں زور آور نہ تھی۔ سلمٰی کے سامنے اس کی پیش نہ چلی۔ تو اس نے مجھ سے دوستی پیدا کر لی۔ میں سلمٰی کا راز داں تھا۔ اس کے جھانسے میں کیسے آ سکتا تھا۔ اتنا بڑا آدمی ہو کر وہ میری منتیں کرتا تھا کہ کسی طرح میں سلمٰی کو اس کی طرف راغب کر دوں۔ سلمٰی کے دل میں اس کی جوت جگا دوں۔ میں اس کی حالت پر مسکرا کر رہ جاتا تھا۔ انہونی بات کیسے ہو سکتی تھی۔ کٹی ہوئی شاخ میں پھول کیسے کھل سکتے تھے۔ سہراب کی حالت قابل رحم ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اس پر بڑا ترس آتا تھا۔ لیکن میں سلمٰی کو اس کی طرف جھکنے کی ترغیب دلانے سے معذور تھا۔ اس کے بعد سلمٰی کا وجود میرے لیے انگارہ بن گیا تھا۔ اسے قریب پا کر میرا خون کھولنے لگتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کار کو کسی درخت سے ٹکرا دوں یا دریا میں پھینک دوں۔۔۔۔۔ ایک شام کو وہ یوں بن سنور کر سامنے آئی تھی۔ جیسے ساری کائنات کو پاگل بنا دینا چاہتی ہو۔۔۔ اس نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"سہراب نے غیر ملکی مہمانوں کو ڈنر اور ڈانس کی دعوت دی ہے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اسے کبھی بھی لفٹ نہ دیتی۔ لیکن اب معاملہ دوسرا ہے۔ میں ان مہمانوں کو بیوقوف بنانے کا موقع ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتی"

سہراب کی کوٹھی رنگ برنگے قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ جب گیٹ میں داخل ہوئے تو میں نے محسوس کیا کہ ہم وقت سے بہت پہلے پہنچ

گئے تھے ۔ ہال میں ۔ گیلری میں ۔ برآمدے میں ۔ کہیں بھی کوئی آدمی دکھائی نہ دیتا تھا ۔ نہ کوئی کار ہی کھڑی تھی سلمٰی فتح مندی کے نشہ میں ڈوبی ہوئی تھی ۔ مگر نے پُراسرار سکوت کو شاید محسوس تو کیا تھا ۔ ۔ ۔ کار سے اتر کر وہ بڑی تمکنت سے دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگی ۔ میری سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ روشنیوں کی جگمگاہٹ کے باوجود مہمانوں کے نشیلے قہقہے کیوں خاموش ہیں ۔ اتنی بڑی کوٹھی میں کوئی ہنگامہ پیدا کیوں نہیں ہوا ۔ ابھی تک مہمانوں کی آمد شروع کیوں نہیں ہوئی ۔ میں بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا دروازے تک پہنچ گیا ۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا ۔ میں نے پردہ ہٹا کر اندر جھانکا ۔ سہراب نے سلمٰی کو بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا ۔ اس کا چہرہ خونخوار نظر آرہا تھا ۔ اس نے سلمٰی کو زور سے جھنجھوڑ کر گرجدار لہجہ میں کہا ۔

" میں نے تمہیں یہاں بلانے کے لئے یہ ناٹک کھیلا تھا ۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور دوڑی آؤ گی ۔ تمہارا غرور تمہیں یہاں کھینچ لایا ہے "

سلمٰی نے زخمی شیرنی کی طرح غراتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کی ۔ لیکن سہراب کی گرفت بہت مضبوط تھی ۔ اس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا ۔

" میں تمہارا غرور توڑنا چاہتا ہوں ۔ تم جب اپنے داغدار حسن کے ساتھ کسی کے ساتھ جاؤ گی ۔ تو وہ تمہیں پہچاننے سے انکار کر دے گا ۔

پھر اس نے زور سے دھکا دیکر اسے صوفے پر گرا دیا ۔ اور سلمٰی چیخ پڑی ۔ وہ چیختی چلاتی رہی ۔ اور میں دروازے سے لگ کر کھڑا رہا ۔ میں اس کا ملازم ہوتے ہوئے بھی اس کی مدد کے لئے اندر نہ جا سکا ۔ سہراب نے اسے بازوؤں پر اٹھایا اور باہر نکل آیا ۔ سلمٰی کا چہرہ لہولہان تھا اس کے رخساروں کے زخم کھلے ہوئے تھے ۔

مجھے دیکھ کر سہراب نے کہا " اس کے چہرہ کو بگاڑ کر مجھے سکون حاصل ہوگیا ہے ۔ میں اب ہر سزا کے لئے تیار ہوں ۔ اسے واپس لیجاؤ "

اس نے سلمٰی کو کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا ۔ سلمٰی بری طرح کراہ رہی تھی ۔ اس وقت مجھے اس کی حالت پر ذرا بھی ترس نہ آیا تھا میں بھی خود کو پُرسکون پا رہا تھا ۔ میرا خیال تھا ۔ وہ عبرت حاصل کرے گی ۔ لیکن اس نے مجھ پر یہ الزام لگا دیا ۔ بیگم صاحبہ نے فون کر کے پولیس کو بلا لیا ۔ مجھے ہتھکڑی لگ گئی ۔ بیگم صاحبہ نے میرے چہرے پر تھوک کر کہا تھا ۔

" اس کمینے کو میری نظروں سے دور لے جاؤ ۔ اس نے میری لاڈلی پر مجرمانہ حملہ کیا ہے ۔ "

میں ہونقوں کی طرح بھونچکا رہ گیا ۔ سلمٰی کا یہ نیا روپ بہت حیران کن تھا ۔ سہراب کے خلاف اس نے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا تھا ۔

اگلے دن سیٹھ صاحب مجھ سے ملنے آئے ۔ انہوں نے رحم طلب لہجہ میں کہا ۔ " شریف ۔ تم واقعی شریف ہو سہراب نے میرے سامنے اقبالِ جرم کر لیا ہے ۔ وہ اپنی اس حرکت پر پچھتا رہا تھا ۔ لیکن اب تم پر الزام لگ چکا ہے اس لئے میری عزت کی خاطر تم سب کچھ برداشت کر لو ۔ میں تمہیں منہ مانگا معاوضہ ادا کرنے کو تیار ہوں ۔ "

میں نے ان کے سامنے سر جھکا دیا ۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا ۔ ۔ ۔ اتنا بڑا آدمی مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہے ۔ استاد جی ! غریبوں کے دل نرم ہوتے ہیں ۔ وہ جلد بہلاوے میں آجاتے ہیں ۔ ۔ ۔ میرا جرم بھی عجیب ہے ۔ ۔ لیکن اس کا ایک فائدہ ہوا ہے ۔ کہ سہراب اور سلمٰی کی نسبت طے پا گئی ہے ۔ ۔ ۔ اور اڑتے بادل کا سایہ پیاسی دھرتی کو سیراب کرنے کی خاطر ایک جگہ جسم کر رہ گیا ہے ۔

---

شبیہہ حیدر زیدی

# بزنس

ان دنوں میں ملازمت کے سلسلہ میں بے حد پریشان تھا۔ کچھ عرصہ پہلے جب میں بی اے فائنل کا طالب علم تھا تو مجھے اس وقت بڑی حیرت ہوتی تھی جب لوگ یہ کہتے کہ بھائی نوکری نہیں ملتی۔ ملازمت کی پریشانی ہے۔ وغیرہ وغیرہ ۔۔ اور تب دل میں ہنس کر یہی سوچتا کہ بے چارہ میٹرک ہوگا یا زیادہ سے زیادہ انٹرمیڈیٹ کر کے چھوڑ دیا ہوگا۔ اور اس لمحہ میں اپنے جسم کے اندر سے ایک آواز سنتا کہ تم تو ماشاءاللہ بی اے کر لوگے۔ پھر تو تمہارے پاس دفاتر والے دوڑے چلے آئیں گے کہ صاحب ہم آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ میں نے گریجویشن کر لیا۔ کچھ دن تو انتظار کیا کہ کوئی دفتر والا' کوئی فیکٹری والا میرے پاس آئے۔ لیکن ۔۔ ایسا نہ ہوا اور طالب علمی کے زمانہ میں جمع کی ہوئی پونجی ختم ہونے لگی۔

۔۔۔ جی ہاں میں طالب علمی کے زمانہ سے ہی خاندان کا کفیل تھا۔ وجہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کیونکہ ہمارے یہاں ایسے مجبور لوگوں کی کمی تو ہے نہیں۔ تو جب ٹیوشن وغیرہ سے جمع کی ہوئی رقم ختم ہونے لگی تو میں نے اخبارات میں اشتہار برائے ملازمت دیکھنا شروع کئے۔ اور یقین جانئے کہ کوئی بھی ایسی جگہ درخواست دینا نہ چھوڑی کہ جہاں گنجائش تھی۔ اس دور میں میری جیبوں میں درخواستوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا کہ جب اور جہاں موقع لگا ایک عدد درخواست پیش کر دی ۔۔۔ لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔ ہر جگہ سے وہی جواب ملتا کہ جگہ تو پہلے ہی پُر ہو چکی ہے۔ آپ سے زیادہ کوالیفائڈ لوگ موجود تھے۔

ایک دن جب دوپہر کا آفتاب سخت دھوپ برسا رہا تھا۔ دور سڑک پر سے حرارت کی لہریں بلند ہو رہی تھیں اور سامنے مل کی چمنی سے ہلکا ہلکا سرمئی دھواں فضا میں گھل مل رہا تھا ۔۔ اس وقت مل کے سامنے ایک پان والا' اور ایک پھلوں کے ٹھیلے والا اپنے اڈوں پر بیٹھے ہوئے اونگھ رہے تھے۔ تب میں نے سیمنٹ کے ایک بڑے پائپ کے نیچے بیٹھے ہوئے ۔۔ یہ فیصلہ کیا ۔۔ کہ اگر آج ملازمت نہ ملی تو کل سے پان کا کیبن لگا لوں گا۔ میرے قریب ہی لیٹے ہوئے شخص نے بیڑی سلگا رکھی تھی اور آہستہ آہستہ کچھ گنگنا رہا تھا چہرہ سے بھی خوش معلوم ہوتا تھا' مجھے اس وقت اس کے لبوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ بڑی زہر معلوم ہو رہی تھی۔ ایک بار جب میں نے زور سے ہوں کی تو وہ میری طرف دیکھنے لگا پھر مسکرایا۔ اور کچھ سوچ کر ہنس پڑا۔ میں نے برجستہ کہا۔

"بڑے خوش دکھائی دے رہے ہو! اگر ایسی ہی ہنسی پھوٹی پڑ رہی ہے تو اپنے گھر جا کر کسی کونے میں لحاف میں منہ دبا کر ہنسو کہ کوئی پریشان حال تمہاری ہنسی سے اور زیادہ افسردہ نہ ہو جائے"۔ وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا:

۔۔۔۔۔۔۔۔دوست تمھارے چہرہ پر اس وقت وہی جذبات نظر آتے ہیں جو اب سے کچھ عرصہ پہلے مجھے اپنے چہرہ پر اس لمحہ نظر آتے تھے جب میں اس بات کا اندازہ لگانے کے لئے آئینہ دیکھتا تھا کہ میرے گال اور کتنے پچک گئے ہیں ۔۔۔۔۔۔ہا۔۔۔۔۔۔ہا۔۔۔۔۔۔ وہ ہنسنے لگا۔ اتنے میں مل کی گھنٹی بجی، میں اٹھنے لگا کہ جا کر بھیج دی ہوئی درخواست کا حاصل معلوم کروں

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا، کہنے لگا

"۔۔۔ بیٹھ جاؤ دوست ۔ کوئی فائدہ نہیں، تمھاری درخواست یقیناً رد کر دی گئی ہوگی ۔۔۔"

میں نے کہا ۔ تمھیں کیا معلوم ۔ ؟

بولا ۔۔۔ " معلوم ہے جبھی تو کہہ رہا ہوں ۔ یقین نہیں تو جاؤ دیکھ آؤ ۔ جس شخص کا تقرر آج اس مل میں ہوا ہے ۔۔۔ وہ یقیناً تم نہیں ہو ۔

میں ہاتھ چھڑا کر جانے لگا تو کہنے لگا ۔ " اگر واپسی میں ادھر سے ہوتے جاؤ تو شاید میں تمھاری کچھ مدد کر سکوں ۔"

میں اس کی طرف دیکھے بغیر مل کی جانب چل دیا ۔ وہاں پہنچا تو وہی جواب ملا ۔ جو کہ اب سے پہلے کئی جگہ اور مل چکا تھا ۔۔۔ افسردہ اور پریشان سا میں واپس آ رہا تھا کہ اسی پائپ کے نیچے سے آواز آئی ۔۔۔ " دوست تھم جاؤ ۔ میں تمھاری پریشانی دور کر سکتا ہوں، میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں

میرے منہ میں کڑوا کسیلا لعاب جمع ہو گیا تھا، میں نے پائپ کے اوپر پچکاری مارتے ہوئے کہا

"۔۔۔ تم ۔۔۔ تم کیا مدد کر سکتے ہو میری ۔"

کہنے لگا ۔ " ملازمت دلوا سکتا ہوں ۔۔۔" اس کا لہجہ پُرسکون تھا اور وہ بے حد مطمئن نظر آ رہا تھا ۔

میں نے سوچا کہ چلو اسے بھی آزمائے لیتے ہیں ۔ اگر آج شام تک کوئی امید نہیں نظر آتی ہے تو کل صبح سے پان کا ٹھیلہ ہوگا اور میں ہوں گا ۔"

۔۔۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آ گیا ۔ بولا " آؤ میرے ساتھ چلو، میں تمھیں ایک ایسے شخص سے ملواتا ہوں جو یقیناً تمھیں نوکری دلا دے گا ۔

میں خاموشی سے ساتھ ہو لیا ۔ مجھے وہ شخص اس وقت، طویل اندھیری راہوں پر ٹمٹماتے ہوئے میونسپلٹی کے چراغ ایسا نظر آ رہا تھا کہ جس میں تیل ختم ہو جانے کا ہر لمحہ خدشہ ہوتا ہے ۔۔۔ بہرنوع وہ مجھے ایک بہت بوسیدہ مگر بلند و بالا عمارت کے قریب لے آیا ۔ پھر آہستہ سے میرے کان کے قریب منہ لا کر سرگوشی کی ۔

"۔۔۔ یہ تو بتاؤ کہ تمہارے پاس کچھ پیسہ ویسہ ہے ۔۔۔ ؟

میں نے پوچھا ۔ " کیوں کیا اس کی بھی ضرورت پڑے گی ؟ ۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسا ۔ " ضرورت پڑے گی کیا معنی ؟ ۔ یعنی اس دنیا میں کوئی چیز بغیر اس کے بھی ہو سکتی ہے ۔۔۔ اگر ایسا ہو تو ہمیں بھی بتاؤ ۔۔۔"

میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا ۔۔۔ وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے اوپر چڑھنے لگا ۔ میں اس کے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگا ۔ ٹوٹے ہوئے لکڑی کے زینوں پر بھر پڑنے سے جو آواز پیدا ہو رہی تھی وہ بلا واسطہ میرے ذہن پر ہتھوڑے کی ضربیں

کی طرح پڑ رہی تھی۔ اور دل میں ایسی کیفیت پیدا کر رہی تھی کہ جیسی اس وقت ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص بس میں بیٹھ کر ایک پلیا پر گذرے ۔۔۔ ایک پر اسرار سی کیفیت۔ کیونکہ اس شخص کی باتوں سے مجھے اتنی ہی امید ہو چلی تھی جتنی اس بس کے مسافر کو ہوتی ہے کہ یہ بس یقیناً اس پلیا پر سے گزر جائے گی۔ فرق صرف یہ تھا کہ دل کے بیٹھنے کی سی یہ حالت بس کے مسافر کی اس وقت ہوتی ہے جب وہ دوسری طرف پہنچ جاتا ہے' اور یہاں اس وقت ہو رہی تھی کہ جب میں اوپر چڑھ رہا تھا۔۔۔ اور ملازمت کے ملنے کا قوی امکان تھا۔

ایک ٹوٹے سے کیبن کے سامنے پہنچ کر ہم دونوں ذرا ٹھہرے۔ میں نے بورڈ پڑھا' لکھا تھا" لوکل ایمپلائمنٹ ایجنسی"۔ ذرا حیرت ہوئی۔ لیکن اس کے اظہار سے پہلے ہی اندر داخل ہو چکے تھے۔ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر تھا اور سامنے میز کے دوسری طرف ایک بھدا اور موٹا سا آدمی بیٹھا ہوا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ نظر ملتے ہی میں نے اسے سلام کیا۔۔۔ وہ میرے ساتھی کو دیکھ کر بولا

۔۔۔۔ حمید ۔۔۔۔ کہو کیسے آئے ۔۔۔ اور ہاں ۔۔۔ آپ کی تعریف ۔' وہ میری جانب کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔۔۔'

" ۔۔۔ یہ میرے دوست ہیں ۔۔۔ یہ بھی میری طرح پریشان ہیں ۔۔۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جیسے نوکری ملنے سے پیشتر میں پریشان تھا ..... اگر ۔۔۔ آپ ان کی بھی میری طرح مدد کر سکیں تو . . . ہیں ہیں۔" وہ انکساری' عجز اور احسان مندی کے ملے جلے جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔

موٹے آدمی نے ایک طویل سانس لیا۔ جیسے کہ کسی کا منتظر رہا ہو اور اب انتظار کی مدت ختم ہوئی ہو۔ اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ پھر حمید کو اشارہ کر کے باہر چلا گیا۔ حمید بھی چلا گیا۔ کچھ دیر بعد حمید اکیلا ہی واپس آیا' کہنے لگا۔ یار۔ یہ صاحب تو کافی پیسہ مانگ رہے ہیں۔ ملازمت دلوانے کا۔۔۔

میں نے ذرا حیرت سے پوچھا۔' پیسہ۔۔۔ تو کیا یہ ملازمت حاصل کرنے کی ایجنسی ہے ؟

۔۔۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ بولا۔" جو چاہو کہہ لو ۔۔۔ ہاں البتہ معاملہ کی بات کرو

ایک لمحہ کے لئے میرے دل کے قریب کوئی چیز اچھلی اور دھم سے نیچے جا پڑی ۔۔۔ میں نے سوچا اگر بقایا سو روپیہ بھی ضائع ہو گیا۔ تو ...... لیکن پھر میں نے سو روپیہ سے زیادہ مستقبل کو اہمیت دی ۔۔۔ اور

"۔۔۔ آخر کتنا پیسہ درکار ہوگا۔۔۔ اور یہ تو بتاؤ کہ طریقہ کار کیا ہوگا۔۔۔ ملازمت کی نوعیت کیا ہوگی ؟

وہ ٹھہر کر بولا۔' ملازمت کرنی ہے یا ملازمت سے پہلے جو پریشانی ہے وہ ہی تمہیں پسند ہے ؟

میں ذرا اکھڑ گیا۔۔۔ وہ بولا" بولو ۔۔۔ کتنا پیسہ دے سکتے ہو ۔۔۔ یاد رکھنا مستقبل بن جائے گا۔ زندگی بھر عیش کرو گے۔ ہاں!

میں نے کہا" بھائی ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میرے پاس کچھ اوپر سو روپیہ ہے" جتنا تم کہو اتنا دے دوں ۔۔۔"

وہ بے تحاشہ ہنسنے لگا۔ بولا" ارے یار بلا وجہ اتنی تکلیف کی' وہیں کہہ دیتے تو یہاں آنا ہی نہ پڑتا۔ کہیں سو روپیہ میں بھی ملازمت ملی ہے ۔۔۔ پانسو چاہیئے کم از کم پانسو

میری آنکھیں حیرت کے مارے کھلی رہ گئیں۔ گویا ملازمت نہ تھی کوئی گائے بھینس تھی کہ جس کی قیمت چکائی جا رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اٹھ کر چلدوں لیکن وہ بھی ایک ہی کائیاں تھا اور پھر بیوپاری ہوتا ہی ہے' میرا ارادہ بھانپتے ہی بولا۔۔۔

"۔۔۔ دوست ایک ترکیب ہے ۔۔۔ نوکری بھی مل سکتی ہے' اور تم پر بار بھی زیادہ نہیں پڑے گا۔"

میں نے مرے دل سے پوچھا " وہ کیا ؟ کہہ دو تاکہ اتمام حجت ہوجائے "
کہنے لگا " سو روپیہ ابھی دیدو یعنی بوقت تحریر' باقی چار سو روپیہ ہر ماہ کی تنخواہ میں سے پچاس فی صد کے حساب سے دیتے رہنا۔ دیکھو یہ ناقاعدے کی بات 'قسطوں پر تو چیز نقد سے ڈیوڑھے میں ملتی ہے' لیکن یہاں وہی ریٹ ہے۔ کم نہ زیادہ ۔"
یہ کچھ سوچ کر منظور کرلیا ۔۔ وہ دوڑا ہوا گیا۔ اور ان موٹے صاحب کو لے آیا جنھیں میں پہلی نظر میں منیجر' دوسری نظر میں جو کہ تصوراتی تھی' ہیڈ کلرک' اور اب یعنی تیسری نظر میں دلال سمجھا تھا۔ یہ مجھ پر بعد میں واضح ہوا کہ دلال غلط لفظ ہے' ایجنٹ کہنا چاہیئے۔ تو خیر وہ صاحب بے حد خوش خوش آئے' اور مجھ سے مصافحہ کرکے بولے۔۔۔
۔۔ آپ واقعی ایک سمجھدار آدمی ہیں۔۔ یقیناً آیندہ بہت کامیاب رہیں گے " میرا مطلب ہے کہ سے کلرکی وغیرہ یا میکانکی کام۔۔'
اس نے ایک لسٹ نکال کر میرے سامنے رکھدی' ٹائپسٹ' اسٹینو' کلرک جونیئر اور سینیئر۔ میکنک مختلف اقسام کے ۔ فورمین وغیرہ۔ ہر قسم کی پوسٹ تھی۔ اس وقت میں کسی بھی قسم کی نوکری کرنے کو تیار تھا۔ وہ آدمی شاید میرے اس ارادے سے واقف ہوگیا' کہنے لگا۔
' سچ بات تو ہے کہ ان دنوں ملازمتیں ہیں ہی نہیں۔۔ یہ دو چار جو باقی رہ گئی ہیں یہ بھی کل تک پر ہو جائیں گی۔ آپ جانیں! آجکل ملازمت چھوڑتا کون ہے جو جگہ خالی ہو۔۔ پھر بھی آپ اپنی مرضی کی نوکری پسند کرلیں۔ عام طور پر . . . . . .
میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا " لیکن صاحب یہ رقم ۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔ وہ . . . . . میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں ۔۔ کہ حمید بول پڑا۔۔
۔" آپ کو ملازمت کرنی ہے یا ان جھمیلوں میں پڑنا ہے۔ معاملہ کی بات کرو' ورنہ بلاوجہ وقت خراب کرنے سے کیا فائدہ "
میں نے دیکھا کہ بات کچھ بگڑ رہی ہے' تو خاموش ہوگیا۔ لیکن ایک سوال میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا کہ ان پانچسو روپیوں کا کیا ہوگا۔ کس کس کو حصہ ملے گا۔۔
وہ موٹا آدمی۔۔ اس دوران میں سگریٹ سلگا چکا تھا۔۔ ایک مجھے دیتے ہوئے بولا۔۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اتنے پیسوں میں عام طور پر جونیئر کلرک بنواتے ہیں' لیکن اگر آپ کو ٹائپ آتی ہے تو سینئر کلرک کی جگہ دلوا دیں گے
مجھے یقیناً ٹائپ آتی تھی۔ میٹرک تک باقاعدہ سیکھی تھی ۔ میں نے اسے بتایا کہ ٹائپ جانتا ہوں چنانچہ بات ختم ہوگئی۔۔ میں نے منظور کرلیا . . . . . پھر مجھ سے پانچ روپے والے ایک اسٹامپ پر دستخط کروائے گئے' اس پر لکھا تھا کہ ہم دونوں کا سودا ہوگیا ہے' سو روپیہ نقد بوقت تحریر لیا جاتا ہے۔ بقیہ مال اٹھوانے کے بعد قسطوں میں ادا کیا جائے گا۔
تیسرے دن سے میں آفس جانے لگا۔ ایک پرائیوٹ فرم تھی۔ میرے علاوہ دس کلرک اور تھے ۔ میری تنخواہ ڈیڑھ سو روپے طے پائی ۔ لیکن ایک معمہ میری سمجھ میں اب تک نہ آیا تھا۔۔ ایک دن جب حمید میرے بڑے صاحب' یعنی ہیڈ کلرک کے پاس آیا' تو جاتے ہوئے میں نے اسے پکڑ لیا۔ میں نے کہا " کیوں بھائی وہ پیسہ آخر ملا کس کو۔۔ اور یہ ملازمت مجھے کیسے ملی۔ جب کہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے کم و بیش دو سو درخواستیں اپنی پوسٹ کے لئے آفس فائل میں دیکھی ہیں۔ جواب الماری میں بند کر کے رکھدی گئی ہیں۔۔ وہ ہنسنے لگا۔ بولا " یہ سب بازیگری ہے استاد۔۔ تم چاہو تو تم بھی کر سکتے ہو۔۔ ذرا محنت کی ضرورت ہے

بہت اچھا بزنس ہے ۔"

میں نے سوچا کہ بزنس تو اچھا ہے ۔ لیکن طریقہ کار میری سمجھ میں اب تک نہ آیا تھا ۔ حید کی باتوں سے کچھ کچھ اندازہ ہوا تھا ۔ لیکن اس نے تفصیل نہیں بتائی ۔

کچھ دن گزرے کہ مجھے ہیڈ کلرک صاحب نے بلوایا ۔ کہنے لگے " ہم جو کچھ کرتے ہیں ۔ مل جل کر کرتے ہیں ۔ میرا مطلب ہے کہ اس میں آپ بھی شریک ہو سکتے ہیں

میں حیران تھا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں ۔ وہ ذرا کچھ ٹھہر کر بولے " واقعہ یہ ہے کہ اختر صاحب جن کے ذریعہ آپ یہاں تک پہنچے ہیں ان کی وجہ سے مجھے کافی نقصان ہو رہا ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اور آپ پارٹنر شپ میں یہ بزنس کر لیں ۔ کیا خیال ہے ۔" وہ زور زور سے ہنسنے لگے ۔ میں بھی ہنسنے لگا ۔

اب آپ یقین جانیئے کہ دل تو میرا ایسے کاروبار کرنے کو نہیں چاہتا' لیکن آمدنی چونکہ اچھی ہے ۔ گویا ہر ہفتہ ایک آدھ پوسٹ خالی کرائی جاتی ہے' ہیڈ کلرک صاحب کو بہت سے اچھے اچھے بہانے یاد ہیں ۔ جٹ سے نوکری سے نکلوا دیتے ہیں ۔ اور پٹ سے اپنا آدمی فٹ کر لیتے ہیں ۔ آدمی مہیا کرنا میرا کام ہے ۔ دو سو' چار سو' پانچ سو جو کہ عہدے کے لحاظ سے مقرر اور معین ہیں ۔ وہ میں اور ہیڈ کلرک صاحب مل بانٹ کر کھا لیتے ہیں ۔ اوپر والے جانتے بھی نہیں کہ کیا ہو رہا ہے ۔ اور یہ بھی کیا ہو رہا ہے ۔ اتنی پریشانی اتنی کلفت' اتنی صعوبتیں تو ہر شخص دو چار سو روپیہ میں بیچنے کو تیار ہو جاتا ہے ۔ ہم سب خرید لیتے ہیں' اسے خوشی اور سکون مہیا کر دیتے ہیں ۔ ہاں یہ بات ضروری ہے کہ اپنے گاہک یا خریدار کو یا جو چاہے کہیئے ۔ سمیٹنے کے لئے بعض اوقات مجھے بے حد لائق لوگوں کی درخواستیں جلا دینی پڑتی ہیں ۔ لیکن ہر بزنس میں کوئی نہ کوئی برائی ہوتی ہی ہے ۔ حید نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ملازمت سے تمہاری زندگی سدھر جائے گی' مستقبل بن جائے گا ۔ میں کہتا ہوں کہ ملازمت سے بزنس ہر حال میں اچھی چیز ہے ۔ اور ایسا بزنس تو کیا ہی کہنے ہیں' نہ نقصان کا ڈر نہ انکم ٹیکس کی فکر و پریشانی ۔ ہیڈ کلرک بھی بڑے سمجھدار آدمی ہیں' کوئی جگہ خالی چھوڑتے ہی نہیں کہ دوسرے کو موقع ملے ۔ ابھی تو کام محدود ہے ۔ لیکن اللہ نے چاہا تو ہر بزنس کی طرح یہ بزنس بھی پھولے پھلے گا ۔!!

خواجہ اعجاز احمد بٹ

# ہم جنس

"میں ایک گھنٹے سے دیکھ رہی ہوں آپ یہاں اس میز پر بیٹھے تنہا بور ہو رہے ہیں۔ کیا آپ کو کسی کا انتظار ہے۔"

"انتظار۔"

"ہاں انتظار کے لمحات بڑے کٹھن ہوتے ہیں۔"

"شاید آپ اپنے تجربے کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔"

"تجربہ ہی تو انسان کی زندگی ہے۔"

"یہ ضروری نہیں کہ آپ کا تجربہ دوسروں کے لئے اصول بن جائے ——— اور آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھ کیوں نہیں جاتیں۔"

"آپ نے کہا ہی کب ہے۔"

"اب جو کہہ رہا ہوں۔"

"شکریہ!"

"بیرا چائے لے آؤ۔"

"آپ کے مہمان تشریف لے آئے صاحب۔"

"ہاں ——— سگریٹ بھی بھجوا دینا۔"

"بہتر سر۔"

"ہاں تو محترمہ آپ تجربے کی بات کر رہی ہیں۔"

"پہلے یہ سگریٹ لے لیجئے۔ یہ لائیٹر بھی میرے پاس ہے۔"

"شکریہ"

"تجربہ۔"

"زندگی ایک تجربہ گاہ ہے۔ جس میں ہر طرح کے انسان تجربے ... کرتے رہتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ چند اشخاص کا تجربہ ایک ہی ریزلٹ لے آتا ہے اور یہ اصول بن جاتا ہے۔"

"آپ کا مشاہدۂ زندگی بڑا وسیع ہے۔"
"یہ زندگی بھی بڑی وسیع ہے۔"
"آپ شاعر معلوم ہوتے ہیں۔"
"زندگی کی تجربہ گاہ میں ہر انسان شاعر ہے۔ شاعری کسی مخصوص طبقہ کی اجارہ داری نہیں نہ ہی یہ وزن یہ بحر اور رنگین الفاظ سے تیار ہوتی ہے۔ یہ تو روح کی آواز ہے جس کے پاس سننے کے لئے کان ہوں وہ سُن لے۔"
"آپ تو اینٹی پوئٹری کے قائل نظر آتے ہیں۔ کہیں لکھنؤ والوں نے سن لیا تو سولی پر چڑھا دیں گے اور اُردو کی روشنی کے ادیبوں نے سن لیا تو آسمان سر پر اٹھا لیں گے۔"
"انسان کو تنقید سے خائف نہیں ہونا چاہئے۔ تنقید ہر آدمی کا پیدائشی حق ہے۔"
"جیسے ووٹ ......"
"ووٹ کا مسئلہ سیاست دانوں پر چھوڑیئے۔"
"چائے حاضر ہے۔"
"اچھا۔"
"آپ نے اپنا تعارف تو کرایا نہیں۔"
"آپ نے مہلت ہی کب دی۔"
"طاہرہ نسیم۔"
"ایم سلے ورک۔"
"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"
"میرا بھی یہی حال سمجھئے۔"
"میڈم۔ آپ کے مہمان تشریف لے آئے ہیں۔"
"اچھا مسٹر ورک کل پھر یہیں ملاقات ہوگی۔ بائی ــ بائی
"ٹا ٹا۔"

"آج آپ نے بہت دیر کر دی۔"
"دیر آید درست آید۔"
"جی ہاں اردو میں کہہ دیجئے۔"
"اردو ہماری قومی زبان ہے۔"
"بہت خوب آپ بھی لیڈی عبدالقادر نکلیں۔"
"وہ آج فوت ہوگئیں۔"

"اچھا تو آپ روزانہ اخبار کا مطالعہ بھی فرماتی ہیں۔"

"اور آپ"

"ہمیں شب و روز کے جھمیلوں سے فرصت ہو تو اخبار پڑھیں۔"

"اور ریڈیو۔"

"کبھی مغربی موسیقی سن لی اور اللہ اللہ خیر سلا۔"

"اور مشرقی موسیقی۔"

"مجھے پکے راگوں سے نفرت تو نہیں چڑ ضرور ہے۔"

"تو نزاکت علی سلامت علی جھک ہی مارتے ہیں۔"

"جھک تو نہیں مارتے مگر ہماری سمجھ میں پکے راگ آتے ہی نہیں۔ کئی دفعہ کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ یہ تو ہمارے معاشرے کا قصور ہے۔ کہ وہ مغربی موسیقی معاف کیجئے گا۔ میں آپ پر چوٹ نہیں کر رہی) سن سن کر اتنی عادی ہو چکا ہے کہ مشرقی موسیقی اس کی سمجھ سے باہر ہے۔"

-خاموشی-

"آپ چپ کیوں ہو گئے۔"

"آپ تو موسیقی کی دلدادہ نکلیں۔"

"مجھے تو آرٹ سے عشق ہے۔"

"تو آپ آرٹسٹ ہوئی نا۔"

"ویسے تو ہر شخص آرٹسٹ ہے۔"

"ہر شخص کو چھوڑ یئے اپنی بات کیجئے۔"

"آپ بڑے خود غرض ہیں۔"

"خود غرضی ہی موجودہ انسان کی ایک بڑی صفت ہے۔ دیکھئے نا ہر شخص خود پسند ہے۔ آپ اپنے گھر محلے گلی اور شہر پر نگاہ دوڑایئے خلوص کے پرستار کم ہی ملیں گے۔ آپ کو لوگ سلام کرتے ہیں صرف اس لئے کہ شاید بڑے افسر ہیں۔ آج آپ اپنا اعلیٰ منصب چھوڑ دیتی ہیں یا آپ کی تبدیلی ہو جاتی ہے تو وہی لوگ آپ سے آنکھیں چرائیں گے۔ اور پھر ـــــ"

"آپ کا مشاہدہ بڑا وسیع ہے۔"

"ہمت افزائی اور مداح سرائی کا شکریہ۔"

"چھوڑیئے یہ بوریا باتیں چھوڑیئے۔ فلسفہ چھوڑ کر حقیقت کی دنیا میں آیئے۔"

"یہ سگریٹ سلگایئے۔"

"شکریہ۔"

"زندگی کی اقدار پر سوچنے کے بجائے زندہ حقیقتوں کا مطالعہ کریں۔"

"ہاں کیوں نہیں۔

---

"کل آپ کس کے منتظر تھے۔"

"اگر میں نہ بتاؤں تو۔"

"میں کچھ نہ کہوں گی۔"

"تو ہم نہیں بتائیں گے۔"

"آپ کو بتانا پڑے گا۔"

"تھی ایک جس کے لئے میں چند گھنٹے تو کیا ——— چند سال اور چند صدیاں بھی انتظار کر سکتا ہوں۔"

"یہ آپ کا جذباتی پن ہے۔"

"جذبہ ہی تو سب کچھ ہے۔ جذبات نہیں تو کچھ بھی نہیں۔"

"وہ کون تھی۔"

"وہ اگر میرے سامنے بیٹھی ہو تو۔"

"آپ بڑے وہ ہیں۔"

"میڈم آپ کے مہمان۔"

"میرے مہمان تشریف لے آئے ہیں۔ کل پھر اسی وقت۔ گڈ ایوننگ"

"گڈ ایوننگ۔"

"طاہرہ صاحبہ۔ آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ کے والد صاحب کیا کرتے ہیں۔"

"پھر آپ پوچھیں گے کہ انکا بینک بیلنس کتنا ہے؟۔ وہ میری شادی کب کر رہے ہیں اور کس سے ——— ؟"

"اگر میں یہی پوچھ لوں۔"

"تو آپ عام مردوں سے مختلف نہیں۔"

"آپ کا معیار کیا ہے۔"

"یہی کہ چند گھنٹے ہنس بول کر اس کیفے میں گزار لئے۔ اور بس، چاہے وہ دوست مرد ہو یا عورت

"آپ تو آئیڈیلسٹ ہیں۔"

"آئیڈیلسٹ ہونا ہر شخص کا فرض ہے۔ آئیڈیل ہی زندگی کا حاصل ہونا چاہئیے۔

"اس کا مطلب ہے۔ آپ نے ایک خاص معیار قائم کیا ہوا ہے جو مرد اس پہ پورا اترے۔"

"ملک صاحب ان خشک باتوں کو چھوڑئیے۔ یہ بتائیے کہ کیا آپ زندگی میں کسی حادثے سے دوچار ہوئے ہیں۔"

"حادثہ ——— حادثہ تو میری زندگی ہے۔ ہر لمحہ زندگی کی گاڑی کو موت کے جھمیلوں میں گھیلتا رہتا ہوں۔"

"ابھی یہاں بیٹھے بیٹھے حادثہ ہو گیا؟"

"مذاق چھوڑیئے۔"

"میں سنجیدہ ہوں۔"

"ہاں ورک صاحب میں آپ کے سامنے ایک تجویز پیش کرتی ہوں۔ شاید آپ کے لئے قابل قبول ہو۔ اس میں آپ کا فائدہ ہی ہے۔"

"ضرور پیش کیجئے۔"

"آپ بیس ہزار کی پالیسی خرید لیجئے۔"

"کیا بیمہ کرانا انسان کے لیے ضروری ہے؟"

"کیوں نہیں۔"

"اگر یہی سوال میں آپ سے کروں؟"

"کیا آپ؟"

"ہاں طاہرہ صاحبہ میں بھی انشورنس ایجنٹ ہوں۔ اور اسی امید پر آپ سے روزانہ ملتا رہا ہوں کہ آپ کم از کم بیس ہزار کی پالیسی ضرور خریدیں گی۔"

"مگر آپ تو ہم جلس نکلیں۔"

"میرا میز کے قریب سر جھکائے کھڑا تھا۔"

---

## قلمی قتلے

(صفحہ ۵۳ سے آگے)

حکیم صاحب۔ اوہو۔ ان خواتین میں آپ ہی ایک مرد ہیں۔ جناب کا نام نامی!

مریض:۔ نظام اسلامی۔

حکیم صاحب:۔ کیا آپ کو بھی کوئی اسلامی شکایات ہیں۔؟

نظام اسلامی:۔ جی نہیں۔ اصل میں میرا نام چوہدری نظام علی ہے۔ اور اسلامی میرا تخلص ہے۔

حکیم صاحب:۔ آپ کو کیا تکلیف ہے۔

نظام اسلامی:۔ کوئی ایک تکلیف ہو تو عرض کروں۔ کوئی نسخہ اعادۂ شباب کے لئے تجویز کیجئے۔ کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ تنہائی محسوس کرتا ہوں۔

مجلس آرائی کرکے جی بہلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن کوئی رفیق و مونس و غمخوار دکھائی نہیں دیتا۔ نفسی نفسی کا عالم ہے۔ دوسروں کے امراض کی علامتیں اپنے امراض کی علامتیں محسوس ہوتی ہیں۔

خواب و خور سے جی گھبراتا ہے۔ تبدیلی آب و ہوا کے لئے مشرقی پاکستان کا دورہ بھی کیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔

حکیم صاحب:۔ معجون شباب نوش جان فرمایئے اور کوئی صحت مند مشغلہ اختیار کیجئے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرسی پر قیلولہ فرمایئے۔ اور آیۃ الکرسی کا ورد جاری رکھیے۔

تیر کے بغیر خالی ہاتھ کمان چلانے سے پرہیز کیجئے۔ یہ صحت کے لئے مفید نہیں ہے۔

نسیم شاد

# لیمپ پوسٹ کی روح

اس روح کو سب سے پہلے نجمہ نے دیکھا تھا۔

شہر سے نئی کراچی جاتے ہوئے ناظم آباد سے کوئی دو تین میل آگے ایک ویرانے میں ٹاٹ اور سرکنڈوں کی بنی ہوئی چار پانچ سو جھونپڑیاں کوڑے کرکٹ کی طرح پھیلی ہوئی ہیں دن کے وقت اس گندی، گمنام بستی پر قبرستان جیسی منجمد اداسی طاری رہتی ہے اور اگر کبھی آپ رات کے وقت ادھر سے گزرے ہوں تو آپ نے یہاں پر چاروں طرف مسلط گھپ اندھیرے میں خوف کی ایک بے نام سی لہر کو اپنے جسم میں بندوق کی گولی کی طرح سنسناتا ہوا ضرور محسوس کیا ہوگا۔ اس بستی میں ایسے لوگ رہتے ہیں جن کی زندگی ہمیشہ جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح ساکت رہتی ہے اور چونکہ انھیں کوئی نہیں جانتا اس لئے ان کی بستی کو بھی ابھی تک کوئی نام نہیں دیا جا سکا ہے کہ آگے چل کر یہ اپنے اندر کوئی ایسی خصوصیت پیدا کرلے جس کے سبب اسے بھی گولی مار یا لیاری جیسا کوئی نام دیا جا سکے، لیکن فی الحال اس کے پھیلنے کے کوئی امکانات نظر نہیں آتے اس لئے کہ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک نئی اور عالیشان بستی بس رہی ہے۔ جو شمالی ناظم آباد کہلاتی ہے۔

شمالی ناظم آباد کی تیزی سے پھیلتی ہوئی زیر تعمیر بستی میں دور دور تک بنی ہوئی اور زیر تعمیر کوٹھیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ ان کوٹھیوں میں سے بعض کوٹھیاں آباد ہو گئیں ہیں جن میں بڑے بڑے خاندان رہتے ہیں۔ بعض اوقات ان کو دیکھ کر ایک عام آدمی یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ اتنے بڑے بڑے مکان کیوں بنائے جاتے ہیں۔ اور ان میں کون لوگ رہتے ہیں۔ اور کیوں رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ علاقہ ابھی پورے طور پر آباد نہیں ہوا ہے۔ اس کے باوجود یہاں دن بھر عجیب رونق رہتی ہے۔ ٹریکٹر طلوع حیات نیچی زمین کو ہموار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اور سارا دن زیر تعمیر کوٹھیوں میں کام کرنے والے راج مزدوروں کا شور اور مکسر مشینوں کی آواز سنائی دیتی ہے اور چاروں طرف سمنٹ، گارا اور لکڑی کے برادے کی بو پھیلی رہتی ہے۔ اس بستی کی ساری سڑکیں مکمل ہو چکی ہیں اور ان کے کنارے کچے فٹ پاتھ بنا دیئے گئے ہیں جن پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ناریل کے پیڑ لگائے گئے ہیں۔ جو آگے چل کر اس بستی کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث ہوں گے۔ ہر سڑک کے دو طرفہ ہے یعنی آنے کی الگ اور جانے کی الگ۔ بیچ میں گھاس اور سدابہار پھول اگائے گئے ہیں جنھیں ہر روز صبح اور شام پابندیٔ وقت کے ساتھ کے۔ ڈی۔ اے کی گاڑیاں پانی دینے آتی ہیں۔

پوری بستی کی سڑکوں پہ لیمپ پوسٹ لگے ہیں۔ جن کی وجہ سے رات کے وقت یہ علاقہ بقعۂ نور بنا رہتا ہے۔

بستی کی بیچ و بیچ، بل کھاتی سڑکوں کے درمیان ایک نسبتاً چوڑی اور کشادہ سڑک ہے جس کا گہرا اور سیاہ رنگ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس سڑک پہ ٹریفک بہت زیادہ ہے۔ یہ سڑک نئی کراچی جاتی ہے اور اس پر دن بھر سامان ڈھونے والے چھکڑے، ہاتھ گاڑیاں، ریڑھی اور بھیری

بیچلنے والے ٹرک اور مسافروں سے کھچا کھچ بھری، ڈیزل کا گندا کالا دھواں اگلنے والی آر۔ٹی۔سی کی بسیں دوڑتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی جب دو بسیں زیادہ سے زیادہ پنجرا اٹھانے کی کوشش میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتی ہیں تو اس سڑک پہ اکثر خوفناک حادثے بھی ہو جاتے ہیں۔ جن کے نتیجے میں بہت سی انسانی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں اور سیاہ سڑک کے سینے پر جیتے جیتے گرم لہو کو دیکھتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ خود غرضی انسان کے کردار کی اہم خصوصیت ہے۔ اور تہذیب کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جانے کے بعد بھی اس کے اندر پائی جانے والی بنیادی درندگی دور نہیں ہوئی ہے اور وہ اب بھی موقع ملتے ہی اپنے بھائی کا گلا کاٹنے کی سوچنے لگتا ہے اور اس کی لاش پہ اپنی فتح مندی و برتری کے جھنڈے گاڑ کے سرمستی کے نعرے لگا کر خوش ہوتا ہے۔

ابھی کل ہی اس سڑک پہ ایک خوفناک حادثہ ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں چار افراد موقع ہی پر ہلاک ہو گئے تھے۔ یہ حادثہ حال ہی میں آباد ہونے والے قصر شاہین کے بالکل قریب پیش آیا تھا۔ جو لمبے برآمدوں اور طویل راہداریوں والی ایک محل نما عمارت ہے اور باہر سے دیکھنے پر بڑی پراسرار نظر آتی ہے

یہیں پر نجمہ نے اس روح کو دیکھا تھا۔

نجمہ انیس سال کی خوبصورت لڑکی ہے۔ بالکل یونانی دیویوں جیسی۔ اس کے جوانی سے ہمکنار ہوتے ہوئے نوخیز چہرے پر الہڑپن کی ساری معصوم خصوصیات نمایاں رہتی ہیں، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی کشش ہے، جیسے جادو کر رہی ہوں۔ بڑی پراسرار ہیں اس کی آنکھیں، ہر وقت کچھ سننا چاہتی ہیں۔ وہ مقامی سینٹ پال اسکول میں میٹرک کی طالبہ ہے۔ اور ان دنوں امتحانات کی تیاری کر رہی ہے۔ امتحانات میں صرف بیس دن رہ گئے ہیں اور نجمہ چاہتی ہے کہ وہ امتیازی نمبروں سے پاس ہو۔ اس لیے وہ آجکل دن رات محنت کر رہی ہے اگرچہ ہر روز شام کے وقت اسے پڑھانے کے لیے ایک ٹیوٹر آتا ہے جسے دو سو روپے ماہانہ دیے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود نجمہ اپنے طور پر بھی رات گئے تک مطالعے میں مشغول رہتی ہے

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس رات دن کی پڑھائی سے نجمہ کا جی اکتا جاتا ہے ایسے موقعوں پر اس کا دل چاہتا ہے کہ کتابوں کو پھینک کر دور تک بھاگتی چلی جائے اور اس مقام پر کھڑی ہو کر، جہاں زمین اور آسمان ایک دوسرے کو چھوتے دکھائی دیتے ہیں، اپنی کوٹھی کو دیکھے جو ایک نقطے میں سمٹ گئی ہو۔ اس وقت اسے ایک نقطے اور ایک انسان میں زبردست فرق دکھائی دیتا ہے اور اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہوتا ہے اور وہ سوچتی ہے کہ اس دنیا میں کسی دوست کے بغیر اکیلے رہنے سے تو یہ بدرجہا بہتر ہے کہ انسان ایک نقطے میں سمٹ جائے۔ پھر اس کے کچے دل میں کسی ایسے دوست کو پا لینے کی معصوم خواہش مچلنے لگتی ہے۔ جو اس کے بہت قریب ہو اور جس کے سینے سے لگ کر سرگوشیوں کی زبان میں وہ اپنے دل کی ساری انجانی دھڑکنوں کے راز افشا کر سکے۔ لیکن اس نئی زیر تعمیر بستی میں اس کا کوئی بھی تو نہیں ہے۔ دور دور تک ساری کوٹھیاں خالی پڑی ہیں۔ رات کو سناٹا بھیانک کہانیاں سناتا ہے اور دن کے وقت لے دے کے کچھ راج مزدوری کرنے والی بھدی، بے ڈھنگی عورتیں اور لڑکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ جن سے نہ دوستی کی جا سکتی ہے اور نہ جنہیں اپنا ہمراز بنایا جا سکتا ہے۔

اور اس دن اس روح کو دیکھتے ہی بدن میں تیزی سے دوڑتی ہوئی خوف کی تیز لہر کے ساتھ ہی اس کے دل نے کہا تھا کاش اس وقت کوئی میرے پاس ہوتا۔

کل کا حادثہ دن کے ایک بجے ہوا تھا گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ کے باوجود نجمہ حادثے کی خبر سنتے ہی قصر شاہین سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کی کوٹھی سے کوئی دس پندرہ گز کے فاصلے پر حادثے میں مرنے والوں کی لاشوں کے گرد مجمع لگا ہوا تھا۔ مجمع میں کچھ تو دونوں بسوں کے مسافر تھے اور باقی ادھر ادھر سے کام کرنے والے راج اور مزدور۔ دھوپ میں تپتی ہوئی سیاہ سڑک پر جیتے جاگتے لہو کے گرم گرم قطرے سورج کی تپش سے سیاہ ہو گئے تھے۔ سڑک کے کنارے پر دونوں بسیں ایک دوسرے سے چپکی ہوئی کھڑی تھیں۔

مرنے والے چار تھے اور ان کی لاشوں پہ کسی نے ایک سفید چادر ڈال دی تھی ۔
نجمہ مجمع کے بیچ میں کھڑی تھی کہ کسی نے لاشوں پہ پڑی چادر سرکا دی
ایک لاش ننگی ہو گئی ۔

اس لاش کو دیکھتے ہی نجمہ کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی ۔ اور اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں کے پیچھے چھپا لیا ۔
نجمہ کا کومل جسم ایک انجانے خوف سے سنسنا اٹھا تھا ۔ اس نے ایک لمحے میں بس یہی دیکھا تھا کہ لاش کا سر پاش پاش ہو گیا تھا چہرے کی جگہ کچھ نہ تھا نہ کان ، نہ ناک ، نہ آنکھ بس کھلے ہوئے منہ سے بڑے بڑے دانت باہر کی طرف لپیں نکلے ہوئے تھے جیسے یہاں پہ موجود لوگوں کو بھنبھوڑ ڈالنا چاہتے ہوں ۔ خشک زمین پر خون سوکھ چکا تھا البتہ جدھر اس کا سر تھا ، وہاں بھیجہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا ۔

نجمہ زیادہ دیر وہاں کھڑی نہ رہ سکی اور خوف اور تھر تھری لئے اپنے گھر آ گئی ۔ اسی رات وہ روح اسے نظر آئی ۔ !!
شام تک نجمہ پہ اٹھتے بیٹھتے اس حادثہ کا اثر طاری رہا ۔ اور وہ لاش کے تصور کو اپنے ذہن میں جگا کر کانپ کانپ اٹھی ۔ لیکن جب اس کا ٹیوٹر اسے پڑھانے کے لئے آیا تو اس پہ ایکبار پھر امتحان کا بھوت سوار ہو گیا ۔ اور وہ سب کچھ بھول بھال کر کتابوں میں ڈوب گئی ۔ رات کا کھانا اس نے اپنے ابو اور امی کے ساتھ کھایا ۔ اور چند منٹ تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد پڑھنے کے لئے اوپر چلی گئی ۔ سوا نو بجے نوکر اس کے لئے کافی لایا ، دس بجے دودھ اور اوولٹین اور اس کے بعد گیارہ بجے اس کے لئے کشمیری سبز چائے آئی ۔ اب نجمہ نے نوکر کو منع کر دیا کہ اس کے بعد وہ اس کے لئے کچھ نہ لائے اور پڑھائی میں کھو گئی ۔ بارہ بجے تک نجمہ ٹیبل لیمپ کے سامنے سر جھکائے بیٹھی پڑھتی رہی پھر اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تو وہ چونک سی گئی ۔ امتحان میں صرف بیس روز باقی رہ گئے تھے اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ آج سے رات کے بارہ بجے تک ضرور پڑھا کرے گی ۔
نیند سے پیچھا چھڑانے کیلئے نجمہ نے سوچا کہ بالکونی میں نکل کر تازہ ہوا میں دو چار گہرے گہرے سانس لئے جائیں ۔ وہ تھکی تھکی سی ، جمائیاں لیتی ہوئی اٹھ کر بالکونی میں آ گئی ۔ اور اس نے انگڑائی لیتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا ۔ آسمان پہ پھیلے ہوئے بے شمار ستاروں کے نیچے گرم ماحول میں چاروں طرف بھیانک سناٹا ۔ مسلط تھا ۔ غیر آباد کوٹھیوں کے خالی کمروں میں اندھیرا سسک رہا تھا ۔ اندھیرے کے درمیان سڑکوں پہ فاصلے فاصلے سے لگے ہوئے لیمپ پوسٹوں کی مدھم پیلی روشنی دھبوں کی طرح ادھر ادھر پھیلی ہوئی بڑی پراسرار لگ رہی تھی ۔ ہوا بند تھی اور چاروں طرف حبس سا طاری تھا اور سہمے ہوئے خاموش ماحول پہ نجمہ کی تیرتی ہوئی نظریں پھیل اور سمٹ رہی تھیں اچانک وہ چونک سی گئی اس کی کوٹھی سے سڑک کے کنارے لگے ہوئے لیمپ پوسٹ کی روشنی تک کوئی ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے کے درمیان اندھیرا حائل تھا ۔

نجمہ کی حیران نظریں اندھیرے کو چیرتی ہوئی جب لیمپ پوسٹ کی روشنی تک پہنچیں تو اس نے دیکھا کہ اتنی رات گئے وہاں کوئی بیٹھا ہوا ہے ۔

اسے دیکھتے ہی خوف کی ایک سنسنی خیز تیز رو نجمہ کے جسم میں سرایت کر گئی اور ڈر کے مارے اس کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا ۔ نجمہ نے ساکت و صامت کھڑے کھڑے سوچا ، اس علاقہ میں تو ہماری کوٹھی کے علاوہ خاصی دور تک کوئی اور نہیں رہتا ، پھر وہ کون ہے ۔ ؟
نجمہ کو لیمپ پوسٹ کی طرف دیکھتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی ۔ اچانک اس نے دیکھا کہ لیمپ پوسٹ کے نیچے سے کوئی اٹھا ۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سیدھا کھڑا ہو گیا ۔ وہ کوئی مرد تھا ۔ بدن سے ننگا ۔ اس نے صرف نیکر پہنی ہوئی تھی اور پیلی روشنی میں اس کا ننگا بدن

بڑا پراسرار لگ رہا تھا۔ خود تین منٹ تک سیدھا کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا بائیں طرف چلا گیا، جیسے تھکے انداز میں، جیسے صدیوں پرانی روحیں چلتی ہیں، بلکہ رینگتی ہیں، نجمہ سمجھ رہی تھی کہ اب وہ چلا جائے گا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا وہ اب واپس آرہا تھا، اس کی چال اور رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ چلتے چلتے کھمبے کے نیچے ایک لمحے کے لیے رکا۔ اور پھر دائیں طرف بڑھتا چلا گیا۔ سسکتی ہوئی رات ڈھل رہی تھی، وہ اسی طرح آ اور جا رہا تھا، بڑی بےچینی سے، پراسرار انداز میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا، جیسے وہ ایک بےچین اور مضطرب روح ہو۔

وہ کون ہے۔ نجمہ نے جھرجھری لیتے ہوئے سوچا۔ اور پھر نہ جانے کہاں سے ایک خیال بڑی سرعت کے ساتھ اس کے ذہن پر چھا گیا لیمپ پوسٹ کی زرد روشنی میں تھوڑی فاصلے پر نجمہ کو وہ جگہ بھی دکھائی دے رہی تھی۔ جہاں دن کے حادثے میں مرنے والوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہاں اب کچھ بھی تو نہیں تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں ادھر دیکھتے ہی نجمہ کے ذہن میں صبح کے حادثے میں مرنے والے اس شخص کا تصور منڈلانے لگا جس کا سر پاش پاش ہو گیا تھا۔

کیا یہ اس شخص کی بےچین روح ہے۔؟

اور اس کے ساتھ ہی نجمہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ وہ لیمپ پوسٹ کے نیچے سیدھا کھڑا تھا۔

نجمہ نے چیخ کر اپنی امی کو آواز دینا چاہی۔ لیکن اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی اور وہ بیہوش ہو کر بالکونی میں گر پڑی۔

رات کے تین بجے تھے۔ اچانک کسی کھٹکے سے نجمہ کی امی کی آنکھ کھل گئی۔ انھوں نے لیٹے لیٹے ادھر ادھر دیکھا۔ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ وہ اپنی آنکھیں ملتی ہوئی کمرے سے نکل کر راہداری میں آگئیں۔ اچانک ان کی نظر اوپر نجمہ کے کمرے کی طرف گئی۔ وہاں روشنی دیکھ کر وہ اوپر آئیں۔ نجمہ کمرے میں نہیں تھی۔ پریشان ہو کر انہوں نے جلدی سے چاروں طرف دیکھا تو نجمہ بالکونی میں پڑی دکھائی دی۔ امی گھبرا گئیں، وہ دوڑی دوڑی نجمہ کے ابو کو بلا لائیں۔ اور پھر ڈاکٹر کو فون کیا گیا۔ جلد ہی ڈاکٹر بھی آگیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کی کوششوں سے نجمہ کو ہوش آگیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور انھیں خوف سے حرکت دیتے ہوئے اپنے ابو اور امی کی طرف دیکھتے ہوئے سہم کر کہا۔

"امی۔ روح۔"!

اس کے بعد اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں سارا واقعہ سنایا جسے سننے کے بعد اس کے ابو نے ہنستے ہوئے اسے نجمہ کا واہمہ قرار دیا اور بولے۔

"پگلی کہیں کی، بس یونہی ڈر گئی، بھلا روح ووح بھی کوئی چیز ہوتی ہے"

"نہیں ابو۔" نجمہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ "اسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے"

"اچھا اب تم سو جاؤ۔" "کل ہم بھی دیکھیں گے تمہاری اس روح کو" نجمہ کے ابو نے اٹھ کر بالکونی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

بالکونی میں کھڑے ہو کر انہوں نے سڑک پر دور دور تک دیکھا لیکن وہاں کچھ بھی تو نہ تھا۔ لمبی سیاہ سڑک بالکل خالی تھی۔ دور کہیں کتے بھونک رہے تھے۔ اور چاروں طرف سناٹا سسکیاں لے رہا تھا جس میں لیمپ پوسٹ کی ہلکی روشنی بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔ نجمہ کے ابو بالکنی سے واپس آگئے۔

اگلی رات، نجمہ، نجمہ کی امی اور اس کے ابو کمرے میں بیٹھے اس روح کا انتظار کر رہے تھے۔ نجمہ کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں تیری

تھیں۔ اس کی امی پر یقین اور غیر یقینی کی کیفیت طاری تھی۔ البتہ اس کے ابو قطعی فکر مند نہیں تھے۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اٹھ کر بالکونی میں جاتے اور چاروں طرف پھیلے ہوئے سناٹے میں دور تک نظریں دوڑانے کے بعد واپس آکر مسکراتے ہوئے نجمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہتے۔

"ہیں تو ابھی تک دکھائی نہیں دی وہ روح"

رات آہستہ آہستہ، بڑی خاموشی کے ساتھ ڈھل رہی تھی۔ نجمہ کی امی کی آنکھوں میں نیند ہلکورے لے رہی تھی۔ نجمہ بھی ہوئی سی خاموش تھی اور اس کے ابو جمائیاں لیتے ہوئے سونے کے متعلق سوچ رہے تھے کہ ٹھیک اسی وقت فیڈرل ایریا کی طرف سے رات کی شفٹ میں کام کرنے والے مزدوروں کو لے جانے والی سرکلر ریلوے کی آخری لوکل کی سیٹی سنائی دی۔ بارہ بج چکے تھے۔ نجمہ کے ابو مسکراتے ہوئے اٹھے اور اس روح کو دیکھنے کیلئے آخری بار بالکونی میں آئے۔ اس بار ان کے ساتھ نجمہ اور نجمہ کی امی بھی تھیں۔

تینوں نے بیک وقت اس لیمپ پوسٹ کی طرف دیکھا جہاں کل رات نجمہ نے پہلی بار اس روح کو دیکھا تھا۔ اس وقت وہاں ہلکی ہلکی روشنی میں کوئی بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔

نجمہ کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ سہم کر اپنی امی سے لپٹ گئی۔ اس کی امی کا چہرہ بھی سفید پڑ گیا تھا اور اس طرف دیکھتے ہی ان کا جسم لرزنے لگا تھا۔ نجمہ کے ابو بھی ادھر دیکھ کر ڈر سے گئے تھے اور ان کے اعصاب پر ہیجان سا طاری ہو گیا تھا۔ لیکن فوراً ہی انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور آہستہ سے بولے۔

"یہ کوئی روح دوح نہیں ہے"

اندر ہی اندر ان کا دل کہہ رہا تھا یہ کچھ نہ کچھ ضرور ہے

ایک بجے تک وہ اس روح کو وہاں منڈلاتے دیکھتے رہے۔ ٹھیک ایک بجے وہ وہاں سے کہیں چلی گئی۔

اگلے دن بستی کے آباد گھروں میں اس روح کے چرچے پھیل گئے اور شام سے بہت پہلے ہی ایک دبا دبا خوف گھروں میں رینگنے لگا۔ نجمہ کے ابو دن بھر اس روح کے بارے میں سوچتے رہے۔ اس کی امی بھی ان کے پاس بیٹھی تھیں اور نجمہ بھی۔ نجمہ کی امی اس کے ابو کو مخاطب کرکے بولیں۔

"سنا ہے یہاں اب سے پہلے ایک بڑا قبرستان تھا"؟

"ہوگا۔" اس کے ابو نے کوئی دلچسپی لئے بغیر جواب دیا۔

"نہیں تھا۔" نجمہ کی امی بولیں "محمد بن قاسم کے زمانے میں یہاں ایک زبردست جنگ ہوئی تھی جس میں ہزاروں آدمی ہلاک ہوئے تھے۔ ان سب کو یہیں قبروں میں دفن کر دیا گیا تھا۔ پتہ ہے آپ کو، کوٹھیوں کی تعمیر کے وقت جب یہاں نیوڑالنے کے لئے کھدائی ہوتی ہے تو اس میں سے مردوں کی ہڈیاں برآمد ہوئی تھیں"

"کیا لغو باتیں کرتی ہو۔" نجمہ کے ابو نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ پھر ایک طویل کش لیکر دھواں چھوڑتے ہوئے وہ کچھ سوچنے لگے اسی سوچ کے دوران کسی خیال پر وہ اچانک چونک پڑے اور مسکراتے ہوئے نجمہ کی امی کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے سگریٹ بجھا دی اور بڑے اطمینان سے بولے۔

"وہ روح ہے نا ۔۔۔ ، وہ یہاں تک کہہ کر رک گئے اور پھر نجمہ کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں اپنا جملہ مکمل کر دیا۔

"وہ کوئی چور اچکا ہے"!

نجمہ کے ابو کا یہ خیال بظاہر ایک عام سا خیال تھا ۔ لیکن ان دونوں کے لئے قابل قبول تھا ۔ لہٰذا نجمہ کے ابو نے پولیس کو اس بات کی اطلاع دی کہ ایک پراسرار شخص کئی دن سے آدھی رات کے وقت ان کی کوٹھی کے چکر لگا رہا ہے ۔ اس کی نیت شاید چوری کی ہے ، اس لئے ان کی حفاظت کی جائے۔

اور پھر اسی رات ایک انسپکٹر کی معیت میں دو پولیس والے اس چور کو پکڑنے کے لئے آگئے۔

رات کے دس بجے تھے ۔ جب چاروں طرف سناٹا پھیل گیا ۔ اور اندھیرا چاروں طرف پراسرار انداز میں سرگوشیاں کرنے لگا تو انسپکٹر نے دونوں پولیس والوں کو لیمپ پوسٹ کے آس پاس کی زیر تعمیر کوٹھیوں میں چھپا کر بٹھا دیا اور خود نجمہ کی بالکونی میں آکر لیمپ پوسٹ کی نگرانی کرنے لگا۔

رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ایک سایہ اس لیمپ پوسٹ کے نیچے آکر رکا اور ایک دو لمحے کھڑے رہنے کے بعد اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ۔ جب اسے اسی طرح بیٹھے بیٹھے خاصی دیر ہوگئی اور نجمہ کی بالکونی میں بیٹھے ہوئے انسپکٹر کو یقین ہوگیا کہ اس کی سیٹی کی آواز سنکر پاس ہی چھپے ہوئے پولیس والے آسانی سے پکڑ لیں گے تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے تیزی سے سیٹی بجائی۔

سیٹی کی آواز سنتے ہی چھپے ہوئے پولیس والے سرعت کے ساتھ نکلے اور آن کی آن میں لیمپ پوسٹ کے نیچے بیٹھا ہوا شخص ان کی گرفت میں تھا۔

دونوں پولیس والے اسے گھسیٹتے ہوئے تعمر شاہین میں لے آئے ۔ نچلی منزل کی تیز روشنی میں ، نجمہ ، اس کی امی اور ابو نے دیکھا وہ نجمہ کی عمر کا ایک لڑکا تھا ۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں ۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور خوف سے بدن تھر تھر کانپ رہا تھا ۔ اس کے جسم پر صرف ایک نیکر تھا۔

انسپکٹر نے اس پر ایک بھرپور نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہو تم ۔ ؟"

لڑکے نے انسپکٹر کی بات کا جواب دینا چاہا ۔ لیکن اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"کون ہو تم ۔ بولتے کیوں نہیں ۔" ؟ انسپکٹر نے غصے سے کہا۔

"مم ، مم ، میں ۔ میں" لڑکا ہکلایا ۔ " میں مشتاق ہوں ۔ محمد مشتاق "

"اتنی رات گئے تم یہاں کیا کر رہے تھے" ؟

انسپکٹر نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی بید کو گھماتے ہوئے پوچھا۔

"جی میں ، جی پڑھ رہا تھا ، پڑھ ، وہاں" وہ لیمپ پوسٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"میری کتابیں وہیں پڑی ہیں صاحب۔

"یہ اس حلیے میں تم پڑھ رہے تھے" انسپکٹر نے اس کے ننگے بدن کو دیکھتے ہوئے کہا "سچ سچ بتاؤ تم کون ہو ۔ ؟ "

"صاحب خدا کی قسم میں پڑھ رہا تھا۔" لڑکا گھگیاتے ہوئے بولا۔ "گرمی کے مارے میں نے اپنی قمیض اتار کر وہیں رکھ دی ہے"

"رہتے کہاں ہو —" ؟

"ناظم آباد کے پاس کی جھگیوں میں رہتا ہوں صاحب۔ گھر میں اندھیرا اور گرمی ہوتی ہے اور میں میٹرک کا امتحان دے رہا ہوں میرا باپ رات کو بتی نہیں جلانے دیتا اس لیے میں پڑھنے کے لیے رات کو یہاں آجاتا ہوں۔"

لڑکے کی باتوں سے انسپکٹر کو تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے پھر پوچھا۔

"پڑھتے کہاں ہو —؟"

لڑکا چپ رہا۔ تو انسپکٹر اپنی بید لہراتے ہوئے گرج کر بولا۔

"بتاتا کیوں نہیں بے، کہاں پڑھتا ہے — چور —"

لڑکا سہم کر بولا۔ "نہیں صاحب میں چور نہیں ہوں۔"

"ہر مجرم یہی کہتا ہے" انسپکٹر نے نجمہ کے ابو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ تو ابھی قبول دے گا" وہ لڑکے کی طرف مڑا،

"ہاں، کہاں پڑھتا ہے تو —؟"

"صاحب میں کسی اسکول میں نہیں پڑھتا۔ صبح اور شام کو صدر میں اخبار بیچتا ہوں اور رات کو امتحان کی تیاری کے لیے یہاں آجاتا ہوں"

انسپکٹر شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔

نجمہ نے اس روح کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے سہما کھڑا تھا۔!

نجمہ کے ابو نے اس چور کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی ... معصومیت طاری تھی۔!

نجمہ نے لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"تمہیں ڈر نہیں لگتا ہے؟"

لڑکے نے نجمہ کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اور چند لمحے بعد اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھا کر انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"صاحب میری کتابیں وہیں پڑی ہیں۔ میں جاؤں صاحب۔!"

ایوان ہنٹر
ترجمہ
سید رضا کاظمی

# نام کی خاطر

(امریکی کہانی)

موسلادھار بارش میں وہ لڑکا فٹ پاتھ پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا!

اس کی عمر تقریباً سولہ سال تھی اس کے جسم پر سلک کی پیلے رنگ کی چمکیلی بنڈی تھی جس کی پشت پر موٹے حروف میں "وی رائل" لکھا ہوا تھا۔ لڑکے کا نام اینڈی تھا اور بنڈی کے سامنے کی جانب دل کے قریب سیاہ ریشمی دھاگوں سے اس کا نام اینڈی کڑھا ہوا تھا دس منٹ قبل کسی نے لڑکے کو چھرا گھونپ دیا تھا۔ چھرا اس کی پسلیوں کے درمیان در آیا تھا لیکن چھرا چونکہ فوراً باہر کھینچ لیا گیا تھا اس لیے زخم کافی بڑا اور گہرا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر پڑا ہوا تھا اور اس کے جسم سے خون نکل کر بارش کے پانی کے ساتھ بہہ رہا تھا جو وقت اس کے جسم میں پیوست کیا گیا تھا۔ اسے یقیناً شدید درد کا احساس ہوا تھا لیکن چھرا باہر نکل جانے کے بعد اسے نسبتاً آرام محسوس اس نے کسی کو کہتے ہوئے سنا تھا۔ تمہاری یہی سزا ہے رائل ۔ اور اس کے بعد اسے صرف بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی جو بارش کے ٹپ ٹپ میں گم ہو گئی تھی اور وہ اپنا پیٹ پکڑے فٹ پاتھ پر گر پڑا تھا ۔

اس نے مدد کے لیے چیخنا چاہا۔ لیکن اس کے حلق سے آواز نہ نکلی۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ اس کی آواز اس کا ساتھ کیوں چھوڑ گئی وہ یہ بھی سمجھ نہ سکا کہ دفعتاً بارش اتنی تیز کیوں ہو گئی یا اس کے جسم میں دائیں جانب اتنا بڑا سوراخ کیوں ہو گیا جس کے ذریعہ اس کی جان خون کی شکل آہستہ لیکن مسلسل باہر نکل رہی تھی اس وقت رات کے گیارہ بجکر تیس منٹ ہو گئے تھے لیکن اسے صحیح وقت بھی معلوم نہ تھا ۔

اسے ایک دوسری اہم بات کا بھی علم نہ تھا۔!

اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ مر رہا ہے ۔ وہ فٹ پاتھ پر پڑا ہوا تھا اور اس کے گہرے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ اس وقت اس نے اتنا ہی سوچا تھا کہ وار کاری اور زخم گہرا ہے۔ آج ان لوگوں نے مجھے پکڑ ہی لیا تھا۔ لیکن اسے اس حقیقت کا احساس نہ تھا کہ وہ مر اگر اسے علم ہو جاتا تو وہ یقیناً خوفزدہ ہوتا۔ اسی لاعلمی کی وجہ سے وہ وہاں فٹ پاتھ پر پڑا تھا۔ اور یہ خواہش کرتا رہا کہ وہ کسی کے لیے پکارے۔ لیکن اس کے حلق سے کوئی آواز ہی نہ نکلی۔ اس کے حلق سے تو صرف خون نکلتا رہا۔ جب کبھی وہ آواز دینے کے لیے ہونٹ کھولتا تو خون باہر اگل دیتا۔ وہ درد سے تڑپتا ہوا وہ وہاں خاموش پڑا رہا اور اس لمحہ کا انتظار کرتا رہا جب کوئی آ کر اس کی مدد کو آئے گا۔

وہ آتی جاتی موٹروں کے ٹائروں کی آواز سنتا رہا جو سڑک پر جمع ہونے والے بارش کے پانی میں گزرنے سے پیدا ہو رہی تھی

فٹ پاتھ کے بھیگے ہوئے پتھریلے فرش پر اپنا گال رکھے ہوئے وہ منہ کے بل لیٹا رہا اور سڑک پر جلتی بجھتی نیون سائن کی رنگین روشنی کو بھیگی ہوئی سڑک پر رنگ بکھیرتے دیکھتا رہا۔

"کیا نورا خفا ہو گئی ؟ " وہ سوچنے لگا۔

وہ سگریٹ خریدنے کے لئے کلب سے باہر نکلا تھا اور نورا سے وعدہ کر آیا تھا کہ چند منٹوں میں سگریٹ لیکر واپس آجائے گا۔
قریبی سگریٹ کی دوکان بند پاکر وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ کیونکہ اسے امید تھی کہ سڑک کے دوسرے سرے پر آلفرڈ کی دوکان ضرور کھلی ہوگی۔
وہ اسی دوکان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب اس پر پیچھے سے وار کیا گیا اس کے کانوں میں فاصلے سے آتی ہوئی موسیقی کی دھیمی آوازیں آرہی تھیں۔ غالباً نورا ابھی تک رقص کر رہی ہے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اب میں شاید واپس نہ آؤنگا۔ یا ممکن ہے وہ خود کلب سے اپنے گھر چلی گئی ہو۔ اسے نورا کا مسکراتا چہرہ۔ بھوری آنکھیں سیاہ ریشمی بال اور دلفریب مسکراہٹ یاد آنے لگی اور وہ اپنا درد اپنا زخم بھول گیا ایک دن وہ نورا سے شادی کرے گا۔ ان کے بہت سارے بچے ہوں گے۔ پھر وہ دونوں اس گندے ماحول سے نکلکر کسی شریف محلہ میں چلے جائیں گے۔ کوئی اچھا سا مکان کرایہ پر لینگے۔

اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور اس نے فٹ پاتھ پر سے اپنا سر اٹھا کر چیخنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اس کے منہ سے خون کے علاوہ کوئی آواز نہ نکلی۔

قدموں کی آہٹ قریب آ گئی — آنے والے نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے قریب سے گذر کر آنے والا قریبی عمارت کی دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ اور چند لمحوں کے بعد جب وہ واپس مڑا تو اس کی نظریں اینڈی پر پڑیں اور وہ اُس کے قریب آ گیا اس کے سرہانے کھڑے ہو کر وہ اُسے چپ چاپ گھورتا رہا۔

"کیا بات ہے دوست ؟ اس آدمی نے پوچھا۔

اینڈی کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے اپنا چہرہ اٹھا کر اجنبی کی جانب دیکھا اور اس کے نتھنوں سے شراب کی تیز بو ٹکرائی اینڈی نے اندازہ کر لیا کہ آنے والا شراب کے نشہ میں دھت ہے۔ اسے کوئی خاص خوف محسوس نہ ہوا۔ چونکہ اُسے اس حقیقت کا علم نہ تھا کہ وہ مر رہا ہے۔ اس لئے اُسے صرف مایوسی ہوئی کہ جس پہلے آدمی نے اُسے اس حالت میں پایا وہ بھی مدہوش ہے۔

اجنبی کھڑا مسکراتا رہا۔

"کیا تم پھسل کر گر پڑے ہو دوست" اجنبی نے پوچھا "یقیناً تم بھی نشہ میں ہو گے۔ خیر فکر نہ کرو میں ابھی واپس آتا ہوں۔
اجنبی لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اینڈی نے اُس کے قدموں کی آہٹ سنی اور پھر اُس کے کوڑے کے ڈرم سے ٹکرا کر گرنے کی آہٹ سنائی دی۔ پھر اس کے اٹھنے گالی بکنے اور کوڑے کے ڈرم پر پیشاب کرنے کی آواز سنائی دی۔ اینڈی اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

گیارہ بجکر انتیس ۲۹ منٹ ہو چکے تھے۔

چند لمحوں بعد اجنبی واپس آیا اور اینڈی کے پہلو میں لیٹ کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔

"تمہیں ٹھنڈ ہو جائے گی " اجنبی نے کہا " آخر ماجرا کیا ہے۔ تم بارش میں فٹ پاتھ پر کیوں پڑے ہو۔ ؟ "

اینڈی جواب نہ دے سکا۔ اجنبی نے اس کے چہرہ پر اپنی آنکھیں گڑا دیں۔

" اور پیو گے ؟ "

اینڈی نے سر ہلا کر انکار کر دیا
"میرے پاس ہی بوتل ہے" یہ کہہ کر اجنبی نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے برانڈی کی چھوٹی سی بوتل نکالی اور کاگ کھول کر بوتل اینڈی کے منہ کی جانب بڑھا دی۔ اینڈی نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن شدید درد سے تڑپ کر منہ کے بل گر پڑا۔

"لو پی لو" اجنبی نے کہا "لو" لیکن جب اینڈی نے حرکت نہ کی تو اس نے کہا۔ "خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ میں خود پی لونگا"
اور یہ کہہ کر اس نے بوتل اپنے ہونٹوں سے لگا لی۔

"تم واقعی ابھی کم سن ہو۔ اور تمہیں شراب نہیں پینی چاہیے۔ تمہیں تو شرم آنی چاہیے کہ شراب پی کر اس طرح فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے ہو۔ میں ابھی کسی پولیس والے کو بلاتا ہوں۔"

اینڈی نے سر کے اشارے سے کہنا چاہا "ہاں ہاں ضرور بلا دیجئے۔ کسی پولیس والے کو بلا دیجئے۔"

"اوہ اب میں سمجھا تم نہیں چاہتے کہ میں پولیس کو بلاؤں اور وہ تمہیں اس حالت میں دیکھے۔ خیر میں نے تمہیں معاف کیا۔ آج تمہاری خوش قسمتی...... اپنے عروج پر ہے۔ ورنہ میں کبھی کسی کو معاف نہیں کرتا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ شب بخیر"
اجنبی نے ہاتھ ہلا کر اینڈی کو خدا حافظ کہا اور لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اینڈی پڑا سوچتا رہا ــــ "نورا ــــ نورا ــــ کیا تم اب بھی رقص کر رہی ہو۔"

دفعتاً ایک نوجوان جوڑا بارش سے بچنے کے لئے تقریباً دوڑتا ہوا اس کے قریب آیا۔ لڑکا لڑکی کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا اور لڑکی نے بارش سے اپنے بال محفوظ رکھنے کے لئے اپنے سر پر اخبار اوڑھ رکھا تھا۔ فٹ پاتھ پر پڑا ہوا اینڈی انہیں دیکھتا رہا دونوں اس کے قریب سے گزر کر قریبی مکان کے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔

"آج کس غضب کی بارش ہو رہی ہے۔ لڑکے نے کہا۔

"فریڈی۔ مجھے دیر ہو رہی ہے اب گھر جانا چاہیئے۔ لڑکی نے کہا۔

"ارے ابھی بہت وقت باقی ہے۔ ایسے خراب موسم میں اگر تم دیر سے گھر پہنچو گی تو گھر والے کچھ نہ کہینگے۔

"لیکن اندھیرا بہت گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ لڑکی نے کہا۔ اور نہ جانے کیوں کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

"ہاں واقعی" لڑکے نے ہولے سے کہا۔

"فریڈی!"

"ہوں"

"تم مجھے کھینچ رہے ہو"

"اونہوں"

چند لمحے مکمل سکوت رہا۔ اس کے بعد لڑکی نے آہستہ سے کہا "اوہ"

اینڈی سمجھ گیا کہ لڑکی کا بوسہ لیا گیا ہے۔ اور اس کی نظروں کے سامنے نورا کے گلابی ہونٹ گھوم گئے اور وہ سوچنے لگا۔ کیا وہ پھر کبھی نورا کا منہ چوم سکے گا۔ اور اس کے ساتھ پہلی بار اسے یہ گمان ہوا کہ وہ مر رہا ہے۔

"نہیں نہیں۔ اس نے سوچا۔ میں نہیں مر سکتا۔ ایسے معمولی زخم سے کوئی مر سکتا۔ ایسے زخم تو ہر روز ہی لڑائی جھگڑے میں لگ جاتے

ہیں۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نہیں مر سکتا۔

" او منہ۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ لڑکی کی آواز سنائی دی۔

" کیوں ؟ "

" یہ میں نہیں جانتی۔"

" کیا تمہیں اچھا نہیں لگتا۔"

" لگتا ہے "

" تو پھر "

" یہ میں نہیں جانتی۔"

" میں تم سے محبت کرتا ہوں انجیلا۔"

" میں بھی تمہیں چاہتی ہوں فریڈی "

اینڈی سوچنے لگا۔ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں نورا۔ نورا۔ میری نورا۔ میں سوچتا ہوں نورا کہ شاید میں مر رہا ہوں۔ ممکن ہے تم مجھے احمق سمجھو لیکن یہ سچ ہے ,نورا کہ میں مر رہا ہوں "

اُسنے بولنے کی کوشش کی۔ پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ اُسنے اُس دروازے کی جانب کھسکنا چاہا جسکی دہلیز پہ وہ نوجوان جوڑا پہلو بہ پہلو کھڑا تھا۔ اس نے اپنے حلق سے آواز نکالنی چاہی۔ لیکن صرف ایک دبی ہوئی کراہ نکلی۔ اس نے دوبارہ کوشش کی۔ پھر بھی زخمی جانور جیسی غراتی ہوئی آواز نکلی۔

" یہ کیسی آواز تھی " لڑکی نے چونکتے ہوئے کہا۔

" ہاں آواز تو میں نے بھی سنی ہے " لڑکے نے باہر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

" تو باہر جاکر دیکھو "

نہیں ٹھہرو شاید پھر صاف آواز سنائی دے۔

" اینڈی نے پھر کوشش کی۔ " فریڈی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

" اچھا میں جاکر دیکھتا ہوں "

نوجوان تیز قدموں سے اینڈی کے قریب آیا۔

" کیا ہوا تمہیں ؟ " نوجوان نے پوچھا

" کیا بات ہے فریڈی ؟ " لڑکی کی آواز آئی۔

" یہاں ایک زخمی پڑا ہے "

" فریڈی آؤ ہم یہاں سے جلد بھاگ چلیں " انجیلا نے کہا۔

" نہیں ذرا ٹھہرو "

نوجوان اینڈی پر جھک گیا " ارے تمہیں تو گہرا زخم لگا ہے۔

اینڈی نے اثبات میں سر ہلا یا۔ نوجوان اُسے گھورتا رہا۔ دفعتاً اسکی نظریں اینڈی کی پٹیڈی کا پر لکھے ہوئے حروف "دی رائلز" پر پڑیں۔

"انجیلا۔ یہ تو رائل ہے"

"میرا خیال ہے ہم لوگ ـــــــ تم کیا کرنا چاہتے ہو فریڈی"

"کچھ بھی نہیں ـــــ میں اس جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اس کا تعلق رائلز کے گروہ سے ہے۔ اگر ہم اسکی مدد کریں گے تو، گارڈنیز، کے گروہ والے ہمیں جان سے مار ڈالینگے۔ غنڈوں کی ان دونوں ٹولیوں میں بڑی گہری دشمنی ہے"

"کیا یہ ـــــ کیا یہ زیادہ زخمی ہے"

"ہاں زخم گہرا نظر آتا ہے۔"

"تو ہمیں کیا کرنا چاہئے"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"لیکن ہمیں اسے اس بارش میں فٹ پاتھ پر نہیں چھوڑ دینا چاہئے"

"اگر میں کسی پولیس والے کو اطلاع دونگا۔ اور اس کی خبر گارڈنیز کو لگ گئی تو ہماری خیر نہیں۔" کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

"فریڈی مجھے دیر ہو رہی ہے گھر والے گھبرا رہے ہونگے۔؟"

"اچھا اچھا" فریڈی نے دوسری بار اینڈی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "کیسے ہو تم؟ کیا بات ہے؟"

اینڈی نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں نے کہنا چاہا "خدا کے لئے میری مدد کرو۔" لیکن نہ جانے فریڈی نے اس کی آنکھوں کا پیغام سمجھا یا نہیں۔

"چلو فریڈی بہت دیر ہو گئی۔" انجیلا نے اس کا بازو کھینچتے ہوئے کہا اور دونوں تیز قدموں سے گلی کی جانب بڑھ گئے۔

"یہ لوگ گارڈنیز سے اتنے خوفزدہ اور ہراساں کیوں ہیں" اینڈی سوچنے لگا۔ میں تو گارڈنیز سے خوفزدہ نہیں ہوں میں تو کبھی ان کے مقابلے سے پیچھے نہیں ہٹا۔ لیکن۔ لیکن اس وقت تو میرے جسم سے خون ابل رہا ہے۔۔۔۔۔۔

بارش کے پانی کی خنکی سے اسے کچھ سکون مل رہا تھا۔ اسے برسات اچھی لگی تو اُسے یاد آیا کہ وہ نورا کے مکان میں کھڑکی کے قریب بیٹھ کر باہر سڑک پر لوگوں کو بارش سے بھاگتے دیکھ کر لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب وہ رائلز کی ٹولی میں نیا نیا شامل ہوا تھا اور اسے بڑی مسرت ہوئی تھی کہ رائلز نے اسے اپنی ٹولی میں شامل کرنا منظور کر لیا تھا۔ اُسے اس بدنام ٹولی کا ممبر بنکر فخر کا احساس ہوا تھا ـــ اب وہ بھی رائل تھا ـــ یہ نام بڑا بامعنی تھا!

اور آج فٹ پاتھ پر بارش میں زخمی پڑا تھا۔ وہ اس نام کی معنویت پر غور کرنے لگا۔ اگر وہ مر گیا تو وہ صرف اینڈی ہوگا ـــ اس کی لاش کسی رائل کی نہیں بلکہ اینڈی کی لاش ہوگی ـــــــ اور وہ سوچنے لگا کہ گارڈنیز نے جب اسے چھرا مارا تھا تو کیا انھوں نے اس حقیقت پر غور کیا تھا کہ وہ صرف اینڈی ہے؟ یا کہ انھوں نے صرف اس ریشمی بینڈی کو چھرا گھونپا تھا جس پر نمایاں حروف میں "رائل" لکھا ہوا تھا۔ اس نام کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی؟ مرنے والے کے نزدیک نام کی کیا اہمیت ہے۔؟

"میں اینڈی ہوں" وہ چیخ اٹھا "میں اینڈی ہوں"

ایک بوڑھی عورت گلی کے اس سرے سے داخل ہوئی جہاں کوڑے کرکٹ کے ٹین کے ڈبے رکھے ہوئے تھے اور جن پر بارش کی بوندیں ستار بجا رہی تھیں۔ بوڑھی عورت کے ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی چھتری تھی جس کی تیلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں لیکن وہ اس چھتری کو بڑے شاہانہ انداز میں لئے تھی اس نے ٹین کے ڈبے کے قریب پہنچ کر اس کا ڈھکنا اٹھایا۔

وہ اینڈی کے کراہنے کی آواز نہ سن سکی کیونکہ وہ اونچا سنتی تھی اور بارش کی پٹر پٹر میں کسی ہلکی آواز کا سنائی دینا یوں بھی دشوار تھا۔ بوڑھی عورت نے کوڑے کے ٹین کے اندر سے اخبار، تصویر کا ٹوٹا ہوا فریم اور اسی قسم کی دو چار گندی پرانی چیزیں نکالیں اور انھیں اپنی بغل میں دبا کر چھتری سنبھالتی ہوئی اسی طرف واپس چلی گئی جدھر سے آئی تھی۔

سڑک پھر سنسان نظر آنے لگی۔ اینڈی نے سڑک کے اگلے نکڑ سے گذرنے والی شاہراہ پر لوگوں کو آتے جاتے دیکھا اور وہ سوچنے لگا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ وہ سوچنے لگا کہ گارڈنیز کی ٹولی کا وہ کون بدمعاش تھا جس نے اسے چھرا گھونپا تھا۔

"یہی تمہاری سزا ہے راتیل"، چھرا مارنے والے نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ اور اس کے بعد صرف بھاگتے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ اور وہ فٹ پاتھ پر گر پڑا تھا۔ شدید درد کے باوجود اسے اس بات پر فخر محسوس ہوا تھا کہ اس کا تعلق رائیلز کی ٹولی سے ہے لیکن اب یہ احساس زائل ہو چکا تھا۔ بارش کے ٹھنڈے پانی میں بھیگتا ہوا۔ اپنی انگلیوں کے درمیان سے بہنے والے خون کو دیکھتا ہوا اب وہ صرف ایک ہی بات سوچ سکتا تھا ——— "میں اینڈی بننا چاہتا ہوں" اس کی یہ معصوم تمنا یقیناً کوئی بہت بڑی تمنا نہ تھی! کوئی ایسی تمنا نہ تھی جس پر اس بے رحم دنیا کو اعتراض ہو سکتا ہے۔!!

اس نے دنیا والوں کو سڑک کے اگلے نکڑ کے پاس سے گذرتے ہوئے دیکھا۔ دنیا کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اینڈی ہے۔ انھیں اس کی فکر نہ تھی کہ وہ مر رہا ہے۔ وہ چیخ کر کہنا چاہتا تھا ——— "اے دنیا والو۔۔۔ میں زندہ ہوں۔ دیکھو میری طرف۔ میں زندہ ہوں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں زندہ ہوں۔؟ کیا تم میرے وجود سے بھی واقف نہیں ہو؟

اس نے خود کو بے حد کمزور، تھکا ہوا تنہا زخمی اور ٹھنڈ سے ٹھٹھرا ہوا محسوس کیا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ قریب المرگ ہے اور اس احساس نے اسے رنجیدہ کر دیا۔ وہ خوفزدہ نہ تھا ——— وہ بالکل ہراساں نہ تھا۔ اسے صرف اس بات کا غم تھا کہ صرف سولہ سال کی عمر میں اسکی زندگی ختم ہو جانے لگی اور اس نے محسوس کیا کہ اسنے ابھی دنیا میں کچھ نہیں دیکھا، کچھ نہیں کیا۔ سیکڑوں ایسی جگہیں تھیں جنھیں وہ دیکھنا چاہتا تھا ——— سیکڑوں ایسے کام تھے جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اسے ان باتوں کا دھیان پہلے کیوں نہ آیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اسے دنگا فساد، غنڈہ گردی اور ریشمی پیلی بنڈی سے ہی کیوں دلچسپی تھی۔ یہ چیزیں جنھیں وہ پہلے بہت اہم سمجھتا تھا اس وقت اس کی نظروں میں بے حد حقیر نظر آنے لگیں تھیں۔

"میں مرنا نہیں چاہتا" اس نے سوچا۔ "ابھی تو میں اچھی طرح جیا بھی نہیں ہوں" اس نے محسوس کیا کہ مرنے سے پہلے اسے اس ریشمی بنڈی سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہئے۔ اب وہ چند لمحوں کا مہمان ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جب لوگ اسکی لاش دیکھیں تو ان میں سے کوئی یہ کہے۔ "ارے یہ تو رائیل ہے" اسنے تمام بچی کھچی طاقت جمع کر کے اٹھنے کی کوشش کی لیکن درد کی ٹیس سے بے تاب ہو کر کروٹ کے بل گر پڑا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ اس ریشمی بنڈی کو اتار پھینکنا چاہتا تھا۔ اب اس کے نزدیک اس بنڈی کی کوئی اہمیت نہ رہی تھی۔ اس پر لکھے ہوئے حروف بے معنی ہو گئے تھے۔ اب ان کا مفہوم بالکل صاف اور مختصر تھا۔

اگر اس کے جسم پر ریشمی بنڈی نہ ہوتی تو اسے چھرا نہ مارا جاتا۔ اینڈی سے نفرت کی بنا پر چھرا نہیں مارا گیا تھا۔ بلکہ اس بنڈی کی

سے نفرت کی بنا پر بنڈی میں پیوست کیا گیا تھا۔ وہ اُسے اتار پھینکنا چاہتا تھا اب وہ ایک لمحہ کیلئے بھی اُسے اپنے جسم پر برداشت نہ کر سکتا تھا۔

وہ بنڈی اتارنے کی کوشش کرنے لگا لیکن جب بھی وہ ذرا حرکت کرتا اُس کے جسم میں شدید درد کی لہر دوڑ جاتی۔ اُس نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ چند لمحوں کے بعد وہ بنڈی اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ بنڈی کو فٹ پاتھ پر پھینک کر وہ لڑھک کر اس سے دُور ہٹ گیا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اب میں اینڈی ہوں۔ صرف اینڈی۔ اب میں سکون سے مر سکوں گا۔"

نصف شب گذر جانے کے بعد نورا اُس کے قریب پہنچ سکی۔ اُس کے قریب زانو کے بل بیٹھ کر اس نے کہا۔ "آنکھیں کھولو اینڈی میں نورا ہوں۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ نورا کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے اور وہ اُٹھ کر تیزی سے بڑی سڑک کی سمت دوڑنے لگی۔ دفعتاً اُسے ایک سپاہی نظر آیا۔

سپاہی نے جھک کر اینڈی کو دیکھا اور انتہائی نرم لہجہ میں کہا "یہ تو مر گیا"

نورا کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اینڈی کے مردہ جسم اور اس سے تقریباً ایک فٹ کے فاصلہ پر پڑی ہوئی ریشمی بنڈی کو دیکھنے لگی۔

سپاہی نے بڑھ کر بنڈی اٹھائی اور اُسے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد اُس نے کہا "ارے یہ تو رانیل ہے"

نورا نے اپنی گیلی آنکھیں اٹھا کر سپاہی کی طرف دیکھا اور رندھے ہوئے لہجہ میں کہا "اس کا نام اینڈی ہے"

سپاہی نے بنڈی اپنے کاندھے پر ڈال لی اور جیب سے نوٹ بک نکال کر لکھنے لگا "رانیل"

روسی

بورس پاسترناک
ترجمہ
احمد رئیس

# میری ہستی

شور ختم گیا ہے
میں پھر اسٹیج پر آپہونچا ہوں
دروازے کی دہلیز پر جھک کر
میں بڑی توجہ سے یہ سننے کی کوشش کرتا ہوں
کہ میری ہستی میں سے کیا کچھ کم ہو جائے گا!

ہزاروں، اوپیرا چشموں، میں سے
شب کا مہیب گھنا اندھیارا
پھیل رہا ہے
ابا! بابا! اگر یہ ممکن ہو تو
یہ پیالہ میرے سامنے سے ہٹالو!

تمہارا یہ بھیانک کھیل مجھے پسند ہے
اور میں یہ محسوس کر کے مطمئن ہوں
لیکن یہ دوسرا کھیل جواب شروع ہو رہا ہے
اس سے پہلے مجھے کچھ سوچ لینے دو ......

چینی

مادام چوان
ترجمہ
سبطِ نبی صبیم

# محبوب

تیرے میرے پیار کا بندھن
ہے مضبوط
پیار کے اس بندھن کی خاطر
گیلی اور چکنی مٹی سے
اک بُت میرا اور اک اپنا
اپنے ہاتھ سے آپ بنا —

دونوں بُتوں کو توڑ دے ساجن
ان کو ریزہ ریزہ کر دے
گوندھ کے پھر سے اُس مٹی کو
دو بُت اور بنا —
اُن دونوں میں
اک تیرا ہو اک میرا ہو

میرے بُت میں تیری مٹی
تیرے بُت میں میری مٹی
یوں اک دوجے میں بس جائیں

آخر دم تک ساتھ رہیں ہم
مرنے پر بھی ہم دونوں کا
اک مرقد ہو ——

ناظم حکمت
ترجمہ
محمد قاسم

ترکی

# دوش بدوش

رفیقو!
میں اپنا ہاتھ بڑھاتا ہوں
ہم نے اپنی دوستی کے ہاتھ تمہیں پیش کر دیئے
مشرق کے انقلابیو،
ہم سے ہم آغوش ہو جاؤ
آؤ ہم تم دوش بدوش بڑھے چلیں

○

قربانیوں کی آگ میں
اگر میں نہ ہوں
اگر تم نہ ہو
اگر ہم نہ جلیں
تو پھر کس طرح
ظلمت بڑھ کر
نور میں تبدیل ہو سکے گی!

اسٹیفن اسپنڈر
ترجمہ
معنر ھادی حسین

انگریزی

# زندگی کے سُورما

میں ان لوگوں کی بابت دل میں اکثر غور کرتا ہوں
کہ جو سچ مچ بڑے تھے، یعنی وہ لوگ
جنہیں ازبر تھی اپنی رُوح کی تاریخ سرتا سر؛
ازل کے روز سے آغاز کرکے بطنِ مادر تک
گزر کر آئی وہ کیونکر تجلی کے اُطاقوں سے،
جہاں پر ساعتیں اک طائفہ تھیں آفتابوں کا،
غزل خواں، وجد میں رقصاں؛
وہ جن کے دل کی واحد آرزو یہ تھی کہ اُن کے لب
زبانِ شعلہ سے ناطق،
اُسی رُوح سراپا زمزمہ کے زمزمے گائیں،
جنہوں نے شاخسارِ نوبہاراں سے سمیٹے اپنے دامن میں
امنگوں کے شگوفے، جن کی بارش ان پہ جاری تھی

پتے کی بات تو یہ ہے،
کبھی جلنے نہ دیجے ہاتھ سے وہ سرخوشی خوں کی
جسے پایا ہے ہم نے ان قدیم الاصل چشموں سے
جنہوں نے اس زمیں کی آفرینش سے بہت آگے
دلِ تحت الثریٰ کی تشنہ کامی کو مٹایا تھا
کبھی کفرانِ نعمت کیجیے اُن کا نہ بھولے سے،

نہ انکار اس سے کیجے صبح صادق کے اُجالے میں
نہ اس کا وہ تقاضائے محبت مسترد کیجے
جسے وہ شام کی تاریکیوں میں پیش کرتی ہے
کبھی انبوہ کے اس شور و غل، اس آمد و شُد کو
نہ حارج ہونے دیجے روح کے پھُولوں کے کھلنے میں

یہ برفانی کہستاں، دھوپ کے پھیلے ہوئے میداں
سب اُن کے نام لیوا ہیں
کہیں تو سبزہ اُن کی شان کا پرچم اُڑاتا ہے
جٹا دھاری گھٹائیں سر کہیں دُھنتی ہیں رہ رہ کر
ہوائیں بھی اُنھی کا نام چپکے چپکے جپتی ہیں
فلک مبہوت سُنتا ہے

یہ اُن کے نام ہیں جو سُورما تھے زندگانی کے،
جنہوں نے عشق کے گلخن سے افروزاں تریں شعلہ
لیا اور دل کے اوپر ایک تمغے کی طرح پہنا
نسب میں آفتابی، آفتابوں کے وہ جویا تھے
کہ تھوڑی دُور چل کر جادۂ ذوقِ تجلی پہ
ہوا پر کر گئے ہیں ثبت اپنے فخر کا طغرا

## یارانِ محفل

# محفل

قیصر تمکین ○ شعیب صدیقی
خلیل رامپوری ○ تاج سعید
خورشید احمد جامی

### قیصر تمکین - کینٹ (انگلینڈ)

آپ نے جس لگن محنت اور خلوص سے افکار کو زندہ رکھا اور اس کے لئے جو عرق ریزیاں کی ہیں، اور اب بھی اس انتہائی حوصلہ شکن اور "دل کے لئے موت" کے دور میں محض "برائے ادب" کی خاطر جس طرح تن من دھن سے اس کو نہ صرف استحکام عطا کر رہے ہیں بلکہ برابر اس کی ترقی کے لئے کوشاں بھی ہیں۔ وہ کوئی ایسا معمولی کارنامہ نہیں ہے جس کو ادب کا کوئی بھی نام لیوا کبھی نظرانداز کر سکے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس راہ میں آپ کو اکثر بے تکی نکتہ چینیوں اور غیر ہمدردانہ تنقیدوں کا جو سامنا کرنا پڑا ہے اُس کے لئے ہم سب (آنے والے زمانے میں) ادبی مورخین کی نظر میں قابلِ گرفت ہی نہیں بلکہ مجرم ٹھہرائے جائیں گے۔ یہ آپ کا ہی نہیں بلکہ پوری علمی و ادبی تاریخ کا المیہ ہے کہ مخلصانہ خدمات اور پُراسرار کاوشوں کو قرار واقعی سندِ پسندیدگی و اعتراف بھی اس وقت نہ نصیب ہوئی جب اس کی حقیقی ضرورت ہوتی ہے۔

### شعیب صدیقی، حیدرآباد

عرصے سے دو خطوں کا جواب اُدھار تھا۔ افکار کا ہر تازہ ماہنامہ کچھ ایسی پابندی سے موصول ہوا کہ میں گھبرا اٹھا۔ شرم بھی محسوس ہوئی۔ معذرت خواہ ہوں۔ عدیم الفرصتی کا عذر نہ صرف یہ کہ

رنگ' ہے مگر کافی عامیانہ بھی ہے ۔ ویسے میں مصروف کافی رہتا ہوں ۔

'افکار' اور 'صہبا' کچھ لازم و ملزوم سے ہیں ۔ یہ نہیں معلوم یہ تخلص آپ نے پہلے اپنایا تھا یا جریدہ کا نام پہلے رکھا ۔ ویسے اس میں اب میری آشفتہ سری کو بھی دخل ہو گیا ہے لہٰذا اضافہ صہبا کا دلدادہ ہو گیا ہے ۔ نہ صہبا ہی بھولنے کی چیز ہے اور نہ افکار کو ہی فراموش کیا جا سکتا ہے ۔

سعدی کے اخلاقی چٹکلے، اُن کے پند و نصائح کچھ اگلے وقتوں کی باتیں معلوم ہونے لگی ہیں ۔ 'خداوندانِ روزی' کو نہ تو "اشتغالِ حق" کا کچھ ذوق باقی ہے اور نہ ثقافتی اقدار کی قدر' یہ سب کچھ تو اسباب "پیمانۂ روزی" کے لئے مقرر ہو چکا ہے ۔ مگر اُن کے شیشے تو "محرومِ صہبا" ہیں ۔ لہٰذا وہ سوچ سوچ کے ہی سر دُھنتے رہتے ہیں ۔ اور کبھی اگر طبیعت زیادہ جوش پہ آجائے تو سر بھی پیٹ لیتے ہیں ۔ اگرچہ طبیعت ہلکی تو ہو جاتی ہے مگر طریقِ کار کچھ اچھا نہیں ۔ اس سے نہ تو 'ذوقِ لطیف' عام ہوگا اور نہ خونِ جگر کی تشہیر ہی ہو سکے گی ۔ لہٰذا بات پھر گھوم پھر کر تونگری اور اس کی ادب نوازی پر جا ٹھہرتی ہے ۔ مگر وہاں تو کچھ عجیب حال چال ہیں ۔ سفید و سیاہ کا چکر ہے ۔ لہو و لعب کا کھیل ہے ۔ نہ ادب ہے نہ ادب نوازی ۔ ثقافت سے بھی صرف اسی قدر دلچسپی ہے کہ اگر وہ باعثِ فروغِ کاروبار ہے تو ٹھیک ہے ورنہ کہاں فرصت ہے ۔

## خلیش رام پوری ۔ بھکر

'افکار' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا ۔ شکریہ ۔

مدنی صاحب پر سیر حاصل مضمون سحر انصاری صاحب کی اَن تھک کاوش کا حاصل ہے' مضمون دو اقساط میں شائع ہوا ۔ اور میں نے جی لگا کر پڑھا بھی ۔ بلا شبہ مدنی صاحب کا اپنا خاص رنگ اور مزاج ہے ۔ اُن پر مضمون لکھنے کے لئے پہلے خاصے مطالعے کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ یہاں تک کہ ساتوں آسمانوں سے گزرنا پڑتا ہے سو، سحر انصاری صاحب گزرے ہیں سحر انصاری صاحب کی طرح کون اتنی منزلیں مارے گا ؟

'اشاریہ' میں آپ نے درست مشورہ دیا ہے کہ کراچی کی انجمن ترقیٔ اردو کو چاہئے کہ اپنے خول سے باہر نکل کر خدمت کرے ۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا ۔ میاں ہر کوئی اپنا جھنڈا اپنے ہاتھ میں بلند رکھنے کا خواہش مند ہے ۔۔۔۔

## تاج سعید ۔ پشاور

'افکار' کا تازہ شمارہ ملا ۔ "دشتِ امکاں" کا ایک سفر ۔ خوب ہے ۔ تازہ قسط

سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سوا انصاری نے خوب ڈوب کر لکھا ہے۔ اور مدنی کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ ادیب سہیل کی نظم پسند آئی۔

**خورشید احمد جامی - حیدر آباد دکن**

"نئی تخلیق نمبر" کی پیشگی مبارکباد قبول فرمائیے۔ مدد شبہ ہند و پاک کے اردو رسائل میں "افکار" نے اپنا ایک مثالی تاریخ بنائی ہے۔ اور اس تاریخ کا ایک ایک نقش آپ کے عزم و عمل اور فکر و نظر کی کرنوں سے جگمگاتا رہے گا۔

ص۔ل

# رفتارِ عمل

ادبی و تہذیبی خبریں اور تبصرے

## پیکنگ میں ۵۳ ملکوں کے ۱۶۱ مصنفوں اور دانشوروں کا تاریخی اجتماع

### سامراجی اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد کرنیوالے افرشیائی ملکوں کی حمایت

### افریشیائی مصنفین عوام کو سامراجی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کریں

### افریشیائی مصنفین کی تیسری کانفرنس بھی پیکنگ میں ہوگی

پیکنگ - گذشتہ دنوں یہاں منعقد ہونے والی افروایشیائی مصنفین کی کانفرنس نے سامراجی اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد کرنے والے افریقی و ایشیائی ممالک کی مکمل حمایت کا اعلان کیا ہے۔ کانفرنس کے اختتام پر جو مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا ہے، اس میں کشمیر، ویت نام اور فلسطین کی آزادی کی جدوجہد کرنے والے حریت پسندوں کی جدوجہد کو سراہا گیا ہے۔ اعلامیہ میں ویت نام میں امریکہ کے انسانیت سوز مظالم اور شہری علاقوں پر وحشیانہ بمباری کی بھی شدید مذمت کی گئی ہے، اور دنیا کے مختلف ممالک سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ ویت نامی عوام کی کھل کر حمایت کریں۔ اس کانفرنس میں ۵۳ ممالک کے ۱۶۱ مصنفوں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ مصنفین نے اپنے اعلامیئے میں کہا ہے کہ کانفرنس کی کامیابی بذاتِ خود سامراجی طاقتوں کی عبرتناک شکست ہے۔ کانفرنس نے ویت نام میں امن کے سلسلے میں شمالی ویت نام کی حکومت کے پانچ نکاتی فارمولے کی مکمل حمایت کی، اور اس کو ویت نام میں امن کی بحالی کا واحد طریقہ قرار دیا۔ کانفرنس نے وحشیانہ بمباری کے دوران ویت نام میں امن کی تجاویز کو پُرفریب قرار دیا۔ کانفرنس کے اعلامیے میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام کے لئے سب سے بڑا خطرہ امریکی سامراج کو قرار دیا گیا ہے اور افروایشیائی مصنفین سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ سامراج کے ناپاک عزائم کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی تحریروں سے

ذریعے عوام کو تیار کریں اور سامراجی منصوبوں کو خاک میں ملا دیں۔ کانفرنس میں پاس ہونے والی قراردادوں میں فلسطین، کشمیر اور دوسرے علاقوں میں آزادی کی جدوجہد کرنے والے عوام کی کوششوں کو سراہا گیا ہے۔ کانفرنس میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ افروایشیائی ممالک کے مصنفین کی تیسری کانفرنس بھی پیکنگ میں منعقد ہوگی۔ اس کانفرنس میں پاکستانی وفد نے بھی مشہور افسانہ نگار شوکت صدیقی کی قیادت میں شرکت کی۔ چیئرمین ماؤزے تنگ نے بھی کانفرنس میں شریک ہونے والے افروایشیائی ادیبوں سے ۹ر جولائی کو ملاقات کی۔

## نیویارک میں پی ای این کا ۳۴واں جلاس

نیویارک۔ گذشتہ دنوں یہاں پی، ای، این نامی بین الاقوامی ادبی ادارے کا ۳۴ واں اجلاس منعقد ہوا، جس میں ۵۴ ملکوں کے تقریباً چھ سو شعراء، ڈرامہ نگار، مضمون نگار اور ناول نگار شریک ہوئے۔ ان میں پاکستان کے ادیب بھی تھے۔ جلسے کا موضوع "ادب اور آزادانہ ماحول" تھا۔ عالمی مفاہمت کو فروغ دینا، اظہارِ خیال کی آزادی کی حمایت کرنا، دوستانہ تعلقات کو برقرار رکھنا اور تمام ملکوں کے مردوں اور عورتوں میں روشن خیالی کو فروغ دینا شامل ہیں۔ مشہور امریکی مصنف آرتھر ملر نے جو پی ای این کے صدر ہیں کہا کہ ادھر چند سال سے اس ادارے کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں مصنفین دنیا سے بہت زیادہ واقف ہو چکے ہیں، اور وہ یہ جانتے ہیں کہ انہیں موجودہ معاشرے میں کیا کردار ادا کرنا ہے۔ ادارے کے منتظم عمومی برطانیہ کے ڈیوڈ کارور نے جلسے سے پہلے ایک اخباری کانفرنس میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ چھ ممبروں پر مشتمل روسی وفد نے اس جلسے میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔

## قاہرہ میں پاک و ہند مشاعرہ

### فیض احمد فیض اور سردار جعفری کی شرکت

قاہرہ۔ پچھلے دنوں یہاں ہندوستانی طلبہ نے ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ جس میں پاکستان اور ہندوستان کے مشہور شعراء نے شرکت کی۔ پاکستان کے مشہور شاعر فیض احمد فیض اور ہندوستان کے مشہور شاعر علی سردار جعفری نے اپنا کلام سنایا۔ ہندوستانی سفارت خانہ کے فوجی اتاشی مسٹر نرائن نے بھی مشاعرے میں حصہ لیا۔ جناب نرائن اردو، عربی اور فارسی کے اسکالر ہیں۔ مشاعرے میں ہندوستانی طلبہ اور مصری شعراء نے بھی اپنا کلام سنایا۔

## ہونہار طلبہ اور لائق اساتذہ کے لئے صدارتی تمغے اور انعامات

راولپنڈی۔ وزارت تعلیم کی سفارش پر صدارتی کابینہ نے پچھلے دنوں معیار تعلیم کو بلند تر کرنے اور ہونہار طلبہ اور لائق اساتذہ کی حوصلہ افزائی کے جذبے سے صدارتی تمغوں اور نقد انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہر سال ۸ طلبہ اور ۱۶ اساتذہ پرائمری سے یونیورسٹی گریڈ تک ان گرانقدر اعزازات اور انعامات سے مستفید ہو سکیں گے۔ پاکستان کے نظام تعلیم کو بہتر کرنے اور اعلیٰ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے صدارتی کابینہ کے اس دوررس اور قابلِ قدر اقدام کا ملک کے ہر طبقہ میں خیر مقدم کیا گیا ہے۔

# استعمار کے خلاف افریشیائی ادیبوں کو متحد ہو کر جدوجہد کرنا چاہیئے

## افریشیائی ادب کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کی اشد ضرورت

## فن اور ادب کو نعرہ بازی سے بچایئے۔ فکری اتحاد کے لئے ادیبوں کا آزادانہ تبادلہ کیجئے

### سویت ادیبوں سے فیض احمد فیض کا خطاب

ماسکو۔ پاکستان کے مایۂ ناز لینن انعام یافتہ شاعر فیض احمد فیض نے جو ان دنوں ماسکو میں ہیں۔ سویت یونین کے ادیبوں اور شاعروں کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے افرو ایشیائی عوام کی جدوجہد آزادی میں ادیبوں کے اس اتحاد فکر و نظر کی بے حد تعریف کی، جس کا اظہار گذشتہ دنوں قاہرہ کے اجلاس میں کیا گیا تھا۔ آپ نے اس بات پر زور دیا کہ افریشیائی ادیب اپنے قلم و ذہن کو استعمار سے نبرد آزما ایشیائی عوام میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لئے وقف کر دیں۔ اس لئے کہ اس عظیم مرحلے کو سر کرنے کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ عوام کے ذہنوں کو جدوجہد آزادی کے لئے بار بار جھنجھوڑا جائے اور ان میں آزادی کے لئے قوت عمل پیدا کی جائے۔ فن اور ادب کو یہ کام نعرہ بازی سے ہٹ کر انجام دینا ہوگا۔ اس مرحلے کو سر کرنے کے لئے ایک اور اہم بات جو مفید مطلب ہو سکتی ہے یہ ہے کہ ہم اپنے اپنے ملکوں کی ادبی شخصیتوں کا آزادانہ تبادلہ کریں — اس طرح ہمارا لائحہ عمل اور طرز فکر ایک دوسرے کے قریب تر ہو سکے گا۔

آپ نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ چونکہ استعماری ممالک کے بعض بڑے اشاعتی ادارے ہم ایشیائی ممالک کے ترقی پسند ادب کو ہمارے اپنے ہی ملکوں میں نہیں پہونچنے دیتے، اور اپنے ادب کی بھرمار سے ہماری راہ روکتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ہم وسیع پیمانے پر افریشیائی ادب کی نشر و اشاعت کا خود ہی کوئی طریقہ کار اپنائیں۔ مخلص اور دیانت دار ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ایشیائی عوام کے چند در چند مسائل سے آگاہی حاصل کریں، اور غور و فکر کے بعد واضح لائحہ عمل مرتب کریں۔ آج ادیبوں کو ویٹ نام کے ان جیالے عوام کی کھل کر حمایت کرنا چاہیئے جو امریکی سامراجیت سے آزادی کے لئے برسر پیکار ہیں۔ آج کی عالمی سیاست نے امن و آزادی کے لئے جو خطرات پیدا کر دیئے ہیں، اس کے پیش نظر ادیبوں اور دانشوروں کی ذمہ داریاں کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ عوام کی خوش حالی، مسرت اور آزادی کی جنگ میں کھل کر ان کا ساتھ دیں۔

فیض صاحب نے قاہرہ میں افریشیائی ادیبوں کے اسٹینڈنگ بیورو کی منظور شدہ قرار دادوں کی پر جوش حمایت کی، اور امید ظاہر کی کہ یہ فیصلے دور حاضر کے اہم مسائل کو حل کرنے میں ممد ثابت ہوں گے۔

## جگر مراد آبادی پر ڈاکٹریٹ

لکھنؤ۔ محمد اسلام صاحب کو لکھنؤ یونیورسٹی نے ان کے مقالے "جگر مراد آبادی، حیات اور شاعری" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ محمد اسلام صاحب نے یہ مقالہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صاحب صدر شعبۂ اردو فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کی رہنمائی میں مرتب کیا ہے۔

## ایشیائی اہل قلم کی تحریک کا نیا موڑ

پیکنگ۔ نائب وزیر اعظم و وزیر خارجہ مارشل چن ای نے افریشیائی اہل قلم کی ہنگامی نشست کے افتتاح سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ یہ اجلاس نہ صرف ایشیائی اہل قلم کی تحریک کا ایک بالکل نیا موڑ ہے، بلکہ افریشیا اور لاطینی امریکی ممالک نیز تمام دنیا کے مصروف جہاد عوام کے لئے بھی نہایت ہمت افزا علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ افریشیائی عوام سامراج کش اور آزادی حریت کے متوالے ہیں اور آج ہمیشہ سے زیادہ بیدار ہیں۔ ان کی طاقت اور جدوجہد کی شدت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ افریشیائی حالات کے دھارے میں اصل طاقت انہیں عوام کے ہاتھ میں ہے۔

## ساقی کا "رزم حق و باطل نمبر"

### سید فیضی کی قومی خدمات کا اعتراف

کراچی۔ گذشتہ دنوں ماہنامہ ساقی۔ نے "رزم حق و باطل نمبر" جو تمام تر سید فیضی کی طویل رزمیہ نظموں پر مشتمل ہے پیش کیا ہے۔ اشارات کے عنوان سے شاہد احمد دہلوی مدیر ساقی نے، تاثرات کے عنوان سے ضیا جالندھری نے اور سخنہائے گفتنی کے عنوان سے شہزاد احمد نے ابتدا میں ان رزمیہ نظموں کے پس منظر اور سید فیضی کی گراں مایہ قومی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد تاریخ وار مختلف عنوانات کے تحت یہ طویل رزمیہ نظم شروع ہوتی ہے — عرصۂ کارزار — یکم ستمبر ۶۵ء تا ۲۳ ستمبر ۶۵ء کے واقعات پر اور سرود جنگ ۲۴ ستمبر ۶۵ء تا ۲ اکتوبر ۶۵ء کے حالات پر مشتمل ہے۔ اول تا آخر واقعاتی صداقت، قومی جذبۂ عمل اور فکری صداقت کارفرما ہے — پاک بھارت جنگ اگرچہ دونوں پڑوسی ملکوں سے نئے عبرت کے کئی سامان چھوڑ گئی ہے۔ پھر بھی اس کے دور رس اور انقلابی اثرات سے انکار ممکن نہیں۔ سید فیضی نے جس جذبۂ قومی سے سرشار ہو کر یہ رزمیہ تاریخ تحریر کی ہے، وہ شعری لطافتوں سے زیادہ تاریخی حقائق کی بنا پر ہمیشہ زندہ رہے گی۔ مدیر ساقی اس یادگار اور تاریخی پیش کش کے لئے قابل مبارکباد ہیں۔

## اشتہاری تجارت میں نیا رجحان

کراچی۔ کراچی کے اخباروں میں "ہر نظر سوئے فلک" کے نام سے جو انوکھا اشتہار شائع ہوا تھا، اس میں لوگوں کو اگلے روز شام ۵ بجے سے ۷ بجے تک آسمان پر ایک عجیب و غریب چیز دکھائی دینے کی اطلاع دی گئی تھی۔ یہ عجیب و غریب چیز ایک طیارے کے پیچھے بندھا ہوا اسی فٹ لمبا اسٹینڈرڈ ڈرنک کا بینر تھا۔ اشتہاری تجارت میں یہ نیا رجحان میکفا ایڈورٹائزرز کا تیار کردہ تھا جسے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ جہاز مسلسل دو گھنٹے تک پرواز کرتا رہا۔

## ۲۵۰ سالہ قدیم "تاج اللغات"

آگرہ۔ یہاں ایک کتاب "تاج اللغات" دستیاب ہوئی ہے۔ جو عربی اور فارسی کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کی چھپائی لیتھو کی ہے اور یہ ۲۵۰ سال پرانی ہے۔ اس کے ہر صفحہ پر اودھ کے حکمراں واجد علی شاہ کی مہر ثبت ہے۔ اور یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہر جلد میں ۸۰۰ صفحات ہیں، اور کاغذ کھردرا ہے۔

# سائنس کی تعلیم اردو میں ہوگی

## پنجاب یونیورسٹی کا قابلِ قدر اقدام

لاہور۔ پنجاب یونیورسٹی کے حکام نے سائنس کے مضامین کے لئے اردو کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر متعارف کرنے کے لئے عملی اقدام کیا ہے، اس سلسلے میں یونیورسٹی کی طرف سے مقامی گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر نذیر احمد کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ وہ علم الحیوانات کی درسی کتب کی طباعت کے لئے اردو میں مواد تیار کریں گے۔ اس کے علاوہ دیگر سائنسی مضامین کے لئے اردو کتب تیار کرنے میں بھی وہ یونیورسٹی کی معاونت کریں گے، یاد رہے کہ پوسٹ گریجویشن کی سطح پر پہلے ہی اردو کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اختیار کیا جا چکا ہے۔

# قومی زبانوں کے معیاری ٹائپ رائٹر

## پاکستان کے لئے جرمن فرم نے تیار کرلئے

کراچی۔ مجلس ترقی اردو اور بنگلہ ڈولپمنٹ بورڈ کے تیار کردہ اردو بنگلہ کے معیاری کلیدی تختے کے مطابق نئے ٹائپ رائٹر عنقریب پاکستان پہونچنے والے ہیں۔ یہ ٹائپ رائٹر تحقیقاتی مرکز حروف نے جرمن کی ایک فرم سے خاص طور پر تیار کرائے ہیں۔ مرکز کے ڈائرکٹر مسٹر تمنائی نے کئی ماہ تک جرمنی میں ٹائپ رائٹر کے کارخانوں میں رہ کر خود اپنی نگرانی میں ان مشینوں کو تیار کرایا ہے۔ ٹائپ رائٹر کے حروف کا ڈیزائن بالکل نیا ہے جو پاکستان کے عوام کے مزاج سے پوری مناسبت رکھتا ہے۔ یہ ڈیزائن بھی مرکز نے ہی ان مشینوں کے لئے تیار کیا ہے۔ تحقیقاتی مرکز ان مشینوں کی عنقریب کراچی، لاہور، راولپنڈی، ڈھاکہ، اور [illegible]گام میں نمائش بھی کرے گا۔

# بیگم عطیہ فیضی کے لئے

## تاحیات وظیفہ کی منظوری

کراچی۔ بلدیہ کراچی نے ممتاز اور ناموَر آرٹسٹ خاتون بیگم عطیہ فیضی اور ان کی ہمشیرہ کی خدمات کے صلے میں تاحیات پندرہ سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ اجلاس نے ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

# پیر حسام الدین راشدی کو ایرانی اعزاز

کراچی۔ پاکستان کے مشہور مفکر، مرکزی اردو بورڈ اور سندھی ادبی بورڈ کے ایڈیٹر پیر حسام الدین راشدی کو شہنشاہ ایران نے ان کی ادبی خدمات کے صلے میں "نشانِ سپاس درجہ اول" عطا کیا ہے جو ایران کا سب سے بڑا ادبی اعزاز ہے۔ اس سے پہلے حکومت ایران انہیں سنہ ۶۵۹ میں ایک اور "نشانِ سپاس" اور حکومت پاکستان سنہ ۶۴ء میں "ستارۂ امتیاز" کے اعزازات دے چکی ہے۔

# کلامِ مصحفی کی اشاعت

نئی دہلی۔ اطلاع ملی ہے کہ مجلس اشاعت ادب باڑہ ہندوراؤ دہلی نے اردو کے قدیم و نامور شاعر مصحفی کا کلام شائع کیا ہے۔ اردو کا یہ عظیم و بلند پایہ شاعر اب تک گوشۂ گمنامی میں پڑا تھا۔ اب شائقین ادب کو پہلی بار مصحفی کے کلام کے مطالعے کا موقع ملے گا۔

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی — طابع: مشہور آفسٹ پریس کراچی [illegible]لسن روڈ کراچی　فون ۳۱ ۳۹ ۵



**BUSINESS REPLY CARD**

| Postage will be paid by the Addressee | G. P. O.<br>KARACHI<br>*Permit No. 210* | No Postage stamp is necessary if posted in Pakistan |
|---|---|---|

*To,*

*The Manager,*

MAKTABA-E-AFKAR,
ROBSON ROAD,
KARACHI - 1
(W. Pak)

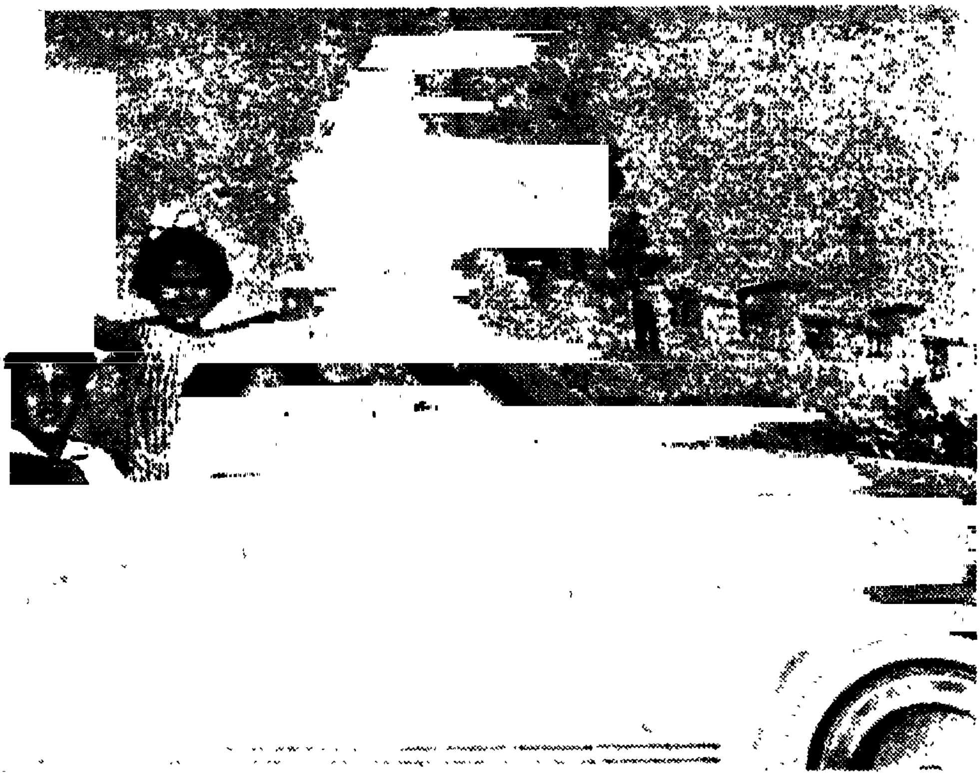






PIA

# خوشگوار سفر!



اگر آپ ایسو گیسولین استعمال کرتے ہیں تو ہمیں یقین ہے کہ آپ "ہیپی موٹرنگ" کا صحیح لطف اٹھاتے ہیں۔ فوری اسٹارٹ ... تیز اور آرام دہ رفتار کے لئے ایسو گیسولین استعمال کیجئے۔ اور بغیر کسی پریشانی کے خوشگوار سفر کا لطف اٹھائیے! اور اس کے علاوہ فی گیلن زیادہ آرام دہ مسافت طے کیجئے۔

**ایسو اسٹینڈرڈ ایسٹرن انکارپوریٹڈ**

Esso

پاکستان



ایسو گیسولین کے لئے
"ہیپی موٹرنگ"
کے نشان پر تشریف لائیے۔




# امین میٹنگ

## ہر جگہ کے لیے موزوں!

ڈرائنگ روم ہو یا ڈائننگ روم۔ استراحت کا کمرہ ہو یا مطالعہ کا، راہداری ہو یا زینہ۔ کم قیمت اور پُر وقار امین میٹنگ (دریاں) ہر جگہ کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ مختلف دلآویز ڈیزائنوں میں اپنی پسند کے شوخ اور صوفیانہ رنگوں کا انتخاب کیجیے۔

اعلیٰ معیار؟ جی ہاں! امین میٹنگ مضبوط پٹ سن سے بُنی جاتی ہیں اور ان کے پختہ رنگ کثرت استعمال کے باوجود شگفتہ رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کو عام دریوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔

امین کی خوش رنگ دریوں سے اپنے گھر کی رونق دوبالا کیجیے۔

**امین سیلز لمیٹڈ** صدر گھاٹ روڈ۔ چٹاگانگ۔ پوسٹ بکس: ۱۵۔ فون: ۵۹۴۱/۳

شاخیں: کراچی ۲۳۳۰۸۲ ۔ لاہور ۶۸۶۰۶ ۔ راولپنڈی ۶۵۰۳۵ ۔ ڈھاکہ ۶۶۵۸، ۳۷۳۵

NATIONAL 367C

# اس شمارے کی

**چند تازہ و غیر مطبوعہ تخلیقات**

پروفیسر آل احمد سرور ——— نظم کی زبان

انجم اعظمی ——— تقسیم کے بعد

رضا افتخار حسین — فرانس میں اردو (آخری قسط)

۱۶ منظومات ، ۶ افسانے ، ۵ دیس دیس کی نظمیں

۱۰ نئی نئی کتابوں پر تبصرے اور ادبی و تہذیبی خبریں

صفحات : ۱۰۴

قیمت : صرف ایک روپیہ

ہر بک اسٹال سے مل سکتا ہے

## افکار دوستوں سے

# ایک اپیل

## افکار کو دس ہزار سالانہ خریداروں کی ضرورت ہے

خریداری مہم میں حصہ لے کر
اردو کا حلقہ وسیع کیجئے

یکم اگست ۶۶ء سے افکار کی خریداری مہم شروع کی گئی ہے جو ۳۱ر دسمبر تک جاری رہے گی۔ افکار کو دس ہزار سالانہ ممبروں کی ضرورت ہے جو صرف افکار دوستوں اور اردو زبان و ادب کے بہی خواہوں کے عملی تعاون سے بآسانی فراہم ہو سکتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ تمام افکار دوست، دردمندان اردو اور ادب نواز حضرات اس ادبی مہم میں حصہ لے کر افکار کی رفاقت و اعانت فرمائیں گے۔ دس کروڑ کے اس ملک میں اردو سے محبت رکھنے والوں کی تعداد کسی طرح پانچ کروڑ سے کم نہ ہوگی۔ اگر اردو زبان و ادب کا ہر شیدائی دو دو چار چار سالانہ خریدار افکار کو فراہم کر دے تو دس ہزار تو کیا دس لاکھ خریدار بھی بآسانی دستیاب ہو جائیں گے اور اس طرح اردو کا ادبی حلقہ وسیع سے وسیع تر ہو سکے گا۔ افکار آپ کے ہر ممکن تعاون کا مستحق ہے۔

- تمام سالانہ ممبروں کو "تمنّے تخلیق نمبر" بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔
- خریداری مہم میں عملی حصہ لینے والے تمام حضرات کے اسمائے گرامی (بشرط اجازت) افکار میں شائع کئے جائیں گے۔
- کم سے کم دس سالانہ ممبر فراہم کرنے والے حضرات کی خدمت میں مکتبۂ افکار چند معیاری کتابیں بطور تحفہ پیش کرے گا۔ کتابوں کی قیمت بیس روپے سے کم نہ ہوگی۔

افکار، آپ کا اپنا رسالہ ہے
اس کی توسیع اشاعت میں عملی حصہ لے کر تعاون کیجئے

ناظم نشر و اشاعت
ماہنامہ افکار - رابسن روڈ - کراچی

منظور شدہ محکمہ تعلیمات کراچی لاہور پشاور کوئٹہ
جاری شدہ ۱۹۴۵ء ٭ ٹیلی فون: ۳۹۹۳۴

# افکار

سال: ۲۲ ○ شمارہ: ۱۸۱

مدیر
صہبا لکھنوی

| زر سالانہ | بیرونی ملکوں سے | | فی پرچہ |
| --- | --- | --- | --- |
| ۱۲ روپے | ۴۰ شلنگ | ۱۰ ڈالر | ایک روپیہ |

## مکتبہ افکار
رابسن روڈ، کراچی

لندن ایجنسی
۱۴ - پرنسیز ایونیو - لندن - این - ڈبلیو - نمبر ۹

ان گنت اچھوتی، منفرد اور بے مثال

خاص اشاعتوں کے بعد

# افکار

کی ایک اور چونکا دینے والی اور خوب صورت پیش کش

# نئی تخلیق نمبر

اس نمبر میں وہ سب کچھ ہوگا جس کی آپ افکار سے توقع رکھتے ہیں

افکار معمولی نہیں ہمیشہ غیر معمولی نمبر پیش کرتا ہے

## نئی تخلیق نمبر

روایتی حسن و معیار کے ساتھ

وسط اکتوبر ۶۶ء میں

شائع ہو رہا ہے

نئے سالانہ ممبر

۱۲ روپے ذریعہ منی آرڈر بھیج کر نئی تخلیق نمبر مفت حاصل کر سکتے ہیں

## افکار

ماہنامہ ادبی رسائل کی آبرو ہے

اس کی سرپرستی کیجئے

اور توسیع اشاعت میں حصہ لیجئے اور معیاری ادب کو فروغ دیجئے

# مکتبۂ افکار

رابسن روڈ کراچی

## ستمبر ۱۹۶۶ء کی تخلیقات

اس شمارے کی تمام تخلیقات براہ راست حاصل کی گئی ہیں۔ مضامین نظم و نثر کا حق اشاعت محفوظ ہے کوئی تخلیق تحریری اجازت کے بغیر شائع نہیں کی جا سکتی

اشاریہ — صہبا لکھنوی

پاکستان ایک زندہ اور باعمل قوم کی حیثیت سے ۱۴ راگست ۴۷ء کو معرض وجود میں آیا تھا۔ اس تاریخی دن کی اہمیت سے انکار کے معنی اپنے وجود کی نفی ہے۔ لیکن اس دن کو ہم رسم کی طرح منانے کے بجائے اپنے وجود کی بقا اور قومی خوابوں کی تعبیر پر غور وفکر کر کے نئے عزائم کو زندگی میں جگہ دے سکتے ہیں۔ ابھی ہم تعمیر و ترقی کی منزل میں ہیں، اور یہ منزل کئی کٹھن راستوں سے گزرتی ہے ہمیں صرف صنعتی انقلاب یا قومی معیشت کے استحکام پر ہی تمام تر توجہ صرف نہیں کرنا ہے بلکہ پوری قوم کے لئے آسودگی اور خوشحالی کے اسباب فراہم کرنا ہیں۔ ملک سے غریبی اور افلاس کو مٹانا ہے۔ تعلیم کی چند در چند مشکلات پر قابو پانا ہے ہر فرد کے لئے سہل الحصول بنانا ہے ——— - ——— بے روزگاری کو دور کرنا ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ اس ملک دشمن طبقے کا قلع قمع کرنا ہے جو قومی استحکام اور پاکستان کے نظریہ اتحاد کو نقصان پہونچانے کے درپے ہے۔ ہمیں چور بازاری، گرانی اور لوٹ کھسوٹ کرنے والے عناصر کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہر ترقی پذیر سماج کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے آزادی اور جمہوری نظاموں کو تباہ کر رکھا ہے!

۱۴ راگست کی طرح ہمارے لئے ۲۳ر مارچ کا دن بھی تاریخ کا دن ہے کہ اسی دن ہم نے پاکستان کے تصور کو عملی شکل دینے کا عہد کیا تھا۔ پھر ۲۱ر اپریل کا دن ہے جب مفکر مشرق علامہ اقبال کی یاد منائی جاتی ہے اور جسے ہم اس نظریہ کا خالق سمجھتے ہیں۔ ۲۵ر دسمبر ہمارے قائد اعظم کی پیدائش کا دن ہے۔ اس دن کی اہمیت بھی ۱۴ راگست اور دوسرے دنوں سے کم نہیں، بلکہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ اور اب ہم ۶ر ستمبر کا دن بھی پہلی بار منا رہے ہیں۔ یہ یوم دفاع ہے، سال بھر پہلے پڑوسی ملک بھارت نے پاکستان پر بھرپور حملہ کر دیا تھا، اور ہم نے اپنے وجود کی جنگ لڑ کر پھر ایک بار دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ ہم ایک زندہ، باعمل، جری اور حوصلہ مند قوم ہیں اور ہمیں زندہ رہنے کا حق ہے۔

یہ تاریخی دن ہمیں کئی سبق دیتے ہیں۔ اور زندہ قومیں اپنے تاریخی دنوں سے ہمیشہ درس تپش بھی حاصل کرتی ہیں اور سوز یقیں بھی۔

آیئے ہم پھر صمیم قلب کے ساتھ یہ عہد کریں کہ ہم پاکستان کے قیام و استحکام کے لئے، ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی کے لئے، نئی نسل کی صحیح فکری تربیت کے لئے اور قومی وقار کے لئے قربانی اور ایثار سے کام لیں گے اور دنیا میں امن و آشتی کے قیام کے لئے تمام پڑوسی اور دیگر ملکوں سے تعاون کریں گے، اور برادرانہ اور مخلصانہ تعلقات کو وسعت دے کر امن عالم اور جمہوری اقدار کا تحفظ کریں گے کہ اسی پر انسانیت کی بقا کا انحصار ہے۔

**نئی تخلیق نمبر**

افکار کا آئندہ شمارہ "نئی تخلیق نمبر" کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ یہ خصوصی اور منفرد اشاعت افکار کی دیرینہ روایت کی حامل ہو۔ سالانہ ممبر اور ایجنٹ حضرات اکتوبر کے شمارے کا انتظار فرمائیں۔ "نئی تخلیق نمبر" انشاء اللہ اکتوبر کے وسط تک آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

**خریداری مہم**

اگست ۶۶ء سے ہم نے خریداری مہم شروع کی ہے کئی افکار دوستوں نے عملی تعاون کا ثبوت دیا ہے پھر بھی ان گنت افکار دوست ابھی تک کسی وجہ سے اس طرف توجہ نہیں دے سکے ہیں۔ افکار آپ سب کے تعاون کا مستحق ہے۔ تمام رفیقان افکار اگر دلچسپی لے کر دو دو چار چار خریدار فراہم کر دیں تو دس ہزار خریدار فراہم ہو جانے کوئی بڑی بات نہیں نامساعد اور صبر آزما حالات میں افکار نے ۲۲ سال کی ادبی جدوجہد میں پہلی مرتبہ دست سوال دراز کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری دردمندانہ اپیل رائیگاں نہ جائے گی۔

سردار جعفری

# صبحِ فردا

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبحِ آزادی
یہ سرحد خون کی، اشکوں کی آہوں کی، شراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اُگائی تھیں

یہاں محبوب آنکھوں کے ستارے تلملائے تھے
یہاں معشوق چہرے آنسوؤں میں جھلملائے تھے
یہاں بیٹوں سے ماں، پیاری بہن بھائی سے بچھڑی تھی

یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اُگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے

میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبحِ فردا کا

(۲)

یہ سرحد پھول کی، خوشبو کی، رنگوں کی، بہاروں کی
دھنک کی طرح ہنستی، ندیوں کی طرح بل کھاتی
وطن کے عارضوں پر زلف کے مانند لہراتی
مہکتی، جگمگاتی، اک دُلہن کی مانگ کی صورت

کہ جو بالوں کو دو حصّوں میں تو تقسیم کرتی ہے
مگر سیندور کی تلوار سے، صندل کی انگلی سے

یہ سرحد دلبروں کی، عاشقوں کی، بے قراروں کی
یہ سرحد دوستوں کی، بھائیوں کی، غم گساروں کی
سحر کو آئے خورشیدِ درخشاں پاسباں بن کر
نگہبانی ہو شب کو آسماں کے چاند تاروں کی
زمیں پامال ہو جائے بھرے کھیتوں کی یورش سے
سپاہی حملہ آور ہوں درختوں کی قطاروں کی
خدا محفوظ رکھے اس کو غیروں کی نگاہوں سے
پڑیں نظریں نہ اس پر خوں کے تاجر تاجداروں کی
محبت حکمراں ہو، حسن قاتل، دل مسیحا ہو
چمن پر آگ برسے شعلہ پیکر گل عذاروں کی

وہ دن آئے کہ آنسو ہو کے نفرت دل سے بہہ جائے
وہ دن آئے یہ سرحد بوسۂ لب بن کے رہ جائے

(۳)

یہ سرحد من چلوں کی، دل جلوں کی، جاں نثاروں کی
یہ سرحد سرزمینِ دل کے بانکے شہسواروں کی
یہ سرحد کج کلاہوں کی، یہ سرحد کج اداؤں کی
یہ سرحد گلشنِ لاہور و دلّی کی ہواؤں کی
یہ سرحد امن و آزادی کے دل افروز خوابوں کی
یہ سرحد ڈوبتے تاروں، ابھرتے آفتابوں کی
یہ سرحد خوں میں لتھڑے پیار کے زخمی گلابوں کی

میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبحِ فردا کا

فارغ بخاری

# ہم اپنے ہی قاتل تو نہیں

آج ہم درد سے پتھرائی ہوئی یاد لیے
دلِ ناکام میں روشن کیے حسرت کے دیے
سوچتے ہیں کہ دماغوں ہی میں اب تک جو رہا
پھوٹ نکلے گا کسی دن وہ اُبلتا لاوا
راکھ ہو جائیں گے یہ جاہ و حشم طبل و علم
ٹوٹ جائے گا خداوندوں کے نشے کا صنم
اپنی جاں سوزی کی یہ داد کبھی پائے گی
منجمد موج بھی طوفانوں میں ڈھل جائے گی
روز و شب گھولتے ہیں زہر جو پیمانوں میں
وہ بھی اب چین سے بیٹھیں گے نہ ایوانوں میں

اب کوئی حیلہ کسی طور نہ کام آئے گا
کل کے مقتولوں میں صیاد کا نام آئے گا

سچ ہے یہ ظلم کی دیوار گرانی ہے ہمیں
اپنی تصویر مگر سامنے لانی ہے ہمیں
دیکھنا یہ ہے کہ ہم اپنے ہی قاتل تو نہیں
اپنی مظلومی کی شمشیر کے بسمل تو نہیں
جس سے اپنا ہی جگر چھد گیا وہ تیر نہ ہوں
جبر کے ہاتھ میں تسلیم کی زنجیر نہ ہوں
سوچنا ہے کہ کہیں عجز کا مہرہ بن کے
حوصلے ہم نے بڑھائے تو نہیں قاتل کے

اس سے پہلے کہ ستمگر کو سر دار کریں
آؤ ہم اپنے گناہوں کا بھی اقرار کریں

صہبا اختر

# صبحِ مراد

اے شبستانِ ملت کی صبحِ مُراد
اے ستارہ نفس، اے شرارہ نژاد

اے تجلی بہ رخسار و انجُم بہ لب
اے سحر در سحر داستانِ طرب

اے افق تا افق روشنی کی پیام
اے شفق تا شفق بادۂ لالۂ فام

اے چمن در چمن بادِ غنچہ طراز
دلبر و دل نشیں، دل کش و دل نواز

اے دمن تا دمن، ساقیٔ گل فروش
یاد ہے تجھ کو وہ محفلِ اہلِ جوش!

یاد ہے تجھ کو وہ ساعتِ پُرفسوں
جس نے راوی کی لہروں کو بخشا سکوں

جس کے رس نے کھلائے ہیں یہ دشت و راغ
جس نے پدما کنارے جلائے چراغ

یاد ہے تجھ کو وہ لمحۂ عہد ساز
جس نے ہر سنگِ ظلمت کو بخشا گداز

یاد ہے تجھ کو وہ شعلۂ شب شکن
جس کی ضو نے تراشا تھا خوابِ وطن

یاد ہیں تجھ کو وہ صاحبانِ غرور
جن کی پیشانیوں کا ہے صدقہ یہ نور

یاد ہیں تجھ کو وہ خوش خرامِ وطن
جن کے ناموں سے زندہ ہے نامِ وطن

آئے اور چل دیئے مثلِ موجِ نسیم
ہائے وہ رفتگانِ بلند و عظیم

جن کی عظمت اٹھائے ہے اب بھی علم
نقشِ تاریخ ہیں جن کے نقشِ قدم

جن کے خوابوں کی تعبیر ہے انقلاب
کیا ستم ہے کہ خود بن گئے ہیں وہ خواب

ہر کرن جن کی ہے آج احسان مند
ہائے وہ شب گزارانِ شعلہ پسند

اپنے جلووں میں اے صبحِ صد رنگ و بو
اُن کی رُوحوں سے رکھنا ہمیں سرخرو

تو جو آئی تو کیا کیا نہ آئے وہ یاد
صبحِ آزادگانِ وطن شاد باد

شعر انصاری

# گرگ آشتی

گھنے درختوں کو اور سرسبز وادیوں کو
خزاں نے تاراج کر دیا ہے
تمام دفتر تمام بازار بند ہیں اور ہر سڑک پر
برف اپنی سفید بے حس تہیں بچھائے
ہوا کے نادیدہ نقش پا کی اداس دولت سمیٹتی ہے
ہوا جو یخ بستہ شہر کی نامراد گلیوں میں
سر کشیدہ گذر رہی ہے
نہ ساعت نانِ گرم ہے اب
نہ انگیٹھی منقلِ گل و لالہ کی دمک ہے
زمیں کی ویران وسعتوں میں
ہزار راہوں کی سرد لہروں کا اک جلوس
اپنے کانپتے پرچموں کو لے کر
گزر رہا ہے

نہ کالوا جسم کا محافظ
نہ حلقۂ نار میں لپکتی ہوئی زبانیں
پاسبانانِ الفتِ گریائی بن رہی ہیں۔
سگانِ آوارہ
نان اور استخواں کی کمیاب حسرتوں کو
دلوں میں اپنے چھپائے پھرتے ہیں کوچہ کوچہ
سبھی مکانوں کے در ہیں بستہ
سبھی دریچوں سے برف کی ناشگفتہ کلیوں کے ہار لٹک کے گر رہے ہیں

تمام جھیلوں کے آئینے ہو گئے شکستہ
تمام راہوں میں اک صدا سائیں سائیں کی گشت کر رہی ہے
نہ حرفِ لب میں خلوص و مہر و وفا کی گرمی
نہ جسمِ قرطاس سے لپٹتے ہوئے خطوں اور دائروں میں
کوئی تپش ہے
کہ جیسے اس شہر کی ہر اک شے ہے سوز و جذب و اثر سے محروم

نقابِ ابرِ سفید کی اوٹ سے —
سفید بستر پہ اک مریضِ جواں کے چہرے کی طرح
حیران و مضمحل —
بے وجود سورج
اپنی کرنیں سمیٹتا ہے

دور اک دائرے میں گرگانِ گرسنہ
نیند کے نشے میں
اپنے اپنے شکم کی بے رحم آگ سے
ہات تاپتے ہیں
ہزار مجبوریوں کے نرغے میں جاگتے ہیں
ہر ایک گرگِ گرسنہ اپنی نگاہ کے دائرے سے پیہم
دوسرے گرگِ گرسنہ کی نڈھال آنکھوں کو تک رہا ہے
ہر ایک دل میں یہ سوچتا ہے
کہ دوسرے کی ذرا سی غفلت
نیند کی ایک مختصر سے نوید محتی
تمام گرگانِ گرسنہ کا علاج بن کر
دوستی اور آشتی کی تمام کہنہ روایتوں کو
اگر بچا لے
تو اس جہاں کی بقا کا سامان کر کے ہم سب یہ کہہ سکیں گے
کہ دوستی زندگی کی ساری عظیم قدروں سے
(اس جہاں میں) عظیم تر ہے۔

نریش کمار شاد

# ٹیلی فون آپریٹر

مجھے فراق کا یہ شعر یاد آتا ہے
میں دیکھتا ہوں تجھے جب بھی اے ستارہ جبیں
"بہت نہیے کسی عشق پر کوئی روئے
کہ حسن کا بھی زمانے میں کوئی دوست نہیں"

میں سوچتا ہوں کہ تو خود بھی سوچتی ہوگی
کہ روز روز لگاتار بولنا، سننا
تباہ کرتا ہے احساس کی لطافت کو
زبان و گوش کی لذت کا ہے کفن بننا

کہ یوں تو بادل ناخواستہ بمجبوری
ہزار لوگوں سے میں ہم کلام رہتی ہوں
نہیں ہے کوئی بھی دنیا میں ہمزباں میرا
کسی کو بھی نہیں معلوم میرا حال زبوں

رفیق دن کے ہیں بس ڈائل اور ریسیور
غضب تو یہ ہے مجھے رات کو بھی خوابوں میں
دکھائی دیتے ہیں نزدیک و دور فون ہی فون
سنائی دیتی ہیں نرم و سخت آوازیں

غم معاش کا ہے کتنا تلخ پس منظر
کہ بیچتی ہوں میں آواز کی بھی شیرینی
مزاج کی تو نہیں، احتیاج ہی کی ہے دین
بجائے خودسری و بے رخی یہ مسکینی

میں کیا کروں، جو سمجھتے ہیں دیکھنے والے!
کہ خوش مزاج ہوں خوش پوش ہوں حسیں ہوں میں
ملازمت کے تقاضے تو کہہ رہے ہیں یہی
بہ شکل حسن کوئی دل نشیں مشین ہوں میں

خدا کرے نہ حقیقت ہو میرا اندازہ
خدا کرے یہ فقط ایک وہم ہو میرا
کہ واقعی تری دنیا ہے دکھ بھری دنیا
کہ واقعی نہیں کوئی بھی ہم زباں تیرا

منظر ایوبی

# تجدیدِ عہدِ وفا

سایۂ عفریت جب دم توڑتا آیا نظر    دل نے چاہا حلقۂ طوق و سلاسل توڑ دے
جادۂ دیر و حرم سے خود کو رکھے دور دور    پیروی برہمن، تقلیدِ یزداں چھوڑ دے
پاس آنے دے نہ اندیشہ نہ کوئی وسوسہ    اک نئی منزل کی جانب زیست کا رُخ موڑ دے
فکر اپنی ہو، نظر اپنی ہو اور اپنا خیال
اپنی منزل، اپنی راہیں، اپنے جادے، اپنی چال
قافلے کے ساتھ ہوں وہ دورِ تیرہ کے رفیق    جو غموں کی تیز دھوپوں میں رہے سایہ فگن
جن کی آہٹ سے رُکی یلغارِ موجِ تند و تیز    کانپ اٹھے جن کی اک للکار سے کوہ و دمن
جن کے اندیشے کی حدت سے جلی کشتِ شہی    کھا گئی ظلمت کو جن کی روشنیٔ فکر و فن
تولتے ہیں زیست کو جو عدل کی میزان پر
جاں کھپاتے ہیں جو اپنے وعدہ و پیمان پر
دل نے چاہا ایسے غم خواروں کی قربت ہو نصیب    بخشتے ہیں کھُردرے ہاتھوں کو جو رنگِ حنا
سرد کر دیتے ہیں پھونکوں سے ہوس کی آگ کو    اور بچھاتے ہیں جنوں کی راہ میں گل کی رِدا
کاروانِ فہم ہو یا آگہی کا قافلہ    بخشتے ہیں رہروؤں کو زندگی کا حوصلا
دل نے چاہا ایسے غم خواروں کی قربت ہو نصیب
جو اُجالوں کے ثنا خواں ہیں اندھیروں کے رقیب
سر سے اُٹھنے ہی کو تھا عفریت کا سایہ مگر    آ گیا زیرِ بحث سود و زیاں کا فلسفہ
رفتہ رفتہ پھر رگ و پے میں سرایت کر گیا    اپنے دیرینہ کرم فرماؤں کی مے کا نشہ
توڑ ڈالے عقل نے دل کے تراشیدہ صنم    سیم و زر کی سرحدوں سے جا ملا پھر سلسلہ
کون جانے اس وفا کیشی کا کیا انجام ہو
دیکھئے پھر ملتفت کب گردشِ ایام ہو

رحمٰن فراز

# نارسائی

ایک اک مصرع میں غلطاں ہیں تری چاہت کے غم
کر رہا ہوں اک زمانے سے تری باتیں رقم
پھر بھی تجھ کو چھو نہیں سکتی مری نوکِ قلم

ڈوبتے سورج کی لالی، بھیگتی راتوں کا نم
اَن گنت پھولوں کے گجرے، ڈولتی شاخوں کے خم
کتنے موسم، کتنی یادیں، کتنے لمحے، کتنے غم

میری صبحیں میری شامیں سوچتے گذریں مگر
یہ مری تخلیق کا دفتر، یہ عمرِ مختصر
آج مر جاؤں تو اک دنیا کہے گی بے ہُنر

حامد سروش

# داغِ تمنّائے نشاط

اسی خیال میں عمریں گزار دیں ہم نے
کوئی تو خضر بنے گا ہمارا راہنما
کبھی تو منزلِ راحت پہ جا ہی پہنچیں گے
کبھی تو چشمۂ حیواں کو ڈھونڈ ہی لیں گے

کبھی تو سلسلۂ روز و شب ملے گا ہی
عنانِ وقت کبھی ہاتھوں میں آ ہی جائے گی
کبھی تو گردشِ شام و سحر کو روکیں گے
غموں کی "وادیٔ اشکآب" طے بھی کر لیں گے

یہ عزم تھا کہ خزاں کی ملول راتوں میں
اُجال دیں گے مسرت کی کہکشاؤں سے
ضرور چھیڑیں گے فصلِ بہار کے نغمے
حیاتِ خستہ کے تاریک و پُر خطر رستے

کبھی تو غیب سے کوئی ہمیں پکارے گا
حصارِ رنج و محن توڑنے کو آئے گا
نشاط و عیش سے بھرپور زندگی کے لئے
مسرتوں کا کوئی لشکرِ کثیر لئے

کبھی تو شہرِ تمنّا کا کوئی ہرکارہ
غمِ فراق سے بوجھل سیاہ راتوں میں
ہمارے واسطے پھولوں کی ڈال لائے گا
نویدِ صبح، پیامِ وصال لائے گا

مگر یہ دل، یہ دل غمزدہ، یہ گھائل دل
اسے قرار نہ آیا، اسے سکوں نہ ملا
نہ بن سکا کسی محفل میں زینتِ محفل
کہ اس کے ساتھ ہمیشہ رہا غمِ منزل

---

لہ اشک آب

پروفیسر آل احمد سرور

# نظم کی زبان

زبان کا تصور سماج کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ فرد کی اپنی کوئی زبان نہیں ہوتی، وہ سماج سے ایک زبان سیکھتا ہے۔ تحریر کی اہمیت کے باوجود، زبان کی بنیاد بول چال میں ہے۔ زبان سیکھ لی جائے تو یہ ایک عادت بن جاتی ہے۔ زبان میں طبقوں کا فرق بھی ملتا ہے۔ اس میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے بقول ماریو پائی کے جس زبان میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ وہ مردہ ہو جاتی ہے۔ یہ تبدیلی اصوات میں بھی ہوتی ہے، الفاظ میں بھی قواعد میں بھی اور معنی کے رشتوں میں بھی۔ زبان میں جہاں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ وہیں وہ ایک معیار بھی حاصل کرنے اور پھر اسے قائم رکھنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ ادبی اسالیب، ایک مضبوط مرکزی حکومت، نصاب تعلیم کی یکسانیت، تجارت و نقل و حرکت کے ذرائع، فوجی خدمت اور ایک ترقی یافتہ دفتری نظام، ایک مذہب یا ایک قومیت کے تصور سے بھی معیار میں مدد ملتی ہے۔ اگر معیار قائم رکھنے کی قوت کم ہو جائے، تو تبدیلی کی صلاحیت اپنا اثر اور زیادہ دکھائے۔ تحریر کی زبان میں عام طور پر تبدیلی بول چال کی زبان میں تبدیلی کے پیچھے چلتی ہے اچھی زبان وہ ہے، جو پوری تہذیب کی آئینہ دار ہو۔

ہم زبان کے اس تصور کو ذہن میں رکھیں، تو ادبی زبان کو اتنا مقدس نہیں سمجھا جا سکے گا، نہ اس کے بعض خوبیوں کی خاطر بول چال کی زبان سے اس کی بہت زیادہ دوری گوارا کی جا سکے گی۔ ظاہر ہے کہ ادبی زبان معیاری زبان ہے، یہ الفاظ کی بہترین ترتیب کا دوسرا نام ہے۔ یہاں الفاظ ... سائنسی زبان کی طرح صرف معلومات کی کنجی نہیں، نہ بول چال کی زبان کی طرح محض کام چلاؤ۔ یہاں الفاظ کا اظہار تخلیقی ہے۔ یہ بھرپور تاثر دیتے ہیں، یہ ذہن کے دریچے کھولتے ہیں، فضا میں بے نام پل بناتے ہیں، اور زمان و مکان کو اسیر کر لیتے ہیں، مگر رفتہ رفتہ ان میں وہی بات آجاتی ہے جو ان صاف شدہ چاولوں میں ہوتی ہے جن کا حیات بخش جوہر کھینچ لیا گیا ہو اگر ادبی زبان بول چال کی زبان سے دور ہو جاتی ہے تو وہ کتنی ہی خوش شکل کیوں نہ دکھائی دے اس کی مثال ان کاغذی پھولوں کی سی ہے جو آنکھوں کو تو بھلے معلوم ہوتے ہیں مگر خوشبو نہیں دیتے، نہ ان کے گرد اگرد شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں شاعری کی زبان نثر سے مختلف ہوتی ہے۔ شاعری تخلیقی اظہار ہے، نثر تعمیری۔ شاعری کی زبان تاثر عطا کرتی ہے، نثر کی علم۔ ایک متاثر کرتی ہے، دوسری قائل۔ بہر حال دونوں معیاری زبان کے دو پہلو ہیں جو ایک دوسرے کو مدد دیتے ہیں اور ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے ہیں۔

ایلیٹ نے شاعری کی تین آوازوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلی شاعر کی وہ آواز ہے جب وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ دوسری جب وہ ایک مجمعے کو خطاب کرتا ہے۔ اور تیسری جب وہ کسی ذہنی یا اصلی کردار کی زبان میں بولتا ہے۔ شاعر جب اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے تو اگرچہ اس وقت بھی وہ سماجی آلہ استعمال کرتا ہے، مگر ایک طرح سے اس وقت وہ دنیا سے کچھ بے تعلق سا ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک

غزل کی زبان اسی پہلی آواز کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہماری غزل چونکہ صرف دل کی واردات نہیں رہی، اسی لئے اس کی زبان بھی صرف شاعر کی خود کلامی تک محدود نہیں رہی، بلکہ اس میں دوسری دونوں آوازوں کی لے بھی شامل ہو گئی ہے، یہ اچھا ہی ہوا، مگر غزل دراصل پہلی ہی آواز کی ترجمانی ہے، اس لئے دوسری اور تیسری آوازوں کی پوری پوری نمائندگی نہیں کر سکتی۔ غالب اور اقبال کا بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے حدیث دلبری کو صحیفۂ کائنات بھی بنا دیا۔ مگر یہ صحیفہ مغل تصویروں کی طرح کا ہے۔ یہ اشاروں کا صحیفہ ہے۔ اور ہم اس پر تکیہ کئے بیٹھے نہیں رہ سکتے۔ نظم کی زبان، غزل کی زبان سے اس لئے مختلف ہونی چاہئے کہ نظم کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس میں نثر کی تعمیری صلاحیت سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ اس میں اشارے کی بجائے صراحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں شاعر کی دوسری اور تیسری آوازوں کی بھی گنجائش ہے اور پہلی آواز میں اس طرح سنائی دے سکتی ہے کہ مختلف آوازیں مل کر ایک سنگیت بن جائیں، جو مسرت اور بصیرت کا خزانہ ہو۔

ایلیٹ ہی نے ایک اور جگہ کہا ہے کہ جس شاعر میں طباعی ہوتی ہے وہ براہِ راست زندگی کی طرف جاتا ہے۔ جو شاعر تقلیدی اور خوشہ چیں قسم کا ہوتا ہے وہ ادب کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس بات کو اس طرح سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ پہلی قسم کا شاعر زندہ زبان استعمال کرتا ہے اور دوسری قسم کا کتابی۔ اردو شاعری کی زبان زیادہ تر کتابی ہے۔ اور اس کتابی زبان کا بڑا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، دردؔ، جراتؔ، آتشؔ، ذوقؔ، داغؔ، حسرتؔ، آرزوؔ وغیرہ کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے باوجود مجموعی طور پر غزل کی زبان جس طرح، ناسخؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فانیؔ سے متاثر ہوئی ہے اس کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

کتابی زبان کو ایک اور مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ ورڈس ورتھ نے اٹھارویں صدی کی انگریزی شاعری کی زبان کو مصنوعی کہا۔ اس کے رچاؤ اور پختگی میں زندگی کی پائی، نثر اور نظم کے مروجہ امتیاز کو کم کر کے شاعری کی زبان کو بول چال کی زبان سے قریب لانا چاہا۔ خود اپنی نظموں میں اس نے اس کے تجربے بھی کئے، جن میں کچھ کامیاب ہیں کچھ ناکام۔ کولرج نے اس کے باغیانہ جوش کی اصلاح کی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ورڈس ورتھ نے وقتی رنگ پر انگلی رکھی تھی اور اس کے اثر سے انگریزی شاعری کو نیا جذبہ نئی توانائی، نئی زندگی، نیا لہجہ اور نیا اسلوب ملا۔ اس کی طاقت کا کیا ٹھکانا ہے ورڈس ورتھ نیچرل ہوتے ہوئے بھی مصنوعی ہے کیونکہ ادبی ہے مگر اس کی کوشش صحت مند ہے اور اس کے بڑے اچھے نتائج نکلے ہیں ........ ہمارے یہاں بھی حالی سے اس قسم کی کوشش کا آغاز ہوتا ہے ان کے یہاں بھی اس قسم کے اشارے ملتے ہیں ؎ صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام ٭ ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

مقدمۂ شعر و شاعری میں انہوں نے ملٹن کے ایک جملے سے مدد لیکر جو نظم کے موضوع پر اس کے ایک مضمون میں ملتا ہے، سادگی، اصلیت اور جوش پر زور بھی دیا ہے۔ مگر کیا ہم یہ ایمانداری سے کہہ سکتے ہیں کہ حالی کے نقطۂ نظر نے شاعری کی زبان سے متعلق ہمارا تصور یکسر بدل دیا ہے! اس میں شبہ نہیں کہ حالی کا گہرا اثر ہوا ہے مگر مجموعی طور پر نظم کی زبان میں ابھی تک کلاسیکی رنگ و آہنگ زیادہ ہے۔ اور غزل کی زبان کا اس پر غلبہ مسلّم ہے۔ غزل کی زبان کا اثر ایک اور وجہ سے بھی گہرا ہے۔ اردو کے عام شاعر کا احساس چند بندھے ٹکے موضوعات ہی کا اظہار کر سکتا ہے۔ رومانی عشق، مبہم سی انسان دوستی، رواجی اخلاق، محدود نظریۂ علم، عشق کی عقل پر فوقیت، جذباتی احساس، شہری مزاج مخصوص مذہبی رنگ۔ یہاں میں صرف ان معنوں میں گفتگو نہیں کر رہا ہوں جن معنوں میں آزاد نے اردو شاعری کی زبان پر تنقید کی تھی، اور نہ صرف ان معنوں جن میں فراق نے اردو میں قدیم ——————

ہندوستانی عناصر کی کمی کا ماتم کیا ہے، بلکہ میں تہذیبی فضا کے محدود ہونے کی بات کر رہا ہوں۔ جو جاگیردارانہ ذہن کی زیادہ غماز ہے جسے سماجی تبدیلیوں کا پورا پورا احساس نہیں ہے۔ اور جو تبدیلی پر ماتم زیادہ کرتا ہے ان کا خیر مقدم کم۔ جو تخریب کا زیادہ قائل ہے، تعمیر کا کم اور جو ماضی کو بھی صرف ماضی قریب ہی تک محدود سمجھتا ہے۔ اور اس سے دور جانے کو تیار نہیں اس لیے میرے نزدیک نظم کی زبان، غزل کی زبان کے رچاؤ، اس کی اشاریت، اس کے تہذیبی میلانات، اس کی سماجی اور اخلاقی قدروں سے بلند ہو سکے، تو یہ اچھی بات ہوگی۔ نشتر کی افادیت اور حسن سے انکار نہیں، مگر پھاوڑے کے دور میں ہاتھ میں صرف نشتر لیے زندگی کے معرکہ کو سر نہیں کیا جا سکتا۔ نشتر کی ضرورت بھی رہے گی مگر نشتر پر فخر کرنے سے کام نہیں چلے گا

نظم کی زبان کی بنیاد بے شک بول چال کی زبان پر تو ہونی چاہیے، مگر چونکہ نظم ادب کی ایک شاخ ہے اس لیے بول چال کی زبان کی بے پروائی اور بد نظمی اس کے نشیب و فراز اور اس کی جبینی معاملات میں بے جھجک بات چیت کو ایک ترتیب یا میدان کی چھلنی سے اس طرح گزرنا ہوگا کہ اس کا عام فہم، جاندار اور جذبے سے بھر پور حصہ سب کا سب آ جائے اور اس کی مخصوص اصطلاحیں، ناپختگی اس کا سوقیانہ پن، اس کی چلتاؤ لکنت نکل جائے یہ چھلنی اتنی باریک نہیں ہونی چاہیے کہ اس میں صرف میدہ ہی چھن سکے۔ بلکہ اس کے سوراخ اتنے بڑے ضرور ہونے چاہئیں کہ ان سے چوکر کا خاصا حصہ بھی آٹے کے ساتھ نکل آئے۔ اور اس طرح غذائیت کا اہتمام ہو سکے۔ اس زبان کو فارسی عربی یا سنسکرت کی قواعد سے بھی تمام تر آزاد ہونا پڑے گا۔ آج ہم نثر میں ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی الفاظ اضافت میں نہیں لاتے، لیکن تدارک کا چنداں لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ ہم فارسی کی وہ ترکیبیں استعمال کرتے ہیں جو صرف ایک محدود طبقہ جانتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری بات عام اردو داں نہیں سمجھ سکتا، جس کا فارسی کا علم نہ ہونے کے برابر ہے۔ غالب اور اقبال کی عظمت کا اعتراف اور احترام کرتے ہوئے ہمیں یہ کہنے میں تامل نہ ہونا چاہیے۔ کہ آئندہ کے غالب اور اقبال اس زبان کو جسے یہ استعمال کرتے پر قادر بھی ہوتے۔ تو ان کی بات بہت کم لوگ سمجھ سکیں گے۔ انھیں اپنی بات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے بول چال کی اردو کو بنیاد بنانا پڑے گا۔ گویا اس سلسلے میں وہ تمام کی روش اختیار کریں گے، اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہوگی، ان سے پہلے بھی بہت لوگوں نے ماضی قریب کو چھوڑ کر ماضی بعید سے رشتہ جوڑا ہے۔

دوسرے ان شاعروں کو اپنی بات کہنے اور منوانے کے لئے، اشاروں، کنایوں، جھلکیوں اور حیرت ناک جلووں کے بجائے مسلسل اظہار، تعمیری اظہار، آغاز، وسط، انجام گویا فارم کے ایک گہرے تصور کو اپنانا پڑے گا اور اس لئے نظم کو ایک چھوٹی مثنوی یا مسدس یا چند یوں ہی سے مربوط بندوں سے آگے بڑھا کر بے قافیہ یا آزاد نظم کو اور ترقی دینا پڑے گی۔ اردو دنیا چونکہ قدامت پرست اور روایت پرست زیادہ ہے، اس لئے اس نے بے قافیہ یا آزاد نظم کی تحریک کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ جیسا کہ ایلیٹ نے کہا ہے آزاد نظم، فن کے قیود سے آزادی کا نام نہیں؛ بلکہ فن کے ساتھ ایک تازہ اور دوسروں سے زیادہ گہری وفاداری کا نام ہے۔ یہ چند معمولی قیود سے آزادی اس لیے حاصل کرتی ہے کہ بعض گہری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔ شاعری کی تیسری آواز کی مکمل نمائندگی بے قافیہ یا آزاد نظم ہی ہو سکتی ہے۔ ہماری مثنویوں میں ہزاروں اشعار ملتے ہیں، مگر مصرعوں کی برابری اتنی ہی اکتا دینے والی ہوتی ہے جتنی اٹھارویں صدی کی باقاعدہ، ہموار، قدم ملا کر چلنے والی شاعری۔ جب ارکان کی برابری اکتا دینے والی اور خیال کو برابر برابر ٹکڑوں میں کاٹنے والی ہے، تو قافیے

کی معمولی سی پابندی بھی ذہنی رَو پر بند باندھنے والی ہے۔ یہاں ردیف یا قافیے کو ترک کر دینے کا سوال نہیں ہے نہ پابند شاعری کو ادب بدر کرنے کی تجویز ہے۔ میں تو عظمت اللہ خاں کی طرح یہ بھی کہنے کو ہرگز تیار نہیں کہ غزل کی گردن بے تکان مار دینا چاہیئے۔ یہاں صرف زبان اور فن کے تصور میں توسیع کا سوال ہے۔ اگر ہمارے اصنافِ سخن پر سے قافیے، ردیف اور بحروں کی یہ آمریت کم ہو جائے جس کے شکنجے میں الفاظ کا گودا نکل جاتا ہے۔ اور ہم ان کی ہڈیوں کی مالا بناتے رہتے ہیں، تو ہمیں تندیٔ صہبا کو اس لئے کم نہ کرنا پڑے گا کہ مبادا کہیں آبگینہ پگھل جائے۔ نہ خیالات پر اتنے بند باندھنے پڑیں گے؛ نہ اس کو ٹکڑوں میں پیش کرنے پر قناعت کرنی پڑے گی، نہ وہ فن کی مجبوریوں کی وجہ سے کچھ سے کچھ ہو جائے گا، بلکہ اسے اپنی پوری تاثیر اور تیزی دکھانے کا موقع ملے گا۔

بے قافیہ اور آزاد نظم کی کوشش اور کامیاب ہوتی، اگر اس کی بنیاد بول چال کی زبان پر قائم ہوتی، مگر نہ صرف اس کی بنیاد بول چال کی زبان پر نہیں رکھی گئی، بلکہ اس کے موضوعات بھی اکثر ایسے چُنے گئے جو عام زندگی کے موضوعات نہیں تھے۔ یہ کچھ مریض اور کج ذہنوں کی بے راہ روی کو چھپانے کے لئے ایک دبیز پردہ بن گئے۔ راشد کا ذہن اقبال کے ذہن سے مختلف ہے، مگر ان کی زبان اقبال سے کم فارسی آمیز نہیں ہے۔ اور چونکہ ان کے یہاں اقبال کی طرح ابلاغ کی کوشش نہیں ہے اس لئے اپنے ذہن کی الجھنوں کو سلجھانے کے لئے انھیں خاصی کاوش کرنی پڑتی ہے۔ "ماورا" سے "ایران میں اجنبی" تک کے راشد میں خاصا فرق ہے۔ ایران میں اجنبی کا راشد اپنے تجربے کا بوجھ پھینک کر سبکدوش ہونا ہی نہیں چاہتا، وہ کچھ کہنا، کچھ بتانا بھی چاہتا ہے، اس لئے اس کے یہاں تراکیب کی طلسم بندی کم ہے، مگر چونکہ وہ اپنے خول سے نکلنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا ہے، اس لئے وہ کتابی زبان کی پناہ لینے پر اب بھی مجبور ہے، میراجی اس لحاظ سے زیادہ کامیاب ہے۔ ان نظموں کو چھوڑ کر جن میں جنسی تجربے رمزیہ اسلوب میں بیان کئے گئے ہیں۔ وہ خاصی صاف ستھری زبان لکھتا ہے اور "کلرک کا نغمۂ محبت" جیسی نظموں میں وہ کامیاب بھی ہے اور موضوع سے انصاف کرنے والی زبان کے استعمال پر قادر بھی۔

راشد اور میراجی کی تو کچھ اپنی الجھنیں تھیں، جن سے وہ مجبور تھے۔ مگر سیاست کے شاعروں نے بھی ادبی سطح پر کچھ کم دھاندلی نہیں کی۔ اقبال کی زبان اور جوش کی زبان میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں، گو دونوں کے پیغام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اقبال بھی جوش کی طرح حال کے درد سے آگاہ ہیں، مگر ان کے نزدیک اس کا علاج ماضی کو یکسر نذرِ آتش کر دینے میں نہیں، ماضی سے صالح بنیادی قدریں لے کر، حال کی دلدل میں راستہ بنانا ہے۔ وہ جب کہتے ہیں کہ اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد کریں گے، تو گو وہ بستیاں کوفہ و بغداد نہ ہوں گی۔ مگر ان میں کوفہ و بغداد نئے رنگ میں ہوں گے۔ جوش ماضی سے بیزار ہیں، اس کے باوجود ماضی کی زبان سے اس طرح چمٹے ہوئے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تو وہ تیوری پر بل ڈال کر فرماتے ہیں کیا میدان سے ملاقات نہیں۔ جوش زندگی کی ترجمانی کے دعوے دار ہیں، مگر کتابی زبان لکھتے ہیں۔ اقبال ایلیٹ کے الفاظ میں اوریجنل شاعر ہیں، جوش خوش فکر شاعر ہیں۔ جوش کے یہاں نئی زندگی ایک نیا لبادہ ہے، جس کے چاک سے جا بجا پرانا پیراہن جھانکتا ہے۔ اسی طرح بعض ترقی پسند شعرا نے عوامی زبان یا عوامی موضوعات استعمال کر کے غلطی نہیں کی، بلکہ یہ غلطی کی کہ انھوں نے ان موضوعات اور زبان کو ایک تو چند سیاسی اور وقتی مقاصد کے لئے استعمال کیا، اس دھارے کو جو اپنی موج میں بہ رہا تھا، پلٹنے یا مڑنے کہ اسے اپنے نزدیک سیدھے راستہ پر ڈال دیا اور اس طرح اس کے حسن کو غارت کر دیا۔ دوسرے انھوں نے کتابی ذہن کو عوامی زبان میں داخل کر کے ایسی شاعری کو جنم دیا، جس میں سیاست کی بدصورتی تھی اس کا ذہن نہ تھا، جس میں عوام کی زبان کا چھوک تھا، اس کا رس غائب ہو گیا تھا۔ عوامی شاعری کتابوں، سیاسی دستاویزوں، پارٹی کے پروگرام میں شرکت ہی سے نہیں ہوتی، ان کے باوجود بھی ہو سکتی ہے۔

بشرطیکہ شاعری اس طرح ، عوام ، بن جائے جس طرح فلابیر نے کہا تھا کہ میں مادام بواری ہوں ، یا جس طرح رومین رولاں نے کہا تھا ۔ کہ میں اینٹ ہوں اس کے لئے درسگاہوں اور دفتروں ڈرائنگ روم اور پارٹی آفس میں محصور ذہن کافی لچکدار نہ تھا ۔ جوش اور چند ترقی پسندوں کی مثال جنھوں نے سیاسی موضوعات پر پابند اسالیب میں طبع آزمائی کی یا آزاد نظموں اور عوامی گیتوں کے پردے میں فارمولے کی شاعری کی ، اس لئے عبرت ناک ہے کیونکہ کچھ لوگوں نے اس سے غلط نتیجہ بھی نکالا انقلابی شاعری کے لئے جس ذہن کی ضرورت تھی ۔ وہ صحیح معنی میں انقلابی نہ تھا ۔ باغیانہ تھا ۔ اس کے لئے جس زبان کی ضرورت تھی وہ وہی مانوس زبان تھی جو شاعرے کی مجلسی تفریح کے کام آسکتی تھی ۔ ذہن میں روشنی نہیں کرسکتی تھی ۔ اور اس کے تجربے بھی پوری ایمانداری سے نہیں کئے گئے ۔ ان تجربوں کی کامیابی کے لئے ذہن کی ایک تپتی بھاتی اور دوسری جلاتی تھی ۔ شہریت کی مصنوعی فضا اور اس کے پرکار ذہن کی جگہ دیہات کی سادہ ، بے جھجک اور معصوم فضا جذب کرتی تھی ۔ یہ تجربہ اس لئے ناکام نہیں رہا کہ اس میں کامیابی کا امکان نہ تھا ، بلکہ اس لئے کہ یہ ایمانداری سے نہیں کیا گیا اور بیلر لوگوں نے مزید تماشا یہ کیا کہ فصل ابھی بوئی گئی تھی کہ اس کا نیلام بھی ہو گیا ۔

جدید ہندوستان میں تہذیبی سرگرمیوں کا جو احیا ہوا ہے ، اسے کچھ لوگ خواہ کتنی حقارت سے دیکھیں مگر یہ آزاد ہندوستان کی فطری کوشش ہے ، اپنی بنیادوں کو استوار کرنے کی ، اپنے آپ کو پانے کی ، اپنے محدود مصنوعی اور کاروباری ماحول میں ، سارے ملک کے درد و داغ اور سوز و ساز کو سمو لینے کی ۔ یہ تہذیب کے صحیح تصور تک پہنچنے کی کوشش ہے ۔

یہ ادب کو تہذیب کے جامع تصور کے ذریعے سے فنونِ لطیفہ کے جانے پہچانے آزمودہ تجربات اور بصیرتوں سے بھرپور ، محنت ، خدمت دکھ اور دلاسے کے خزانوں سے مالا مال کرنے کی کوشش ہے ۔ یہ مغرب کے ان تجربوں سے جن کو خام ذہن کتابوں سے حاصل کرتے ہیں کہیں زیادہ صحت مند ہے اس تہذیبی بساط میں انسان دوستی کے ، رواداری کے ، کثرت اور وحدت کے جو نقش ابھرتے ہیں ، وہ قومی سالمیت کے لئے ضروری ہیں ۔ ان کے راستے سے مغرب کے تجربوں سے بھی صحیح معنی میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ۔

میں یہ نہیں مانتا کہ اردو شاعری کی زبان بدیسی ہے لیکن یہ ضرور مانتا ہوں کہ اردو شاعری کی زبان مجموعی طور پر ہمارے ملک کے ایک محدود طبقے یعنی شمالی ہند کے متوسط طبقے کے فکر و ذہن کی نمائندگی کرتی ہے میں یہ بھی مانتا ہوں کہ جس طرح جدید شاعری ادبی ہوتے ہوئے بھی عام فہم ہے اسی طرح سے ہماری شاعری نہیں ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ہماری زبان میں اس کی پوری صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہماری پوری تہذیبی بساط کی آئینہ داری کرسکے ۔ ہاں اس کے لئے ہمارے شاعروں کو ، شاعری کی طاقت ، فضیلت اور عظمت میں یقین اور اعتماد پیدا کرنا ہوگا ۔ خونِ جگر مال تجارت ہو یا نہ ہو اس سے قانونِ باغبانیِ صحرا ، تو بہرحال لکھا جاتا رہے گا ۔ اسے اپنے عہد کی بے رحمی اور سنگدلی سے سابقہ پڑے ، وہ اس کے بے ستوں سے جوئے شیر نکالتا ہی رہے گا ۔ کیونکہ عشق کے امتحان کبھی ختم نہیں ہوتے ، مگر اسے یہ فیصلہ ضرور کرنا پڑے گا کہ آیا وہ اپنے دور کی ترجمانی میں صرف حفظانِ صحت کے دلار دخہ کا فرض سرانجام دے دینے کو کافی سمجھتا ہے ؛ یا بینڈ ماسٹر کی چمکتی ہوئی وردی اور اس کے گرد ہجوم سے مرعوب ہے ، یا اسے اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کا سمجھ سے انتقام اس طرح لینا ہے کہ ہر خوشۂ انگور کو کھٹا بتا دے کیونکہ اسے اس نے چکھا نہیں ہے ۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ سردی میں کپکپاتے ہوئے بھی جشن کے چراغاں کی تابناکی پر وجد کرتا رہے یا کسی کے اشارے پر سرکاری اسکیموں کی کامیابی کے راگ گاتے ۔ اس کی وفاداری اپنی ذات سے ، اپنے علاقے سے ، اپنی برادری ہی سے نہیں ، اس پورے ملک سے ہوگی جس کے جلوۂ صد رنگ میں اس کی بھی بہار ہے ، جس کے چمن میں اس کے بھی پھول ہیں ۔ وہ اگر قومی ، جمہوری اور اجتماعی تصور کو اپنائے گا ، تو اسے فکر و فن کے لئے لامحدود فضا ملے گی

میں نے نظم کی زبان کے سلسلے میں ، زبان کے صحیح تصور ، تہذیبی پس منظر ، موضوعات ، قومی نقطۂ نظر عوامی بساط کا اس لئے ذکر

کیا ہے کہ میرے خیال میں زبان کا تصور ان چیزوں کے بغیر ناقص رہتا ہے۔ ان کے سہارے ہم آسانی سے نہ صرف اپنے دور کی نمائندگی میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ بلکہ آنے والوں کی راہ کے بھی بہت سے کانٹے نکال دے سکتے ہیں۔ ہمیں الفاظ کی صحت اور غلطی کے معیار کو بدلنا ہوگا مگر اس کے یہ معنی نہیں، کہ ہمارے معیار یکسر بدل جائیں گے۔ ہاں ان میں خاصی لچک ہوگی۔ ہمیں فارسی تراکیب کی بیساکھیوں کا اتنا سہارا لینے کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ بیساکھیاں ایک حد تک اپنے پیروں میں طاقت کی کمی کا بھی ثبوت ہیں ہمیں بحروں، قافیے، ردیف، مروجہ اصناف سخن کی شکنجہ بندی وغیرہ سے بھی خاصا آزاد ہونا پڑے گا۔ ہمیں نظم کو اس قابل بنانا پڑے گا کہ وہ ایک طرف دھرتی پر ہل چلاتے ہوئے کسان کے ذہن کی ترجمانی کر سکے، اور دوسری طرف آن خلا کے سیاحوں کے ذہن کی عکاسی بھی، جو زمین کے حسن کو کششِ ثقل سے آزاد ہو کر دیکھ رہے ہیں۔ اس کے لئے ہمارا موجودہ علم اور زبان کا محدود سرمایہ کافی نہ ہوگا۔ بلکہ بول چال کی زبان کی بنیاد کے ساتھ جدید علمی زبان سے بھی کہیں کہیں مدد لینی پڑے گی، خصوصاً ہندی بحروں کی آزادی اور موسیقی کے علم دونوں سے اور زیادہ فائدہ اٹھانا پڑے گا۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جدید نظم اگر جدید ذہن کی عکاسی کرنے لگی، تو یہ اور بھی مشکل ہو جائے گی، وہ غلطی پر ہیں۔ یہ نظم سہل پسند ذہنوں کے لئے ہے، اس ذہن کے لئے نہیں، جو ایک طرف اپنے تہذیبی سرمائے سے واقف ہے، دوسری طرف جدید علمی دنیا کے کارناموں سے بھی۔ جدید شاعری مشکل اور مخصوص ہوتی ہے، تو وہ ایک محدود طبقے کی ذہنی تفریح یا اس کی الجھنوں اور نفسیاتی گرہوں کی طلسم بندی بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ وہ منزل ہے جب شاعر سماج سے گھبرا کر اس کا حلقہ توڑ دیتا ہے اور اپنی ذات کو کائنات سمجھنے لگتا ہے۔ اردو شاعری کو نئے سرے سے کائنات کے اس حلقے میں داخل ہونا ہے جس میں، سات میل گہرا سمندر اور لاکھوں کروڑوں میل دور ستارے شامل ہیں۔ اور جس میں انسان آج ہلاکتِ کلی اور نجاتِ ابدی کے دوراہے پر کھڑا ہے۔ اسے زبان سے ایک نیا عشق پیدا کرنا ہے، تاکہ وہ اس کی ہر ادا کو سمجھ سکے اسے اپنی سرزمین پر اپنی جگہ بنانی ہے۔ اور اسی اپنی سرزمین کے ہر رنگ و آہنگ سے لو لگانا ہے۔ اسے قدما کے تجربات سے فائدہ اٹھانا ہے، اسے میر کے ذہن کی تقلید نہیں کرنا ہے۔ بلکہ میر کو بھی جذب کرنا ہے۔ اسے سیاست، مذہب، جنس کی روح تک پہنچنا ہے اور انسانیت پر وہ اعتقاد اور اپنی مٹی پر وہ اعتماد پیدا کرنا ہے جو نشتر بھی ہے، نجات بھی۔ غالب اور اقبال سے ہم بہت کچھ لے چکے میر، نظیر، حالی سے ابھی بہت کچھ لے سکتے ہیں اور ہندی شاعری کے اس حصے سے بھی جس کے اسرار میں ہماری تہذیب اور تاریخ کے کتنے ہی جگمگاتے مرقعے پوشیدہ ہیں۔ اس ضرورت کا احساس تو ہے، مگر یہ ابھی عام نہیں ہوا۔ اس لئے ہمیں اپنے اپنے گوشۂ عافیت کو چھوڑ کر اب میدان میں نکلنا چاہئے۔ کھلی ہوا میں کچھ چراغ بجھ جاتے ہیں، مگر کچھ اور نئے جلتے بھی ہیں۔ ہماری زبان اتنی جاندار ہے کہ وہ اب تک جس طرح مہذب رندی کی ترجمانی کرتی رہی ہے، اسی طرح تہذیب کے ہر رقص کی بھی ترجمانی کر سکے گی رقص کی طرف میلان شروع ہو گیا ہے۔ اب ہمارا فرض یہ ہے کہ اسے اور آگے بڑھائیں، حتیٰ کہ یہ ہمارا نمائندہ انداز بن جائے۔

(بشکریہ "ہماری زبان" علی گڑھ)

انجم اعظمی

# تقسیم کے بعد

برصغیر کی تقسیم کے بعد ادیبوں کا سب سے اہم مسئلہ خود تقسیم تھا جس کا اثر بے شمار ذہنوں پر بہت گہرا پڑا۔ اس تقسیم نے اہل سیاست کو ادیبوں سے بالکل الگ کر دیا۔ ویسے تو تقسیم نے ان پر ملک کی تعمیر و تشکیل کی بھاری ذمہ داری ڈالی تھی، لیکن وہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد ملک کی خوش حالی کو فروغ دینے کے بجائے نعمت ہائے غیر مترقبہ سے بہرہ مند ہونے میں مصروف ہو گئے۔ اقتدار کا نشہ ہوتا ہی ایسا ہے کہ آدمی غلط راستوں پر نکل جاتا ہے۔ خصوصاً اُن ملکوں میں جہاں حال ہی میں آزادی ملی ہے۔ ادیبوں نے اس کے برخلاف صدیوں کے ثقافتی رشتوں کو ٹوٹتے بکھرتے دیکھا تو غم کی ایک لہر اُن کی رگ و پے میں اُتر گئی اور برصغیر کی تقسیم کے بعد کا ادب آنسوؤں کے ہجوم میں ڈوب گیا۔ میں فسادات کی خونی لہر کا تفصیلی تذکرہ جان بوجھ کر چھوڑ رہا ہوں۔ کرشن چندر کی کہانی "غدار" ۔ بیدی کی "لاجونتی" ۔ حیات اللہ انصاری کی "ماں بیٹا" ۔ اشفاق کا افسانہ "گڈریا" ۔ قدرت اللہ شہاب کا طنزیہ "یا خدا" ۔ اور احمد ندیم قاسمی کی کہانی "پرمیشر سنگھ" کے بعد انتظار حسین نے کہانی کو یادوں کے غبار میں چھپا دیا۔ شاعری میں فسادات کے تاثر کے بعد کچھ عرصے کے لئے ایک منفی رجحان پرورش پاتا رہا۔ جس کے تحت بے معنی نظمیں لکھی گئیں۔ ترقی پسندوں کی مخالفت کی گئی۔ اور غزل گوئی کے رجحان نے تقویت حاصل کی جس کے لکھنے والے میر کا نام لیتے ہوئے اور فانی کی یاسیت سے سلسلہ جوڑتے رہے۔ البتہ قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول "میرے بھی صنم خانے" میں تقسیم کا دکھ، اور "آگ کا دریا" میں ایک بڑا تہذیبی غم پیش کیا۔ اور اب آزادی کے بیس سال گذر جانے کے بعد ہمارا ادب یادوں کے غبار سے باہر نکل رہا ہے۔ تقسیم سے پہلے ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ آزادی کے حصول کا تھا۔ آزادی کے بعد اب ہمارے ملک کا آدمی معاشرے سے اپنا رشتہ ڈھونڈ رہا ہے پہلے وہ باہر کی جانب دیکھ رہا تھا جس کے سبب ہمارے ادب کا لہجہ تمام تر سیاسی تھا۔ اب اس آدمی کی نگاہ اپنے اوپر اور اپنے معاشرے پر بیک وقت پڑ رہی ہے۔ وہ اپنی ذات اور معاشرے کی اندرونی کیفیت سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اسی تگ و دو میں مصروف ہے۔ اس تبدیلی نے ادب میں اس داخلیت کو جو انسانی رشتوں کے ادراک کا دوسرا نام ہے از سر نو اہمیت دینا شروع کر دی ہے جسے مدت تک قابل التفات نہیں سمجھا گیا تھا۔

آزادی اپنے ساتھ ذمہ داری لاتی ہے ذمہ داری ہمیشہ ذات کے ادراک اور گہرے تہذیبی شعور کا مطالبہ کرتی

ہے۔ کیونکہ رشتے سمجھ میں نہ آئیں تو آزادی انارکی میں بدل جاتی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ آزادی کی عائد کردہ ذمہ داری کا روایتی اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ روایتی اخلاق تو ہمہ وقت اس آدمی کی زد میں ہے، جو سیاسی آزادی کو ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے جس میں اُس کے خواب جگہ پاسکیں۔ اسی لئے تقسیم ہند کے بعد کا ادب فسادات کے موضوع اور بچھڑنے والوں کے غم سے گذر کر ایک نئی سمت کی نشان دہی کرنے لگا ہے، جس طرف ہمارا معاشرہ سُست گام سہی لیکن ایک بار چل پڑا ہے تو اس آدمی کو بھی کسی دن روشنی مل ہی جائے گی جو آزادی کے بعد کی نیم روشن اور نیم تاریک فضا میں اب تک سانس لیتا اور زندگی گذارتا رہا ہے۔ قرۃ العین حیدر کو "آگ کا دریا" میں ہمارے معاشرے کی اس نیم روشن اور نیم تاریک فضا پر جو کچھ لکھنا تھا لکھ دیا۔ اس ناول میں آدمی کے دکھ صدیوں کے تہذیبی پس منظر میں بیان ہوئے ہیں اب ادیبوں اور شاعروں کو اپنے خواب لکھنے ہیں۔ وہ خواب جو رومان پرستوں کے لئے فرار کا ذریعہ تھے۔ لیکن آج ان کے اندر اس عہد کے غم، جمالیات، فکر اور زندگی کے متحرک عمل کی اندرونی کیفیت موجود ہے اور جو حال، و مستقبل کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے ہمیں زندگی کے طوفان خیز عمل میں بے خطر شامل ہونے پر مجبور کرتے آئے ہیں۔

آزادی قومی تعمیر کے سلسلے میں سیاسی اثبات کی حیثیت رکھتی ہے جو ایک روشن منزل کی جانب رہنمائی کرسکتی ہے۔ لیکن آزادی کے بعد چونکہ معاشرہ ہمہ جہتی ارتقا کی راہ میں بہت تیزی سے بڑھتا ہے اس لئے اس کی پیچیدگیوں میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ پہلے "آزادی حاصل کرو" کا نعرہ تھا، جس میں فرد کا سارا خلوص سمٹ جاتا تھا۔ اس نعرے میں کچھ معاشی اور تہذیبی غم بھی شامل ہوتے تھے۔ مارکس اور انقلاب روس کے زیر اثر ایک نئے معاشی نظام کا چرچا اور فرائڈ کے اثر سے اخلاقی ضابطوں کے خلاف انفرادی بغاوتوں نے رواج پایا تھا، پوری قوم کو ایک سیاسی پلیٹ فارم میسر تھا۔ لیکن فرد کی انفرادی آواز اس پلیٹ فارم پر گم ہوگئی تھی۔ یہ دور ایک ایسی اجتماعیت کا تھا جو فرد سے خاصا تعصب برتتی تھی۔ بدیسی حکمرانوں کے جانے کے بعد فرد کو فرصت ملی کہ وہ اپنے لوگوں سے اپنی بات کہے۔ یہاں سے زندگی کے رشتوں میں ہم آہنگی کی ایک نئی جستجو اس کا مقدر بنتی ہے کیونکہ اب دوست بھی اپنے ہیں اور دشمن بھی اپنے۔ اور ہمارے معاشرے میں زندگی کے متضاد عناصر ایک ہی قوم کے تعمیری اور تخریبی عناصر کی پیکار کی علامت بن کر ابھرتے ہیں۔ اسی لئے افراد اپنے اندر اور اپنے آپ سے باہر ان عناصر کی پیکار کو پوری طرح سمجھے بغیر ذمہ داری سے کوئی نیا قدم نہیں اٹھاسکتے۔

اب ہمارے ادب کے سامنے دو نئی راہیں کھلی ہیں جن پر چلنا ہمارا کام ہے۔ ادیب ملکی، قومی اور مقامی مسائل کو سمجھ کر آگے قدم اٹھائے گا۔ دوم انسان کے بنیادی مسائل ساری دنیا کے لئے یکساں ہیں جن سے زندگی کی مشترک اقدار کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ ادب ان کی روشنی میں ایک ایسے معاشرے کی تعمیر میں مدد دے گا جو یہاں کے لوگوں کے لئے عذاب اور دوسری قوم کے لوگوں کے لئے خطرے کی علامت نہ بنے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ادب میں اپنے لوگوں کی محبت اور ہمارے موسموں کے رنگ انسانی شعور سے مل کر وہ خط و خال پیدا کریں گے جن سے ہماری قوم کا پورا چہرہ نمایاں ہوگا، چونکہ ہمارے ملک میں تعلیم عام نہیں ہے اور پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد کم ہے اور ان کے مقابلے میں سوچنے سمجھنے والوں کی

تعداد اسی نسبت سے اور بھی کم ہے ۔ اس لئے اس بات کی وضاحت کردوں کہ ادب سے مُراد صرف ناول، افسانہ، ادبی تنقید، ڈرامہ اور شاعری نہیں ہے ۔ بلکہ وہ ساری تحریریں ادب ہی کا حصہ ہیں جو کسی ملک کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کی حفاظت کے علاوہ اس میں اضافہ بھی کرتی ہیں ۔ اس ورثے میں جو اضافہ آج کا ادیب کرسکتا ہے وہ اس کے خوابوں ہی سے ہوگا۔ جن میں انسان کے بنیادی مسائل اور قومی مسائل ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں ۔ یہی ہم آہنگی ہر قوم کی بقا کی ضمانت ہے، اور ادیب کو اسی کی تلاش ہوتی ہے ۔ روح عصر زندگی کی روایت اور ادب میں تنوع اسی ہم آہنگی کے مختلف عناصر ہیں جن کے سہارے ہر ملک کا ادیب وقت کی رفتار پر قابو پاتا ہے ۔ اسی لئے آج کے ادیب چاہے وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف انداز میں سوچ رہے ہوں اور ان کی تحریر میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو، اپنے آپ سے یہی حساب لینے بیٹھے ہیں کہ اُن کے خواب کیا ہیں، اور ان ادیبوں کے سہارے پوری قوم اپنے خوابوں سے واقف ہونا چاہتی ہے ۔ بظاہر یہ بات موجودہ سماجی بحران میں جب کہ ہم ادب سے ہٹ کر مذہبی، معاشی، سماجی اور سیاسی الجھنوں کا شکار ہوگئے ہیں، عجیب سی معلوم ہو رہی ہے ۔ لیکن یہ بات اتنی عجیب نہیں ہے جتنا چند مایوس ادیبوں کا یہ کہنا کہ ہمارے ادب کا کوئی مستقبل ہی نہیں ہے ۔ میرا خیال ہے کہ وہ ادب کے مفہوم سے واقف ہیں اور یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہماری قوم کا کوئی مستقبل نہیں ہے ۔ کیا اُن کی یہ بات کوئی صاحب شعور تسلیم کرے گا کہ ایک قوم ہمیشہ کے لئے اپنے مستقبل سے ہاتھ دھو چکی ہے ۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ بات بالکل عجیب نہیں معلوم ہوگی کہ جو قوم آج سماجی، مذہبی، معاشی اور سیاسی الجھنوں کا شکار ہے وہ کل کو ان مصائب سے نکلنے کے لئے نجات کا کوئی راستہ بھی ڈھونڈ ھ لے گی ۔ اور اسی بات کو ایک قوم کا اپنے خوابوں سے آگاہ ہونا کہتے ہیں ۔ شاید یہ بات بتلانے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ خواب دیکھنا اور دکھلانا ہمیشہ سے شاعروں اور ادیبوں ہی کی ذمہ داری رہی ہے ۔ جس کے لئے انہیں معاشرے کی منفی قوتوں سے ٹکرانا پڑتا ہے ۔

ہمارے ملک کے نوجوان ادیبوں نے آگے کی جانب دیکھنا شروع کر دیا ہے ۔ حال کے غموں کا مداوا بن کر فردا کی تعبیر کا تصور ہمارے ادب میں جگہ پانے لگا ہے ۔ یہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارا معاشرہ آہستہ آہستہ موجودہ بحران پر قابو پا رہا ہے اور اس میں وہ روشنی اپنی جگہ بنانے لگی ہے جو جلد یا دیر اس قوم کی تقدیر بدلنے والی ہے ۔ نوجوان ادیبوں کے پاس وہ عزت اور وہ شہرت نہیں ہے جو میرؔ، غالبؔ، سرسیدؔ، شبلیؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کو نصیب ہو چکی ہے ۔ لیکن وہ سوچنا چھوڑ دیں تو ماضی کے ورثے اور ان برگزیدہ ناموں کے ساتھ یہ معاشرہ بھی تباہ ہو جائے گا جس میں دس کروڑ عوام زندگی گذار رہے ہیں ۔ کیونکہ جب ادب کی روایت ہی اٹھ جائے گی تو وہ ساری قدریں بھی مٹ جائیں گی جو ادب کے توسط سے معاشرے میں پائی جاتی ہیں ۔ معاشرہ ہجوم کے بجائے افراد کی تنظیم سے بنتا ہے جن کی داخلی تنظیم نامکمل ہو تو معاشرے کی تنظیم ٹوٹ جاتی ہے اور داخلی تنظیم کا کام اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے گزر کر اس وقت مکمل ہوتا ہے جب اس میں کسی قوم یا ملک کے ادیب حصہ لیتے ہیں اسی لئے ادب زندگی کا ایک بے حد اہم شعبہ ہے اور نوجوان ادیبوں نے ہر مخالفت برداشت کرکے اپنی آواز بلند کی ہے وہ صرف عزت اور شہرت کے لئے نہیں لکھ رہے ہیں دپچھلے ادیب بھی عزت اور شہرت کے لئے نہیں لکھتے تھے ۔ ادب میں مستقل عزت اور شہرت تو صرف ان لوگوں کو ملتی ہے یا ملی ہے جو زندگی اور ادب کے ناموس کو زندہ رکھتے ہیں ) بلکہ انہیں ان مسائل کا بھرپور جواب دینا ہے جن کے پُرپیچ

بھنور میں قوم کی کشتی بیس سال سے ڈگمگا رہی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ نشر و اشاعت اور پبلسٹی کے اس دور میں چند ایسے لوگوں نے بھی قلم اٹھا لیا ہے جو تخلیق کے منصب سے ناواقف ہیں۔ وہ شہرت کے بھوکے، کیریئر کے متلاشی اور عزت کے خواہاں ہوتے ہیں لیکن ان کا سفر بہت مختصر ہوتا ہے۔ ایسے لکھنے والے دو دو چار چار قدم چل کر دم توڑ دیا کرتے ہیں، یا اقتدار پسندوں کی خوشامد اور قصیدہ خوانی میں لگ جاتے ہیں، وہ ادب کا مسئلہ کبھی نہیں بنتے۔ سچے ادیب کی فکر کسی لمحے زندگی سے آنکھیں نہیں چراتی۔ چند روز ہوئے میرے ایک ادیب دوست عجیب بے تابی اور کرب کے ساتھ کہہ رہے تھے امریکہ ویت نام کے بہانے ایشیا کو میدانِ جنگ بنانا چاہتا ہے۔ سفید فاموں کا یہ ظلم ہم ایشیا کے لوگ کیونکر برداشت کر سکتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا کہ ویت نام میں روزانہ ہزاروں بوڑھے بچے اور عورتیں امریکی بمباری کی نذر ہو جاتے ہیں بھلا اس فضا میں ہمارے ملک کا کوئی شاعر عاشقانہ غزل لکھے تو میں اسے کیسے پسند کروں، اور اپنے فن کے بارے میں کیا رائے رکھوں۔ میں نیرو تو نہیں ہوں جس نے سارے روم کو بھڑکتی ہوئی آگ میں جلتے دیکھا تو خوشی سے پاگل ہو کر بنسری بجانے لگا۔ میں نے ان سے صرف اتنا کہا کہ ویت نام ہی کی جنگ نہیں، ہر جنگ انسانیت کی توہین ہے۔ سفید فام تو میں بھی زیادہ عرصے تک جدید عہد کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کر سکتیں۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی تباہی کے بعد ایشیائی جنگ سے سب سے زیادہ خوف انہیں کو آتا ہے۔ ہم کو ویت نام کی جنگ کے خلاف صرف احتجاج نہیں کرنا ہے بلکہ اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے نکلے ہیں تو ان قوتوں کا حریف بننا پڑے گا جو ہم پر جنگ مسلط کرنا چاہتی ہیں اور ہماری غزل ہمارے عشق کی روایت ہے۔ اس لئے آپ غزل گو شاعروں سے جب چاہیں یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ عشق کے سچے تجربوں کی آگ میں اپنی غزل کا سانچہ تیار کریں۔ ورنہ نیرو کی بانسری کی طرح ان کی غزل بھی ان کے ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت فراہم کرے گی۔ یہ ہمارے ملک کے ایک ادیب کی صدائے احتجاج تھی جسے میں نے قلمبند کر دیا ہے۔ ہمارے معاشرے کا ادیب آج اُن سارے مسائل سے دوچار ہے جن سے ہمارے ملک، ایشیا، افریقہ اور دنیا کے عوام کی زندگی کا گہرا تعلق ہے۔

ہمارا ادب آج ایک نئے موڑ سے گذر رہا ہے۔ ہم ایک عظیم الشان مستقبل کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں صنعتی عہد کی سچائیوں اور آزادی کی لائی ہوئی ذمہ داریوں نے ماضی سے ہمارے تعلق کو حریفانہ رنگ دے دیا ہے ہم جینے کی امنگ لے کر آگے بڑھے ہیں تو سوچنے سمجھنے ہی کا نہیں تحریر کا انداز بھی یکسر بدل گیا ہے۔ آج روایت کے نام پر جو لوگ ہمارے ادب میں ماضی کی گہری چھاپ تلاش کر رہے ہیں اور روایت پرستی کو فروغ دے رہے ہیں وہ روایت سے ناآشنا ہوتے جا رہے ہیں۔ روایت تو ہمارے سینوں میں جگہ بنا چکی ہے۔ تشبیہات، استعارات، علامتوں، تراکیب الفاظ غرض ادب کی پوری زبان کو زندگی کی نئی معنویت نے ماضی پرستوں کے لئے اجنبی بنا دیا ہے۔ ماضی پرستوں کی جدید عہد کے ادب سے یہ اجنبیت ہی گواہ ہے کہ ہمارا آج کا ادب روایت سے گہرے طور پر وابستہ ہے۔ کیونکہ ہر عہد کا ماضی پرست روایت کو سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ روایت جو سچے تجربوں ہی میں نمو پاتی ہے، ماضی کی طرف دیکھنے والوں کی نظر سے اوجھل رہتی ہے۔ اس بحث کو مختصر کرنے کے لئے ایک ماضی پرست سے یہ کہنا کافی ہوگا کہ زبان تمہاری ہی نہیں ہماری بھی ہے اور ہماری ہی ہے۔ کیونکہ ہم نے اس کے قدموں پر تجربوں کے پھول نچھاور کئے ہیں

(باقی صفحہ ۴۶ پر)

آغا افتخار حسین

# فرانس میں اردو

## گارسیں دتاسی اور اس کی اہم تصنیفات

گارسیں دتاسی[1] سنہ ۱۸۲۸ء سے دمِ آخر سنہ ۱۸۷۸ء تک پیرس کے مشرقی زبانوں کے مدرسہ میں ہندوستانی کا پروفیسر رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہ صرف اردو، ہندی، فارسی، عربی، ترکی زبانوں اور مشرقی تاریخ و تہذیب پر لیکچر دیئے بلکہ اس پچاس سال کے عرصے میں اس نے مختلف مشرقی موضوعات پر متعدد کتابیں، رسالے اور مضامین وغیرہ بھی شائع کئے۔ حال ہی میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ثریا حسین نے گارسیں دتاسی کی حیات اور تصنیفات پر ایک مقالہ لکھا ہے۔ جس پر پیرس یونیورسٹی سے انہیں ڈاکٹریٹ ملی ہے۔ مقالے کا عنوان ہے: "Garcin de Tassy Biographie et etude critique de ses oeuvres"

یہ مقالہ کتابی صورت میں "Institute Francais d' Indologie" پانڈیچری سے سنہ ۱۹۶۲ء میں شائع ہو چکا ہے[2]

اس مقالے میں دتاسی کی کتابوں اور رسالوں وغیرہ کی جو فہرست مرتب کی گئی ہے اس کے مطابق دتاسی کی تالیفات کی کل تعداد ایک سو پچپن (۱۵۵) ہے[3] ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے میں یہ فہرست خاصی مکمل ہے۔ انہوں نے دو ایک مضامین کی نشان دہی کی ہے جن کا پتہ چل جائے تو وہ اس فہرست میں شامل کئے جا سکتے ہیں[4] افسوس ہے کہ ان تالیفات میں سے

---

[1] ولادت: مرسی ایلیا (جنوبی فرانس)، سنہ ۱۷۹۴ء - وفات: پیرس سنہ ۱۸۷۸ء

[2] ثریا حسین نے یہ مقالہ بہت محنت سے لکھا ہے، اور میں نے اس مضمون میں اس سے بھی استفادہ کیا ہے۔

[3] ثریا حسین۔ کتاب محولہ صفحات ۲۰۷ تا ۲۱۷

[4] ملاحظہ ہو اختتامیہ مقالات گارساں دتاسی، جلد اوّل مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی سنہ ۱۹۶۶ء صفحہ ۲۱۱۔

صرف معدودے چند کتابوں کا ترجمہ اردو میں ہوا۔ اور اس علمی ذخیرے کے بیشتر حصے سے فرانسیسی زبان نہ جاننے والے ابھی تک ناواقف ہیں۔ میں صرف چند اہم تالیفات کا ذکر اس مضمون میں کروں گا۔

## تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی

(Histoire de la littérature hindouie et hindustanie)

یہ گارسیں دتاسی کی سب سے زیادہ ضخیم اور اہم تصنیف ہے۔ اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ پہلا ایڈیشن پیرس سے سنہ ۱۸۳۹ء تا سنہ ۱۸۴۷ء دو جلدوں میں شائع ہوا۔ پہلی جلد میں ۶۴۰ صفحات اور دوسری جلد میں بھی ۶۴۰ صفحات ہیں۔ دوسرا ایڈیشن پیرس سے ۱۸۷۰ء - ۱۸۷۱ء میں تین جلدوں میں شائع ہوا۔ جن میں علی الترتیب ۶۲۸، ۶۰۸ اور ۶۱۱ صفحات ہیں۔ اس طرح یہ پوری کتاب ۱۸۴۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ایڈیشن کا ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں موجود ہے، اور میری درخواست پر کراچی یونیورسٹی لائبریری نے تینوں جلدوں کا مائیکروفلم بھی تیار کروالیا ہے۔

دوسرے ایڈیشن کی جلد اول میں پہلے چار صفحات کا مختصر دیباچہ ہے۔ جس میں نئے ایڈیشن کی تالیف و اشاعت کے مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ۷۱ صفحات کا مقدمہ ہے جس میں ہندوستانی زبان کی ابتدا اور ارتقا پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مقدمے میں ان اردو تذکروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن سے مؤلف نے استفادہ کیا۔ اردو اور ہندی زبانوں کی اصناف سخن وغیرہ کو بھی خاصی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اردو اور ہندی کے شعرا اور دیگر اہل قلم کے حالات زندگی بہ اعتبار حروف تہجی بیان کئے گئے ہیں، اور ان کے کلام کے اقتباسات لے کر ان کا فرانسیسی ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ واصل اردو یا ہندی متن پیش نہیں کیا گیا، دوسری جلد میں بھی شعرا کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام کا فرانسیسی ترجمہ ہے ........ تیسری جلد میں پہلے ۸ صفحوں کے پیش لفظ میں دتاسی نے لکھا ہے کہ اسی اثنا میں اسے ایک نہایت کارآمد تذکرہ موسومہ "نسخۂ دلکشا" کے دوسرے حصے کا مخطوطہ مل گیا۔ جس میں ان شعرا کے حالات ہیں جن کے نام "گ" اور اس کے بعد کے حروف تہجی سے شروع ہوتے ہیں[1]۔ اس کے بعد دتاسی نے ان شعرا اور شاعرات کے ناموں کی فہرست دی ہے جن کا تذکرہ "نسخۂ دلکشا" میں کیا گیا ہے۔ پیش لفظ کے آخر میں دتاسی نے شہید پونوی کی کتاب "باغ و بہار" عرف "فسانہ سحر" میں سے بعض اشعار کا فرانسیسی ترجمہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۳۵۳ تک دیگر جلدوں کی طرح تمام شعرا کے حالات اور نمونۂ کلام کا فرانسیسی ترجمہ ہے۔ اور پھر ۳۵۴ سے ۳۷۶ تک نسخۂ دلکشا کے حصۂ اول کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ان شعرا کے حالات ہیں جن کے نام "ک" اور اس سے پہلے کے حروف تہجی سے شروع ہوتے ہیں۔ ان شعرا کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ بصفحہ ۳۷۷ سے ۴۰۸ تک ایک طویل ضمیمہ ہے جس میں گارسیں دتاسی نے ان کتابوں کا ذکر کیا ہے جو اس کے

[1] اس نسخہ پر ملاحظہ ہو میرا مضمون "نسخۂ دلکشا" نگار پاکستان کراچی ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۴ء

زیر مطالعہ رہیں اور جن کا حوالہ ان تینوں جلدوں میں کہیں نہیں آیا۔ صفحہ ۴۸۹ سے ۶۰۳ تک مصنفین کے ناموں کا اشاریہ ہے اور اس پر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

اس کتاب پر بعض محققین (مثلاً قاضی عبدالودود) وغیرہ نے کڑی تنقید کی ہے اور غلطیاں نکالی ہیں۔ لیکن اگر اس کتاب میں غلطیاں باقی رہ گئیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ گارسیں دتاسی کبھی ہندوستان نہیں آیا۔ پیرس میں جو تذکرے وغیرہ اسے مل سکے۔ اور جو معلومات اُسے حاصل ہوسکیں اُن کی بنا پر اس نے یہ کتاب تالیف کی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے بھی بعض اوقات واقعات کی تحقیق کی کوئی خاص پروا نہیں کی۔ پھر کتابوں کی طباعت اس قدر ناقص تھی کہ اکثر پڑھنے میں سہو ہوجاتا تھا۔ اس قسم کے مواد کی اساس پر گارسیں دتاسی نے اتنی ضخیم کتاب تحریر کر دی۔ اس نے کہیں کہیں ٹھوکریں ضرور کھائی ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جتنے شعرا کا تذکرہ گارسیں دتاسی نے "تاریخ" میں کیا ہے اتنا اردو زبان کے کسی تذکرہ نگار نے آج تک نہیں کیا۔

اس کتاب کا ترجمہ تو کراچی یونیورسٹی میں کیا جا چکا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کے شائع ہونے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی۔

## مقالات و خطبات

سنہ ۱۸۵۰ء سے سنہ ۱۸۷۷ء تک ہر سال (سوائے سنہ ۱۸۵۸ء کے) گارسیں دتاسی ہندوستانی (اردو) زبان و ادب کے بارے میں مضامین شائع کرتا تھا جن میں وہ اردو زبان کے بارے میں وہ معلومات پیش کرتا تھا جو خطوکتابت اور دیگر ذرائع سے اسے حاصل ہوتی تھیں۔ ان مقالات و خطبات میں مختلف کتابوں کے شائع ہونے کی تفصیلات، ان پر تبصرے، ہندوستان کے معاشرتی اور سیاسی حالات کا جائزہ، اردو زبان کی ترقی اور مخالفتوں کے کوائف، مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے بارے میں معلومات، اخباروں کے شائع ہونے اور بند ہونے کی اطلاعات، ادبی اور ثقافتی انجمنوں کی سرگرمیوں کے تذکرے اور دیگر اہم شخصیتوں کی زندگی اور موت کے بارے میں نہایت بیش قیمت مواد ملتا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر گارسیں دتاسی کے مقالات و خطبات کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہندوستان کی ادبی اور ثقافتی تاریخ کے اس دور کے بارے میں کوئی اور ماخذ مشکل ہی سے ملے گا۔

حال ہی میں انجمن ترقی اردو نے ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۳ء کے مقالات کے تراجم کو ڈاکٹر حمید اللہ سے نظر ثانی کرا کے شائع کیا ہے[1] ان مقالات و خطبات کو برصغیر ہند و پاکستان میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اور مولوی عبدالحق اور دیگر اہل علم نے ان پر تبصرے تحریر کئے۔ جن سے اردو داں حضرات واقف ہیں۔

فرانس کے مستشرقین بھی گارسیں دتاسی کے ان مقالات سے بہت متاثر تھے چنانچہ مشہور مستشرق رینان کے مضامین سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

---

[1] "مقالات گارسیں دتاسی" مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (سنہ ۱۹۶۴ء)

"ہمارے معزز قائدان خطوط میں ایک ہندوستان کے رہنے والے کی طرح جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔ وہ یقیناً خوب صورت ہندوستانی کے حق میں ہیں جسے اردو کہتے ہیں اور دیوناگری حروف تہجی کے بے جا دعوے کے مخالف ہیں"[1]

ایشیاٹک سوسائٹی کی سالانہ رپورٹ بابت سال سنہ ۱۸۷۴ء میں رینان لکھتے ہیں:

"نہایت بصیرت افروز حقائق کو جس دلچسپی اور جس خلوص سے پیش کیا گیا ہے اس سے بہتر پیش کش کی توقع نہیں کی جا سکتی"[2]

## ہندوستانی - فرانسیسی اور فرانسیسی - ہندوستانی لغت

۴۲ صفحات کی یہ لغت گارسیں دتاسی کی زیر ہدایت فرانسوا دیلونکل (Francois Delonclé) نے سنہ ۱۸۷۶ء میں شائع کی[3]

## عربی فن عروض کے ہندوستانی زبان میں تصرف پر ایک مقالہ

*Memoire sur la systeme metrique des Arabes adapte a la langue hindustanie.*

چوالیس صفحے کے اس مقالے میں دتاسی نے عربی اور اردو دو زبانوں کی بحروں میں فرق اور مماثلت پر بحث کی ہے۔ یہ مقالہ ژورنال آزیاتیک سنہ ۱۸۳۲ء میں شائع ہوا[4]

## قواعد اردو

گارسیں دتاسی نے اردو زبان کی قواعد کی مبادیات، صرف، نحو، وغیرہ پر سات کتابیں اور رسالے شائع کیے ہیں، جن کی تفصیل ثریا حسین نے اپنی کتاب میں دی ہے[5]

---

[1] مضمون معنظار نست رینان، شائع شدہ، ژورنال آزیاتیک (Journal Asiatique) جولائی سنہ ۱۸۷۳ء - بحوالہ تحقیق ثریا حسین صفحہ ۵۱ -

[2] حوالہ مذکور - ژورنال آزیاتیک - جولائی سنہ ۱۸۷۵ء

[3] ثریا حسین کتاب محولہ صفحہ ۵۷ تا ۶۰ -

[4] " " " " ۶۵

[5] ثریا حسین - کتاب محولہ صفحہ ۶۳

## تراجم

گارسیں دتاسی نے اردو زبان سے جو تراجم کئے ہیں ان میں سے حسب ذیل اہم ہیں:

**ہجو بعنوان "تنبیہہ الجہال" - میر تقی میر** کا ترجمہ گارسیں دتاسی نے - (Conseils aux mauvais poets) یعنی "بڑے شاعروں کو مشورہ" کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ گارسیں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی میں میر کے تذکرے میں شامل ہے۔ اور اس سے بہت پہلے سنہ ۱۸۲۵ء میں علیحدہ بھی شائع ہوا۔

**دیوان ولی** ولی کو جو اہم مقام اردو شاعری میں حاصل ہے اس سے اہل نظر واقف ہیں۔ ولی کا انتقال ۱۷۰۴ء میں ہوا۔ اس کی زندگی میں اور اس کی وفات کے بعد ہندوستان میں اس کی شاعری کے پرستاروں کی کمی نہ تھی۔ لیکن اس کے دیوان کے متن کا باقاعدہ تعین اور اس کی اشاعت کا شرف سب سے پہلے گارسیں دتاسی ہی کو حاصل ہوا۔ سید نور الحسن ہاشمی نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے[1] گارسیں دتاسی نے یہ کتاب ۱۸۳۳ء میں پیرس سے شائع کی۔ اس کے بعد دوسرے ہی سال سنہ ۱۸۳۴ء میں ولی کے کلام کا ترجمہ Les oeuvres de Wali traduites de l' hindustani کے نام سے ایک دیباچے کے ساتھ شائع کیا۔ اور اس کتاب کا دوسرا مرحمہ ایڈیشن سنہ ۱۸۳۶ء میں دیباچے کے علاوہ ایک "اعلان" (Avis) کے ساتھ شائع کیا[2]

اس کتاب کے دیباچے میں عالمی ادب میں شاعری کی اہمیت اور قدیم ہندوستان میں شاعری کے مقام کا ذکر کرنے کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی شاعری اور اس کی خصوصیات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس دیباچے میں اس کے مخاطب خصوصاً یورپین فضلا ہیں اور اس نے کوشش کی ہے کہ اردو شاعری (جسے وہ مسلمانوں کی شاعری کہتا ہے) کے مزاج کو مختصراً مغربی ادیبوں سے روشناس کرائے۔ اور چند غلط فہمیاں دور کرے۔ چنانچہ دیباچے میں وہ لکھتا ہے کہ ہندوستانی زبان کو مسلمانانِ ہند کی ثقافت کے بنیادی اجزائے ترکیبی میں سمجھنا چاہیئے۔ مسلمان عوام کو مذہبی فلسفہ کی تعلیم اکثر شاعری کے ذریعے ہی دی جاتی ہے۔ ولی کی شاعری کا مقصد روحانی اقدار سے ربط پیدا کرنا اور اس ذات لافانی سے ہم آہنگ ہونا ہے۔ کیونکہ دنیا کی تمام اشیا فانی ہیں یہ روحانی ربط محبت کے ذریعے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آگے

---

[1] سید نور الحسن ہاشمی "کلیات ولی" مطبوعہ انجمن ترقی اردو، سنہ ۱۹۵۴ء، صفحہ ۴۲

[2] ثریا حسین نے اپنی کتاب میں سنہ ۱۸۳۴ء کے ایڈیشن کا ذکر کیا ہے۔ سنہ ۱۸۳۶ء کے مرحمہ ایڈیشن کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن یہ کوئی قابل اعتراض فروگذاشت نہیں۔ کیونکہ اصل کتاب ۱۸۳۴ء ہی میں شائع ہوئی۔ اسی کی بنیاد پر سنہ ۱۸۳۶ء کا ایڈیشن شائع کیا گیا۔ موصوفہ نے جو اقتباسات "اعلان" میں سے دیئے ہیں وہ سنہ ۱۸۳۶ء کے ایڈیشن سے لئے گئے ہیں۔

چنانچہ دتاسی لکھتا ہے کہ غیر مرئی حقیقت تک پہنچنے کے لئے مرئی مجاز کا مشاہدہ اور تصور ضروری ہے۔ اور مجاز کے ادراک کی صورت یہی ہے کہ کائنات کے مادی مظاہر اور حسن کے اس تصویر خانے کا مشاہدہ کیا جائے۔ شعرا اس مشاہدے سے بصیرت حاصل کرتے ہیں۔ اور اس طرح مجاز کے رموز ان پر آشکار ہوتے ہیں۔ حسن اور اس کے مظاہر کا ذکر کرتے ہوئے گارسیں دتاسی مشرقی شاعری کے خلاف اس الزام کا ذکر کرتا ہے جو "امرد پرستی" کے نام سے مشہور ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حسن کے اہم مظاہر میں انسان بھی ہے اور یہ حسن شاعر کو عورتوں میں اور اکثر لڑکوں میں نظر آتا ہے۔ یہ لڑکے نو عمر ہوتے ہیں ایسی عمر جو ابھی جذبات کی غلام نہیں ہوئی — سادہ اور معصوم — جو برائی سے پاک ہوتی ہے اور فطرت کے نقش قدم پر چلتی ہے۔ اس عمر میں ان لڑکوں کا جسم بھی مضبوط اور صحت مند ہوتا ہے۔ ان کے چہرے نرم و نازک اور ان جھریوں سے پاک ہوتے ہیں جو زندگی کے مصائب و آلام انسان کے چہرے پر ڈال دیتے ہیں۔ شعرا اس حسن کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ لیکن اس کا کوئی تعلق اس مذموم فعل سے نہیں ہے جو بدقسمتی سے عیسائی یورپ میں بھی غیر معروف نہیں ہے اور جسے ایشیائی ملکوں کے لوگ بھی اتنا ہی مذموم قرار دیتے ہیں جتنا کہ عیسائی۔"

عورتوں سے زیادہ لڑکوں کے حسن کو شاعری کا موضوع بنانے کی وجہ دتاسی یہ بیان کرتا ہے کہ مسلمان عورتیں پردے سے باہر نہیں جاتیں اور کوئی اجنبی ان کے حسن و ادا سے متاثر ہونا تو کجا انہیں دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اس لئے اگر کوئی شاعر ان کے حسن و جمال کے گیت گائے تو اس کا خدشہ ہے کہ عورت کے والدین، بھائی یا شوہر اسے اپنی ہتک خیال کریں اور اس کے ناخوشگوار نتائج برآمد ہوں۔ دتاسی لکھتا ہے کہ جن مسلمانوں سے میں ملا ہوں انہوں نے یہی توجیہہ کی ہے۔

دتاسی لکھتا ہے کہ امرد پرستی اور اس کے بارے میں یہ تاثرات زیادہ تر غزلیہ شاعری سے متعلق ہیں۔ قصہ کہانیاں وغیرہ میں ہیرو اور ہیروئن دونوں موجود ہوتے ہیں، اور شاعروں کو نسائی حسن و ادا کے بیان میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات اس موضوع پر جزویات بھی بہت وضاحت سے بیان کی جاتی ہیں۔

اس کے بعد دتاسی غزل اور دیگر اصناف سخن کا مختصراً ذکر کرتا ہے۔ اور پھر ولی، اس کی زندگی کے حالات، اس کے کلام کی خصوصیات بیان کرتا ہے۔ اور اس کا دیگر اردو شعرا سے مقابلہ کرتا ہے۔ ولی کی آزادی فکر کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ اس کے کلام میں کسی بادشاہ یا نواب کی تعریف نہیں ملتی۔ اس ضمن میں وہ میر تقی میر، میر حسن اور سودا سے مختلف ہے۔ یہ تینوں شعرا ولی کے بعد سب سے زیادہ مشہور ہیں، لیکن انہوں نے مشرقی استعارات، تشبیہات اور کنائے نوابین اودھ و بنگال کی تعریف میں صرف کئے ہیں۔

گارسیں دتاسی نے دیوان کے متن کا تعین کرنے کے لئے چھ مخطوطات سے استفادہ کیا ہے۔ جن کا ذکر اس نے دیباچے کے صفحہ ۱۳ - اور اس کے بعد صفحات ۱۸ - ۱۹ پر کیا ہے۔ سنہ ۱۸۳۶ء کے ایڈیشن کے "اعلان" میں دتاسی نے ایک ساتویں مخطوطے کا ذکر کیا ہے۔ جو اسے سنہ ۳۶ء کے ایڈیشن شائع ہونے کے بعد حاصل ہوا۔

گارسیں دتاسی نے پورے دیوان کا ترجمہ فرانسیسی میں نہیں [illegible] دیباچے میں [illegible] غزلوں اور ایک مثنوی کے ایک حصے کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ کتاب کے دیباچے میں شامل ہے۔ دیوان کے بقیہ حصے کے بارے میں اشعار پر وضاحتی نوٹ لکھے ہیں۔ جن غزلوں کا ترجمہ دتاسی نے کیا ہے ان کے مطلعے حسب ذیل ہیں:

قبلۂ اہل صفا شمشیر ہے

یا دنیٔ مشکل کشا شمشیر ہے

ترجمے کا عنوان دتاسی نے "L'epee" دشمشیر) قائم کیا ہے۔

(۲) ؎ زرد رنگ ہے جو کیا ہے خنجر شمشیر طلا
مست ہو وحشی صفت زنجیر طلا

ترجمے کا عنوان "L'or" (طلا) ہے۔

(۳) ؎ ہمیشہ ہے بہار سرو آزاد
نجا ہوے دولت حسن خداداد

ترجمے کا عنوان "L'eternelle Beaute" (حسن ابدی) ہے۔

(۴) مثنوی کا پہلا شعر یہ ہے ؎

انہی دل او پردے عشق کا داغ
یقیں کے نین میں مست کحل مازاغ

ترجمہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

عجب شہراں میں ہے پُر نور یک شہر
بلا شک وہ ہے جگ میں مقصدِ دہر

ترجمے کا عنوان "Surate" (سورت) ہے۔

بیس صفحے کے دیباچے اور دو صفحے کے "اعلان" کے بعد ترجمے کا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس حصے میں چونسٹھ صفحے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے دتاسی نے سب غزلوں وغیرہ کے ترجمے نہیں کیے۔ اس حصے میں بعض پوری غزلوں کے ترجمے ہیں۔ بعض غزلوں کے چند اشعار کے ترجمے ہیں۔ اور ان کے علاوہ مشکل الفاظ، تشبیہات اور تلمیحات وغیرہ پر وضاحتی نوٹ ہیں۔ یہ نوٹ بہت اہم ہیں خصوصاً اس لیے کہ دتاسی نے دکنی زبان کے نامانوس الفاظ کے معانی بھی بیان کیے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے دیباچے میں لکھا ہے۔ دکنی زبان کے اکثر الفاظ کے معانی لغات میں نہیں ملتے۔ جن مقامات پر مختلف مخطوطات کا متن ایک دوسرے سے مختلف ہے ان کی صراحت بھی ان حاشیوں میں کر دی گئی ہے۔ یہ ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے جس کی طرف افسوس ہے کہ خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔
ترجمے کے بعد ایک صفحے پر دتاسی نے ان بحروں کی وضاحت کی ہے جو ولی نے استعمال کی ہیں۔ یہ بحریں تعداد میں تیرہ ہیں۔
اس کے بعد چھ صفحوں میں دتاسی نے دیوان کی ہر غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، فرد وغیرہ کی بحروں کا حوالہ دیا گیا ہے۔

ایک صفحے کے غلط نامے کے بعد اردو متن کا حصہ شروع ہوتا ہے جو ۱۴۲ صفحات پرمشتمل ہے، اور نہایت واضح ٹائپ میں چھپا ہوا ہے۔

**تاریخ شیرشاہ** عباس خاں شروانی نے شہنشاہ اکبر کے حکم سے سلطان شیرشاہ کی تاریخی سوانح حیات فارسی میں لکھی تھی جس کا اردو میں ترجمہ مظہر علی ولا نے سنہ ۱۸۰۵ء میں کیا۔ اس ترجمے کا ایک مخطوطہ پیرس کے میوزے گیمے میں موجود ہے[2] اس مخطوطے کے متن کا آزاد ترجمہ گارسیں دتاسی نے کیا ہے۔ جس کا عنوان *Un chapitre de l'histoire de l'Inde musul-mane ou chronique de Scher Scha.* ——— (مسلمانوں کی تاریخ کا ایک باب یا سرگذشت شیرشاہ) ہے۔

**حضرت مسلم کے دو بچوں کی شہادت پر عبداللہ مسکین کے مرثیے کا ترجمہ** حضرت مسلم بن عقیل حضرت امام حسین کے چچا زاد بھائی تھے۔ برتاں (Bertrand) نے حضرت امام حسین کی شہادت کے مرثیے کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے۔ گارسیں دتاسی نے حضرت مسلم کے بچوں کی شہادت کے مرثیے کا ترجمہ کیا ہے۔ اور مسکین کے مرثیے کے متن میں جو تلمیحات ہیں ان پر نوٹ لکھے ہیں۔ یہ ترجمہ پیرس سے سنہ ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا[3]

——— 'ارائش محفل (شیر علی افسوس) کے دو ابواب کا ترجمہ گارسیں دتاسی نے کیا ہے۔ پہلا باب مذہبی رسوم، لسانی مسائل، موسیقی، وغیرہ کے بارے میں ہے۔ دوسرا باب ہندوستان کے پھلوں کے بارے میں ہے۔ یہ ترجمہ ژورنال آزیاتیک پیرس کی جلد ۹۔ جولائی سنہ ۱۸۲۶ء میں شائع ہوا[4]

——— باغ وبہار (میرامن) گارسیں دتاسی نے اس کتاب کا ترجمہ کیا جو پیرس سے سنہ ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا۔ اور اس پر تبصرہ لکھا۔ جو ریویو دلوریاں *Revue de l'Orient* کی جلد ۱۵ میں سنہ ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا[5]

——— قصۂ گل بکاؤلی کا ملخص، ترجمہ گارسیں دتاسی نے ژورنال آزیاتیک ستمبر

---

[1] ملاحظہ ہو "داستان تاریخ اردو" حامد حسن قادری۔ صفحہ ۱۱۹

[2] ثریا حسین نے اپنی محولہ کتاب (صفحہ ۸۹) میں لکھا ہے کہ انہیں اصل فارسی۔ یا اردو ترجمہ پیرس میں نہیں ملا، غالباً یہ مخطوطہ موصوفہ کی نظر سے نہیں گذرا۔ جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ مخطوطہ ببلیوتک ناسیونال پیرس میں نہیں ہے۔ بلکہ میوزے گیمے پیرس میں ہے۔ اور عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ تمام اردو مخطوطات ببلیوتک ناسیونال ہی میں ہیں۔

[3] و [4] ثریا حسین۔ کتاب محولہ۔ صفحہ ۷۵

[5] 〃 〃 صفحہ

سنہ ۱۸۴۳ء کے شمارے میں شائع کیا۔

—————— قصہ کامروپ (تحسین الدین) کا ترجمہ برطانیہ کی اورینٹل ٹرانسلیشن کمیٹی کے زیر اہتمام پیرس سے سنہ ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا۔

ان کے علاوہ دتاسی کے مندرجۂ ذیل تراجم بھی اہم ہیں:

نہال چند —————— گل بکاؤلی
سید احمد خاں —————— آثار الصنادید
اکرام علی (مترجم) —————— تحفۂ اخوان الصفا
کریم خاں (مجبر) —————— سیاحت نامہ
مقبول احمد (مترجم) —————— قصہ ہیر رانجھا

ان کتابوں کے علاوہ گارسیں دتاسی نے بہت سے تراجم عربی، فارسی، ہندی اور ترکی زبانوں سے کئے ہیں۔ لیکن وہ اس مضمون کے موضوع سے خارج ہیں۔ اس لئے ان کا ذکر کرنا یہاں ضروری نہیں۔ گارسیں دتاسی نے پانچ تقریباً ڈیڑھ سو تصنیفات و تالیفات کے ذریعے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے اس کی مثال برصغیر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ افسوس کا مقام ہے کہ اس کی صرف محدودے چند تصانیف کا اردو میں ترجمہ ہوا ہے۔ اور ان میں سے بعض اہم تصانیف (مثلاً تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی) کا ترجمہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس کی بہت سی تصانیف سے اردو ادب کے اساتذہ ابھی تک بے خبر ہیں۔

## پیرس میں اردو زبان کی تعلیم کے موجودہ مسائل

گارسیں دتاسی نے سنہ ۱۸۷۸ء میں وفات پائی۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس کے بعد ہندوستانی (اردو) کی پروفیسری پر کسی دوسرے کا تقرر نہیں ہوا۔ یہ عہدہ اردو زبان و ادب کے لئے قائم ہوا تھا۔ لیکن گارسیں دتاسی کے بعد اس عہدے پر تامل (پروفیسر ونسن)، سنسکرت (پروفیسر فوشی) وغیرہ کے ماہرین کا تقرر ہوتا رہا۔ پھر فیلیوزا (تامل)، مارکووش (ہندی)، اور کچھ عرصے تک رحمت علی (اردو) پڑھاتے رہے لیکن پیرس کے مشرقی زبانوں کے مدرسے میں پروفیسری کی کرسی پر گارسیں دتاسی کے بعد کوئی مستقل نہ ہو سکا۔ اس کی جو وجہ پروفیسر میل نے بیان کی وہ یہ ہے۔

> گارسیں دتاسی کی وفات کے بعد شمالی ہند سے ہمارا تعلق منقطع ہو گیا۔ اور ہمیں وہاں سے تقریباً کوئی چیز نہیں ملی۔ خواہ اصل متن کی صورت میں ہو یا تاریخی مواد کی صورت میں۔ اس طرح ہم تقریباً ستر سال پیچھے

ایسی صورت میں اگر پیرس کے مستشرقین کو اردو زبان و ادب سے دلچسپی باقی نہیں رہی اور اس کی جگہ تامل، سنسکرت اور ہندی زبانوں نے لے لی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟[۱]

پیرس کے مشرقی زبانوں کے مدرسے میں مندرجہ ذیل زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے:

| | | | |
|---|---|---|---|
| عربی | عبرانی (اسرائیلی) | ترکی | فارسی |
| کُردی | آرمینی | اردو | ہندی |
| تامل | ویت نامی | کیموری | سیامی |
| لاوی (لاؤس کی زبان) | | ملایائی | انڈونیشی |
| ملاغاسی | چینی | جاپانی | سیامالی |
| بربری | فولانی | فانگ | بمبارا |
| | تاہیتی | ہوائی لو | |

ان سب زبانوں میں طلبہ کی سب سے زیادہ تعداد عربی اور چینی زبانوں کی جماعتوں میں ہے۔

گارسیں دتاسی کے بعد اردو زبان کے شعبے میں کوئی پروفیسر تو مقرر نہیں ہوا، لیکن لیکچرار اور معاون ("*repetiteur*") اردو زبان پڑھاتے ہیں۔ لیکچرار عموماً فرانسیسی اور معاون عام طور پر اہلِ زبان ہوتے ہیں۔ آج کل آندرے گمبریتیر (*Andre Guimbretiere*) ہیں۔ موصوف کچھ عرصہ پاکستان میں بھی رہ چکے ہیں، اور خود فرانسیسی زبان کے شاعر ہیں۔ معاون عبدالماجد صاحب ہیں۔ اردو زبان کی تعلیم کا کورس تین سال کا ہے۔ ہر سال طلبہ کا امتحان لیا جاتا ہے۔ کورس مکمل کرنے کے بعد طالب علموں کو ڈپلوما دیا جاتا ہے۔ پیرس میں قیام کے دوران میں نے گمبریتیر صاحب سے اردو زبان کی تدریس سے متعلق کچھ سوالات کیے تھے۔ ان کے جواب میں انہوں نے ایک نوٹ لکھا جس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

> پاکستان کے موجودہ معاشی، سیاسی، ثقافتی حالات کے بارے میں ان کی معلومات کا ذریعہ زیادہ تر دستاویزات ہیں جو انہیں حکومتِ پاکستان کے محکمۂ اطلاعات سے حاصل ہوتی ہیں۔ ادبی رسائل میں انہیں مندرجہ ذیل رسائل موصول ہوتے ہیں: نیا دور، سات رنگ[۲]، ہم قلم[۳]، سویرا، اور ان کے علاوہ "پاک جمہوریت"۔

---

۱؎ ملاحظہ ہو "*Les Langues de l'Inde*" صفحہ ۱۱۹۔ پروفیسر بلاک کی یہ کتاب جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے سنہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ گارسیں دتاسی نے سنہ ۱۸۷۸ء میں وفات پائی۔ اس طرح ستر سال تک ہم نے پیرس میں مشرقی علوم کے مدرسے کی طرف توجہ نہیں کی۔

۲؎ و ۳؎ یہ دونوں رسالے بند ہو چکے ہیں۔

مندرجہ بالا اداروں کے علاوہ وہاں کی معلومات کا ثانوی ماخذ وہ تراجم اور کتابیں ہیں جو یورپی یا امریکی اہلِ علم حضرات نے لکھی ہیں، مثلاً ڈبلیو۔سی۔ اسمتھ ( W.C. Smith ) کے۔ کالرڈ ( K. Callard ) ٹنکر ( Tinker ) وغیرہ۔

اردو زبان اور برصغیر ہندو پاکستان کی تاریخ اور ثقافت کے بارے میں ان کی معلومات کا ماخذ ایک تو وہ کتابیں ہیں جو پیرس میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ لندن کے برٹش میوزیم، انڈیا آفس لائبریری، اور اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز وغیرہ میں جو کتابیں موجود ہیں ان سے بھی گبریئر صاحب استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ انہیں سید احمد خاں، حالی، شاہ ولی اللہ، شبلی وغیرہ کی کتابیں نہیں ملتیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ پر ان کے پاس شیخ محمد اکرام کی تین کتابیں (آبِ کوثر، رودِ کوثر، موجِ کوثر) موجود ہیں۔

گبریئر صاحب کا خیال ہے کہ یورپ میں مشرقی زبانوں اور ثقافت کے مطالعے کو ترقی دینے کے لئے ضروری ہے کہ مفکرین اور اہلِ علم کی اصل تصنیفات مہیا کی جائیں۔ درسی کتابیں، گرامر، اور اردو اخبارات کا ملنا محال ہے۔ اردو لغات بھی نہیں ملتیں۔ دیگر معیاری کتابیں اور رسائل مہیا کرنے کے لئے مناسب انتظامات روبہ عمل لانے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ غیر ملکوں کے طالب علموں کو اردو سکھانے کے لئے کورس تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ پاکستان اور یورپ کے اساتذہ مل کر یہ کورس تیار کریں۔ اس کورس کی تیاری میں روایتی اور جدید لسانیاتی دونوں طریقہ ہائے تدریس کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ اردو زبان کی صوتیات، ترنم ( Rhythm ) اور لحن یا لہجہ ( Intonation ) پر باقاعدہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ [۱]

کتابوں کے علاوہ ریکارڈنگ سے بھی بہت مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ اردو میں بات چیت اور گانے وغیرہ ان کے قدرتی پس منظر میں ریکارڈ کئے جائیں تاکہ مغربی اہلِ علم اردو کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے سیکھیں اور سمجھیں — ہر زندہ زبان کی طرح اردو زبان بھی بدل رہی ہے۔ اس میں نئے الفاظ کا اضافہ ہو رہا ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ سائنس، صنعت و حرفت، سیاسیات وغیرہ کے جو نئے الفاظ اردو میں داخل ہوئے ہیں اُن کی ایک علیحدہ لغت تیار کی جائے۔

آخر میں گبریئر صاحب نے اپنے نوٹ میں تجویز کیا ہے کہ اردو لسانیات، ادب اور پاکستان کی تاریخ، جغرافیہ اور دیگر مسائل کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لٹریچر پیرس کے مشرقی زبانوں کے مدرسے کو بھیجا جائے۔

مشرقی زبانوں کے مدرسے کے کتب خانے میں اردو کی کتابوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ اس کے علاوہ پیرس کے

---

[۱] گبریئر صاحب نے لسانیات کے بہت اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرانسیسی زبان میں ترنم اور لحن یا لہجہ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اگر فرانسیسی زبان کا جملہ اس کے مخصوص لہجہ یا لحن سے نہ بولا جائے تو سننے والے کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہر جملے پڑھتے وقت آواز کے اُتار چڑھاؤ ضروری ہیں ... ترنم کا سانچہ ( Rhythm pattern ) بنتا ہے۔ جہاں تک ... میں اس موضوع پر ابھی تک کوئی کام نہیں کیا گیا۔

کتب خانے ببلیوتھک ناسیونال اور میوزے گیمے میں اردو کے مخطوطات ہیں جن پر میں نے نوٹ لکھے ہیں اور جو زیر طبع ہیں۔

اردو زبان کی خدمت کے سلسلے میں یہ امتیاز فرانس ہی کو حاصل ہے کہ اردو زبان کی سب سے پہلی لغت ایک فرانیسی مشنری فرانسیسین ماری دتور (Francisceion Marie de Tours) نے لکھی تھی[1] اور سب سے زیادہ مبسوط تذکرہ بھی ایک فرانیسی دگارسیں دتاسی نے لکھا۔ افسوس یہ ہے کہ موجودہ صدی میں ہم نے اردو زبان کو فرانیسی اہل علم سے روشناس کرانے کے لئے کوئی عملی کام نہیں کیا۔ اور نہ فرانیسی ادب میں ہی جو مشرقی اثرات ملتے ہیں ان کا مطالعہ کرنے کی طرف سرگرمی سے توجہ دی ہے جس کی شدید ضرورت ہے۔

---

[1] اس لغت کا تفصیلی تذکرہ پیرس میں اردو مخطوطات پر میری زیر طبع کتاب میں شامل ہے۔

---

# تقسیم کے بعد

(صفحہ ۳۴ سے آگے)

اور اپنے لہو کی حرارت دے کر اس کی زندگی کو بڑھایا ہے۔ میر و سودا نے جس زبان کی آبیاری کے لئے فارسی شاعری کا رس نچوڑا تھا آج اس کی بقا کے لئے ہمارے ادیبوں نے دنیا کی ہر تہذیب اور ہر زبان کے ادب سے اپنا رشتہ استوار کیا ہے۔ اور ہمارے درمیان جو شخص اپنا دامن سمیٹے بیٹھا ہے اور یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ اپنی ثقافت کا محافظ ہے وہی اپنی اور ہماری ثقافت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ثقافت مخصوص لباس پہننے اور خاص قسم کے برتنوں میں کھانا کھانے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس کا کام عالمی تہذیب کی مدد سے اپنے معاشرے میں فکر و خیال کی نئی راہیں کھولنا ہے اس اعتبار سے مدنی کی شاعری کے مقابلے میں آج حالی ہی نہیں اقبال، جوش، فراق، مجاز اور فیض بھی پرانے ہو گئے ہیں۔ اور قرۃ العین حیدر ہمارے عہد کی سب سے بڑی آواز بن گئی ہے۔ لیکن لکھنے والوں کا قدم کہیں رکتا نہیں، نئے ناموں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو پانچ دس سال کے اندر ہمارے معاشرے میں اعتبار حاصل کرے گا۔ اور آہستہ آہستہ ان پڑھنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگا جو جدید ادب کے قاری اور زندگی کے نئے شعور کی نشو و نما کے نمائندے ہیں ان کا اضافہ معاشرے میں منفی قوتوں کو کمزور کرتا جائے گا۔ اور زندگی کی قدریں پوری قوت سے افراد کی داخلی تنظیم پر اثر انداز ہو کر معاشرے کو بدل دیں گی۔ اور جب وقت یہ تبدیلی معاشی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی میں نمایاں اور واضح شکل اختیار کرلے گی تو آج کے ادیب ہمارے معاشرے کی روایت بن چکے ہوں گے۔

---

# جمیل ملک

لب پہ آئی ہے پھر اس زلفِ گرہ گیر کی بات
ملتی جلتی ہے اُسی شوخ سے کشمیر کی بات

وادیٔ گل سے چلے، تا درِ زنداں پہنچے
دوستو ایک ہوئی سنبل و زنجیر کی بات

جاں ہتھیلی پہ لئے پھرتے ہیں مرنے والے
کھو چکی اپنا بھرم، تیر کی، شمشیر کی بات

جو تڑپنے میں مزہ ہے وہ سسکنے میں کہاں
یاد کیا کیا ہمیں آئی دلِ نخچیر کی بات

کیا یہی کم ہے کہ جینے کا چلن مانگتے ہیں!
اس سے بڑھ کر تو نہ ہوگی کوئی تقصیر کی بات!!

مرغزاروں سے مچلتے ہوئے صحراؤں تک
سینہ در سینہ چلی جذبۂ توقیر کی بات

جیتنے والوں کو ہوئی مات جمیل آخرکار
پیشِ تقدیر بنی ناخنِ تدبیر کی بات

## محمد علی تاج

حسین چہرے پہ زلفِ سیاہ بکھرا کر
نگاہ بھر کے تجھے دیکھ لوں اندھیرا کر

لرز اُٹھا ہے میرے دل کی طرح آئینہ
وہ اس ادا سے اُٹھے آئینے سے شرما کر

اُسی کو ڈھونڈھ رہا ہوں ہر ایک ساغر میں
جو آنکھ چھوڑ گئی مے کدے میں ٹھہرا کر

گلہ کرو تو کرو اپنی لغزشِ پا کا
بُرا کہو نہ زمانے کو ٹھوکریں کھا کر

سوال تھا کہ تصوّر بھی جسم رکھتا ہے؟
جواب دے دیا اُس نے مری غزل گا کر

## شمیم حنفی

شفق کے دیئے بھی عجب چیز ہیں
اندھیرے سے ڈرتی ہیں ان کی لوئیں

بکھرتے چلے جا رہے تھے مگر
تری آرزو نے سمیٹا ہمیں

چھپے ہیں غمِ زیست کے گھونگھرو
نگارِ تبسّم کی پازیب میں

ستاروں کو نیند آگئی، سو رہے
اندھیروں سے کہہ دو کہ چپ ہو رہیں

خوشی کے جھونکے بپھرتے رہے
بکھرتی رہیں زلفِ شب کی لٹیں

بھڑکتی رہی موت کی نرتکی
اُلٹتی رہیں زندگی کی صفیں

وہ دیکھو سمندر ندی بن گیا
مچھیروں سے کہہ دو کہ یوں مت ہنسیں

سہانا ہے چاندنی رات ہے
چلو چل کے دریا پہ باتیں کریں

## عزیز میرٹھی

نوائے درد ہوں گل کے نہ رنگ و بو کے لئے
غزل سرا ہوں فقط تجھ سے گفتگو کے لئے

پڑا ہے دل پہ تری چشمِ نیم خواب کا عکس
کہ میرے جام نے بوسے ترے سبو کے لئے

کہاں پناہ، ہم ایسے گناہگاروں کو
جہاں بنا ہے فقط تجھ سے خوبرو کے لئے

جہاں جہاں ہیں غزل خواں اسیرِ زلفِ وفا
وہاں وہاں رسن و دار ہیں گلو کے لئے

ابھی نہ چھیڑ ہمیں اے ہوائے موسمِ گل
بہت سے چاک پڑے ہیں ابھی رفو کے لئے

برنگِ شعلہ ہر اک داغِ دل بھڑک اٹھے
کہاں سے لاؤں جگر ایک ایسی ہُو کے لئے

عزیز شوق سے کیجے نمازِ عشق ادا
لہو رواں ہے رگوں میں اگر وضو کے لئے

## خمار انصاری

عشق راحت کا سزاوار کہاں ہوتا ہے
دشت میں سایۂ دیوار کہاں ہوتا ہے

درد کی آنچ تکلم میں نہیں ڈھل سکتی
بات کہنے سے بھی اظہار کہاں ہوتا ہے

ہم نے معیارِ وفا پیش کیا ہے ورنہ
یوں کوئی دل کا خریدار کہاں ہوتا ہے

یہ جنوں میں جو ہے اک بات کسے ملتی ہے
یہ جو وحشت میں ہے پندار کہاں ہوتا ہے

کھائیے ان سے نہ ملنے کی قسم بھی لیکن
وہ بلائیں تو پھر انکار کہاں ہوتا ہے

یہ ہوس کار غمِ دوست کو کیا سمجھیں گے
کم عیاروں کے لئے پیار کہاں ہوتا ہے

تو نے باوصفِ جنوں میری پذیرائی کی
حسن اس درجہ وفادار کہاں ہوتا ہے

منزلِ صبحِ بہاراں پہ نظر ہو جس کی
وہ اندھیروں کا پرستار کہاں ہوتا ہے

سینۂ وقت میں محفوظ ہیں کتنے منصور
ختم ذکرِ رسن و دار کہاں ہوتا ہے

ہم نے ہر درد کو سینے سے لگایا ہے خمارؔ
آدمی اتنا خود آزار کہاں ہوتا ہے

## اطہر نادر

زخمِ دل گہرا نہیں، زخمِ جگر کاری نہیں
میری قسمت میں ابھی راتوں کی بیداری نہیں

نقدِ جاں ہم لے کے آئے ہیں مگر جائیں کہاں
کوچۂ قاتل میں بھی اب گرم بازاری نہیں

مرحلہ ہر ہر قدم پر اک نیا درپیش ہے
زندگی اپنی رہینِ سہل انگاری نہیں

جس کی خاطر ہم نے دنیا سے لڑائی مول لی
اپنی باتیں اب اسی اک شخص کو پیاری نہیں

ان سے ملنا تو بظاہر ہے بہت مشکل مگر
وہ اگر چاہیں تو نادرؔ کوئی دشواری نہیں

## سعید گیلانی

چھا گجن چھنک گئی ہے یہ کس کی ہواؤں میں
موسیقیاں بکھر گئیں سونی فضاؤں میں
چھیڑا ہے میگھ دوت یہ کس نے ہواؤں میں
آنکھیں برس پڑیں مری پلکوں کی چھاؤں میں
تو دیکھ لے تو ان سے شرارے برس پڑیں
وہ نقش تیرے غم نے بھرے ہیں وفاؤں میں
اب التفات موجِ صبا کو بھی رویئے!
انساں نے زہر گھول دیا ہے ہواؤں میں
اک وہ کہ جس کو دھوپ نے کندن بنا دیا
اک میں کہ راکھ ہو گیا زلفوں کی چھاؤں میں
کیا کم تھا اس زمین پہ مرنے کا تجربہ!
کس جستجو میں پہونچا ہے انساں خلاؤں میں
کھویا ہوں ایسا اپنا بھی ملتا نہیں نشاں
بیٹھا تھا دو گھڑی تری زلفوں کی چھاؤں میں
یہ شہرِ سامری ہے یہاں سے نکل چلو!
پتھر بنو گے مڑ کے جو دیکھا فضاؤں میں
کم خوابِ آرزو پہ کرم چشمِ پاسباں
بکھرا ہوا ہے ٹوٹ کے جادو فضاؤں میں
غیروں نے مجھ سے اپنے مقدر بنا لئے
میں خود سکون پا نہ سکا اپنی چھاؤں میں
دینے لگا ہے جسم کا ہر زخم تو سعید!
کھولا ہے شب نے بھیگی لٹوں کو ہواؤں میں

# کاوش بٹ

گو ایک زمانے سے نہیں خاک بھی گھر میں
خوش ہوں کہ ترے پیار کا سودا تو ہے سر میں

تھک ہار کے ہم اہلِ جنوں بیٹھ گئے ہیں
محسوس یہ ہوتا ہے کہ منزل ہے سفر میں

محفوظ رکھے ہیں تری یادوں کے خزانے
کچھ دل میں ہیں کچھ ذہن میں کچھ دیدۂ تر میں

تسلیم کہ کچھ دیر کو آرام ملا ہے
لیکن غمِ دوراں کے مناظر ہیں نظر میں

تحلیل نہ ہو جاؤں میں حالات کی رو میں
اس خوف سے دن رات چھپا رہتا ہوں گھر میں

اک ایسا بھی دور آئے گا جب لوگ کہیں گے
آؤ کہ گھڑی پل کو چلیں چاند نگر میں

اس درجہ ہر اک شے میں چمک آ گئی کاوش
کیا فرق نظر آتا نہیں شام و سحر میں

عفـرا بخاری

# پَچھتاوَا

اُس کے لئے مشکل یہ تھی کہ وہ اس راستے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار نہیں کر سکتی تھی - یہی ایک تنہا صاف اور ستھرا راستہ تھا، جو اُس کے گھر سے آفس اور آفس سے گھر تک جاتا تھا - اس طرح لامحالہ اسے دن میں دو مرتبہ اس راستے سے گذرنا پڑتا ـــــ جب بس میں، رکشا میں یا تانگے میں وہ ڈسپنسری کے پاس سے مڑتی ہوئی گلی کے قریب سے گذرتی تو فوراً اپنی نظریں پلٹا دیتی - لیکن ایسا کرنے کے باوجود اس مجرمانہ احساس سے چھٹکارا پانا ناممکن تھا کہ وہ دراصل گلی سے نہیں خود اپنے آپ سے نظریں چرا رہی ہے -

وہ قصداً کھڑکی کے قریب نہ بیٹھتی - لیکن دور بیٹھ کر بھی وہ وہاں سے گذرتے ہوئے شدید بے چینی محسوس کرتی - دیکھنے اور نہ دیکھنے کی متضاد خواہشات اس کے لئے شدید ذہنی اور اعصابی ٹکراؤ کا باعث بن جاتیں ـــــ کئی بار یہ کش مکش سنگین صورت اختیار کر جاتی ، اور وہ چہرہ گھما کر اپنی نظریں گلی پر ٹکا دیتی - اس وقت اسے محسوس ہوتا جیسے اس نقطے پر پہونچ کر کشش ثقل بڑھ گئی ہے ۔ اور وہ بے اختیار زمین کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہے - جب بس کھڑکھڑاتی ، رکشا فرّاٹے بھرتا ، یا تانگہ دلکی کے انداز میں چلتا آگے بڑھ جاتا تو وہ آرام اور سکون کا گہرا سانس لیتی -

اسے اس گلی اور اس مکان سے نفرت ہو چکی تھی ۔ حالانکہ وہ اس گلی اور اس مکان کی مٹی میں لوٹ پوٹ کر بڑی ہوئی تھی ، اور اس مٹی کی خوشبو اب بھی اس کے جسم سے اٹھتی تھی ـــــ لیکن اس نفرت کا صاف سیدھا جواب بھی اس کے پاس موجود تھا - اُس نے اس مکان میں اپنی بے حد پیاری ماں کو مرتے اور اس منحوس گلی سے اُس کے جنازے کو نکلتے دیکھا تھا ـــــ اس کی نفرت بجا تھی ، لیکن پھر یہ اس کے دل میں کبھی کبھی کیسا کھٹکا سا ہوتا تھا ۔ جیسے یہ سب کچھ محض ڈھونگ ہو - اور وہ اپنے آپ سے جھوٹ بول رہی ہو -

وہ مکان تو ایک حصار کی طرح اس کے گرد کھنچا تھا ، اور وہ اس میں سے باہر نہیں آسکتی تھی - ماں کی اچانک موت کے بعد بھی کافی عرصے وہ اسی مکان میں رہی تھی - اور وہ دن اسے ایک عذاب کی طرح اپنے وجود پر لدے محسوس ہوتے رہے تھے ۔ ان دنوں وہ بالکل تنہا تھی ، نہ اس کا کوئی مشغلہ تھا نہ ساتھی - ابا ہمیشہ کے تنہائی پسند تھے ۔ وہ اس کی دل جوئی کیا کرتے -

انہیں منحوس ایام میں اسے پہلے پہل فیروز لنگڑے کا خیال آیا تھا — اور پھر تو جیسے یہ خیال اس کے اعصاب پر چھا گیا تھا — اٹھتے بیٹھتے وہ اُس کے متعلق سوچنے لگی۔ اور دبے دبے محسوس کرنے لگی جیسے وہ کسی بات پر پچھتا رہی ہے — لیکن کس بات پر؟ — اُس نے کون سا جرم کیا ہے؟ — کئی بار وہ خشمگیں ہو کر خود کو ڈانٹ دیتی

جس دن اس کا بیاہ ہوا، اور وہ اپنے باپ سمیت نئے گھر اور نئے ماحول میں آگئی، تو اُس نے خدا کا شکر ادا کیا مُردہ تصوّرات سے اُسے نجات مل گئی تھی۔

ایک سال ہنسی خوشی میں گذر گیا۔

اُسے کبھی پچھلے گھر کا خیال نہیں آیا۔

پھر یوں اتفاق ہوا کہ اُس کا خاوند ملک سے باہر چلا گیا — اور اپنی تنہائی سے بچنے کے لئے اُس نے ملازمت اختیار کر لی —

اب مشکل یہ پڑی کہ آفس سے گھر اور گھر سے آفس کا راستہ صرف ایک تھا، اور وہ اس پُرانی گلی کے سامنے سے گذرتا تھا۔ یوں اسے دن میں دو بار وہاں سے گذرنا پڑتا۔ اور وہ نئے سرے سے اس گلی اور اس مکان کے خیال چکر میں گرفتار ہو گئی تھی —

دفتر میں سارا وقت وہ آنے والے لمحے کے خیال سے بے چین رہتی — اور جب گھر پہونچتی تو تب بھی اس کی طبیعت بے حد نڈھال اور مضمحل ہوتی۔ باورچن کے کئی مرتبہ بلانے پر وہ کھانے کی میز پر آتی — بہت دنوں کے غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہونچی کہ اس کی اس بے چینی کی وجہ تنہائی ہے۔

اُس کے پاس اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں ہیں۔ وہ ایک آئیڈیل شوہر کی بیوی ہے۔ زندگی نے اپنی ہر خوشی ہر مسرت ہر آرام سے اُسے مالا مال کر دیا ہے۔ شہرت، عزّت، دولت، اس کے پاس سب کچھ موجود ہے، کسی بات کی کمی نہیں۔ ایسے اچھے حالات میں قنوطیت پسند بننے کی کوئی تُک نہیں — اور اگر کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو وہ صرف تنہائی ہے — تنہائی ہی اسے ماضی کی طرف دیکھنے اور اس پر سوچنے پر مجبور کرتی ہے — وہ اصل میں چاہتی ہے کہ وہ دوبارہ اس مکان میں جا کر رہے۔ پچھلے دن لوٹ آئیں — اُس کے ساتھ ماں ہو — ابا ہوں — اور — آگے کی سوچ وہ منقطع کر دیتی — اگر وہ تنہا نہ ہوتی تو مردہ ماضی کو یوں منہ نہ لگاتی — تنہائی سے بچنے کے لئے وہ اپنے شوہر کو لمبے لمبے خط لکھتی اور اصرار کرتی کہ وہ اسے بھی اپنے پاس بُلا لے۔

آخر ایک مبارک صبح اُس کی زندگی میں طلوع ہوئی — اُس دن اُسے اپنے شوہر کا خط ملا جس میں یہ خوش خبری تحریر تھی کہ وہ عنقریب اُسے اپنے پاس بُلانے والا ہے۔ اُس دن وہ بے طرح خوش تھی۔ زندگی کی ہر بلندی اُس کے قدموں کی دھول بن چکی تھی، اور اب وہ ایک نئی پرواز کے لئے پَر تول رہی تھی — وہاں اپنے شوہر کے پاس وہ کتنی خوش، کتنی مگن اور مسرور رہے گی۔ زندگی کا کوئی دکھ اس کے پاس پھٹکنے کی جراٴت بھی نہ کر سکے گا۔

اس دن رکشا ایک زناٹے کے ساتھ گلی کے سامنے سے گذر گیا، اور اسے کچھ یاد ہی نہیں آیا۔ لیکن ذرا آگے جا کر اچانک اُسے خیال آیا، اُس نے گھوم کر دیکھا — اور اس کا دل کسی نامعلوم خوف سے دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

اُسی رات اَبا نے اُسے اپنے کمرے میں طلب کیا۔ اَبا کو جب کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوتا تو اس سے ضرور مشورہ کرتے۔ دراصل اُن کے قریب اور کوئی ایسی مخلص اور ہمدرد ہستی تھی بھی نہیں جو اُن کے فیصلوں پر ہمدردی سے غور کرتی۔ ایک صرف وہ تھی جو اَبا کے ہر فیصلے کو قبول کر لیتی۔ اور یُوں اَبا اپنے بڑھاپے میں بھی ایک قوت محسوس کرنے لگ جاتے تھے۔

اس دن جب وہ اَبا کے سامنے بیٹھ چکی تو اَبا خلافِ عادت دیر تک خاموش بیٹھے سگار پیتے رہے۔ جیسے وہ کسی دوٹوک فیصلے پر نہ پہونچ رہے ہوں۔ آخر انہوں نے سر اٹھایا اور دھیمے لہجے میں بولے:

"بیٹی —— میرا خیال ہے تمہارے جانے سے پہلے ہم وہ مکان بیچ دیں۔ اس طرح جو رقم حاصل ہوگی —— اُس سے میں کسی نئی آبادی میں اچھا سا مکان تمہارے نام بنوا دوں گا، اب وہ پرانا مکان بے کار ہی پڑا ہے ......"

اَبا کچھ دیر چُپ رہ کر پھر گویا ہوئے —— "فیروز کی طرف سے ایک ذرا سی آس تھی، لیکن اب سب کچھ ختم ہو چلا ہے"

"ہاں پیچ پیچ اگر فیروز آئے تو اُن کا نیا مکان وہ کہاں ڈھونڈ سکے گا ——"

لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔

اُس پر ایسا سناٹا طاری ہو گیا تھا جس نے اُس کے گلے کو خشک اور اس کی زبان کو گنگ کر دیا تھا۔ اُس نے سر جُھکائے صرف اتنا کہا۔

"جیسی آپ کی مرضی اَبا۔"

اور اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔

اُس رات وہ بالکل نہیں سو سکی۔ ساری رات وہ کروٹیں لیتے ہوئے سوچتی رہی —— اُس نے ہمیشہ اس مکان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، اب جب کہ مستقل طور پر اسے اس مکان سے نجات مل رہی تھی تو وہ کیوں اپنے آپ کو رنجیدہ محسوس کر رہی تھی —— ساری رات اس پر ایک عجیب سی رقت طاری رہی، اور وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں کو روک سکی ——

صبح وہ اٹھی تو اس کا سر بوجھل اور دل بے چین تھا —— آفس جاتے ہوئے جب وہ وہاں سے گذری، تو اُس نے پہلی بار اس گلی سے ایک جذباتی وابستگی محسوس کی۔ واپسی پر وہ بلا تأمل گلی کے قریب اسٹاپ پر اتر گئی۔ اُسے خود بھی اپنی اس جرأت پر تعجب تھا —— اُس کے بیگ میں چابیوں کا گچھا تھا —— وہ گلی کے جانے پہچانے راستے پر جچے تلے قدموں سے چلنے لگی —— اُسے ایک لمحے کو بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ عرصے بعد یہاں آئی ہے —— اسے گذرا ہوا وقت کل کی بات لگ رہا تھا —— گلی سنسان پڑی تھی، بغیر کسی تردد کے وہ مکان کے سامنے جا پہونچی، تالا کھولا اور مکان کے اندر داخل ہو گئی۔

اِس وقت اُس کے جذبات میں بڑی شدت تھی۔ اور اس شدت میں اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے یا کیا محسوس کر رہی ہے۔ سارا مکان دھول سے اَٹا پڑا تھا۔ اُس کی فضا میں کھنڈر پن تھا، اور وہ وہاں خود کو اجنبی اور غیر محسوس کر رہی تھی۔

وہ ڈری ڈری سارے گھر میں گھومی، دیوار دیوار کو چھوا، ٹھنڈی اور بے حس دیواریں نہ کچھ کہہ رہی تھیں نہ کچھ

سُن رہی تھیں۔ پھر بھی وہ بہت کچھ محسوس کر رہی تھی۔
وہ اپنے کمرے میں گئی ——اور پھر ڈر کر یوں باہر نکل آئی جیسے وہاں اُس نے اپنی دوسری صورت دیکھ لی ہو۔
اُس کا دل خوف سے کانپ رہا تھا۔ یہ کیسا خوف تھا جو ہولے ہولے اس پر طاری ہوتا جا رہا تھا
اُس نے ڈرتے ڈرتے کچن کا دروازہ کھولا —— سامنے پیڑھی پر اماں کا خیالی ہیولا نظر آیا —— وہ نظریں
گاڑے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں، اور اُن کی تیز نظریں اس کے دل کے آرپار ہو کر کسی بھید کو ٹٹول رہی تھیں۔ بدحواسی
میں اس نے کچن کا دروازہ بھی جلدی سے بند کر دیا۔
سارے گھر میں جیسے کچھ تلاش کرتی اب وہ صحن میں ایک طرف بنے پانی کے حوض کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی
حوض خالی تھا اور اس میں جمی سبز کائی اب سیاہ رنگت اختیار کر گئی تھی —— جوں ہی اُس نے جھک کر اندر دیکھا۔
حوض کی خالی تہہ میں اُسے لنگڑے فیروز کا چہرہ دکھائی دیا۔
بہت عرصہ پہلے اُس نے ایک بار فیروز کو اس حوض میں گرتے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ڈر کر اپنے کمرے میں بھاگ
گئی تھی —— فیروز کی خوش قسمتی سے ملک جمعدار اسی وقت وہاں آ نکلا اور اس نے فیروز کو بچا لیا تھا۔ لیکن اچانک گرنے
سے فیروز کے پاؤں میں کچھ ایسا نقص ہو گیا تھا کہ وہ لنگڑا کر چلنے لگا تھا۔ سب نے اُسے ایک حادثہ سمجھا تھا ——اور
وہ خود بھی سب کچھ بھول گئی تھی۔ اپنے ضمیر میں کوئی چبھن محسوس کئے بغیر فیروز کو اس نے بارہا "لنگڑا" کہہ کر پکارا تھا۔
لیکن آج اس نے اس پرانے ممبر ٹ کو پیچ سے علیحدہ کر دیا تھا —— اور پہلی بار اپنے آپ پر شرمندہ تھی۔
وہ حوض سے ہٹ آئی، مگر اب فیروز کا ڈھلے کپڑے جیسا بے خون چہرہ گھر کے کونے کونے سے اُبھرتا دکھائی
دے رہا تھا ——
اماں کے حکم پر فیروز لنگڑاتا ہوا دن میں کئی بار سیڑھیاں چڑھتا اور اُترتا۔
کپڑے کے میلے جزدان میں سیپارہ رکھے مسجد میں جاتا۔
دالان میں تینوں وقت بیٹھا بیچارگی سے کھانے کا انتظار کرتا۔ اماں کو بڑی دیر بعد اس پر رحم آتا۔ اُن کی گالیوں
کی بوچھار میں سر جھکا کر کانپے جاتا۔
وہ جب تعلیمی میدان میں سربلندی کے جھنڈے گاڑتی آگے بڑھ رہی تھی تو فیروز میٹرک میں فیل ہو گیا —— وہ تو
اُس کی شکست پر خوش تھی، لیکن اماں اپنے کسی بنے بنائے منصوبے کے یوں خاک میں مل جانے پر اس کے خون کی
پیاسی ہو گئی تھیں۔ دن میں سیکڑوں پھٹکاریں اُسے سننا پڑتیں۔ بعض اوقات دو دو وقت کا کھانا بھی اماں اسے دینا
بھول جاتیں۔
ابا گھر کی سیاست میں کبھی حصہ نہ لیتے تھے، لیکن فیروز کی وجہ سے اکثر اماں کے ساتھ تلخ کلامی ہو جاتی۔
فیروز سے اُس کی نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ وہ ہر جگہ ہر چیز پر اپنا تنہا حق سمجھتی تھی، حتیٰ کہ ابا کے کبھی کبھی ملنے
والے پیار پر بھی ——
لیکن ایک دن یہ سب کچھ ختم ہو گیا۔

اُس دن فیروز گھر لوٹ کر نہیں آیا ـــــ اگلے دن بھی نہیں، ـــــ اور اُس سے اگلے دن بھی نہیں ـــــ اور پھر کبھی نہیں ـــــ کسی نے اُسے نہیں ڈھونڈا، کسی نے اُسے یاد نہیں کیا، ـــــ اَبا اُس کے منتظر تھے مگر زبان سے انہوں نے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔

رات کو سوتے ہوئے اُس نے اپنی زندگی میں ایک ہلکا سا خلا ضرور محسوس کیا، اور اس خلا کو اماں کی موت نے گہرا کر دیا تھا۔

لیکن اُس نے ہمیشہ اس احساس سے نفرت کی تھی۔ فیروز سے اُسے کبھی دلچسپی نہ رہی تھی۔ نہ اُس نے اُس کے لئے کبھی اپنے دل میں کوئی لگاؤ محسوس کیا تھا۔ پھر اس وقت اُسے اس گھر میں فیروز کے ہر جگہ موجود ہونے کا اتنا گہرا احساس کیوں ہو رہا تھا۔ کیا یہ اس کی کسی نہفتہ مگر شدید خواہش کا عکس تھا ؟!

وہ سارے گھر میں گھومی تھی۔ سارے کمروں کو باری باری کھول کر دیکھا تھا۔ پہلے ہر کمرہ اپنی الگ پہچان رکھتا تھا۔ کوئی ڈرائنگ روم تھا، کوئی ڈائننگ روم۔ کوئی سونے کا کمرہ تھا تو کوئی اسٹور روم ـــــ لیکن اب ان میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا تھا۔ سب کی حالت ایک جیسی تھی۔ سب خالی اور ویران تھے اور ہر کمرے میں چمگادڑوں نے ڈیرے جما رکھے تھے، اور مکڑیوں نے جالے تن دیئے تھے۔

اُس نے سب کمروں کے دروازے احتیاط سے بند کر دیئے۔ اب آنے والے کل کو کوئی اور انہیں کھولے گا۔ یہ ویرانی اجنبی اور نئی آوازیں سنیں گی اور تب وہ بہت دور کہیں اور ہوگی۔

وہ پھر آنگن میں آ گئی تھی ـــــ اب اُس کے سامنے ایک ایسا کمرہ تھا جسے ابھی تک اُس نے نہیں کھولا تھا۔ یہ کمرہ سب کمروں سے چھوٹا، کم روشن اور کم ہوادار تھا۔ اس کی چھت نیچی تھی ـــــ یہ کمرہ فیروز کا تھا ـــــ اس کمرے کو کھولتے ہوئے وہ اَن جانا سا خوف محسوس کر رہی تھی۔ کمرے سے دور آنگن کی دیوار کے ساتھ لگے کھڑے اس نے کئی بار محسوس کیا جیسے کمرے کے اندر کوئی لنگڑاتا ہوا چل رہا ہے ـــــ وہ اپنے اس وہم پر ہنسی، اور اُس نے آگے بڑھ کر دُھول بھرے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا ـــ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے دھکا دے کر کھول دیتی، وہ ٹھٹک گئی۔

کمرے کے اندر سے کسی کے لمبے لمبے سانس لینے کی صاف اور واضح آواز آ رہی تھی۔ جیسے کوئی تنہا اندر پڑا بخار میں پُھنک رہا ہو۔ وہ گھبرا کر دروازے سے دور ہٹ گئی۔

'خدا جانے فیروز اب کہاں ہوگا، اور کس حال میں ہوگا'؟

اُس نے پہلی بار بالکل اچانک طور پر فکر مندی سے سوچا، اور اس کے دل میں کئی بیتے دکھ جاگ اُٹھے ـــــ وہ اپنے سینے میں درد کی ٹیس محسوس کر رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ کسی کو پا جانے کی زبردست کسک۔ لیکن کہیں بھی کچھ بھی نہیں تھا، اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ اس بند کمرے کو کبھی اور کسی بھی صورت میں نہیں کھول سکتی۔

وہ اب دوبارہ حوض بچے کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ حوض کی سوکھی دیوار پر ٹکے تھے۔ ایک دن اسی حوض بچے میں اس نے فیروز کو دھکا دے کر گرا دیا تھا۔

'پانی میں گر کر فیروز زندہ رہا تھا یا مر گیا تھا؟'

اس انوکھے سوال پر اُس کے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا ــــ بعد کے تمام واقعات ایک واہمہ میں بدل گئے تھے، وہ ایک زبردست الجھن میں پڑ گئی تھی۔ اس کے پاس اس وہم کو جھٹلانے کا کوئی جواز موجود نہ رہا تھا۔

لیکن پھر اچانک اُس نے سوچا۔ اگر وہ مر گیا تھا، تو اب اُس نے کمرے کے اندر کس کو سانس لیتے اور چلتے پھرتے محسوس کیا تھا؟

لیکن اس کا یہ استدلال بھی اُسے حیرت زدہ کر گیا ــــ وہ حیران تھی اور خوف زدہ بھی۔ اور سب سے بڑا ذہنی صدمہ تو اسے اس وقت پہونچا جب اُس نے محسوس کیا کہ وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہی ــــ اُسے اپنے سر پر منوں بوجھ محسوس ہو رہا تھا، اور اس بوجھ تلے اس کا ذہن پاش پاش ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اچانک تیز قدموں سے صحن عبور کرتی وہ باہر گلی میں نکل آئی۔ اُس نے ویران اور خالی گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا (اندر کوئی سانس لے رہا تھا) وہ جلدی جلدی ویران گلی کو عبور کرنے لگی۔

تب یوں تیزی سے چلتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں سے دو جلتے ہوئے آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک گئے ہیں!

حسن اجمل مسرت

# کمینٹ

دور سے نظر آنے والے کارخانوں کی چمنیوں کے پیچھے سے جب سورج کی پہلی شعاعیں نمودار ہوتیں اور گلی میں اُجالا پھیلتا تو سب سے پہلے میونسپلٹی کا جمعدار جھاڑو لئے گلی میں داخل ہوتا، اور جیسے ہی وہ جھاڑو دینا شروع کرتا نکڑ والے تنور کا بھٹیارہ پنڈلیاں کھجاتا ہوا بیدار ہوتا، اور جس وقت وہ تنور میں آگ سلگا رہا ہوتا تو اخبار والا لڑکا گلی میں ہانک لگاتا نمودار ہوتا۔۔

"آ گیا اخبار والا — بڑی بڑی خبروں والا"

اخبار والے لڑکے کا نام صمد تھا جس کی چودہ سالہ زندگی کے پورے پانچ سال اخبار فروشی کی نذر ہو چکے تھے۔ ہر صبح وہ مقررہ وقت پر محلے میں نمودار ہوتا اور دو رویہ مکانوں میں اخبار پھینکتا ہوا گلی کے آخری سرے تک جاتا۔ اس کی واپسی تک تنور گرم ہو چکا ہوتا اور اس کے حصے کی نہاری بگھاری جا چکی ہوتی۔ یہاں بیٹھ کر وہ چھوٹی چھوٹی ریزگاری کا حساب کرتا، جس کے بدلے میں وہ تنور والے سے روپیہ روپیہ کا نوٹ لیتا، اور پھر بگھری ہوئی نہاری اور دو تنوری روٹیاں کھا کر کسی سستے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتا اور کسی آسودہ حال شخص کی طرح ٹانگیں پھیلا کر آنکھیں موند لیتا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ وہ اونگھ جاتا، مگر جیسے ہی کارخانے کا گھگّو بولتا وہ مشینی انداز میں اٹھتا اور تیز تیز قدموں سے کارخانے کی راہ لیتا جہاں اسے مزید آٹھ گھنٹے مشقت کرنا پڑتی۔

یہ اس کا روز کا معمول تھا، اور اسے اپنی زندگی کی یکسانیت سے کوئی گلا نہیں تھا۔ ویسے عمر کے اعتبار سے وہ ابھی لڑکپن کی حدود میں تھا، مگر زندگی نے جس انداز میں اسے اپنایا تھا اس نے صمد کو وقت سے بہت پہلے سمجھدار بنا دیا تھا۔۔ ایک شام وہ محلے کے اور بچوں کے ساتھ گولیاں کھیل رہا تھا کہ اس کا چچا لپکتا ہوا آیا اور بے تحاشہ اس کے منہ پر تھپڑ برساتے ہوئے سر پر چپتیں برسانے لگا۔

"حرامزادے گھر پر باپ کی میت رکھی ہے اور تو گولیاں کھیل رہا ہے"

اس کا چچا اُسے ہمیشہ مارتا تھا اور باپ کی موت کے روز بھی مار رہا تھا۔ اُس روز وہ خوب جی بھر کے رویا، مگر یہ بات آج تک اس پر واضح نہ ہو سکی کہ اس کے آنسو باپ کی موت کی خبر سن کر نکلے تھے یا طمانچوں کی چوٹ کی وجہ سے۔ بہر حال اس روز کے بعد سے اسے گولیاں کھیلنا نصیب نہ ہوا۔ چچا نے اُسے اخبار بیچنے پر لگا دیا، اور محلے کے میونسپل ممبر نے کہہ سن کر اُسے

برابر والے کارخانے میں تیلیوں میں بھرتی کرا دیا۔ اب وہ صبح پانچ بجے سے لے کر سات بجے تک اخبار بیچتا، اور ساڑھے سات سے لے کر تین بجے تک کارخانے میں مزدوری کرتا تھا۔

باپ کی موت کے بعد چچا نے اپنا گھر بسا لیا تھا اور الگ ہو گیا تھا۔ اب صرف اس کی بیمار ماں تھی جو ہر وقت کھانسا کرتی، اور موقع بے موقع اسے گالیاں کوسنے دیا کرتی ——

یہ تھی اس کی زندگی —— اور اس زندگی سے اسے کسی قسم کا شکوہ نہیں تھا۔ اس کی زندگی کا ایک بندھا ٹکا معمول تھا جس کا وہ بالکل مشینی انداز میں عادی ہو چکا تھا۔

پھر ایک روز اس کی زندگی میں ایک بڑی خوب صورت سی تبدیلی آئی۔

گلی میں ایک نیلے رنگ کا مکان تھا جس کے دروازے، کھڑکیاں، پردے سبھی نیلے رنگ کے تھے۔ علی الصبح جب پوری گلی سوئی ہوئی ہوتی اور ہر گھر میں اندھیرا ہوتا اُس مکان کے نیلے پردوں کے پیچھے سے بلب کی روشنی چھنا کرتی اور یوں یہ مکان گلی کے دوسرے مکانوں سے بالکل الگ نظر آتا۔

اس روز جب وہ روز کی طرح گھر گھر اخبار ڈال رہا تھا تو اس کے کانوں میں ایک مترنم آواز آئی۔

"اے اخبار والے!"

اس نے دیکھا تو نیلے پردے کے پیچھے سے ایک سنہرا ہاتھ اسے اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔ وہ لپک کر کھڑکی کے قریب آیا، اور کمرے کی نیلگوں فضا میں اس نے ایک نازک نازک سی لڑکی کو دیکھا جس کے سامنے میز پر موٹی موٹی کتابیں بکھری ہوئی تھیں، جنہیں غالباً رات بھر پڑھتے رہنے کی وجہ سے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں گلابی ڈورے دوڑ رہے تھے۔

"اس گلی میں تم اخبار لاتے ہو؟" اس نے صمد سے پوچھا۔

"جی۔ بی بی جی۔"

"کل سے یہاں بھی اخبار دے جانا۔ سمجھے۔"

"بہت اچھا۔" اس نے کہا۔ "اخبار مہینہ پر لیں گی یا —— "

"مہینہ پر۔" اس نے کہا، اور پھر ایک موٹی سی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگی۔

"بہت اچھا۔" صمد نے جیب سے میلی سی نوٹ بک نکالی اور تھوک سے پنسل گیلی کر کے اس نے اپنے نئے خریدار کا نام معلوم کرنا چاہا —— پھر یہ سوچ کر کہ ٹوکنے پر وہ بُرا نہ مان جائے، اس نے ایک خالی صفحے پر ٹیڑھے ترچھے حروف میں نیلا مکان لکھ لیا۔

اس روز جب وہ اخبار فروشی سے فارغ ہو کر تنور پر نہاری کھانے آیا، تو اُس نے بیٹھنے کے لئے ایسی جگہ منتخب کی جہاں سے نیلے مکان کی ایک جھلک حسب ضرورت دیکھی جا سکتی تھی۔ اور نہاری کھاتے ہوئے کئی بار اس نے گردن اٹھا اٹھا کر نیلے مکان کی طرف دیکھا۔ پھر جب نہاری سے فارغ ہو کر اس نے حسب معمول ٹانگیں پھیلا کر آنکھیں موندیں تو وہ نازک نازک سی لڑکی اُس کے خیالوں میں تیر آئی اور وہ زیر لب مسکرانے لگا، اور پھر مسکراتے مسکراتے سو گیا۔ پھر کارخانے کے گھنگھرو کی آواز سُن کر اس کی آنکھ کھلی، اور جاتے جاتے اس نے ایک بار پھر گھوم کر نیلے مکان کی طرف دیکھا۔ جس کے نیلے نیلے پردے صبح کی ہوا سے پھڑپھڑا رہے

سکتے اور اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اُسے ہولے سے گدگدا دیا ہو۔

دوسرے روز اس نے اخباروں کے بنڈل میں سے سب سے صاف اور ستھرا چھپا ہوا اخبار الگ کر لیا، اور جب نیلے مکان کا نمبر آیا تو نہ جانے کیوں اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے پھڑپھڑاتے ہوئے نیلے پردوں کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔ نازک نازک سی وہ لڑکی ایک موٹی سی کتاب پر جھکی ہوئی تھی اور وہ چوروں کی طرح چپ چاپ کھڑا اسے تکتا رہا۔ پڑھتے پڑھتے اس لڑکی نے ایک جماہی لے کر گھڑی دیکھی اور کھڑے ہو کر انگڑائی لینے کو ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ اس کی نظر صمد پر پڑ گئی اور اس کی انگڑائی اس کے جسم میں کسمسا کر رہ گئی۔

"بی بی جی اخبار" اس نے جھک کر مڑا ہوا اخبار کھڑکی کے اندر سرکا دیا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

اس سے اگلے روز جب وہ اخبار لے کر پہونچا تو وہ لڑکی کھڑکی کے پردے سے لگی کھڑی تھی — شاید وہ پڑھتے پڑھتے اوبھ گئی تھی۔ اور صبح کی بھینی بھینی ہوا کے سہارے تازہ دم ہونا چاہتی تھی۔ صمد کو دیکھتے ہی اس نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر اخبار لے لیا۔ اور کھڑکی سے ہٹ گئی۔

آج وہ اسے جی بھر کے دیکھ بھی نہ پایا، اور اسے ایک عجیب سی تشنگی محسوس ہوئی۔ پھر اسے فوراً ہی ایک ترکیب سوجھ گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکایا—

"بی بی جی!

لڑکی جو اخبار پڑھنے لگی تھی چونک کر مڑی اور صمد نے اُس کی آنکھوں سے ناگواری کی واضح جھلکیاں دیکھیں۔

"کیا ہے؟"

"بی بی جی — آج کی خاص خبر بتا دیجئے"۔

"خاص خبر — وہ جان کر تم کیا کرو گے؟"

"آواز لگاؤں گا بی بی جی" — اُس نے معصومیت سے کہا۔

اس لڑکی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور اس نے اخبار کی پہلی سُرخی پڑھ دی — "امریکی طیاروں کی ویٹ نام پر اندھا دھند بمباری" — اور اس روز وہ لہک لہک کر گلی میں آوازیں لگاتا پھرا —"امریکہ نے چین پر حملہ کر دیا — تازہ خبر — امریکہ نے چین پر حملہ کر دیا" — لیکن اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ دنیا کو کوئی خوش خبری سُنا رہا ہو، جیسے وہ جھوم جھوم کر اعلان کر رہا ہو۔

"بی بی جی نے مجھے مسکرا کر دیکھ لیا — بی بی جی نے مجھے مسکرا کر دیکھ لیا —!"

پھر اس روز کے بعد سے اس کا معمول ہو گیا کہ وہ سب سے پہلے نیلے مکان میں اخبار دیتا۔ اس لڑکی سے دن کی خاص خبر معلوم کرتا، اور پھر گلی کے سناٹے میں اس کی آوازیں دیر تک گونجا کرتیں۔

"چین نے امریکہ پر حملہ کر دیا — امریکہ میں بھگدڑ مچ گئی"!

"محمد علی کلے نے دشمن کو پچھاڑ دیا — اسلام کی زبردست فتح"!

"کلکتہ میں گولی چل گئی — زبردست فساد"!

ہر صبح چند لمحوں کی بات چیت کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ اب لڑکی کے سامنے جاتے ہوئے اسے جو جھجک محسوس ہوتی تھی وہ ختم ہو گئی، اور وہ موقع نکال کر ایک آدھ اِدھر اُدھر کی بات بھی کرنے لگا۔ مثلاً —

"رات کیسی گرمی تھی بی بی جی۔"

"آج بسوں کی ہڑتال ہوگی۔"

وغیرہ وغیرہ۔

اور اگر اُسے ان میں سے کسی بات کا جواب مل جاتا تو اس لڑکی کے کہے ہوئے الفاظ تمام دن اس کے کانوں میں گھنٹیوں کی طرح بجتے رہتے اور کبھی کبھار جب وہ کسی بات پر مسکرا دیتی تو اسے ایسا لگتا جیسے کسی نے اس کی ریڑھ کی ہڈی پر نرم نرم سا پر پھیر دیا ہو۔

رفتہ رفتہ اُس کا حلیہ بھی تبدیل ہونا شروع ہوا۔ اُس نے اپنے کترے ہوئے بالوں کو بڑھانا شروع کیا۔ اور ان میں ہر صبح پابندی سے تیل لگا کر کنگھی کرنے لگا۔ پیسہ پیسہ جوڑ کر اُس نے ایک امریکی وضع کی بُش شرٹ اور تنگ مُہری کی پتلون خریدی جسے وہ ہر رات دھو کر استری کرتا اور ہر صبح پہن کر آتا۔

اس عرصے میں اُسے پہلے گھر والوں کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہو گئی تھیں — اس لڑکی کا باپ کسی کالج میں پروفیسر تھا، اور وہ لڑکی بی اے کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی — اور اُس نے اِدھر اُدھر سے پوچھ گچھ کر کے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ بی اے چودھویں جماعت کو کہتے ہیں۔ اب اکثر وہ یہ سوچا کرتا کہ جو لڑکی چودھویں جماعت میں پڑھ رہی ہو وہ کسی بھی طرح بیس اکیس برس سے کم نہیں ہو سکتی۔ اور یہ سوچ کر اسے نہ جانے کیوں ایک عجیب سی کمتری کا احساس ہوتا، چنانچہ ایک دن نہ معلوم کیا سوچ کر اُس نے اپنے رخساروں اور اُوپری ہونٹ پر اُگے ہوئے سنہرے سنہرے روئیں مونڈ لیے، اب وہ ہر اعتبار سے خود کو اس لڑکی کے برابر سمجھنے لگا تھا۔ اور نہاری کھانے کے بعد ٹانگیں پھیلا کر بیٹھنے میں اسے ایک نیا لطف آنے لگا۔

ایک روز جب وہ اخبار دینے آیا تو اُس نے نازک نازک سی اس لڑکی کو سوتا پایا۔ اس کے ساتھ میز پر ایک موٹی سی کتاب کھلی پڑی تھی، اور وہ ہتھیلیوں میں اپنا چہرہ ٹکائے سو رہی تھی — وہ کھڑکی سے لگا اس کے چہرے کو تکتا رہا۔ بالوں کی ایک سنہری لٹ اس کے رخسار پر جھول آئی تھی۔ اور سانس کی آمد و رفت سے یوں آگے پیچھے ہو رہی تھی جیسے اس کے رخسار سے کھیل رہی ہو — صمد دم سادھے اس کے حسین چہرے کو تکتا رہا — یہ پہلا اتفاق تھا کہ جب اس نے جی بھر کے اس لڑکی کو دیکھا تھا، اور وہ اس حسین اتفاق کو زیادہ سے زیادہ طول دینا چاہتا تھا۔ اُسے نیند کی ماتی یہ لڑکی پہلے سے کہیں زیادہ نازک کہیں زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ اور وہ نیلگوں کمرہ اسے اس کے نازک جسم کی حرارت اور سانس کی مہک سے بسا ہوا محسوس ہو رہا تھا — اور لمحہ بھر کو اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی مندر کے دروازے پر کھڑا ہے جس سے عود اور لوبان کی لپٹیں باہر آ رہی ہیں۔

اُس کے سونے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بے حد تھکی ہوئی تھی۔ اور نیند سے زیادہ تھکن اس پر غالب تھی۔ چنانچہ صمد کو اس پر ترس آنے لگا۔ اور اس لڑکی کے لئے اس نے اپنے دل میں ایک عجیب سی کسک محسوس کی۔ وہ کافی دیر تک یونہی کھڑا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے اخبار تہہ کیا اور کھڑکی کے اندر سرکا دیا۔ اس خفیف سی آہٹ سے لڑکی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے

چونک کر صمد کو دیکھا۔ اور اس کی بوجھل بوجھل گلابی آنکھیں دیکھتے ہی صمد کو یکایک پورا کمرہ گلابی گلابی نظر آنے لگا۔

"معاف کیجئے گا، بی بی جی ۔ آپ کی آنکھ کھل گئی" ۔ اس نے سنبھل کر کہا۔

"کوئی بات نہیں ۔ میں تو بس یونہی اونگھ گئی تھی" ۔ اس نے کہا، اور صمد کی نظریں بچا کر اپنے جسم کو اس طرح چرایا جیسے ایک بے ساختہ انگڑائی روک رہی ہو۔

"بی بی جی ۔ یہ آپ ساری ساری رات کیوں پڑھتی ہیں ؟" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"نہیں تو — میں تو منہ اندھیرے اٹھ کر پڑھنے بیٹھتی ہوں" — اس نے جواب دیا — "اور دیکھو اگر کبھی تم مجھے سوتا پاؤ تو اٹھا دینا"۔

"اچھا بی بی جی"۔

لیکن بارہا ایسا ہوا کہ وہ لڑکی اسے کتابوں پر سر رکھے ہوئے سوتی ملی — مگر اس نے جان بوجھ کر اسے سونے دیا۔ اور جس روز ایسا ہوتا وہ گلی میں آواز بھی نہ لگاتا کہ کہیں اس کی آنکھ نہ کھل جائے — اور ایسے دنوں میں جب وہ نہاری کھانے کے بعد ٹانگیں پھیلا کر آنکھیں بند کرتا تو اسے ہلکی ہلکی سنسنی خیزی کا لطف آتا۔

وہ سوچتا —

اب وہ سو کر اٹھی ہوگی۔

اب اس نے گھڑی دیکھی ہوگی۔

اب اس کی نظر اخبار پر پڑی ہوگی — اور اسے احساس ہوگیا ہوگا کہ وہ اسے جان بوجھ کر سوتا چھوڑ آیا ہے۔ اور شاید اس نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ وہ اس کا کتنا خیال کرتا ہے۔

اور یہ سوچ کر اسے ایک عجیب طرح کی طمانیت محسوس ہوتی — ایک ایسی خوشی کا احساس اس پر طاری ہو جاتا جیسے کوئی کسان بے شمار بوئے ہوئے بیجوں کی کوکھ سے پہلی کونپل پھوٹتے دیکھ کر محسوس کرتا ہے!

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ وہ لڑکی اسے نظر نہیں آئی۔

اس روز اس کمرے میں بتی بھی نہیں جل رہی تھی۔ اور نیلا مکان گلی کے اور مکانوں کی طرح سوتا ہوا نظر آ رہا تھا — اس نے خاموشی سے اخبار کھڑکی کے اندر ڈال دیا، اور تمام دن اسے طرح طرح کے خیال آتے رہے۔

دوسرے روز بھی ایسا ہی ہوا۔

تیسرے روز بھی۔

چوتھے روز بھی۔

اور پھر مستقل طور پر وہ کمرہ خالی نظر آنے لگا۔

وہ چپ چاپ اخبار کھڑکی کے اندر سرکا دیتا اور چلا آتا۔

اب اس نے گلی میں آواز لگانا بھی بند کر دی تھی۔ بس خاموشی سے اخبار تقسیم کرتا اور اپنی راہ لیتا۔ اب نہاری کھانے کے بعد اس نے ٹانگیں پھیلا کر آنکھیں موندنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ وہ آنکھیں پھاڑے خلاؤں میں تکا کرتا، اور رفتہ رفتہ جانے کیا کیا

سوچتا رہتا ___ کبھی اسے خیال آتا کہ کہیں وہ بیمار نہ پڑ گئی ہو ___ کبھی وہ سوچتا کہ شاید وہ دوسرے شہر چلی گئی ہو ___ لیکن اگر وہ کسی دوسرے شہر جانے والی ہوتی تو اس کو ضرور بتا دیتی۔ اب وہ اسے اتنا غیر بھی نہیں سمجھتی تھی۔ ضرور کوئی اچانک واقعہ رونما ہوا تھا، ورنہ اس کی غیر حاضری کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی ___ اس نے بارہا سوچا کہ وہ کسی صورت سے اصل بات معلوم کرے مگر اسے کوئی ذریعہ نظر نہ آتا۔ اسے تو اپنی بی بی جی کا نام تک معلوم نہ تھا۔ وہ کسی سے پوچھتا بھی تو کیا کہہ کر؟ اور اسی غم میں وہ اندر ہی اندر گھلتا جا رہا تھا۔

مہینہ کی پہلی اتوار کو جب حساب کا دن آیا تو اُس نے کئی بار یہ دعا مانگی کہ کسی طرح وہ لڑکی اسے بس ایک بار نظر آ جائے چنانچہ اُس نے عمداً ایسا وقت منتخب کیا جب پروفیسر گھر پر موجود نہ ہوں۔ لیکن پروفیسر اسے گھر پہ موجود ملے۔ اور اس کی نگاہیں ہر آہٹ پر اس لڑکی کی منتظر ہی رہیں۔

آخر اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ چلتے چلتے اُس نے دبی زبان سے پوچھ ہی لیا۔

"صاحب ___ بی بی جی تو اچھی ہیں؟"

پروفیسر نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں ___ ہاں ___ کیوں؟"

"یونہی پوچھ لیا صاحب ___ روز وہی اخبار لیتی تھیں نا!"

وہ منتظر ہی رہ گیا کہ پروفیسر کچھ اور بتائے گا، مگر پروفیسر نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا، اور وہ اپنی تشنگی کو دل میں چھپا کے واپس چلا آیا۔

اب پھر وہی ماحول تھا ___ سوتے ہوئے گھر ___ سنسان گلی ___ خاموشی۔

پھر ایک دن یہ خاموشی بڑی ادا سے ٹوٹی۔

وہ حسبِ معمول نیلے مکان میں اخبار پھینک کر مڑا ہی تھا کہ اُس کے کانوں میں جلترنگ بج اٹھی۔

"اے اخبار والے"

"بی بی جی!" اس کے ذہن میں بجلی سی کوند گئی۔

وہ تڑپ کر کھڑکی پہ آیا، اور اس نے دیکھا کہ نازک نازک سی وہ لڑکی پردے کے پیچھے کھڑی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ اب وہ پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی تھی، اور اس کی آنکھوں میں گلابی ڈوروں کی جگہ سفید سفید کنول کھلے ہوئے تھے۔

"بی بی جی" ___ اس کی زبان پر لاتعداد شکوے مچل کر رہ گئے ___ "بی بی جی، آپ کہاں چلی گئی تھیں؟"

"کہیں بھی نہیں ___ یہیں تھی"

اُس کے دل پر چھری سی چل گئی ___ یہیں تھیں اور مجھ سے چھپی رہیں۔ تم نے اتنا بھی نہ سوچا کہ تمہارے لئے میرے دل میں کیسے کیسے ڈراؤنے خیالات آتے رہے ہوں گے ___ مگر وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا:

"میں تو ڈر گیا تھا کہ شاید آپ بیمار ہو گئی ہیں"

"اچھا!" ___ اور صمد نے محسوس کیا کہ وہ ہولے سے مسکرائی تھی ___ "بات یہ تھی کہ میرا امتحان ختم ہو گیا تھا اور پڑھائی

بھی ختم ہو گئی تھی "۔

اور اب صمد کی سمجھ میں اس کی غیر حاضری کی وجہ آئی۔

پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ لڑکی اسے گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی، اور اس کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

اچانک وہ پوچھنے لگی "تم کیا بیمار تھے؟"

اور صمد کو پھر اپنی ریڑھ کی ہڈی پر ایک نرم نرم سا پُرمس ہوتا محسوس ہوا۔

"نہیں تو بی بی جی۔ بس یونہی ذرا طبیعت گر گئی تھی" اس نے کہا اور اپنی بی بی جی کی توجہ کو محسوس کر کے نہال ہو گیا۔

"اچھا دیکھو بات یہ ہے کہ کل میرا رزلٹ آنے والا ہے۔ مجھے جلدی سے جلدی اخبار پہونچا دینا"

"جی بہت اچھا" اُس نے کہا، اور پھر ہمت کر کے بولا "آپ پاس ہو گئیں تو مٹھائی کھلایئے گا نا؟"

"ضرور کھلائیں گے ـــ مگر دیکھو اخبار جتنی صبح لا سکو لانا"

"فکر نہ کیجئے بی بی جی۔ شہر بھر میں سب سے پہلے اخبار آپ ہی پڑھیں گی"

اور اس صبح ایک مدت کے بعد گلی میں اس کی آواز گونج رہی تھی ـــ

"امریکہ نے چاند پر راکٹ اُتار دیا۔ امریکہ کا زبردست اعلان"

اس روز اس نے نہاری کے ساتھ پھر دو روٹیاں کھائیں اور ٹانگیں پھیلا کر آنکھیں موند لیں۔

تمام دن اس کے تصور میں اس لڑکی کی کنول جیسی آنکھیں بسی رہیں اور اُسے یہ دُھن سوار رہی کہ کل اُسے سب سے پہلے نیلے گھر میں اخبار پہونچانا ہے ـــ تمام دن وہ یہ دعا کرتا رہا کہ خدا کرے وہ لڑکی پاس ہو جائے، اور خدا کرے وہ سب سے پہلے اخبار لے کر اس کے پاس پہونچے، اور وہ اس بات کا تصور کر کے مدہوش سا ہو جاتا کہ کل صبح وہ نازک نازک سی لڑکی اُس کی آس لگائے ہوگی ـــ اس کا انتظار کر رہی ہوگی ـــ اور جب وہ اخبار لے کر اس کے سامنے پہونچے گا تو شاید وہ خوشی سے چیخ اُٹھے گی۔

اُس روز وہ ایک جاننے والے کی سائیکل مانگ لایا، اور سائیکل والے کی دوکان سے اُس نے دونوں پہیوں میں خوب ٹائٹ ہوا بھروائی، بریکوں اور چین میں تیل ڈالا، اور سائیکل کو جھاڑ پونچھ کر صبح کے لئے تیار کر لیا ـــ رات دیر تک اسے نیند نہیں آئی ـــ جب بھی وہ آنکھیں بند کرتا اُس کے تصور میں دو جلتے ہوئے کنول کھل اُٹھتے ـــ رات میں کئی بار اٹھ کر اُس نے سائیکل کی ہوا کا جائزہ لیا ـــ بریکوں کو دبا کر دیکھا، چین کو گھمایا، اور صبح ہونے کا انتظار کرتا رہا۔

بمشکل چار بجے ہوں گے کہ وہ اٹھا اور سائیکل لے کر باہر نکل گیا۔

اس روز وہ اخبار کے دفتر جانے کے بجائے سیدھا پریس پہونچا۔ اور چھپتے ہوئے اخباروں کے صفحے نوچ کھسوٹ کر اُس نے اپنے حصے کے اخبار جمع کئے اور سائیکل پر رکھ کر ہوا ہو گیا۔

ابھی کچھ کچھ رات باقی تھی، اور اسے یقین تھا کہ وہ وعدہ سے بہت پہلے نیلے مکان پہونچ جائے گا۔ راستے میں اسے خیال آیا کہ وہ لڑکی شاید اب اس کے انتظار میں دروازے پر آ گئی ہوگی ـــ اُس نے سوچا وہ گلی میں داخل ہوتے ہی اپنی آمد کا اعلان کر دے گا، اور اس کے لئے اُس نے آج کی خبر اپنے جی سے بنا لی تھی:

"آگیا — بڑے بڑے رزلٹ کا اعلان آگیا"۔

سائیکل کی رفتار اس کی سوچ کی طرح تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح اڑ کر نیلے مکان پہونچ جائے۔ وہ اس لڑکی کی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا، اور اب اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا — آج اسے اپنا وجود بڑا اہم محسوس ہو رہا تھا — کوئی اس کا انتظار کر رہا تھا — کوئی ہر آہٹ پر اس کی آمد کا گمان کر رہا تھا — اس میٹھے میٹھے تصور کو لئے ہوئے اس نے تیزی سے بڑی سڑک کا موڑ کاٹا اور پھر جو کچھ ہوا تھا، اس میں صرف چند لمحے صرف ہوئے۔

دوسری طرف ایک تیز رفتار کار آئی —— ایک زبردست دھماکہ ہوا — اور صمد کے تصور میں جلتے ہوئے کنول پٹاخوں کی طرح چھوٹ کر راکھ ہو گئے —— اس کی بغل میں دبے ہوئے اخبار سڑک پر بکھر گئے۔ اور زخمی پرندوں کی طرح پھڑپھڑانے لگے —

کار ایک لحظہ کو رکی، پھر سڑک کو سنسان پا کر آناً فاناً ہوا ہو گئی۔

نمازی گھروں سے نکل چکے تھے۔ ایک اخبار اڑتا ہوا ان تک بھی پہونچ گیا۔ کسی نے اٹھا کر سرخیاں پڑھیں، اور پھر ساتھ والے سے بولا:

"ارے باپ رے۔ ہندوستان نے روپے کا بھاؤ گرا دیا — اب سونا مہنگا ہو جائے گا"۔

کسی کی نظر صمد اور اس کی سائیکل کے ملے جلے کچومر پر بھی پڑ گئی۔

"کوئی حادثہ ہو گیا شاید"۔

"اللہ رحم کرے۔ چلو نکل چلو بھائی۔ مفت میں کون گواہیاں دیتا پھرے"۔

اور نمازیوں نے اپنی راہ لی۔

اب صبح ہو رہی تھی۔

کارخانوں کی چمنیوں کے پیچھے سے سورج کی کرنیں نمودار ہو کر گلی میں پھیل گئی تھیں۔

میونسپلٹی کا جمعدار جھاڑو لگا گیا، مگر اخبار والا نہ آیا۔

بھٹیارے کا تنور گرم ہو گیا، مگر اخبار والا نہ آیا۔

نہاری کی دیگ خالی ہو گئی، مگر اخبار والا نہ آیا۔

نیلے مکان کے نیلگوں پردے ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ جن کے پیچھے وہ نازک نازک سی لڑکی اخبار والے کی منتظر کھڑی تھی۔ اور اس کی آنکھوں سے ناگواری صاف طور پر جھلک رہی تھی۔

پھر جب گلی میں دھوپ پھیل گئی تو وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی۔

"کمینہ!"

اس نے دانت پیس کر کہا، اور پیر پٹکتی ہوئی اندر چلی گئی۔

---

سعید احمد رفیق

# نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن

سنتے ہیں کہ اپنی اولاد اور دوسرے کی بیوی سب کو اچھی لگتی ہے۔ ضرور لگتی ہوگی۔ اولاد کے متعلق تو اپنا بھی تجربہ ہے کہ اچھی لگتی ہے۔ اور بہت اچھی لگتی ہے، جہاں تک بیوی کا سوال ہے، تو بیوی تو وہ جامعِ صفات ہستی ہے کہ اس کا خیال آیا اور دل پر وحشت بلکہ دہشت طاری ہونے لگی اور جب اپنی بیوی کا یہ حال ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اپنی بیوی کی وجہ سے اپنا یہ حال ہے تو پھر کس کی شامت آئی ہے کہ دوسرے کی بیوی کا خیال دل میں لاتا پھرے، ایک تو بیوی اور پھر دوسرے کی، کریلا اور نیم چڑھا، خدا ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ لیکن یہ خوبصورت بلا کچھ ایسی بلا ہے کہ ہو تو فرقت کی دعا کیجئے اور نہ ہو تو وصال کی تمنا۔ چین کسی حالت میں میسر نہیں۔ ایک حالت میں رسی کے ٹوٹنے یا دمِ واپسیں کی آرزو میں دم نکلتا ہے، اور دوسری صورت میں شوقِ شہادت کی وہ بے تابی کہ پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالنے کی خواہش ہر وقت بے چین کئے رکھتی ہے۔ اور نئے نئے گل کھلاتی ہے۔ گریبان اور دامن تو خیر اپنے ہیں، جو چاہے سو کیجئے، چاک کیجئے یا تار تار، آپ کی اپنی مرضی ہے۔ صحرانوردی اور اسیری میں بھی مضائقہ نہیں، اسیری چاہے کالی زلفوں کی ہو یا کال کوٹھری کی، اسیری تو اسیری ہے اور شہادت کا نعم البدل، لیکن جب یہ نالے ان تمام طریقوں سے بھی راہ نہیں پاتے تو ترچھے چلتے ہیں، اور اس وقت کی حالت نہ پوچھئے۔ ایک صاحب کی طبع رُکی اور رُکتے ہی ایسی رواں ہوئی کہ وہ حضرت شاعر بن بیٹھے۔ ایک اور صاحب تھے خاصے بھلے مانس، اب جو ملتے ہیں تو افسانہ نگار۔ ایک اور صاحب فاختہ اڑاتے تھے پھر بلبل پالنے لگے، نہ معلوم بلبل نے انھیں پالا یا انھوں نے بلبل کو۔ بہرحال اب نہ ان کے نالے چڑھتے تھے اور نہ ہی ان کی طبع رُکتی اور رواں ہوتی تھی، لیکن ان سے ملتے ہوئے ڈر ضرور لگتا تھا۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ انسان جس چیز سے ڈرتا ہے۔ وہ ضرور سامنے آتی ہے۔ ایک دفعہ یہ صاحب آموجود ہوئے۔ خاصے عرصے بعد ملاقات ہوئی تھی، مل کر بہت خوش ہوئے، مصنف ہم نہیں۔ اور پھر شروع کیں انھوں نے باتیں، ادھر ادھر کی باتیں، بیکار باتیں، مہمل باتیں، باتیں ہی باتیں ہم سب خاموش تھے اور ان کی زبان تھی کہ گنوار کا لٹھ، کاش یہ لٹھ ان کے سر پر بھی پڑ جاتا۔ لیکن اس وقت تو ہم صید تھے اور انھوں نے اپنے ترکش میں ایک تیر بھی خالی نہ چھوڑا تھا۔ ہم سب مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے، اور وہ تھے اور ان کا زورِ خطابت۔ الامان الحفیظ۔ ایک صاحب نے لقمہ دیا "مولانا۔ ضبطِ تولید کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" اس قدر گرجے، کڑکے، چمکے اور برسے کہ (بقول ان کے) "الپناہ" ـــ کفر و شرک کی باتیں، توبہ توبہ۔ خدا کی خدائی میں دخل۔ خدا رزاق ہے۔ آپ کو کس چیز کی فکر۔ جو پیدا ہوتا ہے، اپنا رزق آپ لاتا ہے۔ غرض اس قسم کے مدلل ثبوت پیش کئے جا رہے تھے۔ کہ ہم خاموش رہنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتے تھے اور خاموشی کے سوا ان کی باتوں کا اور جواب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ اولاد سے خاوند پر آئے اور پھر بیویوں پر۔ ایک نہیں چار چار بیویوں پر۔ قومی، ملکی، ملی، معاشی، معاشرتی ـــ حیاتیاتی نہ معلوم کس کس نقطۂ نگاہ سے چار بیویوں کو نہ صرف جائز بلکہ فرض ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ہماری جو شامت آئی تو استدعا

کی کہ "مولانا ذرا آہستہ، خدا کے لئے ہم پر رحم کیجئے۔ اگر ہماری بیگم صاحبہ نے یہ چار بیویوں والا فتویٰ سن لیا۔ اور پھر چار خاوندوں والا فتویٰ صادر کر دیا اور نہ صرف فتویٰ صادر کر دیا بلکہ ........ " بس صاحب پھر آپ تو جائیں کہاں۔" لاحول، استغفار، جورو کے غلام "زبان کیا تھی تیز گام تھی کہ چل کر رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی کہ گھنٹے نے چھ بجائے اور ہمیں ایسا معلوم ہوا کسی نے زنجیر پکڑ کر کھینچ دی ہو۔ رکے اور پھر فوراً کھڑے ہو گئے۔ "ذرا تمہاری بھابی کے لئے کچھ سامان خریدنا ہے، بیکار ناراض ہوں گی"۔ قہقہہ پڑا لیکن وہ صاحب یہ جا وہ جا۔ تو جناب جب اس قسم کے رستم زماں صاحب بھی اپنی بیوی سے ڈرتے ہوں تو ہم آپ بھلا کس گنتی شمار میں۔ بسمارک کو تمام دنیا فولادی انسان سمجھتی تھی۔ اور اپنی بیوی کی نگاہ میں وہ بے ضرر سا ایک چوزہ تھا۔ نپولین تو تھا ہی خیر جوزیفائن کا غلام کسی نے سچ کہا ہے، شاید آپ نے تو نہ سنا ہو کہ بادشاہ ملک پر حکومت کرتا ہے اور ملکہ بادشاہ پر۔ بادشاہوں کا زمانہ تو خیر گیا، اب تو صرف پانچ بادشاہ رہ گئے ہیں۔ ان میں سے چار باون صفحے والی کتاب میں مقید ہیں۔ اور ایک ہیں شاہِ انگلستان لیکن انگلستان میں بھی ملکہ صاحبہ خود بادشاہ بلکہ شہنشاہ بنی بیٹھیں اور تمام میاں صاحبان قسم کے لوگ منہ دیکھتے رہ گئے۔ چودھویں صدی ہے۔ جو کچھ نہ ہو کم ہے۔ غضب خدا کا۔ عورت حکومت کرے اور مرد تابعداری اور فرمانبرداری ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ بیوی ہو تو مشکل، نہ ہو تو مشکل، ہونے کی صورت میں اچھا خاصا انسان، مظلومیت اور بے کسی کی تصویر بن جاتا ہے اور نہ ہونے کی صورت میں حسرت و یاس کا مجسمہ۔ حسرت و یاس کے چلتے پھرتے مجسمے گفتگو تو خیر بعض مرتبہ کسی اور موضوع پر بھی کر لیتے ہیں، لیکن جہاں تک ان کے خیال کا تعلق ہے صرف ایک ہستی ہے جو ان کے ذہن پر سوار ہے، ہر لمحہ اور ہر وقت۔ اور جب یہ خیال حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے تو تمام ہوائی قلعے دھڑام دھڑام زمین پر آ رہتے ہیں۔ کہاں وہ سہانے سپنے اور کہاں ان کی اس قدر تلخ تعبیر۔ وہ سہانے سپنے تو عزیز ہوتے ہی ہیں لیکن ان کی یہ تلخ تعبیر بھی کم عزیز نہیں ہوتی۔ نہ معلوم تلخی میں وہ کونسی کشش ہے کہ انسان صرف اس چیز کا رسیا ہوتا ہے جو ترش ہو یا نہ ہو، تلخ ضرور ہو۔ چوری کا گڑ بھی تو تلخ ہی ہوتا ہے نا! آپ نے چکھا نہ سہی کھایا تو ضرور ہوگا۔

آپ سے ایک راز کی بات کہوں، بشرطیکہ آپ اس راز کو راز ہی رہنے دیں۔ اور دوسروں تک ضرور پہنچا دیں۔ ویسے آپ سے راز کی بات کہتے ہوئے ذرا کوفت ہی ہوتی ہے۔ بھلا وہ راز ہی کیا، جو سب کو نہ معلوم ہو جائے۔ بھلا اس سے کیا فائدہ کہ آپ سے ایک بات کہی جائے اور آپ اسے طشت از بام نہ کر دیں۔ خیر میں تو اپنا فرض پورا کر دوں، آگے آپ جانیں اور آپ کا کام۔ ہاں تو وہ بات یہ ہے کہ آپ کی طرح میں بھی اپنی بیوی سے ڈرتا ہوں اور بہت ڈرتا ہوں۔ فرمانبردار قسم کا خاوند جو ٹھہرا۔ لیکن بیگم صاحبہ اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم ان سے بالکل نہیں ڈرتے۔ وہ بیوقوف سہی لیکن اتنی بھی بیوقوف نہیں کہ اتنی سی بات نہ سمجھ سکیں۔ اسے خدا کی مہربانی کہئے۔ یا قدرت کی ستم ظریفی کہ وہ یہ بات نہیں سمجھ سکتیں یا سمجھنا نہیں چاہتیں۔ یا اگر سمجھ گئی ہیں تو پھر ہم پر ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتیں۔ یا پھر شاید کسی مناسب موقع کی منتظر ہوں۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو لیکن سمجھتی وہ یہی ہیں کہ ہم ان سے بالکل نہیں ڈرتے اور ہم بھی پورے وقار کے ساتھ اپنا یہ بھرم قائم رکھے ہوئے ہیں۔ کیا مجال جو ان پر یہ ظاہر ہونے دیں کہ ہم ان سے ڈرتے ہیں۔ گذشتہ ہفتے ہی کا ایک واقعہ لیجئے۔ چند دوستوں نے پکنک پر اٹک جانے کا پروگرام بنایا۔ جی ہمارا بھی چاہا کہ ہم بھی چلیں۔ لیکن بیگم صاحبہ کو ہماری صحت اور آرام کا اس قدر خیال ہے کہ اس قسم کی بد احتیاطی کے ارتکاب کی اجازت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خدانخواستہ ان کے اکلوتے شوہر کو کچھ ہو ہوا جائے تو! رشید سے مشورہ ہوا، اور صلاح ٹھہری کہ بیگم صاحبہ سے ذکر ہی کیوں کیا جائے کہ اجازت ملنے نہ ملنے کا سوال پیدا ہو۔ آخر والدین کی نافرمانبرداری بھی تو اکثر کی ہے۔ زندگی میں ایک مرتبہ بیوی سے چوری بھی سہی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ہمت دلائی اور آخر کار ہم بھی اٹک پہنچ گئے۔ ایک تو دوستوں کے ساتھ پکنک اور دوسرے کامیاب چوری کا نشہ سر پر سوار۔ بھاگ دوڑ، پانی، قہقہے، تاش، کبڈی۔ کہ رشید نے ایک طرف اشارہ کیا "یا اللہ، یہ کیا!" کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے کچھ خواتین اور بچے۔ اور ان میں طارق اور ثاقب دونوں۔ لیکن کیا مجال جو ہم پر کچھ بھی اثر ہوا ہو۔ ہم نہ ڈرے اور نہ خوف زدہ ہوئے۔ ہاں اتنا

ضرور ہوا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوا ۔ بہرحال پیروں تلے زمین نکلتی معلوم ہوئی ۔ سانس کی رفتار کچھ ناہموار سی ہوگئی ۔ جسم پر کچھ لرزہ سا تھا ۔ رشید کا چہرہ فق تھا ۔ میں نے جوان کی ہمت بندھانا چاہی تو آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی ۔ خیر اس قسم کے تجربے تو آپ کو بھی ہوئے ہونگے ، اس لئے کلام کو طول دینے سے کیا فائدہ ! بہرحال کسی نہ کسی طرح سر پر رومال ڈالی ، گردن نیچی کر ، خاموشی سے بس کی طرف ہو لئے ۔ نہ معلوم دوست کیا سمجھے کہ مزاج پرسی شروع کر دی بس میں بیٹھے ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ وہی دو بچے بس کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے ۔ ہم مسلمان سہی لیکن اب اتنے مومن بھی نہیں کہ " چوں مرگ آید ، تبسم برلب اوست " والا معاملہ ہو اور موت سے ہے ۔ ایک مرتبہ آئی اور قصہ ختم ۔ بیوی تو نہیں کہ ہر وقت سر پر سوار ۔ لیکن اب جو دیکھا تو وہ بچے ثاقب اور طارق نہ تھے ۔ کھسیانی سی ہنسی ، کچھ شرمندگی ، کچھ بوکھلاہٹ بس سے کون اترتا ۔ سر میں درد کا بہانہ کئے بیٹھے رہے ۔ واپسی میں غیر معمولی دیر ہوگئی ۔ جھوٹ سچ بول کر جان بچائی ۔ سچ بالکل نہیں ۔ صرف جھوٹ ہی جھوٹ ـــــ کہئے ۔ اب تو آپ کو یقین آگیا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے تھے ۔ وہ بالکل سچ ہے اور اگرچہ ہم بھی شریف آدمیوں کی طرح بیگم صاحبہ سے ڈرتے ہیں ۔ لیکن ظاہر بالکل نہیں ہونے دیتے ۔ دیکھئے اس طرح مسکرانے کی بالکل نہیں ٹھہری ! صاف صاف کہئے نا ! کہ میں غلط فہمی میں مبتلا ہوں ۔ اب میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ آپ خود غلط فہمی کا شکار ہیں ۔ خدا لگتی کہئے کیا آپ کی بیگم صاحبہ یہ سمجھتی ہیں کہ آپ ان سے ڈرتے ہیں ؟ دل کا حال تو خدا جانے ۔ دیکھئے ہماری بیگم صاحبہ بارہا ہم سے کہہ چکی ہیں اور اگر ہم ان کی بات پر یقین نہ کریں ۔ تو پھر کس کی بات کو صحیح سمجھیں ، کہ نہ ہوئی کوئی اور عورت ۔ میاں کو دن میں تارے نظر آجاتے ۔ دن تو دن ہمیں تو رات کو بھی تارے نظر نہیں آتے ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انہیں دیکھا اور آنکھوں تلے اندھیرا چھایا ، اور اس کی وجہ وہ آنکھوں پر چربی چھا جانا بتاتی ہیں ۔ وجہ کون دریافت کرتا پھرے ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ذرا ٹھہر جائیے میں ان سے پوچھ تو آؤں کہ ہم کیا جانتے ہیں ۔ شاید کچھ بھی نہ جانتے ہوں ۔ یا جانتے ہوں تو غلط جانتے ہوں ۔ اور آپ بھی ہماری وجہ سے مزید غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں بیکار کیا فائدہ ! اچھا تو ذرا انتظار فرمائیے ، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں ۔ بس ابھی ۔

سید جاوید اختر

# گرگی

تین عورتیں بدکرداری کے الزام میں گرفتار کر کے تھانے لائی گئی تھیں۔

ان میں سے ایک متناسب قد کی گوری چٹی اور تیکھے نقوش کی عورت تھی۔ اُس کی عمر اٹھائیس برس کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ دوسری عورت سانولے رنگ کی قدرے دُبلی اور دراز قد تھی۔ اس کا لباس خاصا چُست اور بھڑکیلا تھا، اور اس کی بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں تجربے کی گہری ڈوریاں نمایاں طور پر نظر آ رہی تھیں۔ اور تیسری ملزمہ کا اگرچہ نہ تو لباس بظاہر شاندار تھا اور نہ ہی اس کے نقوش تیکھے تھے، مگر اس کے نوجوان گندمی بدن میں کچھ ایسا تناسب موجود تھا جو نظر کی جاذبیت اور کشش کا باعث بنتا تھا۔ خاص کر اس کے باریک اور لپ اسٹک زدہ ہونٹوں میں ایک پُراسراری مقناطیسیت تھی۔ باتیں کرتے وقت اُس کے دونوں گالوں میں ننھے منے گڑھے سے پڑ جاتے تھے، جو دیکھنے والے کو بڑے بھلے معلوم ہوتے۔

اس سمے تینوں عورتوں کی نگاہیں اور گردنیں ندامت کے بوجھ سے نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ جس چارپائی پر انہیں بٹھایا گیا تھا، اس کے پائینتی پکی اینٹوں کے ٹوٹے پھوٹے فاختئی فرش پر دو جوان آدمی اکڑوں بیٹھے تھے۔ ان کی ظاہری وضع قطع زیادہ تعلیم یافتہ آدمیوں ایسی نہ تھی۔ ہتھکڑی کی مدد سے ایک کی بائیں کلائی، دوسرے کی دائیں کلائی سے باندھ دی گئی تھی۔

اس تھانے کے صحن میں اچھی خاصی رونق تھی۔ سہ پہر کی مضمحل دھوپ کو نکل کر صحن کے پون حصے میں نیم تاریک سایہ کرنے والی دیوار کے ساتھ تین چارپائیاں چوکور کے تین ضلعوں کی صورت میں بچھی ہوئی تھیں۔ چوتھے ضلع کا کام دیوار ادا کر رہی تھی۔ ان چارپائیوں میں سے ایک پر تو ملزم عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور باقی دو پر دو تین باوردی اور باقی کے قریباً آٹھ دس بے وردی سپاہی براجمان تھے۔

ایک دیانت دار کہانی نویس ہونے کی حیثیت میں آپ کو یہ بتاتے ہوئے قطعاً کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ عمر کا بیشتر حصہ شہروں اور قصبوں میں گزارنے کے باوجود میں نے پولیس اسٹیشنوں کو زیادہ قریب سے بہت کم دیکھا ہے۔ اور اُس روز بھی جب میں اپنے ایک معزز اخبار نویس دوست کے ہمراہ محض وقت گزارنے کے لئے تھانے گیا ہوا تھا، تو مجھے وہاں کا

ماحول دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ عجیب و غریب اور شاید ڈراؤنا سا محسوس ہو رہا تھا۔

کھاٹوں کی چوکور کے درمیان چار بازو دار کرسیاں اور ایک چھوٹی میز پڑی ہوئی تھی۔ ایک کرسی پر آن ڈیوٹی لے ایس آئی، دوسری پر میں اور تیسری پر میرا اخبار نویس ساتھی بیٹھا ہوا تھا۔ چوتھی کرسی خالی تھی، اور حاضرین میں سے کسی اور نے اُس پر بیٹھنے کی ہمت نہ کی تھی۔

ہمارے تھانے پہونچنے سے قبل انگریزی تلوار جیسی چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا صحت مند لے ایس آئی ان پانچوں ملزمان سے بیانات لے چکا تھا۔ اس نے ہمیں مختصراً یہ بتایا کہ :

" وہ دونوں نوجوان میکلوڈ روڈ پر فرنیچر کی ایک دوکان کرتے ہیں۔ جب وہ میٹنی شو دیکھ کر اپنی دوکان کی طرف جا رہے تھے تو وہ تینوں عورتیں چوک میں کھڑی تھیں۔ جب وہ ان کے پاس سے گذرنے لگے تو ان میں سے ایک نے وقت پوچھنے کے بہانے انہیں روک لیا، اور ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی — دونوں ملزمان نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان میں سے دو کے ساتھ گھنٹے بھر کا معاملہ طے کر لیا، اور تیسری عورت کو الگ چھوڑ کر دوکان کی طرف چل پڑے۔ ابھی وہ چوک عبور کر کے کچھ ہی دور گئے تھے کہ کانسٹیبل حنیف نے، جو ہفتۂ انسدادِ عصمت فروشی کے سلسلے میں اپنی پارٹی کے ہمراہ ایک تانگے میں اُدھر سے گذر رہا تھا، انہیں مشتبہ حالت میں پا کر روک لیا۔ پوچھ گچھ کرنے پر شبہ صحیح نکلا، اور ملزمان کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان دونوں عورتوں کے بتانے پر تیسری ملزمہ نسرین بھی جو ابھی تک شہی چوک ہی میں کھڑی کسی اور گاہک کی تلاش کر رہی تھی، پکڑی گئی۔"

میرے صحافی دوست نے اے ایس آئی کی زبانی یہ مختصر سی روداد سننے کے بعد اپنے اخبار کے لئے خبر تیار کرنے کی غرض سے بذاتِ خود ملزم خواتین سے رابطہ قائم کیا۔ اُس نے اپنی کرسی کھینچ کر اُن کی چارپائی کے قریب کر لی اور کاغذ قلم نکال کر اُس گوری چٹی ملزمہ سے مخاطب ہوا جس کا قد متناسب اور نقوش تیکھے تھے۔

"تمہارا کیا نام ہے؟" میرے ساتھی نے اس سے سوال کیا۔

"ندینہ" وہ دبی زبان میں بولی۔ اور اس نے اپنے کالے رنگ کے مہین سے نقاب کو ہونٹوں میں داب لیا۔ اُس کی آواز مجھے یوں محسوس ہوئی جیسے کسی گہرے کنوئیں میں کنکری لڑھکا دی گئی ہو۔

"کہاں رہتی ہو؟"

"لائل پور —"

"اور یہاں کیسے آ گئیں؟"

"اپنی مجبوریوں سے تنگ آ کر"

"ہونہہ! حرامزادی! صاف کیوں نہیں کہتی کہ پیشہ کروانے —" ایک باوردی سپاہی نے اپنی بٹلر ایسی مونچھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بھاری سی آواز میں کہا، "وہاں تجھے کوئی یار نہیں مل سکا تھا —"

اور اس جملے کی گولی سے جیسے ندینہ کا کلیجہ لہولہان ہو گیا۔ اُس کے پورے بدن میں کٹی ہوئی پتنگ کی سی لرزش پیدا ہوئی اور اس کے ہونٹوں سے نقاب کھسک گیا۔

"ہاں تو گویا تم شادی شدہ ہو؟" — اخبار نویس کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔

"جی — ایک بچہ بھی ہے سوا سال کا!"

"اور تمہارا شوہر کیا کرتا ہے؟"

"جناب — وہ دائمی مریض ہے۔ اُسے دوسرے درجے کی دق ہے۔ کسی ملازمت کے قابل بھی نہیں۔ بس گھر ہی پر پڑا رہتا ہے۔"

"کیا اسے تمہارے ان چکروں کا پتہ ہے؟" میرے دوست نے زرینہ کی موٹی موٹی آنکھوں میں اپنی بے باک نگاہوں کی کرنیں پھینکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں جی — اُسے سب خبر ہے۔ وہ بھی مجبور ہے اور میں بھی۔ میں نے گھر کا خرچ چلانے کے لئے لائل پور میں ایک دو جگہ نوکری بھی کی لیکن وہ زیادہ دن نہ چل سکی۔ اور زمانے کی گردش مجھے یہاں کھینچ لائی۔"

میرا دوست نہ جانے اس گوری چٹی اور تیکھے نقوش والی، ایک بچے کی ماں اور ایک دائم المریض شوہر کی اطاعت شعار بیوی سے اور کیا سوال کرتا کہ ایک سپاہی ایس ایچ او صاحب کا یہ پیغام لایا:

"صاحب نے زرینہ کو اندر بلوایا ہے۔"

"چل یار، اب اس ماں — کو اندر ہو آنے دے۔" آن ڈیوٹی اے ایس آئی نے بڑی بے تکلفی سے زرینہ کو گالی دیتے ہوئے، میرے ساتھی رپورٹر سے کہا: "آج ان سے باتیں کرنے کا تمہیں خوب موقع ملے گا — اور ہاں، تمہارا فوٹو گرافر نہیں آیا؟"

"ابھی فون کر کے دفتر سے بلوا لیتا ہوں۔" رپورٹر نے اے ایس آئی کو آنکھ مارتے ہوئے جواب دیا۔ اور باقی دو ملزم عورتوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

زرینہ اپنے جوان جسم کا پہاڑ، کانپتی ٹانگوں پر اُٹھائے ایس ایچ او کے کمرے میں چل گئی۔ جس کے ہرے رنگ کا دروازہ اور دو کھڑکیاں ہم سے دس پندرہ گز دور دھوپ روکنے والی دیوار میں کھلتی تھیں۔ جالی دار کھڑکیاں بند تھیں اور دروازے پر سُرخ رنگ کے دبیز پردے پھیلے ہوئے تھے۔

"کیا نام ہے تمہارا —؟" اخبار نویس نے سانولے رنگ کی لمبی اور اکہرے بدن والی ملزمہ سے پوچھا۔

اور اس سے پیشتر کہ وہ بادامی آنکھوں والی بھولی بھالی سی لڑکی میرے ساتھی کو اپنا نام بتاتی، میرے بائیں پہلو کی چارپائی پر بیٹھے ہوئے سیاہ ملیشئے کی قمیص اور شلوار والے ایک شخص نے اس لڑکی کے منہ کا نوالہ چھین لیا، اور رپورٹر سے کہنے لگا:

"ارے آپ اس کو نہیں جانتے — یہ گوالمنڈی کی مشہور ٹیکسی نسرین ہے۔ پہلے بھی دو بار منہ کالا کراتے ہوئے موقع پر پکڑی گئی ہے۔ اس کتے کی بچی نے جولا ہور میں گند مچا رکھا ہے اب اس کو اس کی سزا مل کر ہی رہے گی۔ پچھلی مرتبہ تو اس کا کوئی 'ماما' ضمانت کرانے آ گیا تھا۔"

"اچھا اچھا — حنیف صاحب: تو یہی وہ نسرین ہے۔" میرے دوست نے قلم سے اپنے سر کے بال سہلاتے

ہوئے اور اُوپر کے لب کو نچلے لب میں دباتے ہوئے ، اس ملیشیا پوش حضرت کو اس انداز میں جواب دیا جیسے اُسے کوئی بھولی ہوئی بات ایک دم یاد آگئی ہو۔

"تو تمہیں جسم فروشی کی لت پڑگئی ہے ۔ ہیک وقت روپے اور لذّت جو حاصل ہوجاتی ہے ۔ کمینی ! مار مار کر تیرا سارا جسم نہ چھلنی کردیا تو کہنا ۔ میں ایس ایچ او صاحب سے خود کہوں گا کہ تیری بوٹی بوٹی کردیں ، تاکہ معاشرے میں بکھری ہوئی تجھ جیسی آوارہ کتیوں کو درس عبرت ملے ، اور وہ اس گھناؤنے جرم سے توبہ کرلیں " اخبار نویس نے نسرین کو ڈانٹ پلادی ۔

"بس اس بار معاف کردیں بابو صاحب ! آئندہ سے غلطی نہیں ہوگی ۔۔۔ بھوکا رہ کر مرنا گوارا کرلوں گی لیکن ..... لیکن ..... دیکھئے ، میں کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوں ۔۔۔ " نسرین نے میرے ساتھی کی یوں منت سماجت شروع کردی جیسے اُسی کے ہاتھ میں ملزموں کو چھوڑ دینے کے سارے اختیارات تھے ۔ اور وہ کوئی اخباری نمائندہ نہیں بلکہ تھانے کا بڑا افسر تھا !

"چل بکواس نہ کر ۔۔۔ معافی کی بچی ! غلطی کرکے پوپلے منہ سے معافی مانگ لینا بڑا آسان کام ہے ساب تو ایک بار تجھے چھٹی کا دودھ یاد کروادیں گے "

میرا ساتھی واقعی کسی تھانیدار سے کم نہ تھا !

"نہیں ، بابو جی ! میں خدا اور رسول کی قسم کھاکر آپ سے وعدہ کرتی ہوں ۔۔۔ آئندہ سے ایسا نہیں کروں گی " وہ ایک بار پھر منمنائی ۔

"بھلا کرے گی کیسے نہیں ؟ کبھی کٹی ہوئی پتنگ اور بھٹکی ہوئی عورت بھی اپنی پہلی فضا میں واپس آئی ہے " رپورٹر نے اپنا فلسفہ بگھارا ۔

اتنے میں زرینہ ایس ایچ او کے حضور پیش ہونے کے بعد واپس چلی آئی ۔ اُس نے آکر اپنی پیلی رنگت سے ہمیں یہ بتایا کہ ۔۔۔

"صاحب نے نسرین اور حُسنہ کو بھی بلایا ہے "

گندمی رنگت کی نوجوان دوشیزہ جس کا نام حُسنہ تھا ، اور جو اس تمام وقفے میں سہمے ہوئے کبوتر کی طرح کھاٹ کے سرے پر چپ چاپ بیٹھی رہی تھی ، جیسے اس ہولناک خبر کے لئے پہلے ہی سے تیار تھی ، وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ اس نے اپنے سفید لیڈی ہملٹن کے بُرقعے کو ٹھیک کیا ۔ لپ اسٹک زدہ ہونٹوں پر زبان پھیری ، اور پھر وہ اور نسرین دونوں ایس ایچ او کے کمرے میں چلی گئیں ۔

"یار ! یہ حُسنہ تو کوئی شریف لڑکی معلوم ہوتی ہے ۔ یہ اس چکر میں کس طرح پھنس گئی ؟" میرے ساتھی نے کرسی اے ایس آئی کے نزدیک کرتے ہوئے اُس سے سوال کیا ۔

"ہاں ، شریف ہوگی ۔۔۔ اب تو نہیں رہی " اے ایس آئی نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا " کسی فلاں قسم کا سکول میں پڑھتی رہی ہے ۔ کہتی تھی میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دینا چاہتی ہوں ، اور ماں باپ غریب ہیں "

"اب اس سے آگے نہ پڑھا گیا":

حاضرین میں سے کسی شخص نے تمسخر آمیز لہجے میں پیش گوئی کی۔

اور پھر میرا صحافی دوست، اپنے فوٹوگرافر کو بلانے کے لئے ایس ایچ او کے کمرے میں فون کرنے چلا گیا۔

"انسپکٹر صاحب! ہمارے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟"

متفکر سے لگے ملزمان میں سے ایک نے میرے سامنے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تنکا تھا جس سے وہ کلرزدہ اینٹوں پر الٹے سیدھے نقوش بناتا رہا تھا۔ وہ اس نے نیچے پھینک دیا۔ اس کے چہرے پر جرأت وندامت کے ملے جلے جذبات نمایاں تھے۔

"تمہیں تو ایک بار بتا دیا ہے۔ اب اس میں تبدیلی نہیں ہوگی"۔ اے ایس آئی نے اپنے کندھوں پر سجے ہوئے چاندی جیسے پھولوں کو چھوتے ہوئے جواب دیا۔

"اجی سرکار! ہم اتنے دل والے ہوتے تو چوک ہی میں نہ چھوٹ جاتے۔ ذرا رعایت کر دیجئے۔ بال بچوں کو دعائیں دیں گے"۔۔۔ دوسرے مرد نے اپنے بائیں ہاتھ کو ماتھے تک لے جا کر اے ایس آئی کو سلام کرتے ہوئے منت سماجت کی۔

"اچھا چلو، آخری بات کر دیتا ہوں۔ تم بھی کیا یاد کرو گے ـــ یہ لو۔۔۔۔۔۔" اے ایس آئی نے اپنی شہادت کی انگلی کو قدرے ایستادہ کر کے جنبش دیتے ہوئے بڑے فیاضانہ انداز میں جواب دیا۔ "صرف ایک نوٹ!"

"اچھا جی، جیسے آپ راضی!" ـــ ان میں سے ایک مان گیا، بولا: "کر دیں گے کسی نہ کسی طرح۔ ڈیڑھ سو روپیہ ہی ہے نا! آپ سے خلاصی ہو، یہی کافی ہے۔ سمجھیں گے ایک ڈائننگ ٹیبل دیگ کے اڈے چڑھ گئی تھی۔ بُرے کاموں کے بُرے نتیجے!"

اور اُسی لمحہ میرا رپورٹر ساتھی اور نسرین دونوں اکٹھے باہر آ گئے۔

"یار، وہ دفتر میں موجود نہیں ہے"۔ میرے ساتھی نے قریب آ کر اے ایس آئی کو بتایا۔ "ویسے میں نے اطلاع دے دی ہے کہ جونہی وہ آفس آئے، اسے یہاں بھیج دیا جائے"۔

"چلو۔ آ جائے گا"۔۔۔ اے ایس آئی نے اپنی دُمدار تارے ایسی مونچھوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا۔۔۔ "تصویر نہ چھپی تو خبر تو ہے ہی نا!"

"ہاں ـــ ہاں، وہ تو لگ ہی جائے گی۔ لوکل ایڈیشن میں!" میرے دوست نے وثوق سے کہا۔

شام دھیرے دھیرے گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ہمیں تھانے میں آئے ہوئے کافی دیر گزر گئی۔ دیوار کا سایہ دیکھتے ہی دیکھتے تمام صحن عبور کر گیا۔

فوٹوگرافر ابھی تک نہیں آیا تھا۔

نسرین اور زرینہ آپس میں آہستہ آہستہ خدا جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔

اور پھر چند لمحوں بعد نسرین نے ایک دم اُٹھ کر اے ایس آئی کے پاؤں پکڑ لئے، اور گھگھیائی ہوئی آواز میں

لبلی ——

"جناب! مجھے بدنام ہونے سے بچالیں۔ میری عزت آپ ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔"

"چل، چل، اُلو کی پٹھی!" —— اے ایس آئی نے آنکھیں نکالتے ہوئے اُسے گالی دی۔ اُس کے پاؤں جہاں تھے، وہیں پڑے رہے۔

"حضور! معاف کردیں۔" زرینہ نے بھی روہانسی آواز میں درخواست پیش کی۔ "انسان خطا کا پتلا ہے۔ ہم وعدہ کرتی ہیں کہ آئندہ سے اس بُرے کام کے نزدیک بھی نہیں جائیں گی۔"

"نہیں نہیں —— میں کیسے معافی دے سکتا ہوں۔ جب تک ایس ایچ او صاحب آرڈر نہ دیں۔ آج رات تو حوالات ہی میں کاٹنا پڑے گی۔" اے ایس آئی ان کو کسی صورت چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔

اور اس بار نسرین نے میرے اخبار نویس ساتھی کے بھی پاؤں پکڑ لئے —— میں نے دیکھا، اُس کی سہمی ہوئی بادامی آنکھوں سے یک بارگی آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا، اور بہت سا کاجل اُس کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پر پھیلنے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی:

"صاحب! آپ ہی سفارش کردیں۔ خدا کے واسطے آپ ہی ہمیں بچالیں۔"

"لیکن تم یہ ذلیل کام کرتی کیوں ہو؟" میرے دوست نے اس سے پوچھا۔

"بابو جی۔ آپ کو کیا خبر، ہم لوگ کن مصیبتوں اور مجبوریوں میں گرفتار ہیں۔ اگر پیٹ کی یہ دوزخ انسان کے ساتھ نہ لگی ہو تو کس کا دل چاہتا ہے کہ وہ یوں ذلیل و خوار ہو۔"

اس لمحے مجھے یُوں محسوس ہوا، جیسے وہ سانولی سلونی نسرین ایک انتہائی مجبور اور —— بے گناہ عورت ہو —— اور اگرچہ اس کا لباس چست اور بھڑکیلا تھا، اور اُس کے آوارہ مزاج ہونے کی غمازی کرتا تھا، لیکن درحقیقت اُس کے اندر کی عورت محض ایک انسان تھی —— ایک انسان جسے موت سے بچنے کے لئے روٹی چاہیئے۔ گرمی سردی سے محفوظ رہنے کے لئے لباس درکار ہے۔ اور سر چھپانے کے لئے کوئی پناہ گاہ، اور احساسِ تنہائی سے بچنے کے لئے کوئی ساتھی چاہیئے یہ انسان کے فطری حقوق ہیں۔

"آج کا انسان کتنا مجبور اور بے بس ہے۔" میں نے سوچا۔ "وہی جسم جو قدرت نے انسان کی فلاح کے لئے پیدا کیا تھا، آج اُس کے لئے باعثِ آزار ہے۔ آج کے معاشرے نے انسان کو انسان نہیں رہنے دیا۔ اُس کے فطری حقوق بھی چھین لئے ہیں، اور اگر وہ ان میں سے کسی بھی حق کے حصول کی جستجو کرتا ہے تو اس پر سوسائٹی کی بغاوت کا الزام تھوپ دیا جاتا ہے۔"

اتنے میں حُسنہ بھی ایس ایچ او کے سامنے پیش ہونے کے بعد باہر صحن میں چلی آئی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ اُس کے بدن میں ہلکی ہلکی کپکپی ہو رہی تھی —— اُس کے گندمی رخسار سرخی مائل ہوگئے تھے، اور اُس کے ہونٹوں کی اصلی رنگت اُبھر آئی تھی۔

"حنیف! تم ان دونوں سؤروں کو یہاں سے لے جاؤ اور ان کا جو کرنا ہے کردو۔" اے ایس آئی نے اس ملیشیا

پوش کو دونوں ملزمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔

" اچھا جناب ! " ملیشیا پوش کانسٹیبل نے اپنے کالے پشاوری چپل پہنے، سگریٹ کو پاؤں تلے مسلا۔ اور ان دونوں مردوں کو اپنے ساتھ صحن کے باہر لے گیا۔ ایک سپاہی بھی اُن کے ساتھ ہو لیا۔

زرینہ اور حسنہ تو تھک ہار کر اور مایوس ہو کر چارپائی پر خاموش سی بیٹھ گئی تھیں۔ لیکن نسرین بے چاری ابھی تک ہمارے قدموں میں پڑی آنسوؤں سے منہ دھو رہی تھی۔ اس کی یہ صورت حال دیکھ کر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں ایک حساس انسان ہوں اور اکثر حساس لوگوں کی طرح حزن و ملال کی کیفیت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔

" کاش کسی طور میں ان بھٹکی ہوئی عورتوں کو سنبھلنے کے لئے ایک موقع دینے کا اہل ہوتا۔ کم از کم اس غریب نسرین کو تو کسی نہ کسی طرح اس مصیبت سے رہائی دلوا دیتا۔ رو رو کر اس کا کیسا بُرا حال ہو گیا ہے۔" میرے جی میں بے اختیار ایک خواہش پیدا ہوئی۔

اور پھر اسی لمحے میرے ذہن کے آسمان پر تدبیر کا ایک کوندا سا لپکا۔ میں یک بارگی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا، اور اپنے ساتھی کے بازو کو چھوتے ہوئے بولا:

" دوست، ذرا میری ایک بات سننا۔ بس ایک منٹ !!"

" کیا بات ہے ؟ " اس نے میری گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے پوچھا۔

" ادھر تو آؤ ذرا " میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

وہ اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور میں اسے صحن کے مشرقی گوشے تک لے گیا۔

" بھئی بات یہ ہے کہ اس بے چاری نسرین کو کسی طرح پولیس کے شکنجے سے بچا لو۔ بڑی دکھیا اور مجبور دکھائی دیتی ہے۔ تمہاری تو سفارش چل جائے گی " میں نے ایک ہی سانس میں اُس سے یہ ساری بات کہہ دی۔

" کسے چھڑا دوں — نسرین کو ؟ " وہ بولا۔ اور اس کی پیشانی پر شکنوں کا جال سا تن گیا۔

" ہاں، ہاں — نسرین کو — جس نے تمہارے قدموں پر اپنا ماتھا ٹیکا ہے۔ وہ سانولی اور دُبلی سی عورت۔ جس کی آنکھیں ساون بھادوں کی جھڑی کی مانند بہہ رہی ہیں — خدا جانے — !"

لیکن اس سے پیشتر کہ میں اپنی بات مکمل کرتا۔ میرے اخبار نویس ساتھی نے مجھے ٹوک دیا: " لاحول ولا قوۃ ! ارے تم اس کے غم میں جذباتی ہوئے جا رہے ہو۔ وہ تو اتو کی پٹھی گرگی ہے "

" کیا مطلب ؟ " میں بات کی تہہ تک نہ پہونچ سکا تھا۔

" مطلب یہ کہ وہ تو خود پولیس کی ایک اہم کارکن ہے۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ بُری عورتوں کی تلاش کرے اور انہیں حوالۂ پولیس کر دے۔ اُس نے تو پچاس روپے بھی کھرے کر لئے ہیں "

اچانک مجھے اپنے قدموں تلے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی، اور لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی گہری شام بڑی تیزی کے ساتھ میری آنکھوں میں پھیل گئی۔

---

نفیس رضا زیدی

# طوفان سے ساحل تک

"اے سُنا تم نے، اچھن کی دلہن نورجہاں نے دوسرا نکاح کر لیا؟"

"کیا سچ ممانی بیگم ——— ؟"

"بوڑھی پھونس ہونے کو آئیں تو یہ چونچلے سوجھے ——— اتنی بڑی عمر میں اب بیاہ کی سوجھی ——— آگ لگے کرنا تھا تو پہلے ہی کیا ہوتا ——— "

"جانے کس طرح شادی ہوئی ——— لڑکا کم عمر ——— اور پھر یہ کہ سیدھا سادا ——— "

"اے میں کہوں، یہ نکاح ہوا کیسے ——— اس اندھیر زمانے میں جب کہ لڑکوں کا کال ہے ——— اتنا اچھا لڑکا کہاں سے مل گیا ——— ؟"

اتنے میں بڑی اماں بھی آنگن میں آکر بیٹھ گئیں ——— انہوں نے کہا ——— "میں نے سنا ہے نورجہاں کو بہت سُکھ سے رکھا ہے ——— "

"میں تو خدا لگتی کہتی ہوں" ——— ممانی بیگم بولیں ——— "کچھ جادو ٹونا کیا ہے ورنہ یوں کوئی اُلو پھنسے ہے۔"

میں دیر سے کمرے میں بیٹھی سُن رہی تھی ——— اور آج کا کیا ذکر، جب سے نورجہاں آپا کی شادی ہوئی روز روز کی یہی باتیں ——— شام ہوئی ——— آنگن میں پانی چھڑکا گیا ——— پلنگیں ڈالی گئیں ——— ممانی بیگم ——— بڑی اماں، اچھن کی دلہن اور چچی بی آجاتیں ——— اور پھر بیاہ سے لے کر طلاق تک، ہر موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہوتی۔

میں نے کمرے سے نکلتے ہوئے زور سے کہا:

"نورجہاں آپا کے صبر کا پھل مل رہا ہے۔ ورنہ خدا جانتا ہے رضوی بھائی نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی ——— اور وہ بے چاری اللہ میاں کی گائے بنی ہر دکھ سہے گئیں ——— جب ساٹھ ساٹھ سال کے کھوسٹ چودہ پندرہ سال کی لڑکی سے شادی کرتے ہیں تو کوئی کچھ نہیں کہتا ——— اور اگر ذرا بڑی عمر کی عورت نے شادی کر لی تو جانو آفت آگئی ——— "

نورجہاں آپا کو تو دکھوں نے ایسا کر دیا، ورنہ اُن کی عمر اتنی کہاں ہے۔ اور شکل تو لاکھوں میں ایک ہے:

"اصل واقعہ تو یہ ہے" ——— میں نے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا ——— "عورتیں کبھی کسی کو خوش

نہیں دیکھ سکتیں ——— اب نورجہاں آپا خوش ہیں تو سارے خاندان پر جانو آفت آگئی ہے ——— ورنہ دس سال سے بے چاری نورجہاں آپا کی مظلومی کے گیت گائے جاتے تھے، اور جتنے کوسنے یاد تھے وہ سب رضوی بھائی کو دیئے جا چکے تھے۔

اور آج شادی کرنے پر اُن ہی نورجہاں آپا میں ہزاروں کیڑے پڑ گئے۔

بہت اچھا ہوا شادی کرلی ——— اور ابھی شادی کو پورا ہفتہ بھی تو نہ ہوا تھا کہ نورجہاں آپا کی والدہ کا انتقال ہوگیا ——— ورنہ کون ساری زندگی اُن کو سینے سے لگائے رکھتا"

میں اپنی دُھن میں کہتی رہی۔

بڑی ممانی زور سے بولیں ——— "اے تجھے کیوں بُرا لگ رہا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ ہمارے خاندان میں کبھی کسی عورت نے دوسرا نکاح نہیں کیا۔ یہ تو نورجہاں نے ناک کٹانے والی بات کی ہے"

"ہاں ——— ممانی بیگم ٹھیک ہے ——— بے چاری عورتوں کو کہاں مجال کہ دوسرا نکاح کریں۔ اس حق کے ذمہ دار، ٹھہرے مختار تو صرف مرد ہیں"

"اے تو پھر دس سال کس کا انتظار کیا ——— اگر ایسی ہی پڑی تھی تو پہلے ہی کرلیا ہوتا"

"واہ ——— ممانی بیگم، آپ نے بھی حد کردی"

میرا دل ان لوگوں کی بیوقوفی پر قہقہے لگانے کو چاہا۔

"رضوی بھائی بھلا ایسے کہاں کے سیدھے تھے۔ وہ تو گھسیٹ کر مارنا چاہتے تھے ——— طلاق ہی کب دی تھی ——— اور نہ کبھی نورجہاں آپا نے طلاق کا لفظ زبان سے نکالا ——— دو سال گذرے جب انہوں نے آٹھ سال بعد طلاق نامہ بھیجا ——— لیکن انہوں نے تو جرمنی جاتے ہی شادی کرلی تھی۔ اور وہاں سے اپنی بیوی کے ساتھ ہر پوز کی تصویریں، بیوی اور ساس کو، نہ جانے کون سے جنم کے بدلے نکالتے تھے"

میں نے بات رنجیدگی سے ختم کی۔

ممانی بیگم خاموش ہوگئیں۔

بڑی اماں بولیں ——— "ہاں دلہن ٹھیک ہی تو ہے ——— نکاح کرلیا تو کون سا غضب ہوگیا ——— اب ماں کے مرنے کے بعد کون ساری زندگی کو لپے سے لگائے رکھتا ——— وہ زمانے گئے، جب کئی کئی بیوائیں گھروں میں رہتی تھیں، اور ہر ایک اُن کی عزت کرتا تھا"

میں ان لوگوں کو راہِ راست پر آتے ہوئے دیکھ کر مسکرادی۔

بڑی ممانی بولیں ——— "اے واقعی نورجہاں نے بہت دکھ اُٹھائے، نہ جانے کیوں مجھے سفال میں رکھے بیگن یاد آنے لگے، چھوٹی عمر میں اماں باوا نے شادی کردی۔ چار سال میاں کے رہیں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جاتی تھیں ——— شکل تو واقعی اللہ نے فرصت میں بنائی تھی ——— ان دنوں رضوی بھی نورجہاں پر دیوانے تھے ——— لیکن پھر جانے کیا ہوا ——— شادی کے چار سال بعد جرمن چلے گئے ——— کچھ عرصے تو کوئی خیر خبر ہی نہ ملی ———

کافی عرصہ بعد صرف خیریت کا خط آیا ــــ نورجہاں مظلوم تو نیم دیوانی ہوگئی تھی۔ عجیب عجیب باتیں کرتی تھی ــــ ایک سال بعد رضوی نے جرمنی میں شادی کرلی اور وہاں سے اپنی اور اپنی دلہن کی تصویر بھیجی ــــ اُن دنوں ہم کو تو یقین ہوگیا تھا کہ نورجہاں بالکل پاگل ہوگئی ہے ــــ سر پیٹ پیٹ کر سوکن کو کوستی تھی، لیکن کبھی رضوی کے لئے کوئی بُرا جملہ منہ سے نہیں نکالا ــــ۔

میں غور سے ممانی بیگم کی باتیں سن رہی تھی۔

کبھی کوستی اور کبھی تصویر سے باتیں کرتی ــــ ہم لوگ چھپ چھپ کر سنتے تھے ــــ ہم کو بھی وہاں بلالو ــــ ہم تمہارے قدموں میں رہ لیں گے ــــ اتنے دور کیوں چلے گئے ــــ ہم لوگوں کو ہنسی بھی آتی، اور افسوس بھی کرتے ــــ

ایک سال بعد رضوی نے بچے کی تصویر بھیجی، تو نورجہاں کی حالت اور خراب ہوگئی ــــ ایک دن مجھ سے کہنے لگی ــــ ممانی بیگم، اللہ میاں سے دعا کرو، میرے بھی بچہ ہوجائے ــــ دعا کرونا ممانی بیگم میں بھی ماں بن جاؤں ــــ میں نے سمجھایا، تو ڈھیروں روئی ــــ ہائے میرے نصیب میں اولاد ہی نہیں ہے ــــ ہائے میری زندگی تو ایک سوکھا اور تنہا درخت بن کر رہ گئی ــــ جس پر کبھی بہار نہ آئی ــــ نہ کبھی پھول کھلا، اور نہ غنچہ چٹکا۔ اُن دنوں تو وہ بالکل پاگل اور دیوانی لگتی تھی ــــ کبھی محلے کے چھوٹے بچوں اور کبھی خاندان کے بچوں کو اتنا پیار کرتی جیسے کلیجے میں سمالے گی ــــ انہیں نہلاتی، دھلاتی ــــ رات رات بھر جاگ کر خدمت کرتی ــــ اور ــــ اور کبھی مہینوں پلٹ کر بھی نہ دیکھتی ــــ رضوی کو خاندان کے تمام افراد نے خط لکھے کہ یا تو نورجہاں کو بلالو ــــ یا طلاق دے دو ــــ خود نورجہاں نے سینکڑوں خط لکھے ــــ لیکن رضوی نے کبھی کسی خط کا جواب نہیں دیا ــــ سالوں بیت گئے، اور نورجہاں یوں ہی دیوانی دکھی رہی ۔

اچھن کی دلہن زور سے بولیں،

"اے میں تو کہوں، رضوی کے خاندان پر جانے کس ظالم کا سایہ ہے ــــ کبھی کوئی بیاہی خوش نہ رہی ــــ ان کے خاندان میں یوں ہی خاندانی شریف زادیوں کو جلا جلا کر مارتے ہیں ــــ اور غیر خاندان کی ــــ جانے کہاں کی کمبخت ــــ غیرت اکر مزے کرتی ہے ــــ ان کے تو خون میں ہی کچھ ہے ــــ بیاہیوں کو جلاتے ہیں"

[illegible] رضوی کے باپ کا حال تھا ــــ اب بڑی اماں نے ماضی کی داستان کو کریدنے کو حال سے جوڑا ــــ رضوی کے باپ نے اپنی بیوی کو بہت دکھ دیئے۔ سالوں بے چاری نے شرک اور بانک صورت نہ دیکھی ــــ [illegible] میں غیر خاندان کی سوکن لا ان کے سینے پر مونگ دلنے کو لے آئے ــــ بے چاری [illegible] ــــ سوکن کے ساتھ [illegible] زندہ رہیں ــــ اور اب یہ ہی حال [illegible] ــــ [illegible] ــــ رضوی [illegible] شریف زادی تھی کہ اسی طرح جلا جلا [illegible] ــــ اور [illegible] کے سامنے [illegible] مثال بن جاتے۔

"لیکن نورجہاں نے شادی کر لی" —— بات پھر نورجہاں آپا کی شادی پر آ گئی تھی۔

"میں کہوں ایسا کما ؤ پوت مل کیسے گیا —— چچی بی نے زبان کھولی —— "نورجہاں کی ماں کا شاید کوئی جاننے والا ہوگا ——"

"لیکن اس سے پہلے تو کچھ پتہ نہ تھا —— ممانی بیگم بولیں —— "مجھے تو لگتا ہے کہ نورجہاں کی خود مرضی تھی:"

میرا خون کھول رہا تھا —— لیکن میں خاموش رہی —— حالانکہ میں اس "مرضی" کا مطلب اچھی طرح جانتی تھی"

"اچھن کی دلہن، تم کو تو پتہ ہی ہے، رضوی نے دو تین دن ہوئے اپنی رشتے کی بھاوج کو خط لکھا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟" —— بڑی اماں بولیں۔

"اُن کی نوکرانی آج کل گئی ہوئی ہے تو اپنی قمرن دعا ایک کام اُن کے کر دے ہے —— اس نے بتایا کہ رضوی کو نورجہاں کی شادی کا پتہ چل گیا ہے:"

"اے سچ تو اُس نے کیا لکھا ——؟"

بڑی اماں، چچی بی، اچھن کی دلہن آگے کو کھسک آئیں۔

"اسے لکھنا کیا —— "ممانی بیگم نے اپنے خاص انداز میں گردن ہلائی۔

"پھر بھی ——" سب یک زبان ہو کر بولے۔

"اُس نے لکھا: مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ نورجہاں کے یہ کرتوت ہیں، جب ہی تو میں نے طلاق دی —— اور یہاں چلا ہوں ——"

"اے دلہن سچ؟!" —— بڑی اماں نے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے 'سچ' کو کھینچا —— "مرد تو اڑتی چڑیا کے پر گنتے ہیں —— اور رضوی ایسا پڑھا لکھا لڑکا —— کیا مت ماری گئی جو اتنی دور پڑا ہے —— کوئی بات ہی ہوگی ——"

"واہ رضوی بھائی واہ —— شاباش ہے آپ پر —— واقعی آپ نے خاندان کا نام روشن کر دیا —— اسی لئے طلاق دی آپ نے —— ورنہ آکڑ گیا —— اٹھارہ سال تک بھی طلاق نہ دیتے —— اور پھر وہاں پڑے ہو —— واقعی —— بے حد مظلوم ہو ——"

"آپ کو بھلا کیسے چین آ سکتا ہے —— میں نے سوچا —— "بھلا آپ کب گوارا کریں گے کہ نورجہاں آپا کی زندگی کا کچھ حصہ چین سے گذر جائے۔"

میں کمرے میں آ گئی —— آنگن سے باتیں کرنے کی آوازیں دھیرے دھیرے آ رہی تھیں —— دریچہ جب چکنے گھڑوں کے مطابق سوچ رہی ہوں، —— آوازیں بھا بھا آ رہی ہیں:

"اے وہ نورجہاں —— دوسرا نکاح —— رضوی —— اچھا لڑکا ——"

میں نے اپنے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ لئے ہیں ——!!

---

بمل ویدؔ
ترجمہ
عشرت صدیقی

# پہاڑ، درخت اور پیار

**ہندی کہانی**

آسمان کا سینہ گہرے سیاہ رنگ کے بادلوں کی ماتمی چادر ڈالے کل سے اس طرح پھٹ رہا ہے کہ بنگلے کے لان کے چاروں طرف پانی سمندر کی مانند اُمڈ آیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مالی نے پھولوں کی جتنی بھی کیاریاں لگائی ہیں وہ سب کی سب دب کر ختم ہو جائیں گی۔ مالی برآمدے میں بیٹھا بیڑی کے لمبے لمبے کش لے رہا ہے اور ہمارا الیسیشین کتا اُس کی چارپائی کے نیچے اطمینان سے سو رہا ہے۔ اور میں اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے دور تک پانی کے ہراتے ہوئے سمندر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہوں۔

دل کتنا پھیکا، کتنا اُداس نظر آ رہا ہے۔ مسز کیشپ کی نئی ساڑی کے رنگ کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ ایسے ہی پھیکے اور اُداس دنوں کی یاد آنے لگتی ہے۔ میں یہ آج تک نہ سمجھ سکی کہ مسز کیشپ کو آخر اُداس رنگ ہی کیوں پسند ہیں۔

"آپ ہمیشہ اسٹاڈل کلر کیوں چوز کرتی ہیں؟"

"مسٹری ہے اس میں!" مسز کیشپ خفیف تبسم کے ساتھ جواب دیتیں۔

"مسٹری! کیسی مسٹری؟" میں متحیر ہو کر پوچھتی۔

لیکن انہوں نے اس کا کبھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اُن کے چہرے پر مُردنی سی چھا جاتی تھی۔ اور وہ سدا گفتگو کا موضوع بدل کر کہتیں، "مسی! تمہارا مالی تو بہت ہی ہوشیار ہے۔ تمہارا لان دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ ایک ہمارا مالی ہے جس نے پورے لان کو جنگل بنا رکھا ہے ——— اسٹل، کام چور!"

ہماری گفتگو خواہ کہیں سے شروع ہوتی، اختتام ہمیشہ اسی پر ہوتا تھا۔

بارش اب تک ہو رہی ہے جیسے شوہر کی ٹورنگ ڈیوٹی ہے۔ اس لئے وہ اکثر باہر ہی رہتے ہیں۔ اور میں اتنے [illegible] آیا اور [illegible] کے سہارے بجلی بور ہوتی رہتی ہوں۔

"چائے میم صاحب:"

آیا بخوبی جانتی ہے کہ برسات کے دنوں میں مجھے چائے بہت عزیز ہے۔ آیا چائے انڈیلنے لگی۔ تو پیالے میں سے نکلتی ہوئی بھاپ میں اس کا چہرہ دھندلا دھندلا سا نظر آنے لگا۔

"مسز کیشپ کو لنچ کے لئے کہہ دیا تھا نا؟" میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

"جی صاحب"

شوہر کی غیر موجودگی میں مجھے تنہا کھانے میں کوئی لطف نہیں آتا۔ آیا کے جانے کے بعد میں پھر باہر دیکھنے لگی۔ برسات ہر سال آتی ہے۔ اور مجھے ہر سال اس کے ساتھ ہی رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن آنسو ہیں کہ نکلتے ہی نہیں۔ اندر ہی گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔

"تم اتنی سنٹی مینٹل کیوں ہو سمی! بچے کیا سبھی کو ہوتے ہیں؟ ان کے نہ ہونے سے کیا کوئی اپنی جان کو اس طرح ہلکان کرتا ہے پگلی!"

لیکن اُن کی بات دل کو تسکین کے بجائے کچوکے سی لگاتی تھی۔ ایک مسز کیشپ ہیں۔ جو اپنے چار سال کے بچے کے پیچھے دن رات ہاتھ دھو کر پڑی رہتی ہیں۔ اور ایک میں ہوں کہ دس سال سے ایک بچے کے لئے ترس رہی ہوں۔

بارش کے ساتھ اب ہوا کا زور بھی بڑھ گیا تھا۔ اب کی بار ہمارے باغ کا سارا حسن تباہ ہو جائے گا۔ مگر ہمارا مالی ہوشیار ہے، وہ پھر گم شدہ بہار کو واپس لے آئے گا۔ اور تب مسز کیشپ کہیں گی:

"تمہارا مالی کیا کوئی جادو جانتا ہے سمی؟"

مسز کیشپ کا لڑکا مجھے بے حد پیار کرتا ہے۔ لیکن میں اس کو دیکھتی ہوں تو ہمیشہ میرے ذہن میں پہاڑ پر لگے ہوئے اُس درخت کی پرچھائیاں سی اُبھر آتی ہیں جس کی شاخیں ہر سال ٹوٹ کر گر جاتی ہیں۔ لیکن کوئی انہیں اٹھانے کے لئے بھی نہیں جاتا۔ اور آخر ایک دن وہ درخت ہمیشہ کے لئے خشک ہو جاتا ہے۔

مسز کیشپ بھی اسی پہاڑ کی مانند ہیں اور اشوک اس ٹنڈ منڈ درخت کی طرح۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اگر وہ اس لڑکے کو کہیں کھو بھی دیں تو شاید انہیں کوئی غم نہ ہوگا۔ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ اشوک اُن کے اپنے خون کا جایا تو ہے۔ لیکن وہ مسٹر کیشپ کا لڑکا نہیں ہے۔ مسٹر کیشپ ان کے دوسرے شوہر ہیں۔ ان دونوں کی اپنی ایک بچی ہے چترا۔ وہ ابھی سال بھر کی بھی نہیں ہوگی۔ ماں باپ دونوں اس پر جان نچھاور کرتے ہیں۔ اور اشوک اپنے لنگڑے پاؤں کو اِدھر اُدھر گھسیٹتا پھرتا ہے۔ اس کو پولیو ہو گیا تھا۔ اور اسی میں اس کا ایک پاؤں ہمیشہ کے لئے بے کار ہو گیا۔

اب بارش کچھ ہلکی ہو گئی تھی۔ اور کھڑکی کے شیشے پر گرتے ہوئے پانی کے قطرے جلترنگ کی سی موسیقی پیدا کر رہے تھے۔

مسز کیشپ کے چہرے پر میک اپ کی تہیں بہت گہری ہوتی ہیں۔ اور میں ان دبیز تہوں کے پیچھے پوشیدہ اصلیت کو آج تک نہ جان سکی۔

"مسٹر کب تک آ رہے ہیں؟"

"کل پرسوں تک آجائیں گے"

مسز کیشپ صوفہ پر نیم دراز سی چھت کی طرف دیکھنے لگیں۔ اور میں اشوک کے تصور میں گم ہو گئی۔

میاں بیوی اس معصوم بچے کو اپنے ساتھ کہیں بھی لے جانے سے احتراز کرتے ہیں۔ مسٹر کیشپ تو اس سے کبھی بات بھی نہیں کرتے۔ وہ بیوی اور بچی کو اپنے ساتھ کار میں بٹھا کر اس رفتار سے کار کو موڑتے ہیں کہ مجھے اندیشہ ہوتا رہتا ہے کہ اشوک ابھی کار کی زد میں آ کر ہمیشہ کی نیند سو جائے گا۔ لیکن وہ لنگڑاتا ہوا اپنے آپ کو کار کی زد سے بچا لیتا تھا، اور دور جاتی ہوئی کار میں اپنی ماں کو دیکھ کر مُردہ آواز میں پکار اٹھتا تھا:

"ممی، ہم بھی، ہم بھی چلیں گے"

ایسے میں میں اشوک کو گود میں اٹھا کر سینے سے لگا لیا کرتی تھی۔ اور وہ سسکتے ہوئے کہنے لگتا تھا:

"آنٹی! ممی مجھے مارتی ہے"

میں نے کتنی بار سوچا کہ میں اسے مسز کیشپ سے مانگ لوں۔ وہ لوگ اُسے بوجھ سمجھتے ہیں۔ مگر وہ مجھے بے حد عزیز ہے۔ درخت کے خشک ہو جانے پر پہاڑ کو تو کوئی صدمہ نہیں ہوگا۔ لیکن ایک دن اس درخت کا نام ونشان تک مٹ جائیگا!

صوفے پر نیم دراز سی مسز کیشپ اپنے پاؤں کے انگوٹھے کو بار بار کارپیٹ پر رگڑ رہی ہیں۔ وہ جب بھی کچھ سوچتی ہیں تو اسی طرح کرتی ہیں۔

"یہاں ایک اَناتھ آشرم بھی ہے نا سمتی؟"

"ہاں ہے تو"

"اس کا مینیجر کون ہے، تمہیں کچھ معلوم ہے؟"

"نا بھئی، مجھے تو نہیں معلوم۔ لیکن تمہیں کیا کام ہے؟"

مسز کیشپ نے چند ساعت کی خاموشی کے بعد دُور خلا میں گھورتے ہوئے خوابناک انداز میں کہا:

"یہی — میں ذرا اشوک کو وہاں رکھنا چاہتی ہوں"

اسی وقت باہر زور سے بجلی چمکی۔ لیکن بجلی کی دلدوز گرج سے بھی زیادہ یہ کیسی خوفناک بات ایک ماں نے اپنے بیٹے کے بارے میں کہی تھی! میں ششدر سی ایک ٹک اُن کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

اچانک مسز کیشپ جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئیں:

"میں اب چلوں سمتی!"

پھر وہ دروازے کے پاس سے مڑ کر بولیں:

"ہو سکے تو پتہ چلانا، یہ کام جلدی ہو جائے تو اچھا ہے۔ مجھے مصیبت سے نجات مل جائے گی"

مسز کیشپ کے جانے کے بعد بھی میں نہ جانے کب تک بُت کی مانند بے حس وحرکت کھڑی رہی۔ اسکا وقت آیا نے آکر سوجانے کے لئے کہا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اب مجھے نیند نہیں آئے گی۔ وہ بدبخت اشوک ساری رات ذہن پر سوار رہے گا ماں باپ کی موجودگی میں وہ یتیموں کے ساتھ پرورش پائے گا۔ حالانکہ ہوگا۔

یہ قسمت کی کیسی ستم ظریفی ہے۔ جس اپاہج کو پیار اور ہمدردی کی ضرورت تھی، اسے مسز کیشپ کتنی بے دردی کے ساتھ اپنے آپ سے دور کر دینا چاہتی ہیں۔

او ویران بے رحم پہاڑ!
یہ بے درد، سنگدل ماں!

میں ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔ لیکن میں ایک لمحے کے لئے بھی نہ سو سکی۔

بارش ابھی بند تھی۔ پانی میں نہائے ہوئے پھول بہت ہی دلفریب نظر آ رہے تھے۔ میں چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے کوئی گیت گنگنا رہی چاہتی تھی کہ آیا نے آکر کہا:

"مسز کیشپ کا فون ہے میم صاب"

"آتی ہوں"

میں نے ریسیور اٹھایا تو اُدھر سے آواز آئی:

"ہلو، گڈ مارننگ ستی! دیکھو بھئی، میں نے دارجلنگ میں ایک اناتھ آشرم کا پتہ لگا لیا ہے۔ میں اشوک کو چھوڑنے کے لئے جا رہی ہوں۔ ابھی گیارہ بجے کی میل سے جاؤں گی۔ تم اسٹیشن آ جانا.........."

ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میرے ہونٹوں کے گیت مر گئے۔ دھلی دھلائی صبح کا رنگ بے حد پھیکا اور اداس اداس سا نظر آنے لگا۔

اُف، آخر پتھر پر اُگا ہوا درخت خشک ہو ہی گیا!

اسٹیشن کی چہل پہل میں مسز کیشپ کو ڈھونڈھ نکالنے پر مجھے خوشی نہیں ہوئی۔

"ہلو ستی!"

"ہلو" میں نے بڑی بے دلی سے کہا۔

اُس وقت اشوک کے چہرے پر گلاب کے پھول کی سی دلکش مسکراہٹ کھیل رہی تھی:

"نمستے آنٹی! ہم چھک چھک میں جا رہے ہیں۔"

میری آنکھیں بھر آئیں، اور آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

مسز کیشپ کا چہرہ آج میک اپ سے بے نیاز تھا۔ میں چونک اٹھی۔ اُن کے چہرے پر مصیبت سے نجات پانے کی خوشی کی جھلک کے بجائے شکست خوردگی کے آثار نمایاں تھے۔ جی چاہا کہ اُن سے پوچھوں:

"کہئے، اب تو آپ خوش ہیں؟"

لیکن میری آواز نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

"آنٹی! ممی کہتی ہیں میں اب وہیں رہوں گا۔ پر میں کل آپ کے پاس آ جاؤں گا۔ ہے نا آنٹی!"

میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی۔ بے تحاشا اشوک کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی۔ اور میں نے گلوگیر آواز میں کہا: "یہ کیوں کیا مسز کیشپ: اس بچے سے اتنی ہی نفرت ہے تو آپ اسے مجھے

دے دیجئے ۔"

"نفرت! " مسز کیشپ کے چہرے پر سیاہ بادل سے چھا گئے ۔" نفرت ایک ماں کو، اپنے ہی بیٹے سے!"

اور وہ آنسوؤں کی بارش کے درمیان ہی بولتی گئیں:

"یہ مجبوری ہے سمّی! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسے یہاں رکھ کر نہ تو میں ہی خوش رہ سکتی ہوں، اور نہ اسے خوش رکھ سکتی ہوں۔ میری نظروں کے سامنے اسے ترسنا پڑتا ہے ........ میری اولاد ہو کر میری ہی ممتا کی بھیک مانگنا پڑتی ہے ...... میں اسے کہاں تک برداشت کروں سمّی ـــ اب نہ یہ میری نگاہوں کے سامنے رہے گا، نہ میرا دل دُکھے گا ـــ۔"

اُسی وقت اشوک خوشی سے تالیاں بجانے لگا:

"آہا، ٹرین آگئی ...... ٹرین آگئی ......"

مسز کیشپ نے جلدی سے اپنے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے کہا:

"اچھا سمّی! پھر ملیں گے۔"

"آنٹی نمستے!"

اور اشوک لنگڑاتا ہوا ٹرین میں جا کر بیٹھ گیا۔

ـــ اب ٹرین نگاہوں سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اور پہاڑ کے سینے میں کافی گہرائی تک خشک درخت کی پھیلی ہوئی جڑیں میری آنکھوں کے سامنے نمایاں ہوتی جا رہی ہیں ـــ

صوفیہ کمال
ترجمہ
منصور قیصر

بنگالی

# جیالوں سے خطاب

بھیگی ہوئی رات کا سکون اور دن کا چین
سب لوٹ کر لے گیا۔

چور —
(انسان دشمنی کے بل پر)
جو اندھا اور گم کردہ راہ ہے
خود غرض، وحشی اور سفاک دشمن
جن کی چیختی ہوئی آوازیں زہر بھری ہیں
آسمان اور زمین کے چہرے پر کالک ملنے والے
جنہوں نے گھر گھر ظلم اور گناہ کے بیج بکھیر دیئے ہیں
جنہوں نے —
کتنی ہی ماؤں کے کلیجے سے
اُن کے لاڈلوں کو چھین کر
موت کے کنوئیں میں ڈال دیا ہے۔
کتنی بہنوں نے اپنے بھائی کھو دیئے
کتنی دلہنوں کے سہاگ اُجڑ گئے،
کتنی ننھی زندگیوں کے ننھے دلوں کی دھڑکنیں رک گئیں

جو بہادر ہیں —
وہ اپنی دلیری اور شجاعت سے دشمنوں کو فنا کر دیتے ہیں
ان کی فتح و نصرت کا قیمتی سرمایہ
ان کی ماؤں، بہنوں اور بیویوں کے دلوں میں
محفوظ رہتا ہے
وہ —
دشمن کے مقابلے میں
کبھی اپنا منہ لٹکائے، گردن جھکائے
واپس نہیں ہوتے
یہاں تک کہ —
ان کا فانی جسم اپنے وطن کی حفاظت کے لئے
میدانِ جنگ ہی میں رہ جاتا ہے
اور وہ اپنا سب کچھ —
اپنی جان —
اپنے خون کا آخری قطرہ تک
نچھاور کر دیتے ہیں
وہ — وطن کی عظمت کا پرچم، اور
آزاد قوم کا سر، فخر سے بلند رکھتے ہیں
ان کی مائیں —
ایک ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھتی ہیں
اور ایک ہاتھ سے اپنی ممتا کی انمول دولت
ان کے سرد جسموں پر نثار کرتی ہیں
دھیرے سے ان کی پیشانی کا بوسہ لیتی ہیں
اور خدا سے فریاد کرتی ہیں
پروردگار — انسانیت کو دنیا میں پھر لوٹا دے

امرتا پریتم
ترجمہ
سلیم سالک

پنجابی

# آنکھیں

کہتی تھی ترے نینوں کی ندیا
میں کرلوں گی پار۔
ڈول گئی مرے من کی نیاّ
چھوٹ گئے پتوار
کشتی تھے اب اور نہ چپّو
نا اِس، نا اُس پار
پران نینوں سے کیا مجھ کو
اس کے سوا درکار؟

ان آنکھوں نے مجھے دھنا یوں
دھنیا جیسے روئی دُھنے
کہتا کچھ پر کیا کیجئے جب
ان آنکھوں میں تو ہی بسے

تو آنکھوں کے پاس نہیں تھا
تو تھا گردوں پار
آنکھیں دیکھ نہ پائیں تجھ کو
بیچ میں، تو جب سامنے آیا
اشک بنے دیوار
آنکھیں دیکھ نہ پائیں تجھ کو!

سندھی

تمر شہباز
ترجمہ
منظور حسین قریشی

# دوہے

مان ئي بنسي مان ئي گيت، مان ئي وڻا مان سنگيت
پيار جي پيار هار به مان ئي، مان ئي جيون جيت
میں ہی بنسی میں ہی گیت، میں ہی وینا میں سنگیت
پیار کی پیاری ہار بھی میں ہوں، میں ہی جیون جیت

ڪير تہ آهي، جنهن جي آشا جيون جو سنگيت بڻي
ڪير تہ آهي، جنهن جي ڳولها، پريت جي آهي ريت بڻي
کوئی تو ہے، جس کی آشا، جیون کا سنگیت بنی
کوئی تو ہے، جس کی چاہت، ایک انوکھی پریت بنی

سنڌو وءَ جي ساحل تي پنهنجي غم جا ديپ جلايان ويٺو
لهر لهر ۾ توکي پائي، من ئي من مسڪايان ويٺو
سندھو کے ساحل پر اپنے غم کے بیٹھا دیپ جلاؤں
لہر لہر میں تجھ کو پا کر من ہی من مسکاؤں

لهر لهر ۾ نغمو جاڳيو، ڇوليون ۾ ڇن ڇن
سندر تارا سيج سجائين، چنڊ سڄيو دلهن
لہر لہر میں نغمہ پیدا لہروں میں ہے چھن چھن چھن
سندر تارے سیج سجائیں، جس پہ سوئے سندر بدن

طاؤس بانہالی
ترجمہ
جہاں آرا تبسم

کشمیری

# دو نظمیں

## لمحے

دوپہر محو رہے چاند سے سرگوشی میں
دن ڈھلے آنکھ کھلی دشت فراموشی میں
روشناسا ہی یہاں روئے سخن کو ترسے
ورنہ کچھ ایسی بھی لذت نہیں روپوشی میں
دھیان سے ڈھلتے رہے چند گریزاں لمحے
جیسے نغمہ کوئی تحلیل ہو خاموشی میں

## یادیں

پت جھڑ رُت
تمہید خزاں کی
بیت چلی ہے
فصلِ زمستاں کے اوراق کھلے
سینے میں
یادیں برگ چنار کی صورت
بیٹھی دعائیں مانگ رہی ہیں

لوک گیت
ترجمہ
عطا شاد، عین سلام

بلوچی

# لیلی مور

وسطی بلوچستان میں یہ گیت اس قدر مقبول ہے کہ بیک وقت دو زبانوں بلوچی اور براہوی میں گایا جاتا ہے۔ لیلی مور میں قریباً ہر نوع کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس صنف کی وجہ تمیز اس کی مخصوص دھن ہے۔

بیائے منی او لیلیٰ دل منی جوش کنت
نیم درنائیں کلیں امردماں بے ہوش کنت

دل ترے عشق میں مست و سرشار ہے
سامنے آ بھی جا کون ہشیار ہے

روچ ءَ ترا پولگاں، شپ ءَ ترا گندگاں
دل منی گوں توں انت من دلداروں

دن کو تیری لگن، شب کو دیدار ہے
تو ہی دلبر مرا، تو ہی دلدار ہے

اے جہاں کے بزانت گو من رچوں کنت
ارس کنت دیدگان کہ دل وھون کنت

مجھ کو دنیائے دوں راس کب آئے گی
آگ برسائے گی، خوں اُگلوائے گی

## ادارہ

# نئی کتابیں

### تبصرہ و تعارف

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

**تنقیدی نقوش** | ناشر: مشتاق بک ڈپو، نزد اردو کالج، شیلٹن روڈ، کراچی
ڈاکٹر عبد القیوم | صفحات: ۱۹۲ — قیمت: ۳ روپے ۷۵ پیسے

تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ تنقید کی معتبر اور ثقہ روایت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم بے حد سلجھے ہوئے مزاج کے آدمی ہیں۔ ان کی تنقید بھی سلجھی ہوئی اور شگفتہ ہے۔ اس کے علاوہ بعض مشکل مقامات سے وہ اپنی نفاست، حلیم الطبعی اور شعور کی بنا پر اس طرح گزرے ہیں کہ قاری کو دیر تک اس دشواری کی خبر بھی نہیں ہوتی جس سے نبرد آزما ہوئے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے بہت کم لکھا ہے، لیکن جتنا لکھا ہے ہمیشہ پوری ذمہ داری سے لکھا ہے۔ وہ اردو ادب کے نقاد بھی ہیں اور کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد بھی۔ ان کی تحریر میں نقاد کی نظر اور ایک استاد کی شخصیت کا وقار ملتا ہے۔ حال ہی ان کا پی ایچ ڈی کا طویل مقالہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں بھی چند مضامین حالی سے متعلق ہیں۔ حالی سے انہیں بے حد لگاؤ ہے۔ حالی شاعر، سوانح نگار اور نقاد تھے۔ حالی مدبر تھے، اسی لئے ڈاکٹر عبدالقیوم کو حالی سے گہرا لگاؤ ہے۔ ان میں وہ ساری باتیں یکجا ہوتی ہیں جو خود انہیں پسند ہیں، جن کی وجہ سے زندگی میں ڈاکٹر عبدالقیوم نے اپنے لئے ادب کا شعبہ منتخب کیا۔ "تنقیدی نقوش" کی بعض آراء سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے مضامین کو علمی حلقوں میں یقیناً سراہا جائے گا۔

**باغ و بہار (میرامن)** | ناشر: اردو اکیڈیمی سندھ۔ بہادر شاہ مارکیٹ کراچی
مقدمہ: ابوالخیر کشفی | صفحات: ۳۶۸ — قیمت: ۳ روپے

"باغ و بہار" کا ایک ایڈیشن اردو اکیڈیمی سندھ کی جانب سے ابوالخیر کشفی کے مقدمے

کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مقدمے میں ابوالخیر کشفی نے "باغ و بہار" کی ادبی، تحقیقی اور تہذیبی حیثیت پر تفصیل سے لکھا ہے۔ لیکن جا بجا ممتاز حسین کا تذکرہ کر کے اُسے بوجھل بنا دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 'باغ و بہار' کے مطالعے سے زیادہ وہ مقدمہ لکھنے والے کے ذہن پر ممتاز حسین چھائے ہوئے ہیں۔ شبلی انشا پرداز بھی تھے اور محقق بھی۔ تحقیق کی بے شمار غلطیاں اُن کے یہاں ملتی ہیں۔ لوگوں نے اُن کی غلطیوں کی گرفت بھی کی ہے۔ لیکن غلطیوں کی گرفت میں ایک حد سے تجاوز کرنے کے بعد بات ادب سے نکل کر ذاتی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ممتاز حسین کی جن غلطیوں کی طرف ابوالخیر کشفی نے اشارہ کیا ہے اُن سے ہٹ کر ہمیں اس بات کو مد نظر رکھنا ہوگا کہ ہمارا اپنا اندازِ نظر ذاتی ہے یا ادبی۔ خصوصاً مقدمے میں اس سے گریز لازمی ہے۔ کیونکہ مقدمہ ایک آزاد مضمون ہونے کے بجائے کتاب سے ملحق ہوتا ہے۔ یہ الحاق مقدمہ کے طرزِ تحریر کا بھی تعین کرتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مولوی عبدالحق سے بہتر مقدمے کسی نے ہمارے ادب میں نہیں لکھے۔ توقع ہے کہ آئندہ اشاعت میں ابوالخیر کشفی مقدمے میں مناسب تبدیلیاں کرکے اسے وقیع اور ادبی روایت کے مطابق کر لیں گے۔

**ادب منزل بمنزل** | ناشر: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

**سیدہ انیس فاطمہ بریلوی** | صفحات: ۲۳۴ —— قیمت: ۶ روپے

انیس فاطمہ نے اردو ادب کو تنقید اور ادبی تاثرات کی ایک اچھی کتاب دی ہے۔ اس کتاب میں برگزیدہ ادبی ہستیوں کے خاکے ہیں۔ اُن کے کارناموں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ ادب کے مختلف اسکولوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اصلاحی، ادبی اور قومی تحریکوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اردو ادب کے ایک بڑے حصے کے سنجیدہ مطالعے کا نتیجہ ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیس فاطمہ کو اپنی ثقافت، زبان، ادب اور اسلاف سے کتنا گہرا لگاؤ ہے۔ کتاب میں جو موضوعات سمیٹے گئے ہیں، اُن کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو کتاب کا نام علامتی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کتاب کے لئے اس سے بہتر نام ملنا مشکل تھا۔ اس کتاب سے ہماری سنجیدہ ادبی کتابوں میں ایک اور کا اضافہ ہوا ہے۔ انیس فاطمہ سے توقع ہے کہ وہ اس طرف اور توجہ دیں گی۔ کیونکہ نقاد خواتین ہمارے ادب میں تقریباً ناپید ہیں۔ انیس فاطمہ نے اس اعتبار سے ہماری تنقید میں خواتین کی نمائندگی کی ہے اور اس نمائندگی کا اپنی تحریر سے پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ اُن کی تحریر میں سادگی، دلکشی اور روانی ہے۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کے روحِ رواں سید الطاف علی بریلوی ادب منزل بمنزل جیسی معیاری، تعمیری اور فکری مطبوعات کی اشاعت کے لئے قابلِ مبارکباد ہیں۔

**تذکرۂ زنداں** | ناشر: مکتبۂ چراغ راہ - ۳۹ لوٹیا بلڈنگ - آرام باغ روڈ، کراچی
**خورشید احمد** | صفحات: ۳۶۸ قیمت: ۶ روپے

یہ کتاب نثری زنداں نامہ ہے جس میں خورشید احمد نے آپ بیتی کے کچھ ورق ہمارے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ تحریر شگفتہ اور اندازِ بیان دلکش اور متین ہے۔ جابجا اشعار موقع و محل کے اعتبار سے ایسے مناسب استعمال کئے گئے ہیں کہ لطف دونا ہو جاتا ہے — خورشید احمد بات بہت سلجھے انداز میں کرتے ہیں۔ متانت، سادگی اور ضبط اُن کی طبیعت کا خاصہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کی رعنائیوں نے اُنہیں گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ وہ شاعری سے عام لوگوں سے زیادہ ہی شغف رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کی دلکشی میں اُن کے ذوقِ شاعری کی وجہ سے بھی اضافہ ہوا ہے۔ کتاب ضخیم ہے لیکن واقعات بیان کرنے میں مصنف نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ بے جا تفصیل نہ ہو جو قاری کو اکتا دے۔ اور نہ بات اتنی مختصر کی جائے کہ اَن کہی ہو جائے۔ اور پڑھنے والے میں صرف ذوقِ تجسس بیدار ہو کے رہ جائے۔

**کاشر زبان** | ناشر: کشمیر پبلشنگ ہاؤس - ڈی - ۸۲، پرانا قلعہ، راولپنڈی
**میر غلام احمد کشفی** | صفحات: ۱۸۴ قیمت: ۲ روپے ۵۰ پیسے

"کاشر زبان" ایک اہم کتاب ہے۔ میر غلام احمد کشفی نے اپنی محنت سے کشمیری بول چال کی زبان کو اردو ترجمے کے ساتھ شائع کر کے گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ ہمارے ملک کے مختلف علاقوں میں مختلف بولیاں ہیں۔ جنہیں کہیں بولیاں، کہیں زبانیں کہا جاتا ہے۔ اردو سب سے قومی زبان کا رابطہ قومی زندگی میں دوررس اہمیت کا حامل ہے۔ میر غلام احمد کشفی کی اس قیمتی کتاب سے ہر وہ شخص مستفید ہو سکتا ہے جسے کشمیری زبان سیکھنے سے دلچسپی ہے۔

**داغوں کی بہار** | ناشر: حسن کار - اشاعت گھر - لاہور
**اختر سلیمی** | صفحات: ۲۵۲ قیمت: ۴ روپے ۵۰ پیسے

'داغوں کی بہار' ایک تفریحی ناول ہے۔ جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ بے حد دلچسپ اور پڑھنے والوں کے مزاج کے عین مطابق ہوتا ہے۔ موضوع عموماً محبت ہوتا ہے۔ جس میں کچھ درمیانی طبقے کے خاص گھومتے قصے اور بیشتر رومان ہوتا ہے۔ اختر سلیمی کا یہ ناول بھی دلچسپ ہے۔ زبان بھی درست ہے۔ کہانی بھی محبت کی ہے۔ رومان بھی قائم ہے۔ غرض تفریحی ادب کے قاریوں کے لئے اس ناول میں سب

کچھ ہے جس کی اُسے تلاش رہتی ہے۔ تحریر میں کہیں کہیں ایسے جملے بھی ملتے ہیں جن میں مصنف نے سنجیدہ اور متین آرا کا اظہار کیا ہے۔ مصنف کرداروں کی کہانی کے تسلسل کو ختم کرنے کے بجائے انہیں مربوط رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔

**خونِ رگِ جاں** | ناشر: مجلس یادگار قابل۔ ۱۵۵ سرفراز کالونی۔ حیدرآباد (مغربی پاک)
**قابل اجمیری** | صفحات: ۱۲۸ قیمت: ۲ روپے ۵۰ پیسے

قابل مرحوم غزل کے شاعر تھے اور اچھی غزل کہتے تھے

اپنے پرائے لوگوں کے پیچ و تاب میں گم ہوں — مدت سے مجھے یار کا دام سلامت نہیں ہے
کچھ اس ادا سے نکھار گئے گلستانِ رنگ و بو — غنچے بہار کے کوئی جواب نہ کر سکے
جلوؤں کی بھی رُت بھی دیدار کے دن بھی — نظروں کی کشمکش کا موسم گل ہے
میں نے ان ہونٹوں کو چوما میں نے ان آنکھوں کو — پہلا پہلا سا میرا طرزِ بیاں ہونا ہی تھا
چراغِ طور ہے روشن نہ آتشِ نمرود — اب اپنی آگ میں خود جل رہے ہیں پروانے

یہ اشعار قابل کے مجموعے میں سے جستہ جستہ لیے گئے ہیں۔ ان کو پڑھ کر قابل کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُن کے ہاں غزل گوئی کے خاصے امکانات موجود تھے۔ افسوس کہ اُن کی زندگی نے وفا نہیں کی۔ ان کا کلام ذوق اور شوق سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اُن کی کم سنی کی موت سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت دلانے کے لئے کافی ہے۔

**دیدۂ یعقوب** | ناشر: جدید ناشرین۔ چوک اردو بازار۔ لاہور
**عرشی صدیقی** | صفحات: ۱۶۰ قیمت: ۴ روپے

عرشی صدیقی اردو کے نوجوان شاعر ہیں۔ اُن کی نظموں میں جدید شاعری کا وہ اسلوب ملتا ہے جس کی نشوونما تقسیمِ ہند کے چند سالوں کے بعد ہوئی۔ داخلیت ان کی اکثر نظموں میں موضوع بن گئی ہے۔ جدید شعرا کے یہاں ایسی داخلیت کے واضح نام نہیں ملتے۔ اس لئے وزیر آغا نے شاید اسی داخلیت کی عرشی صدیقی کی کتاب پر دیباچہ لکھتے ہوئے اس کی روح کی جہت کہا ہے۔ لیکن عرشی صدیقی سے توقع اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اپنی ذات میں گم ہونے کی بجائے عرصۂ حیات میں لہولہان آدم کو زخم کھاتے اور فضاؤں میں "صفریتِ مرگ" کے آسیب کی خبر دیتے ہیں۔ اور یہ خبر ایک شاعر کے دل کی پکار بن کر ہمیں اپنے عہد کے غموں سے آشنا کرتی ہے۔ اگر وہ اپنی آزاد نظموں میں فن کو اور نکھارنے اور بعض مبہم تفصیلات سے بچنے کی کوشش کریں تو آئندہ اس سے بہتر مجموعہ دے سکتے ہیں۔ ابھی بچی کی موت سے جو تاثر انہوں نے قبول کیا ہے اس میں انسانی جذبہ، دکھ کے تجربے سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

ممکن ہے آئندہ زندگی کے دکھوں کو تجربہ بنانے میں اسی موت کا تاثر عرش صدیقی کے لئے مشعل راہ ہو۔ کبھی کبھی تاریکی کے شدید احساس سے روشنی کا پورا شعور حاصل ہوتا ہے ان کی نظم کا عنوان "ارتقا کا ایک تاریک موڑ" اسی بات کا غماز ہے کہ تاریکی کے احساس نے عرش کو ہمیشہ روشنی کا شعور عطا کیا۔ اگر وہ زمین، عورت اور جنس کے مریضانہ تصورات کے بجائے زندگی کے دکھوں ہی سے فن کا رشتہ جوڑتے رہے تو ایک دن کامیابی اُن کے قدم چومے گی۔

| | |
|---|---|
| اسم اعظم | ناشر: انڈین بک ہاؤس۔ محمد علی روڈ، علی گڑھ |
| شہریار | صفحات: ۱۱۲ قیمت: ۳ روپے پچاس روپے |

شہریار جدید شعرا کی اس نسل کے ایک اہم نمائندے ہیں جس میں سحر انصاری شاذ تمکنت، وحید اختر، ساقی فاروقی، جون ایلیا، رسا چغتائی وغیرہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ سنہ ۵۵ء کے لگ بھگ اس نسل نے اپنے لئے شاعری میں چلنا شروع کی تھی۔ ان میں سے بیشتر کا مسئلہ (جن کے نام اوپر درج نہیں ہیں) ذات کی ایک بے نام تنہائی ہے۔ میں نے اسے بے نام اس لئے کہا کہ شاعری جذبے کی تفہیم کا راستہ کھولتی ہے۔ لیکن اس نسل کے اکثر شاعر اپنے کرب کے مبہم اظہار سے آگے نہیں بڑھتے۔ شہریار کا شمار دوسرے قسم کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ جو شاعری کی ایک مسلسل روایت سمجھتے ہیں۔ خامیوں کے باوجود اُن کے فن میں نیا پن، احساس کے رنگ اور رات ان دوستی ملتی ہے ان کی بیشتر آزاد نظمیں جذبے اور احساس کو ناپختہ اور ادھورا چھوڑ دیتی ہیں۔ لیکن "سایہ کی موت" "اجنبی" "شجر سایہ دار" اور "سائے" اچھی آزاد نظمیں ہیں۔ جن میں احساس کی نئی تصویریں، آزاد نظم کی زبان، اور شہریار کا مزاج ملتا ہے۔ شہریار اپنا معرّا نظموں میں آزاد نظم سے زیادہ کامیاب ہیں ؎

رات کے بے پناہ صحرا میں         اپنی تنہائیوں سے لڑتی ہوئی
زخمی روحوں کی پیاسے جسموں کی         ساری پرچھائیاں شہید ہوئیں

ایک نظم کے یہ چار مصرعے جذبے اور زبان کا نیا پن رکھتے ہیں۔ لیکن اسی نظم کے باقی دو مصرعے ؎

یہ خبر تازہ روزنامے کی         کس ورق پر چھپی تھی یاد نہیں

جدید شاعری میں آورد کی مثال ہے۔ جدید دور کے اس قصیدے سے شہریار کو بچنا چاہئے۔ ان کی نظم و غزل میں وہ امکانات ملتے ہیں جن کی بنا پر شہریار سے اچھی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

**کوہِ ندا**
حسین مشیر علوی

ملنے کا پتہ : ادارہ روزنامہ آگ۔ ۱۱ ہاتھی خانہ، لکھنؤ ۳
صفحات : ۱۰۰ — قیمت : ۲ روپے ۵۰ پیسے

یہ جدید نظموں کا ایک مجموعہ ہے جس کا دیباچہ خود شاعر نے لکھا ہے۔ دیباچے میں ایک جگہ لکھتے ہیں "شاعر خود پرست بھی ہوتا ہے اور خود نما بھی" شاعری خود پرستی اور خود نمائی کا تسلسل قدیم تنقید سے ہے۔ جدید تنقید، شاعری اور شاعر کی شخصیت کا مطالعہ زندگی کے ادراک ہی کے سلسلے میں کرتی ہے۔ فلسفہ اور شاعری انسانی عرفان کی دو منزلیں ہیں۔ عرفان حاصل کرنے والے کو جدید تنقید خود پرست اور خود نما نہیں سمجھتی۔ اگر "میں" کا لفظ کوئی شاعر انسان کے لئے استعمال نہیں کرتا تو وہ شاعری میں یقیناً اس لفظ کے صحیح استعمال سے ناواقف ہے۔ اس مجموعے سے دوسرے مجموعوں کی طرح بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد نظم آہستہ آہستہ ہماری تہذیبی زندگی میں جذبہ و خیال کے برتنے کا ایک نیا طریقہ بروئے کار لا رہی ہے۔ غزل کے استعاروں سے نکل کر آزاد نظم کے سہارے ہی ہماری شاعری نئے عہد کے مزاج کو اپنا رہی ہے۔ حسین مشیر علوی کے اس مجموعے میں بھی کہیں کہیں وہ خواب ملتے ہیں جو اس عہد کے شاعر کے اپنے خواب ہیں۔

**رباعیاتِ غریب**
امیر اسلام مولانا غریب

ناشر: ادارہ مطبوعاتِ جدید، پیسہ مل روڈ۔ لاہور
صفحات : ۸۰ قیمت : ۲ روپے

رباعی کا فن اور تصوف کی روایات کو کسی مختصر اور نئے مجموعے میں یکجا دیکھنا ہو، تو نظر "رباعیاتِ غریب" پر جا کر ٹھہرتی ہے۔ اس مجموعے میں چند فارسی اور کچھ اردو کی رباعیات شامل ہیں۔ عشق، اخلاقیات، عبادت اور حبِ رسولؐ مولانا کی مختلف رباعیات کے موضوعات ہیں۔ کچھ رباعیاں مسئلہ وحدت الوجود سے بھی متعلق ہیں۔ ان کی بعض رباعیاں بہت خوبصورت اور پُر تاثیر ہیں ؎

مجھ کو نہ ازل نے نہ قضا نے مارا　　مارا تو تری آن و ادا نے مارا
اس بات سے ناخوش ہے اگر تو اے بت　　کہہ دوں تری خاطر سے خدا نے مارا

اُن کی مندرجۂ ذیل رباعی زندگی کی المناکی کا ایک مرقع اور معاش کے مسئلے کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے ؎

دن رات ہے دو روٹیوں کا بھوکا پیٹ　　خالی حق حق سے پُر نہیں ہوتا پیٹ
سیری ہو شکم کی ذکر و اذکار سے کیا　　تسبیح کے دانوں سے نہیں بھرتا پیٹ

رباعیات کا یہ مجموعہ بہرصورت قابلِ مطالعہ ہے۔

---

ص - ل

# فنتائے علم

**ادبی و تہذیبی خبریں اور تبصرے**

## یوم آزادی پر حسن کارکردگی اور اعتراف خدمت کے صلے میں صدارتی اعزازات و انعامات کا اعلان

اعزاز پانے والوں میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، رئیس احمد جعفری ڈاکٹر محمد انعام الحق، خواجہ معین الدین اور پروفیسر شاکر علی شامل ہیں

## الطاف گوہر کیلئے "ستارۂ پاکستان" اور علامہ علاء الدین،

### اور حکیم محمد سعید دہلوی کے لئے "ستارہ امتیاز" کے گراں قدر اعزاز

راولپنڈی۔ صدر محمد ایوب خاں نے ۱۴ اگست ۶۶ء کو یوم آزادی کے موقع پر ملک کی جن بلند مرتبت اور مشہور و ممتاز شخصیتوں کو انعامات و اعزازات سے نوازا ہے ادارۂ افکار انہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ علوم فنون کے سلسلے میں انعام و اعزاز پانے والوں کی تفصیل یہ ہے:

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| (۱) | ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی | سائنس | صدارتی تمغہ | اور نقد | دس ہزار روپے |
| (۲) | رئیس احمد جعفری | اردو ادب | 〃 | 〃 | پانچ 〃 〃 |
| (۳) | ڈاکٹر محمد انعام الحق | بنگلہ ادب | 〃 | 〃 | 〃 〃 〃 |
| (۴) | خواجہ معین الدین | ڈرامہ | 〃 | 〃 | 〃 〃 〃 |
| (۵) | پروفیسر شاکر علی | مصوری | 〃 | 〃 | 〃 〃 〃 |
| (۶) | ڈاکٹر عبدالوہاب خاں | سائنس | 〃 | 〃 | 〃 〃 〃 |
| (۷) | ڈاکٹر کے اے منصور | 〃 | 〃 | 〃 | 〃 〃 〃 |
| (۸) | ڈاکٹر ایم ایم سرور | 〃 | 〃 | 〃 | 〃 〃 〃 |

ان حضرات کے علاوہ صدرِ مملکت نے جن ممتاز شخصیتوں کو قومی اعزازات سے نوازا ہے اُن میں "ستارۂ پاکستان" حاصل کرنے والوں میں پہلا نام وزارتِ اطلاعات و نشریات کے سکریٹری اور مشہور ادیب الطاف گوہر کا ہے "ستارۂ امتیاز" کے اعزازات علامہ علاء الدین اور حکیم محمد سعید دہلوی کو عطا کئے ہیں۔ یہ شخصیتیں بجا طور پر اپنی علمی، فنی اور قومی خدمات کے صلے میں ان اعزازات کی مستحق تھیں۔

## احمد ندیم قاسمی کے مجموعۂ کلام کی چینی زبان میں اشاعت

کراچی۔ اردو کے ممتاز شاعر اور ادیب احمد ندیم قاسمی کی نظموں کے ایک منتخب مجموعے کا چینی زبان میں ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ یہ بات پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے افریشیائی ادیبوں کی پیکنگ میں ہنگامی کانفرنس میں شریک ہونے والے وفد کے لیڈر شوکت صدیقی نے بتائی ہے یہ ترجمہ گذشتہ ماہ شائع ہوا ہے۔ احمد ندیم قاسمی برصغیر پاکستان اور ہندوستان کے پہلے ادیب ہیں جن کے کلام کا چینی زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔

## ڈاکٹر عبادت بریلوی کی لندن سے واپسی

کراچی۔ اردو کے مشہور و ممتاز ادیب و نقاد اور افکار کے مستقل معاون ڈاکٹر عبادت بریلوی لندن میں چار سال قیام کے بعد گذشتہ دنوں پاکستان واپس تشریف لے آئے ہیں۔ آپ ستمبر ۶۲ء سے لندن میں تھے اور اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ لندن کے قیام کے دوران آپ نے اسکول کے شعبۂ تحقیق و مطالعہ کو کافی وسعت دی۔ ۶۲ء میں وہاں صرف ایک طالب علم اردو میں تحقیق کر رہا تھا اور اب وہاں متعدد طلبہ تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے لندن کے چار سالہ قیام کے دوران ایک درجن سے زائد قیمتی نادر و نایاب اور قلمی مسودے لندن اور یورپ کے کتب خانوں سے تلاش و فراہم کئے جن میں سے شکنتلا، گلشنِ بے خار، حیدر بخش حیدری کی کہانیاں، مادھونل اور کام کندلا کتابی صورت میں شائع ہوگئی ہیں۔ دیگر کتب زیرِ طبع ہیں۔ آپ بدستور پنجاب یونیورسٹی کے اورنٹیل کالج میں شعبۂ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں گے۔

## افکار، پیکنگ یونیورسٹی میں

کراچی۔ اردو کے مشہور ادیب، شاعر اور طنز نگار ابن انشا گذشتہ دنوں چین کا دورہ کر کے واپس آئے ہیں۔ ایک ملاقات کے دوران آپ نے بتایا کہ جب وہ پیکنگ یونیورسٹی میں پہونچے اور شعبۂ اردو کی سربراہ سے انہوں نے دریافت کیا کہ آپ کے یہاں کوئی اردو کا رسالہ بھی آتا ہے تو وہ فوراً "افکار" لے آئیں اور کہنے لگیں کہ ہم عرصۂ دراز سے صرف افکار ہی منگواتے ہیں اور اسی میں ہم نے آپ کی نظمیں اور مضامین پڑھے ہیں۔ افکار کے مضامین نظم و نثر چینی طلبہ و طالبات بخوبی استفادہ کرتے ہیں۔ ابن انشا نے کہا کہ مجھے پیکنگ یونیورسٹی میں افکار دیکھ کر جو مسرت ہوئی وہ ناقابلِ اظہار ہے۔

## نامور پاکستانی، ترکی اور ایرانی شخصیتوں کی برسیاں مشترکہ طور پر منائی جائیں گی

راولپنڈی۔ علاقائی تعاون برائے ترقی کے ثقافتی اداروں کی مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس میں فیصلہ کیا ہے کہ پاکستان، ایران اور ترکی اپنی نامور شخصیتوں کی برسیاں مشترکہ طور پر منایا کریں گے۔ ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے تینوں ملک ترجمے کریں گے اور نصاب کی کتابوں پر نظر ثانی کی جائے گی تاکہ تینوں ملکوں کے طالب علم ایک دوسرے کی تہذیب، تمدن اور تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوسکیں مرکزی وزارت تعلیم کے سکریٹری جناب ڈبلیو. ای. قادری نے ان فیصلوں کا انکشاف کیا۔ انہوں نے کہا کہ مجلس عاملہ نے علامہ اقبال کی تقاریر کے مجموعہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیات کا ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ شاعر نذرالاسلام کے کلام کا بھی ترکی اور فارسی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے گا تاریخ کئی جلدوں میں لکھی جائے گی اور پہلی جلد ایک سال میں تیار ہوجائے گی۔

## افکار۔ امریکی یونیورسٹیوں میں

کراچی۔ امریکہ کی ۱۸ اعلیٰ درس گاہوں کے لئے جہاں اردو کے شعبے کھل گئے ہیں۔ افکار کی ۱۸ کاپیاں ہرماہ فیروز سنز کی معرفت خرید کی جا رہی ہیں۔ کئی امریکی اردو دوستوں نے امریکہ سے خط لکھا ہے کہ افکار ان کے لئے نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ اس کے معیاری، علمی معلوماتی اور ادبی مضامین ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور استفادہ کرتے ہیں۔

## افکار۔ روس میں؛

کراچی۔ روس کے کئی علمی اور تہذیبی مرکز گرزیچ ایجنسی کی معرفت افکار خرید کر رہے ہیں اور روس سے لوٹ کر آنے والے دوستوں نے بتایا ہے کہ وہاں افکار کے معلوماتی مضامین ادبی و تہذیبی خبریں اور معیاری نظمیں نہایت دلچسپی سے مطالعہ کی جاتی ہیں۔ وہاں کے متعدد ادبی اداروں نے جوش نمبر، حفیظ نمبر، فیض نمبر اور غالب نمبر کی کئی کاپیاں مختلف ایجنٹوں سے حاصل کرکے محفوظ کرلی ہیں، تاکہ روسی طلباء ان سے مستفید ہوتے رہیں۔

## لندن میں تحقیقی کام کی رفتار؛

کراچی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ایک ملاقات کے دوران بتایا کہ ان دنوں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں شمس الدین صدیقی، بکھرلپشا ورپی یونیورسٹی سودا کے کلام پر اور کراچی کے معین الدین شاہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین پر تحقیق کر رہے ہیں۔

## اردو افسانہ نگاری میں حقیقت نگاری

جمشید پور۔ اردو کے جواں سال اور مشہور افسانہ نگار ذکی انور جوان دنوں کریم سٹی کالج جمشید پور کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں " اردو افسانہ نگاری میں حقیقت نگاری " پر تحقیق کر رہے ہیں۔

## بچوں کے لئے صدارتی انعامات

### کمیٹی نے چھ بچوں کا انتخاب کرلیا

راولپنڈی ۔ بچوں کے لئے صدارتی انعام کی قومی کمیٹی نے چھ بچوں کا انتخاب کرلیا ہے جنہیں ادب، فن اور بہادری کا صدارتی انعام دیا جائے گا ۔ یہ کمیٹی اپنی سفارشات صدر کو پیش کرے گی جو بچوں کے عالمی دن ۔ یکم اکتوبر میں انعام یافتہ بچوں کے ناموں کا اعلان کریں گے ۔ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ آئندہ ہر سال پینٹنگ اور مضمون نویسی کے لئے موضوعات کا اعلان بھی کیا جائے ۔ کمیٹی کے اجلاس کی صدارت مرکزی وزیر تعلیم قاضی انوار الحق نے کی ۔

## رسالہ "کتاب" کا اجرا

لاہور ۔ نیشنل بک سنٹر نے یہاں سے "کتاب" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا ہے جس کا افتتاح فلیٹیز ہوٹل کے ایک نمائندہ اجتماع میں گذشتہ دنوں کیا گیا، اس میں وہ سب لوگ موجود تھے جو کتابوں کے ساتھ کسی نہ کسی صورت میں تعلق رکھتے ہیں ۔ مصنفین اور ناشرین کے علاوہ اس اجتماع میں کتابیں چھاپنے والے، کتابوں کی کتابت کرنے والے، کتابوں کی جلد بندی کرنے والے بھی شامل تھے بک سنٹر کے سربراہ جناب ابن انشا نے جلسے کے آغاز سے پہلے مجلس صدارت (پریزیڈیم) کا اعلان کیا۔

## ٹی ۔ ایس ایلیٹ پر جمیل جالبی کی نئی کتاب

کراچی ۔ ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سُنی جائے گی کہ ممتاز ادیب و نقاد جمیل جالبی کی "ایلیٹ کے مضامین" کے بعد ایلیٹ کے متعلق نئی کتاب جس میں ایلیٹ کے پانچ تنقیدی مضامین ایک ڈرامہ کا ترجمہ نیز وہ مضامین ایلیٹ کے بارے میں اور آٹھ نادر و نایاب تصاویر بھی شامل ہیں، عنقریب شائع ہو رہی ہے ۔

## یادیں اور آنسو!

○ وادیٔ مہران کے نغز گو شاعر درد سعیدی جو عرصۂ دراز سے سرطان کے موذی مرض میں مبتلا تھے، ۳ر اگست ۶۶ء کو انتقال کر گئے ۔ آپ عرصہ سے ٹنڈو آدم میں میونسپل لائبریری کے نگراں کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اور آپ نے لائبریری کے لئے کئی بیش بہا اور قیمتی کتابیں اس عرصے میں جمع کرلی تھیں ۔ حال ہی میں "شعلۂ جاں" کے نام سے آپ کا مجموعہ شائع ہوا تھا ۔

○ ۱۶ر اگست کو بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی یاد میں جلسہ منعقد ہوا، اور کراچی کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں نے بابائے اردو کو خراج عقیدت پیش کیا ۔

○ برصغیر پاک و ہند کے مشہور ادیب، شاعر و طنز نگار راجہ مہدی علی خاں کا گذشتہ دنوں بمبئی میں انتقال ہوگیا ۔ وہ عرصے سے بمبئی میں مقیم تھے ۔ اور فلموں کے لئے گانے لکھتے تھے ۔

۴۷ء سے پہلے راجہ مہدی علی خاں لاہور میں تھے ۔ اور "خیام" کے علاوہ "عالمگیر" بھی ان کی ادارت میں شائع ہوتا تھا — لاہور کی ادبی فضا کو نکھارنے اور سنوارنے میں راجہ نے نمایاں حصہ لیا تھا ۔

## مکتبۂ افکار کی

# خوب اور خوب صورت کتابیں

| | | | |
|---|---|---|---|
| ناول و افسانے | چاندی کا گھاؤ | کرشن چندر | ۹/- |
| | ایک وائلن سمندر کے کنارے | " | ۶/- |
| | ایک عورت ہزار دیوانے | " | ۵/- |
| | سڑک واپس جاتی ہے | " | ۶/۷۵ |
| | دھواں دھواں سویرا | انور عظیم | ۸/- |
| | اک بوند لہو کی | جوگندر پال | ۴/۲۵ |
| | ایک خوشبو اڑی اڑی سی | کرشن چندر | ۶/۲۵ |
| اسلامیات | تاریخ صحف سماوی | پروفیسر نواب علی | ۵/- |
| | معارج الدین المعروف بہ اسلام اور سائنس | " | ۴/۷۵ |
| سفرنامہ | میرے خوابوں کی سرزمین۔ مشرقی پاکستان | صہبا لکھنوی | ۴/- |
| تنقید | تہذیب و تحریر | مجتبیٰ حسین | ۵/- |
| | ادب و آگہی | " | ۷/- |
| شاعری | نبض دوراں | پروفیسر شور علیگ | ۶/- |
| شخصیت و فن | جوش نمبر قیمتی ایڈیشن سفید کاغذ مع ضمیمہ | مرتبہ: صہبا لکھنوی | ۲۱/- |
| | حفیظ نمبر | " | ۱۰/- |
| | فیض نمبر | " | ۱۲/- |
| | غالب نمبر | " | ۳/- |
| زیر طبع | مجاز ایک آہنگ | " | |

فہرس طلب فرمائیے

## مکتبۂ افکار
رابسن روڈ کراچی

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی    طابع: مشہور آفسٹ پریس کراچی    دفتر: رابسن روڈ کراچی    فون: ۴۳۹۹۳

انسان کا
پرانا
دشمن

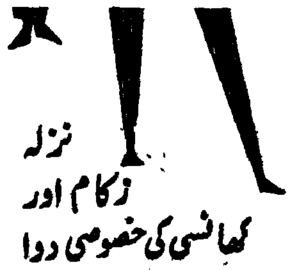
BUSINESS REPLY CARD

To,
*The Manager,*
MAKTABA-E-AFKAR,
ROBSON ROAD.
KARACHI - 1
(W. Pak)

Postage will be paid by the Addressee

G. P. O.
K A R A C H I
Permit No. 210

No Postage stamp is necessary if posted in Pakistan





سعالین
نزلہ
زکام اور
کھانسی کی خصوصی دوا

ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی لاہور ڈھاکہ چٹاگانگ

برونیکس:- گلے، ناک اور سینے پر ملنے سے سوزش اور جکڑن دور ہو کر فوری افاقہ محسوس ہوتا ہے اور مرض کی شدت کم ہو جاتی ہے۔

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی    طابع: مشہور آفسٹ پریس کراچی    دفتر: رابسن روڈ کراچی    فون: ۴۴۹۹۳



انسان کا
پرانا
دشمن
نظر نہ آئے
مگر بچ کے کیوں جائے!
نزلہ، زکام اور کھانسی کو اپنی غفلت سے بڑھنے نہ دیجئے۔
سعالین کا استعمال رکھئے تاکہ دشمن جلد ہی زیر ہوجائے۔
یہ اس کا علاج بھی ہے اور اس سے بچاؤ کی
بہترین تدبیر بھی۔
سعالین
نزلہ
زکام اور
کھانسی کی خصوصی دوا
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی لاہور ڈھاکہ چٹاگانگ
برنیکس:- گلے، ناک اور سینے پر ملنے سے سوزش اور جکڑن دور ہوکر فوری افاقہ محسوس
ہوتا ہے اور مرض کی شدت کم ہوجاتی ہے۔

# پی آئی اے کی پروازیں پیرس

# استنبول

# کویت

# نیروبی

# بغداد

# جدہ

# بحرین

# دوحہ

# دوبئی



کیلئے شروع ہوگئی ہیں

موجودہ پروازیں :- لندن۔ فرینکفرٹ۔ جنیوا۔ روم۔ ماسکو۔ قاہرہ۔
بیروت۔ دھران۔ تہران۔ کابل۔ کراچی۔ ڈھاکہ۔ کھٹمنڈو۔ رنگون
کینٹن۔ اور شنگھائی۔

**PIA** پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز

PK 10

# اس شمارے کی

**چند تازہ ترین تخلیقات**

- جدید اردو نثر کا آغاز ——— انجم اعظمی
- وکٹر اوگو کی مشرقی نظمیں ——— آغا افتخار حسین
- پاکستان کی قدیم میراث ——— ایس اے نقوی

—o—

۵ افسانے، ڈرامے ——— ۱۸ منظومات

۴ دیس دیس کی نظمیں ——— ادبی و تہذیبی خبریں

—o—

**ہر بک اسٹال سے مل سکتا ہے**

محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، راولپنڈی
اور جنرل ہیڈ کوارٹرز آرمی ایجوکیشن سے منظور شدہ

جاری شدہ: ۱۹۴۵ء ٹیلی فون: ۳۹۹۳

# افکار

سال: ۲۲ شمارہ: ۱۸۵

مدیر
صہبا لکھنوی

| زرِ سالانہ | بیرونی ملکوں سے | | قیمت |
|---|---|---|---|
| ۱۲ روپے | ۲۰ شلنگ | ۱۰ ڈالر | ایک روپیہ |

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ کراچی

لندن آفس
۱۴ - پرنسیز ایونیو - لندن - این - ڈبلیو نمبر ۹

# فہرست

## جنوری ۱۹۶۷ء کی تخلیقات

# اشاریہ

۱۹۶۶ء بھی رخصت ہوگیا، اور دکھی انسانیت کو امید و بیم کے دوراہے پر چھوڑ گیا اور بقول شاعر

ہر گیا سال اُمیدوں کا مزار
ہر نیا سال تمنا کا دیار

کل شام جس سورج کو ہم نے الوداع کہی تھی وہ ۱۹۶۶ء کا آخری سورج تھا، اور آج جس سورج کا ہم خیر مقدم کر رہے ہیں وہ ۱۹۶۷ء کا پہلا سورج ہے ــــ اور ان دو سورجوں کے درمیان جس نیم روشن، نیم تاریک رات نے ہمیں محصور کر لیا تھا وہ رات متضاد کیفیات اور احساسات کی ترجمانی کر رہی تھی ــــ ہم سوچ رہے تھے کہ ۱۹۶۶ء میں کیا کچھ نہیں ہوا ــــ یورپ، ایشیا، افریقہ امریکہ، غرض کہ ساری دنیا نت نئے انقلابات کی آماجگاہ بنی رہی۔ کشمیر، فلسطین، ویت نام، اردن اسرائیل، قبرص، روڈیشیا، روس، چین، بھارت اور پاکستان وغیرہ سبھی مسائل سے دوچار رہے ــــ مسئلے جو زندگی ہیں، جو موت ہیں، جن سے دامن بچانا ــــ جن سے پہلوتہی کرنا ــــ جنہیں نظرانداز کرنا ــــ جن سے اثر قبول نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے رُوح اور جسم کے رشتوں کی نفی۔

اور اب اُمید و بیم کی اس فضا میں نیا سال شروع ہو رہا ہے جس کا ہم نیک تمناؤں اور بہترین آرزوؤں کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور خدائے بزرگ و برتر سے دست بدعا ہیں کہ وہ ساری انسانیت کو امن، راحت، آسودگی، خوش حالی اور طمانیتِ قلب کی دولت عطا فرمائے ــــ اور دنیا کو تیسری عالمگیر جنگ کے اندیشوں اور خطروں سے محفوظ رکھے، تاکہ ہم اپنی تہذیب و ثقافت اپنے علم و ادب اور اپنی تاریخ و معاشرت کی صدہا سالہ روایت کا تحفظ کر سکیں، اور نئی روایتوں سے انسانی فکر و صلاحیت کو نمو دے سکیں۔

افکار نئے سال کا پہلا شمارہ بہترین خواہشات کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔ اس شمارے کی تمام تر تازہ وغیر مطبوعہ تخلیقات آج کے ادیب و شاعر کے سچے جذبات و خیالات کی آئینہ دار ہیں اور پڑھنے والوں کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں ــــ اور حقیقی ادب وہی ہے، جو نہ صرف زندگی کی ترجمانی کا حق ادا کرے بلکہ زندگی کی صداقتوں کا آئینہ دار بھی ہو!

انجم اعظمی

# جدید اردو نثر کا آغاز

چند سال پہلے کراچی میں تھیوسوفیکل ہال کے اسٹیج پر مولیر کا ڈرامہ پیش کرتے ہوئے ایک جاہل لیکن دولت مند کردار سے جب اُس کا چالاک اُستاد کہہ رہا تھا کہ وہ ساری زندگی نثر بولتا رہا ہے تو اس کی بات پر اس جاہل کردار کو محوِ حیرت دیکھ کر سارا حال قہقہے لگا رہا تھا۔ حالانکہ اس کا استاد ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ سچ مچ ساری عمر نثر بولتا آیا تھا۔ اس نثر کو ہم بول چال کی زبان کہتے ہیں۔ جس کے مطالعے کی اہمیت خاص طور پر لسانیات میں بہت زیادہ ہے۔ اسی میں سب سے زیادہ لچک ہوتی ہے۔ اس سے ہٹ کر نثر کی تین قسمیں ہیں: افسانوی نثر، ادبی نثر اور علمی نثر۔ یہ تینوں قسمیں کتابی نثر کی ہیں۔ افسانوی نثر بول چال کی زبان سے بہت قریب ہے، اسی کے اعتبار سے اس میں تخلیقی عناصر کی فراوانی ہوتی ہے۔ ادبی نثر میں تخلیقی عناصر اور انشاپردازی کا ایک امتزاج اور علمی نثر میں منطقی اندازِ بیان کی اہمیت ہے۔ ان اقسام کو اردو نثر کی تاریخ میں ہم بڑی آسانی سے میرامن، غالب اور سرسید کی نثر کا نام دے سکتے ہیں۔ آج جو زبان زندگی کے اتنے بڑے کاروبار میں ہم بہت بڑے پیمانے پر بولتے یا لکھتے ہیں۔ اس کو برتنے کے سلسلے میں ان تینوں ناموں کو درجۂ اولیت حاصل ہے۔ اسی لئے ہمارے ادب میں باغ و بہار، خطوطِ غالب اور سرسید کے مضامین، سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس نثر کو جس کا آغاز میرامن سے ہوتا ہے۔ جدید نثر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ انہی کے زمانے میں رجب علی بیگ سرور نے باغ و بہار کا جواب فسانۂ عجائب لکھ کر دیا تھا، جو عرفِ عام میں قدیم اردو نثر کا بہترین نمونہ ہے۔ رجب علی بیگ کی انشاپردازی اور زبان دانی کا اندازہ فسانۂ عجائب سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن اُن کا ذہن پُرانا تھا۔ اُن کی تحریر بھی پرانی تھی۔ وہ میرامن کے مقابلے میں بڑے عالم ضرور تھے، لیکن ان کا علم ان کی قدامت پرستی کی نذر ہوگیا۔ قدیم نثر میں سارا زورِ عبارت آرائی پر صرف ہوتا تھا۔ تحریر مقفیٰ اور مسجع ہوتی تھی۔ جس کے کمال کی حد فارسی نثر کی ہو بہو نقل ہوا کرتی تھی۔ رجب علی بیگ سرور نے بھی اسی راستے پر چل کر قدامت پرستوں سے اپنی انشاپردازی کا خراجِ وقتی داد و تحسین کی صورت میں وصول کیا تھا لیکن میرامن ہماری تہذیب اور روایت کا ایک نیا موڑ تھے۔ اس موڑ پر آ کر گویا ہم اپنے دکھ آپ سہنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔

میرامن سے سرسید تک نثر کا جو ارتقا ملتا ہے اس کی داستان میرامن کے بہت قبل سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں صوفیائے عوام سے اپنے گہرے ربط کی ایک تاریخ رقم کی ہے، ان کی تحریر کی سادگی ہندوستانی عوام کی سادہ مزاجی — اور

ناپختگی ہماری زبان کے عہد طفولیت کی ترجمان ہے۔صوفیاؑ نے سارے ہندوستان میں ایک نئی زبان کے پروان چڑھنے کی ایسی فضا قائم کردی تھی کہ کچھ عرصہ بعد وؔلی کو بحیثیت شاعر اور میرامن کو بحیثیت نثر نگار ملک گیر شہرت نصیب ہوئی۔اس شہرت کے ساتھ ساتھ اردو زبان کا ایک دور ختم ہوتا ہے۔جب وہ بول چال کی زبان تھی اور فارسی سے کم رتبہ تصور کی جاتی تھی اور دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔جو قدیم اور جدید طرزِ انشا کی کش مکش میں جدید کی کامیابی پر تیسرے دور میں ڈھل جاتا ہے۔یہ تیسرا دور سرسید سے شروع ہوتا ہے۔

میرامن سے سرسید تک دراصل ہماری قوم اپنے اسلوب کو حاصل کرنے کی جد و جہد میں مصروف نظر آتی ہے۔قدیم طرزِ انشا،درباداری اور روایتی ذہن کی علامت بن کر نمودار ہوئی تھی۔جس سے جدید ذہن برسرِ پیکار تھا۔وہ ہمارے سامنے کبھی میرامن کی صاف،سحرانگیز اور رواں زبان میں،کبھی غالب کی ظرافت اور بُت شکنی میں،اور آخر کار سرسید کی سادہ منطقی اور علمی نثر میں ابھرتا ہے۔اور سرسید کے بعد وہی ذہن ہماری تہذیب بن جاتا ہے جس کے ارتقا کی آخری کڑی فی الحال ہمارا عہد ہے۔

یہاں تک آتے آتے احساس ہوا کہ اردو نثر کے قدیم اسلوب کو زوال کی علامت سمجھ لینے کے بعد بھی ایک الجھن باقی رہ جاتی ہے۔کیا اسے ہم سچ مچ اردو کا اسلوب کہہ سکتے ہیں۔فارسی اور اردو میں آج بھی بڑی گہری مماثلت ہے۔یہ زبانیں ایک دوسرے سے بے حد قریب ہیں۔قدیم اسلوب تو تمام تر فارسی ہے۔اکثر ایسا ہوا ہے کہ مصنفین نے صرف فعل استعمال کرتے وقت "است" کی جگہ "ہے" اور "بود" کی بجائے "تھا" لکھ دیا ہے۔

اہلِ ایران نے اپنی شاعری پر صدیوں ناز کیا،لیکن اُن کی نثر ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئی۔جو نثر ان کے ہاں ملتی ہے اس میں نثر کی خصوصیات پیدا کرنے کی بجائے شاعری کی نقالی ہی کو اس کا حسن اور معراج سمجھ لیا گیا تھا۔اردو میں بھی جسے ہم قدیم طرزِ انشا کہتے ہیں وہ فارسی کی اسی نثر کی ہم شکل ہے جس کا جملہ فعل یا بعض دوسرے آسان الفاظ مثلاً "سے"،"پر"،"تک" وغیرہ کے استعمال کی وجہ سے فارسی سے اردو میں بدل جاتا ہے۔اور ایسا اس لئے ہوا کہ ہندوستان کی آب و ہوا میں نئی زبان پھل پھول رہی تھی جس کی مہک دربار تک پہونچ رہی تھی۔جہاں فارسی کے اہلِ کمال جمع تھے،جو مختلف علوم کے ساتھ ساتھ دربارداری میں بھی مشاق تھے۔جن کے یہاں علم اپنے معیار سے گھٹ کر وضعداری میں بدل گیا تھا۔انہوں نے اپنی فارسی کو "ہے" اور "تھا" کے استعمال سے اردو بنا دیا۔اور اس طرح زمانے کا ساتھ دیا۔لیکن دربارداری اور فارسی دانی سے ہٹ کر اردو نثر کی غرض و غایت کی بابت انہوں نے کبھی سوچا تھا اور نہ سوچنا چاہتے تھے۔اسی لئے آج میں اُن کی تحریک اردو کا قدیم طرزِ انشا کہتے ہوئے جھجک رہا ہوں کہ ان اہلِ کمال کے سامنے اردو نثر کا کوئی میدان تھا ہی نہیں۔وہ نہ تو یہ جانتے تھے کہ شاعری سے ہٹ کر نثر کا کیا مصرف ہے،اور نہ زوال کے اس عہد میں اُن کے لئے یہ مصرف باقی رہا تھا—فارسی نثر اس معاملے میں کوئی مدد کرنے سے معذور تھی۔لہٰذا ان اہلِ کمال کے ہاں ہمیں اس باب میں کچھ نہیں ملتا۔البتہ صوفیاؑ نے نثر کا مصرف ڈھونڈ نکالا تھا۔انہیں عوام سے رابطہ رکھنا تھا۔ان سے اپنی بات کہنی تھی،انسانی محبت کی تقسیم کے لئے ہندوستان کی ایک سادہ اور دل نشیں زبان کی ضرورت تھی۔سو اردو اپنی ابتدائی شکل میں ان کے کام آئی۔اسی لئے ہماری نثر کا ارتقا صوفیا،کا مرہونِ منت ہے۔اور ہماری زبان کی قدیم اور ابتدائی شکل بھی انہی کی تحریروں میں ملتی ہے

اس اعتبار سے "فسانۂ عجائب" کو قدیم طرزِ انشا کہنے کی بجائے اگر درباری مزاج کی پرتصنع ہیئت کا نمونہ کہا جائے تو بہتر ہوگا، ورنہ اس کا اردو کے قدیم اور جدید اسلوب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان دونوں کی کڑیاں زمانے اور زبان کے ارتقاء کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے عام انسانوں کی زندگی ہی میں ملیں گی۔

میر امن سے کتاب انگریزوں نے لکھوائی تھی۔ لیکن لکھنے والے نے دلّی کا روزمرّہ لکھا تھا۔ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زبان صرف انگریزوں کو سکھانے کے لئے نہیں لکھی گئی تھی بلکہ مصنف خود اپنی زبان کے مزے لیتا ہے۔ اور اس کی لذت سے سرشار ہے۔ اسی منزل میں آ کر ایک لکھنے والا زبان کے تخلیقی جوہر کو سمیٹ لیتا ہے۔ اس کے بعد خطوطِ غالب سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کیسی حیرت انگیز ذہانت کا مالک تھا۔ درباروں سے وہ متعلق نظر آتا ہے۔ نوابین کو وظائف کے لئے مدحیہ خطوط لکھتا ہے۔ بعض حضرات انہی خطوط سے غالب کے مزاج کا اندازہ لگانے بیٹھ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کی حیثیت صرف کاروباری ہے۔ ورنہ جو خط غالب نے دوستوں کو لکھے ہیں، اُن میں واضح طور پر ایک بے ریا، زکی، سچا اور زندہ دل آدمی ملتا ہے، جسے زندگی کا ہر تصنّع اور جھوٹ ناگوار ہے۔

اگر غالب کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس نتیجے پر پہونچنا مشکل نہیں ہے کہ روپوں کی ضرورت سے الگ ہٹ کر اُس کا کسی دربار سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ دراصل وہ اپنی اہمیت سے واقف تھا اور روپے کی ضرورت سے مجبور۔ اسی لئے دوستوں کی محفل میں سُرخ رُو اور محب اور رؤسا کے ہاں وہ صرف ایک ضرورت مند ہے ——— یہی غالب زمانے کے معاملات کو سمجھنے والا اور زندگی کی بصیرت رکھنے والا جب اپنے خطوط میں ڈھل گیا تو اردو نثر میں انشا پردازی کے وہ امکانات پیدا ہو گئے جس نے بعد کو محمد حسین آزاد، شبلی، مہدی افادی، سجاد انصاری، رشید احمد صدیقی اور ابو الکلام آزاد جیسے لوگوں کو پیدا کیا۔

غالب ہی نے سرسید کی کتاب پر تقریظ لکھتے وقت اُن کی فارسی آمیز زبان اور ماضی پرستی کا مذاق اُڑایا تھا، جس پر سرسید عرصہ تک غالب سے خفا رہے۔ لیکن یہ وہی سرسید ہیں جنہوں نے نثر کی غرض وغایت پر پہلی بار ہمارے معاشرے میں نہ صرف سوچا بلکہ بہت کچھ خود کیا اور بے شمار کام اپنے ساتھیوں سے کرائے۔ نئے علوم اور نئی زبان پر جس طرح انہوں نے توجہ دی وہ ان کی عظمت اور وسیع النظری کی دلیل سہی لیکن انہیں ماضی پرستی کی دلدل سے غالب ہی نے نکالا تھا۔ اسی لئے سرسید کو جدید نثر کا بانی کہنے کے باوجود کہ انہوں نے ہمارے معاشرے میں سارے علوم کو رائج کیا۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے جس میں میر امن کی باغ و بہار کی دلکشی اور غالب کے خطوط کی آب و تاب ہے۔ البتہ ہم سرسید کو میر امن اور غالب کی روایت کا سچا امین کہہ سکتے ہیں۔ جس نے اس چھوٹی سی روایت سے اس سمندر کی تخلیق کی جس کے پیراک آج ہماری تہذیب کے ہزارہا عالم، شاعر اور ادیب ہیں۔

سرسید کے بعد اردو نثر کا مطالعہ ایک زبان اور ایک قوم کی صد سالہ تاریخ کا مطالعہ ہے۔ جس کی رگوں میں اُس کے آبا و اجداد کا لہو دوڑ رہا ہے۔ اس تاریخ کے مطالعے سے پہلے نثر کی غرض و غایت کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ تاکہ ہم اپنی شاعری اور نثر میں اپنی روایت کی پوری طرح کھوج لگا سکیں۔ اور علم و فن کی دستگاہ کے ساتھ ساتھ نئے تجربوں کو اپنانے کی سچی جرأت اپنے اندر پیدا کر سکیں۔

جدید نثر کی غرض وغایت اور ماہیت سے آگاہی زندگی کے ایک واضح شعور اور اجتماعی زندگی سے گہری فکری ہم آہنگی کی دلیل ہے۔ کسی زبان، تہذیب یا قوم کے دو ہی بنیادی اسلوب ہوتے ہیں۔ شاعری اور نثر۔ شاعری کا اسلوب تاثر اور نثر کا اسلوب منطق ہے۔ ایک کی اساس جذبہ اور دوسرے کی فکر ہے۔ شعر داخلی صداقت اور نثر خارجی صداقت کی ترجمان ہے۔ شاعری میں انسانی روح کائنات کو اپنے اندر سمیٹتی اور اپنے وجود کا حصہ بنا کر پیش کرتی ہے، نثر میں آدمی خود اپنے وجود کا تجزیہ اس طرح کرتا ہے کہ وہ کائنات کا ایک لازمی اور اہم جزو جیسا کہ وہ ہے نظر آئے۔ شاعری میں یہ صداقت کھل کر اپنا اظہار کرتی ہے کہ روحانی طور پر انسانی وجود ساری کائنات کو محیط ہے اور نثر میں کائنات کو انسانی وجود سے مربوط کر کے تجزیے کی اس منزل تک پہونچایا جاتا ہے جہاں پہونچ کر یہ کائنات ایک ذہن کی جولاں گاہ بن جاتی ہے۔ لیکن ایک جسم کی قید سے انسان اور اس کے ماحول کی ایک ایسی کش مکش ابھرتی ہے جو ایک مخصوص زمانے کو جنم دیتی ہے۔ شعر یا نثر کی ماہیت کو سامنے رکھا جائے تو فن اور سائنس کے مقاصد سمجھ میں آتے ہیں۔ سائنس فطرت کے اصولوں کو دریافت کرتی ہے۔ فن آدمی کو دریافت کرتا ہے۔ اور آدمی کو دریافت کرنے کے سلسلے میں ایک سچے فن کار کو فطرت کے اصولوں کی دریافت سے ہو کر گذرنا پڑتا ہے۔ مختصر طور پر جہاں تک تجزیہ اور منطق کے اصول کارفرما نظر آتے ہیں، سب نثر کی قلمرو ہے۔ اور جب ماثرات کے بہاؤ سے انسانی معاشرہ گذرنے لگے تو سمجھ لیجئے کہ ہم شاعری کی بہشت میں داخل ہو چکے ہیں۔ نثر کسی شے کو بکھیر کر مشاہدہ اور استدلال کرتی ہے۔ شاعری سمیٹ کر ہر شے کو ہم سے مربوط کر دیتی ہے۔ لیکن نثر کے لفظ کا استعمال ہیئت کے اعتبار سے ذرا مختلف انداز میں کیا جاتا ہے نظم و نثر میں فرق صرف موسیقی اور بندش کا ہے۔ موسیقی اور بندش سے آزاد زبان نثر کہلاتی ہے۔ یہ نثر کا روایتی مفہوم ہے۔ لیکن جس طرح منظوم کلام سب کا سب شاعری نہیں ہوتا غیر منظوم سارے کا سارا نثر نہیں ہے۔ نظم و نثر کی تقسیم میں ان کی روایتی ہیئت مد نظر ہوتی ہے۔ شاعری اور نثر کے تقابل میں ان کی ماہیت اور بنیادی امتیازی خصوصیات کا تذکرہ ملتا ہے۔ ایک جگہ نثر کا لفظ روایتی انداز میں استعمال ہوا ہے۔ دوسری جگہ اپنے حقیقی معنوں میں۔ مثال کے طور پر مثنوی سحر البیان کو لے لیجئے۔ اس میں جزئیات نگاری کا کمال شاعری کا نہیں دراصل نثر کا کمال ہے۔ بعض حضرات نثر کو کم تر چیز سمجھتے ہیں۔ اور ناسخ اور ذوق کے کلام کو شاعری نہ سمجھتے ہوئے نثر کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ لیکن ناکام شاعری کو نثر کہنا ایک غلطی ہے۔ بہترین نثر عموماً بڑے شعراء کے کلام میں اور بہترین شاعری اکثر بڑے نثر نگاروں کے یہاں مل جاتی ہے۔ کرشن چندر کی تحریروں اور ٹیگور کی ادب کے بہترین حصے عموماً وہ ہیں جو تمام تر شاعری ہیں۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے رسوا کے بارے میں اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھا ہے —

"ان کی منطق اتنی نازک ہے کہ وہ شعر کے جامے میں

بھی نہیں سما پاتی"

وہ دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ رُسوا کے فن کی لطافت شاعری اور نثر کی حدوں کو ایک کر دیتی ہے۔

فلسفہ ہو یا سائنس بہترین تخلیقی صلاحیتیں شعری اور نثری اسالیب پر یکساں عبور رکھتی ہیں۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے، اشیا کا شیرازہ بکھیر کر استدلال کرتی ہیں اور جب ربط کی تلاش ہوتی ہے تو اس شیرازے کو اس طرح سمیٹتی ہیں کہ اشیا کا ظاہری اور معنوی ربط اور حسن سب عیاں ہو جاتا ہے۔ انسانی تخیل کا سایہ نظم و نثر دونوں ہی پر ہے۔ تخیل شاعری کے لئے

نثر کے مقابلے میں وجہ تخصیص نہیں ہے۔ لیکن انسانی مطالعہ جب تحقیق کے دائرے سے آگے بڑھ کر تخلیق کی منزل میں پہونچتا ہے، تو تخیل کی رہنمائی اور زیادہ فروغ پاتی ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ تخلیق کی منزل تک پہونچا کر تحقیق کی لگن خود کس منزل میں ہوتی ہے۔ اور کس حد تک تخلیق میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تحقیق انسانی تخیل کو گہرے مشاہدات اور عظیم انسانی فکر کی روایت دے کر مکمل کرتی ہے۔ گویا نثر ہی شاعری کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اس اعتبار سے نثر کسی تہذیب کا بنیادی اسلوب اور شاعری اس کا درجۂ کمال ہے۔

اگر کسی بڑے سائنس داں یا فلسفی سے یہ کہہ دیا جائے کہ وہ ایک عظیم شاعر ہے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آئے گا۔ اور اگر کسی عظیم شاعر سے یہ کہا جائے کہ حضرت! آپ نے بہترین شاعری کے ساتھ ساتھ اپنے کلام میں جا بجا بہترین نثر بھی لکھی ہے، تو وہ اور بھی حیران ہوگا، اور شاید اس جملے کو طنزیہ تصور کرے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نثر و نظم کے روایتی مفہوم ہی فوری طور پر ان کے ذہن میں آئیں گے۔

اس روشنی میں اگر سر سید کے کارنامے پر نظر ڈالی جائے تو اس کی عظیم شخصیت ہم پر پوری طرح آشکارا ہو سکے گی۔ میر و غالب کی شاعری سے اس معنوی عظمت کا پتہ چلتا ہے جو ہماری کئی سو سال کی تہذیب کا نتیجہ تھی۔ لیکن سر سید نے ایک مخصوص عہد میں ہماری تہذیب کے اس بنیادی اسلوب کو دریافت کیا۔ جو سارے تہذیبی سرمائے کو بکھیر کر از سر نو شیرازہ بندی کے لئے ہمیں مشاہدات و تجربات کی نئی کڑیوں سے گذار کر ایک نئے طریقۂ استدلال تک پہونچاتا ہے۔ اور جس کا مقصد اردو کو سائنس اور عمرانیات کے سارے شعبوں کی زبان بنانا تھا۔ تہذیب الاخلاق کی فائلوں میں آپ کو ہر موضوع پر مضامین مل جائیں گے یہ ایک نئی تہذیب کا حرفِ آغاز تھا۔

سر سید اور ان کے رفقاء نے اپنی زندگی میں جتنا کام کیا ہے۔ آج اگر ہماری یونیورسٹیوں کے اساتذہ اس سے بہت کم محنت پر بھی آمادہ ہوتے تو وہ اپنے وجود کے مقصد کو نہ کھوتے، اور تہذیب کا جو پودا سر سید کے مفکر اور انقلابی ذہن نے لگایا تھا وہ ہماری آزاد مملکت میں ہرا بھرا درخت بن چکا ہوتا۔ جس کے سائے میں زندگی کی جدوجہد ہمارے لئے کتنی آسان ہو جاتی۔

آغا افتخار حسین

# وکٹر ہوگو کی مشرقی نظمیں

وکٹر ہوگو[1] (پیدائش: بزانسوں (فرانس) سنہ ۱۸۰۲ء - وفات: پیرس، سنہ ۱۸۸۵ء) فرانس کے شاعر، ناول نگار ڈرامہ نگار کی حیثیت سے دنیا میں مشہور ہے۔ اس کی اہم تصنیفات حسب ذیل ہیں:-

ڈرامے:-

1. Cromwell.
2. Hernai.
3. Marion Delorme.
4. Rigoltto.
5. Ruy Blas.

ناول:-

1. Notre Dame de Paris.
2. Les Travailleurs de la Mer
3. Les Miserables
4. Quatre - Vingt Treize.

اس کی نظمیں سیکڑوں کی تعداد میں مختلف عنوانات کے تحت شائع ہوئیں۔ ابتدائی نظموں میں ایک مجموعہ ان نظموں کا ہے جو اس نے مشرقی ممالک، تہذیب، تمدن، تاریخ، روایات، سفرناموں، اور ادب سے متاثر ہو کر لکھیں۔ یہ نظمیں Les Orientales کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ یہ نظمیں تعداد میں اکتالیس ہیں۔ ان میں ترکی، ایران، اسپین، اور دیگر مشرقی اور مسلمان ملکوں کی اہم

---

[1] وکٹر ہوگو (Victor Hugo) کا تلفظ عموماً "وکٹر ہیوگو" کیا جاتا ہے۔ جو انگریزی زبان کی تقلید ہے۔ "t" کا تلفظ فرانسیسی زبان میں "ت" ہوتا ہے۔ "ٹ" کبھی نہیں ہوتا۔ "H" کی آواز "الف" کی آواز کے مماثل ہے۔ فرانسیسی زبان میں "u" کی آواز نکالنے کی صورت یہ ہے کہ ہونٹوں کو گول بنا کر (بوسہ لینے کی شکل میں) "ای" کی آواز نکالی جائے۔ اس طرح "وکٹر ہوگو" فرانسیسی زبان کے تلفظ سے زیادہ قریب ہے۔

تفصیل، مقامات اور واقعات کا ذکر ہے۔ وکٹر اوگو نے یہ نظمیں سنہ ۱۸۲۸ء میں لکھیں۔ اور ان کا پہلا ایڈیشن پیرس سے سنہ ۱۸۲۹ء میں شائع ہوا۔ تازہ ترین ایڈیشن سنہ ۱۹۵۲ء میں الیزابیت بارینو ( Elizabeth Barino ) نے دو حصوں میں حواشی کے ساتھ Librarie Marcel Didier پیرس سے شائع کیا ہے۔ اور یہی ایڈیشن میرے سامنے ہے۔ اس میں نظموں کے مختلف مخطوطات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

وکٹر اوگو نے ان مشرقی نظموں کے لئے عربی اور فارسی زبانوں کے ماخذ سے کیونکر استفادہ کیا؟ ان نظموں کی فرانسیسی ادب میں کیا اہمیت ہے؟ ان کے شائع ہونے سے مسلمانوں کے مخالف عناصر نے کیا ہنگامہ برپا کیا؟ ان کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے میں اس کتاب میں عرض کروں گا جو فرانسیسی ادب پر مشرقی اثرات کے موضوع پر زیر تصنیف ہے۔ اس موقع پر وکٹر اوگو کی مشرقی نظموں میں سے ایک نظم کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو اس نے غرناطہ (اسپین) پر لکھی ہے۔ وکٹر اوگو نے زندگی کا ابتدائی زمانہ اسپین میں گذارا تھا۔ اس سرزمین سے اس کی بہت سی بچپن کی یادیں وابستہ ہیں۔ جن کا اس نے اپنی اکثر نظموں میں ذکر کیا ہے۔ اسے خصوصیت کے ساتھ اسپین میں مسلمانوں کے تاریخی آثار سے محبت تھی۔

غالباً اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ سنہ ۱۸۸۳ء میں جب مولانا جمال الدین افغانی پیرس گئے تھے تو وکٹر اوگو سے بھی ملے تھے۔ ان کی ملاقات کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے وکٹر اوگو سے پوچھا کہ آپ نے اپنی زندگی میں ایسی کون سی چیز دیکھی جو سب سے زیادہ مکمل، سب سے زیادہ حسین اور سب سے اچھی ہو؟

وکٹر اوگو نے جواب دیا: "گلاب کا پھول!!"[۲]

## غرناطہ

الحمرا! الحمرا!!
ایک محل جسے فرشتوں نے ایک سنہری خواب کی طرح مزین کیا
ایک مضبوط قلعہ جس کے نقش و نگار آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں۔

---

[۱] میں نے ببلیوتک ناسیونال پیرس سے وکٹر اوگو کی بعض نظموں کے مخطوطات (خود وکٹر اوگو کے لکھے ہوئے) کے مائیکروفلم حاصل کر لئے ہیں۔

[۲] یہ واقعہ خود مولانا جمال الدین افغانی نے La Correspondence parisienne کے ڈائرکٹر سے بیان کیا جو اس جریدے کے شمارہ ۲۸ مورخہ ۲۰ رمئی سنہ ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا۔ اس کا حوالہ A. Mehdavi نے اپنی کتاب "Documents inedits concernent Sayyed Jamal ed-Din Afghani" کے صفحات ۶۲-۶۳ پر دیا ہے۔ یہ کتاب تہران یونیورسٹی سے سنہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔ میں نے یہ حوالہ پیرس کے مجلہ 'Orient' پیرس کے شمارہ ۳۵ سنہ ۱۹۶۵ء سے حاصل کیا ہے۔

رات کو چاند کی روشنی اس کے ہزار ستونوں سے چھن کر گذرتی ہے
اور اس کی دیواروں کے نقش و نگار سے کھیلتی ہے

غرناطہ عجائبات کا خزانہ ہے
جن کی تعداد اس کی وادیوں میں بکھرے ہوئے اناروں کے
— دانوں کی تعداد سے زیادہ ہے

غرناطہ کا نام خوب ہے
جب جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے
تو غرناطہ اس کے آتشیں انار سے زیادہ آتش فشانی کرتا ہے
جسے فوج کے ہراول دستے پر پھینکا جاتا ہے۔ [1]

غرناطہ بے مثال ہے
وہاں ہر شام عشاق اپنی محبوباؤں کے جھروکوں کے نیچے
محبت کے گیت گاتے ہیں
اور جب گرمیوں کی شام کو
غرناطہ کی عورتیں باہر سیر کو نکلتی ہیں
اور پھول کھلے ہوتے ہیں
تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے
خود ہوائیں دم بخود ہو گئی ہوں

اس کے اجداد عرب ہیں
صرف اس شہر کی خاطر

---

[1] اس بند میں وکٹر ہیوگو نے لفظ غرناطہ "Grenade" سے فائدہ اٹھایا ہے — فرانسیسی زبان میں 'Grenade' انار (پھل) کو کہتے ہیں۔ اور یہی لفظ Grenade دستی بم کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جس کی وجہ تسمیہ غالباً یہی ہے کہ دستی بم انار سے مشابہ ہوتا ہے۔ اس دستی بم (Grenade) کو فوجی اصطلاح میں "انار" بھی کہتے ہیں۔

مسلمانوں نے طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کیں
اور اس کے لئے ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کی بازی لگادی
مگر اب غرناطہ عیسائیوں کا ہے
غرناطہ اب اُن پر خندہ زن ہے ۔ [۵]

خوبصورت غرناطہ
غرناطہ کا جواب سیوؔل ہی ہوتا
لیکن کیا غرناطہ کا کوئی جواب ہو سکتا ہے ؟

---

[۵] ایلزابیت بارنیونے اپنے نوٹ میں لکھا ہے کہ وکٹر اوگو کا یہ بند ایک مشہور ہسپانوی قصے کا جواب ہے یا اس سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔
شاتو بریاں نے یہ قصہ یوں بیان کیا ہے :

—— ایک دن گھوڑے کی سواری کرتے ہوئے شاہ ژواں ہسپانیہ میں غرناطہ کے پہاڑوں کی طرف نکل گئے ۔ انہوں نے غرناطہ سے کہا :
"اے عروس البلاد! میں اپنا دل تیری نذر کرتا ہوں ۔ میں تجھ سے شادی کروں گا، اور اس کے بعد قرطبہ اور سیوِل بھی تجھے دے دوں گا ۔ میں تجھے خوبصورت لباس اور موتی پیش کروں گا ، جو ہم دونوں کی محبت کی یاد دلاتے رہیں گے ۔"

غرناطہ نے جواب دیا :

"لیون کے شہنشاہ ! میں مسلمان کی ہو چکی ہوں ۔ میری شادی ہو چکی ہے اپنے تحائف اپنے پاس رکھئے ۔ میرے بندھن اور میرے بچے ہی میرے سنگار کے لئے کافی ہیں ۔"

"Chateaubriand :—
Les Aventures
du dernier
Abencerage
صفحات ۴۲ ۔ ۴۳

[۶] سیول بھی اسپین کا ایک مشہور شہر ہے ۔ جس میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے آثار ملتے ہیں ۔

## جوش ملیح آبادی

# رُباعیات

ممکن ہو تو جینے کی اجازت دے دے
ہنسنے کو بھی ذرا فراغت دے دے
معبود جو ہنسنے کو نہیں دیتا وقت
تو خیر سے رونے ہی کی مہلت دے دے

ہر شام بجھے دیئے، جلائے نہ اگر
خوابیدہ جوانی کو جگائے نہ اگر
پیرانہ سری کے دن نہ اس طرح کٹیں
بھیگی راتوں کی یاد آئے نہ اگر

وہ زخم سدا ہو دیئے جاتے ہیں
جو سوزنِ آہ سے سیئے جاتے ہیں
گرتے ہیں دل و جگر پہ گھن کے مانند
وہ خون کے آنسو جو پیئے جاتے ہیں

اب چھاؤں کہیں پائی نہیں جاتی ہے
اُف دھوپ کی دارائی نہیں جاتی ہے
کس ناؤ کے ڈوبنے کی دل پر ہے یہ چوٹ
ساحل کی ہوا کھائی نہیں جاتی ہے

برسی بیل کی پیش کش، قوسِ فلک
باماں کے خطوطِ نم پہ شوخی کی جھلک
بچے ہوتے ہیں لیکن اسے والئے نصیب
ماں باپ کی برسی ہوئی آنکھوں کی دھنک

مخدوم محی الدین

# بلّور

منور خموشی کے بلّور چھنکے
کرن مرمریں فرش پر چھن سے ٹوٹی

کلی چٹکی آواز کے پھول مہکے

رنگوں کی نہروں کی کوئی کہکشاں
کھل کھلاتی ہوئی گود میں آپڑی ہے
خموشی کے گہرے سمندر کی تہہ سے
کسی جل پری نے مجھے جیسے آواز دی ہو
اندھیرے کے پردے ہلے، ساز چونکے
کئی نور کی انگلیاں جگمگائیں
شفق در شفق، رنگ در رنگ
عارض کا حیرت کدہ سامنے ہے
وہ ہنستا ہوا مے کدہ سامنے ہے
دھنک سامنے ہے

کسی کو یہ قصہ سناؤں تو کیسے ؟
قدم اور آگے بڑھاؤں تو کیسے ؟

فارغ بخاری

# سنگِ میل

نہ میں شیشہ گر کہ ٹوٹے دل کے ٹکڑے جوڑ دوں
نہ مسیحا ہوں کہ ٹھٹھری لاش کو جھنجھوڑ دوں
موت کی یخ بستگی کو زندگی کا موڑ دوں

گلستاں میں کس کو موسم کی ہوا آئی ہے راس
کب بھلا جلتے سرابوں سے بجھی ہے دل کی پیاس
آسرا جینے کا رکھتے ہو نہ تم مرنے کی آس

اپنے اپنے خوں چکاں پیراہنوں میں ڈوب کر
ڈھونڈتے ہو تم زمیں پر کہکشاں کی رہگذر
کب تلک جاری رہے گا جھوٹے خوابوں کا سفر

یہ نہ سمجھو زندگی ہے نرم رو پانی کی جھیل
زندہ رہنا ہے تو کچھ پیدا کرو اس کی سبیل
تم اگر پتھر بھی ہو بن کر دکھاؤ سنگِ میل

قمر ہاشمی

# یہ ویت نام آج پوچھتا ہے!

وہ بربریت کی اور شقاوت کی آگ جس میں
زمینِ ویت نام جل رہی ہے
ضمیرِ عالم سے پوچھتی ہے کہ
نارِ نمرود کب بجھے گی؟
یہ شعلوں گولیوں کا یہ وبار کب رکے گا؟
یہ ویت نامی یتیم بچے
جو اپنے ماں باپ کا مقدس وجود کھو کر
یہ پوچھتے ہیں کہ
ہم کہاں جائیں۔ کس کی چھاتی سے لگ کے سوئیں!
کہاں ملیں گی ہمیں پناہیں؟
یہ جنگ کے ہولناک دن یہ سیاہ راتیں
ہماری قسمت کی سولیاں ہیں
پیمبرِ آشتی کہاں ہیں؟

یہ ہوچی منہ کا وطن ہے
جس کے جیالے سینوں میں حریت کے شرر چھپائے ہوئے ہیں
زلفیں دھوئیں سے بارود کے اَٹی ہیں
جو کھیت سونا اُگل رہے تھے
وہاں کٹے ہاتھ اُگ رہے ہیں
وہ کھیتیاں جو ہری بھری تھیں
وہ خونِ آدم کی آبیاری سے لالہ وش ہیں
یہ آگ اور خون کی ہولی کب تک؟
یہ قتل گاہوں میں آدمی کے لہو کی بارش تھمے گی کب تک؟
نہ پھول مہکے، نہ گیت گونجے
نہ امن کا سر بلند پرچم یہاں اٹھا ہے
ضمیرِ عالم کو کیا ہوا ہے؟
یہ ویت نام آج پوچھتا ہے!

## سحر انصاری

# مشرق و مغرب

سوچتا ہوں سازشوں کے عہد میں
جس طرح رسوا ہوئے ہیں میرے خواب
اس طرح رسوا ہوئے ہیں کس کے خواب
چشمِ خواب آلود شب کو کیا کھلی
خواب کی ساری حقیقت کھل گئی

ایک ہیں پھر بھی جُدا ہیں مشرق و مغرب کے خواب
ان دنوں مشرق کا سورج اور ہے مغرب کا اور
اور ان کے درمیاں سہمی ہوئی تاریکیاں
سِسکیاں لیتی ہوئی پرچھائیاں
سہہ رہی ہیں جگنوؤں کی برچھیوں کے تُند وار

مشرق و مغرب کے دسترخوان پر
بٹ چکا آنکھوں میں صبحِ آرزو کا انتظار
کس سے پوچھیں کون سی اچھی ہے بھوک
اَن گنت بھوکوں کی بھوک
یا شکم سیروں کی بھوک

مشرق و مغرب کے دسترخوان پر
دو صفیں گردن جھکائے سوچتی ہیں
کون سی اچھی ہے بھوک ؟

بھُوک کی سفاک ضربوں کے تلے
کہہ رہی ہیں اب بھی کچھ ٹوٹے دلوں کی دَھڑکنیں
ریزہ ریزہ خواب ابھی آنکھوں میں ہیں
ریزہ ریزہ خواب اب تک آشنا راہوں میں ہیں
چند لمحوں بعد اندھی آندھیوں کے دوش پر
دشت کے سوکھے ہوئے پتوں کے ساتھ
اُڑ نہ جائیں ریزہ ریزہ خواب بھی
چُن سکو تو اپنی پلکوں سے انہیں چُن لو ابھی
سُن سکو تو اپنے دل کی دھڑکنیں سُن لو ابھی

○

شبنم رومانی

# آوازوں کا سمندر

ایک سمندر آوازوں کا
گھٹتی لہریں، بڑھتی لہریں
لہروں پر اک ننھی کشتی
کشتی میں اک مست کھویّا
بنسی کو ہونٹوں سے لگائے
بند آنکھوں میں پیار بسائے
اپنی تانوں کی لہروں پر
ڈول رہا ہے ہولے ہولے

یہ مستی میں ڈوبی ہستی
یہ متوالا مست کھویّا
جس کے ہونٹوں میں بنسی ہے
(بنسی جو پتوار ہے شاید)
ننھی کشتی ڈول رہی ہے
مَست کھویّا جھوم رہا ہے
بنسی کا منہ چوم رہا ہے

آوازوں کا ایک سمندر
کچھ آوازیں —
"چاند نگر کے رہنے والے اس دھرتی کو ڈھونڈ رہے ہیں"
"عشق کا مصنوعی سیارہ چاند کے چکّر کاٹ رہا ہے"
"درد کا سُورج اب چمکے گا —"

"کرۂ حُسن بکھر جائے گا —
"ہستی ہے اک خوف کی حالت"
"ہستی ہے اک کرب کا عالم"
"سچ کی گنگا —
جھوٹ کی جمنا —
— وقت ہے ان دونوں کا سنگم!"

آوازیں — وحشی آوازیں
آوازیں — خونی آوازیں
اور ان آوازوں کے "بھنور" میں
تیز بھنور میں —
ننھی کشتی ناچ رہی ہے
کس تیزی سے ناچ رہی ہے
مست کھویا جھوم رہا ہے
کس مستی سے جھوم رہا ہے

آوازوں کا تیز سمندر
بنسی میں نغموں کا ساگر
دیکھیں — کون ڈبوئے کس کو؟

بنسی میں جذبات کا رَس ہے
اور سمندر — سیلِ ہوس ہے

طلعت اشارت

# سالِ نو! مبارکباد

رخصت اے سالِ کہنہ۔ رخصت یاد!
سالِ نو! سالِ نو! مبارکباد!

اک خلش آفریں امید کے ساتھ
زندگی کا ہوا عدم سے ورود
یہ برس لے چکا ہے اپنا سود
پھر نئی شرحِ آرزو پہ صاد
سالِ نو! سالِ نو! مبارکباد!

ظلمتِ شب سے دَم اُلٹتا ہے
ساعتوں کے چراغ ہی ڈھالو
دل کو خوش فہمیوں سے بہلا لو
کیوں خلوصِ فریب ہو ناشاد؟
سالِ نو! سالِ نو! مبارکباد!

سالِ خوردہ ؛ جواں ؛ مٹی ؛ ہستی
کربِ تخلیقِ مستقل کا شکار
شورِ گریہ کہ رقص کی جھنکار!
یہ تفاوت ہے زیست کی بنیاد
سالِ نو! سالِ نو! مبارکباد!

ماضی و حال کے دو راہے پر
آنے والے دنوں کے سائے میں
نشترِ غم چھپا کے کھائے میں
ساحرِ وقت لے رہا ہے داد!
سالِ نو! سالِ نو! مبارکباد!

مسعود زیدی

# سوچا ہے کس نے انجام

اب جو تم اِس کوسٹے پر کہتی ہو مجھ کو پہچانو
کچھ بھی یاد نہیں آتا ، دیکھا ہے کہاں پہلے تم کو

اپنے گاؤں کی پگڈنڈی پر، چوپالوں یا جھیلوں پر
پنگھٹ پر یا ندی کنارے باغوں میں یا ٹیلوں پر
میدانوں میں گائے چراتے یا بچپن کے کھیلوں میں
یا سولہ سنگھار کئے ان رنگ برنگے میلوں میں
یا کھیتوں میں تان اُڑاتے " ہوری ہوری " کی
کچھ بھی یاد نہیں آتا دیکھا ہے کہاں پہلے تم کو

یادوں میں باقی ہیں اب تک وہ بھیگی بھیگی شامیں
جب اک گوری جاتی تھی مندر لے کر ارمانوں کے پھول
اور واپس آتی تھی لے کر "شوجی" کے چرنوں کی دھول
من میں اس کے پریم کنول تھے آنکھوں میں آشا کے دیئے
"شوجی" سب کچھ دیکھ رہے تھے اپنی آنکھیں بند کئے

پھر اک دن جانے کیوں - اُس کی آنکھ میں آنسو تیر گئے
مرجھائیں آشا کی کلیاں، پریم کنول بھی مرجھائے
جانے کس بستی کو چل دی روٹھ کے اپنے بھگون سے
روٹھ کے چل دی کھیتوں سے باغوں جھیلوں سے مدھوبن سے
سُوکھ گیا تلسی کا پودا بند ہوئے مندر کے دوار
سوکھ گئے "شو" کی مورت پر پھولوں کے وہ ہار سنگار

جانے اب کس حال میں ہے وہ سوچا ہے کس نے انجام
برکھا رت اب بھی آتی ہے لے کر بھیگی بھیگی شام
لیکن کوئی نہیں آتا ہے مندر میں اب پھول لئے
کوئی نہیں ہے جو اب آکر روشن کر دے بجھے دیئے

اب جو تم اِس کوسٹے پر کہتی ہو مجھ کو پہچانو
جانے کیوں یاد آتی ہے وہ برکھا رُت وہ بھیگی شام
اور تو کچھ بھی یاد نہیں ہے کون ہو تم اور کیا ہے نام

O

وقار عزیز

# شکست

پرانے کاغذوں کے ڈھیر میں پرانے واقعات کی اُداس یاد ہے

کاغذوں کی زرد کانپتی تہوں میں نفرتوں کی راکھ ہے

بناوٹوں کی جھلکیاں عداوتوں کی رات ہے

کہیں کہیں کسی لکیر پہ سلگتے دل پگھلتے آنسوؤں کی بات ہے

کہیں اُمڈتے پیار سے لرزتی انگلیوں کی لغزشوں کے مدھ بھرے نقوش ہیں

خطوں کا اک ہجوم ہے

طویل اور مختصر

کہیں کسی کا حکم ہے کہیں کسی کی التجا

انہیں خطوں میں قہقہے انہیں خطوں میں سسکیاں

پُرانے کاغذوں کے بے کراں ہجوم میں

گئے سمے کی یاد ہے

گئے سمے سے مجھ کو ایسا پیار بھی نہیں

مگر نجانے کیوں خطوں کو پھاڑنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں!

رب نواز مائل

# انقلاباتِ زمانہ

کاروانِ عمر! رُکنا تو ذرا ہم دیکھ لیں
اپنے پیچھے زندگی کے ہمہمے اور قہقہے
ایک وہ شہرِ تمنا، جس کی عذرائیں جواں
ایک اپنا سرو دیراں گھر، جہاں کچھ دن رہے
ایک وہ کھلتے جھروکے، جھانکتے کھلتے گلاب
ایک دل، جس کے لئے دنیا کے سارے غم سہے
ہر گھڑی ہے اک تمنا، وہ مرے، ہم اُن کے ہوں
ہر گھڑی بس ایک ہی خواہش کہ دل نغمے کہے

شاہراہِ وقت پر بکھرا ہے شیرازہ تمام
اور آگے راہ میں حائل ہے اک کوہِ گراں
رُک گیا ہے عمر کی اس حد پہ رہوارِ حیات
اب مسرت کی بہاریں اپنی قسمت میں کہاں
دھند میں لپٹا ہوا، چھپتا ہوا، نظروں سے گم
آہ! وہ شہرِ تمنا دے رہا ہے اب دھواں
بال چاندی کی طرح ہونے لگے اپنے سفید
جسم پر گرنے کو ہے دم بھر میں نیلا آسماں

اقبال متین

# ایک طوفان دو بوندیں

میں کلنور کے ناظر کی کہانی آپ کو سنانا چاہتا ہوں ۔ تو مجھے یادوں کے دفینے کرید کرید کر اپنا بچپن ڈھونڈھ لانا پڑے گا، تاکہ اس کو جھاڑ جھٹک کر میں آپ کے آگے پیش کرنے کے قابل بناؤں۔

کلنور کا ناظر اور میرا بچپن قریب قریب ساتھ ساتھ مرگئے ہیں ۔ اور اس کے بعد تجربات کی بھٹی میں تپ تپ کر میرا وجود ایک سرخ لوہے کی مانند ہو گیا ہے کہ ہر کومل سی نرم و نازک سی شے اس سے مس ہو کر جل اٹھتی ہے ۔ تب ہی تو میرے لئے یہ مصیبت آپڑی ہے کہ میں اپنے بچپن کو جھاڑ جھٹک کر نکھاروں سنواروں بھی اور اپنے وجود کے شعلوں سے اسے جھلسنے بھی نہ دوں ۔

آیئے میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ میرے بچپن پر میری اس جوانی کا کوئی سایہ نہ پڑے ۔

اوکالیاں برس رہی تھیں اور اب کے برس ان کا انداز بڑا طوفانی سا تھا ۔ اوکالی تو اس طرح برستی ہے جیسے کوئی لٹیرا کسی خوشی کی تقریب کے موقع پر یکایک نازل ہو کر دھائیں دھائیں بندوقیں داغ دیتا ہے، اور ساری محفل بکھر کر رہ جاتی ہے اور وہ مال و متاع لے کر فرار ہو جاتا ہے۔ لیکن اب کے برس اوکالیاں جیسے ہمارے ضلع کو تاراج کرنے پر تلی ہوئی تھیں ۔ ایک دن نہیں گذرتا کہ وہ پھر حملہ آور ہوتیں، اتنی بجلیاں، اتنے کڑاکے اُن کے ساتھ ہوتے کہ ضلع بھر کے گھر کانپ کانپ جاتے اور ساری بستی جیسے پانی کی چادر اوڑھ لیتی۔

ایسے میں کلنور کا ناظر ہم بچوں کو ایک کمرے میں لئے ہماری دلچسپی کا سامان بنا رہتا ۔ ہم گھبرا رہے ہوں تو ہمیں لطیفے سنا کر ہنساتا ۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں کوئی بارہ برس کا تھا ۔ لیکن اس رات قرآن کی ایک آیت ہم بچوں کے وردِ زبان ہو کر رہ گئی تھی، جو بجلیوں کے کڑاکے کے وقت خاص طور پر پڑھی جاتی تھی ۔ اور کلنور کا ناظر بھی منہ ہی منہ میں یہی گنگناتا جھوم رہا تھا ۔ کبھی کبھی وہ اپنی آنکھیں بھی بند کر لیتا ۔ لیکن شاید ہمارے خیال سے پھر اس کی آنکھیں بغیر آواز کے پٹ سے کھل جاتیں کہ ہم بچے یہ محسوس نہ کریں کہ وہ ذہنی طور پر ہم سے جدا ہو گیا ہے ۔ اس کے اس تیزی سے آنکھیں بند کر لینے اور جھک کر یکایک کھول دینے میں اس کی اضطراری کیفیت کا پتہ چلتا تھا ۔ ورنہ آنکھیں بجلی کے بلب کی طرح نہ کھلتی ہیں نہ بند ہوتی ہیں ۔ وہ تو دریچوں کی طرح وا ہوتی ہیں اور کواڑوں کی طرح بند ہوتی ہیں ۔

ابا ضلع کے حاکم اعلیٰ تھے اور وہ ان دنوں دورے پر تھے ۔ کلنور کا ناظر جسے سب ناظر صاحب پکارتے تھے ہمارا اتالیق

تھا اور ابا کا مصاحب۔ عجیب میاں قسم کا مرنجاں مرنج آدمی تھا۔ دوہری ہڈی کا بھاری بھرکم انسان، خوش مذاق، خوش مزاج، خوش خوراک، ہماری دیکھ بھال اور ابا کی خوشنودی اُس کا فرض اولین تھا۔ ہم نے فارسی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم اسی سے حاصل کی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ ابتدائی تعلیم انتہا کو آج تک نہ پہونچ سکی۔ لیکن کلمنور کے ناظر کا ہماری اس نیم حکیمی سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس نے تو جو کچھ علم اپنے پاس تھا ہمیں بچپن ہی میں گھول کر پلا دینا چاہا۔ اور بقول کسے بنیاد مضبوط ہونی چاہیئے، عمارت کا کیا ہے، اور اسی مضبوط بنیاد پر ہم آج تک ایک پاؤں پر کھڑے اینٹھتے رہتے ہیں۔ عمارت کی ہمیں خبر نہیں۔

ناظر صاحب جہاں ہم بچوں میں بہت مقبول تھے، ابا بھی انہیں اتنا ہی پسند کرتے تھے۔ ناظر صاحب کا شام کا وقت جب ہم کھلے میدان میں یا چمن میں کھیل رہے ہوتے ابا کے ساتھ گذرتا تھا۔ ہم لوگ قریب ہی کہیں ہوتے تو اس تھوڑے سے وقت میں جو ناظر صاحب ابا کے ساتھ گذار رہے ہوتے ہم اُن کے فلک شگاف قہقہے سن کر چمن کے اسی درمیانی حصہ کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے جہاں ابا اور ان کے دوست احباب بیٹھے رہتے۔ ہمارے لئے دلچسپی کا باعث صرف ناظر صاحب کا یہ فلک شگاف قہقہہ ہوتا تھا، جو ہمیں کھیل کود کے دوران بھی چونکا دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔ ہم جان جاتے کہ ناظر صاحب نے ابا سے کوئی دلچسپ مذاق کیا ہے، اور یہ قہقہہ اسی خوشگوار حادثے کا اعلان ہے۔

ہوتا یوں تھا کہ جب ابا کے احباب جمع ہوتے اور ان کی چائے یا ٹھنڈائی سے تواضع کی جاتی تو کبھی کبھی ابا بطور خاص اس کو ہدایت کر دیتے کہ ناظر صاحب کے لئے خصوصی تیاریاں کی جائیں، اور تقسیم کے وقت نہایت احتیاط برتی جائے، تاکہ اُن کا پیالہ یا گلاس کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ پہونچ جائے ——— اب امی کیری کے افشردے میں باریک پسی ہوئی مرچ ملا دیتیں، یا چائے میں پسی ہوئی سرخ مرچ۔ پیشی کا ملازم بندو خاں اس راز سے واقف ہوتا، اور اُسی کے ذمے تقسیم کا فرض بھی ہوتا، اور وہ اس خوبی سے اپنے اس فرض کی تکمیل کرتا کہ ناظر صاحب کے ہاتھ میں وہی سقراط کا پیالہ ہوتا جو ہونا چاہیئے تھا۔ پہلے تو ایسا ہوا کہ ناظر صاحب نے آدھی چائے پی لی۔ اپنے چہرے سے کسی ناگواری کا احساس نہ ہونے دیا۔ ابا کے دوست احباب انہیں دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں محظوظ ہوتے رہے۔

لوگوں نے چائے کی تعریف کی تو ناظر صاحب نے بھی کی۔

اس پر ابا نے اصرار کیا کہ اور لیجئے۔

ناظر صاحب نے وہی پیالی کہاں پی تھی۔ بدقت تمام چار چھ گھونٹ لے کر دکھاوے کے لئے چسکیاں لے رہے تھے۔ جب ملازم نے خالی پیالیاں سمیٹ لیں تو ابا اور ان کے دوست احباب نے ناظر صاحب کی پیالی کو دیکھا۔ جو آدھی سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔

ابا نے اصرار کیا کہ "پسند نہ آئی ہو تو کہہ دیجئے میں دوسری منگوا دوں"۔

ناظر صاحب جز بز ہوتے رہے۔ کہنے لگے "جی۔ جی بہت اچھی ہے ——— لیکن ———"

"لیکن ویکن کچھ نہیں ——— پسند ہے تو پھر پینی پڑے گی ———"

سب نے اصرار کیا ——— اور ناظر کلمنوری نے ایک اور گھونٹ حلق سے جلدی جلدی اُتارنے کی کوشش میں منہ بنایا،

لیکن نگل نہ سکے، تو سب بے اختیار ہنس پڑے۔

جب اصل بات ناظر صاحب کی سمجھ میں آئی تو ان کا قہقہہ ساری فضا میں پھیل گیا۔

چق سے لگی امی بھی کھڑی تھیں — ہنس پڑیں۔

اس کے بعد ناظر صاحب نے ایک نہیں دو پیالیاں منگوائیں جن میں لبالب ملائی بھری ہوئی تھی۔

ایک دن تو کلنوری کے اس ناظر نے کمال ہی کر دیا۔ کیری کا افشردہ جس میں ہری مرچ باریک پیس کر ملائی گئی تھی، اس قدر اطمینان سے پی گیا کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ سب نے یہ سمجھا کہ آج ناظر صاحب کے لئے کوئی اہتمام نہیں کیا جا سکا ہے جس کا تذکرہ ابا نے پہلے ہی احباب سے کر رکھا تھا —

"بندو خاں میں گلاس کی طرف اشارہ کر دے، اُسے کوئی چھوئے ہی نہیں۔"

سبھوں نے احتیاط برتی، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اور ناظر صاحب اطمینان سے ہونٹ چاٹتے بیٹھے رہے۔ خالی گلاس لے جانے کے لئے جب ملازم آیا تو ناظر صاحب نے کہا کہ میاں اب اصل شربت کے دو گلاس لا دینا۔

سب نے پوچھا تو کیا وہ اصلی شربت نہ تھا جو آپ نے ابھی ابھی پیا ہے؟

تو ناظر صاحب نے اپنا فرمائشی قہقہہ فضا میں بکھیر دیا۔ کہنے لگے وہ تو کیری کی سیال چٹنی تھی، جو میں نے اس تحمل سے اس لئے پی لی کہ آپ لوگوں کو ہنسنے کا موقع ہی نہ دوں۔ ان کی اس زندہ دلی کی سبھی نے داد دی، اور ابا نے ہار مان لی کہ بھئی آج تم جیتے اور میں ہارا۔

ناظر صاحب بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ ابا سے ان کی اس قدر بے تکلفی کے باوجود کبھی ہم بچوں کی جرأت نہ ہوتی جو اُن سے ایسا کوئی ناشائستہ مذاق کرتے جو آداب اور تمیز کے خلاف ہوتا۔ وہ ہم سب سے بڑی شفقت اور پیار سے پیش آتے۔ بڑی دل دہی سے ہمیں پڑھاتے، اور یہ ساری پڑھائی وڑھائی بڑی دوستانہ فضا میں اس طرح ہوتی کہ ہمیں بوریت کا کبھی احساس نہ ہوتا۔ پیشی کے بندو خاں اور ناظر صاحب میں بڑی گھلتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بندو خاں اندرون خانہ سارے نظم و نسق کے ذمہ دار تھے۔ ناظر صاحب بھی بحیثیت اتالیق چونکہ گھر ہی کے ایک فرد ہو گئے تھے۔ اس لئے انہیں بندو خاں کی اہمیت کا اندازہ تھا۔

ادھر بندو خاں کا یہ حال تھا کہ وہ ناظر صاحب کی قابلیت اور علمیت کے بڑے معترف تھے۔ گٹھیلے بدن کے یہ بندو خاں جب ہمارے گھر میں پہلے پہل ملازم ہوئے تھے تو بڑے گاودی قسم کے پھکڑ آدمی تھے۔ ان کے اوصاف نے ابا اور امی کے دلوں پر جو نقوش ثبت کئے تھے، وہ زیادہ تر ان کی مثالی دیانت داری کا سبب تھے — بڑے سے گھیردار شلے، سفید کرتے اور سفید دھوتی میں ملبوس بندو خاں کو رہن سہن کے آداب اور بات چیت کی تمیز تو دیر آتے آتے آئی۔ لیکن کچھ ہی دنوں میں انہوں نے اپنی ایمانداری کے بوتے پر گھر کی ساری چابیوں پر قبضہ کر لیا — باورچی کو غلہ بندو خاں ہی دیتے۔ چپراسیوں سے سودا سلف بندو خاں ہی منگواتے۔ دھوبن کو کپڑے لے جانے کا حساب بندو خاں ہی کو بتلانا ہوتا۔ گوالا بھینس لے کر صبح و شام دروازے پر آتا تو دودھ دھونے کے لئے بندو خاں کا ہی منتظر رہتا — اور بندو خاں پلے سے رجسٹر میں ہر شے کا حساب لکھتے

اس قدر نفاست سے لکھ رکھتے جیسے ابا یا امی اس کی آڈٹ کرنے والے ہوں۔ ویسے بندو خاں کو اس بات کا علم تھا کہ ان پر اس حد تک اُن کے مالکوں کا بھروسہ ہے کہ حساب کتاب بتلانے کا کوئی سوال ہی نہیں، لیکن اُن کی اپنی دل کی دنیا اُن کے اپنے ایمان کی روشنی سے جو منور ہو جاتی۔ اور یہی نور تو بندو خاں کی زندگی کا نور تھا۔

بندو خاں کا خط بڑا پختہ اور بہت ہی خوب صورت تھا۔ ابا نے جب پہلی بار ان کی تحریر دیکھی تو بڑے متعجب ہوئے سامنے لکھوا کر یقین کیا تو ہر قریبی دوست کے آگے ذکر کیا ـــــ ابا کی زبانی اپنی تعریف و توصیف سن کر بندو خاں پھولے نہ سماتے۔ اپنے خط پر ان کو بھی بڑا ناز تھا، لیکن اب تو ان میں ایک ایسی خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی جو اتنے بڑے گھر کا نظم و نسق چلانے کے لئے شاید ضروری تھا۔

ناظر صاحب سے بندو خاں کی یگانگت کا بھی ایک سبب تھا کہ بندو خاں ان کی علمیت کے معترف تھے تو وہ بندو خاں کی خوش نویسی کے مداح۔ فارسی اور اردو شاعروں کے بے شمار پسندیدہ اشعار جو ناظر صاحب کی بوسیدہ بیاض میں محفوظ تھے وہ انہیں ایک نئی بیاض میں بندو خاں سے نقل کروا رہے تھے۔ گھر کے کام کاج سے فراغت پا کر راتوں کو بندو خاں بڑے انہماک سے یہ کام کرتے رہتے۔ اور اسی کام کے دوران میں وہ آہستہ آہستہ ناظر صاحب کی قابلیت کے دل ہی دل میں معترف ہوتے گئے، کیونکہ بیاض میں لکھے اکثر شعر ان کی سمجھ میں نہ آتے جنہیں وہ من و عن نقل کر لیتے۔

ناظر صاحب ناشتے سے فراغت پا کر ہمارے گھر چلے آتے، پھر اپنے گھر لوٹتے لوٹتے انہیں رات کے دس بھی بج جاتے، گیارہ بھی ـــــ ہم ان دنوں اسکول نہیں جاتے تھے ـــــ ناظر صاحب ہی ان دنوں ہماری دیکھ بھال کرتے، اور تعلیم و تربیت کا فرض پورا کرتے ـــــ ایک بڑے سے کمرے کے نصف حصے میں قطار سے پلنگ بچھے تھے۔ شام کے پانچ بجے تک ہمیں اپنی اسی دنیا میں سانس لینا ہوتا۔ پانچ بجے ہمیں باہر نکلنے کی اجازت تھی جس کے ہم دن کے تین بجے ہی سے بے چینی سے منتظر رہتے۔

قریب قریب سارا دن کلثوم کے یہ ناظر صاحب ہمارے دل و دماغ پر سوار رہتے۔ ان کے پڑھانے کا سلسلہ تین تین گھنٹے تک چلتا۔ یہ تین گھنٹے ہمارے لئے دوبھر نہ ہوتے۔ فارسی اور اردو پر ناظر صاحب بہت توجہ دیتے۔ سبق آموز اور نصیحت آمیز کہانیاں بڑے مزے لے لے کر اس طرح سناتے جیسے وہ خود اس کے ہیرو ہوں۔ پھر یہی کہانیاں ہمیں دہرانی پڑتیں اور نصیحت کا جو پہلو ان میں پوشیدہ ہوتا وہ ناظر صاحب کو بتلانا ہوتا ـــــ اور یہ اہم بات ہم سب چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر لکھ کر ناظر صاحب کے آگے پیش کر دیتے ـــــ ناظر صاحب ان پرچیوں کو دیکھ کر نمبر دے دیتے اور نمبروں کے اعلان کے بعد اس دن کی حکومت زیادہ نمبر حاصل کرنے والے بچے کو سونپ دی جاتی۔ ناظر صاحب پرچیوں کی جانچ کرتے وقت بچے کی عمر اور اس کی علمی استطاعت کے پیش نظر بڑے فراخ دل ہو جاتے۔

اردو فارسی کے سلیس اشعار وہ ہمیں یاد کراتے۔ پھر بیت بازی کے مقابلے ہوتے۔ جو ٹیم جیتی ہوئی ہوتی، اس میں بھی جس نے سب سے زیادہ شعر سنا دیئے وہی اس دن کا صدر چنا جاتا جس کو 'شاہ امروز' کا نام دیا جاتا۔ جیتنے والی لڑکی ہوتی تو وہ 'ملکۂ امروز' بنتی۔ اور اس کا اعزاز یہ ہوتا کہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں سات چاکلیٹ اس کو زیادہ دیئے جاتے۔

ناظر صاحب ہمیں انگریزی بھی پڑھاتے تھے لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مجبوراً وہ اس زبان سے نباہ کر رہے ہوں

شاہِ امروز کو ابا کنگ آف دی ڈے ( King of the day ) پکارتے، اور ملکہ کو ( Queen of the day ) ۔ شام کو جب ہم بن سنور کر تفریح کے لئے نکل رہے ہوتے تو شاہِ امروز یا ملکۂ امروز کا ابا اور امی سے تعارف کرایا جاتا ۔ لیکن ابا نہ کبھی شاہ کو شاہ کہتے اور نہ ملکہ کو ملکہ ۔ وہ ہمیشہ King اور Queen ہی کے الفاظ استعمال کرتے ۔

ابا انگریزی زبان کے بڑے رسیا تھے ۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ ان کے بچے گٹ پٹ کریں ۔ وہ ناظر صاحب کو تاکید کرتے کہ وہ زیادہ تر ہم بچوں سے انگریزی ہی میں بات چیت کریں ۔ ناظر صاحب طوعاً و کرہاً ادھر رجوع ہوتے تو ایسی بوجھل سی اکتا دینے والی فضا بن جاتی کہ ہم لوگ اس پابندی کے خلاف احتجاجاً بات ہی نہ کرتے ۔ سچ پوچھئے تو بات کرنا بس میں نہ ہوتا ، لہٰذا کچھ دیر تک خاموشی کا راج رہتا جس کو توڑنے کے لئے ناظر صاحب انگریزی میں ہر ایک کو مخاطب کرتے اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہی زبان ہماری محبتوں کا وسیلہ بن جاتی جس میں ہم نے تتلانا سیکھا تھا ۔

اسکول بھجوانے سے ابا اس لئے اجتناب کرتے کہ ہمارا عام لڑکوں سے ملنا جلنا انہیں گوارا نہ تھا ۔ ابا نہ صرف ضلع کے حاکمِ اعلیٰ تھے بلکہ حکومت کے سربرآوردہ امرا کے خاندان سے تھے ۔ زندگی کو انہوں نے ہمیشہ بلندی سے دیکھا تھا ۔ اتنی بلندی سے کہ زمین کے پہاڑ بھی انہیں چھوٹے نظر آتے تھے ۔ —— یہ اندازِ نظر انہیں ورثے میں ملا تھا —— بھلا ایسے میں ہمارا عام بچوں سے ملنے جلنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ اسی لئے اسکول کا سارا نصاب ہمیں گھر ہی پر پڑھایا جاتا ۔

ایک دن تعلیمی تاش میں زیادہ نمبر حاصل کر کے حُسنہ ملکۂ امروز بن گئی تھی ۔ اس دن مروجہ اصولوں اور قاعدہ کے مطابق منٹ بھر کے لئے اپنے کمرے سے باہر نکلنے کو بھی ہمیں حُسنہ کی اجازت لینی پڑتی —— سارے بچوں پر غنودگی طاری تھی —— حُسنہ جو میری بنتِ عم اور ملکۂ امروز تھی وہ جاگ رہی تھی ۔ اُس کے دونوں بھائی اپنے اپنے بستروں پر پڑے تھے ، چھوٹا تو واقعی سو گیا تھا —— بڑا یہ باور کرانے کی سعی کر رہا تھا کہ وہ سو گیا ہے ۔ ناظر صاحب آرام کرسی پر دراز اونگھ رہے تھے ۔ ہم لوگوں نے سن رکھا تھا کہ جب ہم لوگ سو جاتے ہیں تو اکثر و بیشتر ناظر صاحب چھپ کر قریبی کسی مکان میں ہو آتے ہیں ۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ایسے میں بندو خاں باہر کے احاطے میں مشرقی گیٹ کے قریب ہری ہری باڑھ کے پہلو میں چھپے ناظر صاحب کا انتظار کرتے رہتے ہیں ۔ اور جب ناظر صاحب ان کے برابر پہونچ جاتے ہیں تو وہ چھپاک سے کوئی سٹّہ ان کو دے دیتے ہیں جسے چھپا کر ناظر صاحب روانہ ہو جاتے ہیں —— ہمیں یہ بات مومن بی نے بتلائی تھی اور نبی چپراسی نے اس کی تائید کی تھی ۔

نبی چپراسی اور مومن بی کی ایک علیحدہ تاریخ ہے ۔ بلکہ ذرا غور سے دیکھا جائے تو صرف مومن بی کی ایک علیحدہ تاریخ ہے ، اور نبی صاحب تو صرف تاریخ کا ایک باب ہیں ۔ مومن بی بالکل سیاہ رنگ کا ایک ایسا چمکدار کوئلا تھیں کہ دھوپ کی کرن پڑنے سے اس کوئلے میں رنگ روپ کی جو دنیا چھپی رہتی ہے وہ سطح پر ابھر آتی ہے —— دھوپ کی اس کرن کی طرح ہر نوجوان چپراسی ، پہرہ دار ، اردلی اور گھڑ سوار نے پہلی نظر پھینک کر ہی روپ کی وہ چھایا مومن بی کے انگ انگ پر دیکھی کہ سارے ضلع میں ان کی شہرت پھیل گئی ۔ مومن بی کا طوفانی شباب تھا تو انہوں نے بڑھ کر نبی صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ بس اس وقت سے نبی صاحب مرتے دم تک خاموشی سے خدمت انجام دیتے رہے تھے ۔

مومن بی چچی اماں کی باندی تھیں ۔ بندو خاں کو رجھانے کی ساری عشوہ طرازیاں بے کار ثابت ہوئیں تو وہ ان کی مخالف

ہو بیٹھیں ـــــــ بندو خاں کو دھکا پہونچانا بے چاری مومن بی کے بس میں تو تھا نہیں، بس جو کچھ تھا سو اُن کے نازنخروں کے بس میں تھا ـــــــ جب وہ انہیں اس جادو سے بھی رام نہ کرسکیں تو انتقامی جذبے کے تحت اندر اندر سلگتی رہیں ـــــــ لیکن بندو خاں کے خلاف کھلے بندوں آواز اُٹھانے کی ان میں ہمت نہ تھی۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے پیمانے پر ہم بچوں کے کان بھرنے شروع کردیئے۔

پہلی بات جو بندو خاں کے بارے میں ہمیں بتائی گئی تھی وہ یہی تھی کہ بندو خاں اور ناظر صاحب آپس میں مل جل کر آہستہ آہستہ گھر کا سامان پار کررہے ہیں، اور اس طرح ہمارا گھر اُجاڑ کر وہ اپنا اپنا گھر بسانے کی فکر میں ہیں۔

ناظر صاحب کے مزاج کا ایک پہلو ایسا بھی تھا جو غور کرنے پر بھی سمجھ میں نہ آتا ـــــــ اچھی اچھی باتیں کرتے کرتے لطائف اور چٹکلے بیان کرتے کرتے کبھی کبھی وہ یک لخت مٹی کے پتلے کی طرح خاموش ہوجاتے۔ ہماری محفل میں رہ کر بھی گویا ہماری محفل میں نہ رہتے۔ یوں لگتا جیسے کسی یاد آنے والے کو بھلا رہے ہوں۔

آج حُسنہ 'ملکۂ امروز' تھی تو اس نے پہلے تو مٹ مٹ ناظر صاحب کی طرف شریر نظروں سے دیکھا جو غنودگی کے عالم میں آرام کرسی پہ دراز تھے۔ پھر اُس نے نظروں ہی نظروں میں مجھے اپنے قریب بلایا۔

"بھیا" اُس نے کہا۔ "آج دیکھتے ہیں کہ ناظر صاحب کہاں جاتے ہیں۔"

میں نے بھی دلچسپی لی ـــــ واقعی آج یہی مہم سر کریں کیونکہ ملکۂ امروز بھی اپنے ساتھ ہے۔ میں نے سوچا۔

لیکن ناظر صاحب اپنی کرسی پر سے جیسے اچھل پڑے ـــــــ کسی نے برف کا ٹھنڈا پانی جیسے چھپاک سے اُن کے منہ پر دے مارا ہو ـــــــ انہوں نے سامنے لگی گھڑی پر اس طرح نظر ڈالی جیسے ٹرین چھوٹی جارہی ہو ـــــــ اور ہم سے کہنے لگے، ہم فوری سوجائیں۔ حُسنہ کو بھی انہوں نے تنبیہہ کی ـــ کہا کہ آج ملکہ ہوکر تم نے نہ انہیں وقت پر سوجانے کا حکم دیا نہ خود بستر پہ گئیں۔

حُسنہ اور میں اپنے اپنے بستروں پر کھاگے اور دھڑام سے گر کر بس منٹ بھر میں یوں بے سُدھ ہوگئے جیسے آنکھ لگے دیر ہوئی ہو۔

ہم نے دیکھا۔ ناظر صاحب چوروں کی طرح ہال میں ٹہلتے رہے۔ دو منٹ میں تین بار انہوں نے گھڑی دیکھی۔ پھر ہم لوگوں کی طرف اس طرح دیکھا جیسے سوئے ہوؤں پر چادر اُڑھا رہے ہوں، اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم لوگ سوئے نہیں ہیں، وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ اور احتیاط سے پردہ برابر کردیا۔

حُسنہ بجلی کی سرعت سے اٹھ بیٹھی۔

میں نے کہا: "پگلی لیٹ جا۔ ہوسکتا ہے وہ پردے کی اوٹ سے ہمیں دیکھیں۔"

"دیکھا جائے گا" ـــــــ حُسنہ نے تن کر کہا ـــــــ "مگر بھیا، ذرا تمیز سے بات کرو نا۔ تم ملکہ سے بات کررہے ہو۔"

میں نے اپنی غلطی تسلیم کی ـــ آج اُس سے مل کر رہنے ہی میں عافیت تھی۔

"معاف کردو ملکہ ـــ" میں نے کہا۔

"کرتے ہیں ـــ" اُس نے اختصار سے کام لیا ـــ بالکل شہزادیوں کا سا انداز تھا اس کا۔

کیا یاد کرے گی ۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا ـــ سہہ لیں گے اس کی اکڑفوں آج ۔

جب ہمیں یقین ہو گیا کہ ناظر صاحب جا چکے ہیں ، تو میں نے منہ سے پوچھا ،

"کیا حکم ہے ملکۂ امروز ؟"

پلنگ سے اُترتے ہوئے اُس نے کہا ـــ "چلتے ہیں" ـــ اور بڑی تمکنت سے پردے تک آ کر رک گئی ـــ پھر ٹھٹک کر مجھے بُلا لیا۔

"بھیا ، مجھے تو ڈر لگ رہا ہے ـــ پہلے تم جا کر ذرا دیکھ آؤ تاکہ سب بڑے لوگ کہاں ہیں ـــ سونے کے وقت گھومتے ہوئے پکڑے گئے تو پٹائی ہو گی ۔"

"اور اگر میں پکڑا گیا تو ؟"

"تمہارا کیا ہے ـــ تم عام آدمی ہو ـــ میں تو ملکہ ہوں نا ۔"

"باپ رے ـــ یہ بات ہے ـــ" میری زبان سے نکلا ۔

"ہاں ہاں ! بالکل یہی بات ہے" ـــ وہ تنک کر بولی ـــ "وقت پڑے تو تمہیں چھڑا بھی سکتی ہوں ۔ تمہاری سفارش کر سکتی ہوں ۔ کہہ سکتی ہوں کہ میں نے کام سے بھیجا تھا ۔"

میں نے اس کی بات کی اہمیت کو محسوس کیا ـــ واقعی آج وہ یہ سب کچھ کر سکتی تھی ـــ آج وہ ایک صاحبِ اقتدار ہستی تھی ـــ میں نے حکم کی تعمیل کی اور پردہ اٹھا کر دبے پاؤں وہاں سے نکل گیا ۔

صحن میں پہونچ کر باہر کے احاطے میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ کسی نے کھنکارا ۔ آواز میں نے پہچان لی ـــ امی نہیں تھیں ـــ حواس ٹھکانے ہوئے تو میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا ـــ چچی امی ، چچا ابا کی اچکنیں تہہ کرنے میں محو تھیں ، اُن کے کھنکارنے کا تعلق قطعی مجھ سے نہیں تھا ۔ بس وہ اپنے کام میں مصروف تھیں اور اپنی ہی آواز کی نزاکتوں میں گم ۔ کچھ گنگنا رہی تھیں کہ شاید حلق میں پتی آ گئی ـــ چچی امی کی آواز بڑی سریلی تھی ، وہ اکثر گنگناتی رہتیں ۔

میں نے جی ہی جی میں سوچا ـــ انہیں کیا دفتر شیک اختر کے احکام کی تعمیل کر رہا ہوں ۔ وہ کچھ کہیں گی تو انہیں بتلا کر خوش کر دوں گا کہ آپا حسنہ ملکۂ امروز ہے اور میرے لئے اس کی ہر بات مان لینا ضروری ہے ـــ لیکن چچی نے جب ادھر کوئی توجہ ہی نہ کی تو میرا جی چاہنے لگا کہ وہ ادھر توجہ کریں ۔

ویسے حسنہ ملکہ ہونے کے باوجود بھی اپنے دائرہ اقتدار و اختیار سے باہر نہیں جا سکتی تھی ـــ مثلاً وہ اس کی مجاز نہ تھی کہ کڑی دوپہر میں جب کہ چلچلاتی دھوپ سے ہر ذی نفس پناہ مانگ رہا ہو کسی بھائی یا بہن کو چپراسیوں کے کمرے تک بھی یہ کہہ کر بھجوائے کہ ریوڑیاں منگوا دو یا لال لال ٹیڑھی میڑھی میٹھی قلفیں ـــ یا بوڑھی کے بال ، یا تل کے لڈو ، لیکن یہ بات طے تھی کہ جانے والا پکڑا جائے اور اس بات کا انکشاف کر دے کہ وہ آج کی ملکہ یا آج کے شاہ کے کام پر جا رہا ہے ۔ تو اس سے کچھ پوچھ تاچھ نہ ہوتی ـــ شام کو جب ملکہ یا شاہ کا بزرگوں سے تعارف کرایا جاتا تو اس کے دورِ حکومت میں جس بے راہ روی کو اس نے روا رکھا تھا ، اس کی نسبت استفسار کیا جاتا ـــ تنبیہ کی جاتی تھی ، اور اگر جرم سنگین ہوتا تو ایک ہفتے تک ملکہ یا شاہ کو معزول کر دیا جاتا ، وہ اس طرح کہ اپنے کارہائے نمایاں کی بدولت وہ دو ایک ہفتے کے اندر ملکۂ امروز یا شاہِ امروز بن سکتا تو بھی نہ بنایا جاتا ۔

بہرحال میدان صاف تھا، اور ملک حُسنہ بغیر کسی پابندی کے باہر نکل سکتی تھی۔ سو میں نے لپک کر اس کو اطلاع دی لیکن وہ مانی نہیں۔ وجی امی سے وہ ڈر رہی تھی۔ طے ہوا کہ میں اسے اپنی آڑ میں اونٹ کی طرح چھپا لوں گا — لہٰذا ہم پیر دبا کر پنجوں کے بل چلتے ہوئے اس طرح باہر کے احاطے تک آپہونچے جیسے ساری دنیا اپنا سب کچھ تیاگ کر بس ہماری ٹوہ میں لگی بیٹھی تھی — باہر کی کھلی فضا میں سانس لے کر ہمیں چلچلاتی دھوپ کا احساس ہوا نہ تپتی ہوئی زمین کا — ننگے سر ننگے پاؤں ہم تو مہم پر چل پڑے تھے۔

احاطے کے بغیچے کے پچھلے گیٹ تک پہونچنے کے لئے پہرہ بیٹھک سے ہو کر گزرنا تھا — بیٹھک میں نبی صاحب ہوتے، تو کوئی بات نہیں، مومن بی کے نام کی دہائی اُن کے لئے کافی تھی۔ لیکن کوئی دوسرا ہوا جیسے وہ کھنڈی جاوش جس نے ابا سے، جب وہ شروع شروع میں اس ضلع پر آئے تھے تو کہا تھا کہ میں سپاہی بچہ ہوں، کرسی نہیں اٹھاؤں گا — بات دراصل یوں ہوئی تھی کہ ابا نے بر سر اجلاس اس کو حکم دیا تھا کہ کرسی اٹھا لاؤ۔

چھوٹتے ہی کھنڈی جاوش نے جواب دیا کہ میں سپاہی بچہ ہوں، تلوار اور بندوق اٹھاتا ہوں، کرسی نہیں اُٹھاتا۔

ابا نے عدول حکمی کی پاداش میں ایک مہینے کے لئے اسے معطل کر دیا۔

میں پہلے آپ کو کھنڈی جاوش کی اصطلاح اور خصوصیات سمجھاتا چلوں،

حیدرآباد کے نظام حکومت میں اکثر و بیشتر خزانے کے پہروں پر درباروں کے پہروں پر ایسے عرب متعین تھے جو عربستان سے آ کر یہاں بس گئے تھے — شملہ اور تہمد باندھتے تھے۔ خنجر تہمد میں اُڑس رکھتے۔ اس خنجر کے بل بوتے پر ان کی شجاعت اور بہادری کے افسانے زبان زد خاص و عام تھے۔ ان عربوں کی دیکھا دیکھی یہاں مقامی باشندوں نے بھی جو اس طرح کی ملازمت سے وابستہ تھے تہمد باندھ کر خنجر اُڑس رکھنا اپنا شعار گردانا — وہ اردو بات عربی لہجے میں کہتے، اور اس تقلید پر فخر محسوس کرتے — اُن کی اس گراوٹ پر لوگوں نے انہیں "کھنڈی جاوش" پکارنا شروع کیا — کھنڈی جاوش کی نسبت میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا — آپ بھی نہ جانئے — ہاں ایک اضافہ جاوش کے ساتھ "لچھو" کا بعد میں ہوا — یہ لچھو پس ماندہ طبقے کی پڑی جھڑپی ایسی عورت کا سمبل ہے جو جاوش کی داشتہ بن کر اس کے ساتھ رہنے میں اپنی توقیر سمجھتی ہے — پھر اس لچھو کے لئے عربوں نے ایک دوسرے کو قتل بھی کیا۔ خون خرابے بھی ہوئے۔

ہاں تو جب ابا نے پہرے کے اس کھنڈی جاوش کو معطل کر دیا تو اُس نے معذرت خواہی کی، اور انہوں نے اس شرط پر معاف کر دیا کہ وہ کرسی سر پہ اٹھا کر دفتر کے اطراف احاطے میں چکر لگائے۔ کھنڈی جاوش نے تعمیل کی۔ اس کی لچھو نے خوب ہنس ہنس کر اس کو چھیڑا، جب وہ کرسی سر پہ اٹھائے چکر لگا رہا تھا۔ پھر سزا کی معافی کی خوشی میں دونوں نے جی بھر کر تاڑی پی۔ یہ بات بھی ہم نے سنی۔

اب یہ کھنڈی جاوش کچھ ایسے وفادار ہوئے کہ انہوں نے ہم بچوں کو کبھی بے وقت گھر سے باہر دیکھا تو کبھی نہ بخشا، اور ابا سے شکایت کی۔

اللہ کی کرنی یہ ہوئی کہ اس وقت پہرے پر یہ وفا شعار نہ تھا — میں اور حُسنہ احاطے کے بغیچے کے پچھلے گیٹ

پر ہمیں اس وقت پہونچنے میں کامیاب ہوگئے تھے جب کہ بندو خاں واقعی کوئی سے بستی میں چھپا کر ناظر صاحب کو دے رہے تھے اور پھر ناظر صاحب اسے لے کر تیزی سے روانہ ہوگئے تھے۔

حسنہ نے مجھے ٹھوکا دیا — دیکھا بھیا، مومن بی سچ کہتی تھیں نا۔

مجھے بھی کچھ عجیب سا لگا — جو کچھ دکھ مجھے اس وقت ہوا تھا اس کا احساس آج تک ذہن میں جیسے کہیں چھپ بیٹھا ہے۔ اور اس کیفیت کی یاد دلاتا ہے جو مجھ پر طاری ہوگئی تھی۔ میرا تو اس وقت جی چاہا تھا کہ رو پڑوں — اس کی وجہ شاید بندو خاں کی ایمانداری کا وہ تصور تھا جو ابا اور امی کے رویئے سے امانتاً ہم تک پہونچا تھا — اور آج ساری بنیادیں ہل کر رہ گئی تھیں۔

میں نے جھرجھری لی، اور جیسے ہوش میں آتے ہوئے حسنہ کی بانہہ میں چٹکی بھرلی۔

"کیوں نوچتے ہو بھیا۔"

"دیکھ کیا رہی ہے۔ چل بھاگ چلیں — بندو خاں نے دیکھ لیا تو انتقاماً"

لیکن اس نے میری پوری بات نہیں سُنی — بگڑ کر بولی —

"بھولتے کیوں ہو کہ میں ملکہ بھی ہوں۔ صرف حسنہ نہیں ہوں"

جی چاہا گردن پکڑ کر اس کو بندو خاں کے آگے ڈھکیل دوں جو آہستہ آہستہ اب گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لیکن مجھے اپنی بھی تو خیر منانی تھی۔

گھنی باڑھ کی اوٹ میں چھپے ہم بندو خاں کو نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتے رہے۔

لیکن جب جھکے جھکے دب دب کر باڑھ کی اوٹ میں ہم گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے، مجھے گمان ہوا کہ بندو خاں نے ہمیں اُس مقام پر دیکھ لیا ہے جہاں باڑھ کچھ سوکھ گئی تھی۔ اور اتنی گہری نہ تھی۔

میں نے حسنہ کو ٹوکا —

"ملکۂ امروز!"

"ہاں جی"

"راستۂ خاص سے بھاگ چلیں"

یہ وہ راستہ تھا جہاں سے ملازمین کو آمد و رفت کی اجازت نہ تھی۔ لیکن ہمارے کمرے میں پہنچنے کے لئے یہ قریب ترین راستہ تھا، پر اتنا ہی کٹھن بھی — کٹھن اس لئے کہ ابا اور امی کے کمروں کے بالکل پاس سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔

ملکہ نہیں مانی۔

میں نے کہا — "بندو خاں تعاقب کر رہے ہیں"

اب اگر ہم اور آگے بڑھتے تو یہ راستہ پیچھے چھوٹ جاتا تھا۔ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا — حسنہ (اب یہ پھر بھول گیا تھا کہ وہ ملکہ بھی ہے) دیر مت کرو — اور ہم دونوں بھاگے — میں نے دیکھا، ملکہ ابا کی پشت سے لگا گئی ہے جو دفتر سے غالباً قبل از وقت لوٹ گئے تھے — اللہ اللہ کر کے میں خود کو دروازے کی اوٹ میں چھپا کر نکل بھاگے

میں کامیاب ہوگیا۔

مجھے حسنہ کی وہ نگاہیں کبھی نہیں بھولتی ہیں جن نگاہوں سے اُس نے مجھے اس وقت دیکھا تھا — اب جو میں بھٹکا تو بندو خاں کے بالکل مقابل تھا — لیکن اس وقت میں ایک ایسے بڑے حادثے سے بچ کر نکل آیا تھا کہ بندو خاں اپنے تن و توش کے باوجود مجھے کچھ ٹھگنے ٹھگنے سے اپنے بونے سے لگے — غیر شعوری طور پر میرا ذہن ان سے خوف کھانے کے بجائے ان سے مقابلہ کرنے کے درپے تھا۔ شاید میں کچھ اس طرح سوچ رہا تھا کہ میں ریل کے انجن سے ٹکراتے ٹکراتے بچ گیا ہوں، اور کسی بچے کی ٹرائسکل سے ٹکرا گیا ہوں۔

لیکن حسنہ بے چاری — بدنصیب ملکہ۔

بندو خاں نے رعب کسا — میں نے دیکھ لیا ہے بابا۔

مجھ میں بھی تو کوئی باغی جاگ گیا تھا — میں نے جواب دیا — "میں نے بھی سب کچھ دیکھ لیا ہے بندو خاں —"

"کیا دیکھ لیا ہے؟" بندو خاں ذرا سا چونکے۔

"یہی کہ تم ناظر صاحب کو چھپا چھپا کر کچھ دیتے ہو۔"

"کچھ کیا دیتا ہوں۔ کھانا دیتا ہوں — سونا چاندی نہیں دیتا۔"

"کھانا دیتے ہو؟ — یہاں انہیں کھانے پینے کی کوئی کمی ہے! —" مجھے ایک اور دھچکا سا لگا۔ بندو خاں کی بڑائی ایک سیاہ دھبہ بن کر میری نظروں میں سمٹ گئی — میں کچھ ہی دیر پہلے ان کے تعلق سے مشتبہ ہو گیا تھا، اب یہ بات تو اور بھی کھل کر رہ گئی کہ وہ چوری بھی کر رہے ہیں اور سینہ زوری بھی —

لیکن بندو خاں نے بڑی تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ "یہ بات کسی کو بتلانا مت" وہ کہنے لگے "میں آپ کو سب کچھ بتلا دوں گا۔"

میں اب زیادہ وضاحت میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ آہستہ آہستہ میرا سانس ٹھیک ہو رہا تھا، اور میں نارمل ہونا چاہ رہا تھا — مجھے پھر وہی فکر دامن گیر ہوئی کہ اپنے گوشۂ عافیت میں محفوظ پہونچ جاؤں۔ سو میں مزید کچھ بندو خاں سے کہے بنا چل دیا۔

ملکہ جب کمرے میں لوٹی تو بہت سہمی ہوئی تھی اور ہانپ رہی تھی۔ سانس ٹھیک کر کے اُس نے کہا — "چچا ابا نے کچھ نہیں کہا — صرف اس قدر پوچھا کہ آج کنگ کون ہے؟ — میں نے کہا کہ جی میں ہی کوئین ہوں — اس پر انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور میں اب تک کانپ رہی ہوں۔"

شام کو ملکۂ امروز حسنہ ایک ہفتے کے لئے معزول کر دی گئی۔

لیکن میرے لئے اس واقعے سے بڑا ایک حادثہ پیش آیا — میں حادثہ اس بات کو اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس بات نے میرے لئے زندگی کو سمجھنے کے کچھ راستے متعین کئے۔ اور میں نے اپنی کم عمری میں سب سے زیادہ اس بات پر سوچا، اور غور کیا تھا۔

بندو خاں نے مجھے بتلایا کہ ناظر صاحب کی اکلوتی بیٹی یہیں ضلع میں ان کے ساتھ رہتی ہے۔ مصلحتاً انہوں نے اولاد امی

کو یہ جتلا دیا تھا کہ بچی کو انہوں نے اپنے وطن گلمنود بھجوا دیا جہاں اُن کی بہن ہے ۔ سچ پوچھئے تو ناظر صاحب کا سوائے اس بچی کے اور کوئی ہے ہی نہیں ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ انہوں نے اس جھوٹ کو گھڑنے کی ضرورت کیوں محسوس کی ۔ مجھے یاد ہے مجھے اس جھوٹ نے بے حد صدمہ پہونچایا تھا ۔ اتا جبکہ اس بات کا انکشاف ہوتا کہ ناظر صاحب کی کوئی لڑکی بھی ہے تو وہ ہر طرح اس کی دستگیری کرتے ـــــ چھپے چوری تین وقت کے کھانے کے لئے ناظر صاحب نے اپنی اہمیت کو اس قدر گھٹا لیا تھا ۔ جب کہ ہر چیز ان کے بس میں تھی ۔ یہ بات کچھ میری سمجھ میں نہ آئی ۔ اسی لئے میں نے بندو خاں کی سب کچھ سن کر انہیں ایسی تیکھی نظروں سے دیکھا کہ وہ جان گئے کہ میں ان کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوا ہوں ۔

کچھ دیر سوچ کر بندو خاں نے مجھے اپنے قریب کر لیا ـــــ پھر بڑی شفقت سے کہنے لگا ـــــ بابا کمخواب میں ٹاٹ کے پیوند نہیں لگتے ـــــ صاحب کو معمولی گھرانوں کے بچوں سے آپ لوگوں کا ملنا جلنا پسند نہیں ہے ـــــ ناظر صاحب کو اپنی اکلوتی بیٹی بہت عزیز ہے ۔ وہ اسے یہاں لاتے ہیں تو وہ روزانہ ہی یہاں آنے کے لئے ضد کر سکتی ہے ۔ ناظر صاحب کو اپنی حاضری یہاں ہر روز ضروری ہے ۔ ان کا اپنی بچی کے ساتھ آنا اگر صاحب کو برا معلوم ہو تو ـــــ ... پھر بندو خاں کہنے لگے ۔ "آپ کا گھر میرا گھر بھی ہے بابا ۔ میں کوئی سونا چاندی نہیں لٹا رہا ہوں "۔

بات میری سمجھ میں تو آگئی تھی ۔ لیکن میں اپنے نیم پختہ شعور کے باوصف کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا ـــ کیا ہم اس زمین پر نہیں رہتے ۔ کیا ہم اتنے بلند ہو گئے ہیں کہ زمین پر رہنے والوں کو چھوٹے دکھائی دیں ۔

میں نے بندو خاں سے وعدہ کیا کہ یہ راز میں کسی کو نہیں بتاؤں گا ـــــ اور پھر بات آئی گئی ہوئی ـــــ یہ قصہ پارینہ ہوا ۔

لیکن آج کی رات تو بھیانک حد تک تاریک تھی ۔ آج کی رات تو اوکالیاں اس طرح برس رہی تھیں جیسے پھر برسنے کا نام نہ لیں گی ۔ بجلیاں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے تاریکی کے ہر تصور کو نابود کر کے رکھ دیں گی ـــ گرج اور کڑاکے ایسے تھے کہ زمین کی بے بسی پر آسمان دھاڑیں مار کر روتا ہوا محسوس ہوتا تھا ۔

ناظر صاحب ہم بچوں کے جھرمٹ میں آنکھیں بند کئے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر سے اس طرح چونک اٹھتے تھے ، جیسے بجلی انہیں چھو چھو کر گذر رہی ہے ۔

بچے اونگھنے لگے ـــ یہاں تک کہ سب سو گئے ۔

میں نے ناظر صاحب سے کہا ـــ " مولوی صاحب آپ چلے جائیے ۔ آپ کی بیٹی اکیلی ہوگی "

انہوں نے آنکھیں کھول کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے کوئی بچہ ماں کے بطن سے ابھی ابھی دنیا میں آیا ہو ۔

میں نے پھر کہا ـــ میں سب جانتا ہوں مولوی صاحب ۔ میں کسی کو نہیں بتلاؤں گا ۔

ناظر صاحب میری پیشانی پر جھکے ۔ میں نے ان کے ہونٹوں کی حدت اور آنسوؤں کی نمی دونوں ہی اپنی پیشانی پر محسوس کی ۔ پھر وہ اُٹھے ، اور طوفانی بارش میں گرجتے بادلوں میں چمکتی بجلیوں میں اس تیزی سے چل پڑے جیسے ان کے اندر کے طوفانوں کے آگے یہ سب کچھ ہیچ ہو ۔

سجاد نظر

# یہ روداد ہے اپنے سفر کی

اور ایک دن میں نے بڑی بہو کو ڈھونڈھ لیا۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹی درد سے تڑپ رہی تھی ؛ اور اس کے پھولے ہوئے ننگے پیٹ کو دائی ماں اپنی بوڑھی انگلیوں سے آہستہ آہستہ ٹٹول رہی تھی ــــ میں نے دیکھا بڑی بہو کی آنکھوں کی قندیلیں جھلملا رہی تھیں، اور اس کے حسین چہرے پر ایسی ویرانی تھی جیسے کسی تکلیف نے ساری عمر اسے گلے لگا کر بوسہ لیا ہو ــــ میں بڑی بہو کو بچپن سے جانتا ہوں۔ مگر پھر بھی مجھے اس پر رحم نہیں آیا۔ کیونکہ ہوش سنبھالتے ہی میں نے اپنا دل اپنے سینے سے نوچ کر پھینک دیا تھا۔ میں کھڑا دیکھتا رہا اور ہنستا رہا۔

یکایک بڑی بہو کا درد ایک لمحے کو رُک گیا، اور اس ایک لمحے کو اس کی زندگی نے بہت کس کر اپنی مٹھی میں بھینچ لیا ــــ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی، اُٹھ کر اس نے ایک بہت بڑے جال کو جسے صرف وہی دیکھ سکتی تھی توڑ ڈالا۔ پھر اس نے دائی ماں کو چھوڑا اور اپنے شوہر کو چھوڑا، اور گھر کی ہر اس چیز کو جس پر اس کا حق تھا چھوڑا، اور وہ دوڑتی ہوئی پاگلوں کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی ــــ

میں اُس کے پیچھے پیچھے دوڑا۔

بڑی بہو باہر سڑک پر بے تحاشہ دوڑ رہی تھی۔ دوڑتے دوڑتے وہ اس سڑک کو پار کر گئی۔ اور پھر وہ اس شہر سے بھی آگے نکل گئی؛ اور کسی دوسرے شہر پہونچ کر ایک ٹوٹی پھوٹی کوٹھی کے اندر چلی گئی ــــ

اور پھر میں نے دیکھا کہ بڑی بہو ایک بہت بڑے نیم کے پیڑ سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے کوئی اپنی پہلی اولاد کی لاش سے لپٹ کر روتا ہے۔

میں اُس کی بیوقوفی پر کھل کھلا کر ہنس پڑا ــــ نیم کے پیڑ سے پیار کرنے والی، تیری زندگی میں کڑواہٹ نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا؟

میں چونکہ کسی کو کسی سے پیار کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے میں نے بڑی بہو کو جی بھر کے رونے نہیں دیا ــــ میں نے اس کے پیٹ پر اس زور کی لات ماری کہ اس کا درد شعلوں کی طرح بھڑک اُٹھا ــــ وہ تڑپتی ہوئی واپس اپنے شہر اور کمرے میں آگئی، اور پھر ایک پل میں بیوی بنی اور دوسرے پل میں بڑی بہو ــــ تیسرے لمحے وہ دائی ماں کے سامنے اپنا پیٹ ننگا کرکے

لیٹ گئی۔ اور درد کے لحاف کو سر سے پاؤں تک تان کر کراہنے لگی۔

میرا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ میں نے جھک کر اپنے ہونٹ بڑی بہو کے پیٹ پر رکھ دیئے اور اس کے بچے کو بددعا دی کہ جب وہ پیدا ہو تو اتنا کُبڑا ہو کہ آسمان نہ دیکھ سکے۔ اور اس کے دونوں ہاتھ اس قدر مڑے ہوئے ہوں کہ وہ دعا نہ مانگ سکے — کیونکہ کبھی کبھی میں آسمان پر اور کبھی کبھی کسی دعا پر ہنس نہیں سکا ہوں۔ اور جس پر میں نہیں ہنس سکتا، اُس سے میں نفرت کرتا ہوں۔

یکایک پھر ایک لمحے کو بڑی بہو کا درد رُک گیا، اور وہ پھر اسی طرح اپنے کمرے سے اٹھ کر بھاگ گئی۔ اور پھر اسی شہر میں پہونچ کر ایک جھیل کے کنارے کھڑی ہوگئی اور اس طرح رونے لگی جیسے روز آکر اُس جھیل کو اپنے آنسوؤں سے بھرتی ہو — میں نے دیکھا اُس کے پورے جسم میں دو مضبوط باہوں کا لمس جاگا ہوا تھا۔ اور وہ اس لمس کے جادو میں کھنچی کسی زخمی ابابیل کی طرح دھڑک رہی تھی — میں مارے جلن کے بے تاب ہوگیا — میں نے پھر بڑی بہو کے پیٹ پر لات ماری، اور بڑی بہو پھر واپس اپنے کمرے میں آگئی۔

اور پھر ایسا کئی بار ہوا     کبھی نیم کا پیڑ اور کبھی آنسوؤں کی جھیل     مگر میں نے ہر بار بڑی بہو کو اسی بے دردی سے مارا     میں بڑی بہو کو جانتا ہوں، اس لئے یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کے خواب میرے ظلم سے بہت بڑے ہیں۔ اسی لئے میں نے اُس کے دل کے خون میں ہاتھ ڈال دیا، اور پھر وہی ہاتھ اپنے منہ پر اور اپنے سارے جسم پر مل لیا     دیکھتے ہی دیکھتے میں ایسا مرد بن گیا جس کے لئے بڑی بہو سب کچھ کر سکتی تھی۔     خود زہر کھا سکتی تھی، دوسروں کو زہر کھلا سکتی تھی۔

میں ایک چور کی طرح اُس کے درد کے لحاف کے اندر گھس گیا، اور پھر بڑی بہو کے بغل میں لیٹ کر اُس کے کان میں آہستہ سے بولا —

"اندرا — میں آگیا —"

"سرجو —" وہ یکایک کروٹ بدل کر مجھ سے لپٹ گئی — "سرجو —"

"اندرا — میں آگیا —" میں نے اس کے بازو پر ہاتھ پھیرا، اور اس کی آنکھوں پر اپنے جھوٹے ہونٹ رکھ دیئے۔

"سرجو —" بڑی بہو یکایک زور سے چلّائی۔

دائی ماں نے چونک کر بڑی بہو کو دیکھا — اُس کی اُنگلیاں جو زیتون کے تیل سے لپٹی تھیں اس طرح کانپنے لگیں، جیسے وہ بھول کر اپنے ہی آنسوؤں کے جھیل کنارے منہ دھونے بیٹھ گئی ہو۔

دائی ماں کی کہانی بھی مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اس لئے اس کے خوف پر مجھے بڑے زور کی ہنسی آگئی، اور میں نے اُسے آہستہ سے دھکا دے کر ہزاروں فٹ کی بلندی سے نیچے گرا دیا — دائی ماں زور سے چیخی اور اپنی اکلوتی بیٹی پر پیار سے جھک گئی جو اپنا پھولا پیٹ لئے پڑی "سرجو — سرجو" بک رہی تھی۔

"جانے دے —" دائی ماں نے اس کی پیشانی کو سہلایا — "جانے دے"

"نہیں ماں" — اُس کی بیٹی نے سر کو جھکولا دیتے ہوئے کہا — "اسے بُلا دو — سرجو کو بُلا دو ماں —"

مگر دائی ماں سرجو کو کہاں بلا سکتی تھی — وہ تو اُسے ڈس کر کب کا بھاگ چکا تھا۔ اس دن بھی میں اس کی بیٹی کے بغل میں

لیٹا ہوا تھا۔ دائی ماں بے کسی سے سر جھکا کر رونے لگی تھی۔ اور میں نے آہستہ سے اس کی بیٹی کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ گرچہ اس بات کو برسوں بیت چکے ہیں، لیکن آج بڑی بہو کی چیخ نے کیسے اس کو دہلا کر رکھ دیا تھا —

دائی ماں کی انگلیاں اب بھی کانپ رہی تھیں، اور چھوٹی بہو دروازے پر کھڑی منہ میں پلّو ٹھونسے کھی کھی ہنس رہی تھی —

"ارے کیا ہوا؟ —" اُس کی ساس بغل کے کمرے سے چلّائی۔

"کچھ نہیں —" دائی ماں جلدی جلدی اپنا ہاتھ دھونے لگی۔

"تم جا رہی ہو دائی ماں؟" چھوٹی بہو بڑی بے پروائی سے دیوارگیر آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

"بڑی بہو کو اسپتال لے جاؤ چھوٹی بہو —" دائی ماں کی آواز بھرّا گئی — "بچہ شاید پیٹ میں مر چکا ہے —"

"دائی ماں" — چھوٹی بہو یکایک سنجیدہ ہو گئی، اور پھر دوڑتی ہوئی اپنی ساس کے کمرے کی طرف بھاگی۔

دائی ماں نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں نے اندرا کو کس کر اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

"اور وہ نیم کا پیڑ —؟" بڑی بہو نے پوچھا۔

"وہ بھی اب تک کھڑا ہے — گنجان — سبز —"

"اور وہ جھیل —؟"

"وہ بھی اب تک ویسی ہی ہے — گہری — سبز —"

"تمہاری آنکھیں بھی تو سبز ہیں سرجو —"

"ہاں — ہیں تو —" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اس لئے ان میں بھی زہر ہے" وہ مسکرائی۔

"زہر —؟؟"

"ہاں زہر — مجھے پینے دو — پی کے مر جانے دو —"

وہ میری آنکھوں کو لگاتار چومنے لگی — ایک، دو، تین، چار — سرجو، سرجو، سرجو...

اور ٹھیک اس وقت جب وہ میری آنکھوں کا زہر پی پی کر مر رہی تھی میں نے بڑی مکاری سے اس کے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر دیکھا — اس کا بچہ مر چکا تھا، اور بڑی بہو بس چند گھنٹوں کی مہمان تھی — میرا جی چاہا کہ اتنے زور سے قہقہہ لگاؤں کہ سارا آسمان اڑ جائے — دنیا کے اِس کونے سے اُس کونے تک خون کی ندیاں بہا دوں — ہائے! کیا مزیدار جیت تھی۔

"سرجو —" بڑی بہو نڈھال ہو کر اپنی پیشانی میرے سینے کے بالوں سے رگڑنے لگی۔

"ہوں —" میں نے بڑی محبت سے کہا۔

"بس ایک بار کہہ دو —" اس کی آواز بھرّا گئی — "ایک بار —"

"کیا اندرا ـــــ؟" میں اُس کی گداز پیلی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"یہی کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے ـــــ"

"مجھے تم سے محبت ہے ـــــ" میں نے ریکارڈ کی طرح کہا۔

"اور تم میرے بعد کسی کو نہیں چاہو گے ـــــ"

"کسی کو نہیں چاہوں گا ـــــ"

"اور یہ کہ تم اکیلے میں میرے لئے روتے ہو ـــــ"

"روتا ہوں اندرا ـــــ"

"اور تمہارا کسی کام میں جی نہیں لگتا ـــــ"

"کسی کام میں جی نہیں لگتا ـــــ"

"اور میں بہت حسین ہوں ـــــ"

"بہت حسین ہو ـــــ"

"سرجو ـــــ"

"ہوں ـــــ"

"میں دو گھنٹوں میں مر جاؤں گی نا ـــــ؟"

"نہیں اندرا ـــــ"

"ہاں سرجو، میں دو گھنٹوں میں مر جاؤں گی۔"

"اندرا ـــــ"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا سرجو ـــــ"

"کیسا ـــــ؟"

"یہی کہ تم بھی میرے ساتھ مر جاؤ ـــــ"

"مر جاؤں گا ـــــ"

"سچ ـــــ؟"

"ہاں اندرا ـــــ مر جاؤں گا ـــــ"

"تو پھر سرجو، اس موت کا کوئی نام رکھو ـــــ"

"نام ـــــ؟"

"ہاں نام ـــــ جیسے ہر رنگ کا ایک نام ہے۔ جیسے ہر خوشبو کا ایک نام ہے۔"

"موت کا کوئی نام نہیں رکھ سکتا اندرا ـــــ موت تو بس موت ہے ـــــ"

"تو پھر زندگی کے اتنے نام کیوں ہیں" ـــــ بڑی بھولی بننے لگی ـــــ "کیوں ہیں سرجو ـــــ؟"

"اس لئے کہ زندگی بولتی ہے اور موت خاموش رہتی ہے ۔" میں اُس کے آنسو پونچھنے لگا۔

"موت خاموش نہیں رہتی سرجو ۔ موت بھی بولتی ہے ۔ دیکھو میری طرف ۔"

میں نے بڑی بہو کی طرف غور سے دیکھا اور خوشی سے میرا رنگ گلنار ہوگیا۔ بڑی بہو زرد ہوتی جارہی تھی ۔ اُس کے ہونٹوں کے کنارے سکڑ گئے تھے ، اور اُس کی آنکھوں کے گدلے پن میں کیچڑ گھل رہی تھی ۔ اُس کی سانسوں سے بدبو آنے لگی تھی اور اس کے نرخرے سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے مشین کی ٹوٹی ہوئی گراری چل رہی ہو۔

"اندرا — ؟"

"سرجو —" بڑی بہو اُسی طرح رو رہی تھی — "سرجو سب کچھ ختم ہوگیا ۔"

"نہیں اندرا —"

"ہاں سرجو، سب کچھ ختم ہوگیا ۔ اب میں نہیں بچوں گی —"

"اندرا —" میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کردی — "تم ابھی زندہ رہو گی ۔ دیکھو یہ رات —" میں نے اپنی سانسوں کی زنجیروں کو بڑے زور سے صدیوں پیچھے پھینکا ، اور ایک خوب صورت رات کی گردن میں پھنسا کر اُسے ایک ہرنی کی طرح گھسیٹتا ہوا سامنے لے آیا۔

"ہائے — !" اندرا تھرّا کر بولی — "یہ رات اب تک زندہ ہے سرجو —"

"ہاں —"

"مجھے — مجھے یہ رات دے دو —" بڑی بہو نے جھپٹ کر اُس کھلی ہوئی ہیرے کی طرح دمکتی ہوئی رات کو اپنے پیلے پیلے ہاتھوں میں لے لیا ، اور پھر اسے سینے سے بھینچ کر کمزور ، مردہ آواز میں رونے لگی ۔

میں نے مڑ کر حدِ نظر تک دیکھا ۔ زمانے کی آخری سرحد پر دائی ماں بیٹھی ایک کالی اندھی رات کو پرانے خط کی طرح پرزے پرزے کر رہی تھی — میرے لئے اب ہنسی روکنا مشکل ہوگیا تھا ۔ لیکن چونکہ میں اندرا کے سامنے ایسا نہیں کرسکتا تھا اسی لئے میں آنسوؤں میں ہنسنے لگا — یہ فن دنیا میں سوائے میرے اور کسی کو نہیں آتا ۔ اور اسی لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ میری کس ہنسی میں آنسوؤں کا نمک ہے اور کن آنسوؤں میں ہنسی کی شبنم ہے ۔ اندرا کبھی میں اس کے غم میں رو رہا ہوں ۔ دائی ماں کی لڑکی بھی بہت دنوں پہلے یہی سمجھی تھی کہ میں اُس کے غم میں رو رہا ہوں ، لیکن دائی ماں آج سمجھ گئی ہے کہ وہ غم کا رونا دراصل کیا تھا اور جو دائی ماں سمجھی ہے اسے بڑی بہو بھی دو گھنٹے بعد سمجھ جائے گی — رہ گئی چھوٹی بہو تو وہ ...... مگر خیر ! چھوٹی بہو کی کہانی بڑی بہو کی موت کے بعد ہی اچھی لگے گی ۔

"سرجو —" اندرا نے بہت دیر بعد کہا۔

"ہاں —" میں بڑے پیار سے بولا ۔

"جانتے ہو — میں اب کبھی ماں نہیں بنوں گی ۔"

"اندرا —"

"میں بانجھ ہوں سرجو — اور دو گھنٹوں میں مرجانے والی ہوں —"

"نہیں اندرا —" میں نے اس کی پیلی شکل اپنے دونوں ہاتھوں میں اسی طرح پکڑ لی جس طرح سرجو پکڑا کرتا تھا۔

"میرے پیٹ میں میرا بچہ مر چکا ہے سرجو — میں بس اس رات کی ماں ہوں —"

"اندرا —" میں اس کے پیلے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں کے قریب لے آیا۔

"تم اسے نہیں سمجھو گے —" اندرا کی آواز اس کے بہت سے جذبوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بٹ گئی — "تم عورت نہیں ہو، تم اسے نہیں سمجھو گے — سرجو! ناکام محبت میں عورت صرف راتیں جنتی ہے اور ناکام شادی میں صرف بچے —"

"تمہارا پیار ناکام نہیں اندرا —"

"ناکام ہے سرجو — شروع سے آخر تک — آرزو سے آنسو تک —" اندرا ہنس پڑی۔

میں لمحہ بھر کے لئے ڈر گیا، اور میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی — میں نے غور سے دیکھا — بڑی بہو کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ اور اس کی کوکھ کا زہر اس کی رگ رگ میں پھیل گیا تھا — وہ بہت دیر تک خاموش رہی، اور اس وقت چونکی جب چھوٹی بہو اپنی ساس کے ساتھ کمرے میں آئی۔

"اندرا —" چھوٹی بہو نے اُسے آہستہ سے سہلایا۔

"بڑی بہو —" اُس کی ساس نے بھی اسے ہلایا —

اندرا نے آنکھیں کھولیں — "کیا ہے ماں —؟"

"کیسی طبیعت ہے تیری —؟" اس کی ساس پیار سے اس پر جھک گئی۔

"بہت خراب ہے ماں۔ اب میں نہیں بچوں گی —" بڑی بہو اس بار بچوں کی طرح رونے لگی۔

"تو کس سے باتیں کر رہی تھی —؟"

"سرجو سے —" اندرا روتے روتے ہنس پڑی۔

"سرجو سے —؟" اُس کی ساس لمحہ بھر کے لئے کانپ گئی۔

"ہاں ماں۔ دیکھو! یہ کیا ہے سرجو — میرا سرجو —" وہ میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگی۔

میں زور سے ہنس پڑا — اندرا نہیں جانتی تھی کہ سوائے اس کے مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا، یا پھر وہ جسے میں خود کو دکھانا چاہوں۔ اور یہ فن سوائے میرے دنیا میں کسی کو نہیں آتا۔ اس لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کب میں تمہاری پلکوں پر سے دبے پاؤں گذر کر خوابوں میں شور پیدا کر گیا، اور کب شہ رگ میں دانت چبھو کر تمہارے دل کا لہو پی گیا۔

اندرا کی حالت دیکھ کر چھوٹی بہو کی آنکھیں بھر آئیں، اور اس نے گھبرا کر دروازے کی طرف منہ پھیر لیا۔ لیکن دروازے کی طرف منہ پھیر کر وہ روئی نہیں بلکہ ساری کا پلو منہ میں ٹھونس کر کھی کھی ہنسنے لگی — یہ چھوٹی بہو بھی عجیب کہانی ہے۔ مگر بڑی بہو جب تک نہیں مرتی، چھوٹی بہو کو ننگا کرنے کا مزہ نہیں۔

"چھوٹی بہو —" اُس کی ساس نے یکایک مڑ کر کہا۔

"ہاں ماں —" چھوٹی بہو پھر پلٹ کر رونے لگی۔

"مندجیت کو خبر کر دے۔ بڑی بہو کی حالت بہت خراب ہے۔"

"اچھا ماں ۔۔۔"

چھوٹی بہو نوکر کو بلانے باہر چلی گئی۔

شام ہوتے ہوتے بڑی بہو اسپتال پہونچا دی گئی، اور رات ہوتے ہوتے سارے گھر کو جیسے سناٹا نگل گیا ۔۔۔ اس کی ساس اپنے کمرے میں آنکھیں بند کئے بیتے دنوں کی تسبیح کے ایک ایک دانے کو گن رہی تھی، اور چھوٹی بہو اپنا کمرہ بند کئے آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی ۔۔۔ آنگن خالی اور سونا تھا، اور میں ننگا بیٹھا اکیلے اکیلے پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔

یکایک مجھے ایک خوفناک شرارت سوجھی، اور میں نے پوری رات کو ایک کوئل کی طرح اپنی ہتھیلی پر اٹھا لیا، اور جب وہ کوکنے لگی تو میں نے اسے چھوٹی بہو کے بستر کے سامنے والی کھڑکی پر رکھ دیا ۔۔۔ باہر چاندنی یکایک پھوٹ کر بہہ نکلی۔ اور اس بہتی ہوئی چاندنی میں چھوٹی بہو بھی بہہ کر بہت دور چلی گئی ۔۔۔

اندر جیت بڑی بہو کو اسپتال پہونچا کر اب تک نہیں لوٹا تھا، اور اُس کا شوہر آفس سے سیدھا شراب خانے چلا گیا تھا۔ باقی رہ گیا تھا اس کا کمرہ اور ایک آئینہ اور کاجل کی ایک ڈبیا اور دو کنگھیاں اور ایک لپ اسٹک، اور انتظار ۔۔۔ انتظار ۔۔۔ انتظار ۔۔۔

چھوٹی بہو یکایک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، اور پھر اُس نے کمرے کی بتی بجھا دی، اور پھر ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیئے اور چاندنی کو دھکے دے کر باہر نکال دیا، اور پھر بستر پر اوندھی گر کر اس طرح سسکنے لگی جیسے چادر کے اندر کسی کی لاش دفن ہو، باہر رات کی کوئل کوک رہی تھی۔

"کو ہو ۔۔۔
کہاں ہو تم ۔۔۔ کہاں ہو تم؟"

میں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور اپنے لوہے کے بوٹ پہن کر چھت پر چڑھ گیا، اور ادھر سے ادھر اس طرح دوڑنے لگا جیسے خدا محبت سے ہار گیا ہو ۔۔۔ میرے قدموں کی آواز سن کر چھوٹی بہو سمجھی کہ بادل گرج رہا ہے، حالانکہ بادل خود اس کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک رہا تھا ۔۔۔ قطرہ قطرہ آرزو ۔۔۔ قطرہ قطرہ خواب ۔۔۔

"چھوٹی بہو! کیا یہ سزا تیرے لئے کافی نہیں ۔۔۔؟"

میں گلا پھاڑ کر چیخا، اور چھوٹی بہو سمجھی کہیں بجلی گری ہے۔ حالانکہ بجلی خود اندھیرے کی آگ بن کر اُس کی پلکوں سے لگی بیٹھی تھی۔

بہت دیر بعد جب اُس نے آنکھیں پونچھ کر اپنے گھپ اندھیرے کمرے کو دیکھا تو اسے فرش پہ چاندنی کی ایک بوند اس طرح لرزتی نظر آئی جیسے کانچ میں اس کا آویزہ گر گیا ہو ۔۔۔ چھوٹی بہو کا جی چاہا کہ اُس آویزے کو اٹھا کر وہ پھر سے پہن لے۔ اور شراب خانے جا کر اپنے شوہر کے جام پر ایسی ٹھوکر مارے کہ اس کا سارا نشہ برف بن کر اس کی رگوں میں دوڑنے لگے۔ مگر چھوٹی بہو ایسا نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اُس کے کمرے سے شراب خانے تک ایک ایسا لمبا فاصلہ بچھا ہوا تھا جسے نفرت اور محبت نے دو پکی سہیلیوں کی طرح صدیوں میں بن کر تیار کیا تھا ۔۔۔ یہ فاصلہ صرف میرے اختیار میں تھا، اور یہ فن سوائے میرے اور کسی کو نہیں آتا۔ اس لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ

کب میں تمہاری ہنسی کی دہلیز میں چھپ کر تمہاری آئندہ نسلوں کے آنسو دیکھ گیا ہوں، اور کب امن کے دستخطوں کو سینے سے لگا کر خاک و خون کا تہوار منا گیا ہوں۔

میں نے پھر ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا، اور اپنے دل سے بہت سا اندھیرا نکال کر رات کے منہ پر مل دیا —— رات گہری اور تاریک ہوگئی —— اور پھر میں نے اسے ابر کی طرح کھینچ کر ستاروں کی میخوں میں پھنسا دیا —— رات بدصورت ہو کر ڈھلنے لگی ——

میں نے مڑ کر دیکھا۔ اندرجیت چھوٹی بہو کے شوہر کے ساتھ اب تک شراب پی رہا تھا، اور اُس کی آنسو بھری آنکھوں میں نشہ اس طرح گھلا ہوا تھا جیسے سچ اور جھوٹ میں صلح ہوگئی ہو۔

"راج کمار ——" اندرجیت نے اپنے بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ہوں ——" چھوٹی بہو کے شوہر نے 'ہوں' کو اس طرح لمبا کر کے کہا جیسے نشہ کو چیر کر باہر آنا چاہتا ہو۔

"اندرا شاید اب مر گئی ہوگی ——" اندرجیت نے کہا۔

"کیا —— ؟" راج کمار نے چونک کر اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔

"تمہیں کیسے معلوم —— ؟"

"راستے میں اُس نے مجھ سے معافی مانگی تھی ——"

اندرجیت نے گلاس کو ایسے پکڑ لیا جیسے بڑی بہو کی معافی کو پکڑے ہوئے ہو۔

"کیا کہا تھا —— ؟" راج کمار اسی طرح دیکھتا رہا۔

"کہنے لگی، مجھے معاف کر دو، میں تمہیں کوئی سکھ نہ دے سکی ——" اندرجیت ہنسا۔

"پھر تم نے کیا کہا —— ؟"

"کچھ نہیں ——"

"کچھ بھی نہیں —— ؟"

"نہیں —— مگر میں نے اُسے ایک تھپڑ مار دیا تھا ——" اندرجیت یکایک اپنے دونوں ہاتھوں کو شکست بھرے انداز میں ملنے لگا۔

"کیوں —— ؟"

"پتہ نہیں —— مگر مجھے اس کا دکھ ہے ——" اندرجیت اُکھڑے ہوئے لہجے میں افسوس سے بولا۔

"اندرا نے کیا کہا تھا —— ؟"

"وہ منہ پھیر کر رونے لگی تھی ——"

راج کمار یکایک خاموش ہوگیا —— اندرجیت ڈیڑھ دو پیگ کا پورا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔

"راج کمار ——" اندرجیت کی آواز بھرّا گئی —— "مجھے اس کی موت کا بہت دکھ ہے۔ تم کیا اسے سمجھ گئے —— ؟"

"سمجھتا ہوں ——" راج کمار ہلکے سے ہنسا —— "تم اس کی بے وفائی کے عادی ہو چکے ہو ——"

"ہاں" اندرجیت نے نظریں جھکالیں۔ "مجھے اُس کی بے وفائی کی بہت ضرورت ہے۔۔اُس کے بغیر گھر کیسا سنسان ہو گیا ہوگا۔۔"

"گھر۔۔؟" راج کمار زور سے ہنسا، اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔

چھوٹی بہو کمرے کی تمام بتیاں جلائے آئینے کے سامنے بیٹھی اس طرح لپ اسٹک لگا رہی تھی جیسے شراب کی کھلی ہوئی بوتل پر لیبل چپکا رہی ہو۔۔ بڑی بہو کا بند کمرہ گہرے سایوں سے بھرا ہوا تھا، اور اس کی ساس اپنے کمرے میں آنکھیں بند کئے سوچ میں اس طرح گم تھی جیسے کڑی ریاضت کے بعد کسی جوگن کو گیان مل جائے۔۔۔ میں نے ایک چور کی طرح پورے گھر کو اپنی انگلیوں پر اٹھا لیا۔ اور پھر اسے ہوا کے ایک بہت بڑے بھنور میں خشک پتے کی طرح ڈال دیا۔۔۔ پوری بلڈنگ ایک کنکر کی طرح چکر کھانے لگی۔۔۔ موت کا دھبہ چکّر۔۔۔ زمین نا آسمان۔۔۔ نہ چھوٹی بہو کو اس کی خبر تھی نہ اس کی بجز یہ کار ساس کو۔۔۔ نہ راج کمار کو نہ اندرجیت کو۔۔۔ اگر کوئی جانتا تھا تو وہ بڑی بہو کے کمرے میں بڑی بہو کا سایہ تھا، اور سائے چونکہ کچھ نہیں بولتے اسی لئے مجھے ان کا ڈر نہیں۔۔

"تم ہنستے ہو۔۔؟" اندرجیت طنز سے مسکرایا۔

"نہیں اندرجیت۔۔" راج کمار یکایک سنجیدہ ہوگیا۔۔"شرابی اسی طرح روتے ہیں۔"

اندرجیت نے آنکھیں بند کرکے گلاس پر پیشانی کو ٹکا دیا۔۔"راج کمار، تمہیں اندرا کی موت کا غم نہیں۔۔؟"

"پتہ نہیں۔۔" اُس نے اُکتا کر کہا۔۔"نشے میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔" پھر اُس نے سوڈے کی بوتل اٹھا کر منہ سے لگائی' شراب ختم کرنے کے بعد وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔

"تم پی چکے۔۔؟" اندرجیت نے پوچھا۔

"ہاں۔۔" راج کمار نے گیلے ہاتھوں کو پتلون سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو آج نشہ ہی نہیں آتا۔۔" اندرجیت بڑی مایوسی سے بولا۔

"اندرجیت۔۔" راج کمار لڑکھڑا کر کھڑا ہوگیا۔۔"موت کے غم میں شراب نہیں پینی چاہئے۔ یہ کم بخت اتنی بڑی حقیقت ہے کہ نشہ اسے مٹا نہیں سکتا۔"

"پھر میں کیا کروں۔۔؟" اندرجیت بھی کھڑا ہوگیا۔۔"مجھے گھر جاتے ڈر لگتا ہے۔۔"

"تم اسپتال چلے جاؤ۔۔"

"اسپتال۔۔؟"

"ہاں۔۔" راج کمار بڑی بے پروائی سے بولا۔۔"ایک بار اندرا کا مردہ چہرہ دیکھ لو، تمہیں یقین آجائے گا کہ جینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔۔"

"میں تمہاری طرح بہادر نہیں راج کمار۔۔"

"بہادر۔۔؟" راج کمار زور سے ہنسا۔۔"جینے کی بہادری دل کی موت کا نام ہے۔ اور تمہارا دل اب تک مرا نہیں' اسے مرجانے دو اندرجیت۔"

راج کمار نے آخری بار بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اور پھر کچھ کہے بغیر باہر چلا گیا۔

میں نے یکایک محسوس کیا کہ میں پسینے سے بھیگ گیا ہوں۔ گو مجھے کسی کی پروا نہیں، مگر اس راج کمار سے کبھی کبھی بہت ڈر لگتا ہے ــــ یہ مجھے سمجھنا چاہتا ہے ــــ مجھے چھونا چاہتا ہے ــــ مجھ سے بہت آگے، بہت تیز چلنے کی کوشش کرتا ہے ــــ میں اپنے کروڑوں ہاتھوں سے بھی اس کا گلا گھونٹ دوں تو مجھے وہ سکھ نہیں ملے گا جو بڑی بہو کو مار کر ملا ہے ــ راج کمار جیسا آدمی مر کر بھی بہت کچھ چھوڑ جاتا ہے ــ یہ میں جانتا ہوں۔

میں نے مڑ کر دیکھا ــــ چھوٹی بہو بن سنور کر ایک خوبصورت فیصلے کی طرح بیٹھی تھی، اور اپنے خاموش کمرے کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی اینٹ مارنے سے پہلے جھیل کے ساکت پانی کو دیکھے ــــ رات کے ختم ہونے میں صرف تین گھنٹے باقی تھے، اور ان تین گھنٹوں میں اسے بہت کچھ کرنا تھا۔ بڑی بہو کی موت کو اس نے اس مہرے کی طرح پکڑ رکھا تھا جس سے وہ ساری بازی جیتنے والی تھی ــــ میں نے دیکھا چھوٹی بہو کے جوڑے کے پھول سرہانے رکھے رات بے ہوش پڑی تھی، اور لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی، یکایک میں نے اس سوتی ہوئی رات کے چہرے پر زور کا تھپڑ مار دیا، اور آنے والے تین گھنٹوں کو کیچڑ کی طرح ہاتھوں سے اٹھا کر چہرے پر ملنے لگا ــــ دیکھتے ہی دیکھتے میں اندرجیت بن گیا، اور جب میں اندرجیت بن گیا تو میں چھوٹی بہو کے بند کمرے کے باہر جا کر کھڑا ہو گیا، اور تھکے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دینے لگا ــــ

چھوٹی بہو نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔

"تم ــــ؟" اس نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں ــــ" میں بھرائی آواز میں بولا۔

"اندر آجاؤ ــــ" چھوٹی بہو دھیمے سے مسکرائی "میں جانتی تھی ــــ"

"کیا ــ؟"

"یہی کہ تم آج آؤ گے ــــ"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، اور چپ چاپ کمرے میں داخل ہو گیا ــــ چند لمحوں کے لئے چھوٹی بہو نے نگاہیں جھکا لیں اور بالکل چپ ہو گئی ــــ

میں نے دیکھا، وہ اپنے گاؤں کی سونی پگڈنڈی پر بے تحاشہ دوڑی چلی جا رہی تھی، اور اس کے پیچھے اڑتا ہوا اس کا رنگین دوپٹہ دور کھڑے ہوئے اندرجیت کے لئے ایک دل ربا اشارا بن کر آواز دے رہا تھا ــــ میں نے دیکھا چھوٹی بہو جنگلی پیڑوں پر جھولا باندھے بے دم ہو کر جھول رہی تھی، اور اس کے بالوں سے گلاب کا سفید پھول گر کر اندرجیت کے ہاتھ میں آ گیا تھا ــــ میں نے دیکھا، وہ اندھیری رات میں کھیتوں کے بیچوں بیچ لیٹی سسک سسک کر رو رہی تھی، اور اندرجیت اسے اپنے ہاتھوں میں جکڑے اس کی بھیگی آنکھوں کو لگاتار چوم رہا تھا ــــ میں نے دیکھا، وہ گھر سے پیٹھی ہیھوئی صبح کو ہاتھ میں دودھ کا گلاس لئے اندرجیت کی پیشانی سہلا رہی تھی، اور اندرجیت بے خبر سو رہا تھا ــــ میں نے دیکھا، چھوٹی بہو بہت پیچھے چلی گئی تھی، اور ادھر ادھر سے کرید کرید کر سارے زخم ہرے کر رہی تھی ــــ گھوم گھوم کر پرانے مقبروں پہ رو رہی تھی ــــ ہزاروں باسی پھول جمع کر رہی تھی اور لاکھوں ٹوٹے ہوئے تارے اس کے ہاتھوں میں بکھرے پڑے تھے

میں نے ایک زور کا قہقہہ لگایا، اور بجھا کر بولا ——

"مینا —"

مینا نے اپنی ڈبڈبائی آنکھیں آہستہ سے اُٹھائیں۔

"اندرا مر گئی ——" میں نے لیکایک اپنے چہرے کو ہاتھوں میں ڈھانپ لیا۔

"بھول جاؤ اُسے ——" چھوٹی بہو نے بناوٹی اداسی سے کہا۔ اور پھر اپنی آنکھیں پونچھتی ہوئی دھیرے سے بولی —— "میری ایک بات کا جواب دو جیت ——"

"کیا —؟" میں نے پوچھا۔

"جیت ——" چھوٹی بہو نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ دیا —— "کیا میں تمہارے لائق نہیں ——؟"

"مینا —؟"

"کیا تم میرے ساتھ سکھی نہیں رہ سکتے تھے —؟"

"مینا —؟"

"کیا میں تمہارے بچے کی ماں نہیں بن سکتی تھی ——"

"چپ رہو مینا۔ کیا......"

"پھر تم نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کیوں کر دیا تھا ——؟"

"مینا، تمہیں اندرا کی موت کا کوئی غم نہیں ——؟"

"نہیں۔ مجھے اپنے سوا کسی کا غم نہیں۔ بولو، کیوں کر دیا تھا شادی سے انکار ——؟"

"میرے ماں باپ راضی نہیں تھے ——" میں نے شرمندہ ہو کر آنکھیں جھکا لیں۔

"بس —؟" چھوٹی بہو بڑی کڑواہٹ سے ہنسی —— "اتنی سی بات کے لئے تم نے مجھے ٹھکرا دیا —— زندگی بھر کے وعدے بھلا دیئے، اور اس ڈائن سے شادی کر لی —؟"

"اُسے ڈائن مت کہو مینا، وہ مر چکی ہے ——"

"میں زندگی بھر اُسے ڈائن کہوں گی —— اچھا ہوا وہ مر گئی۔ میں بہت خوش ہوں۔"

"مینا —؟" میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

"جیت ——" وہ اپنے آنسوؤں کو بے بسی سے بہاتی ہوئی بولی —— "مجھے اتنا بتا دو کہ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ کون سا قصور ہوا تھا مجھ سے، جو تم نے مجھے اتنی بڑی سزا دی ——؟"

"میں مجبور تھا مینا ——"

"تم مجبور تھے، تو تمہارے بھائی نے کیسے مجھ سے شادی کر لی، کیسے تمہارے ماں باپ راضی ہو گئے ——؟"

"وہ ضدی ہے۔ اُسے تم پسند آ گئی تھیں ——"

"تو یوں کہو کہ اپنے بھائی کی خوشی کے لئے تم نے مجھے بلیدان کیا ——"

"میں کچھ نہیں جانتا ــــ۔"

"جیت ــــ۔" چھوٹی بہو یکایک میرے بالکل قریب آگئی، اور بے تابی سے میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ "جیت ــــ جیت مجھے تم سے پیار ہے ــــ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی ــــ" اس نے میرے سینے میں منہ چھپا لیا، اور میری پیٹھ پر پاگلوں کی طرح ہاتھ پھیرنے لگی ــــ "نہیں رہ سکتی ــــ نہیں رہ سکتی ــــ"

"مینا ــــ۔" میں نے اسے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"جیت ــــ مجھ سے اس طرح منہ مت پھیرو ــــ تمہیں نہیں معلوم میرا کیا حال ہوتا ہے ــــ مجھ پر رحم کرو جیت، میں مر جاؤں گی ــــ۔"

میں نے پھر ایک بلند قہقہہ لگایا، اور اندرجیت کے خول سے باہر نکل کر کمرے کے دوسرے کونے میں کھڑا ہو گیا، اور چھوٹی بہو کو دیکھنے لگا۔ (یہ فن دنیا میں سوائے میرے اور کسی کو نہیں آتا، اس لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کب میں ایک بے کار محبت بن کر آیا اور تمہیں گونگا بہرا بنا گیا، اور کب ایک زہریلا پھول بن کر کھلا اور تمہاری سانسوں پر زندگی پھیر گیا) ــــ وہ اندرجیت کے گلے سے لپٹی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی، اور اس کے آنسو کسی کام نہیں آ رہے تھے ــــ میں نے دیکھا، چھوٹی بہو دس منٹ بعد مر جانے والی تھی ــــ اس کی وہ بیوقوف زندگی جس نے اس بھری دنیا میں بس ایک آرزو کے لئے اپنے آپ کو خراب کر لیا، اب راکھ بن کر ــــ اندرجیت کی اُداسی پر جمنے والی تھی۔

میں مسکرایا، اور چھوٹی بہو کو ایک پَر کی طرح اُٹھا کر گاؤں کی ایک پُرانی بارش میں کھڑا کر دیا۔ وہ بُری طرح بھیگ گئی تھی، اور اندرجیت اسے ہاتھ پکڑ کر بارش میں گھسیٹ رہا تھا ــــ

("نہیں جیت ــــ نہیں ــــ")

"مجھے اس طرح نہ ٹھکراؤ ــــ۔" وہ اب بھی مجھ سے لپٹی بلک رہی تھی۔

"میں جاتا ہوں مینا ــــ۔" میں نے اُسے الگ ہٹا دیا۔

"جیت ــــ" اُس نے پھر اُسی بے تابی سے میرے چہرے کو چھوا ــــ "جیت، تمہیں میری ضرورت ہے ــــ میں جانتی تھی تم آج آؤ گے ــــ تمہیں میری ضرورت ہے ــــ۔"

"مجھے اندرا کے سوا کسی کی ضرورت نہیں مینا ــــ۔"

"اندرا ــــ اندرا ــــ اندرا ــــ" چھوٹی بہو یکایک چیخ پڑی ــــ "کیا مل گیا تھا تمہیں اُس سے؟ کون سے سُکھ کی آس میں اب تک اس ڈائن کا نام لے رہے ہو ــــ؟"

"اسے ڈائن مت کہو مینا ــــ۔"

"ہزار بار کہوں گی ــــ زندگی بھر کہوں گی ــــ۔" وہ بچوں کی طرح بلک کر رو پڑی ــــ "وہ ڈائن تھی ــــ وہ ڈائن تھی ــــ۔"

میں ایک جھٹکے سے دروازے کی طرف بڑھا۔

"جیت ــــ۔" وہ پھر لپک کر مجھ سے لپٹ گئی ــــ "مت جاؤ ــــ۔"

"چھوڑ دو مجھے ــــ۔" میں نے اسے زور کا دھکا دیا۔

"جیت — " چھوٹی بہو نے یکایک غصے سے میرے بازو کو سختی سے پکڑ لیا — " جاتے ہو تو ایک بات اور سنتے جاؤ —"

"کیا — ؟" میں نے بہت تیز لہجے میں کہا۔

"اندرا کو میں نے مارا ہے — " وہ یکایک ہنس پڑی۔

"مینا — ؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں جیت — میں نے اسے زہر دے کر مارا ہے — " چھوٹی بہو کھل کھلا کر ہنس پڑی — میں نے اُسے غور سے دیکھا، اور پھر میرا بھرپور طمانچہ اس کے چہرے پر پڑا —

"جیت — " وہ زور سے ہنسی — "وہ ڈائن تھی — میں نے اُسے مار ڈالا —"

"مینا —" میں بہت زور سے چیخا۔

"تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے جیت — " وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی — "کچھ نہیں بگاڑ سکتے — "

"مینا — " میں نے پھر اُس کے چہرے پر زور کا طمانچہ مارا اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی — یکایک سارا کمرہ راج کمار کی ہنسی سے گونج گیا، جو بہت دیر سے دروازے کی اوٹ میں کھڑا سب کچھ سُن رہا تھا۔

چھوٹی بہو نے گھبرا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا، اور پھر دوڑ کر اس کے سینے سے لپٹ گئی، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی —

"راج — " وہ سسک کر بولی — "راج، اندرجیت سے پوچھو کہ وہ اتنی رات گئے میرے کمرے میں کیا کرنے آیا ہے —"

راج کمار پھر زور سے ہنسا، اور نشے میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو مشکل سے کھول کر اس نے میری طرف دیکھا۔

"راج — " چھوٹی بہو نے کسی بچے کی طرح کہا — "اس سے کہہ دو کہ یہاں سے چلا جائے — مجھے اس کی بھوکی آنکھوں سے ڈر لگتا ہے —"

"مینا — " راج کمار نے بڑے پیار سے چھوٹی بہو کے چہرے کو اُوپر اٹھا کر دیکھا، اور پھر اُس نے آہستہ سے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ "اندرجیت نہیں جائے گا"

"کیا — ؟" چھوٹی بہو نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں مینا — " راج کمار اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا — "اندرجیت نہیں جائے گا —"

مینا نے ڈر کر میری طرف دیکھا — راج کمار نے اس کے چہرے کو موڑ کر بڑی بے حیائی سے اُس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

اور پھر یکایک میں نے چھوٹی بہو کی کربناک چیخ سُنی۔

راج کمار اپنی پوری طاقت سے اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔

"راج کمار — " میں تیزی سے آگے بڑھا۔

"چُپ رہو — " راج کمار کا زوردار طمانچہ میرے چہرے پر پڑا، اور اس کے دوسرے ہی لمحے چھوٹی بہو کا مُردہ جسم دھم سے فرش پر گر گیا۔

"یہ تم نے کیا کیا — ؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

راج کمار نے کوئی جواب نہیں دیا، اور اپنے گالوں سے بہتے ہوئے خون کو پونچھنے لگا جسے چھوٹی بہو نے ناخنوں سے نوچ ڈالا تھا۔

کمرے میں ایک منحوس بدصورت سناٹا پھیل گیا۔ اور آس پاس کی چاروں دیواریں چھوٹی بہو کی چیخ سے دھیرے دھیرے گونجنے لگیں، اور ایک ایک کرکے اُس کی ساری باتیں اِدھر اُدھر سے سنائی دینے لگیں۔

"اندرجیت —" راج کمار بہت دیر بعد نشے میں بھرّا کر بولا —" مجھے معاف کرنا —" اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے میری طرف دیکھا، اور پھر سامنے کی کرسی پر لڑکھڑا کر بیٹھ گیا — اُسے اپنی ماں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی جو بہت دیر سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔ اور پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

میں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا، اور اپنے لوہے کے بوٹ زمین پر پٹکتا ہوا اندرجیت کے خول سے باہر آگیا، اور اُس کمرے سے، اُس گھر سے بہت دور جاکر کھڑا ہوگیا —

راج کمار اندرجیت کے خول سے کہہ رہا تھا —

"تم یہ نہ سمجھنا اندرجیت کہ بینا کو میں نے اس کی بے وفائی کے لئے مارا ہے"

میں پھر بڑے زور سے ہنسا اور سر اٹھاکر غور سے اوپر کی طرف دیکھا — میرا نیلا پرچم آسمانوں پر اُڑ رہا تھا، اور رات ریزہ ریزہ ہوکر چاروں طرف ایسے پڑی تھی جیسے آخری بازی ہارنے کے بعد کوئی تاش کے پتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ اُداس پیڑوں کے پیچھے چاند میری فتح کی کہانی سننے سے پہلے مر چکا تھا — خدا چپ تھا اور ستاروں کی بارش میں راستہ ڈھونڈ رہا تھا

"سب برباد ہیں —" میں نے پاگلوں کی طرح چیخ کر نعرہ لگایا، اور فتح کی مالا جو میرے گلے میں پڑی تھی اس میں ایک اور موتی گوندھ لیا —

یکایک چاروں طرف بڑی تیز دھول اُڑنے لگی۔ اور میں نے دیکھا کہ اِس دھول کی زد میں ہر چیز آتی جا رہی تھی۔ اور وہ جم رہی تھی — شہروں پر اور پہاڑوں پر اور سمندروں پر — دھول جو حسین زلفوں پر تھی اور دل رُبا آنکھوں پر تھی اور بے قرار لفظوں پر تھی — جو دھیرے دھیرے، ذرہ ذرہ ہونٹوں پر گر رہی تھی، اور گیتوں کے رنگ مدھم پڑ رہے تھے — جو کتابوں پر جم رہی تھی اور لفظوں کے معنی بدل رہے تھے — جو آج کو کل بنا رہی تھی — محبتوں کو یادوں میں اور یادوں کو کہانیوں میں بدل رہی تھی۔

"سب برباد ہیں —" میں نے سکھ کا ایک بھرپور سانس لیا اور مجھے اپنا لمبا سفر یاد آیا — میرے پیچھے موت کا ایک قافلہ تھا، اور مجھے ابھی ساری دنیا ختم کرنی تھی، اور بہت دور جانا تھا، اور خاک و خون کے لاکھوں تہوار منانے تھے۔

میں نے اپنے ہزاروں میل لمبے بگل کو اٹھایا اور ہونٹوں سے لگاکر پھونکنا چاہا کہ یکایک مجھے بڑی بہو یاد آگئی، اور جب بڑی بہو یاد آئی تو اتنے زور کی ہنسی آئی کہ پسلیوں میں درد ہونے لگا۔

میں نے ملپٹ کر دیکھا — بڑی بہو مردہ پڑی تھی، اور سناٹا اس کی لاش کو اٹھائے بسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے پیلے ناآسودہ چہرے پر چھوٹی بہو کا ظلم عیاں تھا، اور اُس کے ہونٹوں پر ایسی دھندلی مسکراہٹ جمی ہوئی تھی جو اگر پگھلتی تو شاید آنسو بن جاتی۔

"بڑی بہو ـــ" میں نے اس کے مردہ چہرے پر زور کا تھپڑ مارا ـــ "تیری کہانی ختم ہوگئی ـــ"

میں آگے بڑھا، اور جاتے جاتے اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اس کے مردہ بچے کو دیکھنا چاہا کہ یکایک میری انگلیوں میں جیسے سوئیاں چبھ گئیں ـــ مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا اور میری آنکھوں میں ساری دنیا اندھیری ہوگئی ـــ بڑی بہو کا پیٹ خالی تھا، اور اس کی کوکھ ایسے آسودہ تھی جیسے موتی اگلنے کے بعد سیپ کا دکھ مٹ جائے۔

میں نے جانے کس خوف سے گھبرا کر اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا، اور یکایک میرے کانوں میں ہنسی کی آواز گونجی ـــ میں نے سر کو اٹھا کر دیکھا ـــ بڑی بہو کھل کھلا کر ہنس رہی تھی۔

"بڑی بہو ـــ" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں پکارا۔

"تو ہار گیا ـــ" بڑی بہو نے اپنے ہونٹوں پر ہنسی دبانے کو ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ـــ "تو ہار گیا"

"بڑی بہو ـــ تم زندہ ہو ـــ؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"نہیں ـــ" بڑی بہو نے کہا ـــ "میرا بچہ زندہ ہے ـــ"

اور وہ ایک دلکش ہنسی کے ساتھ پھر مر گئی۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔ سامنے پالنے پر بڑی بہو کا بچہ پڑا تھا ـــ جیتا جاگتا ـــ اور اس کی آنکھیں نیلی تھیں، اور قندیلوں کی طرح جل رہی تھیں ـــ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ فضا میں ادھر ادھر لہرا رہے تھے، اور میرا نیلا پرچم آسمانوں پر چیتھڑے بن کر بکھر رہا تھا ـــ یکایک بڑی بہو کا بچہ زور سے چیخ کر رو دیا، اور میں یکایک لاکھوں کروڑوں فٹ کی بلندیوں سے لڑھکتا ہوا کھائیوں میں چلا گیا ـــ اور میں نے پہچان لیا ـــ یہ چیخ بہت پرانی تھی، اور اس وقت ابھری تھی جب سورج سے ٹوٹ کر ایک ٹکڑا فضا میں گرا تھا اور دنیا بن گیا تھا۔

میں نے دیکھا، میں واقعی ہار گیا تھا۔ میں نے دیوانوں کی طرح ایک چھلانگ لگائی، اور طوفان کی طرح آگے بھاگنے لگا ـــ مگر وہ چیخ میرا پیچھا کرتی گئی، اور ایک تیز بھالے کی طرح میرا خون پینے کو میری طرف آتی رہی ـــ میرے لوہے کے بوٹ بھٹی کی طرح گرم ہوگئے اور میرے پاؤں آبلوں سے چھلنے لگے ـــ میرے سر کا تاج پگھلنے لگا، اور اس کا گرم لاوا میری آنکھوں میں گھس گیا ـــ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں جنگلوں کی طرف بھاگا اور وہاں جہاں گھنی جھاڑیاں تھیں جا کر چھپ گیا ـــ مگر اس چیخ نے مجھے ڈھونڈ لیا، اور میرے پاس آکر چند لمحوں کے لئے رک گئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے دو حصوں میں بٹ گئی ـــ پھر اس کا ایک حصہ تلوار بن کر میرے سینے کے آرپار ہوگیا اور ایک حصہ پھول بن کر جھاڑیوں میں کھل گیا۔

میرے منہ سے موت کی ایک کربناک چیخ نکلی، اور میں بے دم ہو کر بھاگنے لگا، اور بہت دور جا کر ریگستانوں میں چھپ گیا ـــ مگر وہ چیخ وہاں بھی آگئی، اور آدھی گرم ریت بن کر میرے حلق میں گھس گئی، اور آدھی نخلستان، میٹھا چشمہ بن کر پھوٹ نکلی ـــ

میری آنکھوں میں ساری دنیا پتھرا گئی۔ اور میری فتح کا ہار میرے گلے سے ٹوٹ کر بکھر گیا۔

میں نے پھر کسی طرح اپنی سانسوں کو سمیٹا اور اٹھ کر بھاگا اور گہرے سمندروں میں جا کر چھپ گیا ـــ مگر وہ چیخ ایک جانی دشمن کی طرح میرا پیچھا کرتی ہوئی وہاں بھی آگئی اور آدھی مگرمچھ بن کر مجھے نگل گئی اور آدھی شرما کر سیپ کے پاس چلی گئی اور

موتی بن کر کھل گئی۔

میرے بے ہوش ذہن میں بڑی بہو کی ہنسی کی آواز صاف صاف سنائی دے رہی تھی ——

"تو ہار گیا —— تو ہار گیا —— "

اور مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور کسی سے کچھ نہیں چھین سکتا —— اور یہ کہ یہ چیخ مجھ سے بہت بلند ہے اور بہت عظیم ہے اور امر ہے —— یہ ہر جگہ ہے —— ازل سے ابد تک —— اس کنارے سے اس کنارے تک —— یہ چیخ جو جاوداں ہے دیوتاؤں کی طرح، پیہم رواں ہے آبشاروں کی طرح اور ہر دم جواں ہے محبتوں کی طرح ——

یہ بڑی بہو کے بیٹے کی چیخ
یہ زندگی
زندگی
زندگی

ابراہیم یوسف

# خطوط کی واپسی

منظر: ایک سجا ہوا ڈرائنگ روم، جس میں تمام سامان قیمتی ہے۔ جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو ناہید سامنے صوفے پر بیٹھی نظر آتی ہے جو نظریں جھکائے کام میں مشغول ہے۔ کچھ دیر بعد نازنین بہت خوش خوش کمرے میں داخل ہوتی ہے، اور کتابیں صوفے پر رکھ کر ناہید کے پاس بیٹھ کر۔

نازنین: ارے ناہید آپا۔ آپ کا یہ سوئٹر ابھی تک تیار نہیں ہوا۔

ناہید: (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے بغیر نظریں اٹھائے) دن بھر دوسرے کام کرتی رہی۔ فرصت ہی نہیں ملی۔

نازنین: مگر شاید کچھ زیادہ شوخ ہوگیا ہے۔

ناہید: (اسی طرح اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) آج کالج میں بہت دیر کردی۔

نازنین: جی —— وہ —— آج —— ہمارے کالج میں ایک لیکچر تھا۔

ناہید: اچھا —(نظریں اٹھا کر نازنین کو غور سے دیکھ کر) کس کا لیکچر تھا؟

نازنین: جی وہ میرا مطلب ہے —— باہر سے ایک صاحب —— میرا مطلب ہے یونیورسٹی کے پروفیسر آئے تھے

ناہید: (پھر اپنے کام میں مشغول ہو کر) کس ٹاپک پر بولے تھے؟

نازنین: یہی ہماری خارجہ پالیسی پر — (مسکرا کر) بیچ بیچ میں بڑے مزیدار شعر بھی سُناتے جاتے تھے۔

ناہید: اچھا — (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے)

## افرادِ تمثیل

فاروقی —— ایک مشہور بیرسٹر

ناہید —— فاروقی کی لڑکی

نازنین —— فاروقی کی ایک عزیز لڑکی جو اُس کے ساتھ رہتی ہے

عارف —— ایک نوجوان وکیل

ایک مُلازم

آج بہت خوش ہو، کیا بات ہے؟

**نازنین:** کوئی خاص بات نہیں۔ ویسے ہی آج کچھ موڈ اچھا ہے ـــ میرا کوئی خط تو نہیں آیا۔

**ناہید:** (نظریں اٹھا کر ناہید کو غور سے دیکھ کر) کس کا خط؟

**نازنین:** (کچھ دیر خاموش رہ کر نظریں جھکا کر) گھر سے۔ دیکھئے نا، اباجی کتنے دنوں تک خط نہیں لکھتے۔

**ناہید:** (پھر اپنے کام میں مشغول ہو کر) ان کا کوئی خط نہیں آیا

(نازنین مشکوک نظروں سے ناہید کو دیکھتی ہے)

تم جنگل میں تو بیٹھی نہیں ہو کہ انہیں فکر ہو۔

(نازنین خاموش رہتی ہے، مگر اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ناہید نظریں اٹھا کر نازنین کو دیکھ کر)

بھئی تم وقت پر گھر لوٹ آیا کرو، مجھے ہول سا اٹھنے لگتا ہے۔

**نازنین:** (اس طرح ناہید کو دیکھتی ہے جیسے وہ اس سے نظریں ملاتے ہوئے شرما رہی ہو) میں تو سیدھی ہی گھر چلی آتی ہوں۔ وہ تو آج اتفاق سے دیر ہو گئی۔

(ناہید پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی ہے۔ نازنین کچھ دیر خاموش رہ کر)

ناہید آپا، آج پکچر چلئے نا، کل اتوار ہے۔

**ناہید:** بھئی آج تو مجھے بہت ضروری کام ہے۔

**نازنین:** واہ ناہید آپا ـــ جب بھی میں پکچر کے لئے کہتی ہوں، آپ کام کا بہانہ بنا دیتی ہیں۔ آج میرا کچھ سہیلیوں سے بھی وعدہ ہو چکا ہے۔

(ناہید خاموشی سے اپنا کام کرتی رہتی ہے ـــ نازنین کچھ دیر خاموش رہ کر)

آپ تو اس سوئٹر پر اس طرح جھکی ہوئی ہیں کہ اگر آج یہ تیار نہیں ہوا تو سردی ہی گذر جائے گی۔

(ناہید کوئی جواب نہیں دیتی۔ اپنے کام میں مشغول رہتی ہے)

تو پھر آج چل رہی ہیں نا؟

**ناہید:** نہیں، آج نہیں ـــ

(اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے)

اب تم جا کر منہ ہاتھ دھو لو، اور عبدل سے چائے کے لئے کہہ دو کہ یہیں لے آئے۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔

**نازنین:** (کھڑے ہو کر ایسے لہجے میں جس میں بددلی نمایاں ہے)

آپ نے چائے پی لی ہوتی۔

**ناہید:** (نظریں اٹھا کر نازنین کو دیکھ کر)

میں نے کبھی بلا تمہارے پی ہے جو اب پی لیتی؟ ڈیڈی بھی ابھی تک نہیں لوٹے۔ آج جانے کیوں سب ہی دیر کر رہے ہیں۔

**نازنین:** (مسکرا کر دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے)

ناہید آپا، اب ہم کوئی بچے تو ہیں نہیں کہ راستہ بھول جائیں گے۔

(دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے ـ ناہید اسے جاتا ہوا دیکھتی رہتی ہے ـــ پھر اپنے پاس سے ایک خط اٹھا کر اس کا پتہ پڑھتی ہے ـ پھر اس پر لگی ہوئی ڈاک خانے کی مہر دیکھتی ہے اور پھر اپنے پاس رکھ کر کام میں مشغول ہو جاتی ہے ـــ کچھ دیر بعد فاروقی صاحب کمرے

میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت خوش ہیں۔ ناہید کے پاس آتے ہوئے)

فاروقی : کہو بیٹی، کیا ہو رہا ہے۔ (ناہید کھڑی ہو جاتی ہے) ارے ابھی تک تمہارا یہ سوئٹر پورا نہیں ہوا۔ (کوٹ اتارتے ہیں۔ ناہید کوٹ اتارنے میں ان کی مدد کرتی ہے) نازنین کالج سے آ گئی۔

ناہید : جی ہاں۔ (کوٹ صوفے کی پشت پر ڈالتے ہوئے) آج وہ بھی کالج سے دیر میں آئی ہے

فاروقی : ہو گئی ہو گی کسی وجہ سے دیر۔ (صوفے پر بیٹھ کر) ارے بھئی کیا آج چائے کا پروگرام نہیں ہے

ناہید : چائے آ رہی ہے ڈیڈی —— مگر اس کا کالج سے دیر میں آنا ——

فاروقی : (بات کاٹ کر) کیا بوڑھی کھوسٹ عورتوں کی طرح باتیں کرتی ہے۔ کوئی کام ہو گا دیر ہو گئی (محبت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) اس عمر میں بوڑھیوں جیسی باتیں اچھی نہیں لگتیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) بیٹی آج ہم وہ کیس جیت گئے۔

ناہید : کون سا کیس ڈیڈی ؟

فاروقی : وہی مرڈر کیس۔ بہت اہم کیس تھا۔ اس کے جیتنے پر تمام بار حیرت زدہ ہے۔ (مسکرا کر) سچ پوچھو تو اس کیس میں میری پرسیج اسٹیک پر لگی ہوئی تھی۔

(نازنین کمرے میں آتی ہے۔ فاروقی اسے دیکھ کر) ارے نازنین یہ ناہید تمہاری شکایت کر رہی ہے کہ تم کالج سے دیر میں آئی ہو۔

نازنین : انکل! ناہید آپا تو بلا وجہ پریشان ہو جاتی ہیں، آج کالج میں ایک لیکچر تھا، اسے سننے لگی تھی۔

ناہید : (نازنین کو دیکھ کر) چائے کا کہہ دیا؟

نازنین : جی ہاں، عقیل لا رہا ہے۔ (فاروقی کو دیکھ کر) اس بار چھٹیاں کہاں گذاری جائیں گی انکل؟

فاروقی : یہ پروگرام تم دونوں بتانا۔

(عقیل چائے لا کر سامنے میز پر رکھ دیتا ہے اور واپس چلا جاتا ہے۔ نازنین چائے بنانے لگتی ہے۔ فاروقی کچھ دیر خاموش رہ کر) عارف پرسوں انگلینڈ جا رہا ہے؟

(ناہید نظریں اٹھا کر فاروقی کو دیکھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے)

بہت ذہین ہے اور سچ پوچھو تو آج کا مقدمہ اسی کی ذہانت سے جیتا ہے۔

(عارف کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ فاروقی اسے دیکھ کر) ارے بھئی عارف آؤ ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ کہو تمہاری تیاری مکمل ہو گئی ؟

عارف : جی ہاں، تیاری تو مکمل ہو گئی ہے —— میں آپ کو آج کی کامیابی پر مبارک باد دینے حاضر ہوا تھا۔

فاروقی : سارا بار حیرت زدہ ہے کسی کو اس میں جان نظر نہیں آتی تھی۔

عارف : مجرم خود نا امید تھا۔

فاروقی : مگر مجھے پوری امید تھی۔ لوور کورٹ کے فیصلے میں جو قانونی سقم رہ گئے تھے، انہوں نے

بڑی مدد کی۔ مگر بھئی در حقیقت تم نے ڈیزائنیں تیار کرنے میں جو محنت کی وہ قابلِ مبارک باد ہے۔

عارف : یہ تو آپ کا کرم ہے کہ آپ اس قدر اہم معاملات میں مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔

فاروقی : ذہین اور محنتی آدمی پر اعتماد نہ کرنا بزدلی ہے۔ (کھڑے ہو کر) اچھا ذرا میں کپڑے بدل لوں، آج کلب میں ایک اہم میٹنگ ہے۔ (عارف کھڑا ہو جاتا ہے) ارے بھئی بیٹھو۔ تمہارا پلین کس وقت پرواز کرے گا؟

عارف : دس بج کر پندرہ منٹ پر

فاروقی : دس بج کر پندرہ منٹ پر! اچھا ۔۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہی ایئرپورٹ چلیں گے۔ (کمرے سے چلے جاتے ہیں)

نازنین : (چائے کی پیالی عارف کو دے کر) آپ کتنے عرصہ انگلینڈ میں رہیں گے؟

عارف : (پیالی لے کر) ویسے پروگرام تو ایک سال ہی کا ہے۔ (مسکرا کر) اگر خدا نے مجھے آپ کے سایہ سے محفوظ رکھا تو ۔۔۔

نازنین : جی ۔۔ کیا مطلب؟

عارف : (چائے کا گھونٹ لے کر مسکراتے ہوئے) اگر امتحان ایک ہی سال میں پاس کر لیا تو ایک ہی سال میں واپس آجاؤں گا۔

نازنین : (کسی قدر برہم ہو کر) میں ایک سال کیا ڈیٹین ہو گئی ہوں کہ آپ نے میرا مذاق بنا رکھا ہے، جیسے آپ تو کبھی ڈیٹین ہوئے ہی نہیں ہوں گے

عارف : (ہنس کر) فی الحال تو ریکارڈ میں ڈیٹین ہونے کی کوئی انٹری نہیں ہے۔

نازنین : (طنزیہ) چالاک لوگ ایسی ہی باتیں اپنا ڈیفنس تیار کرنے میں پیش کرتے ہیں۔

(ناہید مسکراتی ہے۔ عارف قہقہہ مار کر ہنستا ہے۔ پھر مسکرا کر)

عارف : آپ کا یہ کامپلی مینٹ انکل تک پہونچا دیا جائے گا۔

نازنین : کامپلی مینٹ آپ کے لئے ہے انکل کے لئے نہیں۔ ضرور پہونچا دیجئے۔
(کچھ دیر خاموش رہ کر)
آپ سے ملنے نجمہ بھی آرہی ہے یا نہیں؟

عارف : جی ہاں، تشریف تو وہ بھی لا رہی ہیں۔

نازنین : چلئے دو چار دن اسی کے ساتھ تفریح رہے گی ہاؤ سوئٹ شی از۔

عارف : پھر انگریزی کی ٹانگ توڑی ۔۔ (ہنس کر) یوں فرمایئے: لذیذ ہے، مزیدار ہے، خوش ذائقہ ہے۔ یہ سوئٹ کیا؟

نازنین : اسی انگریزی کے بل بوتے پر آپ انگلینڈ تشریف لے جا رہے ہیں۔
(کھڑے ہو کر بلند آواز سے)
عیدل یہ چائے کے برتن لے جاؤ۔

(نازنین کمرے سے چلی جاتی ہے۔ ناہید نظریں جھکائے سوئٹر بنتی رہتی ہے۔ عارف کچھ دیر بیٹھا دیکھتا رہتا ہے، پھر آہستہ سے)

عارف : شیڈ تو آپ نے بہت خوب پسند کیا ہے۔

ناہید : (نظریں اٹھا کر عارف کو دیکھتی ہے پھر نظریں جھکا کر) آپ کو پسند ہے؟

عارف : پسند تو بہت ہے مگر ۔۔ (ناہید پھر نظریں اٹھا کر عارف کو دیکھتی ہے۔ دونوں کی نظریں

ملتی ہیں ، ناہید کچھ نظریں جھکا لیتی ہے ) ــــ
جانے کس خوش قسمت کے لئے ہے ۔
(ناہید تھوڑا سا مسکراتی ہے ، مگر خاموش
رہتی ہے ـــ عارف کچھ دیر خاموش رہ کر)
میرے انگلینڈ جانے کے بعد آپ مجھے بھول تو
نہیں جائیں گی ۔

ناہید : (مسکرا کر) بھولنے والی چیز ہی کو انسان
بھولتا ہے ۔

عارف : اور میں بھول جانے والی چیز ہوں ۔

ناہید : (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) آپ کے والد
صاحب کس وقت آرہے ہیں ؟

عارف : (غور سے ناہید کو دیکھتا ہے جو نظریں جھکائے
ہوئے ہے) آج رات ڈیڑھ بجے ۔

ناہید : (نظریں اُٹھا کر عارف کو دیکھ کر) اور آپ نے
بتلایا تک نہیں کہ اُن کے لئے کمرہ تیار کرایا
جاتا ۔

عارف : اس مرتبہ میرا خیال تھا کہ وہ میرے ساتھ ہی
قیام کریں ۔

ناہید : ڈیڈی سے اجازت لے لی ہے کہیں وہ ناراض
نہ ہو جائیں ۔ اور پھر یہ کسی غیر کا مکان تو ہے
نہیں ۔

عارف : آپ کو بلاوجہ تکلیف ہوگی ۔

ناہید : اس سے پہلے کبھی تکلیف ہوئی ہے جو اب ہوگی
ہاں اگر وہ یہاں قیام نہ کریں گے تو ضرور دکھ
ہوگا ـــ آپ کی والدہ بھی آرہی ہیں ؟

عارف : آپ کو تو معلوم ہے کہ وہ ہارٹ پے شینٹ
ہیں ۔ اس قدر لمبا سفر کیسے کر سکتی ہیں ؟

ناہید : مجھے آرہی ہے یہ اچھا ہے ۔ اُس سے اس
بہانے ملاقات ہو جائے گی ۔ اور آپ کے والد
کو بھی تو ایک عرصہ سے نہیں دیکھا ہے ۔

عارف : وہ بھی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں ۔

(ناہید خاموش رہتی ہے اور سوئیٹر کو الٹ پلٹ
کر دیکھنے لگتی ہے ــــ عارف کچھ دیر خاموش
رہ کر)
آپ ایئرپورٹ تو آئیں گی ۔

ناہید : کوشش تو کروں گی ۔

عارف : صرف کوشش ؟

ناہید : (مسکرا کر) جی ہاں ــــ اس لئے کہ کہیں آپ
مجھے بداخلاق نہ سمجھ لیں ۔

(نازنین کمرے میں داخل ہو کر عارف سے)

نازنین : آپ کو انکل بلا رہے ہیں ۔

عارف : بہت اچھا ۔ (کھڑے ہو کر) کہاں ہیں ؟

نازنین : اپنی اسٹڈی میں بیٹھے ہیں ۔

(عارف کمرے سے چلا جاتا ہے ۔ نازنین واپس
جانے کے لئے مڑتی ہے ۔ ناہید اسے دیکھ کر)

ناہید : نازنین ! عارف صاحب کے والد کے لئے کمرہ
تیار کرا دو ، وہ آج ہی آرہے ہیں ۔

نازنین : بہت اچھا ـــ (مسکرا کر) ــــ مگر یہ میں
اعتراضات کی چارج شیٹ ہاتھ میں نہ تھما
دیجئے گا ۔

(عبدل کمرے میں داخل ہوتا ہے ۔ نازنین اسے
دیکھ کر)
مہمانوں کا کمرہ تیار کرنا ہے ۔
(عبدل خاموشی سے چائے کے برتن اٹھا کر
چلا جاتا ہے)
مہاشے ایسے خاموش رہتے ہیں جیسے چوہیں

گھنٹے مرن بہت رکھتے ہوں۔

(ناہید کی طرف دیکھ کر)

آپ عارف بھائی کے والد صاحب کو ریسیو کرنے اسٹیشن تو جائیں گی؟

**ناہید:** رات کے ڈیڑھ بجے!

**نازنین:** رات کے ڈیڑھ بجے آ رہے ہیں؟ انہیں کوئی دوسری ٹرین نہیں ملی کہ ہم بھلے آدمیوں کی طرح انہیں ریسیو کرنے جاتے۔

**ناہید:** (مسکرا کر) انہیں تم جیسے بھلے آدمیوں کی ضرورت نہیں ہے۔

**نازنین:** تو گویا میں —

**ناہید:** (بات کاٹ کر) اب جا کر کمرہ تیار کر دو — اور ہاں، ذرا دیکھ لینا آج رات کے کھانے کے لئے کیا تیاری ہو رہی ہے۔

**نازنین:** یہ آج آپ اپنی ساری ذمہ داریاں مجھے کیوں سونپ رہی ہیں۔

(ناہید خاموش رہتی ہے۔ نازنین کچھ دیر بعد) —

بے چارے عارف بھائی انگلینڈ چلے جائیں گے تو عجیب سونا سونا سا لگے گا۔

**ناہید:** (مسکرا کر) ہاں۔ اب تم سے جھگڑنے والا کوئی نہ رہے گا۔

**نازنین:** ان کے دل میں کس قدر خلوص اور پیار ہے، شاید وہ تجھ کو بھی اس قدر نہ چاہتے ہوں گے جس قدر مجھے چاہتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں مجھے یہ کبھی احساس نہیں ہوا کہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔

(کچھ دیر خاموش رہ کر)

گئے سال جب ہم پہاڑ پر گئے تھے تو انہوں نے ہمارے آرام کا کس قدر خیال رکھا تھا۔ نئے نئے پروگرام بناتے تھے۔ نئے نئے کھیل ایجاد کرتے تھے۔ جانے کے بعد وہ کس قدر یاد آئیں گے۔

(نازنین کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں جن کو وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھتی ہے۔ ناہید نازنین کو دیکھ کر)

**ناہید:** انسان کو اس قدر جذباتی نہیں ہونا چاہئے آخر وہ تمام زندگی کے لئے تھوڑا ہی جا رہے ہیں، دعا کرو کہ کامیاب لوٹیں۔

**نازنین:** میں تو ایرپورٹ پر انہیں سی آف کرنے نہ جا سکوں گی۔ نہیں تو وہاں بھی رو پڑوں گی۔

**ناہید:** کبھی کبھی تو تم اس قدر جذباتی ہو جاتی ہو کہ دوسرے کی ہمت جواب دینے لگتی ہے۔

**نازنین:** ناہید آپا! کیا آپ کو اُن کے جانے کا غم نہیں ہے؟

**ناہید:** تو کیا صرف آنسو بہا کر ہی غم ظاہر کیا جاتا ہے؟ آنسو پونچھ ڈالو، نہیں تو اُن کو بہت دُکھ ہوگا۔

(نازنین آنسو پونچھ لیتی ہے، اور خاموش کھڑی ہو کر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگتی ہے ناہید کچھ دیر خاموش رہ کر)

تم جا کر ان کے والد کے لئے کمرہ تیار کرا دو۔ ہم آج کھانے پر ان کو روک لیں گے۔

(نازنین خاموش رہتی ہے۔ ناہید پھر سویٹر بننے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد نظریں اٹھا کر نازنین کو دیکھ کر)

جا رہی ہو نا؟

نازنین : جا رہی ہوں ناہید آپا۔

(جانے کے لئے مڑتی ہے کہ فاروقی صاحب داخل ہوتے ہیں۔ اُن کے پیچھے پیچھے عارف آتا ہے۔ فاروقی صاحب ناہید کو دیکھ کر)

فاروقی : بیٹی! میں نے عارف کو آج رات کھانے پر روک لیا ہے۔ میں کلب جا رہا ہوں ساڑھے آٹھ بجے تک واپس آجاؤں گا۔

(دروازے کی طرف بڑھتے ہیں)

نازنین : انکل! من دو من نمک کا انتظام کرنا پڑے گا۔

عارف : (مسکرا کر) بھئی ہم تو جس کا نمک کھاتے ہیں، دل کھول کر کھاتے ہیں کہ نمک حرامی کا احتمال نہ رہے۔

(فاروقی ہنستے ہوئے کمرے سے نکل جاتے ہیں)

نازنین : (عارف سے) فرمایئے، آپ کے لئے کیا کیا انتظام کیا جائے؟

عارف : یہ تو کھلانے والی کی ہمت پر ہے۔ مہمان کیا کہہ سکتا ہے۔

نازنین : آج آپ کی دعوت کی میں انچارج ہوں۔ ذرا میری سخاوت بھی دیکھئے گا، انگلینڈ میں بھی یاد آئے گی۔

عارف : اچھا — چوہے کو چندی مل گئی ہے جب ہی خود کو بزاز سمجھ رہا ہے۔

(ناہید مسکراتی ہے)

نازنین : خیر آج چوہے کی بزازی بھی دیکھ لیجئے، کیا یاد کیجئے گا کہ کبھی کوئی چوہا بزاز بنا تھا۔

(کمرے سے چلی جاتی ہے۔ عارف خاموش کھڑا ناہید کو دیکھتا رہتا ہے جو نظریں جھکائے سوئٹر بُنتی رہتی ہے۔ کچھ دیر بعد نظریں اٹھا کر عارف کو دیکھ کر)

ناہید : ابھی نازنین آپ کے جانے کے تصور ہی سے رو پڑی تھی۔

عارف : اس کی موجودگی میں میں تنہا کا خیال تک بھول جاتا ہوں۔

(کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر)

میں یہاں سے جو یادیں اور ناکامیاں لے کر جا رہا ہوں وہ مجھے وہاں کس قدر ستائیں گی۔ میں ان کا تصور ابھی سے کر رہا ہوں۔

ناہید : (غور سے عارف کا چہرہ دیکھ کر) —— ناکامیاں؟

عارف : جی ہاں —— انسان زندگی میں کچھ غلطیاں صرف جذباتی بن کر کرتا ہے، اور پھر اُن پر اسے تمام زندگی پچھتانا پڑتا ہے۔ میں ایک مہینے سے جس ذہنی الجھن میں مبتلا ہوں آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔

ناہید : ذہنی الجھن!

عارف : جی ہاں —— (ٹھنڈی سانس بھر کے) میں نے اکثر آپ سے کچھ کہنا چاہا، مگر آپ کی خاموشی نے مجھے کچھ نہ کہنے دیا۔ تو میں نے لکھ کر اس کا اظہار کر دیا جس میں کچھ منت تھی کچھ درخواست تھی۔ یہ میری بڑی غلطی تھی کہ میں جذباتی ہو گیا تھا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا جس سے آپ کو ناگواری ہوئی۔

ناہید : (نظریں اٹھا کر عارف کو دیکھ کر) لیکن میں نے تو کبھی ایسا نہیں سوچا ایسا نہیں کہا۔

عارف : لیکن آپ کی اس ایک مہینے کی خاموشی نے تو
سب کچھ کہہ دیا۔

ناھید: ہر بات کا جواب بھی تو نہیں دیا جاتا۔

عارف : اسی لئے تو مجھے افسوس ہے۔ میں نے چاند کو
پکڑنے کی کوشش کی۔ یہ نہیں سوچا کہ وہاں
تک پہونچنے کی میری اوقات ہے بھی یا نہیں۔
(کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر)
آپ میرا وہ خط واپس کر دیجئے۔
(ناھید حیرت سے عارف کو دیکھتی ہے اور اس
کے چہرے پر غم کے آثار ظاہر ہوتے ہیں کہ نازنین
کمرے میں داخل ہوکر)

نازنین : ناھید آپا! کھانے کا انتظام تو میں اپنے کمرے ہی
میں کئے بیٹھی ہوں۔

ناھید: (نظریں جھکا کر) ہاں کر لو۔
(نازنین جانے کے لئے مڑتی ہے۔ پھر پلٹ کر
عارف کو دیکھ کر جو دوسری طرف منہ کئے کھڑا
ہے)

نازنین : اے جناب! شاید آپ ناھید آپا سے جھگڑ لئے
ہیں جو منہ پھلا کر ادھر کھڑے ہو گئے ہیں —
(عارف خاموش کھڑا رہتا ہے)
اجی جناب ادھر تو دیکھئے۔
(عارف پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ نازنین چند سیکنڈ
انتظار کرتی ہے پھر اس کے سامنے جاکر)
ارے آپ کی آنکھوں میں آنسو۔ عارف بھائی
اگر آپ کی آنکھوں میں آنسو آئے تو میں رو
رو پڑوں گی۔

عارف : (نازنین کا کاندھا تھپ تھپا کر) نہیں نازنین
نہیں۔

نازنین : آپ رو کیوں رہے ہیں ؟

عارف : مجھے تم لوگوں سے جدا ہونے کا بہت افسوس ہے

نازنین : آپ تو ایک سال بعد واپس آجائیں گے۔

عارف : ہاں ہاں آجاؤں گا۔
(تیزی سے کمرے سے نکل جاتا ہے۔ نازنین حیرت زدہ
کھڑی رہ جاتی ہے۔ پلٹ کر ناھید کو دیکھتی ہے،
جو اپنے آنسو پونچھ رہی ہے)

نازنین : ارے آپ بھی رو رہی ہیں! آخر بات کیا ہے ؟

ناھید : (آنسو پونچھ کر) نہیں نازنین کوئی بات نہیں ہے۔

نازنین : مگر —

ناھید : (بات کاٹ کر) تم نے کھانے کا انتظام کر لیا؟

نازنین : وہ تو ہو رہا ہے مگر —

ناھید : بات کیا ہوگی۔ جاؤ تم جاکر خود دیکھ لو۔ (نازنین
کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے پھر کچھ سوچ کر
جانے کے لئے مڑتی ہے۔ ناھید اسے جاتا ہوا دیکھ کر)
تمہارا خط ہے۔ (خط اس کی طرف بڑھا کر) لو۔
مگر اسے یونہی واپس کر دینا۔

نازنین : (خط لے کر) واپس کر دینا!

ناھید : (ٹھنڈی سانس بھر کر) تمہارے گھر سے نہیں آیا ہے
اس پر کالج کے پوسٹ آفس کی مہر ہے — لوگ
ایسے خط واپس مانگنے کے لئے لکھتے ہیں (خط نازنین
کے ہاتھ میں دے کر سویٹر ادھیڑنے لگتی ہے)

نازنین : ارے آپ اسے ادھیڑ رہی ہیں! آپ نے تو اس پر
دن رات محنت کی ہے۔

ناھید : یہ ڈیزائن ٹھیک نہیں ہے۔ اب کسی اور اچھے
ڈیزائن سے بُنوں گی۔ (نازنین حیرت سے اس
کا چہرہ دیکھنے لگتی ہے۔ ناھید نظریں جھکا کر اپنے
کام میں مشغول ہو جاتی ہے) (پردہ)

• حسن جمیل مسرت

# خودکشی کا موقع

خودکشی کی خبر محلے میں آگ کی طرح پھیل گئی۔

ہوا یہ کہ گلی میں ایک شادی تھی، اور بارات کے لئے شامیانے لگائے جا رہے تھے۔ شامیانے لگانے والے مزدوروں میں سے ایک جب چھت پر شامیانے کی رسی باندھنے چڑھا تو عادتاً تاکا جھانکی کے سلسلے میں اس کی نظر سامنے والے مکان میں چلی گئی جہاں ایک نوجوان کی لاش چھت کی کڑیوں میں لٹکی ہوئی جھول رہی تھی۔ پھر ایک ایک کر کے بہت سے لوگ چھت پر چڑھ آئے اور جھولتی ہوئی لاش کو دیکھنے لگے ــــ اور ان میں بہت کم لوگ تھے جنہوں نے مرنے والے کو اس سے پہلے دیکھا تھا۔

مرنے والے کے متعلق محلے والوں کی معلومات بڑی محدود تھیں ــــ

ملک صاحب صرف اس کا نام بتا سکتے تھے اور وہ بھی "شاید" کے ساتھ ــــ "شاید اس کا نام ممتاز تھا"۔

محلے کی عورتوں میں سے چند کا بیان تھا کہ وہ ایک کمرے کے اس نیچے نیچے سے مکان میں ہمیشہ تنہا دیکھا گیا تھا، اور عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس شہر میں وہ بالکل اکیلا تھا۔

اخبار والے لڑکے کا کہنا تھا کہ ممتاز کسی اردو اخبار میں ملازم تھا۔

اور کالج میں پڑھنے والے چند لڑکوں کا خیال تھا کہ ممتاز شاعر بھی تھا، کیونکہ انہوں نے مرنے والے کو کسی ادبی جلسے میں نظم پڑھتے سنا تھا۔

ویسے یہ بات نہیں تھی کہ مرنے والا اس گلی میں نیا آیا تھا۔ اسے یہاں رہتے ہوئے سال بھر سے زیادہ ہو چکا تھا مگر محلے والوں کی عدم واقفیت کی وجہ در اصل یہ تھی کہ اُس کے روز کے معمولات محلے کے اور لوگوں سے بالکل الگ تھے۔ جس وقت گلی کے مرد دفتر وں کو جانے کے لیے گھر سے نکلتے اس وقت اُس کی نیند بھی پوری نہ ہوئی ہوتی۔ وہ دن چڑھے سو کر اٹھتا اور بارہ ایک بجے کے قریب گھر سے باہر نکلتا، اور یہ ایسا وقت تھا جب گلی میں یا تو عورتیں ہوتیں یا بچے۔ مرد سب دفتروں میں ہوتے۔ اسی مناسبت سے اس کی واپسی نصف شب کے قریب ہوتی، اور یہ ایسا وقت تھا جب گلی میں آوارہ کتوں کے علاوہ اور کوئی نہ ہوتا ــــ ایسی صورت میں ظاہر ہے محلے میں اس کا کون واقف کار نکلتا۔ ویسے ذاتی طور پر وہ ملنسار بھی نہیں تھا۔ چھٹیوں کے دن وہ بہت کم گلی میں نظر آتا ــــ عام طور پر وہ اپنے کمرے میں پڑا موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتا یا کچھ لکھتا رہتا۔ اور پھر جب اس کا جی چاہتا تو لباس تبدیل کر کے باہر

نکلتا اور سر جھکائے ہوئے گلی سے گذر جاتا ـــ یوں کسی سے سلام دعا کی نوبت بھی نہ آتی۔ لوگ زیادہ سے زیادہ اس کی صورت آشنائی کا دعویٰ کر سکتے تھے۔

ایسے مرنے والے سے بھلا ہمدردی ہوتی بھی تو کیسے ؟

نہ اس کی بیوی تھی جسے بیوگی کا غم ہوتا۔ نہ اس کی ماں تھی جس کی کوکھ اُجڑی ہوتی۔ نہ بہن بھائی جنہیں بے سہارا ہونے کا غم ہوتا۔ اس کا کوئی بھی تو نہیں تھا جو اس کے لئے دو آنسو بہا دیتا۔ رہے محلے والے انہیں اس کی موت کا دکھ کم اور کوفت زیادہ تھی۔ سب سے زیادہ کوفت کی بات تو شادی کے گھر والوں کے لئے تھی۔ ان کے دروازے پر بارات آنے والی تھی، اور سامنے کے گھر میں ایک لاش چھت سے جھول رہی تھی ـــ حتیٰ کہ چند جہاں دیدہ قسم کی خواتین نے آپس میں کھُسر پھُسر کرکے اپنے اندیشے بھی ظاہر کردیئے تھے ـــ

"بہن یہ تو بڑی بدشگونی کی بات ہوئی ـــ اب اللہ ہی رحم کرے۔"

مالک مکان الگ گھبرایا گھبرایا پھر رہا تھا۔ اول تو اُسے یہ اندیشہ تھا کہ پولیس والے گواہی میں سب سے پہلے اُسے پھانسیں گے، اور دوسرے یہ دھڑکا کہ اب اُس کے مکان کی قیمت گر جائے گی ـــ بھلا اس مکان میں کون رہنا پسند کرے گا جس میں تازہ تازہ خودکشی کی واردات ہوئی ہو ـــ!

آس پاس جن لوگوں کے مکان تھے وہ بھی گھبرائے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے پولیس والے انہیں آسانی سے بخشنے والے نہیں تھے پھر ہوتے ہوتے پولیس کو بھی اطلاع مل گئی۔

محلے کا تھانیدار ایک سپاہی کے ساتھ موقعۂ واردات پر نمودار ہوا۔ انہوں نے مرنے والے کے گھر کا دروازہ توڑا، اور اندر داخل ہوئے۔ اور اس توقع میں کہ مرنے والے نے اپنے پیچھے کوئی تحریر ضرور چھوڑی ہوگی، انہوں نے پورے کمرے کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا، مگر ایسی کوئی بھی تحریر برآمد نہ ہوسکی جو خودکشی کے اسباب پر روشنی ڈال سکتی۔ مرنے والے نے اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ لوگوں کو اپنی خودکشی کا راز بتا جاتا۔

پولیس والے ناکام ہوکر باہر آگئے۔ کمرے کا دروازہ پھر بند کرادیا گیا۔ جس پر سپاہی تعینات ہوگیا، اور وہ تھانیدار کی نظر بچاتے ہوئے بیڑی کے کش لگانے لگا۔

تھانیدار گلی میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا، اور آس پاس کے لوگوں کے بیانات قلم بند کرنے لگا۔

اندر ممتاز کی لاش چھت سے جھولتی رہی۔

تھانیدار کو بھی بڑی کوفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ گلی کا کوئی فرد بھی مرنے والے سے اچھی طرح واقف نظر نہ آتا تھا، اور مرنے والا خود بھی انتہائی غیر ذمہ دار تھا جس نے دو سطریں لکھنا بھی ضروری نہ سمجھا کہ وہ خودکشی کر رہا ہے اور یہ کہ اپنی موت کا خود ذمہ دار ہے۔ آخر کیس کو داخل دفتر کرنے کے لئے بھی تو کچھ خانہ پُری ضروری ہوتی ہے ـــ!

سپاہی ادھیڑ عمر کا تھا۔ شادی کا گھر اس کے بالکل سامنے تھا، اور اس کی ناک پکتی ہوئی دیگوں کی مہک کا تعاقب کر رہی تھی، اور وہ سوچ رہا تھا کہ نہ معلوم کھانا دن میں ہے یا رات میں ـــ

تھانیدار نے دو ایک معزز آدمیوں کے بیانات قلم بند کئے، اور موت کو خودکشی کی واردات قرار دے کر معاملہ ختم کردیا۔ البتہ یہ

بات مازہی رہی کہ خودکشی کے اسباب کیا تھے ۔ اوراب ہر طرف اسی سلسلے میں خیال آرائیاں ہو رہی تھیں ۔

تھانیدار کو رخصت کرنے سے پہلے بارات والے گھر میں بٹھا کر چائے پانی سے تواضع کی گئی ۔ جس کمرے میں اسے بٹھایا گیا اس کے پیچھے والے کمرے میں جو عورتیں تھیں وہ ٹوہ لینے کے لئے جھانک جھانک کر پولیس والوں کی باتیں سننے کی کوشش کرنے لگیں ۔

اس کمرے کے پیچھے ایک اور کمرہ تھا جس میں خیال دارستم کی عورتیں تھیں اور اپنی کھسر پھسر کے دوران خودکشی کو شادی کے لئے بدشگونی قرار دینے پر مصر تھیں ۔

اور اس کمرے کے بھی پیچھے ایک کوٹھری تھی ، جس میں دلہن اپنی سہیلیوں میں گھری بیٹھی تھی ، اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں ایک سہیلی سے سرگوشی کر رہی تھی ۔۔۔

"تم نے دیکھی مردوں کی خود غرضی ۔۔۔ اس نے مرنے کے لئے بھی یہ خوشی کا موقع تاک رکھا تھا ۔۔۔۔۔۔۔ اگر کوئی سمجھ جاتا تو ۔۔۔۔۔۔۔ "

گلی میں آگے پیچھے پولیس کی دو گاڑیاں داخل ہوئیں ۔۔ پہلی گاڑی میں لاش اٹھانے والا عملہ تھا اور دوسری میں پولیس بینڈ کا جتھہ ۔

پہلی گاڑی والے ممتاز کی لاش اتارنے لگے ۔

پولیس بینڈ شادیانے بجانے لگا ۔

ایزاک بیبل
ترجمہ
سید رضا کاظمی

# پہلا معاوضہ

(روسی کہانی)

موسم بہار میں طفلس میں رہنا پڑے۔ بیس سال کی عمر ہو، اور کوئی آپ کو پیار کرنے والا نہ ہو تو صورت حال انتہائی پریشان کن ہوتی ہے۔ میں ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہو چکا ہوں۔ اُن دنوں میں کاکیشین صوبہ کے ایک چھاپہ خانے میں بطور پروف ریڈر ملازم تھا۔ میری کھڑکی کے نیچے سے دریائے کُرا لہراتا ہوا بہہ رہا تھا اور صبح کو پہاڑوں کی اوٹ سے طلوع ہونے والے سورج کی سنہری کرنیں دریائے کُرا کی مٹیلی لہروں کو چمکا دیا کرتی تھیں۔

مکان کی چھت پر بنی ہوئی وہ چھوٹی سی کوٹھڑی میں نے ایک نئے شادی شدہ جوڑے سے کرایہ پر لی تھی۔ اُس آدمی کی سبزی منڈی میں گوشت کی دوکان تھی۔ کوٹھڑی کی دوسری جانب وہ جوڑا تالاب کی دو مچھلیوں کی مانند پریم ساگر میں اُبھرتا ڈوبتا رہتا تھا۔ اکثر اُن دو متوالی مچھلیوں کے جسم درمیانی دیوار سے ٹکرا جاتے اور یوں محسوس ہوتا کہ ایک دن وہ لکڑی کی دیوار ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑے گی۔

ہر صبح ملیئت ڈبل روٹی خریدنے کے لئے سیڑھی سے اُتر کر نیچے آتی تھی۔ وہ اتنی دُبلی پتلی اور کمزور تھی کہ جنگلے کا سہارا لے کر اُترتی۔ اُس کے چہرے پر طویل علالت سے سنبھلے ہوئے بیمار کی سی پھیکی مسکراہٹ پھیلی ہوتی۔ اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے وہ آہستہ آہستہ سڑک پر آگے بڑھتی، اور ہر راہ گیر کو سلام کرتی۔ ان راہ گیروں میں عام طور پر آسیرئین بوڑھے موم بتیاں اور اُون بیچنے والی بیوائیں ہوتیں جن کے چہروں پر جھریوں کا جال تنا ہوتا۔

رات میں میرے پڑوسیوں کی کراہٹوں اور سسکیوں کے بعد فضا پر ویسی ہی خاموشی چھا جاتی جیسی توپ کا گولہ چھوٹنے کے بعد پیدا ہوتی ہے!

طفلس میں رہنا۔ بیس برس کا ہونا، اور رات کو دوسروں کے ہنسی مذاق کی باتیں سننا بڑا تکلیف دہ ہے۔ ان پریشان کن

حالات سے چھٹکارا پانے کے خیال سے میں دریائے کُرا کے ساحل کی جانب چل پڑتا، جہاں موسم بہار کی ٹھنڈی ہوا میرے کپڑوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی اور دل و دماغ پر نشہ سا طاری ہو جاتا۔ سوکھا ہوا حلق لئے میں طفلس کے گلی کوچوں میں آوارہ گردی کرتا رہتا۔

لیکن موسم بہار کی سُرمئی کہر جلد ہی مجھے اپنی کوٹھڑی میں واپس جانے پر مجبور کر دیتی جہاں کی گھٹن مجھے تیز تیز سانسیں لینے اور کسی کے پیار کا سہارا ڈھونڈنے پر اُکساتی — اور جلد ہی میں نے ایک سہارا پا لیا!

یہ بات اچھی ہو یا بُری، اس سے مجھے سروکار نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جس عورت کا میں نے انتخاب کیا، وہ ایک طوائف تھی۔ اس کا نام وَیرا تھا۔ میں ہر رات گولووِن اوینیو میں چوری چوری اس کا تعاقب کرتا رہتا تھا، لیکن اس سے بات کرنے کی مجھے ہمت نہ ہوتی۔ اس کے لئے میرے پاس نہ دھن دولت تھی نہ پیار کے میٹھے بول۔

بچپن سے ہی میری تمام قوت تخیل کہانیاں تخلیق کرنے اور ڈراموں کے پلاٹ تصنیف کرنے میں صرف ہو رہی تھی۔ میری ان تخلیقات کی مجموعی تعداد ہزاروں سے اُوپر تھی۔ کسی چٹان پر بکھرے ہوئے سیکڑوں مینڈکوں کی مانند یہ تخلیقات میرے دل و دماغ پہ چھائی ہوئی تھیں، لیکن میں انہیں کاغذ کے سینے پر پھیلانے اور لفظوں اور جملوں میں مقید کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ ایسی ادبی تخلیقات جو ٹالسٹائے کی ٹکر کی نہ ہوں محض بکواس اور تضیع اوقات کے علاوہ اور کچھ نہ تھیں۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ میری تخلیقات غیر فانی ہوں گی۔ وہی ادبی تخلیقات غیر فانی اور قابل ذکر ہوتی ہیں جن میں زندگی کی حرارت ہو۔ سوال صرف یہ ہے کہ زندگی کی حرارت کیونکر پیدا کی جائے۔

کسی ایسے شخص کے لئے جو اپنے خیالات اور تصوّرات میں کھویا رہتا ہو، یہ بہت دشوار ہے کہ وہ خود کو پیار کے بے معنی الفاظ میں الجھائے۔ ایسا شخص نہ تو انتہائی کرب کے عالم میں کراہ سکتا ہے نہ وہ یہ جانتا ہے کہ انتہائی شادمانی کے موقع پر کس طرح ہنسنا چاہیئے۔ بہرحال میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ اگر میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا تو مجھے اپنے انتہائی قلیل سرمایہ میں سے دس روبل وَیرا کو دینے پڑیں گے!

اور جب میں نے فیصلہ کر لیا تو ایک شام سمپیتی ریستوران کے قریب وَیرا سے ملنے کے لئے پہونچ گیا۔ نیلے لبادے اور نرم چمڑوں کے بوٹ پہنے ہوئے تاتاری میرے قریب سے گذر رہے تھے، اور گذرتے ہوئے دائیں بائیں کھڑی ہوئی سڈول جسموں والی عورتوں کو گھور رہے تھے۔ شام کی سرمئی سیاہی میں رات کی تاریکی گھلنے لگی تھی، اور خنک ہوا کے جھونکے سڑک پر لگے ہوئے درختوں کی نرم شاخوں کو چھیڑ رہے تھے۔

جب اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تو وَیرا آئی۔ فٹ پاتھ پر پھیلی ہوئی بن مانسوں کی سی بھیڑ کو چیرتی وہ یوں آگے بڑھتی رہی جس طرح تالاب کی لہروں پر کشتی آگے پھسلتی رہتی ہے۔

جب وہ ریستوران کے صدر دروازے کے قریب پہونچی تو میں لپک کر اُس کے سامنے پہونچ گیا۔ اور آہستہ آہستہ اُس کے ساتھ چلنے لگا۔

چند قدم چلنے کے بعد میں نے دھیمے لہجے میں کہا:

"کہاں جا رہی ہو؟"

وہ پیچھے گھوم گئی۔

"کیا کہا تم نے؟" اُس نے انتہائی ترش لہجے میں کہا۔

لیکن میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں ہنسی کھیل رہی ہے۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا، لیکن میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"دس روبل! منظور ہے؟"

میں اتنی جلدی راضی ہو گیا کہ اُسے شبہ ہونے لگا۔

"لیکن تمہارے پاس دس روبل ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

ہم دونوں ایک قریبی پھاٹک کے اندر داخل ہو گئے۔ اور میں نے اپنا بٹوہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے بٹوہ میں رکھے ہوئے اکیس روبل گنے۔ اُس کے ہونٹ ہلے اور بھوری آنکھیں چمک اٹھیں۔ اُس نے چاندی اور سونے کے سکوں کو الگ الگ کر دیا۔

"مجھے دس روبل دے دو۔" اُس نے بٹوہ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "ہم پانچ روبل اور خرچ کریں گے، باقی رقم تم اپنی ضروریات کے لئے رکھ لینا۔ تمہیں اگلی تنخواہ کب ملے گی؟"

"چار دن بعد!"

ہم پھاٹک کے باہر نکل آئے۔ ویرا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم گلی میں چلنے لگے۔

"کتنا اچھا ہوتا اگر ہم بور جھوم چلتے! وہاں کا موسم بڑا سہانا ہوتا ہے۔" اُس نے کہا۔ ویرا کے سنہرے بال ایک ربن سے بندھے ہوئے تھے جو گلی میں لگی ہوئی بجلی کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ نکل چلو بور جھوم۔" میں نے جواب دیا۔ "نکل چلو۔" نہ جانے کیوں میں نے ان غلط الفاظ کا استعمال کیا۔

"لیکن میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔" ویرا نے جماہی لیتے ہوئے کہا اور جیسے مجھے بھول گئی۔

ہم خاموشی سے چلتے ہوئے کوہ ڈیوڈ کے دامن میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک ریستوران میں داخل ہو کر میں نے کباب کا آرڈر دیا۔ لیکن کباب آنے کا انتظار کئے بغیر ہی ویرا اٹھ کر چند پریشان بوڑھوں کے پاس جا بیٹھی جو ایک کونے کی میز پر بیٹھے ہوئے اپنے کاروبار کی باتیں کر رہے تھے، اور ریستوران کے مالک کو مشورہ دے رہے تھے کہ وہ اس تنگ اور گندی گلی سے اپنا ریستوران اٹھا کر میخلوسکی اسکوائر پر ایک شاندار ریستوران کھول لے۔

میز پر مکا مار کر ویرا نے بھی اُسے یہی مشورہ دیا، لیکن ریستوراں کا بوڑھا مالک ان مشوروں کو کوئی اہمیت نہ دے کر خراٹے بھرتا رہا۔

جب ویرا میری میز پر واپس آئی تو کباب ٹھنڈا ہو چکا تھا، لیکن اُس نے اُس کی جانب کوئی دھیان نہ دیا۔ یکے بعد دیگرے اُس کے دوسرے پرستار میز کے قریب سے گذرتے رہے۔ لانبے لبادوں والے تاتاری۔ ادھیڑ عمر کے سرکاری آفیسر، اُونی پوستین پہننے والے دکاندار اور توندیل بوڑھے۔

جب ہم ہوٹل پہونچے تو آدھی رات گذر چکی تھی۔ لیکن وہاں بھی ویرا کو متعدد کام کرنے تھے۔ ایک بڑھیا جسے اپنے اکلوتے بیٹے کے پاس آسٹریا جانا تھا سفر کی تیاری کر رہی تھی۔ ویرا مجھے چھوڑ کر بڑھیا کا سامان باندھنے چل دی۔ جھکے شانوں والی وہ بڑھیا اپنی جالی دار ٹوپی پہن کر اور بغل میں تھیلا دبا کر سب کمروں میں باری باری جا کر لوگوں کو الوداع کہتی رہی۔ اُس کا جھریوں بھرا چہرہ کبھی ہلکی مسکراہٹ سے کھل اٹھتا اور کبھی وہ سسکیاں لینے لگتی۔

میں ایک سیلن بھرے کمرے میں، جہاں ایک تین ٹانگوں والی کرسی اور ایک پلنگ پڑا تھا، بیٹھا ویرا کی واپسی کا انتظار کرتا رہا ـــ

شہر کے کونے کونے کا چکر کھلا کر مجھے اتنی دیر تک جس طرح پریشان کیا گیا تھا اُس کے سبب میں نے جس پیار اور محبت کی تمنا کی تھی وہ نفرت میں بدلتی جا رہی تھی ـــ ایسی نفرت جس سے چھٹکارا پانا بھی دشوار معلوم ہو رہا تھا۔

باہر برآمدے میں کوئی شخص بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

کمرے میں ایک کٹورے میں کوئی سیّال شے رکھی ہوئی تھی جس میں گر گر کر مکھیاں مر رہی تھیں۔ لیکن ہر ایک مکھی کے مرنے کا انداز جداگانہ اور نرالا تھا۔ چند مکھیوں کی موت اذیت دہ نظر آتی تھی، لیکن چند دوسری مکھیاں چپ چاپ کٹورے کے قریب پہونچ کر اور اپنے ننھے پروں کو ہلکی سی جنبش دے کر آرام سے مر جاتی تھیں۔

کٹورے کے قریب ہی میز پر گوئی ون کا مشہور ناول پڑا ہوا تھا۔ میں نے اُسے اٹھا کر یوں ہی وقت گذاری کے لئے کھولا۔ ناول کی عبارت ایک ہی سطر میں گڈمڈ نظر آئی۔

دفعتاً ویرا کمرے میں داخل ہوئی۔

"ہم ابھی فیوودوسیا کو رخصت کر کے آ رہے ہیں۔ وہ ہم لوگوں کے لئے ماں کے برابر تھی۔ بے چاری تنہا اتنا طویل سفر کر رہی ہے۔" ویرا نے کہا۔

وہ اپنے گھٹنے پھیلا کر بستر پر بیٹھ گئی۔ اور ایک ٹک خلا میں گھورنے لگی۔ غالباً بڑھیا کی جدائی اُس پر شاق گذری تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے کنکھیوں سے میری جانب دیکھا، اور اپنے دونوں ہاتھوں کو باندھ کر انگڑائی لی۔

"تم یقیناً انتظار کرتے کرتے اُکتا گئے ہوگے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ بس ابھی ـــ ....." اُس نے کہا۔

لیکن میں قطعی اندازہ نہ لگا سکا کہ ویرا کیا کرنے جا رہی ہے۔ وہ کچھ اس طرح تیاری کر رہی تھی جس طرح کوئی سرجن آپریشن کے لئے تیاری کرتا ہے۔ اُس نے اسٹو جلا کر ایک دیگچی میں پانی چڑھایا۔ ایک صاف تولیہ لا کر پلنگ کے سرہانے کی پٹی پر پھیلا دیا اور اس پر اینیما کا برتن لٹکا دیا۔ دیوار سے سفید نلکی لٹک رہی تھی۔ جب پانی گرم ہو گیا، تو اُس نے پانی ایک بڑے طباق میں اُنڈیل دیا، اور پانی میں سُرخ رنگ کا کوئی سفوف ڈال دیا ـــ اس کے بعد وہ اپنے کپڑے اپنے سر کے اوپر سے کھینچ کر اُتارنے لگی۔

اب میرے سامنے جھکے ہوئے شانوں اور سُکڑے پیٹ والی ایک لانبی چوڑی عورت کھڑی ہوئی تھی!

"ادھر آؤ پیارے ـ اتنے میں پانی گرم ہوتا ہے۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے کوئی جنبش نہ کی۔ مجھے بڑی جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی تنہائی کو اس نفرت انگیز ماحول کے، جس میں تین ٹانگ والی کرسی اور مری ہوئی بے شمار مکھیاں تھیں، حوالے کیوں کیا؟

"اُف" میں نے زیرِ لب کہا۔ میرے پڑوس میں رہنے والے اُس نئے شادی شدہ جوڑے کے محبت و اختلاط کے نظاروں سے یہ بناوٹی اور کاروباری پیار اور محبت کی دنیا کتنی مختلف تھی؟

"تم ایسی منحوس شکل بنائے وہاں کیوں بیٹھے ہو؟ یہاں میرے قریب آؤ" اپنا پیٹی کوٹ اپنی ناف تک کھینچ کر بستر پر بیٹھے ہوئے ویرا نے کہا۔

میں خاموش رہا۔

"کیا تمہیں اپنے دس روبل کی فکر ہو رہی ہے؟"

"مجھے رقم کی کوئی فکر نہیں ہے" میں نے دل برداشتہ لہجے میں کہا۔

"اچھا تو تم رقم کی کوئی فکر نہیں کرتے؟ خوب۔ تو کیا تم چور ہو یا...... ..."

"میں چور نہیں ہوں"

"تو چوروں کے ساتھی یا جیب کترے؟"

"نہیں — میں لونڈا ہوں"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں کہ تم جانور نہیں ہو" وہ بڑبڑائی۔

میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں۔

وہ بستر پر لیٹ گئی اور مجھے اپنے قریب کھینچ کر میرے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"میں لونڈا ہوں، آرمینا کے باشندوں کا لونڈا — اب بھی نہیں سمجھیں؟" میں نے چیخ کر کہا۔

اُف خدایا۔ میری عمر کے بیس سالوں میں سے پانچ سال اُن ہزاروں کہانیوں کی تخلیق میں گذر گئے تھے جو میرے دماغ پر چھائی ہوئی تھیں۔ کسی چٹان پر بکھرے ہوئے سیکڑوں مینڈکوں کی مانند یہ تمام کہانیاں میرے دماغ سے چمٹی ہوئی تھیں، اور آج طویل تنہائی کے دباؤ سے ٹوٹ کر ان میں سے ایک کہانی زمین پر گر پڑی تھی۔ یہ بھی نصیب کا چکر ہے کہ طفلس کی ایک طوائف نے میری کہانی کی پہلی پڑھنے والی کا شرف حاصل کیا۔

میں اپنی قوتِ تخیل پر خود ہی کانپ اٹھا، اور خود کو آرمینا کے باشندوں کے لونڈے کے روپ میں پیش کر کے ویرا کو اپنی کہانی سُنائی۔

اگر میں نے اپنی تخلیق پر محض مختصر سا وقت اور دماغ صرف کیا ہوتا تو میں اپنے آپ کو کسی دولت مند تاجر کا بیٹا جسے گھر سے نکال دیا گیا ہو بنا کر پیش کرتا، اور اس طرح گھسے پٹے انداز میں کسی معمولی افسانہ نگار کی مانند عام سی بات بیان کرتا اور نتیجہ کے طور پر ایک مغرور باپ اور رحم دل ماں کی عام سی کہانی بن جاتی۔ لیکن میں نے ایسی غلطی نہیں کی۔ ایک اچھی کہانی کو زندگی سے دُور اور روزمرہ کی باتوں سے بیگانہ نہیں ہونا چاہئے۔ بیشتر کہانیاں ایسی ہی لکھی جاتی ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ زندگی کسی اچھی کہانی میں اپنا روپ، اپنی جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب رہتی ہے۔ اسی لئے میں نے اپنی کہانی ویرا کو اُسی انداز میں سُنائی، جس انداز میں میرے دماغ نے اسے سوچا اور سمجھا تھا۔

میں نے اپنی کہانی یوں سُنائی:

"میں صوبہ خیرساں کے اتوسکی قصبہ میں پیدا ہوا تھا۔ میرے والد ایک اسٹیمر کمپنی میں ملازم تھے، اور اپنے بچوں کو بہترین تعلیم دلانے کی غرض سے رات گئے تک اپنے دفتر میں کام کیا کرتے تھے۔ لیکن ہم سب بچے اپنی بے وقوف ماں پر پڑے گئے، جو صرف عیش و آرام کرنا جانتی تھی۔ دس برس کی عمر سے ہی میں نے اپنے باپ کی جیب سے رقم چرانا شروع کر دیا تھا۔ ذرا اور سیانا ہوتے ہی میں اپنی ماں کے رشتہ داروں کے پاس باکو بھاگ گیا جہاں انہوں نے میرا تعارف اسٹیپن ایوانووچ نامی ایک آرمینین سے کرایا۔ میں اُس کے ساتھ رہنے لگا، اور چار سال تک رہا۔"

"اُس وقت تمہاری عمر کیا تھی؟" ویرا نے جو میری کہانی بڑی دلچسپی سے سُن رہی تھی، پوچھا۔

"پندرہ سال۔"

غالباً ویرا کو امید تھی کہ میں اُس آرمینین کی جس نے مجھے بگاڑا تھا بدکرداریوں کا تذکرہ تفصیل سے کروں گا۔ لیکن میں اپنے سوچے ہوئے انداز سے ہٹنے پر تیار نہ تھا۔

"ہم لوگ چار سال تک ساتھ رہے۔ اسٹیپن جیسا شریف اور قابلِ اعتبار آدمی میں نے آج تک دوسرا نہیں دیکھا۔ وہ اپنے دوستوں کی تمام باتوں پر اعتبار کر لیتا تھا۔ اُن چار سالوں میں مجھے کوئی کام سیکھ لینا چاہئے تھا، لیکن میں نے کوئی کام دھندا نہ کیا۔ اسٹیپن کے دوستوں نے اُسے تباہ کر دیا۔ وہ اپنے دوستوں کو بلاضمانت بھاری رقم بطور قرض دے دیا کرتا، جسے وہ کبھی واپس نہ کرتے......"

"بلاضمانت قرض؟" ویرا نے پوچھا۔

نہ جانے کیوں میرے ذہن میں قرض کی بات آ گئی تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ میں نے اس کا ذکر کر دیا۔ کیونکہ اس کے آگے ویرا میری کہانی کے ہر لفظ پر یقین کرنے لگی۔ اس کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ اُس نے اپنا شال اوڑھ لیا، جس نے اُس کے عریاں جسم کو آدھا ڈھک لیا۔

"اسٹیپن تباہ ہو گیا۔ اسے مکان سے بے دخل کر دیا گیا، اور اُس کا سامان نیلام ہو گیا۔ وہ پھیری لگانے لگا۔ اب چونکہ اُس کے پاس دولت نہ رہی تھی، اس لئے میں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا، اور ایک دولت مند بوڑھے کے ساتھ رہنے لگا، جو جرج وارڈن تھا۔" یہ کردار میں نے عام کہانی نویسوں کے انداز پر ہی تخلیق کیا تھا۔ یہ ایک ایسے بیکار اور مضمحل ذہن کی پیداوار تھی جو حقیقی زندگی سے جیتے جاگتے کردار تلاش کرنے کی دردسری مول لینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

جب میں نے 'جرچ وارڈن' کہا تو ویرا کی آنکھیں بجھ گئیں۔ اور میں نے صورتِ حال کو قابو میں رکھنے کے لئے اُسے دمہ کا مریض بنا دیا۔ جب اُس پر دمہ کا دورہ پڑتا تو وہ رات کو اٹھ کر باکو کی تیل سے بھری ہوئی گندی ہوا میں تیز تیز سانسیں لیتا، جس سے اس کی حالت بگڑتی گئی اور جلد ہی وہ مر گیا۔

"میرے رشتہ داروں کو مجھ سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس طرح جب میں بیس روبل لے کر یہاں طفلس آیا ——— وہی روبل جو ویرا نے گولوون رینو کے پھاٹک میں کھڑے ہو کر گنے تھے ——— تو میں نے جس ہوٹل میں قیام کیا تھا، وہاں کے بیرے نے مجھے دولت مند گاہک دلانے کا اطمینان دلایا تھا۔ لیکن ابھی تک اُس نے صرف موٹے توندیل آرمینیوں کو ہی میرے پاس بھیجا تھا۔ یہ لوگ اپنا ملک، اپنے گیت اور اپنی شراب ہی پسند کرتے تھے، دوسرے ملک کے باشندوں کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں

لوگ اسی طرح روندتے ہیں جس طرح چور اپنے پڑوسی کے باغ کو روندتا ہے!

آرمینیا کے باشندوں کے متعلق میں نے جتنی معلومات حاصل کر رکھی تھیں اُن کی روشنی ہی میں نے بات آگے بڑھائی، میرے سینے میں جذبات کا طوفان اُمڈ رہا تھا، اور میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں مکمل ناپاک ہوگیا ہوں۔ میرے جسم پر پسینہ رینگ رہا تھا۔ میرا گلا بھر آیا، اور میں رونے لگا۔

اپنی آنکھیں ملتا ہوا میں وہاں سے ہٹ گیا۔

میری کہانی ختم ہوگئی تھی۔

اسٹو کافی دیر پہلے ہی بجھ چکا تھا۔ اور اس پر رکھا ہوا پانی ایک بار جوش کھا کر ٹھنڈا ہوچکا تھا۔

ویرا اُٹھ کر چپ چاپ کھڑکی کے پاس چلی گئی۔

"لوگ بھی کیسے کیسے کام کرتے ہیں" ــــ میری جانب دیکھے بغیر ہی ویرا نے کہا ــ "اوہ خدا، لوگ کیسے کیسے کام کرتے ہیں ــ!!"

اس نے اپنی ننگی باہیں پھیلائیں اور کھڑکی کے پٹوں کو پورا کھول دیا۔ اُس کا سر ہل رہا تھا۔

"تو تم بھی رنڈی ہو ــ ہم کتیوں کی طرح!" اُس نے ہولے سے کہا۔

میں نے اپنا سر جھکا لیا۔

"ہاں تمہاری ہی طرح......"

ویرا میری جانب مڑی۔ اس کا پیٹی کوٹ اس کے جسم پر چیتھڑے کی طرح جھول رہا تھا۔

"لوگ کیسے کیسے کام کرتے ہیں ــ وہ بڑبڑائی ــ "تم کبھی کسی عورت کے پاس گئے ہو؟"

میں نے اپنے ٹھنڈے ہونٹ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیئے ــــ

"نہیں۔ میں کیونکر جاتا؟ وہ لوگ مجھے جانے نہیں دیتے تھے"

"بہن" ــ اُس نے زیر لب کہا، اور فرش پر میرے پہلو میں بیٹھ گئی ــ "میری ننھی بہن!"

ذرا بتلایئے تو۔ کیا آپ نے کسی دیہاتی بڑھئی کو اپنے مددگار کے ساتھ کام کرتے دیکھا ہے؟ کیا آپ نے دیکھا ہے کہ جب دونوں لکڑی کے تختہ پر ساتھ ساتھ رندا چلاتے ہیں تو لکڑی کے چھلکے کتنی تیزی سے اُڑتے ہیں؟

اُس رات اُس تیس سالہ عورت نے اپنے فن کے سارے گُر مجھے سمجھا دیئے۔ اُس رات میں ایسے رازوں سے آگاہ ہوگیا، جو آپ شاید کبھی نہ جان سکیں۔ مجھے ایک ایسی محبت کا احساس ہوا جو شاید آپ کو کبھی نہ ہوسکے۔ میں نے وہ الفاظ سنے جو ایک عورت نے دوسری عورت سے ہی کہتی ہے ــ میں اب ان الفاظ کو بھول گیا ہوں ــــ ویسے بھی ہم مرد لوگ ایسے الفاظ کو یاد رکھا کرتے نہیں کرتے!

جب صبح کے دھندلکے میں ہماری آنکھ کھلی تو ہم نے دیکھا کہ ہم دونوں بے جان پتھر کے مانند بستر پر پڑے ہوئے ہیں، ہم ایک دوسرے پر ہنسی آئی۔

اُس دن میں چھاپے خانہ نہیں گیا۔ اُس پرانے شہر کے تنگ اور گندے بازار میں ہم نے چائے پی۔ گیروے رنگ کی وہ چائے

تیز بہتے ہوئے خون کی مانند نظر آئی۔ سورج کی شعاعیں ہمارے گلاس کے کناروں پر چمک رہی تھیں۔ دنیا حسین نظر آنے لگی تھی۔ جب میرا جسم پسینے سے تر ہونے لگا تو میں نے چائے کا گلاس اوندھا کر کے رکھ دیا۔ چائے کی قیمت ادا کرنے کے بعد میں نے پانچ روبل کے دو سکے ویرا کی جانب بڑھا دیئے۔

"کیا تم جھگڑا کرنا چاہتی ہو بہن؟" اُس نے انتہائی ترش لہجے میں کہا۔

چونکہ میں جھگڑا نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لئے میں نے دونوں سکے جو میری ادبی زندگی کا پہلا معاوضہ تھے اپنے بٹوہ میں واپس رکھ لئے۔ اور ویرا سے شام کو ملنے کا وعدا کر کے وہاں سے چلا آیا۔

یہ بہت پُرانا واقعہ ہے —— اس کے بعد سے مجھے مختلف ناشروں، کتب فروشوں اور اخبار رسالے والوں سے کافی رقم موصول ہوئی ہے —— یہ رقمیں اُن کامیابیوں کے عوض ملی ہیں جو درحقیقت میری شکست تھیں، اور ان شکستوں کے لئے جو جیت میں تبدیل ہو گئیں!

زندگی کے لئے اور موت کے لئے ان ناشروں اور کتب فروشوں نے مجھے بڑی بڑی رقمیں دی ہیں۔ لیکن یہ تمام دولت اُس کے سامنے بالکل حقیر اور ہیچ ہے جو میری جوانی میں میری پہلی پڑھنے والی نے مجھے دی تھی۔ لیکن مجھے اس کا کوئی رنج نہیں ہے۔ اس لئے کہ مجھے یقین ہے کہ میں اُس وقت تک نہیں مروں گا جب تک میں اپنا آخری معاوضہ پیار کے ہاتھوں حاصل نہیں کر لوں گا۔

## علامہ حیرت بدایونی

شباب کو جو گناہوں کی ایک رات ملی
وہ ایک رات ہی سرمایۂ حیات ملی

تری نظر، ترے عارض، تری جبیں کی قسم
مجھے بھی دولتِ آیات و بیّنات ملی

ڈھلک کے چہرۂ رنگیں پہ آ گئے آنسو
بہارِ عید سے گویا شبِ برات ملی

تعینِ صفت و ذات کیا کرے کوئی
حریمِ ذات سے ہے سرحدِ صفات ملی

رہا نہ کوئی بھی محروم تیری خلوت سے
مگر کسی کو ملا دن کسی کو رات ملی

معاف کر مری تاخیر اے دیارِ حبیب
میں آ رہا تھا کہ رستے میں کائنات ملی

یہ کیا غضب ہے کہ خوابِ خلیل کی تعبیر
بہ ذبحِ آلِ محمدؐ لبِ فرات ملی

کہاں یہ نعمتِ دنیا و دیں، کہاں حیرتؔ
جو شے ملی وہ خلافِ توقعات ملی

## جگن ناتھ آزاد

کبھی جب فرقتِ جاناں کی لذت کم نہیں ہوتی
تو پھر کیوں دل کی حالت ایک سی پیہم نہیں ہوتی

نہ جانے بے خودی میں مجھ کو کتنی بار چھیڑا ہے
مگر اے زلفِ جاناں تو کبھی برہم نہیں ہوتی

ابھی کچھ خام ہے آزاد! رودادِ الم تیری
ابھی تو آنکھ بھی اس داستاں سے نم نہیں ہوتی

ہزاروں بار گذرا ہوں اسی رستے سے میں لیکن
یہ رستہ ہے کہ اس کی دل کشی کچھ کم نہیں ہوتی

تمہاری یاد کی لو تیز ہو ہو کر بھڑکتی ہے
ہزاروں آندھیاں آئیں یہ لو مدھم نہیں ہوتی

اسی مدت میں یادیں بے شمار آئیں بھی گذریں بھی
مگر ارضِ وطن کیوں یاد تیری کم نہیں ہوتی

یہ اتنا ذکر کیوں آخر دکن کی میزبانی کا
پذیرائی تری اے دل کہیں جب کم نہیں ہوتی

نہ اتنا دل لگا آزاد! دنیا سے کہ یہ ظالم
شریکِ عیش ہوتی ہے شریکِ غم نہیں ہوتی

## خورشید احمد جامی

پیار کی راہوں کے دھوکے ہیں نہ امیدوں کی بات
زندگی ہے یا کسی جلتے ہوئے جنگل کی رات

گرد آلودہ ہے مفلس کے ارادوں کی طرح
صبح کے زرکار ایوانوں میں تصویرِ حیات

نرم، نازک شبنمی یادوں سے لَو دینے لگا
اے غمِ دوراں، ترا پیغمبرانہ التفات

چیختے زخمی پرندوں کی طرح سے آج بھی
دل سے ٹکرا کر پلٹ جاتی ہیں کتنی خواہشات

رات بھر اوراقِ دل پر جیسے لکھتا ہے کوئی
لالہ و گل کی فضاؤں کے سلگتے واقعات

مے کدے جلتے ہیں کب سے تشنگی کی دھوپ میں
بھیج دو نا پھر مہکتے گیسوؤں کی ایک رات

اب وہ دلداروں کی محفل ہو کہ مقتل ہو کوئی
وقت سے اک بار کر لو اور پیمانِ حیات

ہم سفر جامی ہو جیسے شعلۂ لرزاں کوئی
یوں مرے ہمراہ چلتا ہے شعورِ کائنات

# محسن احسان

نگارِ فن پہ حریفانِ شعر کی یلغار
نیامِ حرف کہاں ہے خیال کی تلوار

رہینِ مرگ تمنا تھی کامرانیٔ وصل
جھلس گیا ہے مجھے قربِ شعلۂ رخسار

ہوا کچھ ایسی چلی دشتِ نامرادی سے
اُجڑ کے بس نہ سکے پھر کبھی دلوں کے دیار

کڑکتی دھوپ میں اب اور کس جگہ بیٹھوں
سمٹ کے بن گیا دیوار - سایۂ دیوار

جلا گئی ہے مری آگ پیرہن میرا
میں کیا گلہ کروں تجھ سے چراغِ محفلِ یار

ذرا رسائیٔ منزل گہہ مراد تو دیکھ
چلے تھے شہرِ وفا کو پہنچ گئے سرِ دار

یہ کس نے سروِ گلستاں کا ذکر چھیڑا ہے
نکھر چلا ہے نگاہوں میں پیکرِ قدِ یار

یہ کس جزیرۂ بے رنگ و بُو میں بستے ہیں
نہ طائرانِ عجم ہیں نہ آہوانِ تتار

یہ کون گذرا ہے محسن خرابۂ دل سے ،
کہ اُڑ رہا ہے ہر اک سمت حسرتوں کا غُبار

## لیث قریشی

یہ جو اک تسکینِ دل، آرامِ جاں کی بات ہے
کوئی سمجھائے ہمیں یہ کس جہاں کی بات ہے

محفلِ کم ظرف میں رطلِ گراں کی بات ہے
اپنے لب پر بھی کہاں رہ کر کہاں کی بات ہے

دوستو! منزل رسی میں کچھ تو ہے قسمت کی بات
کچھ ہمارے آپ کے عزمِ جواں کی بات ہے

نکہتِ آوارہ رُسوا ہو نہ اے بادِ صبا!
اک کلی کی بات سارے گلستاں کی بات ہے

درد سے دل کو نوازا، سوزِ غم سے روح کو
نام کیا لیں، اک ہمارے مہرباں کی بات ہے

ہاں!! پاسِ مصلحت خاموش ہی رہتے ہیں ہم
ہاں! کچھ ایسی ہی سلوکِ دوستاں کی بات ہے

خندۂ گل پر ہمارا تبصرہ یہ ہے کہ لیثؔ
زندگی کے لب پہ مرگِ ناگہاں کی بات ہے

## احمد طاہر

رہِ وفا میں فنا ہو کے زندگی پائی
ہمیں پہ ختم ہوئی دو جہاں کی یکتائی

جنوں کی خیر کہ اب موسمِ بہاراں میں
بہ فیضِ عشق میسّر ہے آبلہ پائی

دل و نظر کو بچایا نہ جا سکا افسوس
بساطِ عشق پہ لوگوں نے مات ہی کھائی

تمام عمر سہے ہم نے دوستوں کے ستم
مگر ہماری وفا میں نہ کچھ کمی آئی

دھواں دھواں ہے ابھی منظرِ بہارِ چمن
گلوں کو دھوپ میسر ہے اور نہ پُروائی

دیارِ غیر میں ملتا ہے کب سکوں اے دوست
بچھڑ کے تجھ سے ہمیں ڈس رہی ہے تنہائی

غروب ہو گئے یادوں کے انجم و مہتاب
دیارِ دل میں اندھیروں نے آگ برسائی

## رشید نثار

کوئی آواز نہیں، سازِ غمِ دل کے سوا
ہم نوا کون ہے اک رات کی منزل کے سوا

تیرا آغوش بھی تھا، محفلِ احباب بھی تھی
کوئی بھی دوست نہ تھا دامنِ قاتل کے سوا

موت کے دشت میں بھی، زیست کے گلزار میں بھی
ہر جگہ عشق ملا، حُسن کی محفل کے سوا

کیسے برباد ہوئے، کس نے ڈبو دیا ہم کو
کچھ ہمیں یاد نہیں راحتِ ساحل کے سوا

ایک ویرانے میں پھرتے رہے مَیں اور تُراب[1]
حیدرآباد میں کیا رکھا تھا قابل[2] کے سوا

وادیٔ عشق میں گونجی تھی اناالحق کی صدا
کچھ بھی ہم سُن نہ سکے شورِ سلاسل کے سوا

فکر کے نجد میں گم ہو گیا ہے قیس نثار
اب یہاں کیا ہے نوائے جرسِ دل کے سوا

---

[1] تراب گوالیاری [2] قابل اجمیری مرحوم

## بلقیس عزیز

تجھ سے ملنا بھی کچھ اہم تو ہے
اِس جگہ گر نہیں عدم تو ہے

کٹ ہی جائے گی اتنا غم کیا ہے
زندگی کیا ہے ایک دَم تو ہے

مطمئن ہوں میں اپنے حاصل پر
تو نہیں پاس تیرا غم تو ہے

چاند بے نور، چاندنی بے کیف
شبنمی آنکھ تجھ میں نم تو ہے

منزلِ عشق کے سبھی راہی
کیوں بھٹکتے ہیں دو قدم تو ہے

کھُل سکا آج تک نہ جو عقدہ
زلفِ پیچاں کا ایک خم تو ہے

نامراد اس جہاں سے جانے کا
مجھ کو شکوہ نہیں، الم تو ہے

ایس اے نقوی

# پاکستان کی قدیم میراث

## اردو مجلس کی ماہانہ نشست

۹ر دسمبر ۶۶ء کو پاکستان نیشنل میوزیم میں اردو مجلس کی ماہانہ نشست منعقد ہوئی۔ جس میں پاکستان نیشنل میوزیم کے جناب ایس اے نقوی نے "پاکستان کی قدیم میراث" سے متعلق ایک فلم دکھائی، اور اسی موضوع پر ایک مقالہ پڑھا۔ اس نشست کے شرکاء یہ تھے: ممتاز حسین، محمد ہادی حسین، نفیس ظفر، عبدالحنیف خاں، صہبا لکھنوی، انجم اعظمی، قمر ہاشمی، مرزا ظفر الحسن، مسلم ضیائی، سید محمد اشفاق، محمد اشتیاق خاں، افضال احمد، مشرف احمد، عتیق احمد، اختر علی خاں، ضیاء الحسن موسوی اور سرار انصاری۔ اردو مجلس کے سکریٹری آغا افتخار حسین صاحب چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر نشست میں شریک نہ ہو سکے۔ "پاکستان کی قدیم میراث" پر مقالہ پیش کرتے ہوئے ــــ نقوی صاحب نے بتایا کہ شمال مغربی پاکستان میں ۵ لاکھ سال قبل کے آثار بھی ملے ہیں۔ جو موئنجو دڑو سے بہت پہلے کے ہیں اور بعض سنگی اوزار پر مشتمل ہیں ــــ اسی طرح بلوچستان سے ۵ ہزار سال قبل مسیح کے ظروف کے نمونے برآمد ہوئے ہیں۔ اس مضمون میں موصوف نے شروع سے لے کر مسلمانوں کے دور تک کے آثار کا حال بیان کیا۔ آخر میں شرکائے نشست نے آثار قدیمہ، پاکستان نیشنل میوزیم اور کھدائی کے بارے میں سوالات کئے۔ اور نقوی صاحب نے نیشنل میوزیم کی نقاشی اور پیکر تراشی کے نمونوں کی مثالوں سے اُن کے جوابات دیئے۔ ذیل میں نقوی صاحب کے مقالے کا مکمل متن پیش کیا جا رہا ہے

(ادارہ)

سیاسی اعتبار سے پاکستان ایک نیا ملک ہے، لیکن اس کے آثار و شواہد بہت پرانے ہیں۔ جس کا آغاز آج سے تقریباً ۵ لاکھ سال قبل ہو چکا تھا۔ راولپنڈی کے نزدیک دریائے سوآن نے اپنا رُخ بدلتے ہوئے پتھر کے جو کھُردرے اوزار زمین سے برآمد کئے ہیں وہ عہد عتیق کے انسانوں کی خبر دیتے ہیں اور ان کی مشقت اور ہنرمندی کی داستان دُہراتے ہیں۔ یہ سنگی اوزار جنہیں

عام انسان کی نظر، دریائی بہاؤ سے گھسے ہوئے پتھروں سے بمشکل تمیز کرسکتی ہے، ماہرین آثار قدیمہ کے لئے اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ ازمنۂ قدیم ہی میں انسان نے کائنات کی دیگر مخلوقات پر اپنی ذہنی فوقیت کا سکہ جما لیا تھا۔ صحراؤں اور بیابانوں میں وہ آزادانہ گھومتا پھرتا تھا، اور تفریح اور شکم سیری کے لئے جنگلی جانوروں کا شکار اس کی زندگی کا ایک جزو تھا۔

افسوس کہ ہمارے پاس مزید ایسے شواہد نہیں جن کی مدد سے ہم ان قدیم انسانوں اور ان کے مہذب ورثا کے مابین زمانے کے ارتقائی مراحل کا خاکہ پیش کرسکیں۔ البتہ بلوچستان میں ایسے ٹیلے ضرور موجود ہیں جن میں اس گمنام دور کی چند جھلکیاں ملتی ہیں۔

ظروف سازی کے جو نمونے بلوچستان سے برآمد ہوئے ہیں ان سے ایک نئی تہذیب کا سراغ ملتا ہے جس کا بغور مطالعہ کرنے پر ۵۰۰۰ سال قبل مسیح تک انسان کی مسلسل جدوجہد کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ بھی پتھر ہی کا زمانہ تھا۔ لیکن اب انسان نے گلہ بانی اور کھیتی باڑی کا کام شروع کردیا تھا۔ اور پہاڑی وادیوں اور اس سے ملحق آبادیاں قائم کرلی تھیں۔ لیکن ان حقائق کے باوجود ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے تاکہ ہم صحیح معنوں میں اندازہ کرسکیں کہ اس قدیم تہذیب کی نشوونما کیسے ہوئی، جس کی معراج کے دو عظیم نمونے اب سے پانچ ہزار سال قبل صفحۂ ارض کی زینت بنے۔ ان میں سے ایک تہذیب میسوپوٹامیا میں چمکی اور دوسری وادیٔ سندھ میں پروان چڑھی۔

۲۵۰۰ اور ۱۵۰۰ سال قبل مسیح کے دوران وادیٔ سندھ ایک اہم تہذیب کا گہوارہ تھی۔ قرون اولیٰ میں مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک اس کی عظمت سے متاثر ہوئے۔ موئن جو دڑو اور ہڑپہ اس ثقافت کے دو اہم مرکز تھے۔ یہاں منصوبہ بندی کے تحت بنائی ہوئی منظم اور کشادہ سڑکیں، عمدہ ہوادار مکانات اور زمین دوز پانی بہنے کے نلے اور نالیاں آج بھی ماہرین تعمیر کے لئے مشعل راہ کا کام دیتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں کے رہن سہن کا طریقہ ایک عمدہ اجتماعی زندگی کی مثال پیش کرتا ہے۔ کاشتکاری کے ساتھ ساتھ وہ تجارت بھی کرتے تھے۔ اور اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ میسوپوٹامیا اور شمالی افغانستان سے اُن کے تجارتی تعلقات قائم تھے۔

اس شاندار دور کی ابتدائی تاریخ ایک عرصے تک معما بنی رہی، لیکن حال ہی میں بالائی سندھ کے علاقہ کوٹ ڈیجی کے کھنڈروں سے جو چیزیں کھدائی میں ملی ہیں اُن سے اس مسئلے کے حل میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے۔ مزید برآں یہاں سے برآمد شدہ چیزوں سے ایک اور تہذیب کا انکشاف بھی ہوا ہے جس کا دور تقریباً ۳۰۰۰ قبل مسیح سے ۲۵۰۰ قبل مسیح تک تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوٹ ڈیجی کی تہذیب، وادیٔ سندھ کی ثقافت پر مختلف پہلوؤں سے اثرانداز ہوئی ہوگی لیکن اس کے متعلق ہماری معلومات ابھی بہت محدود ہیں۔ دوسرے یہ کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ کسی حادثے کے باعث کالعدم ہوکر رہ گئی۔ اس کے لئے بھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

کھدائی کے ذریعے ٹیکسلا اور شمال مغرب میں متعدد بدھ خانقاہوں سے جو آثار برآمد ہوئے ہیں وہ ایسے ڈھائی ہزار سال قبل کی تہذیب کا حال بتاتے ہیں جس سے تاریخی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ہمالیہ کی بلند چوٹیوں اور ہندوکش کے لامتناہی سلسلوں کے باعث وسط ایشیا سے الگ تھلگ رہنے کے باوجود ٹیکسلا اس وقت بھی بدھ تہذیب کا ایک اہم مرکز تھا۔ پھر ماؤنڈ کی کھدائی میں یہاں کی قدیم ترین آبادی کے نشان ملتے ہیں۔

۳۲۶ قبل مسیح میں سکندر کے حملے نے یہاں کی پرسکون زندگی کا خاتمہ کر دیا، اور برصغیر کے اس شمال مغربی علاقے پر ایک بیرونی طاقت کا قبضہ ہو گیا، لیکن یونانیوں کی یہ فتح مقامی لوگوں کے لئے بڑی سازگار ثابت ہوئی، کیونکہ بہت جلد ہی فاتح مشرقی فلسفہ سے مرعوب ہو کر اس کے مطیع بن گئے۔ انہوں نے اپنے تمام قوتیٰ اور فن کو ایک نئے بدھ کی تشکیل میں صرف کر دیا جس کے خوب صورت رومی النسل خدوخال تھے لیکن ماحول اور انداز زندگی مشرقی تھا۔ سنگ تراشی کے یہ نمونے گندھارا آرٹ کے نام سے مشہور ہوئے جس کی وجہ سے اس ملک کی روایتی سنگ تراشی کا نمونہ یکسر بدل گیا۔

بدھ تہذیب کے جو آثار مینامتی اور پہاڑ پور واقع مشرقی پاکستان میں پائے گئے ہیں، دیوا اور پال راجاؤں کی شاہانہ سرپرستی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ جن کا زمانہ تقریباً ساتویں یا آٹھویں صدی عیسوی تھا۔ مینامتی کے رنگین پہاڑی علاقوں پر گیارہ میل کے رقبہ میں بدھ بستیوں کے آثار پھیلے ہوئے ہیں۔ پہاڑ پور میں جنگلی جھاڑیوں، لمبے لمبے بانس کے جھنڈ، جوٹ اور چاول کے کھیتوں اور سرسبز میدانوں کے وسط میں سب سے بڑی بدھ خانقاہ پائی گئی ہے جو ہمالیہ کے جنوب میں سب سے بڑی خانقاہ ہے۔ ان تمام آثار کی ساخت پرپیچ تعمیرات، ان میں الجھی ہوئی آرائشی تراکیب صاف طور پر واضح کرتی ہیں کہ پاکستانی بدھ مت اپنے دم توڑتے ہوئے دور میں بھی کتنے پرنمود تقدس کا حامل تھا۔

۷۱۱ء میں جب کہ اسپین میں گاتھی حکومت کا تختہ الٹا جا رہا تھا اور کاشغر میں ایک عرب فوج تسلط جما رہی تھی، سندھ اور ملتان اسلامی خلافت میں ضم کر لئے گئے۔ یہاں کے لوگوں کی زندگی اور ثقافت سے اسلام کا جو اولین تصادم ہوا، اس کا پتہ بھنبھور کے آثار قدیمہ سے چلتا ہے جو کراچی سے تقریباً چالیس میل شمال میں واقع ہے۔ علاوہ ازیں ملتان، اُچھ، سیہون اور برہمن آباد میں عہد اسلام کی ابتدائی تعمیرات میں ملتی ہیں۔ مسلمان اپنے ساتھ جو ثقافت شام اور ایران سے لائے اس میں مقامی عناصر کے اختلاط سے ایک نیا رنگ پیدا ہوا جو سب پر غالب رہا اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بتدریج پاکستان کے ادب، ثقافت اور نظریات کے سانچے میں ڈھل چکا ہے۔

عربوں نے اپنی ہندی فتوحات کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ برصغیر کی سیاسی تسخیر کا سہرا دراصل ترکوں کے سر رہا، جو بارھویں صدی عیسوی میں یہاں آئے۔ لیکن محدودے چند باقیات کے، برصغیر کی موجودہ اسلامی یادگاریں یا تو مغلوں سے منسوب کی جاتی ہیں یا اُن کی ہم عصر مقامی سلطنتوں سے۔ مغلوں سے قبل کی مسلم یادگاروں کے فقدان کا سبب معلوم کرنا ایک عقدۂ مشکل سے کم نہیں۔ گمان یہ ہوتا ہے کہ سولہویں صدی اور اس کے بعد کا مروجہ جدید فن تعمیر پہلے کی فرسودہ عمارتوں کے مسمار ہونے کا باعث ہوا۔

مغلوں سے قبل کے دور کی جو یادگاریں قائم ہیں اُن میں ٹھٹھہ اور ملتان کے چند مقبرے شامل ہیں جن میں سب سے زیادہ پرشکوہ رکن عالم (۱۳۲۰ - ۱۳۲۴) کا مقبرہ ہے جس کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اُن چند عظیم الشان یادگاروں میں سے ہے جو کسی کی وفات پر بطور عقیدت تعمیر کی گئی ہیں۔ اس کی شکل ہشت پہل ہے اور دیواروں پر سفید اور نیلے رنگ میں منقش ٹائلیں چنی ہیں۔ فن تعمیر کے لحاظ سے یہ مقبرہ ہند و مسلم فن کے امتزاج کی بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ان عناصر کی پیش بینی کرتا ہے جو آنے والی صدیوں میں مغل تعمیرات میں اُجاگر ہوئے۔ اس دور کے فن تعمیر پر وسط ایشیا اور ایران کے فن کا گہرا اثر پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ عمارتیں بے حد سادہ اور کشادہ نظر آتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی بیرونی ہیئت مدوّر...

یا ہشیر الاضلاع ہے جن میں مقامی تعمیراتی سامان کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔

ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی بابر تھا، لیکن اسے استحکام شہنشاہ اکبر کے دور میں حاصل ہوا، جو سنہ ۱۵۴۲ء میں سندھ کے ایک شہر عمر کوٹ میں پیدا ہوا۔ سنہ ۱۶۰۵ء میں اپنی وفات سے قبل وہ نہ صرف ایک وسیع سلطنت کا حکمران تھا بلکہ معاشرتی اور اقتصادی اصلاحات کے ساتھ ساتھ اس کے زمانے میں ادب اور فن تعمیر نے بھی ایک ممتاز حیثیت اختیار کی جو وسط ایشیا، ایران اور مقامی فنون کی آمیزش کا نتیجہ تھا۔ اس نئے نمونے کی تشکیل کی شہنشاہ شاہ جہاں کے وقت میں ہوئی جو فن تعمیر کا بہت بڑا دلدادہ تھا۔ اس کی سرپرستی میں مغل فن تعمیر بام عروج پر پہونچ چکا تھا۔ اس عہد زریں کی چند شاہکار تخلیقات آج بھی اس سرزمین کی زینت ہیں۔

مغلوں کے دور میں لاہور فن تعمیر کا ایک مرکز بن گیا، اور اس کا شمار ایشیا کے مشہور ترین شہروں میں ہونے لگا۔ یہاں متعدد شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں جن سے آج بھی مغلوں کی تعمیراتی عظمت کی روایات زندہ ہیں۔ یہاں کا قلعہ جہانگیر، اور نور جہاں کے مقبرے، شالامار باغ اور وزیر خاں کی مسجد ایسی یادگاریں ہیں جو زبان حال سے مغلوں کے تعمیری ذوق کی داد دیتی ہیں۔

اندرونی نقش و نگار، دیدہ زیب مزین اسلوب اور پیازہ نما گنبد عمارتوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ہشت اضلاعی شہ نشینیں اور باغیچے ان کے فن میں چار چاند لگاتے ہیں۔ تعمیر کے لئے سنگ مرمر کے علاوہ سنگ احمر بھی استعمال کیا گیا ہے، بعد کے دور میں اینٹ کے وسطی حصّہ کو پچی کاری سے مزین کرتے تھے جس کے لئے خاص طور سے نیلے، سفید، پیلے اور سبز رنگ کے چمکدار ٹائل بنائے جاتے تھے۔ آخر میں اس کی جگہ مربع نما ٹائلوں نے لے لی جن پر بیل بوٹے منقش و نگار ہوتے تھے۔ ان کا رنگ خاص طور پر سبز ہوتا تھا۔ اگرچہ گلابی اور آبی رنگ کے ٹائل بھی نظر آتے ہیں۔ منقش ٹائلوں کا رواج گو ایرانی اثرات کا نتیجہ تھا، لیکن اس میں مقامی عناصر بھی شامل ہوتے گئے جس کی مثال لاہور کے قلعہ کی شمالی اور مغربی فصیلوں میں ملتی ہے۔

ٹھٹھہ میں بھی مغل زمانے کی مشہور عمارتیں قائم ہیں۔ سندھ کے اس قدیم دارالخلافہ میں منقش ٹائلوں سے مزین شاہجہانی مسجد قابل دید ہے۔ علاوہ ازیں شاہزادوں، وزیروں، گورنروں اور صوفیوں کے بے شمار خوب صورت مقبرے مکلی پہاڑی پر چھ مربع میل کے رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں جو مشرق کا سب سے بڑا گورستان سمجھا جاتا ہے۔

مشرقی پاکستان میں مان سون اور ناگہانی حادثات نے مغلوں سے قبل کی عمارتوں میں سے بہت کم عمارتوں کا وجود باقی رہنے دیا ہے۔ جن میں سب سے زیادہ پر عظمت گوڑ کی "چھوٹا سونا مسجد" ہے جس کا اندرونی اور بالائی حصہ مشہور ہے۔ یہ دراصل بنگال کے قدیم فن کا اعادہ ہے۔

مغلوں کے زمانے کی عمارتیں نسبتاً اچھی حالت میں محفوظ ہیں۔ ان میں لال باغ کا قلعہ، بی بی پاری کا مقبرہ، ڈھاکہ کی ہشت گنبد مسجد اور شہر کے مضافات میں پھیلے ہوئے چند قلعے خاص طور پر قابل دید ہیں۔ ان تمام عمارتوں میں بالعموم فن تعمیر کا عنصر غالب ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ بنگال کے مقامی فن کی آمیزش کی جھلک بھی موجود ہے۔

قاضی ابوالحسن علی بن عبدالعزیز جرجانی
ترجمہ
ڈاکٹر سید محمد یوسف

عربی

# علم کی عزت

يَقولونَ لي فيكَ انقباضٌ وإنّما
رَأَوا رجلاً عن موقفِ الذُّلِّ أحجَما

لوگ کہتے ہیں کہ میں کم آمیز ہوں - بات صرف اتنی ہے کہ ان کا پالا ایسے آدمی سے پڑا ہے جو ذلّت کی جگہوں سے دُور رہتا ہے -

إذا قيل: هذا مَشرَبٌ، قُلتُ: قد أرى
وَلٰكنّ نفسَ الحُرِّ تحتمِلُ الظّما

جب کوئی کہتا ہے کہ "پنگھٹ یہ رہا!" تو میں کہتا ہوں کہ وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے، لیکن ایک شریف النفس پیاس برداشت کرسکتا ہے -

ولم أقضِ حقَّ العِلم ان كان كُلّما
بَدا طَمعٌ صَيّرتُه لِيَ سُلَّما

میں علم کے حق میں کوتاہی کروں گا اگر ایسا ہو کہ جب بھی کوئی لالچ پیدا ہو میں اس کے زینے پر چڑھتا چلا جاؤں -

ولم أبتَذِلْ في خدمةِ العِلم مُهجَتي
لِأخدمَ مَن لاقَيتُ لكن لِأُخدَما

میں نے علم کی خدمت میں اس لئے پِتّا نہیں مارا ہے کہ جو سامنے آئے اُس کا خادم بنوں بلکہ اس لئے کہ مخدوم بنوں -

أأشقَى به غَرسًا وأجنيهِ ذِلَّةً
إذنْ فاتّباعُ جهلٍ قد كان أحزَما

کیا میں علم کا پودا لگانے میں ہر قسم کی تکلیف اٹھانے کے بعد اس سے ذلّت کا پھل پاؤں - تب تو زیادہ دانش مندی یہی ہے کہ جہل کے راستے پر چلا جائے -

ولوأنّ أهلَ العِلمِ صانوهُ صانَهُم
ولو عظّموهُ في النّفوسِ لَعُظِّما

اگر اہلِ علم، علم کا مرتبہ بلند کرتے تو علم بھی اُن کا مرتبہ بلند کرتا اور اگر وہ دلوں میں علم کی عظمت بٹھاتے تو ضرور اُس کی عظمت مسلّم ہو جاتی -

ولكن أهانوهُ فهانوا ودَنّسوا
مُحيّاهُ بالأطماعِ حتى تجهّما

لیکن انہوں نے تو علم کو رسوا کیا، نتیجے میں خود بھی رسوا ہوئے اور علم کے چہرے کو ذاتی منافع کی آلائش سے ایسا گندا کیا کہ وہ نفرت انگیز بن گیا -

ماؤزے تنگ
ترجمہ
خیرالنساء انصاری

چینی

# نانکنگ[1] کی عوامی فتح

دفعتہً ایک طوفان چنگشان کو پار کر کے بڑھا
ہماری سپاہِ عظیم و جفاکش کے لاکھوں سپاہی
تند موجوں کی مانند دریائے اعظم سے گزرے
شہر — شیرِ مطیع، ایک پیچیدہ اژدر[1] —
اپنی کہنہ روایاتِ تابندہ کو اور تابندہ کرنے لگا
فتحِ کامل نے زیر و زبر کر دیئے آسمان و زمیں
کیوں نہ تاب و توانائی کے ساتھ ہم اپنے دشمن کا پیچھا کریں
ہسیانگ یو[2] کی طرح لغو شہرت کی خواہش سے کیا فائدہ۔
ہوتی قدرت بھی ذی حس اگر
وہ بھی عہدِ جوانی سے پیری کی منزل میں رکھتی قدم
لیکن انساں کی دنیا کے گہرے سمندر تو بن جاتے ہیں باغ شہتوت کے[3]

---

[1] نانکنگ، کومنتانگ کی رجعت پسندانہ حکومت کا مرکز تھا۔ کوہ چنگشان شہر کے مشرق میں واقع ہے کلاسیکی ادیبوں نے انہیں "شیرِ مطیع" اور "پیچیدہ اژدر" سے تشبیہ دی ہے۔

[2] ہسیانگ یو: خود ساختہ فاتح جس نے تیسری صدی ق۔م۔ میں چن خاندان کے خلاف کسانوں کی قیادت کی تھی۔ فیاض اور رواداری کہلانے کی خواہش میں اس نے موقع ملنے پر اپنے حریف لیو پانگ کو قتل نہیں کیا تھا۔ آخر میں لیو پانگ سے شکست کھا کر اس نے خودکشی کر لی تھی۔

[3] ایک قدیم چینی کہانی میں ہے کہ ایک چینی عورت نے اتنی طویل عمر پائی تھی کہ اس نے سمندروں کو کئی بار خشک ہو کر شہتوت کے باغوں میں تبدیل ہوتے دیکھا۔

باقی صدیقی
ترجمہ
سلیم سالم

پنجابی

# کھڑکی میں بیٹھا دیکھوں

آندھیاں آن تے جھکڑ جھلن
چیڑے اُڈن، صافے کھلن
تکاں تک نہ سکاں
باری وچ بیٹھا تکاں

میکی ہوئی چادر چٹی
گلی گلی نی اُڈنی مٹی
جھکاں، جھک نہ سکاں
باری وچ بیٹھا تکاں

لمیاں سوچاں پہراں پہراں
وگی وا، سمے نیاں لہراں
ڈکاں، ڈک نہ سکاں
باری وچ بیٹھا تکاں

دردحیاتی ڈونگھی کتی
ایہہ دنیا نی کھٹی لستی
جھکاں، جھک نہ سکاں
باری وچ بیٹھا تکاں

آندھیاں آئیں جھکڑ آئیں
پگڑیاں، صافے اُڑ اُڑ جائیں
دیکھوں، دیکھ نہ پاؤں
کھڑکی میں بیٹھا دیکھوں

اُجلی چادر ہو گئی میلی
گلی گلی کی اُڑتی مٹی
جھانکوں، جھانک نہ پاؤں
کھڑکی میں بیٹھا دیکھوں

شام سویرے گہری سوچیں
چلتی ہوا، سمے کی لہریں
روکوں، روک نہ پاؤں
کھڑکی میں بیٹھا دیکھوں

جیون روگ ہے گہری ندی
یہ دنیا کی کھٹی لسی
پیوں ــــــ پی نہ پاؤں
کھڑکی میں بیٹھا دیکھوں

خواجہ غلام فرید
ترجمہ
مولانا محمد عزیز الرحمٰن

سرائیکی

# آنسوؤں کی جھڑی

ساون بونڈریاں جھبر لاوے

آنسوؤں کی جھڑی نے ساون کا منظر پیدا کر رکھا ہے

کوک کوک پاپی رڑے پپیہا
پھوک پھوک تن آگ جگاوے

ظالم پپیہا کوک کوک کر بدن میں آگ لگا رہا ہے
اور پھونک پھونک کر اُسے بھڑکا رہا ہے

کوئل کوکُو مہر وا بولے
دل دکھیاری نوں ڈُوکھ تاوے

کوئل ۔ کوکو اور مور بول بول کر دردمند دل کو
زیادہ دُکھ دے رہے ہیں اور آگ لگا رہے ہیں

نین چین سے جھگڑت جھگڑت
تڑپھت تڑپھت رین بہاوے

آرام اور آنکھوں کی باہم جنگ ہے
جس میں عاشق کی رات تڑپتے ہوئے گذرتی ہے

چھتیاں دھڑکت جیارا لرجت
سج بن کاری گھٹن ڈراوے

سینہ دھڑکتا اور دل لرزتا ہے ۔ اے محبوب
تیرے بغیر یہ کالی گھٹا بھی ڈراؤنی معلوم ہوتی ہے

بیستم پیت فرید نہ پالی
انگ انگ برہن مرجھاوے

اے فرید افسوس ہے کہ محبوب دل نواز نے محبت سے نباہ نہ کی
اب یہ حال ہے کہ دردِ فراق میں جسم کا ایک ایک حصہ مرجھا گیا ہے

هو الشافی

HE is the Healer

# انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ طبّی ریسرچ

# THE INSTITUTE OF HEALTH AND TIBBI RESEARCH

## تنصیبِ سنگِ بنیاد

۳ر دسمبر ۱۹۶۶ عیسوی ۱۹ر شعبان ۱۳۸۶ ہجری

## FOUNDATION STONE LAYING CEREMONY
3RD DECEMBER 1966

کراچی۔پاکستان

KARACHI-PAKISTAN

# خبر نامہ

## ٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ طبی ریسرچ

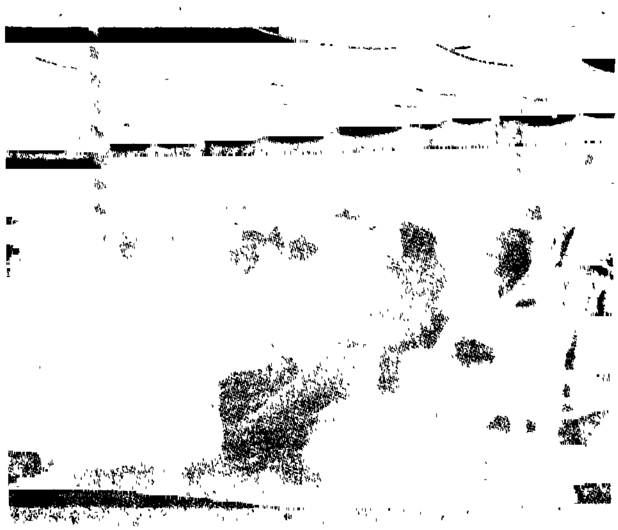
# سنگِ بنیاد

## تاریخِ طب کا ایک عظیم واقعہ





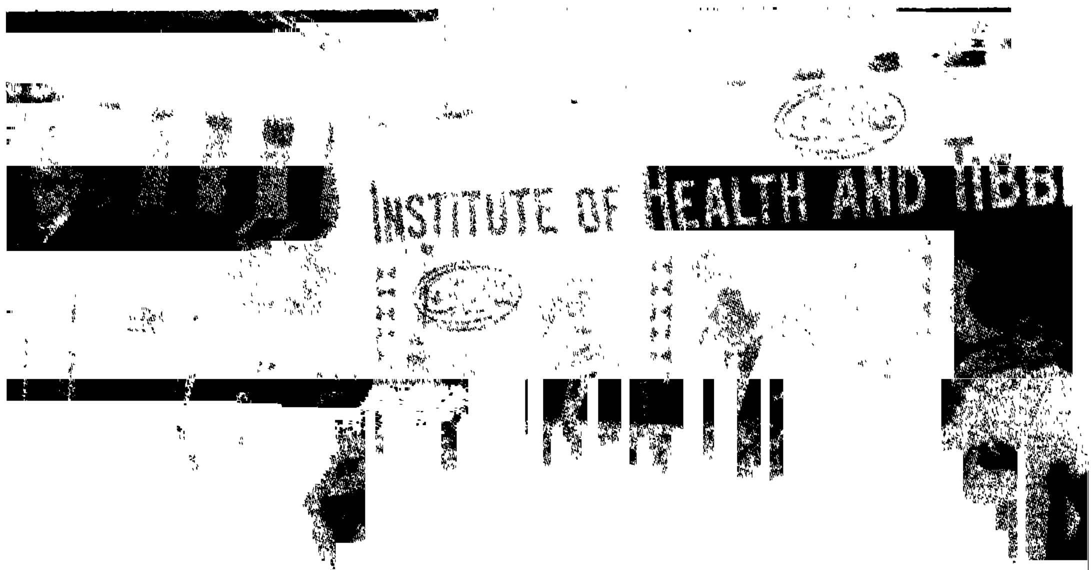

صدرِ مملکت پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب
خان صاحب حکیموں، ڈاکٹروں اور سائنس دانوں
اور سفارتی نمائندوں اور فوجی اور سول حکام اور معززین سے مخاطب ہیں ـــــ انھوں نے ارشاد فرمایا کہ بیماریوں کا خا
اور دکھ درد کا علاج کسی خاص طریقۂ علاج کی
اجارہ داری نہیں۔ بلکہ ان مقاصد کی تکمیل کسی
بھی طریقے سے کی جا سکتی ہے ـــــ انھوں
نے یہ بھی فرمایا کہ حکومت سائنسی خطوط پر
حکمت کی ترقی میں بھرپور مدد دے گی۔

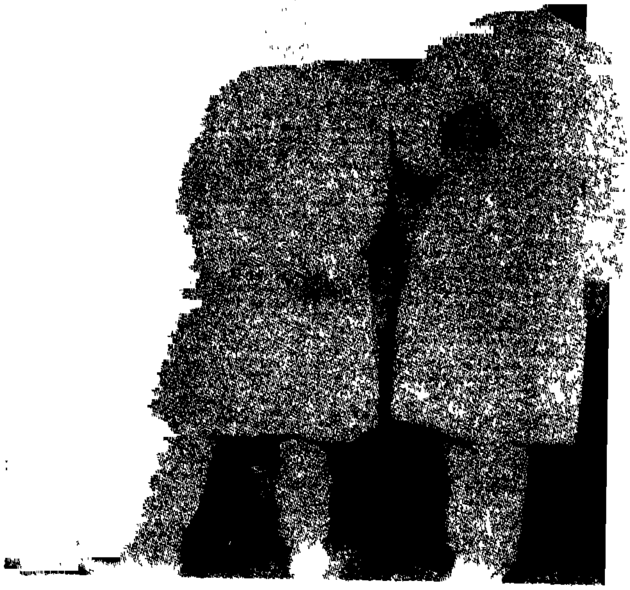




مریض کی شفا کو مقدس سمجھنا چاہیے اور اس کو بہر حال اوّلیت دینی چاہیے (حکیم محمد سعید)

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی صاحب نے فرمایا کہ طب میں بڑا کثیر سامان علم و حکمت ہے اس سے پورا استفادہ کرنا چاہیے



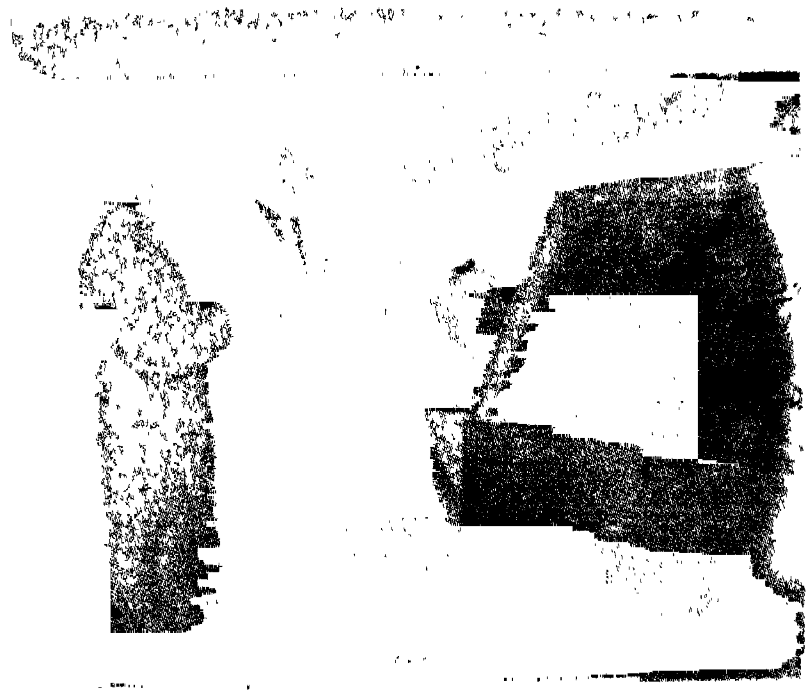


صدرِ مملکت خطاب کے بعد انسٹی ٹیوٹ کے مختلف شعبوں، ہسپتال، میڈیکل میوزیم، لائبریری وغیرہ
کے نقشے ملاحظہ فرمانے تشریف لے جا رہے ہیں



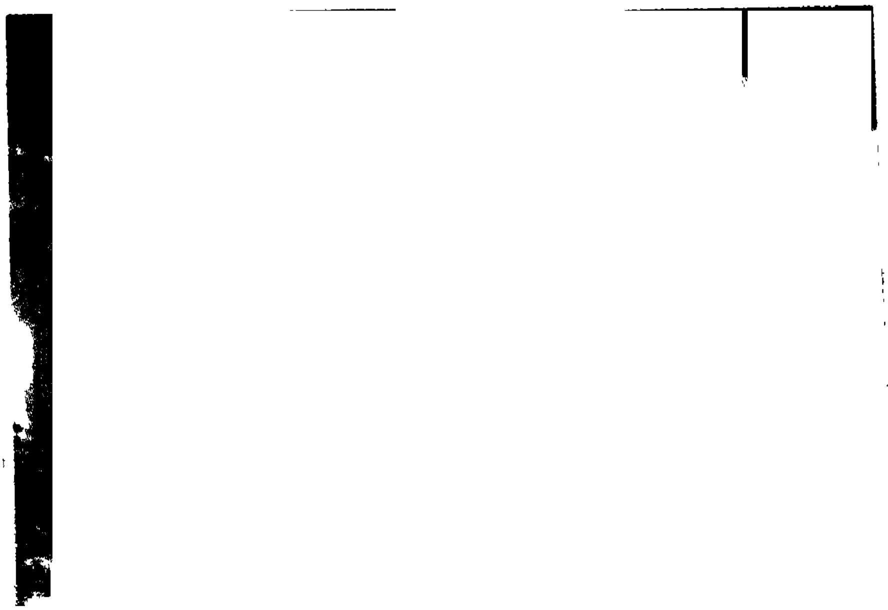


صدرِ مملکت
سنگِ بنیاد
نصب فرما
رہے ہیں۔



اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ اس انسٹی ٹیوٹ کی جلد تکمیل کی ہمت عطا فرمائیں
ہسپتال وغیرہ جلد بنیں، کہ خدمتِ خلق کا جلد آغاز ہو

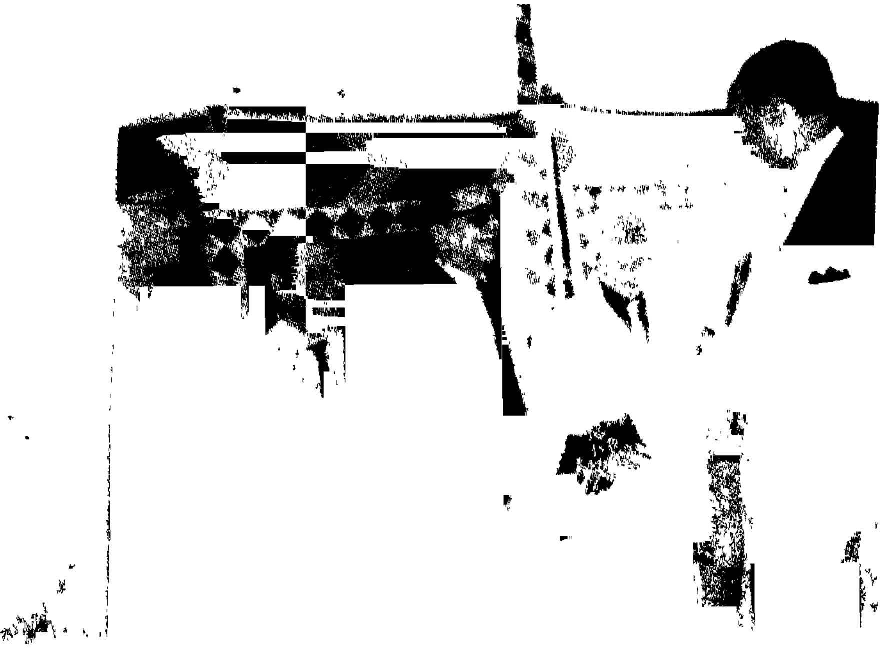
انسٹی ٹیوٹ کی ایڈوائزر
کاؤنسل کے سائنسدان
ڈاکٹر، حکیم اور ماہر
تشریف فرما ہیں۔





حکیم عبدالحمید دہلوی سے ملاقات حکیم صاحب کے بائیں طبیبہ انوری بیگم، دائیں ڈاکٹر محمود حسین صاحب

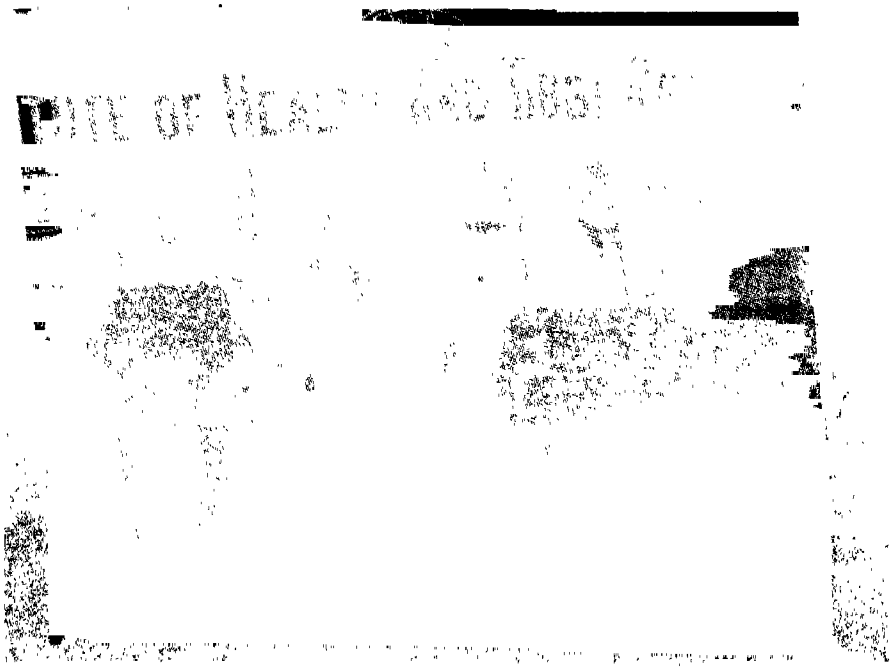
سکریٹری مواصلات مسرت حسین زبیری سے ملاقات برابر میں جناب مدنی صاحب اور جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب





ڈاکٹر محمد الیاس جنرل منیجر ہمدرد صدرِ مملکت کے ساتھ

صدر مملکت، قاضی انوار الحق صاحب وزیرِ صحت پاکستان، حکیم عبدالحمید دہلوی






ڈاک کا یادگاری ٹکٹ۔ جو ۳ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو سنگِ بنیاد رکھنے کے موقع پر جاری کیا گیا۔ یہ تقریب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نشانِ پاکستان، ہلالِ جرأت صدر پاکستان نے اپنے دستِ مبارک سے انجام دی۔ یادگاری ٹکٹ پر دی ہوئی تصویر حکیم ابنِ سینا کی ہے، جنھیں اہلِ مغرب AVICENNA کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور طبیبوں کے بادشاہ مشہور ہیں۔ بخارا کے قریب ۹۸۰ش میں پیدا ہوئے اور ایران کے شہر ہمدان میں ۱۰۳۷ش میں وفات پائی۔ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے حکیم اور فلسفی تھے۔ انھوں نے ہر موضوع پر کتابیں لکھی ہیں، لیکن طب پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تاریخ کا بے مثال سرمایہ ہے۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف قانونِ طب (القانون) ہے، جو طب پر ایک جامع العلوم کی حیثیت رکھتی ہے اور یورپ اور مشرق کی درسگاہوں میں صدیوں تک نصاب میں شامل رہی ہے۔ آج بھی بعض یورپی ممالک میں قانونِ طب کے نظریات، طریقہ ہائے علاج، ادویہ اور تراکیبِ تیاری ادویہ پر چھان بین کی جا رہی ہے۔ اس ذہین و فہیم حکیم کو مرے سینکڑوں برس گزر چکے ہیں لیکن اس کا نام آج بھی زندہ ہے۔ کیونکہ ابنِ سینا کا نام طبِ مشرقی کی ترقی کے مترادف ہے۔

ص - ل

# رفتارِ عمل

## ادبی و تہذیبی خبریں اور تبصرے

# اردو کو ہر سطح پر تعلیمی اداروں میں رائج کیا جائے

## تمام یونیورسٹیوں میں ترجمہ و تالیف کے شعبے قائم کئے جائیں

## کل پاکستان سائنٹیفک سوسائٹی کے چند اہم فیصلے

لائل پور۔ گذشتہ دنوں یہاں کل پاکستان سائنٹیفک سوسائٹی کا ۸ واں اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں ساڑھے تین سو سائنس دانوں نے شرکت کی اور مختلف اجلاسوں میں ۲۵۰ نمائندوں نے سائنسی اور فنی موضوعات پر سیر حاصل مقالے پڑھے سوسائٹی کا افتتاح جناب ملک خدا بخش صوبائی وزیر زراعت نے کیا۔ آخری اجلاس میں دور رس فیصلے کئے گئے ان میں حکومت سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اردو کو ہر سطح پر تعلیمی شعبوں میں جلد از جلد رائج کرنے کے لئے اقدامات عمل میں لائے، تاکہ اردو ایک قومی زبان کی حیثیت سے جلد اپنا مرتبہ حاصل کرسکے۔

اس کے علاوہ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ہر یونیورسٹی میں ترجمہ و تالیف کا ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا جائے۔ حکومت نے قومی زبانوں کی ترقی اور اس کے جلد نفاذ کا جائزہ لینے کے لئے جامع اختیاری کمیٹی قائم کی ہے۔ سوسائٹی نے اسے ایک صحیح فیصلہ قرار دیتے ہوئے ارباب حکومت کو مبارکباد دی ہے۔ ایک اور قرارداد میں سائنسی اور فنی ماہرین کے سلسلۂ ملازمت بیرونی ممالک جانے پر اظہار تشویش کیا ہے۔ اور حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں تحقیقات کرے اور حالات کی بہتری کے لئے ضروری کارروائی عمل میں لائے

اردو نصاب کی کتابوں میں بعض سرکاری اور غیر سرکاری ایجنسیوں نے اردو اور عربی اعداد کے بجائے انگریزی اعداد کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے جس سے خواہ مخواہ دشواریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اسے ترک کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ عربی اور اردو کے اعداد گذشتہ چودہ سال سے مروج ہیں لہذا اردو نصاب میں ان ہی کو استعمال کیا جائے

آخر میں انتخابات عمل میں آئے اور سال رواں کے لئے ڈاکٹر شفاعت حسین صدیقی صدر۔ ڈاکٹر اسد الحق نائب صدر، میجر آفتاب حسن جنرل سکریٹری، ڈاکٹر سید محمود سکریٹری۔ پروفیسر ایم اے عظیم اور جناب رشید حبیب بطور خازن منتخب کئے گئے۔

## جشن جوش سے جشن مخدوم تک

### زندہ دوستی اور اعتراف عظمت کی نئی روایت

### جس کا سہرا افکار کے سر ہے

کراچی۔ افکار نے نومبر ۱۹۶۱ء میں وسیع پیمانے پر "جشن جوش" منایا تھا، اور اس عہد کے عظیم شاعر حضرت جوش ملیح آبادی کی زندگی، شخصیت اور فن پر" جوش نمبر" ایسی تاریخ ساز ادبی دستاویز پیش کرکے زندہ دوستی اور اعترافِ عظمت کی نئی روایت کا آغاز کیا تھا۔ شکر ہے کہ اس کی تقلید و حمایت میں اور نئی روایت کو آگے بڑھانے کے جذبے سے برصغیر میں ہر جگہ اردو زبان و ادب کی باکمال شخصیتوں کے جشن منانے کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور بطور قدر دانی خاص اشاعتیں بھی پیش کی گئیں۔ جوش ملیح آبادی کے بعد اب تک جن زندہ و باکمال حضرات کی خدمات کا پاکستان اور بھارت میں عملی اعتراف کیا گیا ہے ان میں نیاز فتح پوری، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، فراق گورکھپوری، علی عباس حسینی، جمیل مظہری، اختر اورینوی، اثر لکھنوی، حبش رحمٰن ڈاکٹر سید عبداللہ، امتیاز علی عرشی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

"تازہ ترین اطلاعات کے مطابق ۱۰ر ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو مخدوم محی الدین کی ۳۵ سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں دکن کے ادیبوں اور شاعروں نے جشن مخدوم منایا، اور انہیں شایانِ شان خراجِ تحسین پیش کیا۔ ایک اطلاع کے مطابق ماہنامہ 'صبا' حیدرآباد دکن جشن مخدوم کی تقریبات پر مشتمل خصوصی اشاعت پیش کر رہا ہے۔ ادھر بمبئی میں ماہنامہ 'شاعر' نہایت اہتمام سے "کرشن چندر نمبر" مرتب کر رہا ہے جو اعلان کے مطابق فروری ۶۷ء میں شائع ہو رہا ہے۔ ادھر 'ارژنگ' پشاور نے احمد ندیم قاسمی نمبر کی تیاری شروع کر دی ہے۔ اور ان اطلاعات پر افکار اور ادارۂ افکار سے زیادہ کسے فخر و مسرت کا حق حاصل ہے جس نے مختصر سی مدت میں جوش نمبر، حفیظ نمبر اور فیض نمبر پیش کرکے اہلِ نظر اور معاصرین کو زندوں کی قدر دانی کی راہ دکھائی۔ ہماری تمنا اور دعا ہے کہ اہلِ کمال کی قدر دانی کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے۔

## لندن میں چغتائی کی تصویروں کی نمائش

لندن۔ گذشتہ دنوں کامن ویلتھ انسٹی ٹیوٹ آرٹ گیلری میں پاکستان کے ہائی کمشنر جناب ایس کے دہلوی نے مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کی تصاویر کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ چغتائی اسکول کی بنیاد جذبہ و روح کا حسین امتزاج ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ تصاویر معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ چغتائی کی نہ صرف ملک میں قدر و منزلت کی جاتی ہے بلکہ بیرونِ ملک بھی ان کے فن کے قدرداں موجود ہیں۔ انہوں نے مغل مصوری کو حسین و دلکش رنگوں اور لکیروں میں منتقل کرکے اس فن کو معراج تک پہونچایا ہے۔

لندن کی اس آرٹ گیلری میں پاکستان کے کئی اور ممتاز مصوروں کے فن پاروں کی نمائش بھی ہو چکی ہے۔ جن میں صادقین اور شمزا بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

## امریکہ میں اردو ادب پر تحقیقی کام

کراچی - اردو زبان کی بین الاقوامی حیثیت اور مقبولیت کا اندازہ کچھ تو ان مضامین (مطبوعہ افکار) سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جس کے کچھ حصے آغا افتخار حسین کی زیرِ طبع کتاب "یورپ میں اردو" پر مشتمل تھے، اور کچھ اُن اطلاعات سے جو یورپ کے علاوہ دیگر ملکوں میں طلبہ اردو پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق امریکہ میں اردو پڑھنے والے طلبہ نے جن موضوعات پر اب تک تحقیقی کام مکمل کر لیا ہے، ان کی حسبِ ذیل تفصیلات کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

۱- غالب - روایت اور جدت
۲- اقبال کے فلسفۂ خودی پر مغرب کا اثر
۳- پریم چند - فن کار یا مصلح
۴- امراؤ جان ادا - ناول کے فن کی روشنی میں
۵- فیض احمد فیض - نوآزاد جنوبی ایشیا کی آواز
۶- اردو افسانے میں تنزل کا دور
۷- انگریزی تراجم میں اردو ناول اور افسانہ کا جائزہ
۸- اردو ادب کی جدید تحریکیں - ایک تبصرہ
۹- جدید اردو شاعری کے ترجموں پر ایک نظر۔

امریکی حکومت جن گیارہ غیر ملکی زبانوں کی تعلیم پر زیادہ زور دے رہی ہے ان میں اہمیت کے اعتبار سے اردو اور ہندی کا نمبر صرف روسی اور چینی زبان کے بعد آتا ہے — روس میں اردو زبان و ادب پر جتنا کام دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہوا ہے اتنا کام کسی اور ملک میں نہیں ہوا۔ چین میں بھی اب اردو ادب کے مطالعہ کا شوق بڑھ رہا ہے اور کئی ممتاز اردو ادیبوں اور شاعروں کے مجموعے چینی زبان میں چھپ چکے ہیں ——— اور یہ بات اردو والوں کے لئے باعثِ فخر و امتیاز ہے۔

## جرمنی میں علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت

ہائیڈلبرگ (جرمنی) پچھلے دنوں یہاں ہائیڈلبرگ کے وزیرِ ثقافت پروفیسر ڈاکٹر یان نے پاکستان کے قومی شاعر اور فلسفی علامہ اقبال کی یاد میں ایک لوح کی نقاب کشائی کی۔ جرمنی میں پاکستانی سفیر جناب عبدالرحمن جنوبی ایشیا کے ادارے کے ناظم پروفیسر جو ساٹز فارڈ میئر کلیم اور بہت سے پاکستانی اور جرمن طلبہ اس تقریب میں موجود تھے۔ یہ تقریب پاکستان کے عظیم قومی شاعر کی یاد میں منعقد کی گئی تھی۔

واضح رہے کہ علامہ اقبال نے سنہ ۱۹۰۷ء میں ہائیڈلبرگ میں قیام کیا تھا۔ وزیرِ ثقافت پروفیسر ڈاکٹر یان نے اپنی تقریر میں پاکستانی شاعر کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال کو "سیاسی ہیرو" قرار دیا۔ پاکستانی سفیر جناب عبدالرحمن خاں نے پاکستان کے قومی شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کرنے پر مقررین کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب کا اہتمام جرمنی میں مقیم پاکستانی طلباء نے کیا تھا۔

## 'جاوید نامہ' کا انگریزی ترجمہ

راولپنڈی - علامہ اقبال کے "جاوید نامہ" کا انگریزی ترجمہ حال ہی میں لندن سے شائع ہوا ہے یہ ترجمہ تمام دنیا میں' اور خصوصاً برطانیہ کے ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہو رہا ہے۔ اخباروں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے ڈانٹے کی "ڈیوائن کامیڈی" (مقدس طربیہ) سے تشبیہ دی ہے — "جاوید نامہ" کا یہ ترجمہ مشہور مستشرق پروفیسر آربری نے کیا ہے۔

# مشرقی پاکستان کی اعلیٰ درس گاہوں میں ذریعۂ تعلیم بنگلہ ہوگی

## بنگلہ زبان و ادب کی ترقی کیلئے بنگالی اکیڈیمی کی مساعی

ڈھاکہ۔ اطلاعات کے بموجب حکومت مشرقی پاکستان سنہ ۱۹۶۸—۶۹ء کے تعلیمی سال تک ڈھاکہ یونیورسٹی میں اعلیٰ جماعتوں تک بنگلہ زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا رہی ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر غنی نے ایک بیان میں کہا کہ یونیورسٹی کی سطح پر بنگلہ زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لئے ضروری ہے کہ سیکنڈری بورڈ ثانوی درجوں تک بنگلہ زبان کو لازمی ذریعۂ تعلیم قرار دے دے۔ کیونکہ ثانوی درجوں کی مطلوبہ کتب بنگلہ زبان میں بہ آسانی دستیاب ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس سلسلے میں خالص جذباتیت اور جلدبازی سے کام نہیں چلے گا، اور ہمیں سوچ سمجھ کر لیکن مستعدی کے ساتھ مشرقی پاکستان کی تمام درس گاہوں میں بنگلہ زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا ہوگا۔ کراچی اور لاہور کی یونیورسٹیوں میں اردو پہلے ہی اعلیٰ جماعتوں تک درجۂ تعلیم بنائی جا چکی ہے۔ ڈاکٹر غنی نے کہا کہ ہمیں انگریزی زبان کی اہمیت کو بالکل ہی نظرانداز نہیں کرنا چاہئے بلکہ یہ طے کرنا چاہئے کہ انگریزی زبان کو کس حد تک لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے۔ بنگلہ زبان میں مخصوص اصطلاحات کی تیاری کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اور اعلیٰ جماعتوں کے لئے بنگلہ میں کتابوں کی تیاری بھی شروع کی جا چکی ہے۔

بنگلہ اکیڈیمی بنگلہ زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں نہایت سرگرمی سے مصروف ہے۔ ڈاکٹر شہید اللہ کی مرتبہ انسائیکلوپیڈیا ۵ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ بنگلہ زبان کی قدیم و نایاب کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ مکمل ہو چکا ہے، اور کئی اور منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ جس سے یہ توقع بندھ گئی ہے کہ بنگلہ کو جلد ہی اس کا جائز مقام مل جائے گا۔

## برماشیل کا "نونہال"

### بچوں کے لئے خوبصورت تحفہ

کراچی۔ برماشیل کے شعبۂ نشر و اشاعت نے "نونہال" کے عنوان سے اپنے خبرنامہ میں شائع شدہ بچوں کی کہانیوں کا باتصویر انتخاب شائع کیا ہے، جو معیار، ترتیب و تدوین، اور حسن اشاعت کے لحاظ سے قابل تعریف ہے۔

اس مجموعے میں ۴۰ کہانیاں رنگین تصاویر کے ساتھ شائع کی گئی ہیں جو صرف بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ کہانیوں کی زبان نہایت سادہ و سلیس ہے۔ پہلے یہ کہانیاں دو علیٰحدہ مجموعوں کی شکل میں چھپی تھیں جنہیں اب یکجا شائع کیا گیا ہے۔ برماشیل اس خوب صورت پیشکش کے لئے قابل مبارکباد ہے۔

## زبانوں کا بینک

مانچسٹر۔ مانچسٹر یونیورسٹی کے طالب علموں نے شہر کے لوگوں کے لئے زبانوں کا مسئلہ حل کرنے کی غرض سے زبانوں کا ایک بینک قائم کیا ہے۔ عوامی ادارے مثلاً اسپتال، پولیس، مواصلاتی ادارے اور سوشل سروس کے ادارے اس بینک سے مترجم حاصل کر سکیں گے۔ یہ منصوبہ یونیورسٹی کے بین الاقوامی کلب نے شروع کیا ہے اور یہ بینک روزانہ ۲۴ گھنٹے کھلا رہے گا۔ یونیورسٹی میں ایک ہزار بیرونی طالب علم زیر تعلیم ہیں۔

ڈبلیو پی آئی ڈی سی

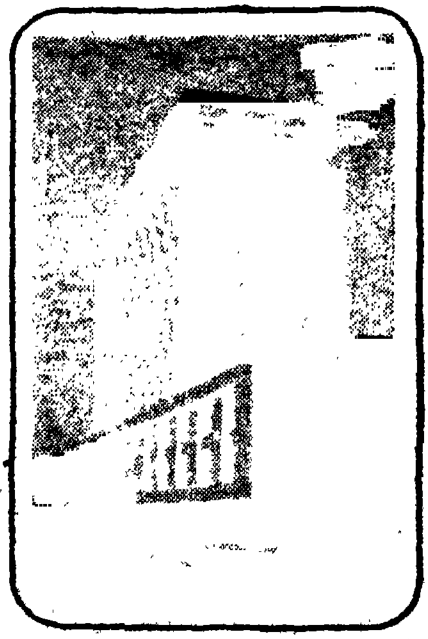
## سیمنٹ

مضبوط عمارتوں

کی ضامن







ZEALPAK

یہ عمارتیں ایک جھلک ہیں اس عظیم تر پاکستان کی جو ہمارے شہروں اور دیہی علاقوں میں اُبھر رہا ہے۔ یہ ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں لیکن ان سب کی مضبوطی کا راز ایک ہی ہے۔ وہ ہے، زیل پاک اور میپل لیف فیکٹریوں میں تیار ہونے والی اعلیٰ قسم کی ڈبلیو پی آئی ڈی سی سیمنٹ کا استعمال!

## مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی　　طابع: مشہور آفسٹ پریس کراچی　　دفتر: رابسن روڈ کراچی


قدیم طبی دانش اور جدید تحقیق
کے مطابق تیار کیا ہوا
قوت بخش ٹانک
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - ڈھاکہ - چاٹگام - لاہور

اِس شمارے کی

چند تازہ ترین تخلیقات

o سرسید کی انقلابی تحریک ——— انجم اعظمی
o اٹلی میں اردو ——— آغا افتخار حسین
o مکتوب نگاری کی روایت ——— مس گیتی آرا
o اردو میں تاریخ نویسی ——— ایک مذاکرہ

عربی، روسی، انگریزی اور رومانین نظمیں

o افسانے ——— ۱۶ منظومات
o نئی کتابیں ——— اور ——— ادبی و تہذیبی خبریں

# فصلوں میں کئی گنا اضافہ!

یہ ڈبلیو پی آئی ڈی سی کی کیمیاوی کھاد ہی کا کمال ہے کہ ان کے استعمال سے اب ملک کی زرعی پیداوار بہت بڑھ گئی ہے۔

چند اہم خصوصیات :-

- یہ زمین کی زرخیزی کو قائم رکھتی ہیں۔
- ہر فصل کا عمدہ اور کامیاب ہونا یقینی ہے۔
- پودوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہیں۔
- پودوں کی جڑیں مضبوط کرتی ہیں۔

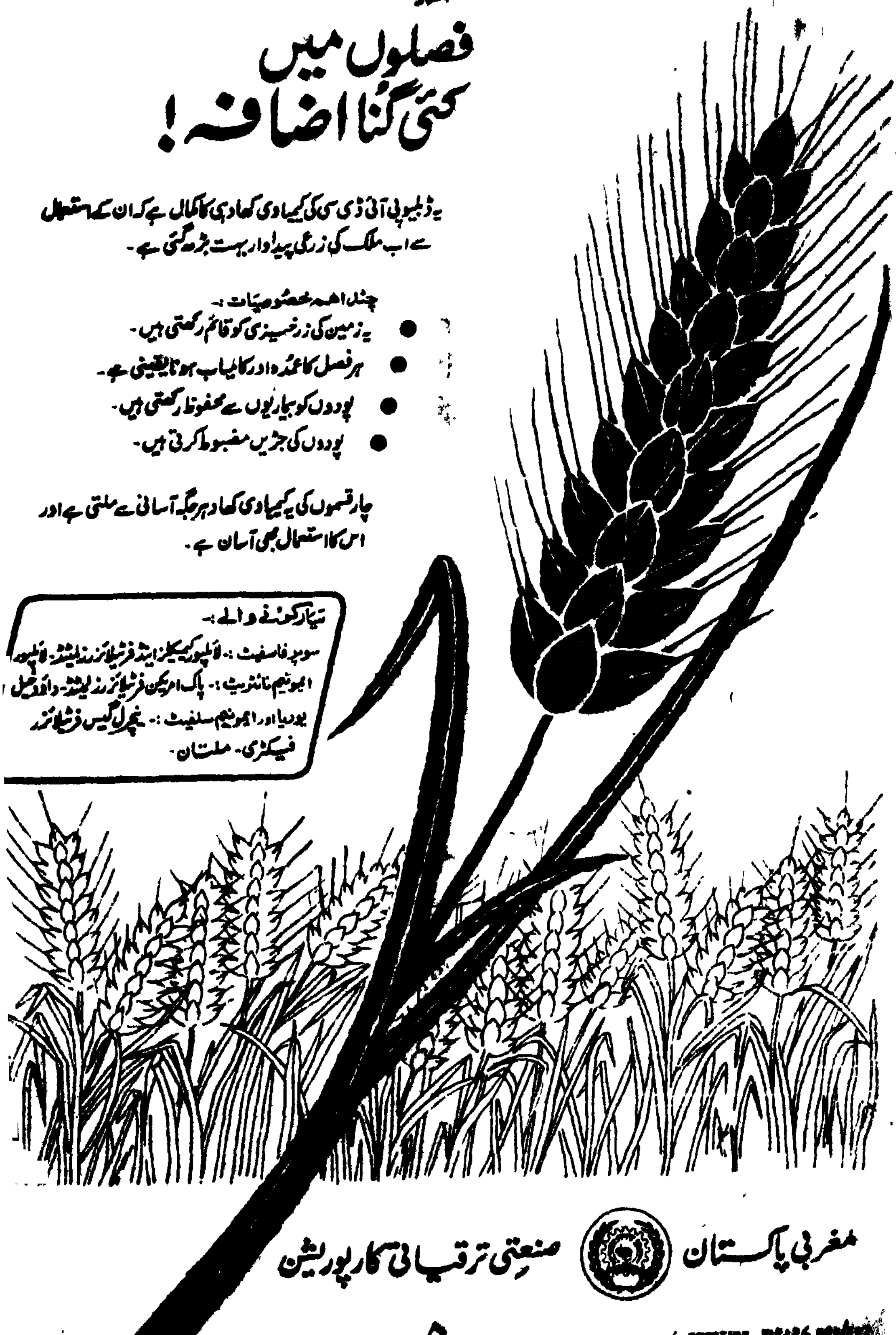
چار قسموں کی یہ کیمیاوی کھاد ہر جگہ آسانی سے ملتی ہے اور اس کا استعمال بھی آسان ہے۔

تیار کرنے والے :-

سوپر فاسفیٹ :- لائلپور کیمیکلز اینڈ فرٹیلائزرز لمیٹڈ۔ لائلپور

امونیم نائٹریٹ :- پاک امریکن فرٹیلائزرز لمیٹڈ۔ داؤد خیل

یوریا اور امونیم سلفیٹ :- نیچرل گیس فرٹیلائزر فیکٹری۔ ملتان۔



مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، راولپنڈی
اور جنرل ہیڈکوارٹرز آرمی ایجوکیشن سے منظور شدہ

جاری شدہ: ۱۹۴۵ء ★ ٹیلیفون: ۷۳۹۹۳

# افکار

سال: ۲۲ ٥ شمارہ: ۱۸۶

مُدیر
## صہبا لکھنوی

| قیمت فی پرچہ | بیرونِ ملک سے | | زرِ سالانہ |
|---|---|---|---|
| ایک روپیہ | ۱۰ ڈالر | ۴۰ شلنگ | ۱۲ روپے |

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ کراچی

لندن آفس
۱۴ - پرنسیز ایونیو - لندن این ڈبلیو نمبر ۹

# ڈاکٹر ایس۔ایم۔یوسف

## صدر شعبۂ عربی جامعہ کراچی

" پروفیسر نواب علی سفیل کے ہم عصر تھے۔ مذہبی اور ادبی تحقیق و تصنیف سے مشترکہ دلچسپی کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے قریبی دوست بھی تھے۔ مستشرقین اور مغربی مصنفین کے اسلام پر حملوں اور خصوصیت کے ساتھ حیاتِ رسول کے واقعات کو مسخ کرنے کا ان دونوں اصحاب پر بہت گہرا اثر ہوا چنانچہ انہوں نے رسول اللہ کی ایک نئی سیرت طیبہ لکھنے کی ضرورت پر غور و خوض کیا اور ایک ہی عالمانہ انداز میں علیحدہ علیحدہ کام کا آغاز کر دیا۔

"سیرتِ رسول اللہ" کا ہر صفحہ پروفیسر نواب علی کے وسیع مطالعے اور منفرد ذوقِ تحقیق کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے مستشرقین کی تصانیف کا براہ راست مطالعہ کیا تھا اور اُن کے ماخذوں کا بھی وہ سیر حاصل جائزہ لے سکتے تھے۔ عربی کے اصل ماخذ سے گہری عالمانہ واقفیت کے ساتھ ساتھ وہ تحقیق کے جدید ترین اسالیب سے بھی کما حقہٗ آگاہ تھے۔ مختصر یہ کہ وہ مستشرقین کو ان ہی کے حربوں سے شکست دے سکتے تھے۔ یہ ایک ایسا وصف ہے جسے روایتی مکتبۂ فکر کے علماء جدید علوم سے واقف ہونے کی شدید خواہش کے باوجود شاذ و نادر ہی حاصل کر سکے ہیں۔

پروفیسر نواب علی کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تصنیف کو مستند بنانے کے لئے اعلیٰ علمی معیارات کے مطابق دیدہ ریزی سے تحقیق کی ہے۔ تحقیق کی زبان عام طور پر دلکش طرزِ ادا سے عاری اور سادہ ہوتی ہے لیکن پروفیسر نواب علی نے شعر گوئی اور انشاء پردازی کی خدا داد قابلیت کی وجہ سے اپنی تحریر کو کبھی بے لطف نہیں ہونے دیا۔ ان کا اسلوبِ تحریر دل نشیں اور کیف آمیز ہے۔

کتاب کا حجم جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ضرورتوں کے لحاظ سے بطور خاص مناسبت رکھتا ہے۔ کتاب کی قیمت کم سے کم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے، تاکہ طلبا اور عام قارئین اس سے بآسانی مستفید ہو سکیں۔"

(روزنامہ "ڈان" کراچی)

---

پروفیسر نواب علی کی مشہور و مستند کتاب

# سیرت رسول اللہ

سائز ۲۰×۲۶/۸ ۰ صفحات : ۴۶۰ ۰ قیمت مجلد : بارہ روپے

## مکتبۂ افکار رابسن روڈ کراچی

## فروری سنہ ۱۹۶۸ء کی تخلیقات

اشاریہ ۱۲ صہبا لکھنوی

اس شمارے کی تمام تخلیقات بلاواسطہ حاصل کی گئی ہیں، مضامین نظم و نثر کا حق اشاعت محفوظ ہے، کوئی تخلیق تحریری اجازت کے بغیر شائع نہیں کی جا سکتی

# گلڈ کی آٹھویں سالگرہ

۳۱ جنوری ۶۷ء کو گلڈ کی آٹھویں سالگرہ منائی گئی۔ ۸ سال پہلے مشرقی اور مغربی پاکستان کے نمائندہ ادیبوں کا کنونشن کراچی میں منعقد ہوا تھا اور گلڈ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ۲۱۲ بنیادی ممبروں نے ایک واضح اور جامع منشور کی منظوری کے بعد گلڈ کا دستور مرتب کیا، اور ادیبوں کی فلاح و بہبود، باہمی ربط و تعلق اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ اب گلڈ کے ممبروں کی تعداد ۱۴ سو سے زائد ہے۔ ملتان اور لاہور میں گلڈ ہاؤس قائم ہو چکے ہیں —— کراچی میں گلڈ پبلشنگ ہاؤس اور گلڈ کتاب گھر، گلڈ کے اپنے ادارے ہیں جو کامیابی سے چل رہے ہیں — گلڈ ٹرسٹ گلڈ کے اثاثوں کا نگراں ہے، اور اس طرح یہ تنظیم نہ صرف ملک کی سب سے بڑی ادبی تنظیم بن گئی ہے بلکہ بیرون ملک بھی اس ادارے کے سبب پاکستان کے ادیبوں کا وقار بلند ہو گیا ہے اور ان کی گرانمایہ تخلیقات دنیا کی بیشتر ترقی یافتہ زبانوں میں منتقل ہو چکی ہیں۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے ادیبوں نے مل جل کر جس طرح اس ادارے کو کامیابی سے آگے بڑھایا ہے —— نامناسب نہ ہوگا اگر اس کا مختصر سا جائزہ پیش کر دیا جائے۔

اب تک گلڈ کے زیر انتظام سالانہ ۸۷ ہزار روپے کے انعامات علمی، ادبی، فنی، تحقیقی اور سائنسی کتابوں پر تقسیم کئے جا رہے تھے، جنوری ۶۷ء سے ۲۰ ہزار روپے کے ایک اور مستقل انعام کا اضافہ ہو گیا ہے، اس طرح آئندہ ایک لاکھ سات ہزار روپے ادیبوں کی تخلیقات پر سالانہ تقسیم ہوں گے۔

کراچی، لاہور اور ڈھاکہ میں ادیبوں کے لئے زمینوں کی فراہمی اور بستیاں بسانے کی سعی و جہد جاری ہے۔ کراچی ریجن کے زیر اہتمام پاکستان کی ادبی تاریخ میں پہلی بار "رائٹرز کلب" قائم ہو چکا ہے۔ کلب کے ساتھ ایک وسیع لائبریری کا پروگرام بھی زیر عمل ہے۔

ہر دو سال کے بعد مرکزی اور علاقائی شاخوں کے انتخابات عمل میں آتے ہیں، اور گلڈ کے ممبران ان میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں۔ مرکزی دفتر کے علاوہ کراچی، لاہور، اور ڈھاکہ میں تین علاقائی دفتر، اور دونوں صوبوں کے متعدد شہروں میں ۲۵ ذیلی شاخیں ہیں۔ مرکزی کمیٹی میں سکریٹری جنرل کے علاوہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی تمام زبانوں کے ۲۵ نمائندے منتخب ہوتے ہیں جو گلڈ کے انتظامی امور کی نگرانی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

گلڈ کی مالیات گلڈ کے ممبران کے چندوں، حکومت کی امداد اور گلڈ کے اثاثوں پر مشتمل ہے۔ غیر ملکی امداد گلڈ کے دستور کے تحت قابل قبول نہیں۔ ستمبر ۶۵ء کی جنگ کے دوران گلڈ کی امداد میں کمی ہو گئی جس کے سبب کئی منصوبے تکمیل پذیر نہ ہو سکے۔ گلڈ کے آئندہ منصوبوں میں کراچی اور ڈھاکہ میں گلڈ ہاؤس اور رہائشی بستیوں کا قیام، اشاعتی پروگرام کی وسعت اور کئی فلاحی پروگرام شامل ہیں۔

گلڈ کی سرگرمیوں کا یہ نہایت مختصر سا خاکہ ہے جس سے یہ اندازہ تو نہیں لگایا جا سکتا کہ گلڈ کے مخلص کارکنوں نے چند در چند مشکلات کے باوجود گلڈ کے اعلیٰ مقاصد کے حصول میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے، لیکن اگر پوچھا جائے تو اس کا سہرا گلڈ کے تمام ممبران کے سر بھی ہے اور اس کے سابق اور موجودہ سکریٹری جنرل حضرات کے سر بھی — میری مراد قدرت اللہ شہاب اور جمیل الدین عالی سے ہے۔ ان حضرات نے ادیبوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے شبانہ روز جس خلوص، لگن، محنت اور دیانت سے کام کیا ہے اس کا اعتراف نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگی۔

خدا سے دعا ہے کہ گلڈ روز افزوں ترقی کرے۔ اور ادیبوں کے دیگر فلاحی منصوبے جلد از جلد تکمیل پذیر ہو سکیں، تاکہ وہ ذہنی آسودگی کے ساتھ اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکیں۔ اور معاشرے میں وہ مقام حاصل کر سکیں جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

فضا ابن فیضی

# پھول کے زخم

لے کے پہونچا یہ کہاں قافلۂ شوق مجھے
اجنبی لگتے ہیں پہچانے ہوئے دشت و دیار
وہی محفل ہے وہی شمع وہی لوگ، مگر
نہ وہ خوشبو کا تلاطم ہے نہ رنگوں کی پھوار
کیا ہوا حُسن کی دلکش وہ نگاہوں کا فروغ
نہ وہ دلداریٔ جاناں ہے نہ وہ لطف نہ پیار

بے نیازانہ گذر جاتی ہے گلشن سے نسیم
اس تغافل پہ ہے خود پھول کی خوشبو حیراں
جیسے ہے جُرم کوئی پرورشِ نافۂ مشک
اپنے تاتار میں بھی رہ کے ہے آہو حیراں
ہے کناروں پہ بھی رقصاں وہی طوفاں کا خروش
چھو کے ساحل کو ہے خود موجِ لبِ جو حیراں

پھول کا ذہن رسا، کلیوں کا وجدانِ سلیم
ایسا لگتا ہے کسی سوچ میں ڈوبا سا ہے
کیا کریں ایسے میں مشاطہ گرانِ معصوم
شانہ خود گیسوئے حالات میں اُلجھا سا ہے
کس کو آواز دوں سوئے ہوئے سناٹے میں
منزلیں خواب سی ہیں، راستہ کھویا سا ہے

لفظ پیتے ہوئے خود اپنے معانی کا لہو
مضمحل جنبشِ لب، ذوقِ تکلم زخمی
ہر دریچے پہ ہے شعلوں کی لرزتی چلمن
جلوے مجروح نظر، حُسنِ تبسم زخمی
انگلیاں خوں چکاں، شکستہ قلم کا مضراب،
نغمے مجروح، نوا سست، ترنم زخمی

عشق و مستی کے صنم، شعر و ادب کے پیکر
مجھ سے مت پوچھ کہ زخمی ہیں یہاں کتنے گلاب
یہ چٹختے ہوئے آئینۂ افکار و خیال
یہ سلگتے ہوئے کلک و قلم و لوح و کتاب

اپنی ہی تلخیٔ بے نام سے اُکتائی ہوئی لبِ نازک کی شکر، نرگسی آنکھوں کی شراب

حسن ہے یا کسی نوخیز کلی کی میّت لَب کے یاقوت اُداس آنکھ کے کاجل مغموم
آئینے پہلو میں ٹوٹے ہوئے نشتر کی اَنی چاندنی چہرے کی بجھتی ہوئی، آنچل مغموم
درد کے چھینٹوں سے افسردہ خط و خال کی آگ عنبریں زلفوں کے مہکے ہوئے بادل مغموم

نرم گیتوں کے گھنے کنج میں احساس کے پھول نشۂ ونور کی پلکوں پہ مچلتے آنسو
یہی سب کچھ تو نہیں، قیمتِ فردوسِ نشاط آہ میں ڈھلتی کسک، بہ حرف میں ڈھلتے آنسو
اتنے بیماروں میں اب ایک مسیحا بھی نہیں کون پونچھے گا خنک اوس کے جلتے آنسو

کس سے احوالِ جنوں پوچھوں کہ اس فصل میں کیوں داغہائے دلِ کہسار و چمن ہیں عریاں
اُف یہ رُسوائیٔ ملبوس و قبا کا عالم پردۂ زخم کے یا وصف بدن ہیں عریاں
کسی ناسور کے چہرے پہ نہیں کوئی نقاب وقت کے سارے خط و خال و شکن ہیں عریاں

سانس روکے ہوئے ہیں رنگ و نوا کے دلدار بزم در بزم نگارانِ غزل ہیں چُپ چاپ
فکر میں گم ہے پگھلتی ہوئی کہسار کی برف جھیل میں تیرتے شاداب کنول ہیں چُپ چاپ
ہوگئے خشک کسی شاہ جہاں کے آنسو پیار ہے سہما ہوا، تاج محل ہیں چُپ چاپ

ہم نوا ہے کوئی بلبل نہ پپیہا نہ چکور سوچتا ہوں تمہیں ایسے میں پکاروں کیسے
ہر قدم دشتِ تپاں، دجلۂ خوں، نجدِ جنوں بہتے پانی پہ کوئی نقش اُبھاروں کیسے
کتنی صدیوں سے ہے مجروح یقیں تگ و تاز ذہن میں چاند ستاروں کو اُتاروں کیسے
ابھی حالات کے آئینے ہیں دُھندلائے ہوئے فکر و احساس کے پیکر کو نکھاروں کیسے
کسی جلوے پہ بھی باقی نہیں نظروں کی گرفت
اپنی صبحوں کے مقدّر کو سنواروں کیسے

قمر ہاشمی

# چہرہ

قامت کی کشش ہے چال میں بھی
ٹھوکر میں ہے فاصلہ سفر کا
پامال ہیں فرش راہ آنکھیں
خود اپنی نظر جمال آرا

لہرا کے جو ہاتھ اُٹھ گیا ہے
بکھری ہوئی لٹ سنور گئی ہے
آیا ہوا خط جو پرس میں ہے
ممکن ہے خیال میں بسا ہو

معصوم تبسموں کی تابش
آئینۂ زینتِ دہن ہے
سانسوں میں گھُلی ہوئی ہے خوشبو
آواز میں سحر بانسری کا

آنکھوں میں ہے موہنی سی صورت
کاغذ پہ دمک رہا ہے چہرہ
دفتر کی تمام فائلوں میں
خوشبو ہے کسی کے پیرہن کی

احمد ظفر

# جنم جنم

زنگوں میں کچھ رنگ تھے ایسے
جن سے میں نے پھول چُنے تھے
پتھر نے انگڑائی لی تھی
آگ سے خوشبو سی برسی تھی
چاند ہوا کا جھونکا بن کر
کلی کلی کو چُوم رہا تھا

یہ سب کیا تھا
قبر کی مٹی
قبر کی مٹی جس کے نیچے
ناگ ہی ناگ چھپے بیٹھے تھے
بچھو، چیونٹے
میرے جسم کے پھول تھے شاید

میں نے اپنے انگ انگ سے پیار کیا تھا
موت نے مجھ پر وار کیا ہے
اب میں میز پہ جیسے گلداں
باسی پھولوں سے بھرپور ہو
رنگ اور نور سے کوسوں دور ہو

مظفر علی سید

# شہادت کی شکلیں

شہادت کی شکلیں بہت ہیں:

نظر کی شہادت،
کہ ہم نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے
کیسے سمجھ لیں، نہیں ہے؟

زباں کی شہادت،
کہ مُنہ سے جو نکلے گا، اُس کا نتیجہ
ہمیں ہی بھگتنا پڑے گا۔

قلم کی شہادت،
کہ تحریر کی روشنائی
ہزاروں برس تک چمکتی رہے گی۔

مگر ــــ
ساری شکلوں سے افضل
لہو کی شہادت،
کہ مضمر ہے جس میں:
نظر کی صداقت
زباں کی گواہی
قلم کی سیاہی

ادیب سہیل

# سکوتِ بیکراں

سر پہ جب تلوار تھی رقصاں
تو ہم
سینہ سپر تھے ہر قدم
ہر طرف اپنا جنوں بیدار تھا۔
فخرِ نظارہ تھا اپنا بانکپن
سخت تھی جس لمحے زنجیرِ ستم
آج جب حالات کی کروٹ سے ہے ـــــ
ماحول قدرے سازگار
آج ایسے میں نہ جانے ہم کہاں کھوئے گئے
فکر و عمل کو کیا ہوا؟
اپنا جنوں
خواب کا ایسا سمندر بن گیا
جس پہ پتھر پھینکئے پھر بھی نہ پیدا لہر کا ہو سلسلہ!

تابؔ اسلم

# نقشِ آب

زندگی خوابوں کا اک رنگیں کفن
دفن ہیں جس میں ہمارے روح و تن
زندگی خوابوں کا اک رنگیں کفن

چارسو اشکوں کے طوفانوں کا زور
چیختی، روتی ہوئی روحوں کا شور
آرزوؤں کے دیئے شعلہ بکف
خون میں تر دیدہ و دل کے صدف
کپکپاتے ہونٹ، ویراں انکھڑیاں
بجھتے چہرے نیم جان و بے زباں
رینگتے سایوں کا سیلِ بے کراں
درد، آنسو، اُلجھنیں، تنہائیاں
حسرتوں کے زخم، یادوں کی صلیب
پھانس جیسے اک رگِ جاں کے قریب

ہم کہ ہیں نقشِ سرِ آبِ رواں
ہم کہ ہیں بجھتی ہوئی شمعوں کی لَو
تیز آندھی جب چلی بجھ جائیں گے
ہم کہ ہیں بجھتی ہوئی شمعوں کی لَو

ناصر شہزاد

# گیت

دُھم کَٹ، دِھر کَٹ، دَھا تِگن، تِنٹ تا
من کے مدھوبَن میں ناچے متواری رادھا
دُھم کَٹ۔ دِھر کَٹ ....

لپک جھپک، جل برسائیں، گھنگھور گھٹائیں
کھیتوں میں مہکار لٹائیں، مَست ہوائیں
چندر مکھی کے پھول کھلاتا ساون آیا
دُھم کَٹ، دِھر کَٹ .....

چَھم چَھم چھنکیں بچھوے، رن جھن باجیں مجیرے
چمکیں نَین گوری کے جیسے نرمل ہیرے
کومل کنیاؤں نے مل کر منگل گایا
دُھم کَٹ، دِھر کَٹ .....

پنگھٹ کے رستوں پہ سجیں جسموں کی اُٹھانیں
مُرلیوں کے لہروں میں کھلیں ملہار کی تانیں
سُر ہے اَمر، سُر میں ہے چھپا بھگوان کا سایا
دُھم کَٹ، دِھر کَٹ......

انجم اعظمی

# سرسیّد کی انقلابی تحریک

اردو ادب میں دو بڑی تحریکیں ملتی ہیں جن کی بدولت اسے بڑے پیمانے پر فروغ حاصل ہوا — سرسید تحریک، اور بیسویں صدی کی ترقی پسند تحریک — ان دونوں کا احاطہ کئے بغیر ہمارے ادب کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی اور انہیں سمجھے بغیر آج کا کوئی ادیب پوری طرح باشعور نہیں کہلا سکتا۔

سرسید تحریک دراصل ادب کی تحریک نہیں تھی، بلکہ اس عہد کے مسلمانوں کی مکمل سماجی، سیاسی، تہذیبی، علمی اور روحانی زندگی پر محیط ہے۔ اس تحریک کے ابھرنے اور فروغ پانے کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ادب اور زندگی کے رشتے کو سمجھ کر ازسرِ نو استوار کیا گیا۔ میر و غالب کی شاعری میں عشق اور انسانی ادراک کی بلندی نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں دل کی وسعت ملتی ہے۔ سرسید کے عہد میں پہلی بار ہمارے ادب کے اندر معاشرہ کی وسعت نے جگہ بنانی شروع کی جہاں آدمی رہتا بستا ہے صرف قلندر نہیں ہوتا۔ گھر بناتا ہے، زندگی کی مشقت برداشت کرتا ہے۔ ملک و قوم کے ہزار مسائل سے دوچار ہوتا ہے اور ان جھگڑوں میں جینے کی آرزو کو بھی کہیں بچا کر رکھتا ہے۔ اس کے لئے شاعری کے دوش بدوش علمی نثر کے کشادہ میدان کی بھی ضرورت تھی جو ہمہ جہتی ہوتا ہے تاکہ بیک وقت خود بینی اور جہاں بینی کے راستے آدمی پر کھل جائیں۔ یہی شعور لے کر سرسید نے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا تھا۔

آج ہزاروں رسالے اردو زبان میں چھپتے ہیں۔ ان میں خراب اور اچھے ہر قسم کے رسائل ہیں۔ ہیں ان میں سے کسی کا مقابلہ "تہذیب الاخلاق" سے نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آج ہزاروں پرچوں میں سے ایک بھی اس معیار کا رسالہ نہیں ہے۔ بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ ان میں سے کسی کے پیچھے وہ ذہن اور شعور کارفرما نہیں ہے — جس کی بدولت "تہذیب الاخلاق" کا اجرا عمل میں آیا۔

"تہذیب الاخلاق" کی اشاعت کا منشا علم اور خصوصاً نئے علوم کو رواج دینا تھا۔ اور نئے علوم کے فروغ پلنے سے انسانی شعور کی ترویج کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں نئی راہیں کھولنا تھا جن پر چل کر آدمی ماضی پرستی کی گرد سے باہر نکل کر روشنی کے دائروں تک پہونچتا ہے۔ یہ وہ جہاں بینی تھی جو سرسید سے پہلے ہمارے معاشرے میں دم توڑ چکی تھی، اور جس کا سبب ہمارا سیاسی اور تہذیبی زوال تھا۔

یہ سیاسی اور تہذیبی زوال سرسید تحریک کے لئے پس منظر کا کام دیتا ہے۔ اس میں سے بعض کہانیاں ایسی بھی ہیں جو ہمیں روک کر پوچھتی ہیں۔ کیا یہ سچ مچ زوال کا عہد تھا؟ — آصف الدولہ کی سواری رُکتی ہے۔ مسجد کے صحن میں میر تقی میر بیٹھے ہیں، جو بادشاہ سے ناراض ہیں۔ آصف الدولہ سواری رکوا کر اُترتے ہیں۔ مسجد کے صحن میں پہونچ کر میر صاحب کو سلام عرض کرتے ہیں۔ میر صاحب جواب کے ساتھ ساتھ یہ جملہ بھی عنایت کر دیتے ہیں " بازار میں بات کرنا شریفوں کا شیوہ نہیں ہے " آصف الدولہ معذرت چاہتے ہوئے واپس جاتے ہیں۔ اس کہانی میں اس زوال پذیر معاشرے کے دو افراد سے آپ کی ملاقات ہوتی ہے۔ ایک شاعر ہے جو بادشاہ کو خاطر میں نہیں لاتا۔ دوسرا خود بادشاہ ہے، جو میر تقی میر کی سخت بات سُن کر چپ چاپ واپس چلا جاتا ہے۔ اور ہم سوچتے رہ جاتے ہیں کہ کیا ہمارے معاشرے میں اب ایسے لوگ کبھی پیدا نہیں ہوں گے جن میں میر کی سی خودداری اور آصف الدولہ جیسی وضعداری موجود ہو۔

میر تقی میر اور ہمارے عہد کا درمیانی فاصلہ دو سو سال کے لگ بھگ ہے۔ اس عرصے میں ہم نے غلامی کے سو سال کاٹے ہیں اور اپنی تہذیب کی رہی سہی بساط اٹھا کر مغرب کے دست نگر ہو چکے ہیں۔ ہمارے پاس نہ تہذیب کا سرمایہ ہے اور نہ اپنی صنعت ہے۔ مشرق میں جس سورج کے طلوع ہونے کی خبر شاعروں اور ادیبوں نے برسوں پہلے دی تھی، وہ ابھی دوسرے ملکوں میں چمک رہا ہے۔ اسی لئے ہمیں میر تقی میر کی کہانی بڑی غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہمارے عہد کا عالم اقتدار کے سامنے سر جھکاتا ہے، اور دولت کی حرص رکھتا ہے۔ شاعر خوشامد کر کے انعام حاصل کرتا ہے اور صاحب ثروت میں سے بیشتر بے کردار، بے مغز اور بے علم ہوتے ہیں۔

اور بھی کئی کہانیاں ہیں جو مغل تہذیب کی عظمت کی یاد دلاتی ہیں۔ دلّی کے لال قلعہ کے اندر شہزادیوں کے غسل کے لئے جو حمام تیار کیا گیا تھا اس میں پانی ہمیشہ گرم ملتا تھا۔ انگریزوں نے دلّی فتح کرنے کے بعد یہ جاننے کے لئے کہ پانی کے گرم رہنے کا راز کیا ہے؟ وہاں کی زمین کھُدوا دی۔ آخر کار انہیں ایک جگہ ایک چھوٹا سا چراغ جلتا ہوا ملا، جسے جگہ سے ہٹا لینے کے بعد دوبارہ انگریز اپنی ساری کوششوں کے باوجود حمام کا پانی گرم نہ رکھ سکے۔ اور مغل تہذیب کا چراغ ان کے ہاتھ میں آتے ہی بجھ گیا۔ یہ اس چراغ کی ایک تہذیب سے وفاداری تھی، لیکن اس کے گل ہو جانے کی داستان ایک تہذیب کے زوال کی بھی کہانی ہے۔

سن ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں مغل بادشاہ اور ہندوستان کے مسلمانوں کا اقتدار ہمیشہ کے لئے ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کا سبب صرف ہندوستانیوں کی آپس کی پھوٹ نہیں تھی، بلکہ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے فکری انقلاب کے بعد صنعتی انقلاب بھی برپا ہو چکا تھا، جس کی ہندوستانیوں کو خبر تک نہیں تھی۔ ہند کے لوگوں میں محبت اور وضعداری تھی علم کا بھی گھر گھر چرچا تھا، لیکن اب اس تہذیب میں نہ کوئی مفکر پیدا ہوتا تھا اور نہ سیاح۔ یہاں کسی طرح کی سیاسی بیداری کا بھی سوال نہیں اٹھتا تھا۔ جن کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور تھی وہ کردار کے اعتبار سے عوام سے پست تر تھے۔ زوال کی یہ تنہا نشانی ہی اس دور کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ تعلیم کا نصاب کئی سو سال سے نہ بدلا تھا اور نہ اس میں کوئی خاص اضافہ ہوا تھا۔ تخلیق کے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ لے دے کر ان سب پر آنسو بہانے والے یکے بعد دیگرے دو شاعر میر اور غالب پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اس عہد کے شرفاء کے سارے آنسو اور بچی کھچی اقدار جمع کر کے آنے والے دور کے حوالے کر دیا

سرسید نے "اسباب بغاوت ہند" میں انہیں آنسوؤں کا حساب چکایا تھا۔ غلامی کا عذاب کاٹنے اور شعور کی گرہوں کو کھولنے کے لئے انہوں نے ہمارے معاشرے کے پورے نصاب کو بدل دیا تھا۔

مسلمانوں کے دور حکومت میں علم و فن نے بے حد فروغ پایا تھا۔ اسپین سے ہندوستان کی انتہائی سرحدوں تک ہر جگہ اہل علم کا مجمع تھا۔ ان کا احترام بھی معاشرے کی ایک اہم روایت تھی۔ ہندوستان کا قدیم علم بھی یہاں کے مسلمانوں کے علم میں شامل ہو گیا تھا۔ اور دونوں نے مل کر اپنا مسکن بنایا تھا۔ مصوری، موسیقی، ادب و شعر، ریاضی، طب، فلسفہ، منطق، علم نجوم و ہیئت میں طاق افراد خاصی بڑی تعداد میں مل جاتے تھے، لیکن خلاقی، ترقی اور اُپج کے دور کے گذر جانے کے بعد ان علوم سے وابستہ ایک معاشرے کی وضعداریاں بچ گئی تھیں جو اندر سے کھوکھلی تھیں۔ زوال آہستہ آہستہ مکمل ہو چکا تھا۔ اس زوال کو ذہین افراد کی نگاہیں پہچان رہی تھیں۔ میر و سودا اس حقیقت سے آشنا تھے۔ غالب نے انگریز کی برتری نمایاں طور پر محسوس کر لی تھی۔ زوال کی یہ رو اب صرف اپنے منطقی نتیجے کی خواہاں تھی۔ اس سے انحراف ممکن نہ تھا۔ انگریز کی چالا کی اسی لئے اس کے کام آئی کہ ہمارے معاشرے کی قوت زائل ہو چکی تھی۔ البتہ روایات کا خزانہ کسی سرسید کا منتظر تھا جو انہیں کھنگال کر کسی نئی تہذیب کی بنیاد میں سمو دے۔

سنہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد مسلمان بطور خاص انگریزوں کی نگاہ میں مورد عتاب تھے۔ سرسید نے اس عتاب سے اپنی قوم کو بچایا۔ اسے بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتے پر مجبور کیا۔ یہ حقیقت پسند سرسید تھے۔ ان کی ذمہ داری بڑی بھاری تھی۔ جذبات سے کھیلنا اور جذبات کی رو میں بہنا ان کا کام نہ تھا۔ وہ اکبرالہ آبادی کی سمجھ میں آنے والی چیز نہیں تھے وہ ان علوم کو فروغ دینا چاہتے تھے جن سے مسلمان قوم کا دامن خالی اور حاکموں کی جھولی بھری تھی۔ ہندوؤں نے حالات سے پہلے ہی سمجھوتہ کر رکھا تھا، انہوں نے جس طرح مسلمانوں سے سیکھا تھا اب انگریزوں سے بہت کچھ سیکھ رہے تھے۔ اور مسلمانوں کے عالمی زوال نے یوروپ کو ترقی کی شاہراہ پر بہت آگے پہونچا دیا تھا۔ ان سے سیکھنا حکمت عملی تھی۔ صداقت کی تلاش پہلے مسلمان بستیوں کے داناؤں کا پیشہ تھا، اب یوروپ کے مفکرین نے اپنی حکمت سے باقی ماندہ دنیا کے علم کو دھندلا دیا تھا، ہندوستان میں انگریز حاکم بھی تھا اور یوروپ کے جدید علوم کا نمائندہ بھی۔ اسی لئے وہ ہندوستانیوں کا بدترین دشمن بھی تھا اور بہترین دوست بھی۔ سرسید وہ علم انگریزوں سے چھین لینا چاہتے تھے جس کے بل بوتے پر وہ اس ملک کا حکمراں بن گیا تھا۔

ماضی پرستوں میں سے بعض نے سرسید کی اس حکمت عملی کو سمجھ لیا تھا، لیکن اپنی پست ہمتی کو یہ کہہ کر چھپاتے رہے کہ سرسید مادہ پرست ہے، نیچری ہے، وہ روحانی سربلندی کا دشمن ہے اور مسلمانوں کو ہوس دنیا میں مبتلا کرنے آیا ہے۔ اس کے برخلاف سرسید کو نہ کفر کے فتوے کی پروا تھی اور نہ گالیوں کی۔ ان کو زوال کے روپ میں کفر و اسلام دونوں کی ایک ہی تصویر نظر آئی تھی۔ ان کے سامنے سارے الفاظ جھوٹے ثابت ہو چکے تھے۔ اور انہیں دن رات دھن تھی تو یہ کہ ان کی قوم خواب غفلت سے اُٹھے، اپنے ہوش و حواس درست کرے اور زندگی کی دوڑ میں پوری قوت سے شریک ہو جائے۔

سرسید کے دل کی اسی لگن نے تحریک کو جنم دیا، اور ان کے عہد کے سارے چراغوں کو جمع کر کے ان کے گرد ہالہ کھینچ دیا جو تاریخ کے اندر انیسویں صدی کے نصف آخری حصے میں سرسید کی بینا اور روشن شخصیت کی مرکزیت کی دلیل ہے۔

سرسید تحریک کے بنیادی عناصر کیا تھے۔ اس نے ہمیں کیا دیا۔ اپنی تاریخ سے آگاہی کے لئے ذہن ایسے سوالوں کا جواب طلب کرتا ہے۔ علمی نثر، تہذیب الاخلاق کا اجراء، مصنفین کا حلقہ، تعلیم سے سرسید کی گہری دلچسپی، مسلم کالج کا قیام، انگریزی زبان سے مسلمانوں کی بیزاری اور سرسید کا تعلیمی اور سماجی جہاد، شبلی، حالی، محسن الملک، نذیر احمد اور دوسرے اکابرین کی کاوشیں اور ان کے جواب، ان کے آپس کے زبردست اتحاد اور منفی اختلافات کے اندر ایک پورا عہد سمٹ جاتا ہے۔

یہ تحریک صرف مسلمانوں تک محدود نہیں تھی، اس کا اثر ہندوستان کی پوری آبادی پر پڑ رہا تھا، لیکن ہندو انگریزوں سے جتنی آسانی سے سمجھوتہ کر چکا تھا مسلمان اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ ریاست کے چھینے جانے کا غم اس کے دل میں بالکل ہی تازہ تھا۔ راجہ رام موہن رائے نے ہندوؤں میں ستی کی رسم بند کرائی تھی بیواؤں کی شادی کو رواج دیا تھا۔ لیکن سرسید کو بہت زیادہ مشکل حالات کا سامنا تھا — انہوں نے ان ذہنوں کو بدل دیا جو بدلنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں تھے۔ وہ تنگ نظر اور متعصب نہیں تھے — ہندوؤں کے برہمنی سماج میں چھوت چھات اور تنگ نظری نہ ہوتی تو عین ممکن تھا کہ آج ہند و پاک کی تاریخ کا رخ کچھ اور ہوتا۔ سرسید نے تو اپنے زمانے کا یہ سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا کہ ہندوستان کی آبادی کے ایک ایسے عضو کو مفلوج ہونے سے بچا لیا جس کے مفلوج ہونے کے امکانات سو فی صد اور صحت حاصل کرنے کی امید صفر کے برابر تھی۔ اسی رعایت سے سرسید تحریک کا نام اصلاحی تحریک پڑا۔ لیکن جب ہم اس پہلو پر غور کرتے ہیں کہ جس معاشرے میں صدیوں سے کوئی بڑی تبدیلی مفقود تھی، اسے سرسید ایک نئے موڑ سے گزار دیتے ہیں تو ان کے ذہن کی تیز روشنی میں ایک ایسی انقلابی تحریک کے نقوش ابھاگر ہوتے ہیں جس سے قوموں کی ماہیت بدل جاتی ہے۔

اس تحریک کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حالی کو سرسید کا دست راست کہا گیا ہے۔ شبلی نے ان پر "مدح مداحی" کا الزام لگایا لیکن سرسید نے جب اعلیٰ نوکریوں کے حصول پر بہت زیادہ زور دیا تو حالی نے بڑے واضح انداز میں مختلف فنون کی مہارت حاصل کرنے اور تجارت کی جانب مسلمانوں کی توجہ مبذول کرائی۔ یہ سرسید سے کھلا اختلاف تھا لیکن سرسید کی انقلابی تحریک میں ایسے ہزارہا اختلافات کی گنجائش تھی، کیونکہ وہ عمل کے اصل محرک یعنی نصب العین پر اتفاق چاہتے تھے۔

سرسید بے شمار کام مصلحت اور وقتی ضرورت کے ماتحت کرتے تھے۔ ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوئیں جن کے سبب ان کے رفقاء ان کی گہری محبت کے گھنے سائے میں بیٹھ کر ان سے اختلاف رائے رکھتے تھے۔ شبلی کو ان سے بعض بے حد شدید اختلافات تھے لیکن شبلی کا آدرش سرسید کے نصب العین کا ایک حصہ تھا۔ شبلی یونانیوں، اسپین کے مسلمانوں اور عباسیوں کے دور عروج کی مثال ایک ایسے عہد کی تمنا کرتے ہیں جو تمام تر علم کے چراغوں سے روشن ہو لیکن ان کا یہ خواب بھی سرسید کا خواب ہے۔ شبلی، حالی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، محسن الملک اور وقار الملک وغیرہ کی موجودگی میں سرسید نے کسی حد تک اپنے اس خواب کی درخشاں تعبیر بھی دیکھی تھی اور غور کریں تو علمی نثر کی داغ بیل ڈالنے اور ان سب لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کا مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ ان کی قوم ماضی کی مرثیہ خوانی کے بجائے اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتیں بروئے کار لا کر ایک ایسے مستقبل کی تشکیل کرے جو اس کا اپنا ہو۔

اسی لئے ہمیں اپنے معاشرے میں ترقی کے ہر موڑ پر سرسید کی بصیرت کا عکس نظر آیا ہے۔ اور جس منزل میں ہمارے قدم رک گئے ہیں وہاں سرسید کی انقلابی تحریک سے گہری آشنائی، زندگی کی جدید ترین تعبیرات کا روپ دھار کر دوبارہ ہمارے قدموں کی چاپ بننے والی ہے۔

آغا افتخار حسین

# اٹلی میں اردو

## تاریخی پس منظر

اٹلی میں اردو زبان کی تعلیم گذشتہ صدی عیسوی میں شروع ہو چکی تھی۔ صحیح تاریخ کا تعین تو نہیں کیا جا سکتا، لیکن نیپلز کے مشرقی تعلیم کے یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ (Instituto Universitario Orientale) میں گذشتہ صدی کے اواخر میں اردو کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ سنہ ۱۸۸۸ء تک یہ انسٹی ٹیوٹ صرف چین کے بارے میں تعلیمات کے لئے مختص تھا، لیکن اسی سال اس کے نصاب میں دیگر مشرقی ممالک کی تاریخ، تہذیب، زبان اور ادب کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ "ہندوستانی اردو" کی تعلیم کے لئے ایک پروفیسر کا عہدہ بھی قائم کیا گیا۔

اردو کی پروفیسری قائم ہونے کے چار سال بعد سنہ ۱۸۹۲ء میں اطالوی زبان میں اردو کی سب سے پہلی گرامر شائع ہوئی۔ اس گرامر کا نام ——— (Grammatica della lingua Indostana o Urdu) تھا یعنی ہندوستانی اردو زبان کی گرامر۔ اس کے مصنف کا نام کامیلو تگلیابو (Camillo Tagliabue) تھا۔ یہ گرامر نیپلز میں شائع ہوئی اس کتاب میں برصغیر ہند و پاکستان میں مسلمانوں کے ادب پر ایک مختصر مضمون بھی شامل تھا۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں روم کے "مشرقی انسٹی ٹیوٹ" (Institato per l' Oriente) کی طرف سے ایک ماہانہ مجلہ Oriente Moderno (مشرق جدید) شائع ہوا۔ اس مجلہ کا مقصد یہ تھا کہ اٹلی کے باشندوں کو دنیائے اسلام کے تازہ ترین واقعات سے باخبر رکھا جائے۔ اس مجلہ کے سیاسی و تہذیبی حصہ میں اقبال پر بھی مضامین شائع ہوئے۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں روم میں "مشرق وسطیٰ و بعید کا اطالوی ادارہ" "Instituto Italiano per il Medio ed Estremo Oriente"

قائم ہوا جس کا مخفف (ISMEO) ہے۔ اس ادارے نے جلد عالمگیر شہرت حاصل کر لی۔ اس ادارہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیا کے وسطی، جنوبی، اور مشرقی ممالک سے تہذیبی تعلقات قائم کئے جائیں۔ اس ادارہ کے قائم ہونے کے فوراً ہی بعد اردو زبان وتہذیب کی تعلیم روم، میلان، تیورن، اور وینس میں شروع ہو گئی۔

اردو زبان کی تعلیم جلد ہی مقبول ہو گئی اور گرامر وغیرہ پر کئی کتابیں شائع ہو گئیں۔ ان میں حسب ذیل مصنفین کی گرامر کی کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

P. Santarelli (Rome – 1954.)
A. E. Leva (Rome – 1958.)
O. Bartolini (Milan – 1959.)

سنہ ۱۹۴۱ء میں پروفیسر ورجینیا واکا (Vergìnia Vacca) کی مشہور کتاب "مسلم ہندوستان" "L' India Musulmana" شائع ہوئی۔ اس خاتون کی کتاب کا مطالعہ مشرقی تاریخ کے طلبہ کے لئے ناگزیر ہے۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں اقبال اٹلی گئے۔ صقلیہ پران کی طویل نظم مشہور ہے۔ مسولینی پر بھی چند شعر ہیں۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں اقبال کے جاوید نامہ کا ترجمہ پروفیسر باوسانی نے کیا۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں روم سے پروفیسر باوسانی، پارےجا، اور ہرٹلنگ نے ایک کتاب مرتب کرکے شائع کی جس میں اردو ادب کی مختصر تاریخ اور چند نظموں کے تراجم شامل تھے۔

سنہ ۱۹۵۵ء میں پروفیسر باوسانی کے دو مضامین شائع ہوئے۔ پہلا مضمون "اقبال کی فلسفیانہ شاعری میں ابلیس"۔ اور دوسرا "انجمن ترقی اردو کراچی کی تاریخ اور کارگزاری" کے موضوع پر۔

پروفیسر باوسانی نے اقبال کی نظموں پر مبنی ایک بیاض (Anthology) بھی مرتب کی جس میں پیام مشرق، بانگ درا، زبور عجم، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز سے استفادہ کیا گیا ہے۔

سنہ ۱۹۵۸ء میں پروفیسر باوسانی کی کتاب 'Storia delle Litterature del Pakistan' (پاکستان کے ادب کی تاریخ) میلان سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب اردو ادب کی تاریخوں میں بہت معتبر سمجھی جاتی ہے۔

اسی سال غالب پر پروفیسر باوسانی کا مضمون جرمن میگزین 'Der Islam' کے شمارہ ۳۴ میں شائع ہوا۔ اٹھائیس صفحے کا یہ مضمون تحقیق وتنقید کا شہ پارہ ہے۔ پروفیسر باوسانی نے اس مضمون میں برصغیر کی ادبی تاریخ میں غالب کا مقام متعین کرنے میں دانشوری کا حق ادا کر دیا ہے۔ میں اس مضمون میں سے چند اقتباسات اپنے

---

A. Bausani. ۵۱
F. M. Pareja. ۵۲
L. Hertlinge. ۵۳

مضمون "یورپ میں غالب کا مطالعہ" میں شامل کر چکا ہوں جو افکار کے "غالب نمبر" میں گذشتہ سال شائع ہوا تھا۔
سنہ ۱۹۵۹ - سنہ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر ویتو سالیرنو ( Vito Salierno ) نے میلان میں پاکستان کی تاریخ پر دو لیکچر دیئے۔ یہ لیکچرز بعد میں فلورنس سے شائع ہوئے۔ ڈاکٹر سالیرنو عرصے تک پاکستان میں اٹلی کے کلچرل اتاشے رہے۔ آج کل میلان میں ہیں۔ انہوں نے سنہ ۱۹۶۳ء میں منتخب اردو نظموں کا اطالوی زبان میں ترجمہ شائع کیا۔ اس مجموعے میں غزلیں، نظمیں، مثنویاں، مرثیے، قصیدے، رباعیاں، ہجویات، سب ہی کچھ شامل ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر سالیرنو نے احمد علی کی کہانی "موت سے پہلے" اور سعادت حسن منٹو کی کہانی "نیا قانون" کا بھی ترجمہ کیا ہے

## مشرق وسطیٰ و بعید کا اطالوی ادارہ

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے یہ ادارہ سنہ ۱۹۳۳ء میں قائم ہوا۔ اس کے پہلے صدر مشہور اطالوی فلسفی گیووانی ژنتیل (Giovanni Gentile) تھے۔ سنہ ۱۹۴۸ء سے مشہور مستشرق اور ماہر آثار قدیمہ پروفیسر توچی (Giuseppe Tucci) انہی کے صدر ہیں۔ اس کا میدان عمل بہت وسیع ہے۔ اس کی سرگرمیوں میں تہذیبی تبادلے، سائنسی مشن، اشاعتی پروگرام، آثار قدیمہ کے اکتشاف، مشرقی زبانوں اور تہذیبوں کے نصاب تعلیم، ایشیائی ممالک کے لئے خصوصی براڈ کاسٹ، ایشیائی فنون لطیفہ کی نمائشیں، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں اطالوی تہذیب کے مراکز کا قیام، اطالوی ایشیائی انجمنوں کی امداد وغیرہ شامل ہیں۔ پاکستان میں سوات کے علاقے میں گندھارا آرٹ سے متعلق آثار قدیمہ کی دریافتیں زیادہ تر اسی ادارے کے بھیجے ہوئے ماہرین کی مساعی کا نتیجہ ہیں۔

اس ادارہ میں جن زبانوں کی تعلیم ہوتی ہے ان میں اردو، فارسی، بنگالی، چینی، جاپانی، انڈونیشی اور ہندی شامل ہیں۔ عموماً ہر زبان کا کورس تین سال کا ہوتا ہے لیکن بعض زبانوں میں دو سال کے مزید اعلیٰ نصاب کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ زبانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ متعلقہ ملک کی تاریخ، ادب، مذہب، فن، معاشرت وغیرہ کے بارے میں بھی معلومات بہم پہونچائی جاتی ہیں۔ آج کل ضیاء الصمد صاحب اس ادارہ میں اردو پڑھاتے ہیں۔

اس ادارے کی شاخیں میلان اور تیورن میں ہیں۔ ادارہ کی حیثیت نیم سرکاری ہے لیکن بموجب حکم نامہ نشان ۱۰۷۷ مجریہ ۲ جولائی سنہ ۱۹۴۷ء اس کے نصاب کو مقابلے کے امتحانوں کے لئے تسلیم کیا جاتا ہے۔ روم یونیورسٹی میں ہندی زبان کی تعلیم کے لئے پروفیسر کا عہدہ قائم کر دیا گیا ہے۔ لیکن یونیورسٹی کے نصاب میں اردو زبان شامل نہیں

روم اور نیپلز کے علاوہ میلان اور تورن میں بھی اردو زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ میلان میں اردو کی تعلیم کا انتظام روم کے مشرق وسطیٰ و بعید کے ادارے ہی کی سرپرستی میں کیا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں اردو زبان و ادب کی پروفیسری قائم ہوئی۔ لیکن آٹھ سال بعد سنہ ۱۹۶۴ء میں اسے ختم کر دیا گیا۔ کوئی تیس طالب علموں نے داخلہ لیا تھا، لیکن صرف ایک طالب علم تین سال کا کورس مکمل کر سکا۔ اس عرصے میں اوسوالدو بارتولینی (Osvaldo Bartolini) اور مسز کینیز جعفری نے اردو کی تعلیم دی تھی —— نقوی صاحب بھی چند ماہ اردو پڑھاتے رہے۔

حال ہی میں میلان میں بھی اردو کی تعلیم کا سلسلہ ختم کرنا پڑا۔

آخر اردو سے دلچسپی میں کمی کی کیا وجہ ہے؟ — اس کی وجہ تو میں کسی قدر تفصیل سے کسی اور مناسب موقع پر لکھوں گا۔ یہاں میں اپنے ایک اطالوی دوست کے ایک خط کا اقتباس نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

"ناکامی کی وجہ پاکستان کے بارے میں نشر و اشاعت کی کمی ہے۔ بیشتر طالب علم ہندی پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں[1]۔ اس زبان میں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور تعلیم کا انتظام ہر جگہ نہایت تسلی بخش ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان نشر و اشاعت کی طرف زیادہ توجہ دے رہا ہے ....... اب ہندی پڑھنے کا شوق بڑھ رہا ہے۔ اٹلی کے چند دانشوروں نے اقبال کا نام سنا ہے لیکن اس کی تحریروں سے ناواقف ہیں۔ دوسرے ادیبوں کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ اس کے مقابلے میں ٹیگور، گاندھی، نہرو، رادھا کرشنن، پریم چند، ویویکا نند اور ہندوستان کی تاریخ، تہذیب، فلسفہ وغیرہ کے بارے میں متعدد کتابیں شائع کی جا رہی ہیں، جن میں پاکٹ ایڈیشن بھی شامل ہیں۔ ہندوستان کے بارے میں تقاریر اور دستاویزی فلموں کا انتظام کیا جاتا ہے جس سے اس ملک کے بارے میں نشر و اشاعت میں اضافہ ہوتا ہے۔"

میرے اطالوی دوست نے جو کچھ لکھا ہے وہ میں نے خود اٹلی کے دوران قیام میں دیکھا ہے۔ اور میرے بھی یہی تاثرات تھے۔ لیکن میں سوچتا تھا کہ پاکستانی ہونے کی حیثیت سے شاید میرا جائزہ جانبدارانہ ہوگا۔ لیکن مذکورہ بالا رائے اس غیر ملکی کی ہے جسے پاکستان اور ہندوستان کے بارے میں جانبدار ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

---

[1] اس ضمن میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے یورپ میں برصغیر کی زبان "ہندوستانی" یا "اردو" ہی تسلیم کی جاتی تھی۔ ہندی کو کوئی نہیں جانتا تھا۔

مس گیتی آرا

# مکتوب نگاری کی روایت

یہ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ خطوط نگاری کا راز انسان کے ذہن میں کب سے پوشیدہ تھا، البتہ اس نے عمل کی صورت بہت دیر میں اختیار کی۔ ابتدا میں خطوط صرف ضروریات کے اظہار یا زیادہ سے زیادہ واقعات کا اظہار ہوتے تھے۔ لکھنے والے اگر اس میں زیادہ جدت پیدا کرتے تو ان میں اپنی قابلیت کے اظہار کی کوشش کرتے تھے۔ پڑھنے والے اس میں کوئی دلچسپی محسوس نہ کرتے تھے۔ کیونکہ وہ خطوط کاروباری غرض سے تحریر کئے جاتے تھے۔

مذہب اور حکومت نے انسانی تہذیب اور تمدن کی تعمیر میں ہمیشہ سنگ بنیاد کا کام دیا ہے۔ خطوط نویسی کے قائم کردہ گلستان کے پودوں کا وجود ان دونوں کا رہینِ منت ہے۔ تحقیق کی رو سے یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ خط لکھنے کی ابتدا حکومت اور مذہب کے علم برداروں ہی کے ذریعے وجود میں آئی۔ ہو سکتا ہے کہ انفرادی طور پر لوگوں نے اس سے پہلے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کر دیا ہو۔ پھر بھی خطوط کے جو مجموعے دستیاب ہوئے وہی ہیں جو ان دونوں کی وجہ سے لکھے گئے تھے۔ ان خطوط میں یا تو وہ خطوط ہیں جو بادشاہ و وزیر اپنے دور دراز رہنے والے نائبین کو لکھتے تھے جن میں حکم و احکام کے علاوہ کچھ اور نہیں ملتا۔ یا پھر وہ مقدس خط ہیں جو مذہبی پیشواؤں نے اپنے عقیدت مندوں اور ارادت پسندوں کو تحریر کئے تھے۔ ان خطوط میں مذہبی نکات اور روحانی باریک بیان ہیں۔ ان مجموعہ ہائے خطوط میں سے بعض آج بھی خاص مقبولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔

زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ خطوط نویسی کا فن بھی ترقی کرتا گیا اور لوگوں کو خطوط جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ خانگی خطوط بھی جمع ہونے شروع ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کی اکثر ترقی یافتہ زبانوں میں خطوط و رسائل کے ایسے مجموعے موجود ہیں جن سے نہ صرف مصنف کی انشاپردازی کی اعلیٰ قابلیت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ اس کے اخلاق اور ماحول پر بھی بہت حد تک روشنی پڑتی ہے۔ لاطینی زبان میں ہوریس اور سیسرو، انگریزی زبان میں ملٹن، بیکن، گولڈ اسمتھ، بائرن، لارڈ چسٹر فیلڈ اور ملکہ وکٹوریہ۔ فرانسیسی میں والٹیر اور ڈیڈرو وغیرہ کے خطوط نثر کے بہترین نمونے خیال کئے جاتے ہیں۔ ہر زبان کی خطوط نویسی کی اپنی علیحدہ ایک تاریخ ہے جو الگ الگ رنگ میں اپنے اندر دلچسپی لئے ہوئے ہے۔ یہاں غرض صرف اردو خطوط نویسی سے ہے، لیکن چونکہ اس کا رشتہ فارسی اور اس کی وساطت سے عربی تک پہونچتا ہے۔ اس لئے اردو خطوط نویسی کی

ابتدائی کڑیوں کا ذکر کرنا اہم بات ہے۔ اس صورت سے ان دونوں زبانوں میں خطوط کی حالت واضح ہونے کے علاوہ ان کے اردو خط نویسی پر اثرات بھی واضح اور نمایاں ہو جاتے ہیں۔

فن خطوط نویسی نے مسلمانوں کے عہد میں خوب ترقی کی۔ خطوط کی نگہداشت کا کام زمانۂ نبوت ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ دوسرے ممالک کو دعوتِ اسلام کے جو خطوط بھیجے جاتے انہیں انشا پرداز صحابہ تحریر کرتے اور وہی ان کی حفاظت کا کام بھی انجام دیتے۔ خلفائے راشدین میں سے حضرت عمرؓ نے بڑھتی ہوئی ضرورت کا احساس کر کے ایک مستقل محکمۂ انشا کی بنیاد ڈالی۔ خلافت بنو امیہ اور خلافت بنو عباسیہ دونوں نے اس محکمے اور ساتھ ساتھ فن خط نویسی کو وہ ترقی دی جو اس سے پہلے اس صنف کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ حکومت کی طرف سے خط لکھنا ایک مستقل اور اہم فن بن گیا جسے سیکھنے کے لئے لوگوں کو برسوں ریاضت کرنی پڑی۔ اس فن کے سیکھنے اور سکھانے میں تن آسانی کے لئے بڑے بڑے انشا پردازوں کے خطوں کے مجموعے شائع ہوئے۔ خط لکھنے کے فن پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ خط کو علمی ادب میں جگہ ملنے لگی۔ ان کی تعریف کی جانے لگی اور قسمیں مقرر ہوئیں اور ہر قسم کا خاص اسلوب متعین کیا گیا۔ اس کے علاوہ صابی صاحب، ہمادسے لے کر ابن عبد الکریم تک بیسیوں انشا پردازوں کے خطوط اور مراسلے اس حقیقت کی شہادت کے لئے آج بھی موجود ہیں اور انہیں عربی ادب کا بیش بہا ذخیرہ خیال کیا جاتا ہے۔

ہلاکو کے ہاتھوں جب بغداد کی عظمت اور اس کے ساتھ عباسیوں کی حکومت کا چراغ گل ہوا تو اسلامی ایشیا میں مغلوں کا دور دورہ ہوا۔ ان کے زمانے میں عربی کے بجائے فارسی دفتری زبان قرار پائی، اور اس صورت میں عربی خطوط نویسی کی وہ تمام خدمات جو حکومت انجام دے رہی تھی وہ فارسی کا حصہ بن گئی۔ فارسی خطوط ایران سے زیادہ ہندوستان میں پروان چڑھے اور مکاتیب کے جو مجموعے فارسی ادب کی جان ہیں انہیں ایران کے بجائے ہندوستان کی زمین نے پرورش کیا ہے۔ ان مجموعہ ہائے خطوط میں حکومت کے رقعات کے علاوہ صوفیوں، عالموں اور دوسرے اشخاص کے نجی خطوط بھی شامل ہیں۔ ان خطوط کا رنگ حکومت کے رقعات کے رنگ میں ہے۔ کیونکہ حکومت کے رقعات ہی مکتبوں میں پڑھائے جاتے تھے اور لوگ انہی کی روشنی میں اپنے نجی خط لکھتے تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ فارسی زبان مدت تک تہذیب اور ثقافت کی مالک رہی ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ صدی سے پہلے تک تعلیم یافتہ ہندو مسلمان گھروں میں خط و کتابت عام طور پر فارسی ہی میں ہوتی تھی جس کا ثبوت اب بھی بعض جگہ شادی بیاہ کے رقعوں کی شکل میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی خطوط اور رقعات کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اردو خطوط میں ابتدا میں فارسی خطوں کے ان مجموعوں کی پیروی کی گئی تھی۔ اسی لئے اردو خط نگاری کو دیکھنے کے لئے عربی اور فارسی کے خطوط کا رنگ اور اسے اختیار کرنے کی وجہ کا جاننا اہمیت رکھتا ہے۔

تہذیب کے نئے دور میں مکاتیب و مراسلت کو اس درجہ اہمیت دی گئی کہ قدیم زمانے میں ادب و انشا کی تکمیل کی بنیاد ہی اچھی خطوط نویسی قرار پائی۔ جو شخص اس زبان و بیان سے کامل شناسائی رکھتا تھا اس کو اسلامی ادوار میں اکتسابات و فضائل کے لحاظ سے شائستہ ترین انسان سمجھا جاتا تھا۔ نیز اسے سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے قابل سمجھا جاتا تھا۔

چونکہ عربی و فارسی خطوط نے حکومت کی آغوش میں پرورش پائی تھی، اس لئے ان کی نشو و نما پر حکومت کی زبان و ادب کا کافی اثر ہوا۔ حکومت کی طرف سے لکھے جانے والے خطوں میں بہت سی باتوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ شاہی کاتبوں اور منشیوں کے لئے سب سے پہلی اور ضروری بات یہ تھی۔

(۱) خط میں شروع سے لے کر آخر تک رکھ رکھاؤ اور مراتب کا خیال ضرور قائم رہے۔ کوئی لفظ حکومت کی شان کے خلاف نہ ہو، اور خط کے ذریعے حکومت کی کوئی معمولی کمزوری بھی ظاہر نہ ہو۔ خط میں کسی ایسی بات کا ذکر بھی نہیں ہونا چاہئے جس سے خط پڑھنے والے پر حکومت کی نظر میں اس کی اپنی وقعت اور اہمیت واضح ہو جائے۔ یعنی اس کی عدم موجودگی میں حکومت کا کام درہم برہم ہو جانے کا امکان ہو۔ غرض کہ ان باتوں کی وجہ سے خطوط نویسی میں قدرے تکلف کا رنگ آ گیا اور وہ سادگی قائم نہ رہی جو خطوں کا حسن خیال کی جاتی ہے۔

(۲) دوسری وجہ جس کا مکاتیب کے طرز نگارش اور اسلوب پر اثر پڑا' یہ تھی کہ خط و کتابت کی بنیاد محض صورت پر قائم تھی اور خط کا اصل مضمون اکثر مختصر ہوتا تھا۔ خطوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے شاہی انشا پرداز داد قابلیت دینے لگے۔ اس طرح مکاتیب نگاری ادبی جوہر دکھانے کی جولانگاہ بن گئی، اور خطوں میں وہ تمام باتیں پیدا ہو گئیں جو اس زمانے کے ادب کی جان تھیں۔ مضمون کی قلت کے باوجود اگر جدت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو مقفیٰ و مسجع عبارتوں، استعاروں اور تشبیہوں کی بھرمار کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے خطوط کے مجموعے اس لحاظ سے کہ ان میں ذرا ذرا سے مضمون میں خوبصورتی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ الفاظ سمونے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے' دنیائے ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔

(۳) القاب و آداب پر حکومت کی سرپرستی کا گہرا اثر پڑا، جن لوگوں کو بادشاہِ وقت کی طرف سے خط لکھے جاتے تھے ان میں مختلف مراتب اور حیثیات کے اشخاص تھے جن سے شاہی تعلق کا اظہار فن خط نویسی کا بڑا نازک مسئلہ تھا۔ القاب و آداب سے کافی حد تک طرفین کے تعلق کا اظہار ہوتا ہے، اس لئے القاب لکھتے وقت بہت احتیاط سے کام لینا پڑتا۔ بعض اوقات بعض کو محض اس لیے بڑھا چڑھا کر القاب لکھے جاتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو بادشاہوں کے قرابت داروں میں سے سمجھ کر اطاعت کا دم بھرنے لگے۔ غرض کہ شاہی خطوں میں القاب و آداب کو بہت اہمیت دی گئی، اور یہ القاب و آداب طول طویل لکھے جانے لگے۔

نجی خطوط میں بھی ہر رشتہ دار و عزیز اور ہر ملنے جلنے والے کے لئے ان کے مدارج کے مطابق الگ الگ القاب مقرر ہو گئے، اور ان میں جدت پیدا کرتے رہنا اچھے انشا پردازوں کی خصوصیت بن گیا۔ رقعات ابوالفضل، رقعات عالمگیر انشائے خلیفہ، انشائے مادھو رام، فائق، نیبر اور بہارِ عجم وغیرہ فارسی کے وہ مجموعے ہیں جنہوں نے ہندوستان میں مکمل شکل اختیار کی اور یہیں تیار کئے گئے۔ یہ مجموعے مندرجۂ بالا تمام باتوں کے حامل ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر اور چندر بھان برہمن کا تذکرہ اس سلسلے میں اہمیت رکھتا ہے جس کا تعلق ہندوستان کی خط نگاری سے ہے۔ ان دونوں مکتوب نگاروں کی خط نگاری کا طرۂ امتیاز ان کی سادگی، سلاست اور مدعا نگاری ہے۔ نیز ان میں مکتوب نگار کی منفرد شخصیت بھی منعکس ہے۔ خصوصاً اورنگ زیب کے خطوط ادب میں بدیں وجہ خاص مقام رکھتے ہیں کہ ان میں مدعا نویسی کے باوجود ادبی شان اور بلاغت کا کمال پایا جاتا ہے۔ برہمن کے خطوں میں تکلف اور رنگینی کے رواج عام کے باوجود سادگی اور مدعا نگاری کو مقدم سمجھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی انشا میں معصوم، نرم و ملائم تہذیب یافتہ لہجے کی چاشنی ہے۔ خط کے فن میں اس کو خاص مہارت معلوم ہوتی ہے۔

ان مجموعوں کو کچھ عرصہ تک ہندوستان میں درسی کتابوں کی حیثیت دی گئی۔ اور جب تک تعلیم یافتہ گھروں میں یہ خط و کتابت فارسی میں ہوتی رہی، اس میں ان کا رنگ کافی نمایاں رہا، اور اردو خطوط کے وجود میں آنے کے بعد ان خطوط

نے اپنے اثر سے انہیں بھی متاثر کیا، اور اپنے گہرے نقوش ان پر چھوڑے۔

یوں تو مغلوں کے دور میں بھی اردو خطوط نویسی کے نشانات نظر آتے ہیں لیکن جب انیسویں صدی کے وسط میں فارسی کی دفتری و کاروباری حیثیت زوال پذیر ہوئی اور اردو نے اس کی جگہ لے لی تو اردو میں مراسلت کا رواج بڑھنے لگا۔ گارسن دتاسی اپنی "تاریخ ادبِ ہندی" میں راجہ رام موہن رائے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اس نے اکثر خطوط اردو اور انگریزی میں ہمارے پاس بھیجے تھے :

*Histoire de la literature hindovi*

*garcin de tassy* P. 414.

(طبقاتِ شعرائے ہند۔ کریم الدین وفیلن صفحہ ۲۹۸)

لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اردو خط نگاری کا اولین دور فارسی انداز سے متاثر تھا۔ وہی القاب وآداب، وہی سرنامے، وہی عنوان، وہی افتتاحیئے، وہی رنگ وانشاء، وہی تکلف، وہی رنگینی، مگر انیسویں صدی کے شروع میں سادگی کی طرف کچھ کچھ میلان پیدا ہوا۔ جیسا کہ "انشائے بے خبر" سے واضح ہوتا ہے۔ اس کے تمام اصول وقواعد جو فارسی میں خطوط نویسی کے لئے رائج تھے، وہی اردو خطوط نگاری میں منتقل ہوئے۔ جنہیں غالب نے اردو خط وکتابت سے قریباً تیس سال پہلے سنہ ۱۸۲۵ء کے قریب قریب کسی کی فرمائش پر قلم بند کئے تھے۔

چنانچہ مجملاً اگر دیکھا جائے تو خطوط کے مختلف ارتقائی ادوار میں عجیب عجیب تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتداً خط نگاری میں سادگی، ایجاز واختصار، مدعا نگاری، خلوص اور مناسبت ........ وموزونیت کے اوصاف کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ لیکن تہذیب میں تکلف کا رنگ جس قدر بڑھتا گیا، اسی قدر خطوں میں بھی تکلف رنگینی اور تصنع اور دفتریت کے انداز نمایاں ہوتے گئے، جن کا خاتمہ اس اسلوب پر ہوا جسے غالب نے "محمد شاہی روشوں" کا نام دیا ہے۔ یعنی اگر دیکھا جائے تو خط بجی، شخصی وکاروباری چیز رہنے کی بجائے رنگین نثر کی ایک شاخ ہو کر رہ گئی تھی،

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ انیسویں صدی کے ربع اول میں سادگی کی طرف کچھ کچھ میلان پیدا ہوا تو اس نئی طرز کی ایجاد کا سہرا صحیح معنوں میں غالب کے سر ہے۔ سنہ ۱۸۴۸ء کے قریب قریب انہوں نے نئے انداز میں خط لکھ کر اردو میں نہ صرف مکتوب نگاری کی طرز نو ڈالی بلکہ خود اردو نثر کو بھی ایک نئے طرز نگارش سے آشنا کیا۔

غالب کے خطوط اردو خط نگاری کی تاریخ میں منفرد امتیازات کے حامل ہیں۔ انہوں نے سابق روش سے ہٹ کر اپنے خطوط کو نئے رنگ سے آشنا کیا۔ اس کے علاوہ ان خطوط میں مرزا کا رنگ طبیعت بلکہ نجی زندگی کے انعکاسات بھی منعکس ہو رہے ہیں جو اس سے پیشتر قریباً قریباً نظر ہی نہیں آتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی، القاب وآداب، اور اسلوب وغیرہ کے سلسلے میں جدت طرازی کی اور آخو کار فارسی خط وکتابت کے اصول اردو خط نگاری میں بھی رائج ہوئے جن کو مدنظر رکھ کر خط نگاری کی صنف آگے بڑھی۔ یہ اصول مرزا غالب نے ہی متعارف کرائے جو کہ انیسویں صدی کے ربع اول میں کسی کی فرمائش پر قلم بند کئے گئے تھے۔ اگرچہ یہ باتیں فارسی خط وکتابت سے متعلق ہیں، لیکن کسی دوسری زبان کے خطوں میں دلکش اور دل پسند اسلوب بیان پیدا کرنے کے لئے بھی یہ کافی حد تک مفید اور معاون ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ غالب کی ان باتوں

سے آٹھ نکتے نکلتے ہیں :

(۱) خط کے شروع میں مکتوب الیہ کو اس کے موافقِ حال کسی لفظ سے پکارا جائے۔

(۲) اس کے بعد زبانِ قلم پر ایک دم حرفِ مطلب آجانا چاہیئے۔ القاب و آداب، خیریت گوئی اور خیر و عافیت طلبی قطعاً زائد و بے کار ہے۔

(۳) خط لکھنے والے کو اس بات کی کوشش کرنا چاہیئے کہ تصویر میں تقریر کا رنگ پیدا کیا جائے، مطلب کو اس انداز سے ادا کرے کہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

(۴) اگر کئی باتیں کہنا ہوں تو انہیں نہایت ہوشیاری سے ترتیب دے۔

(۵) ایسا نہ ہو کہ الفاظ پیچیدہ ہو جائیں اور مطلب کے اجزا ایک دوسرے سے مل جائیں۔

(۶) مشکل اور دقیق استعاروں اور غیر مانوس الفاظ سے جو زمانہ کے مذاق کے موافق نہ ہوں، ہمیشہ اجتناب کرے۔

(۷) تمام خط میں کسی جگہ مکتوب الیہ کے مرتبہ و منزلت کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دے۔

(۸) ایک لفظ کی تکرار سے بچے۔ زبان کی خوبی کو ہاتھ سے نہ جانے دے اور بے فائدہ طوالت سے اجتناب کرے۔

غالب کا اپنا نقطۂ نظر بھی یہی تھا کہ خط میں کوئی ایسا اسلوب نہ ہونا چاہیئے جسے ہم گفتگو میں استعمال نہیں کرتے۔

اردو خطوط نگاری کی تاریخ میں آئندہ آنے والے مکتوب نگاروں نے بھی ان اصولوں کی روشنی میں اپنے خطوط کو ڈھالنے کی کوشش کی، اور ان اصولوں کو اردو خطوط نگاری کا معیار بھی سمجھا گیا۔ اور غالب کے خطوط آئندہ آنے والے مکتوب نگاروں کے لئے مشعلِ راہ بنے اور اردو ادب کا مایۂ ناز سرمایہ تسلیم کئے گئے۔ خطوط نگاری کی اس روز افزوں ترقی کو دیکھتے ہوئے شمس الرحمٰن کہتے ہیں :

> "یہ نیا ادبی سورج اگرچہ ابھی اپنی کرنوں میں بن سنور رہا ہے۔ لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ طلوع ہو کر اردو ادب کے قدر دانوں کو کتنے ایسے گنجہائے گراں مایہ سے روشناس کرے گا جن کے بغیر نہ ادب کو صحیح طور پہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس کے حسن و قبح کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا ممکن ہے۔"

(اردو خطوط۔ مرتبہ شمس الرحمٰن۔ جامعہ۔ کتابی دنیا)

خط نگاری کی مندرجۂ بالا ادبی حیثیت و اہمیت ہی کے پیشِ نظر موجودہ زمانے میں تمام ترقی یافتہ قومیں مجموعہ ہائے خطوط کے جمع کرنے پر زیادہ سے زیادہ توجہ اور وقت صرف کر رہی ہیں جو انفرادی طور پہ ہر قوم کا مایۂ ناز سرمایہ شمار کئے جاتے ہیں، چنانچہ اس صورتِ حال کی روشنی میں شمس الرحمٰن صاحب کا مندرجۂ بالا اقتباس کسی تشریح کا محتاج نہیں بلکہ خطوط نگاری کے درخشاں مستقبل کی پیشین گوئی ہے۔ جس میں شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو بھی ترقی ہوتی رہے گی اس کا منبع بالآخر غالب کے خطوط ہی ہوں گے جس سے کوئی صاحبِ ذوق و ادب انکار نہ کرے گا۔

---

## روش صدیقی

نکہتِ زلف کو ہم رشتۂ جاں کہتا ہوں
ہوش آتا ہے تو خوابِ گزراں کہتا ہوں

درد کو دولتِ صاحب نظراں کہتا ہوں
غم کو سرمایۂ عیشِ نفساں کہتا ہوں

کوئی سمجھے کہ نہ سمجھے مگر اے شیخِ حرم
میں تجھے شعلۂ رخسارِ بتاں کہتا ہوں

قطرہ دریا ہے تو کیوں شورشِ دریا طلبی
ہر تمنا کو محبت کا زیاں کہتا ہوں

ہے وہ آوازِ شکستِ دلِ گیتی جس کو
جرسِ قافلۂ عمرِ رواں کہتا ہوں

تہمتِ سبزۂ بیگانہ ہے سنگِ بیداد
میں تو کانٹوں کو بھی پھولوں کی زباں کہتا ہوں

کون سمجھے گا مرے حسنِ یقیں کا عالم
عرش و طوبیٰ کو حجاباتِ گماں کہتا ہوں

بندۂ خاک نشینانِ محبت ہوں روشؔ
خاک کو مسندِ آشفتہ سراں کہتا ہوں

## افسر ماہ پوری

ہمیں جب سے ہوئی نسبت کسی کی زلفِ برہم سے
نہ پھر دل کو قرار آیا نہ چھٹکارا ملا غم سے

تمہارے لطف سے دامن ہمارا بھی نہیں خالی
تبسم پھول سے ہم کو ملا ہے، اشک شبنم سے

اگرچہ پاس ان کو بھی ہے آدابِ گلستاں کا
مگر اہلِ جنوں مجبور ہو جاتے ہیں موسم سے

ہمیں کچھ اس طرح ایامِ رفتہ یاد آتے ہیں
اندھیری رات میں جیسے دیئے جلتے ہوں مدھم سے

خدا معلوم کس کس آستانے پر گئے سجدے
"جبینِ شوق کی گمراہیاں پوچھے کوئی ہم سے"

تمہارا کیا گلہ، شیوہ یہی ہے اہلِ دنیا کا
اُدھر کچھ کہہ دیا تم نے، اِدھر کچھ کہہ دیا ہم نے

ہماری داستاں وہ داستانِ شوق ہے افسر
زبانِ حال سے کچھ ہو بیاں کچھ چشمِ پُرنم سے

## ظفر گورکھپوری

کب تلک انتظار بہار رو نمو مشت و خاک سرِ رہگذر کی طرح
بوئے گل بن کے چھلکو رگِ شاخ سے پھوٹ نکلو اُفق سے سحر کی طرح

ہم رہ شوق میں اتنے تنہا رہے اب تو احساس تنہا روی بھی نہیں
آبلے ہیں دیئے درد ہے رہنما، فاصلے ساتھ ہیں ہم سفر کی طرح

شب کی تنہائی میں خانۂ دل تلک آج شاید وہ زہرہ جبیں آگیا
دھڑکنیں جیسے دیتا ہو دستک کوئی سانس بجتی ہے زنجیر در کی طرح

کس تیقن سے ہم رہروِ راہِ غم چل رہے ہیں خیالوں کا موسم لئے
دشت مانندِ پیراہنِ یار ہے، دھوپ رنگین ہے اُس نظر کی طرح

دار و مقتل کی اونچائیاں بچا ند کر ہم کو تیری طرف لے کے اُڑتی رہی
درد کی شکل میں دل سے اٹھتی ہوئی کوئی بے نام شے بال و پر کی طرح

وقت نے خاک کے مول بیچا ہمیں سوچتے ہیں ظفر وہ بھی کیا دن تھے جب
گلرخوں نے نگاہوں کی میزان میں ہم کو تولا تھا لعل و گہر کی طرح

## سحر انصاری

قائل ہم اپنے دیدۂ پُر آب ہی کے ہیں
پھر منتظر تلاطم و سیلاب ہی کے ہیں
مرجانہ و حسینہ و سلمیٰ و نازیہ
یہ سارے نام خواب کے تھے خواب ہی کے ہیں
سیارگانِ چرخ سے تا زلفِ مشکبار
حلقے تمام عالم گرداب ہی کے ہیں
پیراہنوں کی سُرخ شفق عارضوں کی دھوپ
یہ عکس میرے ساغرِ خوناب ہی کے ہیں
آہنگ و رنگ و چنگ کا دشمن نہیں کوئی
دشمن تمام نغمۂ کمیاب ہی کے ہیں
برگِ خزاں رسیدہ ہیں بیرونِ جوششِ غم
نوحے ہواؤں میں دلِ بے تاب ہی کے ہیں
لب تشنگاں کو جامِ مئے ارغواں سے کیا
ہم تشنگاں تو جرعۂ زہراب ہی کے ہیں
یہ بھی کھلا کہ خاک نشینانِ کوئے غم
دلدادگانِ ریشم و کمخواب ہی کے ہیں
یہ حسرتیں کہ سینۂ مہتاب میں سحر
دیکھا تو داغ مہرِ جہانتاب ہی کے ہیں

## منظفر حنفی

کچھ دن کی من مانی کر لو — حق سے نافرمانی کر لو
داناؤں کا دل رکھنا ہے — تھوڑی سی نادانی کر لو
پھر کوئی تکلیف نہ ہوگی — پیدا تن آسانی کر لو
چرب زبانی بھی کیا شے ہے — جس کو چاہو پانی کر لو
گردن کیا خم ہو گی میری — تم یوں ہی قربانی کر لو
ساری محفل دیکھ رہی ہے — مجھ سے آنا کانی کر لو
موسم گل کے نام پہ دو بھر — گلشن میں ویرانی کر لو
"خضر نمائی" پھر کر لینا — پہلے ہر "شیطانی" کر لو
کھل کر الجھو ان فتنوں سے — یا فتنہ سامانی کر لو
طوفاں آنے سے پہلے ہی — ہمت کو طوفانی کر لو

کچھ تو سیکھا پن اور منظفر
لہجے کو لاثانی کر لو!

## منظر ایوبی

منزل ملی انہی کو جو راہیں بدل گئے
ہر سانحے سے پہلو بچا کر نکل گئے

اٹھتا دھواں وہ خانۂ دل سے کہ دیکھئے
اچھا ہوا کہ درد کے پہلو بدل گئے

اب کے شراب میں تھی وہ حدت کہ لب تلک
آنے نہ پائے شیشہ و ساغر پگھل گئے

ہر لب پہ یوں تو ترکِ تعلق کا ذکر تھا
اس کی نظر اٹھی تو ارادے بدل گئے

پھر لوگ کس پہ طنز کے پتھر اٹھائیں گے
گر ہم بھی کوئے یار سے بچ کر نکل گئے

کچھ پھول تو نشانہ بنے تیز دھوپ کا
باقی خود اپنے حسن کے شعلوں سے جل گئے

تجھ کو دعائیں دیتے رہیں گے تمام عمر
کھا کھا کے ٹھوکریں ترے وحشی سنبھل گئے

اس انجمن میں خاک کریں شرحِ آرزو
آزردہ دل جہاں سے ہزاروں نکل گئے

جانے یہ کس نظر کا فسوں تھا کہ یک بیک
منظرؔ جبینِ وقت کے تیور بدل گئے

## خمار انصاری

واردات جاں کو غم کی داستاں سمجھا گیا
ایک اظہارِ حقیقت کو فغاں سمجھا گیا

دوسروں سے ہو گئے منسوب میرے واقعات
میری باتوں کو حدیثِ دیگراں سمجھا گیا

زود رنجی میری فطرت ہے مری عادت نہیں
دوستو مجھ کو سمجھنا تھا کہاں سمجھا گیا

کیا پذیرائی کے احساسات تھے وقتِ سفر
جب یہاں پہونچے ہمیں بے خانماں سمجھا گیا

ایسے بھی نا اہل ہیں جن کو مراتب کے طفیل
اہلِ فن سمجھا گیا ، اہلِ زباں سمجھا گیا

ہم اک ایسے جہل کے صحرا میں رہتے ہیں جہاں
جھوٹ کا منشور بھی حق کی زباں سمجھا گیا

جس کے ہاتھوں ہو گئی گلشن کی پامالی خمارؔ
کیا قیامت ہے اسی کو باغباں سمجھا گیا

## حامد سروش

یاد آئی تھی تری درد کے جھونکے کی طرح
دل میں اُتری تھی کوئی چیز سی کانٹے کی طرح

دامنِ شب میں "سُلگتے" ہوئے انگارے تھے
شعلۂ ماہ تھا جلتے ہوئے خیمے کی طرح

وقت کی جھیل میں تنہا ہوں کنول کے مانند
چھٹ گیا ہاتھ سے دامن ترا لمحے کی طرح

ہم تو کہتے تھے کہ مر جائیں گے جاں دیدیں گے
بہہ گئے وقت کے سیلاب میں تنکے کی طرح

اپنی افشاں کے ستاروں میں سجا لے ورنہ
وسعتِ دہر میں کھو جاؤں گا ذرّے کی طرح

رنج و راحت میں کوئی فاصلہ باقی نہ رہا
ہم خوشی جھیل گئے دوستو! صدمے کی طرح

عمر کٹ جائے نہ کوتل[1] کے پہاڑوں میں سروش
بکھر کے رہ جائیں نہ کوہاٹ میں چشمے کی طرح

---

[1] درۂ کوتل

## قمر لدھیانوی

اور کچھ دور نہیں کوئے صنم دیکھو تو
خود بخود اٹھتے ہیں اس سمت قدم دیکھو تو

یہ کڑے کوس، یہ منزل کی تمنا، یہ سراب
تشنگی خود ہی پلا دیتی ہے سم دیکھو تو

چارۂ غم جو نہیں اذنِ شکایات تو ہے
التفات اُن کا زیادہ ہے نہ کم دیکھو تو

جسم و جاں کا ہے عوض چند کھنکتے سکے
یہ سخاوت، یہ تلطف، یہ کرم دیکھو تو

فاصلے اتنے دلوں میں کہ الٰہی توبہ!
پھر بھی کہنے کو ہیں ہم لوگ بہم دیکھو تو

ایک لمحہ بھی مسرت کا غنیمت ہے قمرؔ
ہر نفس گھات میں کیا کیا نہیں غم دیکھو تو

سیدہ حنا

# تشنہ تشنہ

زندگی میں محبت کی ضرورت سے وہ کبھی منکر نہیں ہوئے۔ یہ اور بات تھی کہ فریدہ سے رشتہ ٹوٹنے کے بعد انہوں نے اس کی اہمیت پر زور دینا چھوڑ دیا تھا، بس یوں کہ میسر آجائے تو بہار آجائے، ورنہ خزاں میں بھی تو کچھ نہ کچھ رنگ ہوتے ہی ہیں بلکہ اگر دیکھا جائے تو بہار کے مقابلے میں خزاں زیادہ پائیدار، زیادہ ابدی حقیقت رکھتی ہے۔ بس یوں انہوں نے زندگی سے سمجھوتہ کر لیا،

اور وقت انہیں اس قدر بے نیاز پاکر چپکے سے آگے بڑھ گیا۔

زندگی سے محبت کا رس نچوڑ کر قسمت کی دیوی مہربان ہوئی تو ایسی مہربان ہوئی کہ دنیا کی ہر نعمت ان کے دامن میں بے مانگے لاکر ڈال دی۔

اب وہ پہلے کی طرح مفلس و قلاش انسان نہیں رہے تھے۔ گھنے سایہ دار درختوں کے درمیان گھری ہوئی ان کی اپنی کوٹھی تھی، نوکر چاکر تھے، گیراج میں چھوٹی سی چمکیلی کار بھی تھی، لوگ ان کی عزت بھی کرتے تھے، اور وہ جو محبت نے مذاقِ شاعرانہ بخشا تھا اور محبت کی ناکامی نے زندگی میں جو خلاء اور روح میں جو کسک بھر دی تھی اس کی بدولت ادبی حلقوں میں ان کی خاصی شہرت بھی تھی۔

دوست رشتہ داروں نے بہت سر کھپایا، شادی کی اہمیت اور ضرورت پر لاکھ زور دیا، شریک حیات کی جاں بخش مسکراہٹوں اور درختوں کے گھنے سایوں میں دوڑتے، بھاگتے پھول سے بچوں کی گل کاریوں کی بڑی حسین نقشہ کشی کی۔ پر ان کے دل میں تو فریدہ کا خیال کچھ یوں پاؤں پسار کر بیٹھا تھا کہ اور کسی خیال کا اس میں گذر ہی نہ ہو سکا۔ اور وہ یوں ہی بے حس اور بے نیاز بنے رہے۔

کبھی کبھی وہ فریدہ کے لئے سوچتے: جانے کہاں ہوگی؟ —— کیسی ہوگی؟ —— گھر کے دھندوں اور بال بچوں میں پھنس کر اب تک تو ان کو بھول بھال بھی گئی ہوگی! —— کبھی کبھی وہ اس کی صورت اور اس کے سراپے کے لئے سوچتے: وہ سبک ساصندلی پیکر جانے اب کس روپ میں ہوگا —— یقیناً وقت نے اپنی کارگزاری دکھائی ہوگی —— بالوں میں چاندی کے تار چمکنے لگے ہوں گے —— جسم پھیل کر موٹا ہوگیا ہوگا —— رخساروں کی دمک اور آنکھوں کی آب مدھم پڑ گئی ہوگی

اور ایک تلخ سی مُسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر رینگ جاتی ـــ پھر دل کے کسی گوشے سے ایک مبہم سی شکایت سر اُٹھاتی؛ کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا ـــ کاش اُس کی جوانی یوں رائیگاں نہ جاتی ۔

خدا جانے کیوں، انہیں اس کا یقین تھا کہ ان کے پاس رہ کر فریدہ کی جوانی خزاں سے کبھی آشنا نہ ہوتی ۔ اس کا حسن زندگی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دھنک کی طرح تن جاتا، اور جس طرح دھنک کے دونوں سرے حسین ہوتے ہیں ان کی زندگی کا آغاز اور انجام دونوں حسین ہوتے، دونوں ساتھ ساتھ جیتے اور ساتھ ساتھ مر جاتے ـــ وہ زندگی بھی حسین ہوتی اور وہ موت بھی ـــ پر اب تو وہ زندگی اور موت دونوں کے تصور سے بے نیاز ہو کر جی رہے تھے ـــ دوستوں کی محفلوں میں بیٹھ کر اُونچے اُونچے قہقہے لگاتے اور تنہائیوں میں خود کو کتابوں کے حوالے کر دیتے ۔

ایک صبح تفریح سے لوٹتے وقت جب وہ ایک کوٹھی کے سامنے سے گذر رہے تھے انہوں نے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ سنا، اور بلا ارادہ مڑ کر اس طرف دیکھنے لگے جدھر سے یہ آواز آرہی تھی ـــ کوٹھی کے گیٹ سے کچھ لڑکیاں ہنستی ہوئی باہر نکل رہی تھیں ۔ وہ سب ہی حسین تھیں، پر ایک لڑکی، پہلی نظر میں انہیں یوں محسوس ہوا کہ وہ فریدہ کو دیکھ رہے ہیں مگر دوسری نظر میں انہیں پہلے خیال کی تردید کرنی پڑی، تاہم اس روز سارا دن وہ کچھ کھوئے کھوئے سے رہے ۔ ہر چیز میں انہوں نے اجنبیت محسوس کی ۔

وہ اسے بھول جاتے اگر کچھ دنوں بعد وہی لڑکی ان کی کلاس میں داخلہ نہ لے لیتی ـــ اُس کا نام صبیحہ تھا ۔ وہ فریدہ کی نسبت کہیں خوب صورت اور اسمارٹ لڑکی تھی ۔ فریدہ کو تو اس کے والدین کی بے وقت موت اور چچا چچی کی سرپرستی نے جوانی کی شوخیاں چھین کر ایک سلگتی ہوئی سوچ عطا کر دی تھی ـــ پھر اس تعلق خاطر نے اسے اور بھی پژمردہ کر دیا تھا ۔ اس کے نسوانی حسن اور ذکاوت نے اسے باور کرا دیا تھا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی ـــ وہ نوجوان جس کے لئے اس نے اپنے دل میں بے پناہ کشش، ہمدردی اور محبت کا جذبہ محسوس کیا تھا وہ مفلس اور بے زر تھا ۔ اور چچا، جو محض فرض شناس تھے، فریدہ کے دل کی گہرائیوں میں نہیں جھانک سکتے تھے ۔ اس کا درد اپنے دل میں محسوس نہیں کر سکتے تھے ـــ وہ خود کتنی بے بس تھی ـــ اگر اس تعلق خاطر کا چچی کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو وہ طعنے دے دے کر اس کے سارے خاندان کا جینا محال کر دیتی ۔

فریدہ کو اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن چھوٹی بہن، اور اپنے سے دو سال بڑے بھائی کی عزت کا خیال اُس کے ہونٹوں پر مہریں لگائے ہوئے تھا ۔

انہیں دنوں انہوں نے جرأتِ رندانہ سے کام لے کر فریدہ کی خواستگاری کی ۔ اُس کے لئے اس کے چچا کے آگے ہاتھ پھیلا دیا ـــ لیکن اگر وہ جلدی ہاتھ کھینچ نہ لیتے تو شاید کیا یقیناً توڑ دیا جاتا ـــ اور تب انہوں نے زخمی دل اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ وہ شہر چھوڑ دیا ۔

احساسِ شکست، احساسِ ذلت، احساسِ ناکامی، اور محبوب سے جدائی کے احساس نے، انہیں اندر سے صرف جلایا ہی نہیں بلکہ توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ۔ بس اوپر سے ان کا خول سلامت تھا ۔ نئے شہر میں مدتوں ان کا دم گھٹتا رہا کیونکہ وہاں کی ہوائیں پیراہنِ دوست کی شامہ جاں نواز سے خالی تھیں ۔ فضاؤں میں اس کی چاندسی پیشانی اور طلوعِ سحر جیسی رنگت والے

رخساروں کا نور پڑ تھا۔ پرندوں کی خوش نوائیوں میں اُس دل نشیں آواز کی کھنک نہ تھی۔ غرض اس قسم کے شاعرانہ خیالات انہیں اُداس رکھنے کے لئے بہت کافی تھے۔

فریدہ کی چاہت میں محبت کا عنصر زیادہ تھا جنس کا کم، تقدس، مسرت اور پسندیدگی کے جذبات کارفرما تھے جنونِ دل یوں مچلا نہ تھا جس طرح صبیحہ کو دیکھ کر مچلا ــــ

ادھیڑ عمر میں، جب کہ بالوں میں چاندی کے تار چمکنے لگے تھے، جذبات و احساسات میں ایک قسم کا ٹھہراؤ پیدا ہو چلا تھا ــــ محبت کی ناکامی کے لگاؤ یاس کے مرہم سے اندمال پذیر ہونے لگے تھے، اچانک ایک پایاب موج اٹھی، اور سر سے گذر گئی۔

پھر ایک اور موج ــــ

ایک اور ــــ

انہیں یُوں لگا جیسے وہ کھڑے نہیں رہ سکیں گے۔ وہ زندگی میں پہلی بار جنس کے جذبے سے متعارف ہو رہے تھے۔ اور یہ سب کچھ انہیں بڑا عجیب سا لگ رہا تھا ــــ

کھوئے تو فریدہ کی جاں بخش مسکراہٹ میں بھی تھے پرستر، ہٹ میں کھو کر لبوں تک پہونچنے کا بے باک اور سرکش جذبہ یُوں کبھی اُن کے دل میں نہ اُبھرا تھا ــــ یہ جذبہ ان کے لئے نیا بھی تھا پریشان کن اور اذیت دہ بھی ــــ ان کی ساری ساری رات صبیحہ کے تصور سے باتیں کرتے گذر جاتی۔

تنہائیوں میں وہ اُن کے بے حد نزدیک ہوتی وہ اس کی قربت کے خوش گوار احساس کی چھاؤں میں یہ سوچ کر سلگتے رہتے کہ در حقیقت وہ ان کی دسترس سے بہت دور ہے ــــ جس دن وہ نہ آتی وہ ان کی زندگی کا سب سے تاریک دن ہوتا۔ جب وہ ان کے سامنے ہوتی تو اس کے بالوں کی آوارہ لٹیں، اس کے رخساروں کے شعلے، اس کی گردن کا خم، اس کے پلکیں جھپکنے کا انداز، ان کے جسم میں ایک انوکھا طوفان اٹھائے رکھتا۔ کتنی کتنی دیر وہ کوریڈور میں کھڑے اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرتے رہتے۔ جب وہ ان کے قریب سے گذر کر آگے بڑھ جاتی تو اس کی ساری کی لہریں، اس کے جسم کی لچک، اس کی کمر کے بل، اُن پر ایک نشے کی سی کیفیت طاری کر دیتے۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں اور خیالوں ہی خیالوں میں اتنی چڑھا لیتے کہ چوبیس گھنٹے حالت کیف و سرور میں گذر جاتے۔

اُن کی وحشت روز بروز بروز بڑھ رہی تھی۔ اسے اپنی بانہوں کے حلقے میں لینے کے لئے وہ روز بروز مضطرب ہوتے جا رہے تھے ــــ کھانا پینا برائے نام رہ گیا تھا۔ جسم ایک دھیمی دھیمی آنچ میں سلگ رہا تھا۔ پگھل رہا تھا ــــ سارے فاصلے مٹ جائیں، ہر رکاوٹ دور ہو جائے، ساری دوریاں قربتوں میں بدل جائیں۔

مگر کیسے؟

کیونکر ــــ؟

بہت دن سے پوئٹری پر لیکچر دے رہے تھے۔ کیٹس کی "لابیل ڈیم سیس مرسی" (La belle dame sans merci) ــــ کی تشریح انہوں نے اتنے حسین جاندار اور اتنے حیرتناک پیرائے میں کی کہ ساری کلاس مبہوت

ہو[illegible] اور جب وہ یہ اسٹینزا سمجھا رہے تھے :

*She took me to her elfin grot,*
*And there she wept and sigh'd full sore;*
*And there I shut her wild, wild eyes*
*With kisses four.*

تو اُن کی پیاسی آنکھیں ان وحشی ہرنیوں جیسی گہری گہری کالی کالی آنکھوں سے جا ٹکرائیں ۔ ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی کشش، ایک ایسی روشنی تھی کہ صبیحہ بوکھلا کر آنکھیں جھکانا بھول گئی، اور وہ اس بھنور میں جانے کتنی دیر ڈوبتے اُبھرتے رہے ——— وہ تو کچھ صبیحہ کو ہی خیال آ گیا، اُس نے کچھ گھبرا کر، کچھ شرما کر نگاہیں جھکا لیں، ان آنکھوں پر پلکوں کی چلمن پڑی تو وہ سنبھل کر ہوش میں آ کر آگے بڑھے ۔

پھر تو یہ روز کا معمول بن گیا ۔ بھولے سے یا اُن کی نگاہوں کی حدّت سے تپ کر صبیحہ کی نگاہیں ایک لمحہ کے لئے بھی اُن کی طرف اُٹھ جاتیں تو وہ اُس کی آنکھوں میں اس طرح آنکھیں ڈال کر ڈوب جاتے کہ صبیحہ کو نگاہیں ہٹانا، اور جھکانا دشوار ہو جاتا ۔

لیکچر کے دوران اکثر اس طرح ہوتا ۔

لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس کھیل سے لیکچر میں کوئی فرق نہ پڑتا، بلکہ اس میں کچھ زیادہ ہی رنگینی اور تاثر پیدا ہو جاتا ۔

طلباء میں ان کی مقبولیت بڑھنے لگی تھی ۔ انگلش لٹریچر پڑھاتے وقت وہ ایسے ایسے باریک اور ناگفتنی حقائق ایسے شستہ اور دلکش پیرائے میں بیان کر جاتے کہ اکھڑی جوانیاں دل تھام کر رہ جاتیں ۔

پھر ایک دن جب وہ اپنی کار خود ہی ڈرائیو کرتے ہوئے گھر جا رہے تھے، ایک حادثہ پیش آ گیا، انہوں نے دیکھا صبیحہ کی کار راستے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑی ہے اور صبیحہ اس سے لگی کھڑی ہے ۔ وہ فوراً اُتر پڑے :

'What happened?'

"گاڑی میں کچھ خرابی ہو گئی ہے سر!"

"آئیے دیکھیں ——— !"

وہ آستینیں چڑھا کر آگے بڑھے ——— انجن کھول کر اس میں دیکھنے لگے ——— اُسی وقت صبیحہ نے بھی اس میں جھانکا ——— اور ان کی نظر بہک کر بلاؤز کے کھلے گلے پر جا پڑی ——— وہ زلزلہ تھا ——— سنسنی تھی ——— چکر تھا ——— کیا تھا؟ ——— بس یوں ہوا کہ اُن کی ٹانگیں کانپنے لگیں ۔ خوف زدہ ہو کر انہوں نے کار کی باڈی کو مضبوطی سے تھام لیا، شدتِ ضبط سے اُن کا چہرہ عرق آلود ہو گیا ۔

صبیحہ گھبرا گئی ۔

"آپ کو کیا ہوا سر؟" ۔

جانے وہ کیا کیا کہنا چاہتے ہوں گے ۔ پر فرقِ مراتب نے زبان پکڑ لی ۔ ہاں آنکھوں میں ساری زندگی کی تشنگی، دنیا جہان کی پیاس چیخ پڑی ۔

صبیحہ نے جلدی سے کار میں سے تھرموس لے کر ان کو ٹھنڈا پانی پیش کیا۔

وہ اس کا نازک سا سفید ہاتھ ـــــ وہ کیوٹکس لگے ہوئے شعلہ شعلہ ناخون ، اور وہ ہتھیلی کی گہری گہری گلابی لکیریں! سنسان سڑک ، تپتی دُھوپ میں ٹاہلی کی گھنی ٹھنڈی چھاؤں ـــــ وہ اور صبیحہ ـــــ اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو جانے کیا کر گذرتا ، پر انہیں اپنی شخصیت ، اپنے مرتبے اور اپنے مقام کا احساس برابر ہوتا رہا ۔

کار کی مرمت ہو گئی ، تو وہ شکریہ ادا کر کے چلی گئی ۔

لیکن شام کو ان کی مزاج پرسی کے لئے ان کے بنگلے پر آموجود ہوئی ۔

اُس دن اُس نے بہت اچھی اچھی باتیں کیں ۔ اُن کے فن کو سراہا ۔ اُن کے طرزِ تعلیم کو سراہا ـــــ اُن کی تنہا زندگی پر افسوس کیا ـــــ اُن کی بیماری پر تشویش کا اظہار کیا ـــــ اور ـــــ کچھ دن چھٹی لے کر کسی پہاڑی مقام پر جانے کا مشورہ بھی دیا ۔

اُس رات انہوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ـــــ

لیکن صبح جب وہ آئینے کے سامنے اپنا یہ فیصلہ دہرا رہے تھے ، بالوں میں چمکتے ہوئے چاندی کے تار جیسے اُن کا منہ چڑانے لگے ـــــ کہاں وہ اٹھتی جوانی ، وہ ابھرتا ہوا شباب ، وہ دمکتا ہوا چاند سا مکھڑا ، وہ دہکتے ہوئے آتشیں رخسار وہ پچھم سے امڈی ہوئی گھٹاؤں جیسے کالے بادل ـــــ کہاں وہ خود ـــــ ؟

'یہ صبیحہ کے ساتھ زیادتی ہوگی' ـــــ انہوں نے بڑے تحمل کے ساتھ سوچا۔

'تو پھر ـــ تو پھر ـــ؟'

اور جیسے اُن کا ایک ایک بُنِ مو پکار اُٹھا :

'صبیحہ ـــ صبیحہ ـــ'

دن گذرتے رہے ، ان کی اندر کی کش مکش بڑھتی گئی ۔ عقل کہتی تھی وہ صبیحہ کے جوڑ کے نہیں ہیں ۔ دل ، روح اور جسم پکار پکار کر صبیحہ کو طلب کرتے ۔

نگاہوں کا تصادم اب بھی ہوتا ،

اب بھی وہ کبھی کبھی اُن کی طرف آ نکلتی ۔

پھر ایک دن اُس کی جگہ اس کا نوکر آیا ـــــ وہ ایک انویٹیشن کارڈ لایا تھا ـــــ صبیحہ کی منگنی ہو رہی تھی ، اس کے کزن کے ساتھ ـــــ!

ایک جھٹکا سا لگا ـــ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ـــــ آگے وہاں کیا سالم رہا تھا ـــــ پر مذا جانے جب کھنڈرات میں زلزلہ آتا ہے تو کیا ہوتا ہے ؟ ـــــ بس ایسا ہی کچھ ہوا ـــــ ٹوٹی پھوٹی چیزیں اور بھی ٹوٹ پھوٹ گئیں ـــــ کچھ کھنڈر زمین میں بیٹھ گئے ـــــ انہیں ایسا محسوس ہوا ، جیسے ان کا دل بیٹھا جا رہا ہے ، اور وہ پاتال کی گہرائیوں میں اترتے چلے جا رہے ہیں ـ نیچے ـ نیچے اور نیچے ـ

دو دن تک [illegible] نہ جا سکے۔

صبیحہ بھی چھٹی پر تھی۔

تیسرے دن جب انہوں نے کلاس روم میں قدم رکھا تو صبیحہ اپنی مخصوص سیٹ پہ بیٹھی ہوئی تھی — اُن کا دل بھر آیا، وہ کتنی خوش، کتنی مسرور نظر آ رہی تھی — گذری ہوئی مسرّتوں کے سائے ابھی تک اس کے چہرے پر رقصاں تھے — اُنگلی میں بڑے سے نگ والی انگوٹھی چمک رہی تھی — لڑکیاں کھسر پھسر کر کے مسکرا رہی تھیں — خود اُس کے لب بھی — یوں لگتا تھا جیسے مسکراتے ہوں، یا ابھی ابھی مسکرا پڑیں گے۔

انہوں نے سوچا: اس بھولے بھالے چہرے کے پیچھے یقیناً کسی پتھر کا دل ہے۔

وہ شیلے پڑھا رہے تھے:

Oh lift me from grass
I die! I faint! I fail!
Let thy love in kisses rain
Oh my lips and eyelids pale.
My cheek is cold and white, alas!
My heart beats loud and fast; —
Oh! press it to thine own again,
Where it will break at last.

ان کی آواز کا سوز اور گمبھیرتا لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ چوٹ کھائے ہوئے دل اس سوز، اس گمبھیرتا میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ صرف صبیحہ تھی جو لاتعلق سی نظر آ رہی تھی — ہر التجا سے بے نیاز — وہ اس لمحے انہیں بے حد مغرور نظر آئی۔ اردو اور فارسی کے شعراء کے محبوب کی طرح مغرور، سنگدل اور بے پروا۔

مگر عجیب بات یہ تھی کہ خود ان کی بھی ماہیت قلب ہو گئی تھی۔ اردو فارسی شاعری کے عشاق کی طرح ان کا دل چاہ رہا تھا کہ اس معصوم قاتل کے قدموں پر سر رکھ دیں، اور آنسو بہا بہا کر سکونِ دل کی بھیک مانگیں۔ اُن کے دل کا سکون، ان کی زندگی کی مسرت، اُن کی دنیا کا اُجالا، سب کچھ اُسی کے قبضۂ قدرت میں تو تھا — پر وہ آہنی حصار، جو انہوں نے اپنی ذات کے گرد ۴۵ سال تک کھینچا تھا، جسے پگھلتا ہوا سیسہ پلا پلا کر مضبوط کیا تھا — اس طرح کے آگے آج وہ خود بے بس تھے۔

وہ اُس سے کہنا چاہتے تھے:

"تم کتنی ظالم ہو، بے درد ہو، ظاہر کو تو تم جیسی بیسیوں صبیحائیں مل جاتیں، مگر میری افسردہ زندگی کی امید تو تم اور صرف تم تھیں — تمہیں میرا ساتھ دینا چاہئے تھا — اگر اسی طرح بے موت مارنا تھا تو تم نے مجھے نئی زندگی کیوں عطا کی تھی — میں فریدہ کے غم میں جل بجھ چکا تھا۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ ایک دم توڑتی ہوئی چنگاری کو ہوا دے کر

شعلہ بنا دو ––– اور پھر میرے وجود کو ان بھڑکتے شعلوں کے سپرد کر کے خودکشی اور کی زندگی کی ٹھنڈک اور راحت بن کر بیٹھ جاؤ"

پھر وہ لمبی چھٹی لے کر پہاڑ پر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے بہت سے چہرے دیکھے۔ لیکن کوئی فریدہ کوئی صبیحہ اُن کو نہیں ملی۔ پھر ان کا دل اس کو دیکھنے کے لئے بے چین ہوا تھا۔ کہیں بھی، کسی طرح بھی وہ اس کو دیکھ لیں ––– وہ واپس آ گئے، مگر واپس آ کر وہ اس کو نہیں دیکھ سکے۔ طاہر کو گورنمنٹ کی طرف سے اسکالرشپ مل گیا تھا، وہ صبیحہ کو رخصت کرا کے اپنے ساتھ امریکہ لے گیا۔

ان کو اس حادثے کا یقین نہیں آیا ––– وہ کہیں بھی نہیں جا سکتی۔ وہ تو اُن کے نہاں خانۂ دل میں مقیم تھی۔ ہر صبح وہ اس کی کوٹھی کے سامنے سے اس امید پر گذرتے کہ شاید آج اس کی ایک جھلک نظر آ جائے ––– یہ جانتے ہوئے بھی، کہ وہ وہاں نہیں ہے ––– ان کی نگاہیں کوٹھی کا بار بار طواف کرتیں ––– اُسے ایک نظر ––– صرف ایک نظر دیکھنے کے لئے اُن کا دل مچل مچل جاتا۔

جذبات کے ہیجان، جسم کی ماندگی، ذہن کی ابتری اور دل کی بے چینیوں نے انہیں بیمار ڈال دیا۔ سارے دوست، رشتہ دار انہیں دیکھنے آئے، اور ایک دور کے رشتہ دار جو کافی عرصے سے بے کار رہتے ان کی دیکھ بھال کرنے اور تنہائی دور کرنے کے خیال سے انہیں کی کوٹھی میں آ رہے۔

اُن کے ساتھ ان کی نوجوان بیوی، اور ایک گول مٹول سا بچہ تھا۔ وہ شکل و صورت سے بے حد ذہین اور حرکات و سکنات سے بلا کا شریر معلوم ہوتا تھا۔

شروع شروع میں انہیں ان کا آنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ سب سے زیادہ وہ بچے کے خیال سے الجھ رہے تھے خواہ مخواہ ڈسٹرب کیا کرے گا ––– نہ یکسوئی سے سوچنے دے گا، نہ پڑھنے دے گا ––– تاہم وہ خاموش رہے، اور جلدی جلدی صحت بحال کرنے کی کوشش کرنے لگے، تاکہ ان بن بلائے مہمانوں سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کر سکیں۔

بچے کے والدین اُن کے مزاج سے کسی نہ کسی قدر واقف تھے۔ منے کی شرارتوں کے خوف سے وہ اس کو ان کے کمرے میں نہیں چھوڑتے تھے ––– لیکن وہ موقع پاتے ہی آ دھمکتا۔ اور اپنے ننھے منے وجود سے سارے کمرے میں اُچھل مچا کر بھاگ جاتا وہ اسے سزا دینے اور خوف زدہ کرنے کے لئے کسی موزوں موقع کے منتظر تھے۔

ایک دن انہیں یہ موقع مل ہی گیا۔

اس دن منے نے اپنی ماں کی ہیل والی سینڈل پہن رکھی تھی۔ اور کھٹ کھٹ کرتا گرتا پڑتا ان کے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ وہ پردے کے پیچھے چھپ گئے؛ اور جیسے ہی اس نے کمرے میں قدم رکھا انہوں نے جھپٹ کر اسے اپنی باہنوں کے حلقے میں جکڑ لیا۔

"اب بولو مسٹر! پھر کبھی آؤ گے ادھر ––– ؟"

انہوں نے اسے ڈانٹا۔

اُن کا خیال تھا، وہ ڈر جائے گا ––– ڈر کر چیخے گا ––– روئے گا ––– لیکن وہ ان کے منہ کی طرف دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑا اور اپنے سر کو اثبات میں زور زور سے ہلانے لگا۔

اس کی کلکاریوں میں کھو کر انہیں پتہ بھی نہ چلا کہ وہ خود کب ہنسنے لگے۔

بس اُس دن سے منے کے ساتھ ان کی دوستی ہو گئی۔

انہوں نے نوکر کے ہاتھ اس کے لئے بہت سے کھلونے اور ٹافیاں منگوائیں۔ چابی سے چلنے والی کار، سوتی جاگتی گڑیا اور اسی طرح کی بہت سی چیزیں، ــــ منے نے شاید پیدا ہو کر پہلی بار یہ کھلونے دیکھے تھے۔ اس کی گول گول سنہری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور جب اس کو یقین آ گیا۔ یہ سب کچھ اسی کے لئے انہوں نے منگوایا ہے تو وہ خوش ہو کر ان سے چمٹ گیا ــــ اس نرم گرم دھڑکتے ہوئے ننھے سے وجود کے لمس نے انہیں کہیں سے کہیں پہونچا دیا ــــ اس کی چراغوں کی سی جھلملاتی ہوئی آنکھیں اور چہرے پر بکھرے ہوئے معصومانہ خوشی کے رنگ، ان کے شاعرانہ محسوسات کے لئے ایک حسین تحریک بن گئے۔ کتنی عجیب بات تھی کنواں خود چل کر پیاسے کے پاس آ گیا تھا۔ ان کے دل میں محبت و مسرّت کے ان گنت چشمے پھوٹ پڑے۔ انہوں نے اُسے چوم لیا۔

اب مُنا: جتنی دیر وہ گھر میں رہتے، اُن کے پاس بیٹھا رہتا۔ میٹھی میٹھی باتیں، پیاری پیاری حرکتیں کبھی وہ اسے گدگداتے، کبھی وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے انہیں گدگداتا۔ اور جب کبھی وہ اپنی گول مٹول باہیں ان کی گردن میں ڈال کر اُن کے سینے سے لگ جاتا تو انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے پیاسی دھرتی سیراب ہو رہی ہے۔ جیسے اندھے کنوئیں میں پانی آ رہا ہے۔ جیسے ان کے اردگرد ٹھنڈے میٹھے پانی کے شفاف جھرنے پھوٹ رہے ہیں۔

رفتہ رفتہ وہ سنبھلنے لگے۔

جس دن انہوں نے غسلِ صحت کیا اُس دن وہ منے کو کار میں بٹھا کر بازار گئے۔ اُس کے لئے بہت سے خوبصورت ریڈی میڈ سوٹ خریدے۔ کھلونوں، مٹھائیوں اور ٹافیوں کے پیکٹوں کا تو کوئی حساب ہی نہ تھا۔

اس دن منے سے زیادہ منے کے والدین خوش تھے۔ وہ یوں ظاہر کر رہے تھے۔ جیسے اُن کے صحت یاب ہونے کی انہیں بہت ہی مسرّت ہوئی ہو۔

دوسرے دن منے کے والدین اُن کے پاس آئے۔

مرد نے کہا ــــ "خدا کا شکر ہے، آپ صحت یاب ہو گئے ہیں، ناظمہ کا خیال ہے کہ اب ہمیں واپس چلا جانا چاہئے۔"

"ہم تو کل شام ہی چلے جاتے ــــ" ناظمہ مرد کی بات کاٹ کر بولی ــــ "مگر وہ منا آپ سے بہت ہل گیا ہے۔ وہ تو آپ سے دور ہو کر دشمنوں سے دور بیمار پڑ جائے گا۔ سوتے میں بھی انکل انکل پکارتا رہتا ہے۔"

وہ مسکرائے ــــ "یہ مت کہئے۔ منا مجھ سے نہیں ہلا ہے میں منے سے ہل گیا ہوں۔ دراصل میرے صحت یاب ہونے میں منے کا بڑا ہاتھ ہے۔ بڑا پیارا بچہ ہے آپ کا ــــ"

"اسے آپ اپنا ہی بچہ سمجھئے" مرد بولا۔

"ہاں، وہ تو بس آپ کا ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم لوگوں کی تو ذرا بھی پروا نہیں کرتا۔ ایمان کی بات ہے۔ میں ماں ہو کر اس کا اتنا خیال نہیں کرتی جتنا آپ کو ہے۔"

"میرا خیال ہے ــــ" انہوں نے جچے تلے لفظوں میں اپنا فیصلہ سنا دیا ــــ "جب تک آپ کو سروس نہیں ملتی، آپ یہیں

میرے پاس قیام کریں۔"

"سروس کی تو کوئی بات نہیں ہے"... مرد نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس منے کی مجبوری ہے ——" عورت جلدی سے بول اٹھی۔

"منا کہاں ہے اسے میرے پاس بھیج دیجئے" یہ کہتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"سویا ہوا ہے"

عورت نے واپس ہوتے ہوئے کہا۔

مرد بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔

والدین نے منے کو مکمل طور پر ان کے حوالے کر دیا تھا۔ اور خود اس سے دستبردار ہو گئے تھے۔ تنہائیوں میں وہ منے کی قسمت پر تبصرہ کرتے۔ کتنا لکی تھا ان کا منا۔ اس کی بدولت انہیں دنیا کی ہر نعمت میسر آ گئی تھی۔ ناظمہ کی ساری کوٹھی پر حکومت تھی۔ وہ سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ مرغن اور لذیذ کھانے، قیمتی اور خوش نما ساریاں، ضرورت کی ہر چیز، آسائش کا ہر سامان اُن کے لئے منے کی معرفت مہیا ہو گیا تھا۔

ادھر انہیں یوں لگنے لگا تھا، جیسے ان کی رُوح کا خلاء پُر ہوتا جا رہا ہے۔ اسے چھُو کر، اُسے گدگدا کر، انہیں ایک انجانا سا مسرت کا احساس ہوتا۔ اس کے معصوم قہقہوں میں کھو کر وہ خود بھی بے اختیار ہنس پڑتے —— کالج سے واپس ہوتے تو منا اُن کا منتظر ہوتا۔ اور پھر باقی سارا وقت سائے کی طرح اُن کے ساتھ رہتا —— گو فریدہ کی یاد اب بھی ان کے دل کو غم سے بھر دیتی۔ صبیحہ کی کوٹھی کے سامنے سے اب بھی وہ گذرتے تھے۔ اب بھی اُسے ایک نظر، صرف ایک نظر دیکھنے کی پیاس شدت سے محسوس کرتے تھے۔ لیکن منا جیسے ہر درد کا درماں بن گیا تھا —— آہستہ آہستہ وہ اپنی اس حالت پر لوٹ رہے تھے جہاں غم و مسرت کے احساسات مٹ جاتے ہیں۔ اور زندگی —— زندگی سے بے نیاز ہو کر گذرتی چلی جاتی ہے۔

تب ایک دن منے کے ابا کو کراچی سے کال آ گئی۔ انہیں وہاں ایک معقول سروس مل گئی تھی۔ میاں بیوی خوش خوش اپنا سامان پیک کر رہے تھے۔ اور منا مزے سے کھیلتا پھر رہا تھا۔ صرف ایک وہ تھے جو گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے ——

اب کیا ہوگا؟

کیا منا بھی چلا جائے گا؟

گو منے کے والدین اسے مکمل طور پر ان کے حوالے کر چکے تھے۔ انہوں نے بارہا انہیں یقین دلایا تھا کہ منا آپ کا اور صرف آپ کا ہے۔ آپ ہی اُسے پالیں پوسیں، اسے پڑھائیں لکھائیں۔ ہم نے تو بس آپ کو دے دیا —— پھر بھی ان کا دل دھڑ رہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اپنی ملکیت کی تصدیق اُن سے کرانا چاہتے تھے۔

منے کی انگلی پکڑے ہوئے اس طرف چلے گئے۔

ناظمہ منے کا سامان پیک کر رہی تھی۔

یہ دیکھ کر انہیں دھچکا سا لگا —— ایک بے اختیار جذبے سے مجبور ہو کر انہوں نے کہا:

"منے کو تو تم یہاں میرے پاس چھوڑ ہی جاؤ گے نا —— اس کے بغیر میں بہت تنہائی محسوس کروں گا —— میں اس کا

بہت خیال رکھوں گا ــــ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا ــــ ذرا بڑا ہو گیا تو کسی اچھے انگلش اسکول میں داخل کر دوں گا ــــ خود بھی اسے پڑھایا کروں گا "

انہوں نے والدین کو بولنے کا موقع دیئے بغیر جلدی جلدی کہہ ڈالا ــــ

"میرے پاس رہ کر منّا اتنا بڑا آدمی بن جائے گا کہ تم دیکھ کر بھی نہ پہچان سکو گے "

وہ دونوں مسکرانا چاہتے تھے، مگر کچھ سوچ کر رُک گئے ـ

مَرد نے کہا ــــ

"آپ جانتے ہیں" یہ ہمارا پہلا بچہ ہے ـ پھر بھی اگر ناظمہ راضی ہو تو ــــ "

اُس نے بیوی کے پھُولے ہوئے پیٹ کی طرف دیکھا ـ

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ ــــ کوئی ماں اپنے جگر کے ٹکڑے کو کسی کے حوالے کر سکتی ہے ــــ "اُس کے لہجے میں تلوار کی سی کاٹ اور آنکھوں میں شعلوں کی سی لپک تھی ـ

"اتنی بے مروّتی ــــ" وہ بڑبڑائے ـ

"آخر آپ لوگ عرصہ دراز تک میرے پاس رہے ہیں "

"ہم آپ کا، جتنا خرچ ہوا ہے، سب قسطوں میں اُتار دیں گے " وہ جلدی سے بولی ـ اور منے کو اپنے سینے سے مضبوطی سے چپٹا لیا ـ ان سے چھین کر اپنی گود میں بھر لیا ـ

منّا تڑپ کر ماں کی گود سے نکل گیا ـ

یہ دیکھ کر انہیں اطمینان کا ہلکا سا احساس ہوا ـ اگر منّا نہ جانا چاہے ـ اگر وہ میرے پاس رہنے کے لئے مچل جائے ــــ!!

انہوں نے کمرے میں قدم رکھا تو منا دوڑتا ہوا آگیا ـ

"انکل ــــ انکل ــــ میلی ٹافیاں ــــ"

"منّے! تم میرے پاس رہو گے نا ــــ دیکھو میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں ـ تمہارے لئے کتنی اچھی اچھی چیزیں لایا ہوں" انہوں نے الماری کھول کر دنیا جہاں کے کھلونے، مٹھائیوں کے ڈبے، رنگ برنگے سوٹ، ننھے ننھے بُوٹ، جرابیں، ہر چیز اس کے سامنے ڈھیر کر دی ــــ انہوں نے اسے بانہوں کے حلقے میں لے لیا ـ" میں اور چیزیں بھی لے آؤں گا ــــ تم میرے پاس سے جاؤ گے تو نہیں، بولو میرے پاس رہو گے نا ـ امی ابّا کو جانے دو "

منّے نے زور سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی ــــ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں ــــ وہ اُن کے بازوؤں میں مچلنے لگا ـ

"مجھے چھوڑ دو ــــ میں جاؤں گا ــــ امی ــــ ابّا ــــ"

ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ـ وہ اسے چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے ـ

"جاؤ ــــ" انہوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا ـ

وہ روتا ہوا دوڑتا چلا گیا ــــ "امی ــــ ابّا ــــ"

اور وہ منہ پھیر کر دریچے سے باہر دیکھنے لگے ــــ افق پر چھائی ہوئی گھٹائیں تیزی سے منتشر ہو رہی تھیں !

انیسہ جلال

# یادوں کے سائے

خواب کے جزیروں سے اب دھواں سا اٹھتا ہے
اک ہجوم یادوں کا روح میں سلگتا ہے

سوز زندگی کا یہ ڈھب ہو کر رہ گیا ہے۔ یادوں کے ہجوم نے یلغار کر رکھی ہے اور روح سلگ رہی ہے۔

نزہت .... نزہت .... نز .... ہت

زندگی کے ساز پر میں نے صرف یہی ایک گیت گایا ہے، اور وہ بھی ادھورا اور نامکمل۔

لیکن اس گیت کی یاد زندگی کا سایہ بنی ہوئی ہے۔

"نزہت" لبوں پہ نام آتا ہے تو لگتا ہے کہ زندگی پھول کی طرح کھل اٹھی ہو۔ کائنات مسکرا رہی ہو۔

لیکن اس خوشی نے میرا ساتھ صرف چند دن کے لئے دیا۔ اور نزہت کا دیا ہوا غم آج تک میرا مقدر ہے۔ میرا سایہ ہے۔ میں یہ کیوں بھولوں کہ میں نے اپنے آپ کو اس غم میں چھپا لیا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ نزہت میری زندگی میں رچ بس گئی تھی۔ اس کا تصور مجھے خوش رکھتا۔ اس کی قربت مجھے مسکراہٹ عطا کرتی۔ زندگی اُن دنوں اتنی سہل تھی کہ آج بھی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ کٹھن زندگی بھی میرا ہی مقدر ہے۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یہ خاموشی، یہ اداسی اور یہ تنہائی کا جہنم میرا مقدر بن چکا ہے۔

نزہت کے سنگ میں نے خوشی کے چند ہی دن بتائے۔ اور میرا اور اس کا ساتھ تو دراصل اسی دن چھوٹ گیا تھا، جب پپا اس دنیا میں نہ رہے۔ دنیا بدل گئی۔ اور اس بدلی ہوئی دنیا میں نزہت کا وجود ویسا کا ویسا کیونکر رہ جاتا۔ پپا نے آنکھیں موند لیں۔ وہ کوئی اپنی نہ رہی جو نزہت کے پڑوس میں تھی۔ ممی اور میں نزہت سے بہت دور ہو گئے۔ بہت سی عام کہانیوں کی طرح یہ بھی ایک کہانی یا حقیقت تھی کہ حالات جب بدلے تو دنیا بدل کر رہ گئی۔ ایسی صورت میں نہ مجھے حیرانی ہوئی تھی اور نہ ہی ممی کو۔ بس صرف یہ ہوا کہ میں برداشت کر گیا اس تبدیلی کو اس حادثے کو، لیکن ممی بنڈل نکلیں اور انہوں نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور میرا دل اور بھی پتھر ہو گیا۔

پھر بھی نزہت مجھ سے ملتی رہی۔ حالات کی الٹ پلٹ میں میں اس مقام سے بہت نیچے گر گیا تھا جہاں میں اور نزہت

کے برابر کھڑا ہو سکتا تھا۔ میرے لئے نزہت اپنے مقام سے نیچے اتر آئی تو مجھے حیرانی ہوئی۔ میرے اور نزہت کے بیچ جو فاصلے پیدا ہو گئے تھے میں انہیں باقی رکھنا چاہتا تھا، اور نزہت انہیں ختم کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ میں اس کے لئے ویسا کا ویسا تھا۔ حالانکہ میں بالکل بدل چکا تھا۔ میرے حالات بدل گئے تھے۔ اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ نزہت بھی میرے ساتھ بدل جائے۔ حالات نے مجھے جو بنا دیا تھا میں وہی کچھ رہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ میری غلط سلط اور چھوٹی موٹی کوششیں مجھے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہ سکی تھیں۔ اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی اور کی کوشش میرے لئے باعثِ نجات بنے۔ پپا کی چھوڑی ہوئی ہر چیز دوستوں، عزیزوں، رشتہ داروں نے بانٹ لی تھی، اور اب میرے پاس اُن کی دی ہوئی صرف ایک چیز رہ گئی تھی "خودداری" جسے میں کسی قیمت پر نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ ویسے ہی میں بالکل خالی ہاتھ اور تہی دست تھا۔

اس بے سروسامانی کے عالم میں نزہت کی محبت میرے لئے غیر یقینی بات تھی۔ بھلا مجھ ایسا تہی دست ایسی قیمتی شے کا مالک کیونکر بن سکتا تھا۔

لیکن نزہت بضد تھی۔ مجھے اس کی ہٹ سے ڈر لگتا۔ اُس کے ماں باپ کی فکر سے مجھے فکر ہونے لگتی۔ لیکن نزہت بہت کچھ سہنے کو تیار تھی۔ اور میں جب اس کا نازک پیکر دیکھتا تو میں یہی سوچتا رہ جاتا کہ اس پر خار راہ کا ایک ہی کانٹا اس کے نرم پاؤں میں چبھ کر کبھی نہ بھرنے والا زخم بن سکتا ہے ——— میں تو بس اس وقت یہی سمجھا تھا۔ میں نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ میں عورتوں کو پوری طرح سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ یقین ضرور تھا کہ میں نے جو کچھ سمجھا ہے وہی بالکل صحیح ہے اور اسی سمجھ اور عقل کے سہارے میں نزہت کی زندگی سے چپ چاپ نکل آیا ——— بہت مطمئن ہو کر اور یہ سوچ کر کہ اس سے بہتر کوئی فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا ——— میں خوش، نزہت کے ماں باپ مطمئن، اور نزہت ——— .... ؟ بھئی اس کا کیا ہے، کوئی شاندار سا شوہر مل جائے گا، اور کچھ عرصے بعد جب وہ چند خوب صورت سے بچوں کی ماں بن جائے گی تو سب کچھ بھول جائے گی۔

بس میرا یہی کچھ خیال تھا۔ اُسے اور کیا چاہئے ——— ایک شاندار شوہر ——— موٹر، بنگلہ، خوب صورت بچے۔ ایسی دنیاوی جنت تو بڑے بڑے زخم بھر سکتی ہے۔ اور میری یاد کونسا ایسا ناسور ہے کہ رستا ہی رہے۔ خوش گوار زندگی کا ایک جھونکا ہی ایسی فضول یادوں کو بہت دور اُڑا دے گا۔

میں نزہت کی زندگی سے نکل آیا۔ اس سے بہت دور آ گیا ——— اتنی دور کہ مجھے اس کی کوئی اطلاع نہ ملے ——— کوئی خبر نہ رہے۔ آخر مجھے بھی تو اسے بھلانا ہوگا۔ اور مَرد آسانی سے اپنی محبت کو نہیں بھلا سکتے۔ میرا عقیدہ مضبوط تر ہوتا گیا۔ زندگی کے بہت سارے سال بیت گئے، اور میں نزہت کو ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بھلا سکا۔ زندگی اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے گذرتی رہی۔ نہ میں نے کوشش کی اور نہ زمانے نے ہی اتنی عنایت کی کہ میں پپا جیسا مرتبہ حاصل کر سکتا۔ اب مجھے اس کی کوئی خواہش بھی نہ تھی ——— زندگی کو ساری خواہشات سے مبرا کر کے میں نزہت کے دیس سے نکل آیا تھا۔ زندگی گذر رہی تھی صرف ایک یاد کے سہارے۔ صرف نزہت کے تصور کے سہارے ——— !

——— اور وہ اندھیری رات، بارش کا شور اور تنہائی کا بھوت ——— میں گھبرا اُٹھا۔ نزہت کیا کر رہی ہوگی بھلا ——— ؟ کمرے میں ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی ہوگی۔ نزہت کے پہلو میں اُس کا خوبرو شوہر ہوگا۔ اس کا ایک ہاتھ پلنگ سے نیچے لٹک رہا ہوگا۔ نزہت نے اس کو پیار سے دیکھا۔ اور اس کا ہاتھ اٹھا کر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ میں نے اپنا پلنگ سے

نیچے لٹکتا ہاتھ اٹھا کر سینے پر رکھ لیا، اوہ کبھی،

سردیوں کے دنوں میں ہلکی ہلکی دھوپ چمک رہی تھی ——

"نزہت" میں نے اسے پھر یاد کیا۔

لان پر کرسی ڈالے وہ دھوپ کھا رہی ہوگی۔ سردیوں کی چمکیلی دھوپ نے اس کے رخسار دہکا دیئے ہیں۔ نزہت کے ہاتھ تیزی سے سلائیوں پر چل رہے ہیں ننھی منی کئی چیزیں اس نے بُن ڈالی ہیں۔ رنگ برنگے کپڑوں کی سلائی اسے دن بھر مصروف رکھتی ہوگی۔

پتہ نہیں یہ کیا گھر ہے ہر طرف بچے ہی بچے۔ میں تو اس شور سے تنگ آگیا ہوں۔

نزہت کے بچے اُسے کتنا تنگ کرتے ہوں گے۔ روتے ہنستے ان بچوں نے اسے دنیا بھلا دی ہوگی۔ وقار بھلا اب اُسے کیا یاد آئے گا —— بچے اسکول سے آگئے، انہیں کھانا کھلانا ہے —— منے کا بخار کم ہی نہیں ہوتا۔ آج ڈاکٹر کو بلا کر اُسے دکھانا چاہئے —— ایسی ہی چھوٹی چھوٹی فکریں اسے ستاتی رہتی ہوں گی۔

جگ بیت گئے!

میں نے آئینہ دیکھا۔ تمام سر چاندی کے تاروں سے جگمگا رہا تھا۔ لو بھئی، بھلا اب نزہت آپ کو کیا یاد کرتی ہوگی وقار صاحب۔ میں نے اطمینان کا سانس لینا چاہا۔ لیکن جانے کیوں مجھے دکھ ہوا۔ یہ احساس کہ نزہت نے مجھے بھلا دیا ہوگا مجھے خوش نہ کر سکا۔ جب کہ میری یہی کوشش رہی ہے کہ یوں ہی ہو جائے۔

زندگی کے اتنے بہت سارے دن بیت گئے۔ نزہت وقار کو بالکل بھول چکی ہوگی، اور اب میری زندگی کا سرمایہ نزہت کی یادیں، نزہت کا تصور ہی ہے۔ مرد اپنی محبت کو آسانی سے نہیں بھلا سکتا۔ میرے نظریئے کو خود میرے خیالات اور احساسات نے تقویت دی۔

جُگ بیتے اور میں یہی چاہتا رہا کہ میں نزہت سے نہ ملوں، لیکن اب میرا دل اسے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ بڑے بڑے باشعور بچوں کی ماں۔ اب وہ ایک باوقار خاتون لگتی ہوگی —— میرے دل میں ہوک سی اٹھتی۔ میں اُسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے بھلا دیا، لیکن میں اسے نہیں بھلا سکا —— صرف یہی آرزو رہ گئی تھی کہ میں نزہت کو دیکھ لوں۔ زندگی سے میں نے بہت کم کسی بات کی خواہش کی ہے۔ دل نے جو بھی مانگا میں نے صاف انکار کر دیا۔ خواہشات کی تکمیل بہت کم میرا مقصد رہا ہے۔ لیکن یہ خواہش شدت اختیار کر رہی ہے اور میں سر پر لگے جیسے سفید بال سجائے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو رہا ہوں۔ اس عمر کو پہونچ کر انسان یوں بھی کمزور دل کا ہو جاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ زندگی کے اور کتنے دن رہ گئے ہیں، اور مجھ ایسا نامراد بھی بھلا کوئی کیا ہوگا دنیا میں؟

لیکن اس خواہش کو پورا کرنا بھی میرے لئے اچھا خاصا مشکل مرحلہ تھا۔ میں نزہت سے اتنا زیادہ دور ہو گیا تھا، کہ اس تک پہونچنا آسان نہ رہا تھا —— مجھ ایسے تہی دست انسان کے لئے۔ میں جس نے پیسے کی کبھی قدر نہ کی، ایک ایک پیسہ دانت میں پکڑنے لگا۔ اور پھر میں نزہت کے لئے بھی کچھ لینا چاہتا تھا۔ کوئی ایسی چیز جو اس باوقار خاتون کو زیب دے۔ کوئی انمول اور قیمتی چیز —— ایک ایک دن میرے لئے پہاڑ بن گیا تھا۔ اور دل بچوں ایسی خواہشات کا اظہار کر رہا تھا۔ میری سمجھ میں

نہ آتا تھا کہ میں نزہت سے ملنے کیوں جا رہا ہوں۔ اُسے کوئی تحفہ دینا کیوں چاہتا ہوں۔ اب اتنے برسوں بعد بھلا یہ باتیں کتنی غلط تھیں، لیکن میں نے اپنے دل کو آزاد چھوڑ دیا تھا، اور آج کل صرف دل کا کہا ماننا میرا شعار ہو کر رہ گیا تھا۔ یوں تو یہ حماقت بھی میرا مقدر تھی۔ میں سوچتے سوچتے مسکرا دیا۔

دن بیتتے گئے اور میں یہ فیصلہ ہی نہ کر پاتا تھا کہ نزہت کے لئے کون سی چیز لوں۔ رات گئے تک بازاروں میں گھوما کرتا۔ سیکڑوں چیزیں جگمگاتی شوکیسوں میں سجی ہوئی نظر آتیں، لیکن میری نظر کسی چیز پر جمتی ہی نہ تھی۔ دنیا کی ہر شے حقیر معلوم ہوتی تھی، اور میں پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔

جن راہوں نے مجھے نزہت سے جُدا کیا تھا، ان پر چل کر جب میں نزہت کے دیس واپس ہو رہا تھا، تو مجھے قطعی یہ احساس نہ رہا تھا کہ زمانہ کتنا بدل گیا ہے اور میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ خواب کی سی حالت میں چلتا ہوا میں نزہت کی کوٹھی کے سامنے جا پہونچا۔

امتداد زمانہ سے سرخ پتھروں کی بنی ہوئی اس عمارت کا حسن لٹ چکا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک شان باقی تھی۔ نزہت بھی بالکل ویسی ہی ہوگی — سنجیدہ — لُٹی لُٹی، لیکن پھر بھی بڑی باوقار — میں نزہت کے بالکل قریب پہونچ چکا تھا۔

کوئی بھی تحفہ مجھے نزہت کے لئے نہ جچا تھا، اور میں نے سارے جمع کئے ہوئے پیسے ایک فقیر کی جھولی میں ڈال دیئے تھے۔ نزہت کو بھلا میری کسی چیز کی کیا ضرورت ہوگی۔ میں نے تھک کر سوچا، اور پھر ان دنوں کا تصور کر کے جب میں اور نزہت ساتھ ساتھ تھے میں نے ایک بڑا سا سُرخ گلاب لے لیا (نزہت کو سُرخ گلاب بے حد پسند تھے)

میں اجنبی اجنبی سا کوٹھی کی روش پر چل رہا تھا۔ نئی پڑی ہوئی سرخ بجری میرے قدموں تلے زور زور سے بول رہی تھی۔ میرا یہ سفر کتنا طویل تھا۔ میں ایک دوسری دنیا کی حدوں کو پھلانگ کر آیا تھا۔ اور سُرخ پتھروں والی درختوں سے گھری ہوئی اس عمارت کا پرسکون ماحول میرے تھکتے ہوئے سفر کی منزل ثابت ہو رہا تھا۔ جانی پہچانی راہیں میرے قدموں تلے تھیں، اور میں ان پر یوں سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا کہ ایک مدّت بعد یہ سعادت مجھے نصیب ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس گھر میں میں کسی کو بھی پہچان نہ سکوں گا۔ لیکن نزہت کو تو ایک ہی نظر میں پہچان لوں گا۔ وہ میرے تصورات میں ہر ہر تبدیلی کے ساتھ رہی ہے۔ نزہت ایک باوقار خاتون کے روپ میں ہوگی میرے تصور نے مجھے سہارا دیا۔

برآمدہ طے کر کے میں کمروں تک جا پہونچا۔ سُرخ پھولدار دبیز پردے بالکل ساکت تھے، اندر سے کسی کے بولنے کی آواز آ رہی تھی —

"نزہت کی آواز" میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

"میں تمہیں کیونکر یقین دلاؤں کہ میں وقار صاحب جیسا کم ہمت نہیں فرحت۔ تم نزہت باجی کے سے انجام سے ڈرتی ہو لیکن یہ سوچ لو کہ میں وقار نہیں عارف ہوں۔ مجھ میں حالات کو بدلنے کی ہمت ہے اور میں اپنی اس حالت سے وقار صاحب کی طرح ڈرتا نہیں، مجھے یقین ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ اور تم ان حالات میں بھی میرا ساتھ دو گی۔ کم مائگی کوئی جرم نہیں فرحت کم ہمتی جرم ہے"

یہ آواز بڑی گھن گرج کے ساتھ میرے کانوں سے ٹکرائی۔ زمین نے میرے قدم پکڑ لئے۔ "نزہت باجی کا سا انجام" میں

لرز کر رہ گیا —

" عارف بس میں نزہت باجی کے سے انجام سے ڈرتی ہوں۔ مجھے زندگی سے بہت محبت ہے اور میں یہ زندگی تمہارے ساتھ بسر کرنا چاہتی ہوں۔ میں نزہت باجی کی طرح مرنا نہیں چاہتی، لیکن اگر وقار صاحب کی طرح تم بھی مجھے چھوڑ دو گے تو میں کیا کروں گی۔ میں نزہت باجی نہیں بننا چاہتی۔ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ لیکن عارف تم مجھے اتنے کم ہمت نہیں دکھائی دیتے۔ تمہاری آنکھوں میں ہمت و استقلال کی چمک ہے اور بس ...... بس میں یہی چاہتی ہوں "

فرحت، نزہت کی سی آواز میں بول رہی تھی۔

سُرخ گلاب میرے ہاتھ میں مسلا جا چکا تھا۔ اور میں واقعی کم ہمت آدمیوں کی طرح اس باہمت جوڑے کو مبارکباد دیئے بغیر لوٹ آیا۔

نزہت! تمہیں شاندار شوہر، موٹر، بنگلہ، اور پیارے پیارے بچے کوئی بھی نہ روک سکا۔ اور میں نے کیا سوچا تھا — میں ساری زندگی ایک غلط فیصلے کی بناء پر نزہت کی یاد کا سایہ ساتھ لئے پھرتا رہا، اور نزہت بہت پہلے مجھے چھوڑ چکی تھی۔

میرا جی چاہا کہ خوب قہقہے لگاؤں کہ میرے تصورات نے نزہت کو کس کس روپ میں دیکھ لیا — نزہت تو سوئی ہوئی کلی کی طرح ہی یہاں سے رخصت ہوئی۔ اور عارف مجھے کم ہمت کہتا ہے — فرحت، نزہت باجی کے سے انجام سے ڈرتی ہے۔ قہقہے میرے وجود سے لپٹ کر رہ گئے ہیں۔ بچے میرے پیچھے پتھر لے کر دوڑتے ہیں۔

" سنگساری " میری سزا پھر بھی کم ہے۔

مجھے سب سے پہلا پتھر عارف جیسے باہمت جوان کا لگنا چاہیئے۔ لیکن میں اب اُسے ڈھونڈنے کہاں جاؤں۔ اس کی تو صرف آواز سنی ہے میں نے۔ اور مجھے اس سے یہ بھی تو پوچھنا ہے کہ اگر میں کم ہمت ہوں تو اب تک زندہ کیسے ہوں؟

انور سدید

# مرزا غالب سرگودھا میں

## بیادِ غالب

مشاعرے کا اعلان ہوا تو مرزا غالب کے ہمدم دیرینہ میر مہدی مجروح نے انہیں لکھا:

"اے حضرت! یہ کیا غضب ہے کہ آپ سرگودھا کے مشاعرے میں شریک ہوں اور ہمیں اطلاع تک نہیں"

مرزا مرحوم اُس وقت عالم بالا میں میوجی سے دل بہلا رہے تھے۔ میر مہدی مجروح کی یہ اطلاع ان کے لئے بالکل اچنبھا تھی۔ انہوں نے خط حیرت سے پڑھا۔ صراحی اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔ قلم تھاما اور جواب لکھنے لگے:

"میرن صاحب حضور! کیوں مجھ بڈھے کو پیری کے عالم میں رُسوا کرتے ہو۔ کہاں کا مشاعرہ اور کیسی شرکت! قسم لے لو جو میں نے کبھی ایسا وعدہ کیا ہو۔ واللہ یہ گناہ غالب مرحوم سے کبھی سرزد نہ ہوگا"

تب میر مہدی نے انہیں وہ پوسٹر ارسال کیا جس میں مرزا کی اجازت کے بغیر یہ اعلان کیا گیا تھا کہ: مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی اپنے تمام معاصر شعراء، مومن، ذوق، علائی اور شیفتہ وغیرہ کے ساتھ "کاروان مشاعرہ نمبر ۱۹ام" میں شرکت کریں گے۔ مشاعرہ ایک رفاہی مقصد کے لئے منعقد ہو رہا تھا۔ اور اس کی ساری آمدنی انسداد مادہ پرستی کی انجمن کو دی جانی تھی۔

مرزا غالب نے اشتہار کا متن پڑھا تو کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ انگریزی سرکار سے پنشن کبھی کی بند ہو چکی تھی۔ رام پور سے جو وظیفہ ہر ماہ ملتا تھا، اب کے اس میں بھی تاخیر ہو رہی تھی۔ ہنڈوی کے بھروسے پر قرضداروں سے وعدہ جون کے اوائل کا تھا، لیکن دس تاریخ تک ادائی کی کوئی صورت نہ نکلی تو تقاضے بڑھنے لگے۔ ایسے میں ان کی نظر اشتہار کے آخری حصے پر پڑتی اور دیر تک نہ ہٹتی۔ منتظم مشاعرہ نے نوید دی تھی کہ اخراجات وضع کرنے کے بعد اگر کچھ رقم بچ گئی تو تمام شعراء کو حسب رُتبہ معاوضہ دیا جائے گا۔ مرزا کو اپنے مرتبے کا پاس تھا۔ اس لئے انہوں نے کاروباری پہلو پر بات چیت مناسب نہ سمجھی

البتہ احتیاج کے پیشِ نظر مشاعرے میں شرکت کا ارادہ کر لیا۔

تپتی ہوئی جون کی وہ شام سرگودھا کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی جب مرزا غالبؔ مشاعرے میں شرکت کے لئے یہاں تشریف لائے۔ انہوں نے آتے ہی اپنے یارِ غار نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ کو پوچھا تو معلوم ہو کہ وہ نہیں آئے۔ مومن اور علائی کی شکل بھی نظر نہ آئی۔ ذوق کا صرف خط موصول ہوا تھا کہ وہ شاہ کی اجازت کے بغیر کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوتے۔ منتظمِ مشاعرہ کو لے دے کے مرزا کی ذات ہی غنیمت نظر آئی، کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی ادب کی شمع روشن کئے ہوئے ہے۔ اور عالمِ بالا سے سرگودھا تک کا سفر انہوں نے خدمتِ ادب کے صادق جذبے کے تحت طے کیا تھا۔ مرزا نے سوچا، محفل میں نہ شیفتہ ہیں نہ مومن، تفتہ، حالی اور مہدی مجروح بھی نہیں پڑھنے کا خاک لطف آئے گا۔ لیکن اسی لمحے انہیں اپنی احتیاج اور متوقع معاوضے کا خیال آ گیا تو مصلحتاً خاموش ہو گئے۔

ایک تو مرزا غالبؔ کا نام نامی، دوسرے گرمی کا فارغ مہینہ۔ سامعین سے ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ اندرونِ شہر کے تمام شاعروں نے شرکت کی۔ مشاعرہ خوب جما اور منتظمِ مشاعرہ نے بھی سب کو پڑھنے کا وافر موقع فراہم کیا۔ مرزا سفر کی تکان سے بے حال ہو رہے تھے۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ گئی تھی۔ آنکھوں میں نیند بری طرح اتری ہوئی تھی، لیکن اپنی وضعداری اور آدابِ محفل کے خیال سے چپ تھے۔ ۸۱۴ شاعر پڑھ چکے تو منتظمِ مشاعرہ نے غالبؔ کی زمین میں غزل سنا کر مرزا پر جاں کنی کا عالم طاری کر دیا۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ اب مرزا کی باری قریب ہے۔ چنانچہ انہوں نے انگرکھا سنبھال کر "کے ٹو" سگریٹ کے دو چار کش ہی لئے تھے کہ مائیکروفون سے ان کا نام پکارا گیا۔

مرزا غالبؔ نے پہلے "عرضِ حال" کے خیال سے ایک قطعہ عطا کیا۔

شہر سرگودھا میں آنے کا سبب کیا کہئے
ہوسِ سیرِ تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
"لئے آئی ہے یہاں" ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

منتظمِ مشاعرہ نے مرزا کے یہ تیور دیکھے تو گھبرائے اور ان کا رُخ غزل کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ اب مرزا غزل سرا تھے اور مشاعرہ داد کے ڈونگروں سے گونج رہا تھا۔ مرزا نے کئی غزلیں سنائیں اور ہر شعر بیسیوں مرتبہ مکرر سنا گیا۔ نصف شب کے قریب جب مرزا مائیکروفون سے ہٹے تو ان میں پڑھنے کی سکت نہیں تھی، لیکن سامعین کا ذوق تشنہ اور اصرار باقی تھا۔

جب سب لوگ رخصت ہو گئے تو ہال میں چند شعراء معاوضے کے انتظار میں بیٹھے رہ گئے۔ مرزا غالب بھی للچائی ہوئی نظروں سے منتظمِ مشاعرہ کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کسی کو پان پر، کسی کو سگریٹ پر اور کسی کو دو چار روپوں پر قناعت کی تلقین کر رہے تھے۔ مرزا سے آنکھیں چار ہوئیں تو ایک کھسیانی ہنسی ان کے ہونٹوں پر ابھر آئی۔

سلے حضرت! آپ نے خط کی رسید ہی نہ بھیجی۔ میں تو بالکل مایوس ہو چکا تھا۔

دیکھئے آپ کے سب معاصر بھی دھوکا دے گئے۔ اسی عالم میں میں نے آپ کے واجبات
بھی مشاعرے کے بجٹ سے کاٹ ڈالے۔ لیجئے ایک سگریٹ پیجئے۔ واللہ کیا غزلیں کہی
ہیں آپ نے۔ واہ وا۔"

مرزا ٹھہرے سادہ آدمی۔ اس دل پذیر تقریر کا مطلب نہ سمجھ سکے تو خود ہی حرفِ مطلب زبان پہ لے آئے، اور بولے:
"شیخ صاحب قبلہ! کچھ معاملے کی بات چیت ہو جاتی تو فقیر۔۔۔۔۔۔"

"وہ تو میں عرض کر چکا حضور کہ آپ نے دعوتِ مشاعرہ کی قبولیت کی اطلاع ہی نہیں دی۔ یہ ضابطے کی بات ٹھہری اس لئے معاوضہ پیش کرنے سے معذور سمجھئے۔ رہا زادِ سفر تو لیجئے دس روپے۔ اور تمام قیام حاضرِ خدمت ہے آپ کو اسٹیشن پر پہونچا دے گا۔ اجازت چاہتا ہوں۔ سلام علیک۔۔۔۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے منتظم مشاعرہ نے اپنی نئی اچکن کی اوپری جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا۔ مرزا کو تھمایا اور تیزی سے یہ جا وہ جا۔ مرزا بے چارے پرانے زمانے کے وضعدار بزرگ تھے۔ یہ بھی نہ کر سکے کہ دوسرے شاعروں کی طرح منتظم کی جیب سے بٹوہ ہی چھین لیتے۔ کچھ دیر آنکھیں نیچی کئے اس ہنگام پر غور کرتے رہے۔ پھر اطراف و جوانب نگاہ دوڑائی تو سارا ہال خالی ہو چکا تھا۔ یہ دیکھ کر گھبرائے۔ پیٹ میں بھوک سے چوہے دوڑ رہے تھے۔ پیاس سے بُرا حال ہو رہا تھا اب ایک اور خدشہ یہ لگا کہ رات کہاں بسر ہوگی؟

اسی پریشانی میں اٹھے اور کچہری بازار کی طرف چل پڑے۔ جہاں ایک روزنامے کے دفتر میں اخبار کی آخری کاپی تیار ہو رہی تھی۔

اخبار کے ایڈیٹر نے اپنے سامنے مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اس ہیئت کذائی میں دیکھا تو سخت متأسف ہوا، اور فوراً دو کوکا کولا منگوانے کا آرڈر دے دیا۔ تب مرزا کی جان میں جان آئی، اور انہیں احساس ہوا کہ ؏

"ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں"

مرزا نے مشاعرے کے منتظم کے خلاف ایک احتجاجی بیان دینا چاہا تو یہ اشعار بے اختیار زبان پر آگئے

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی
جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیا کسی کا گلہ کرے کوئی

غیر مطبوعہ تذکرۂ انوری میں لکھا ہے کہ مرزا کی یہ غزل ان کے ورودِ سرگودھا کی یادگار ہے، اور ان کے جذبات کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔

نسیم شاد

# پھول اور سمندر

"جمیلہ اب تک کیوں نہیں آئی؟"

پیٹر تھامسن اپنی کرسی پر سیلہ جینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے" سین سیمون نے سگار سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

"اُسے اب تک آجانا چاہئے تھا"

"جمیلہ تو وقت کی بڑی پابند ہے" رچرڈ پال بولا۔

نوجوان روسی انجینئر کیری لوف "وودکا" کی چسکیاں لے رہا تھا۔ وہ پیٹر تھامسن کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔

"ہمیں پریشان نہ ہونا چاہئے جمیلہ آتی ہی ہوگی"

"آج سے پہلے وہ کبھی دیر سے نہیں آئی" پیٹر تھامسن نے اس سے کہا۔

"آج اُس کا ابھی تک نہ آنا کسی خاص بات کو ظاہر کرتا ہے"

"تم امریکیوں میں صبر و تحمل تو ہوتا ہی نہیں" کیری لوف نے اسے تنک کر جواب دیا۔

"معمولی سی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا تم امریکیوں کی خاص عادت ہے۔ جمیلہ کو کوئی کام ہوگا۔ تھوڑی دیر میں آجائے گی۔ بھلا اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

کیری لوف کے جواب پر پیٹر تھامسن کا تانبے کی رنگت ایسا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اُس نے اپنا پالی حال کا لمبا سا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا، اور کرسی پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے غصے سے بولا۔

"تم روسیوں کو بات کرنے کی تمیز کب آئے گی۔ نہ موقع دیکھتے ہو نہ محل، بس اپنی ہی ہانکنے لگتے ہو"

"اور ہماری بات پر مشتعل ہو کر تم لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہو ــــ کیوں ٹھیک ہے نا" کیری لوف نے نہایت اطمینان سے کہا اور سگریٹ کے کش لینے لگا۔

"پلیز ــــ پلیز ــــ" سین سیمون کھڑا ہوگیا۔

"ہم لوگ یہاں لڑنے کے لئے تو اکٹھا نہیں ہوئے ہیں دوستو۔ شام کو رنگین اور دلچسپ بنانے آئے ہیں۔ لڑو مت۔ شراب پیو اور شام کے گنوارے حسن سے لطف اٹھاؤ۔"

سین سیمون کی بات پر کیری لوف نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ تھامسن کی طرف بڑھا دیا۔ تھامسن نے سرد مہری سے ہاتھ ملایا، اور سگریٹ سلگا کر دھواں منتشر کرنے لگا۔

زندگی کے بارے میں مختلف نظریات وعقائد رکھنے والے ان چار غیر ملکیوں کو ایک مرکز پر لانے والی جمیلہ تھی۔ وہ ان چاروں کی مشترکہ دوست تھی، اور یہ سب اس سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔

جمیلہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کی مہکتی ہوئی نازک جوانی اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی تھی۔ لیکن اپنے طبقے کی دیگر لڑکیوں کی طرح اس کی خوب صورتی کسی جنسی اشتہار کا سائن بورڈ نہیں تھی۔ جمیلہ کا تعلق معاشرے کے اس طبقے سے تھا، جہاں ارل اسٹینلے گارڈنر کے ناول اور نیم عریاں تصویروں والے امریکی میگزین پڑھنا اعلیٰ ذوق اور گہرے مطالعے کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطالعہ اس سے بھی زیادہ تھا۔ اردو ادب کے علاوہ غیر ملکی ادب پر بھی اس کی گہری نظر تھی، اور وہ اپنے مطالعے کی بدولت اقتصادیات، معیشت اور عالمی سیاسی حالات کا باآسانی تجزیہ کرسکتی تھی۔ وسیع مطالعے نے اس کی شخصیت کو پروقار بنا دیا تھا۔

یوں تو جمیلہ کے چاروں غیر ملکی دوست اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ لیکن اس کی سیاہ لمبی آنکھوں کے وہ دیوانے تھے۔ جمیلہ کی آنکھیں واقعی بہت خوب صورت تھیں، یوں لگتا تھا جیسے وہ شراب کی جھیلیں ہیں۔ جو ان میں دیکھتا نشے میں ڈوبتا ہی چلا جاتا۔ واقعی اس کی سیاہ آنکھوں میں بلا کی سحر انگیزی تھی۔

سین سیمون پر جب کبھی رومانی موڈ طاری ہوتا تو وہ بڑے جذباتی لہجے میں کہا کرتا تھا۔

"میں جمیلہ کی آنکھوں میں فرانس کی پرانی شرابوں کے سمندر کو موجیں مارتے دیکھتا ہوں"

جب کبھی اس کے منہ سے یہ جملہ نکلتا تو خالص برطانوی نژاد رچرڈ چیپال فوراً ہی بول اٹھتا،

"اور مجھے جمیلہ کی آنکھوں میں لندن کی راتوں کا افسوں تیرتا دکھائی دیتا ہے"

"جمیلہ کی آنکھوں میں ماسکو کے آسمان پر سرِ شام نکل آنے والے ستاروں کی چمک پائی جاتی ہے"

کیری لوف کہتا۔

پیٹر تھامسن اس موقع پر ہمیشہ پال مال کا لمبا سگریٹ سلگا کر اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کسی رومانی جملے کو یاد کرنے کی کوشش کرتا اور جب اس میں ناکام رہتا تو جھٹ سے بول اٹھتا۔

"تمہاری آنکھیں واشنگٹن کی طرح ہیں"

جب تک جمیلہ ان کے سامنے ہوتی تو یہ لوگ ایسی کوئی بات نہ کرتے جس سے ایک دوسرے کی دل شکنی ہوتی ہو۔ لیکن اس کی غیر موجودگی میں اکثر اوقات ایک دوسرے پر جملے کستے، اپنے اپنے نظریات ٹھونسنے کی کوشش کرتے۔ اور کبھی کبھی تلخ کلامی پر بھی اتر آتے۔

اس وقت پیدا ہو جانے والی تلخی کو دور کرنے کی غرض سے سین سیمون بولا:

"ووڈکا" "ووڈکا" میں جیتن بیئر اور ماسکا پچ وہسکی ملا کر پیو تو ایک عجیب قسم کی کاک ٹیل بن جاتی ہے:"

"میں یہ تجربہ کئی بار کر چکا ہوں" رچرڈ پال نے جھٹ سے جواب دیا۔

سین سیمون ابھی اسے کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ کیری لوف بول اٹھا۔

"جمیلہ آ رہی ہے"

اس کے اس جملے پر وہ چاروں اپنی اپنی کرسیوں پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔

جمیلہ اُن کی طرف آ رہی تھی —— اُس نے ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ اور تقریباً اسی رنگ کا بلاؤز تھا، اور اُس کے حُسن کی سادگی نیلے رنگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"ہیلو جمیلہ"

"ہیلو——"

جمیلہ نے ڈینٹی بیگ اپنے مخصوص انداز میں لہرایا اور کرسی کھسکا کر اس پر بیٹھتے ہوئے تھامسن سے مخاطب ہوئی۔

"کیوں پیٹر کیا بات ہے۔ تم کچھ بجھے بجھے سے دکھائی دے رہے ہو؟"

پیٹر تھامسن نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا، اور خاموشی کے ساتھ پال مال کا ایک نیا سگریٹ سلگانے کے بعد کیری لوف کی طرف دیکھنے لگا۔

جمیلہ تھامسن کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی تو اس کے ہونٹوں کی لالی شفق کی سرخی بن کر اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

"بیوتی، بیوتی —— آہ فرانس میرے خوشبوؤں اور رنگوں کے حسین دیس —— جمیلہ، تم میرے ساتھ ایک بار فرانس ضرور چلنا"

"ہاں سیمون، میں تمہارے ساتھ فرانس ضرور چلوں گی" جمیلہ نے کہا۔ "میں انقلابی فلسفیوں کی سرزمین دیکھنے کی بےحد مشتاق ہوں"

پال جانتا تھا کہ اب بات کدھر مڑے گی، اس لئے وہ فوراً بول اٹھا۔

"جس وقت فرانس میں انقلاب کی آندھی چل رہی تھی اس وقت انگلستان میں ایک خاموش اور انقلابی عمل ترقی پذیر تھا"

"اور اس موقع پر انتیس برس کا ایک نوجوان رابرٹ اوڈین ظاہر ہوا تھا" جمیلہ پال کی بات کاٹتے ہوئے بولی "جس نے فرانسیسی فلسفیوں کے اس خیال کو اپنا لیا تھا کہ انسانی کردار موروثی حیثیت اور ماحول کی پیداوار ہے۔ اس وقت صنعتی انقلاب کی وجہ سے انگلستان میں انتشار اور ابتری پھیلی ہوئی تھی اور وہاں کے سرمایہ دار موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنا چاہتے تھے، لیکن اوڈین اپنے عمل اور کردار کے ذریعے اس انتشار کو استحکام میں بدلنا چاہتا تھا"

جمیلہ نے اپنی بات ختم کی تو کیری لوف "ووڈکا" کا آخری گھونٹ لے کر گلاس خالی کرتے ہوئے بولا:

"تم کتنی پڑھی لکھی لڑکی ہو" وہ ایک لمحے کے لئے رکا اور اس کو گھورتے ہوئے کہنے لگا "تمہارا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ تم نے پشکن اور چیخوف کو بھی پڑھا ہوگا؟"

"ہاں" —— جمیلہ نے اسے جواب دیا —— "میں نے سارے حقیقت پسند روسی ادیبوں کو پڑھا ہے۔ مجھے یاد ہے۔ چیخوف

نے لکھا تھا ــــ میں صرف جینا چاہتا ہوں، خواب دیکھنا چاہتا ہوں، آرزوئیں کرنا چاہتا ہوں، اور کوئی چیز چھوڑ دینا نہیں چاہتا۔ میرے دوست زندگی بڑی مختصر ہے اور ہمیں اس کا زیادہ سے زیادہ فیض اٹھا لینا چاہئے ........"

جمیلہ بولتے بولتے رک گئی اور تھامسن کی طرف دیکھنے لگی۔

چند لمحوں کے لئے وہاں خاموشی چھا گئی۔

جمیلہ نے اس خاموشی کو توڑا اور کہنے لگی:

"اگر چیخوف زندہ ہوتا تو وہ دیکھتا کہ اس خوب صورت زمین پر زندہ رہنا، خواب دیکھنا، اور آرزوئیں کرنا کتنا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانوں میں حیوانیت اور بربریت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ "صرف اپنے ہی لئے جیو" کے فلسفے نے انسان کو غاصب بنا دیا ہے۔"

"پال، ــــ اُس نے رک کر پال کو مخاطب کیا۔

"ہاں" ــــ وہ فوراً بول اٹھا۔

"کیا ہم سب دنیا میں ایک نہیں ہو سکتے ــــ؟"

جمیلہ اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد ان کے چہروں کو گھورنے لگی۔

وہ چاروں خاموش تھے، اور نظریں جھکائے میز کو گھور رہے تھے۔ ماحول پر ایک گہرا سکوت طاری ہو گیا جس میں ڈوبے وہ چاروں شاید جمیلہ کے سوال پر غور کر رہے تھے۔

اس خاموشی میں کئی منٹ گذر گئے۔

تھوڑی دیر بعد جمیلہ پھر بولی۔

"خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ میں کتنی دیر سے یہاں بیٹھی ہوں اور تم لوگوں نے میرے لئے کچھ نہیں منگوایا۔"

"ووڈکا پیوگی تم؟" کیری لوف نے پوچھا۔

"نہیں" جمیلہ نے جواب دیا۔ "تم جانتے ہو میں شراب نہیں پیتی۔"

"او ــــ میرا خیال ہے تمہیں سگار کا دھواں بھی ناگوار گذرتا ہوگا" سین سیمون نے سگار بجھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ــــ نہیں تو ــــ" جمیلہ ہنستے ہوئے بولی ــــ "سگریٹ اور سگار کا دھواں تو فضا کو باوقار بنا دیتا ہے۔"

جمیلہ کی اس بات پہ وہ سب ہنسنے لگے۔

تھامسن بولا: "میں تمہارے لئے کوکا کولا منگواتا ہوں۔"

"ہوں ــــ کوکا کولا اس لئے کہ اسے ایک امریکن فرم تیار کرتی ہے۔ تم جمیلہ کے لئے پاکولا بھی منگوا سکتے ہو" ــــ کیری لوف نے کہا۔

تھامسن کا چہرہ ایک بار غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا۔

پال نے جلدی سے اسکاچ وہسکی کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق میں اُتار لیا۔

"نو پالیٹکس پلیز" ــــ سین سیمون بولا ــــ "نو پالیٹکس میرے دوستو ــــ ایسی خوب صورت اور رومانی شام کو ان فضول باتوں

سے اداس مت بناؤ۔ اس کے حسن کو محسوس کرو اور خوش رہو۔"

"ہاں ٹھیک ہے —— سین سیمون ٹھیک کہتا ہے۔" جمیلہ بولی۔ "میرے دیس کی شامیں بڑی خوب صورت ہوتی ہیں اور اس کے آنچل پہ لہراتے ہوئے ستاروں کی روشنی میں جب رات اپنا سیاہ ریشمی دامن پھیلائے کنواریوں کی طرح لجاتی ہوئے چاروں طرف پھیلنے لگتی ہے تو بے اختیار ریشلے اور کیٹس کی نظمیں یاد آجاتی ہیں۔"

سین سیمون جمیلہ کی بات ختم ہوتے ہی بہت افسردہ لہجے میں بولا۔

"ایسی خوب صورت شاموں میں مجھے پیرس بے اختیار یاد آتا ہے۔"

"مجھے نیویارک کی ہنگامہ پرور زندگی اور وہاں کے آسمان کو چھوتی ہوئی روشنیاں بے چین کر دیتی ہیں۔" پیٹر تھامسن نے کہا۔

"اور میں ماسکو کو یاد کرتا ہوں۔ پشکن اور ترگنیف کا ماسکو۔ میرا ماسکو —— !"

"لندن میرے پیارے لندن —— !!"

رچرڈ پال نے کہا اور پائپ سلگا کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔

"تم سب اداس ہو؟" جمیلہ نے پوچھا۔

اس کی بات کا ان میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"آؤ کہیں گھومنے چلیں۔" جمیلہ نے تجویز پیش کی۔

"ہاں —— یہ ٹھیک ہے، آؤ گھومنے چلیں ——" پیٹر تھامسن اٹھتے ہوئے بولا۔

"مگر چلیں کہاں؟" رچرڈ پال نے پوچھا۔

"ہاکس بے۔" سین سیمون نے کہا۔

"آج وہاں کیا دھرا ہوگا —— وہاں تو ہفتے یا اتوار کو جانا چاہئے۔" رچرڈ پال بولا۔

"ہمیں اس سے کیا غرض کہ وہاں کوئی اور ہوگا یا نہیں۔ ہم تو ہوں گے وہاں۔" کیری لوف نے کہا۔

"ہاں، اب اٹھو جلدی کرو۔" جمیلہ پھر بولی۔

وہ سب کے سب اٹھ گئے۔

وہ پانچوں سمندر کے کنارے کھڑے تھے۔

رات زیادہ نہیں ڈھلی تھی، تاہم ویران ساحل پر پھیلے ہوئے سناٹے کو دیکھ کر یوں لگتا تھا، جیسے یہ رات کا پچھلا پہر ہو۔ دور، سمندر کے پار ابتدائی راتوں کا میلا چاند اس کے سینے میں اترا ہوا تھا، اور ملگجے اندھیرے میں ٹمٹماتے ہوئے تاروں کے نیچے وہ پانچوں چپ چاپ کھڑے کچھ سوچ رہے تھے۔

جب انہیں اسی طرح خاموش کھڑے خاصی دیر گذر گئی تو جمیلہ سے نہ رہا گیا، اور وہ خاموشی کو توڑتے ہوئے بولی:

"یہ خاموشی کس لئے —— ہم یہاں اپنے کسی دوست کی موت کا ماتم کرنے تو نہیں آئے ہیں؟"

"ہاں ہاں" ہکتے ہوئے پال نے پائپ سلگا لیا —

"ذرا ماچس تو دینا" تھامسن نے پال سے کہا۔ "میں اپنا لائٹر بھول آیا ہوں۔"

"سیمون تم چپ کیوں ہو؟" جمیلہ نے سین سیمون سے پوچھا۔ "تم رات کے شاعرانہ حسن کو محسوس نہیں کر رہے ہو۔؟"

"میں اسے محسوس کر رہا ہوں" سیمون نے بے دلی سے کہا۔ "رات ایک آبنوسی ہتھیلی کی طرح خوب صورت ہے اور اس پر تاروں کے کنول روشن ہیں — پر مادام میں اُداس ہوں —!"

جمیلہ نے اُس کے آخری جملے پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اور بولی:

"دیکھو بوڑھا سمندر اپنے سینے کی گہرائیوں میں دفن صدیوں پرانے سربستہ رازوں کو اگل دینے کے لئے زمین کی طرف بڑھ رہا ہے — بابل و نینوا کے کھنڈرات کے راز، دجلہ و فرات کی وادیوں کے قصے، مغرور فرعونوں کے مصر کی کہانیاں، یونان کے عظیم المرتبت شہنشاہوں کے مظالم اور روم کے بردہ فروشوں کی خوں چکاں داستانیں، کیا کچھ ہے جو اس بوڑھے کے سینے میں محفوظ نہیں —؟"

"ہاں مادام" — سین سرد آہ بھرتے ہوئے بولا — "مگر سمندر کو دیکھ کر مجھے فرانس یاد آتا ہے — فرانس، میرا رنگوں اور خوشبوؤں کا دیس — انقلابوں کی سرزمین اور رومانوں کا گہوارہ — میں ان پُرشور موجوں کے پیچھے پیرس کے باغات دیکھ رہا ہوں مادام جہاں ان کے کنجوں میں اس وقت نہ جانے کتنے دل دھڑک رہے ہوں گے — میں بہت اداس ہوں مادام —!"

"کیوں — تم کیا کہتے ہو —" جمیلہ نے مسکراتے ہوئے پال سے پوچھا۔

"یہ سمندر اپنی لہروں کے ساتھ انگلستانی موسیقی کی دل نواز دھنیں لا رہا ہے۔ اور مجھ میں وطن سے دوری کا احساس شدید ہوتا جا رہا ہے۔ اسی لئے میں بھی اداس ہوں" — پال نے جواب دیا۔

"دیکھو، دیکھو، سنو —" کیری نوف پال کی بات ختم ہوتے ہی بول اٹھا — "سمندر کے سینے میں ماسکو کے ہزاروں کارخانوں کا شور موجزن ہے اور اس میں مایئکافسکی کی نظموں کی گونج ہے۔ اور یہ ہمارے دیس کے کروڑوں مزدوروں، کسانوں کے دلوں کی دھڑکنیں لئے آگے بڑھ رہا ہے:"

پیٹر تھامسن نے سگریٹ سلگائی اور اس کا کڑوا دھواں اُگلتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"اس سمندر کے پیچھے روشن امریکہ ہے، اور یہ ہماری دوستی اور امن کے جذبات کے لئے والہانہ انداز میں ہر زمین کی طرف دوڑ رہا ہے۔"

"تو پھر آؤ، اس بوڑھے کی آغوش میں سما جائیں" — جمیلہ بولی — "اور اس سے وہ سب کچھ سُن لیں جو یہ ہمیں سنانا چاہتا ہے۔"

سب نے ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لئے اور سمندر میں اُتر گئے۔

جمیلہ شور مچاتی ہوئی لہروں میں کسی جل پری کی طرح خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ تیرتی ہوئی دور تک چلی جاتی، چاروں اس کی طرف بڑھتے، کوئی بڑی سی موج آتی، جمیلہ اس کے نیچے چھپ جاتی، موج واپس چلی جاتی تو اس کا مسکراتا ہوا چہرہ

پھر ان کے سامنے ہوتا، وہ سب کے سب اسے پکڑنے کے لئے لپکتے، لیکن جمیلہ غوطہ مار کر پانی میں چھپ جاتی۔
وہ لوگ سمندر کی موجوں سے بڑی دیر تک کھیلتے رہے، اور جب اُن کے جسم تھکن سے چور چور ہو گئے تو وہ پانی سے باہر نکل آئے۔

"میں تو بری طرح تھک گیا ہوں" پیٹر تھامسن نے کہا۔

"ہاں۔ اب ہمیں واپس چلنا چاہئے" رچرڈ پال بولا۔

"جلدی کیا ہے۔ ابھی کچھ دیر اور ٹھہریں" کیری لوف نے کہا۔

"نہیں —" سین سیمون بولا —" رات خاصی گذر گئی ہے، اور اب تو سمندر بھی خاموش ہے"

جمیلہ مسکرائی۔ اُس نے اپنے کومل ہاتھوں سے بھیگے ہوئے بال نچوڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے — سمندر ہم سے جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ چکا، اور اب اپنی صدیوں پرانی تھکن ہمیں سونپ کر خود خاموش ہو گیا ہے — کتنا خود غرض ہے یہ بوڑھا"

"ہوگا" — تھامسن نے ناگواری سے کہا —" اب واپس چلو"

"چلو" — رچرڈ پال بولا۔

وہ سب تھامسن کی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ کار تیزی سے ہوٹل کی طرف دوڑنے لگی۔ راستے میں جب سیمون فرانس کے دیہی علاقوں کا ایک لوک گیت سنا رہا تھا تو جمیلہ کو اپنے سر میں ہلکے سے درد کا احساس ہوا۔ لیکن اس نے یہ بات کسی پہ ظاہر نہیں کی۔

ہوٹل پہونچنے کے بعد گاڑی سے اُترتے وقت جمیلہ نے تھکن سے چور آواز میں کہا۔

"پیٹر میرا ہاتھ تھام لو — مجھ سے چلا نہیں جا رہا ہے"

تھامسن نے لپک کر جمیلہ کو سہارا دیا۔

ہوٹل کی لمبی کوریڈور سے گذرتے وقت جب تیز روشنیاں جمیلہ کی آنکھوں سے ٹکیں تو اسے چکر سے آ گئے۔

"مجھے سہارا دو۔ مجھے چکر آ رہے ہیں" وہ نڈھال آواز میں بولی۔

کیری لوف نے آگے بڑھ کر اس کے شانوں کو تھام لیا۔

وہ جمیلہ کو تھامسن کے کمرے میں لے آئے۔

کمرے میں آتے ہی جمیلہ بے ہوش ہو گئی۔

رچرڈ پال دوڑ کر ٹھنڈے پانی کا گلاس لے آیا، اور اس کے منہ پہ چھینٹے دینے لگا۔ سین سیمون ایک انگریزی میگزین سے ہوا کرنے لگا۔

تھامسن اس کے چہرے پہ جھکا، اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جمیلہ نے آنکھیں کھولیں۔ سب کے سب جلدی سے اس کے قریب آ گئے۔

"پیٹر، کیری، پال، سیمون" — جمیلہ نے باری باری سب کو مخاطب کیا۔

"تم لوگ کہاں ہو۔ مجھے نظر کیوں نہیں آ رہے ہو"۔

"ہم لوگ تمہارے بالکل سامنے ہیں"۔ کیری لوٹ نے گھبراہٹ کے ساتھ جمیلہ کو جواب دیا۔

"مگر مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے کیری"۔ جمیلہ بے بسی سے بولی۔

"میں اندھی ہو گئی ہوں"۔ جمیلہ کی آواز لرز رہی تھی۔

"نہیں جمیلہ، نہیں، ایسی بات منہ سے نہ نکالو"۔ سیمن سیمون جلدی سے بولا۔

"نہیں سیمون۔ میں واقعی اندھی ہو گئی ہوں۔ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے"۔

غم اور حیرت سے ان چاروں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ اور وہ خاموشی کے ساتھ جمیلہ کی کھلی ہوئی خوبصورت آنکھوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ آخر ایسا ہوا کیونکر؟ —

جمیلہ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور بے نور تھیں اور ان میں اداسی تیر رہی تھی — ان میں فرانس کی پرانی شرابوں کا موجیں مارتا ہوا سمندر خشک ہو چکا تھا، اور اب وہاں صحراؤں کی خاک اُڑ رہی تھی۔ ان میں تیرنے والے وہ سپنے نہ جانے کہاں کھو گئے تھے جو پال کو نظر آیا کرتے تھے۔ آج اس وقت، اس کی آنکھوں میں کیری لوٹ کو ماسکو کے آسمان پہ سرِ شام نکل آنے والے ستاروں کی روشنی کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اور پیٹر تھامسن پال مال کا لمبا سگریٹ سلگائے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں نظر آنے والا وارفتگی کہاں کھو گیا ہے —؟!

جمیلہ ایک بے جان لاش کی طرح، پیٹر تھامسن کے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔

اس کے چہرے پر اندرونی کرب کی علامتیں نمایاں تھیں۔ ان چاروں کے سر جھکے ہوئے تھے، اور ماحول پر ماتمی فضا چھائی ہوئی تھی۔

"پیٹر —"۔ جمیلہ نے بڑی بے بسی سے اسے مخاطب کیا۔

"ہوں —"

"کیا اب میں تمہیں کبھی نہ دیکھ سکوں گی؟"

پیٹر نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا، اور سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

پیٹر تھامسن کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر جمیلہ چند لمحوں تک خاموش رہی۔ پھر اس نے آہستہ سے سیمون کو مخاطب کیا

"سیمون —"

"ہاں جمیلہ —"۔ سیمون جلدی سے بولا۔

"اب میں انقلابی فلسطینیوں کی سرزمین کبھی نہ دیکھ پاؤں گی"۔

"ایسی باتیں نہ کرو جمیلہ" — سیمون نے اسے تسلی دی — "تمہاری آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی"۔

جمیلہ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا، اور کمرے کی فضا پر بوجھل سی اداسی طاری ہو گئی۔

اگلے دن وہ چاروں اسپتال پہونچے تو جمیلہ کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی، ان کے قدموں کی آہٹ پا کر

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم لوگ آگئے؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں ——" رچرڈ پال نے جواب دیا۔

اس کے بعد تھوڑی دیر تک وہاں خاموشی رہی۔ پھر جمیلہ نے پوچھا:

"آج دن کیسا ہے؟"

چاروں نے اسے کوئی جواب دینے کے بجائے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموش رہے۔

"بولو، بتاؤ نا، آج کا دن کیسا ہے؟"

"اچھا ہے" پیٹر تھامسن بولا "تم اپنا دل چھوٹا نہ کرو جمیلہ، تمہاری آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ رات ڈاکٹر کہہ رہا تھا تمہاری آنکھیں بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی"

"غلط ہے بالکل غلط، میری آنکھیں اب ٹھیک نہیں ہو سکتیں۔ میں اب اس خوب صورت دنیا کو کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ یہ بات ابھی مجھے تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر نے بتائی ہے، اور میری بینائی ضائع ہونے کی وجہ جانتے ہو تم کیا ہے؟"

ان میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا، تو جمیلہ خود ہی بولی:

"ڈاکٹر کے بیان کے مطابق میری بینائی ضائع ہونے کی وجہ تمہارے دیس سے آنے والے سمندر کی ایک ایسی لہر تھی جس میں بہت سی زہریلی گیسوں کے اجزا، ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کے ذرات اور دیگر اسلحہ کے گھلے ہوئے مصالحے شامل تھے ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ جب ہم سمندر میں نہا رہے تھے تو اس وقت کوئی ایسی لہر آنکلی جو اپنے ساتھ زہریلے اثرات لئے ہوئے تھی۔ یہی لہر میری آنکھوں میں اپنی بے رحمی کے نشان ثبت کرتی چلی گئی...."

یہاں تک کہہ کر جمیلہ چند لمحوں کے لئے رُکی۔

اُن چاروں نے اُس کی طرف دیکھا اور چپ رہے۔

جمیلہ پھر بولی:

"ڈاکٹر نے مجھے بتایا ہے کہ ایسے ہی زہریلے اور تباہ کن تابکاری اثرات فضا میں بھی پائے جاتے ہیں"

"پیٹ" اُس نے پیٹر تھامسن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "پیٹ، تمہارے دیسوں سے آنے والی ہوائیں بھی لوگوں کو اندھا بنا سکتی ہیں"

جمیلہ بات ختم کر کے اپنی بے نور آنکھوں کو حرکت دینے لگی۔

رچرڈ پال آہستہ سے بولا۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

حالانکہ اُس نے یہ جملہ بہت آہستہ سے کہا تھا لیکن پھر بھی جمیلہ نے اسے سُن لیا تھا، وہ بڑے عزم اور حوصلے کے ساتھ بولی ——

"میں بتاتی ہوں کہ تمہیں کیا کرنا چاہیئے —— تمہیں اپنے اپنے ملک لوٹ جانا چاہیئے۔ اس لئے نہیں کہ میں اندھی ہو گئی ہوں

بلکہ اس لئے کہ تم مشرقی دیسوں کی کروڑوں جمیلاؤں کو اندھا ہونے سے بچا سکو۔ تم اپنے اپنے وطن لوٹ جاؤ، اور اس بات کے لئے جدوجہد کرو کہ جب تمہارے ملک کے سمندر کی موجیں اور ہوائیں دوسرے دیسوں کو جائیں تو اپنے ساتھ فرانسیسی نوجوانوں کی اُمنگیں، امریکہ کی روشنیاں، انگلستان کی موسیقی اور روسی ادیبوں کی حقیقت نگاریاں لے کر جائیں، اپنے ساتھ تابکاری اثرات، ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کے اجزا، مہلک بیماریاں، وبائیں اور زہریلی گیسیں لے کر نہ جائیں:

جمیلہ سانس لینے کے لئے رُکی، اور پھر اسی عزم اور حوصلے کے ساتھ کہنے لگی:

"تم اپنے ملکوں میں جا کر کہو کہ دنیا بھر کے انسان زندہ رہنا چاہتے ہیں، اور اپنی مختصر سی زندگی سے زیادہ سے زیادہ فیض اٹھانا چاہتے ہیں اور اس کے لئے انہیں ہتھیاروں کی، بموں کی، راکٹوں کی اور میزائلوں کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا تم اپنے خوفناک تجربات بند کر دو اور دنیا بھر کی جمیلاؤں کو اندھا نہ بناؤ"

جمیلہ یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گئی۔ اس کی بے نور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سیمون ہوسلے سے بولا:

"کل میں فرانس واپس چلا جاؤں گا۔"

پیٹر تھامسن نے پہلو بدلتے ہوئے سگریٹ نکال کر سلگایا، اور جمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

"میں بھی کل واشنگٹن جا رہا ہوں"

"کل میں ماسکو چلا جاؤں گا" کیری لوف نے کہا۔

"اور میں لندن لوٹ جاؤں گا" رچرڈ پال کہنے لگا۔

سب چپ ہو گئے تو جمیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا:

"میں تم لوگوں کی کامیابی کے لئے دعا کرتی رہوں گی"

اس کی پلکوں پر آنسو لرز رہے تھے۔

اعتبار ساجد

# یروشلم کے بعد

"۔۔۔میں عدم کی گھاٹیوں سے چلا اور یروشلم کے بازاروں سے گزرا۔ میری ہتھیلیوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ میں نے سقراط بن کر زہر پیا، گوتم بدھ بن کر تخت سے اترا اور منصور بن کر زندہ رہا۔۔۔"

اس نے کتاب بند کر دی۔ فضا میں سناٹے کا راج تھا۔ کتاب اس کی گود میں پڑی تھی اور وہ آنکھیں موندے اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسی صوفے پر انتھونی فلوریڈا نیم دراز تھی اور اب وہ بھائیں بھائیں کرتے ہوئے کمرے میں چپ چاپ بیٹھا اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔

دھیمے دھیمے بے جان سانس کھینچتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے اس کا وجود کسی سخت دھات میں بدل گیا ہے۔ اس نے تھکے تھکے سے انداز میں اپنا جسم ٹٹولا۔ اس کے اعصاب پر طلائی صلیب سوار تھی۔ شاید وہ ایک لمبی سی خاموش صلیب کا روپ دھارتا جا رہا ہے۔ اس نے عجب بے چارگی سے سوچا!

"۔۔۔میں عدم کی گھاٹیوں سے چلا اور یروشلم کے بازاروں سے گزرا۔ میری ہتھیلیوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ میں نے سقراط بن کر زہر پیا، گوتم بدھ بن کر تخت سے اترا، اور منصور بن کر زندہ رہا۔۔۔"

آسمانی کتاب کے اوراق پھڑپھڑا کر فضا میں تحلیل ہو گئے۔

"انتھونی فلوریڈا۔۔۔ فلوریڈا۔۔۔" اس نے خواب آلود لہجے میں کہا۔

لڑکی اتنی خوب صورت تو نہیں تھی۔ لیکن اس کے سارے جسم میں اس کی سیاہ بڑی بڑی بادامی آنکھیں نمایاں تھیں، اور پھر اہم بات تو یہ تھی کہ وہ خود اس کی میز پر چل کر آئی تھی۔۔۔

"میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"

"بیٹھو۔" اس نے مارٹینی کا آخری پیگ حلق سے اتارتے ہوئے کہا تھا۔

اس کے سیاہ بالوں میں گلاب کے تین سپید پھول تھے، اور سانولی گردن میں ایک ننھی سی طلائی صلیب۔۔۔ یسوع مسیح کی ہتھیلیوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

لڑکی خاموشی سے بیٹھی طلائی صلیب سے کھیلتی رہی ۔ البتہ اس کے لپ اسٹک سے رنگے سرخ گداز ہونٹ ضرور کانپ رہے تھے ۔۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی ۔

"میں ڈاکٹر جواد ہوں " بالآخر طویل خاموشی سے اُکتا کر اُس نے تعارف سے گفتگو کی ابتدا کی ۔

"انھتونی فلوریڈا ۔۔ " اُس نے مخروطی انگلیوں والا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھایا " گلیڈ ٹو سی یُو ۔۔ "

"اینڈ آئی ٹو ۔۔ " وہ مصافحے کے ریشمی لمس سے متاثر ہو کر بولا " مارٹینی، شیری یا کافی ؟ "

" نو تھینکس " لڑکی نے ہاتھ اٹھا کر کہا " مجھے کافی نہیں سکون چاہیئے "

" ہم کتنے احمق ہیں " وہ ہنس کر بولا " کلب میں سکون ڈھونڈنے آتے ہیں ۔ یہاں تو والنا ہے یا فاکس ٹراٹ "

" مجھے تو یہیں سکون ملتا ہے " فلوریڈا اپنی صلیب کا زاویہ درست کرتے ہوئے بولی ۔

" غالباً شادی شدہ ہو ؟ " اُس نے سگریٹ کیس نکالتے ہوئے پوچھا ۔

" شادی ۔۔ " وہ بڑی بے تکلفی سے ہنسی " تم شادی کسے کہتے ہو ۔ اس قید کو جس کی میعاد کبھی ختم نہ ہو ؟ سچ پوچھو تو میری نظر میں باقاعدہ شادی ایک گھسی پٹی روایت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ۔ میں جسم اور رُوح کی مکمل آزادی چاہتی ہوں جو صرف شادی کے بغیر ممکن ہے "

وہ دَنگ رہ گیا ۔

فلوریڈا الٹرا موڈرن لڑکی تھی ۔ اور غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود شادی کے نازک مسئلے پر بے تکان بول رہی تھی ۔

" میں ہر سنیچر کی رات کو اپنے جسم کے ذریعے سو ڈیڑھ سو روپے کما لیتی ہوں "

" اور تمہاری یہ صلیب ۔۔ یہ سدا تمہارے گلے میں لٹکی رہتی ہے ؟ " اُس نے اشارے کے لئے ہاتھ اٹھایا ۔ اُس کے ہونٹ نفرت اور حقارت کے ملے جلے جذبات سے کانپ رہے تھے ۔

اُس نے جلدی سے صلیب پر اپنا ہاتھ رکھ لیا ۔۔ " او گاڈ ! تم میرے گولڈن کراس کا نام مت لو ۔ یہ میری زندگی ہے "

" تم مریم نہیں ہو ۔۔ یہ میں جانتا ہوں " وہ ہونٹ بھینچ کر بولا " پھر اس اندھی عقیدت کا فائدہ ؟ "

" بزنس اپنی جگہ ۔۔ گولڈن کراس اپنی جگہ ۔۔ " وہ آہستہ سے بولی ۔ " یہ دو مختلف چیزیں ہیں "

" تم یہ دھندا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں ؟ " اس نے ایک گہرا کش لے کر دھواں اس پر چھوڑ دیا ۔

وہ کپکپائے ہوئے لہجے میں بولی " سب یہی کہتے ہیں ۔۔ لیکن تم کیا جانو کہ کن حالات نے مجھے اس بزنس پر اکسایا ۔ میرا باپ کیتھولک چرچ کا مالی ہے ۔ اُسے دمہ کا مرض ہے ۔۔ میری ماں کو ٹی بی ہے ۔۔ اور میرے چار چھوٹے چھوٹے بھائی بہن کنڈر گارڈن میں پڑھتے ہیں ۔۔ اتنے اخراجات کا بار برداشت کرنا میرے باپ کے بس کا روگ نہیں ہے "

" تمہارے ماں باپ تمہیں کچھ نہیں کہتے ۔۔ " وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا ۔

" ڈاکٹر ۔۔ " وہ آہستہ سے بولی " کیا تم یقین کرو گے کہ میری ماں مجھے یہ دھندا برقرار رکھنے پر مجبور کرتی ہے ۔ جس سنیچر کی رات میں کمائی کئے بغیر گھر جاؤں تو اس روز مجھے ماں کی جھڑکیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں ۔ پہلے پہل میں بہت رویا کرتی تھی ، ڈاکٹر ۔۔ لیکن آہستہ آہستہ انھتونی کو موت آ گئی اور فلوریڈا زندہ رہ گئی "

"لیکن تم شادی کرکے اپنے معاشی مسائل پہ قابو پا سکتی ہو۔" اُس نے بڑا نیک مشورہ دیا۔

"میں نے بہت سی شادیاں ہوتے دیکھی ہیں۔" وہ بڑے کربناک لہجے میں بولی۔ "اس صدی کا شوہر بڑی مشکل سے اپنی بیوی کا پیٹ پال سکتا ہے، اور بیوی کے میکے کا پیٹ پالنا اُس کے قانونی فرائض میں شامل نہیں۔"

پھر اس نے ایک سرد آہ بھری تھی اور فلوریڈا کو اپنی خواب گاہ میں لے آیا تھا۔ فلوریڈا جیسی لڑکیوں کے لئے وہ صرف اتنی اخلاقی ہمدردی کر سکتا تھا کہ انہیں اُن کے جسم کی قیمت دے کر اپنے بیڈ روم میں لے آئے۔

وہ دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

کمرے کی ہر شے سے بے ترتیبی اور لااُبالی پن مترشح تھا۔ فلوریڈا نے گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔

"ڈاکٹر، شاید تم بھی ابھی کنوارے ہو — ؟"

وہ آہستہ سے ہنسا۔ "کنوارہ تو نہیں، البتہ غیر شادی شدہ ضرور ہوں۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ کسی عورت کے ہاتھ میرے کمرے کو حقیقی حسن و ترتیب بخش دیں۔ کوئی مجھ سے ساڑھی خریدنے اور سینما دکھانے کی فرمائش کرے۔ کوئی رات گئے تک اپنی آنکھوں میں نیند لئے میرا انتظار کرے۔ کوئی مجھے گرم کوٹ پہناتے ہوئے میری پیشانی پر ایک لرزتا ہوا کانپتا ہوا بوسہ ثبت کر دے — کاش۔"

اس کا لہجہ بڑا حسرتناک تھا — صوفے کی پشت پر اپنا سر ٹیکتے ہوئے اُس نے آہستہ سے آنکھیں موندلیں، اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"فلوریڈا کبھی تم نے محبت کی ہے؟"

"ہاں، ایک بار —" فلوریڈا نے دھیمے سے کہا — "وہ مجھے کلب کے اُسی گوشے میں ملا تھا جہاں تم بیٹھے مارٹینی پی رہے تھے — ہم دونوں نے آلو کے قتلے کھائے اور شیری کے پیگ لگائے۔ اُس نے مجھے دو سو روپے دیئے اور اپنے گھر لے گیا، لیکن ڈاکٹر! یقین کرو اُس نے میرے جسم کو ہاتھ تک نہ لگایا، البتہ اُس نے ایک عجیب سی فرمائش کی —۔"

"کیسی فرمائش؟" اُس نے آنکھیں کھولے بغیر پوچھا۔

"اُس نے بڑی لجاجت سے کہا کہ میں اس کے بستر پر نئی چادر بچھا دوں — اور بک شیلف پر سے مدتوں کی جمی ہوئی گرد جھاڑ دوں۔ اور گلدان میں تازہ پانی ڈال کر ڈیزی کے پھول سجا دوں۔ اور اُس کے لئے کافی بنا کر لے آؤں — میں نے اُس کے احکامات کی تعمیل کی — جب میں کافی بنا کر لائی تو وہ نئی چادر پر آنکھیں موندے لیٹا تھا، اور اُس کی بند آنکھوں کی کوروں پر دائیں بائیں آنسوؤں کے دو قطرے چمک رہے تھے:"

فلوریڈا ایک لمحے کے لئے رکی، پھر بھیگے ہوئے لہجے میں بولی —

"پھر میں نے تپائی پر کافی رکھ دی۔ اُس نے ایک کروٹ بدل کر اپنا چہرہ میری طرف کر لیا — اور آنکھیں کھول دیں۔ وہ رو رہا تھا — کچھ آنسو ایسے بھی تو ہوتے ہیں جو خاموشی سے شبنم کی طرح اُبھرتے ہیں اور بوند کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں ایسے ہی آنسو تھے۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگا — دیر تک روتا رہا — پھر اُس نے ایک گرد آلود صندوقچی کھول کر

یہ گولڈن کراس نکالا اور میرے گلے میں پہنا دیا۔ پھر آہستہ سے تھرتھراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ رات بھیگ رہی ہے اب تم چلی جاؤ۔ میں جوان آدمی ہوں۔ میرے جذبات برانگیختہ بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن میں یہ پسند نہیں کروں گا۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو ــــ بہت ہی اچھی لڑکی ہو ــــ تم جیسی لڑکیوں کا اپنا ایک گھر ہونا چاہیے۔ ایک شوہر ہونا چاہیے۔ اور انہیں گھر کی چار دیواری اور شوہر کے بازوؤں سے نکل کر آوارہ ابابیلوں کی طرح بھٹکنا نہیں چاہیے ــــ اب تم جاؤ ــــ خدا حافظ ــــ میرا دیا ہوا گولڈن کراس کبھی نہ اُتارنا، یہ تمہیں میری یاد دلاتا رہے گا۔"

فلوریڈا نے ایک سرد آہ بھری۔ اس کی پلکوں پر آنسوؤں کے تارے کانپ رہے تھے۔

وہ ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں بولی۔ "اور میں رات گئے اُس کے سنسان گھر سے واپس لوٹی۔ وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ اور اس کے بعد ٹیکسی پر بٹھا کر خود آنکھوں پر ہاتھ رکھے تیزی سے اندر چلا گیا ــــ مجھے معلوم تھا کہ وہ رو رہا ہے لیکن اپنے آنسو چھپانا چاہتا ہے ــــ ڈاکٹر! اس رات کے بعد مجھے بھرپور نیند میسر نہ آ سکی۔ میں دیر تک بستر پر پڑی کروٹیں بدلتی تھی اور اسے یاد کرتی تھی۔ وہ میری زندگی کا پہلا عجیب آدمی تھا۔ تم یقین کرو ڈاکٹر! اس سے جدا ہو کر میرے اندر کی عورت جاگ اٹھی۔ فلوریڈا مر گئی اور اس نسوانی زندگی پا گئی۔ میں چھ ماہ تک گھر میں پڑی رہی۔ مسلسل غور و فکر نے مجھے بیماری کے بستر پر ڈال دیا ــــ اور آج غسلِ صحت کے بعد میں اس سے ملنے گئی تھی۔ لیکن بنگلہ سنسان پڑا تھا۔ بوڑھے مالی نے مجھے چپ چاپ کھڑے دیکھا تو تیزی سے میرے قریب آیا۔ اور میرے گلے میں جھولتی ہوئی صلیب دیکھ کر رُک گیا۔

پھر وہ بڑے دکھ سے مسکرایا۔ اور اُس نے کہا ــــ 'تم اس سے ملنے آئی ہو' وہ اُداس آنکھوں والا نوجوان جس کی چہیتی بیوی قاہرہ کے ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی ــــ؟"

میں نے کچھ نہ کہتے ہوئے سر ہلا دیا۔

وہ آہستہ سے بولا ــــ "تمہاری گردن میں گولڈن کراس دیکھ کر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم اس سے ملنے آئی ہو ــــ یہ گولڈن کراس اس کی بیوی پہنتی تھی ــــ ہر اتوار کی صبح وہ دونوں جب عبادت کے لیے چرچ جاتے تو میں مادام کے بالوں میں گلاب کے تین سفید پھول لگاتا تھا۔ مادام کو سفید گلاب بہت پسند تھے۔ لیکن شاید تمہیں یہ سن کر دکھ ہو کہ صاحب قاہرہ چلا گیا ہے۔ جاتے جاتے اس نے کہا تھا کہ اب میں اُس دھرتی کا طواف کروں گا۔ جہاں میری بیوی کے جسم کے اَن گنت ٹکڑے بکھر کر مٹی میں مل گئے ہیں۔ اب میں کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ اور صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میرے بعد یہاں کوئی لڑکی مجھے پوچھنے آئے تو اُس کے بالوں میں گلاب کے تین سفید پھول لگا کر اسے رخصت کر دینا ــــ آؤ بیٹی، میں تمہارے بالوں میں سفید پھول لگا دوں ــــ"

اور اس نے میرے بالوں میں گلاب کے پھول لگائے، اور مجھے روتے ہوئے رخصت کیا ــــ

دیر تک میں وہاں کھڑی روتی رہی۔ پھر نڈھال قدموں سے کلب چلی آئی کہ مجھے تم مل گئے ــــ اسی نیم تاریک نیم روشن گوشے میں جہاں وہ مجھے پہلی بار ملا تھا ــــ او مائی گولڈن کراس ــــ"

فلوریڈا نے اپنا ریشمی بالوں بھرا سر اس کے کاندھے پر ٹیک دیا اور سسکیاں لینے لگی۔

کمرے کی سوگوار فضا میں دیر تک اس کی اذیت ناک سسکیاں گونجتی رہیں۔

پھر اُس نے فلوریڈا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ــــ "زندگی کی اس ریل گاڑی میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جنہیں اگرچہ

کہیں بھی نہیں جانا ہوتا لیکن ٹکٹ خرید کر گاڑی میں بیٹھ ضرور جاتے ہیں ـــ ویسے بھی گذرے ہوئے لمحوں پر آنسو بہانا عبث ہے۔ محبت میں نے بھی کی تھی لیکن آنسو بہانا مجھے نہیں آتا ـــ دھیمے دھیمے ہولے ہولے بیری کی شاخ کی طرح دھواں چھوڑتے ہوئے جلنا چاہیئے۔ پیٹرول کی طرح ایک دم بھڑکنا نہیں چاہیئے ـــ تمہارے ہونٹ بالکل اُس لڑکی کے ہونٹوں کی طرح گداز ہیں جس نے ایک بار کہا تھا کہ وہ میری خاطر جان دے سکتی ہے لیکن آج اُس کے تین بچے ہیں اور اس کا خاوند ایک بڑا افسر ہے ـــ تمہیں دیکھ کر بے ساختہ مجھے وہ یاد آ گئی تھی ـــ آؤ ہم اپنے بچھڑے ہوئے پیار کی یاد میں ایک دوسرے میں گم ہو جائیں ـــ"

اس نے اٹھ کر نیلا بلب جلا دیا۔ خواب آلود نیلی روشنی میں ڈوبا ہوا کمرہ یکلخت انتہائی پُراسرار بن گیا۔

فضا میں گلاب کے سفید پھولوں کی خوشبو تھی۔ فلوریڈا کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

کھڑکی سے پرے یوکلپٹس کی شاخوں پر کسی پرندے نے پر پھڑپھڑائے اور چیختا ہوا تیزی سے ایک طرف اڑ گیا۔

اس کے لرزتے ہوئے ہونٹ فلوریڈا کی گردن کے اس گڑھے تک پہونچ گئے جس پر لونڈر کی ہلکی سی مہک تھی۔ اور تب اس کی آگے بڑھتی ہوئی گردن ایک جھٹکے سے جہاں کی تہاں رک گئی۔

نیلی روشنی میں طلائی صلیب چمک رہی تھی۔ یسوع مسیح کی ہتھیلیوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

"یہ صلیب اُتار دو" اس نے گہرے گہرے سانس لے کر کہا۔

فلوریڈا آنکھیں بند کئے خاموشی سے پڑی رہی۔

"یہ صلیب اتار دو فلوری ـــ یہ صلیب اُتار دو ـــ" اُس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

فلوریڈا نے اپنی آنکھیں آہستہ سے کھول دیں۔ اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔

"یہ صلیب اتار دو ـــ" اس نے زور سے کہا۔

فلوریڈا کے ہونٹ کانپے۔ اُس نے آہستہ سے کہا ـــ "نہیں"

"میں نے تمہیں دو سو روپے دیئے ہیں ـــ تم میری بات مان لو ـــ اس وقت یہ صلیب میرے جذبات سرد کر رہی ہے"

"میں یہ صلیب نہیں اُتار سکتی" فلوریڈا نے زور سے کہا۔ "میں یہ صلیب نہیں اُتار سکتی"

"آخر کیوں؟" وہ جھنجلا کر بولا۔ "میں تمہیں دو سو روپے دے چکا ہوں۔ اصولاً تمہیں میری بات مان لینی چاہیے"

یکایک فلوریڈا تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ تیزی سے پرس کھول کر اس نے نوٹ اُس کی طرف اُچھال دیئے۔ اُس کا چہرہ سرخ تھا اور پنڈلیاں کپکپا رہی تھیں۔　　　اُڑتے ہوئے نوٹ اس کے جسم سے ٹکرا کر فرش اور صوفے پر بکھر گئے۔

"احمق لڑکی ہوش میں آؤ" وہ حیرت سے چلّایا۔ "غضب خدا کا تم دو سو روپوں پر لات مار رہی ہو اور یہ بھول گئی ہو کہ چھ ماہ بعد میں پہلا آدمی ہوں جس نے یکمشت تمہیں دو سو روپے دیئے ہیں"

وہ گھوم کر دروازے پر رُک گئی۔ آہستہ سے اُس نے اپنی بڑی بڑی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ اُس کی آنکھوں میں گہرا اعتماد تھا۔ "ڈاکٹر جواد تم ٹھیک کہتے ہو" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "لیکن میں اپنے جسم کا سودا کرتی ہوں اپنی یادوں کا نہیں۔ انتھونی فلوریڈا پر ابھی وہ وقت نہیں آیا ڈاکٹر! جب وہ کاغذ کے ان حقیر ٹکڑوں کی خاطر اپنی روح بیچ دے ـــ مجھے بھول جانا ـــ گڈ بائی ـــ!!"

اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی دروازہ کھول کر باہر پھیلے ہوئے اندھیروں میں گم ہو گئی ـــ!!

میخائیل نعیمہ
ترجمہ
ڈاکٹر سید محمد یوسف

# اخی

سامراجی جنگوں میں حصہ لینے والے غلام ملکوں کی تباہی کی عبرت آموز تصویر

اخی! ان عاد بعد الحر — بمجندیٔ لأوطانہٖ
والقی جسمہ المنہو — کَ فی احضان خُلّانہٖ
فلا تطلُبْ اذا ماعُدْ — تَ للأوطان خُلّانا
لانّ الجوعَ لم یترکْ — لنا صَحْبًا نُناجیہمْ
سِوی اَشباحِ موتانا

میرے بھائی! لڑائی کے اختتام پر اگر کوئی
فوجی اپنے وطن لوٹ کر
اپنے تھکے ہارے جسم کو
دوستوں کی گود میں ڈال دے
تو تو وطن لوٹ کر
کسی دوست کی تلاش نہ کرنا
اس لئے کہ بھوک نے ہمارے دوست باقی نہیں
چھوڑے جن سے ہم دل کی بات کرسکیں۔
ہمارے لئے تو صرف مرے ہوؤں کی
خیالی تصویریں ہیں

اخی! قد تم مالولم — نشأْہُ نحنُ ماتمّا
وقد عمّ البلاءُ ولو — اَرَدْنا نحن ماعمّا
فلا تَنْدُبْ فاذن الغیـ — ـرِ لا تُصغِی لِشکوانا
بل اتبعنی لنحفر خنـــــد — قًا بالرفش والمعوَلْ
نُواری فیہ موتانا

میرے بھائی! سب کچھ ہو گیا، اور اگر ہم نہ
چاہتے تو یہ کچھ نہ ہوتا۔
مصیبت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، اور اگر ہم
عزم کرلیتے تو یوں نہ پھیلتی۔
پس تو رونے پیٹنے سے باز رہ، اس لئے کہ
غیروں کے کان ہمارے شکوے نہیں سنتے۔
بہتر یہ ہے کہ تو ہمارے ساتھ ہولے تاکہ ہم بیلچہ
اور کدال سے ایک خندق کھودیں
اور اس میں اپنے مرے ہوؤں کو
مٹی سے ڈھانک دیں۔

رسول رضا
ترجمہ
کوثر انصاری

روسی

# یہ مت کہو: میں نے سب کو چاہا

گذرتا جاتا ہے وقت پیہم
ہمارے پیچھے ازل ہے
جس میں تمام لمحات گھُل رہے ہیں
یہ وقت کا تیز و تند دھارا
اک ایسی منزل کی سمت ہم کو بہا رہا ہے
جہاں سے واپس اک آدمی بھی
نہ آسکا ہے، نہ آسکے گا

مگر تمہارے لئے ابھی وقت بچ رہا ہے
کہ اس جہاں پہ نگاہ ڈالو
اور اپنی آنکھوں کی راہ اس دہر کو کھنگالو
اگر تقاضہ کرے تمنا
تو اس عمارت میں، جو کہ تعمیر ہو رہی ہے
تم اپنے ہاتھوں سے ایک پتھر کو نصب کر دو
سمیٹ لو
دل کی دھڑکنوں میں شگفتہ پھولوں کی خوشبوؤں کو

اور اپنی زلفوں میں جذب کرلو
سحر کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے،
ابھی تمہارے لئے بہت وقت بچ رہا ہے
محبتوں کے دیئے جلالو
اور اپنے احساس کے چراغوں کا نور بھر دو
سیاہ و تاریک راستوں میں
لبوں پہ اپنے تبسم شوق کو جگالو

ابھی تمہارے لئے بہت وقت بچ رہا ہے
کسی کے ہاتھوں میں جذب کر دو
تم اپنے ہاتھوں کی گرم جوشی
ابھی ہم اظہار اور تخلیق کے چمن میں
نئے شگوفے کھلائیں گے، کار زندگانی دراز سمجھو

ابھی تمہارے لئے بہت وقت بچ رہا ہے
حیات کے اس گھنے شجر کی لچکتی ڈالی کی طرح لچکو
یہ مت کہو: "میں نے سب کو چاہا"
کہ دشمنوں کے لئے محبت روا نہیں ہے
کرم فقط دوستوں کا حق ہے

ابھی تمہارے لئے بہت وقت بچ رہا ہے
تمام سعی و طلب میں یہ زندگی گذار دو
کہ بعد مرنے کے، سب یہ دیکھیں، سبھی یہ سوچیں
جہاں یہ تم تھے
وہاں خلا ہے، فقط خلا ہے۔

انگریزی

ورڈز ورتھ
ترجمہ
مہر نگار قریشی

# گم شدہ محبت

دُور افتادہ کہیں
برکنارِ رودِ وہ
حلقۂ الفت سے دُور
پیکرِ الفت تھی جو

غنچۂ دگل نزدِ سنگ
چشم ظاہر سے نہاں
نجم تاباں کی طرح
آسماں پر ضوفشاں

اک کلی تنہا تھی جو
آج وہ مرجھا گئی
سو رہی ہے خاک میں
کیا یہی ہے زندگی

## رومانئین

میرین یے سوریسکو
ترجمہ
عبیرالنساء انصاری

# ٹرائے

ہمارے چاروں طرف ہیں فرس ٹرد جن کے
ہراک فرس میں ہے پوشیدہ اک سیاہ غنیم
جو پوتلوں سے، لباسوں سے اور نقشوں سے
شبِ سیاہ میں باہر نکلنے لگتی ہے
ہم ایسے ناداں کہ ان پوتلوں لباسوں کو
بڑے ہی شوق سے بازار سے خریدتے ہیں
پھر اپنے گھر میں سجاتے ہیں، اور ان میں سے
ہر ایک شب کو نکلتی ہے اک سیاہ غنیم

رُوداد نگار

# اُردو میں تاریخ نویسی

## اردو مجلس کا ایک مذاکرہ

اردو مجلس کی ماہانہ نشست ۴؍جنوری سنہ ۱۹۶۰ء کو آغا افتخار حسین صاحب کی قیام گاہ پر منعقد ہوئی۔ اس بار ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا تھا جس کا موضوع "اردو میں تاریخ نگاری" تھا۔ اس مذاکرے کی صدارت ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے کی جو پچھلے دنوں کراچی آئے ہوئے تھے۔ مذاکرے میں ان حضرات نے شرکت کی: ممتاز حسن، ڈاکٹر ریاض الاسلام، آغا افتخار حسین، صہبا لکھنوی، شان الحق حقی، مظفر علی سید، عتیق احمد، ضیاء الحسن موسوی، سید عبدالرحمن، اشفاق نقوی، مسلم ضیائی، ظفر الحسن، سحر انصاری۔

سب سے پہلے تاریخ نگاری اور تاریخ نویسی کی تراکیب پر بحث ہوئی۔ ضیاء الحسن موسوی نے یہ رائے ظاہر کی کہ تاریخ نویسی کی ترکیب عام طور پر مادۂ تاریخ نکالنے کے فن کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ لیکن آغا افتخار حسین کا خیال تھا کہ اس ترکیب کا وسیع مفہوم موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ مختصر سی بحث کے بعد مجلس اس بات پر متفق ہوگئی کہ تاریخ نویسی اور تاریخ نگاری دونوں اصطلاحیں موضوع کے لئے مناسب ہیں۔

ڈاکٹر ریاض الاسلام نے اردو میں تاریخ نویسی کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ سرسید احمد خاں کی 'آثار الصنادید' اور اسی قبیل کی کتابوں میں تنقید کے وہ طریقے نہیں ملتے جو بعد کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ اسی طرح مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ ہند میں واقعات نگاری زیادہ اور تاریخ نگاری کم ہے۔ تنقیدی اور تحقیقی پہلو بھی اس میں کم ہے۔ شبلی کا کینوس وسیع ہے۔ ان کے ماخذ بھی زیادہ ہیں۔ اس کے بعد کافی عرصے تک تاریخ میں خلا نظر آتا ہے۔ عبدالحلیم شرر نے 'تاریخ سندھ' لکھی تھی، یہ کتاب اب کہیں نہیں ملتی۔ اس کے بعد زیادہ تر تاریخیں انگریزی میں لکھی گئیں۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کی مطبوعہ تاریخیں اور سلیمان ندوی کی تاریخی تحریریں کلاسیکی حیثیت رکھتی ہیں۔ تقسیم کے بعد رشید اختر ندوی نے تاریخ مغربی پاکستان لکھی ہے۔

نقوی صاحب نے اس جائزے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ان کے علاوہ بعض مثنویاں بھی تاریخی موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔

**مظفر علی سید:** مثلاً دکن میں 'علی نامہ' لکھا گیا۔

**ریاض الاسلام:** مثنویوں میں تاریخ معتبر نہیں ہوتی۔

اس کے بعد اختر حسین رائے پوری نے فلسفے کے نقطۂ نظر سے تاریخ نویسی پر اظہار خیال کیا اور سوال اٹھایا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ مورخ کسی خاص نظریے سے تاریخ لکھے؟ اس سلسلے میں شرکائے مذاکرہ نے مختلف آراء پیش کیں۔ لیکن اکثریت کی رائے یہ تھی کہ مورخ کے اپنے نقطۂ نظر کا ہونا ضروری ہے اور ناگزیر بھی۔

مظفر علی سید نے کہا کہ اس دور کے مسلمانوں میں فی الاصل تاریخی شعور کی کمی ہے۔ ہمارے یہاں تاریخ کی اعلیٰ کتابیں بہت کم ہیں، زیادہ تر درسی کتابیں ملتی ہیں۔ ہمارے یہاں تاریخ کے معلمین کا مبلغ علم یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر کی فارسی صفر ہوتی ہے۔ انگریزی ترجموں کو پڑھ کر وہ سمجھتے ہیں کہ کلاسیکی کتابوں کا عطر ہاتھ آگیا۔ پھر بھی یہ خوشی کی بات ہے کہ بعض کتابیں اردو میں ایسی لکھی گئی ہیں جنہیں انگریزی خواں بھی یاد رکھتے ہیں۔

**عتیق احمد:** ہمارے یہاں تاریخ کا ایک تصور یہ ہے کہ بادشاہوں اور خلفا کے واقعات پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ باتیں پرانی ہو چکی ہیں۔ اس نقطۂ نظر میں ترمیم کی ضرورت ہے۔

**ممتاز حسن صاحب:** زیادہ تر تاریخیں واقعات ہی پر مبنی ہوتی تھیں۔ معاشی اور معاشرتی تاریخ کا تصور بہت پرانا نہیں ہے البتہ اردو کی تاریخوں میں یہ تصور کم ہے۔

**ضیاء الحسن موسوی:** اردو زبان کی عمر کے لحاظ سے اگر جائزہ لیا جائے تو ہمارا تاریخی سرمایہ کچھ کم نہیں ہے۔ بلکہ ریاستوں میں تو خاص طور پر کام ہوا ہے کیونکہ وہاں تاریخ نویسوں کی سرپرستی کی جاتی تھی۔

**صہبا لکھنوی:** اس سلسلے میں ریاست بھوپال بطور خاص قابل ذکر ہے جہاں تاریخ نویسی کا ایک علیحدہ شعبہ تھا، جس کی سرپرستی ریاست کرتی تھی۔ محمد امین زبیری اور مولوی عبدالرزاق کانپوری ایسی ممتاز شخصیتیں اس شعبے سے وابستہ تھیں۔

**مسلم ضیائی:** عثمانیہ یونیورسٹی میں ایم اے اور ریسرچ کے متعدد مقالے اردو میں لکھے گئے ہیں۔ یہ شائع نہیں ہو سکے، اس لئے لوگ ان سے واقف نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہاں کا تاریخی سرمایہ منتشر حالت میں ہے۔ اگر یہاں نیشنل میوزیم یا ہسٹاریکل سوسائٹی آف پاکستان یا کوئی اور ادارہ ایک مرکزی لائبریری ایسی بنا دے جہاں تاریخی کتب اور مخطوطات کو جمع کیا جا سکے تو یہ ایک بہت اہم کام ہوگا۔ اس صورت میں نہ صرف تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو بیشتر مواد یکجا مل جائے گا، بلکہ بہت سے لوگ کتابوں کا عطیہ بھی وہاں دے سکتے ہیں۔

**ممتاز حسن:** مجھے اس سے اتفاق ہے کہ تاریخ نویسوں کی سرپرستی نہیں ہوئی اور انہیں آزادی حاصل نہیں۔ ایک زمانے میں مسلمان اس بات پر فخر کرتے تھے کہ رومنوں کے بعد دنیا میں سب سے پہلے انہوں نے تاریخ کا معیار دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس برصغیر میں تو تاریخ ہی مسلمانوں سے شروع ہوئی ہے۔ مسلمانوں کا خاصہ واقعات کو واقعات کی طرح پیش کرنا تھا، لیکن ہم اس سے دور ہوتے گئے۔ میں سمجھتا

ہوں کہ ہمیں تصوّف نے بہت نقصان پہونچایا ہے۔ ہمارے یہاں تصوف کے اثر کی وجہ سے واقعات کے تسلسل کا شعور کم ہوگیا ہے۔ تصوّف میں کبھی کسی شخص کو زمین پر دکھایا جاتا ہے کبھی آسمان پر؛ اور ہر ایسی چیز کو ممکن بتایا جاتا ہے جو عقل میں نہ آسکے۔ تصوف قاطع علم اور قاطع تاریخ ہے۔ قرآن میں علوم آفاق، علوم النفس اور تاریخ کا ذکر آیا ہے۔ اس میں قوموں اور پیغمبروں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اسلامی فرہنگ و ثقافت کا تقاضا ہے کہ ہم اس علم کو برقرار رکھیں۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے اردو زبان ابھی ارتقائی مراحل سے گذر رہی ہے۔ اسے ہم شاعری اور ادب کی زبان کی حیثیت سے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں پیش کرسکتے ہیں، لیکن علمی اعتبار سے یہ بہت پیچھے ہے۔

شائستہ اکرام اللہ: صاحب، ادب اور علمی زبان کا مسئلہ تو یہ ہے کہ اب تک اردو زبان کو شاعری اور ادب کے لئے استعمال کیا گیا ہے اس لئے یہ ادبی معلوم ہوتی ہے۔ اگر اس میں علمی کتابیں لکھی جائیں تو الفاظ میں Precision پیدا ہوگا، اور یہی زبان علمی بھی بن جائے گی۔

آغا افتخار حسین: میں سمجھتا ہوں کہ اگر اردو زبان میں تاریخ پر زیادہ کتابیں نہیں لکھی گئیں تو اس میں اردو زبان کا نہیں بلکہ ہمارا قصور ہے۔ سوال یہ ہے کہ انگریزی زبان ہی میں گذشتہ سو سال میں ہم نے کتنی اہم تاریخی کتابیں لکھی ہیں؟ برصغیر ہند و پاک میں مسلمانوں کی تاریخ پر زیادہ تر کام ہندوؤں نے کیا ہے اور ان ہی کی کتابیں مستند مانی جاتی ہیں۔ مسلمانوں میں صرف چند نام ایسے گنائے جاسکتے ہیں جنہوں نے تاریخ پر اعلیٰ درجے کا کام کیا، اور اس میں سے بھی زیادہ کام مقالہ پیش کرکے ڈگری لینے کے لئے کیا گیا۔ تاریخ نویسی کے فقدان کی وجہ ہماری سہل انگاری ہے اردو زبان کی خامی نہیں۔

عبدالرحمٰن: سوانح حیات کو اگر ہم تاریخ سمجھیں تو حالی، غلام رسول مہر، وغیرہ کی کتابیں بھی تاریخ ہیں۔

سحر انصاری: میری رائے میں تاریخ نویسی میں تعصب سے کام نہیں لینا چاہئے، بلکہ مورخ کو غیر جانبدار نقطۂ نظر اختیار کرنا چاہئے۔ تعصب کی وجہ سے مورخ بہت سے واقعات کو توڑ مروڑ کر بیان کرتا ہے، اور اس طرح صحت مند رجحان کو نقصان پہونچتا ہے۔

عبدالرحمٰن: لیکن میرے خیال میں اس چیز کی بھی اہمیت ہے جو تعصب سے لکھی گئی ہو۔ لکھنے والا اسے لکھ دے بعد میں اسے تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھ کر حقائق کی چھان بین کی جاسکتی ہے۔

ضیاء الحسن موسوی: عقیدہ ضروری ہے بلکہ ہمارے اجداد کی امانت داری قابل تعریف ہے۔ اگر وہ اپنے عقیدے کے مطابق نہ لکھتے تو یہ مناظرے اور محاکے نہ ہوتے۔

عتیق احمد نے تاریخی کتب کی لائبریری کے قیام کا سوال پھر اٹھایا، جس پر ممتاز حسن صاحب نے کہا کہ ایک علیحدہ لائبریری قائم کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ ہسٹاریکل سوسائٹی کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ موجودہ دور میں دولت پیدا کرنے کی خواہش پیدا ہوتی جارہی ہے اور علم اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم، جو کچھ کام ہو رہا ہے اس کا ہمدردی سے جائزہ لیں اور غیر معمولی نتائج کی تمنا نہ کریں۔

**آغا افتخار حسین** : ہسٹاریکل سوسائٹی کو بہتر بنانے کی ابتدا کیسے کی جائے؟

**ممتاز حسن** : اس کی ابتدا اس طرح ہو سکتی ہے کہ علم دوست اصحاب نادر کتابیں ہسٹاریکل سوسائٹی کو عطیہ کے طور پر دے دیں۔

**عبدالمومن** : بہتر تو یہ ہے کہ یونیورسٹی لائبریری میں ایسی کتابیں جمع کرادی جائیں، وہاں یہ زیادہ محفوظ بھی رہیں گی اور ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ بھی کیا جاسکے گا۔

**ریاض الاسلام** : علی گڑھ کے شعبۂ تاریخ کے ایک صاحب پچھلے دنوں یہاں آئے تھے، تو بتا رہے تھے کہ ان کے شعبہ میں دنیا کا کوئی مخطوطہ ایسا نہیں جس کے عکسی نقول ان کے پاس نہ ہوں، اور اس کے لئے انہیں کئی لاکھ روپے حکومت کی طرف سے ملتے ہیں۔

آخر میں جسٹس امیر علی کی ہسٹری آف ساراسینس کا ذکر آیا۔ آغا افتخار حسین صاحب نے کہا کہ اس میں چند غلطیاں ہیں، ممتاز حسن صاحب نے بتایا کہ ہسٹری آف ساراسینس میں نام ہی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ امیر علی نے ساراسینس کو شرقیوں سے ماخوذ بتایا ہے۔ حالانکہ وہ ہے ساراکینوس (Sara kinas) یعنی "سارا کے غلام کی اولاد"۔

مذاکرے کے اختتام سے پہلے یہ طے کیا گیا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں تاریخ سے متعلق ایم اے اور پی ایچ ڈی کے لئے جو مقالے لکھے گئے ہیں ان کی ایک فہرست مرزا ظفرالحسن صاحب اردو مجلس میں پیش کریں گے، اور سید عبدالرحمٰن صاحب، ڈاکٹر ریاض الاسلام صاحب کی زیر نگرانی "اردو میں تاریخ نویسی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھیں گے، تاکہ جتنا کچھ کام اس سلسلے میں اب تک ہو چکا ہے اس کا تفصیلی جائزہ لیا جاسکے۔

ادارہ

تبصرہ و تعارف

# نئی کتابیں

تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

## مادھونل اور کام کندلا

مؤلف: مظہر علی خاں ولا ، مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی
ملنے کا پتہ: اردو دنیا، کراچی ۱۸
صفحات: ۸۴ قیمت: پانچ روپے

مادھونل اور کام کندلا کی کہانی موتی رام کبیشر نے برج بھاشا میں لکھی تھی۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ کی فرمائش پر مظہر علی ولا نے اسے ۱۸۰۱ء میں اردو میں منتقل کیا۔ مظہر علی ولا کی کتاب اب تک غیر مطبوعہ تھی، جس کا ایک قلمی نسخہ لندن کی لائبریری میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کو دستیاب ہوا اور اب یہ کتاب ڈاکٹر عبادت بریلوی کے سیر حاصل مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ مظہر علی ولا کی زبان میر امن جیسی نہیں ہے لیکن بعض جگہوں پر ان کے محاورے میر امن کی زبان سے بھی زیادہ لطف دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت نے اپنے مقدمے میں اس کتاب اور مظہر علی ولا کی ادبی حیثیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ ان کا ایک اور تحقیقی کارنامہ ہے جو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

## جہانِ غالب

کوثر چاندپوری
ملنے کا پتہ: حامد بادرس۔ سوہا بازار۔ لاہور ۸
صفحات: ۳۲۸ قیمت: ۵ روپے ۵۰ پیسے

کوثر چاندپوری افسانہ نگار ہیں۔ اور یہ کتاب تنقید و تحقیق سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں غالب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف اور ان کی ذاتی زندگی کے نقش نقش پر کھل کر رائے دی گئی ہے۔ کتاب تیرہ ابواب میں تقسیم ہے۔ کوثر چاندپوری نے پوری کوشش کی ہے کہ غالب پر جو کچھ لکھا جائے وہ بے لاگ لکھا جائے۔

غالب کی عظمت کے سلسلے میں آج کچھ لکھنے کے لئے غالب کا طرفدار ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن کوثر چاندپوری نے ان کی کمزوریوں اور شخصی زندگی کے جن پہلوؤں کی طرف اشارا اور جن آرا کا اظہار کیا ہے ان سے ہر شخص کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ بات صرف اس کی نہیں ہے کہ غالب نے کیا کیا، بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ غالب نے اپنی زندگی کے تجربات کو کس طرح سمیٹا ہے۔ کسی واقعے کو کسی شخص کی پوری زندگی سے الگ کرکے سمجھنے کی کوشش علمی نقصان کے مترادف ہے۔ ان کی بیوی سے اُن کا رشتہ کیسا تھا؟ اُن کے گھر پر کب اور کیسے جوا ہوتا تھا؟ جو شراب وہ پیتے تھے وہ ان پر کس کس طرح اثر انداز ہوتی تھی۔ اُن کی یہ ساری خامیاں ہمیں ایک بار یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ آج تک جس پیکر کو انسان کہ زندہ لکھا گیا ہے وہ صرف اس بات کی دلیل ہو کہ معاشرہ ایک فرد پر سارا الزام ڈال کر اپنی خامیوں کی پردہ پوشی چاہتا ہے۔ غالب نے اپنا مسلک واضح کر دیا تھا۔ ع

چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

جب تک معاشرے میں اخلاق اور بداخلاقی کی تقسیم قائم رہے گی شاعر دونوں ہی سے تعلق رکھے گا کیونکہ وہ آدمی کی ذات کا ترجمان ہے۔ وہ آدمی کو اخلاق اور بداخلاق کی معاشرتی تقسیم کے ذریعے دو ٹکڑے کرنے کے بجائے اس ہم آہنگی کو تلاش کر رہا ہے جہاں آدمی کا پورا وجود ہو۔ ویسے بھی غالب کی شخصیت کے بہترین عناصر ہمیں اس کی شاعری ہی میں تلاش کرنے چاہئیں۔ اور انسانی کمزوریوں کا مطالعہ اس لئے جاری رکھنا چاہئے کہ یہ مطالعہ آدمی سے اور قریب کر دیتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ شاعر کی زندگی کا مطالعہ محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ جب کہ فقط تنگ نظر معلمین اخلاق ہمیں نفرت کرنا سکھا سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے غالب کی زندگی کا مطالعہ ضروری ہے۔ غالبیات کے سلسلے میں کوثر چاندپوری کی یہ کتاب اختلافی نقطۂ نظر کے باوجود دعوتِ مطالعہ دیتی ہے۔

## اردو رُباعی

فرمان فتحپوری

ملنے کا پتہ: مکتبۂ سنگ میل۔ کراچی

صفحات: ۲۵۸ قیمت: ۵ روپے۔

فرمان فتح پوری کا تعارف نیاز فتح پوری نے "نگار" کے ذریعہ کرایا تھا۔ اسی پرچے میں کافی عرصہ سے وہ لکھ رہے ہیں۔ ان کے مضامین کے موضوعات عموماً ادبی تاریخ سے متعلق ہوتے ہیں۔ انہوں نے یہ کتاب رباعی کے فن اور تاریخی ارتقا پر لکھی ہے۔ جس میں تفصیل سے رباعی کی فنی خصوصیات کی وضاحت کی ہے۔ چونکہ اس سلسلے میں ایک مخصوص مواد ہر لکھنے والا استعمال کرتا ہے۔ اس لئے فرمان فتح پوری نے بھی اس کو حسن و خوبی استعمال کیا ہے۔ البتہ رباعی لکھنے والوں کی ادبی اور شعری حیثیت کا تعین شاید ان کے لئے مشکل کام تھا۔ اُن کی تحریر میں سنجیدگی اور متانت ملتی ہے۔ اور کتاب بحیثیت مجموعی

معلوماتی ہے۔

## میرے گذشتہ شب و روز

جگن ناتھ آزاد
ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی
صفحات: ۶۲　　قیمت: ایک روپیہ ۲۵ پیسے۔

جگن ناتھ آزاد آزاد کے ایک جانے پہچانے شاعر ہیں۔ جن کی نظموں سے ہی ہندو پاک میں اُن کی سیاحی کا پتہ چلتا ہے۔ آزادی سے پہلے وہ اس علاقے میں رہتے تھے جو اب پاکستان میں ہے۔ اس کتاب کا محرک بھی شاید وہ جذبہ ہے جو وطن سے بے وطن ہونے کے بعد انہیں بے چین رکھتا ہے۔ کتاب کا عنوان خود اس بات کا غماز ہے کہ ماضی مصنف سے کچھ کہلوانا چاہتا ہے۔ اسے کچھ یاد دلاتا ہے۔ اسی لئے بظاہر اس کتاب میں تمام تر واقعات ہیں لیکن ان واقعات کی تہہ میں مصنف کے وہ آنسو چھپے ہوئے ہیں جو اس کی زندگی کا سرمایہ ہیں۔ روحانی طور پر ہند و پاک کے لئے واسطے ایک ہی وجود کا حصہ ہیں' ایک ایسا وجود جو زندگی کی مشترکہ اقدار سے تشکیل پاتا ہے۔ جس سے انسانی تہذیب میں سیاست پر ادب کی فوقیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے کچھ واقعات، کچھ خاکے اور کچھ یادیں اس کتاب کے بہانے ہماری نذر کی ہیں۔ جن میں ان کا خلوص بھی شامل ہے اور جذبے کی سچائی بھی۔ یہی اس کتاب کی سب سے بڑی اہمیت اور افادیت ہے۔

## بینا نابینا

ترجمہ: سید ابوالخیر کشفی
ملنے کا پتہ: اسعد اکیڈمی۔ سندھ۔ کراچی
صفحات: ۱۶۸　　قیمت: ایک روپیہ ۵۰ پیسے

یہ کتاب انگریزی کی ایک کتاب "Teacher of Life" مصنفہ ہیلن الیزاویٹ کا ترجمہ ہے جو ایک ایسی سوانح پیش کرتی ہے جس سے آدمی میں حوصلہ، ہمت اور زندگی کی لگن پیدا ہوتی ہے۔ ہیلن ایک گونگی، بہری اور اندھی عورت ہے۔ لیکن اس نے اپنے راستے میں زندگی کی کسی محرومی کو حائل نہیں ہونے دیا۔ ابوالخیر کشفی نے اس کتاب کا صاف ستھرا اور رواں ترجمہ کیا ہے اور اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں کہ زبان یا محاورہ ہو اور اس میں وہ تشنگی نہ پائی جائے جو عموماً کچے ترجموں میں ہوتی ہے۔ یہ کتاب ہر شخص کے پڑھنے کی ہے۔

## چاندنی کی پتیاں

ناصر شہزاد
ناشر: مکتبۂ ادب جدید۔ ۱۵۔ پٹیالہ گراؤنڈ، میکلوڈ روڈ۔ لاہور
صفحات: ۱۱۸　　قیمت: ۴ روپے ۵۰ پیسے

ایک صاحب نے ٹوائن بی کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ہندوستان کو سمجھنے اور اس کی دھرتی کی باس کو

ایک ہی موضوع میں کامیاب ہونا چاہتا ہے تو وہ ناصر شہزاد کا یہ مجموعہ پڑھے۔ افسوس کہ قوم اُن کی اس کتاب سے بے خبر ہے۔

ناصر شہزاد نے ہندی کے اُن الفاظ کا بے شمار استعمال کیا ہے جن کے تہذیبی پس منظر اور مزاج سے ہم سب ناواقف ہیں۔ ہمیں یہ الفاظ اچھے ضرور لگتے ہیں لیکن شاعری میں لفظ کو برتنے کے لئے ان الفاظ کا انتخاب کیا جاتا ہے جو دل کی دھڑکنوں اور انسانی تن کا ساتھ دیتے ہیں۔ اُن کی بیشتر نظموں میں کچا پن ملتا ہے۔ ہندی الفاظ کہیں بھی بھرپور تاثر نہیں دے سکے۔ دراصل جو توقعات کبیرداس، تلسی داس وغیرہ کو پڑھنے کے بعد ہم ہندی الفاظ سے وابستہ کر چکے ہیں، اس سے کمتر بھی ہمیں قبول ہے۔ لیکن الفاظ سے ناواقفیت کی حد تک ان کا کچا استعمال ذہن پر گراں گذرتا ہے۔ کسی کو ٹک اسٹال پر کھڑے ہوئے دیکھنے کی خبر دینے یا گلدان میں جنگل کی گھاس چن کر رکھنے کو مصرعہ بنا لینا شاعری کے ساتھ اچھا خاصا مذاق ہے۔ ہندوستان کے تہذیبی اور لسانی پس منظر میں صرف قرۃ العین حیدر نے نیا لٹریچر "آگ کا دریا" کی صورت میں دیا ہے۔ جو شاید اردو نثر کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ اور اس کے علاوہ کچھ لوگ میراجی کا نام لیتے ہیں۔ لیکن ناکام تجربے کو روایت سے الگ ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔ ناصر شہزاد کے لئے ابھی بہت وقت ہے کہ وہ اپنے اندر اور اپنے ماحول میں شعری امکانات کی تلاش کریں۔ اس مجموعے میں بعض اشعار اور نظموں کے کچھ حصے اچھے ہیں جن میں ٹھیراؤ ہے اور ہماری اپنی شعری روایت کی جھلک ملتی ہے۔ جدید شعراء کو کبھی یہ بات بھولنی نہیں چاہئے کہ تجربہ چاہے کتنا ہی نیا کیوں نہ ہو روایت کا احساس نہ دلا سکے تو اسے فوراً رد کر دینا چاہئے۔ اگر ناصر شہزاد نے اس کا خیال رکھا تو آئندہ اُن کی شعری کاوشیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔

## چکیدہ

مبین سلام

ملنے کا پتہ: قلات پبلشرز، مستونگ (قلات ڈویژن)

صفحات: ۱۵۰    قیمت: ۵ روپے

'چکیدہ' کوئٹہ کے رہنے والے مبین سلام کی اردو نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ مبین سلام بلوچی ہیں اور قبائلی زندگی کی عکس کشی، دلیری اور رومان پرور فضا سے گہرے طور پر واقف ہیں۔ اُن کی نظموں میں ایک نیا مزاج ملتا ہے ؎

کبھی اپنی صورت جو آئینے میں دیکھتا ہوں
تو یہ سوچتا ہوں
کہ میں وہ نہیں ہوں

جو میں پڑ ن

اُن کی مختصر نظم " میں " کو نمونہ کلام کے طور پر پیش کیا گیا ہے تاکہ قاری کو معین ، مسلم کے اسلوب شاعری کو سمجھنے میں دشواری نہ پیش آئے ۔ اُن کے یہاں قبائلی زندگی کے اثر سے تشبیہات اور استعارات کا اچھا ذخیرہ ملتا ہے ۔ اُن کی آزاد نظمیں پڑھنے والے کو خاص طور پر متاثر کرتی ہیں ۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے ۔ قیمت کچھ زیادہ ہے ۔

## رزم و نظم

مرتب : پاکستان کونسل

ملنے کا پتہ : پاکستان کونسل ۔ ۱۷۵ اگوئن مقامس روڈ ، راولپنڈی

صفحات : ۱۲۰　　قیمت : ۴ روپے ۔

ستمبر سنہ ۱۹۶۵ ء کی جنگ سے متعلق ہمارے ملک کے شعراء کی اردو ، بنگالی اور علاقائی نظموں کا ایک مختصر سا مجموعہ پاکستان کونسل کی جانب سے شائع ہوا ہے ۔ جس میں ہمارے چند شاعروں کے حب الوطنی کے جذبات مختلف انداز سے سامنے آئے ہیں ۔ بیشتر نظموں میں جذبہ بے حد شدید ہے اور بعض نظمیں ضبط و توازن کی مثال ہیں ۔ شاعروں میں جوش ملیح آبادی ، رئیس امروہوی ، محشر رسول نگری ، صوفی تبسم اور احمد ندیم قاسمی کے نام اہم ہیں ۔ پاکستان کونسل اگر کوشش کرتی تو ملک بھر کی مقبول ترین قومی نظموں کا نمائندہ انتخاب بھی ممکن تھا ۔ اس طرح قومی تاریخ کی تدوین میں ان نظموں سے مدد لی جا سکتی تھی ۔

یہ مختصر انتخاب کافی حسن و اہتمام سے شائع کیا گیا ہے ، البتہ قیمت کچھ زیادہ ہے ۔

## لوک گیت

اطہر علی فاروقی

ملنے کا پتہ : ادارہ انیس اردو ۔ الہ آباد ۳ (بھارت)

صفحات : ۸۰　　قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے

اطہر علی فاروقی نے لوک گیت پر ایک اچھا مقالہ کتابی صورت میں پیش کیا ہے ۔ جس میں گیت کیا ہیں ؟ گیتوں کی قدامت ، شاعری سے گیتوں کا تعلق ، گیت کی زبان اور طرزِ ادا ، گیت میں ہمارے عوام کے دلوں کی دھڑکن اور اُن کی تاریخی حیثیت سے بحث کی ہے جو حضرات گیتوں کے موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں یہ کتاب اُن کے لئے ایک قیمتی مرقع کی حیثیت رکھتی ہے ۔ کیونکہ اس موضوع پر بہت کم مواد ملتا ہے ۔ شادی بیاہ ، بچے کی پیدائش ، ساس بہو اور نند کے تعلقات سے متعلق ہمارے گیتوں میں ہماری سماجی زندگی کا جو عکس ملتا ہے ان پر اس کتاب میں مختصر مگر اہم نوٹ ملتے ہیں ۔

---

ص-ل

# رفتارِ عمل

## ادبی و ثقافتی خبریں اور تبصرے

## پاکستان رائٹرز گلڈ نے قومی یک جہتی کے لئے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں: جسٹس چودھری

## گلڈ نے مختصر سی مدت میں تمام ممالک کی ادبی انجمنوں سے رابطے قائم کرلئے ہیں: جمیل الدین عالی

## سائنسی ادب کا فروغ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے: ممتاز حسن

## گلڈ کی آٹھویں سالگرہ پر آدم جی، داؤد اور نیشنل بنک کے انعامات کا اعلان

کراچی - ۱۳ جنوری ۶۷ء کو ہوٹل میٹروپول میں گلڈ کی ۸ ویں سالگرہ کی تقریب منعقد ہوئی - مشرقی پاکستان ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس ابو سعید چودھری نے تقریب کی صدارت فرمائی - تلاوت کلام پاک سے جلسہ کا آغاز ہوا - اس کے بعد جمیل الدین عالی سکریٹری جنرل پاکستان رائٹرز گلڈ نے اپنی مختصر اور جامع رپورٹ پیش کی اور کہا کہ مختصر سی مدت میں گلڈ نے تمام ملکوں کی ادبی انجمنوں سے رابطے قائم کرلئے ہیں اور آج یہ ادارہ مصنفین پاکستان کا سب سے بڑا قومی ادارہ بن گیا ہے -

جناب لال میاں صدر گلڈ ٹرسٹ نے ادیبوں اور شاعروں سے اپیل کی کہ وہ دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کی سعی و جہد کریں اور جشنِ نزولِ قرآن کو کامیاب بنائیں -

جناب ممتاز حسن نے ادب اور سائنس کے باہمی رشتوں پر ایک جامع مقالہ پڑھا، اور دنیا کے مشہور سائنس دانوں کا حوالہ دے کر ادیبوں پر زور دیا کہ وہ سائنسی ادب کو فروغ دے کر وقت کی اہم ترین ضرورت کو پورا کریں -

آخر میں مہمان خصوصی و صدرِ تقریب مسٹر جسٹس چودھری نے اپنا فکر انگیز خطبۂ صدارت پڑھا جس میں کہا گیا تھا کہ گلڈ نے قومی یک جہتی کے لئے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں اور بیرونی ممالک میں بھی پاکستانی ادیبوں کا وقار بلند کر دیا ہے۔ انہوں نے تخلیقی ادیبوں اور مصنفین کو مشورہ دیا کہ وہ معاشرے کی تعمیر میں اپنے فرائض انجام دیں۔ وطن سے محبت کریں، ورنہ آزادی کا حق خطرہ میں پڑ جائے گا۔

آپ نے گلڈ کے منشور پر اظہار پسندیدگی فرماتے ہوئے کہا کہ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے بخوبی آگاہ ہیں۔

گلڈ ایسے نمائندہ ادارے کو ان گنت منصوبوں کی تکمیل کے سلسلے میں جن مالی دشواریوں کا سامنا ہے جسٹس چودھری نے ان پر بھی اظہار خیال فرمایا اور کہا کہ گلڈ کی مالی مشکلات جلد دور ہونا چاہئیں۔ انہوں نے توقع ظاہر کی کہ حکومت اور مخیر حضرات اس قومی ادارے کی مدد کر کے اسے بہتر خدمت کا موقع فراہم کریں گے۔

# پاکستان رائٹرز گلڈ

## نئی مرکزی کمیٹی برائے سال ۶۷ تا ۶۹ء کا انتخاب

کراچی۔ ۲۲ر جنوری ۶۷ء کو مشرقی اور مغربی پاکستان کی مرکزی اور علاقائی کمیٹی کے نمائندوں کا اجلاس جناب لال میاں کی صدارت میں یہاں منعقد ہوا جس میں تاخیر سے اجلاس طلب کرنے کے اسباب و علل، گذشتہ تین سال کی سرگرمیوں، اخراجات اور منصوبوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ پہلا اجلاس ۱۰ بجے شروع ہوا۔ دو بجے ظہرانہ کا وقفہ ہوا۔ تین بجے سے نئی مرکزی کمیٹی کے انتخابات شروع ہوئے جو چھ بجے تک مکمل ہو گئے۔ آخری اجلاس میں متعدد تجاویز مرکزی کمیٹی کی منظوری کے لئے پیش کی گئیں۔ نئی مرکزی کمیٹی کے ممبران یہ ہیں:۔

سکریٹری جنرل ——— جمیل الدین عالی (بلا مقابلہ)

**بنگلہ کے نمائندے:**

(۱) قاضی دین محمد (۲) ڈاکٹر محمد شہید اللہ (۳) ایس ایم بذل الرحمٰن (۴) جسیم الدین (۵) محبوب جمال (۶) منیر چودھری (۷) عبدالقادر (۸) محمد رفیق الاسلام (۹) لطف الحمید چودھری (۱۰) ریحان شریف

**اردو کے نمائندے:**

(۱) قتیل شفائی (۲) ریاض انور (۳) فارغ بخاری (۴) احسان دانش (۵) محمد طفیل (۶) حسن احمد اشک (۷) صہبا لکھنوی (۸) سرشار صدیقی (۹) یونس احمر (۱۰) بیگم حسن زمانی عالمگیر۔

نمائندہ پنجابی: احمد ظفر — نمائندہ پشتو: قلندر مومند
نمائندہ سندھی: شیخ ایاز۔

## غیر ملکی طلبہ کے لئے ثقافتی وظائف

راولپنڈی۔ وزارت تعلیم کی ثقافتی وظائف کی اسکیم کے تحت ۸ لاکھ روپے بطور وظائف ایسے غیر ملکی طلبہ کو جو پاکستانی درس گاہوں میں زیر تعلیم ہیں دیئے جائیں گے مختلف ملکوں کے طلبہ ۶۷-۱۹۶۶ء کے عرصے میں پاکستان میں تعلیم حاصل کریں گے۔

# شمالی ویٹ نام پر بمباری بند کی جائے : رائٹرز گلڈ کا مطالبہ

## افریقی ایشیائی ادیبوں کے بیورو سے تعاون کا فیصلہ

## گلڈ کی مرکزی کمیٹی کی منظور کردہ تجاویز

کراچی - ۲۲ر جنوری کو پاکستان رائٹرز گلڈ کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس جناب عبداللہ ظہیر الدین لال میاں کی صدارت میں منعقد ہوا - اور اتفاق رائے سے آٹھ تجاویز منظور کی گئیں، جن کا خلاصہ یہ ہے :- (۱) شمالی ویٹ نام پر امریکی بمباری کی شدید مذمت کی گئی اور اسے انسانیت کے منافی قرار دیتے ہوئے مطالبہ کیا گیا کہ شمالی ویت نام سے تمام غیر ملکی فوجیں واپس بلائی جائیں - (۲) کولمبو کے افریقی ایشیائی رائٹرز بیورو سے ہر قسم کا تعاون کیا جائے - (۳) فحش اور پاکستان دشمن لٹریچر پر مکمل پابندی عائد کی جائے - (۴) "کھنور کھیرے آکاش" اور "سر مقتل" نامی کتابوں پر پابندی لگانے کے فیصلے کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے، اور گلڈ کے ماہرین کی کمیٹی سے مشورہ لیا جائے - (۵) نصابی کتابوں اور فلم سنسر بورڈ میں گلڈ کے نمائندے شامل کئے جائیں - (۶) گلڈ کی امداد میں اضافہ کیا جائے - (۷) گلڈ پبلشنگ ہاؤس کی مطبوعات پر ممبران گلڈ کو ۳۰ فی صدی رعایت دی جائے - (۸) آخر میں اُن ادیبوں کی جدائی پر تعزیتی قرارداد منظور کی گئی جو گذشتہ تین سال میں رحلت کر گئے -

# ذہنی سرمایہ دار مگر جیب خالی

## ادیبوں اور صحافیوں کو رہائشی پلاٹ دیئے جائیں

کراچی - صوبائی وزیر بلدیات اور بنیادی جمہوریت میاں محمد یاسین خاں وٹو نے کے ڈی اے کے ڈائرکٹر کو ہدایت کی ہے کہ وہ کراچی کے عامل صحافیوں اور انجمن مصنفین پاکستان کے ان اراکین کے تمام کوائف پر مشتمل رپورٹ انہیں پیش کریں جنہیں اپنے مکانات تعمیر کرنے کے لئے اراضی کے پلاٹ درکار ہیں، تاکہ ان کے پلاٹوں کے الاٹمنٹ کا مسئلہ جلد از جلد طے کیا جائے -

انہوں نے کہا کہ صحافی اور ادیب ذہنی طور پر تو بہت سرمایہ دار ہوتے ہیں، لیکن اُن کی جیب عموماً خالی ہوتی ہے - میں نے اُن کے مسائل پر گورنر جناب محمد موسےٰ کو گذارشات پیش کی ہیں جنہیں ان سے بڑی ہمدردی ہے اور وہ ان کی اعانت کرنی چاہتے ہیں -

واضح رہے کہ ادیبوں اور صحافیوں کے وفود کئی سال سے اپنے بے گھر ساتھیوں کے لئے زمین کے حصول کی جدّو جہد کر رہے ہیں -

یہ بیان پاکستان رائٹرز گلڈ کے ایک وفد کی ملاقات کے بعد صوبائی گورنر نے دیا ہے -

گلڈ کے ایک وفد نے جو حا زق الخیری سکریٹری کراچی ریجن کے علاوہ صہبا لکھنوی مولانا رازق الخیری اور بیگم نورا لصباح پر مشتمل تھا، صوبائی وزیر میاں محمد یاسین وٹو کو پلاٹوں کی فراہمی کے سلسلے میں ایک یادداشت پیش کی ہے -

# آدم جی۔ داؤد اور نیشنل بنک ادبی انعامات

کراچی۔ گلڈ کی آٹھویں سالگرہ پر سنہ ۶۵ء میں شائع ہونے والی جن کتابوں کو انعامات دیئے گئے ان کی تفصیل یہ ہے

احمد فراز ——— "دردِ آشوب" ——— (مجموعۂ کلام) ——— ۵ ہزار روپیہ

(اردو نثر کی کوئی کتاب ججوں کے معیار پر پوری نہیں اُتری اس لئے ۵ ہزار کی رقم ۴۷ء تا ۶۶ء کے افسانوی انتخاب اور اس کے بنگلہ ترجمہ کے لئے مخصوص کر دی گئی، بنگلہ کتابوں کے انعامات کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

## داؤد ادبی انعام

۱ - ڈاکٹر شوکت سبزواری ——— "اردو لسانیات" ——— ۵ ہزار روپے

۲ - ڈاکٹر ظہیر الدین ——— "پاکستان میں فارسی ادب" ——— ۵ ہزار روپے

بنگلہ کتابوں کے انعامات کا اعلان بعد میں کیا جائے گا

## نیشنل بنک ادبی انعام

۱ - پروفیسر حمید عسکری ——— "حرارت" ——— ۵ ہزار روپے

۲ - ڈاکٹر ایس اے مینائی ——— "منی اینڈ بنکنگ" ——— ۵ ہزار روپیہ

۳ - ایس ایم ایچ جعفری ——— "دی فلورا آف کراچی" ——— ۵ ہزار روپے

۴ - محمد نواب اللہ ——— "بادشا بار بچا شنگھا نقن" ——— ۵ ہزار روپے

۵ - ڈاکٹر علی محمد یونس ——— "ادھبید بھرو تنتا" ——— ۵ ہزار روپے

## یونائیٹڈ بنک ادبی انعام

۲۰ ہزار روپے کا یہ مستقل ادبی انعام بچوں کے ادب کے لئے مخصوص ہے۔ اس انعام کا اعلان ۲۲ جنوری ۶۷ء کو مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں کیا گیا

# پاکستان کے علمی اداروں کی امداد

## ۱۰ لاکھ ۳۷ ہزار روپے کی منظوری

اسلام آباد۔ حکومت پاکستان نے مختلف علمی اداروں کے لئے دس لاکھ ۳۷ ہزار روپے کی امداد منظور کی ہے۔ اس رقم میں چار لاکھ اور سوا دو لاکھ روپے کی امداد قومی زبانوں بنگلہ اور اردو کی ترقی کے مرکزی بورڈ کو دی گئی ہے۔

بنگالی اکیڈیمی اور نذرل اکیڈیمی کو دی جانے والی سوا دو لاکھ روپے کی امدادی رقم اس کے علاوہ ہے۔ اس رقم سے بنگالی زبان و ادب پر تحقیقی کام جاری رکھا جائے گا۔ ڈیولپمنٹ بورڈ کو ایک لاکھ ۹۰ ہزار روپیہ کی امداد دی گئی ہے۔ یہ رقم ایک جامع اردو لغت کی ترتیب کے لئے ہے۔

اس کے علاوہ ایک تصحیح شدہ قرآن مجید کی طباعت کے لئے بھی خصوصی رقم محفوظ کی گئی ہے۔

# مشہور ادیب سید سبط حسن کی نئی کتاب "شہرِ نگاراں" کی افتتاحی تقریب

## اردو ۔ جاپانی کمیٹی کے صدر جناب میا موتو نے "شہر نگاراں" کا پہلا نسخہ ایک ہزار روپے میں خرید کیا

کراچی ۔ گزشتہ دنوں انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کے زیرِ اہتمام ملک کے مشہور ادیب، صحافی، اور دانشور سید سبط حسن کی نئی کتاب "شہر نگاراں" کی تقریب افتتاح اور عید ملن پارٹی منعقد ہوئی ۔

اس موقع پر سید سبط حسن نے تقریر کرتے ہوئے ملک کے ادیبوں سے اپیل کی کہ وہ نہ صرف اردگرد کے واقعات کا بلکہ عظیم ماضی کا جائزہ لے کر اپنی تخلیقات پوری دیانت اور خلوص کے ساتھ پیش کریں تاکہ ہمارے اسلاف کے کارنامے محفوظ ہو سکیں ۔ دکن کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا: میں آج بھی ہر حیدر آبادی کو اسی طرح پیار کرتا ہوں جس طرح اپنے قیامِ حیدر آباد کے زمانے میں کرتا تھا، اور اس عظیم مملکت کا آج بھی اسی طرح قدرداں ہوں ۔

اردو ۔ جاپانی کمیٹی کے صدر اور تقریب کے مہمانِ خصوصی میا موتو نے "شہر نگاراں" کا پہلا نسخہ ایک ہزار روپے میں خریدتے ہوئے نہایت شستہ اردو میں تقریر کی اور کہا کہ مجھے اپنی مادری زبان جاپانی کے بعد سب سے زیادہ محبت اردو زبان سے ہے اور اسی وجہ سے میں اردو بولتا ہوں، اردو پڑھتا ہوں اور اردو لکھتا ہوں ۔

رسمِ افتتاح کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کے معتمد مرزا ظفر الحسن نے کتاب کے مصنف سید سبط حسن اور مسٹر میا موتو کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کا یادگار واقعہ ہے کہ کسی نئی کتاب کا پہلا نسخہ اس قیمت پر خریدا گیا ہو، اور ایک ایسے شخص نے خریدا ہو جن کی مادری زبان اردو نہیں ۔

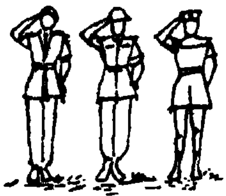
اس تقریب میں ممتاز فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کے علاوہ شہر کے معززین اور خواتین نے کثیر تعداد میں شرکت کی ۔ ہر مہمان نے "شہر نگاراں" کا ایک ایک نسخہ بھی خریدا ۔ سید سبط حسن کی یہ نئی کتاب انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ نے نہایت اہتمام سے شائع کی ہے ۔

### شمعیں بجھ رہی ہیں

کراچی ۔ یہ خبر علمی و ادبی حلقوں میں نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ جنوری ۱۹۷۷ء کے دوران چار اور مشہور و ممتاز شخصیتیں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئیں ۔ بیگم عطیہ فیضی، صدق جالسی ۔ پروفیسر 'آغا اشہر لکھنوی'، اور جوان سال شاعر سید رشکیب کی رحلت سے اردو ادب کو جو نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی شاید ہی ہو سکے ۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ان کی مغفرت کرے اور متعلقین کو صبر کی توفیق عطا فرمائے ۔

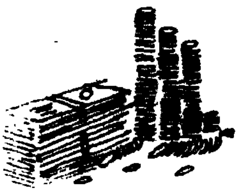
# وطن کی بھلائی

## اور



# کنبے کی بھلائی

## کیلئے



# ڈیفینس سیونگز سرٹیفکیٹ

ڈیفینس سیونگز سرٹیفکیٹ میں سرمایہ لگانا ہمیشہ سے زیادہ منافع کمانے کا، بہترین ذریعہ اور ملک کے دفاع میں ہاتھ بٹانے کا بے نظیر موقع ہے۔

ڈیفینس سیونگز سرٹیفکیٹ کی چند اہم خصوصیات

★ اگر آپ یہ سرٹیفکیٹ پانچ برس تک رکھیں تو منافع ۶ فیصد ملیگا اگر مزید پانچ برس رکھیں تو منافع ۸ فیصد ہو جائیگا یعنی ۶ فیصد منافع اور مزید ۲ فیصد بونس۔ اس طرح صرف دس برس میں آپ کے ۱۰۰ روپے ۱۸۰ روپے بن جائیں گے۔

★ منافع اور بونس دونوں پر ٹیکس کی مکمل چھوٹ ہے۔ آپ کی لگائی ہوئی ابتدائی رقم پر بھی انکم ٹیکس کی رعایت ملتی ہے یعنی اتنی رقم آپ کی آمدنی میں سے منہا کر کے ٹیکس تشخیص کیا جاتا ہے۔

★ انفرادی طور پر ۲۵ ہزار روپے تک کے ڈیفینس سیونگز سرٹیفکیٹ خریدے جا سکتے ہیں اور مشترکہ طور پر ۵۰ ہزار روپے تک۔ ادارے اس سے زیادہ رقم بھی لگا سکتے ہیں اور ضابطے کے مطابق نامزدگیوں کی بھی اجازت ہے۔

★ پراویڈنٹ فنڈ سے بھی رقم لگائی جا سکتی ہے جس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

## ڈیفینس سیونگز سرٹیفکیٹ

۵ روپے۔ ۱۰ روپے۔ ۵۰ روپے۔ ۱۰۰ روپے۔ ۵۰۰ روپے۔ ۱۰۰۰ روپے اور ۵۰۰۰ روپے کی مالیتوں میں ڈیفینس سیونگ سرٹیفکیٹ اسٹیٹ بینک آف پاکستان منظور شدہ بینکوں اور ڈاکخانوں سے خریدے جا سکتے ہیں۔

مکتبۂ افکار کی ایک اور فخریہ پیش کش

# غالبؔ، ایک مطالعہ

مرتبہ: صہبا لکھنوی

مرزا غالبؔ کی صد سالہ برسی (سن ہجری کے حساب سے) کے موقع پر فروری ۱۹۶۵ء میں افکار نے غالب نمبر پیش کیا تھا جو شائع ہوتے ہی ختم ہو گیا۔ اور ہزاروں طلبہ و طالبانِ ادب اس کے مطالعہ سے محروم رہ گئے۔ غالب نمبر کی فرمائشات کا سلسلہ آج تک جاری ہے، اور ہم تعمیل سے قاصر ہیں۔ افکار کی دیگر خاص اشاعتوں کی طرح غالب نمبر بھی ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسے اب نظرِ ثانی اور کئی نئے مضامین کے اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں:

## غالبؔ، ایک مطالعہ

کے عنوان سے مکتبۂ افکار روایتی حسن و معیار کے ساتھ عنقریب غالب شناسوں کی خدمت میں پیش کرے گا،

اشاعت کا انتظار کیجیے

## مکتبۂ افکار

رابسن روڈ کراچی

افکار دوستوں سے

# ایک اپیل

خریداری مہم میں سرگرمی سے حصہ لیجئے!

اچھے اور معیاری ادب کی حوصلہ افزائی کیجئے

افکار خود بھی پڑھئے اور عزیزوں اور دوستوں

کو بھی اس کے مطالعہ کی دعوت دیجئے

زر سالانہ صرف بارہ روپے

ادا فرمائیے آپ اور گھر کا ہر فرد افکار سے استفادہ کرسکتا ہے

افکار اردو ماہناموں کی آبرو ہے

افکار آپ کا اپنا رسالہ ہے

افکار کی

توسیع اشاعت میں حصہ لے کر تعاون کیجئے

زر سالانہ اس پتے پر بھیجئے:

## منیجر ماہنامہ افکار

رابسن روڈ کراچی

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی — طابع: مطبوعہ آصف پریس کراچی — دفتر: رابسن روڈ کراچی




سیرت کی ایک کتاب ——— مجتبیٰ حسین
ادب کی تعلیم ——— انجم اعظمی
نیپلز میں مشرقی علوم کا ادارہ ——— آغا افتخار حسین

---

سردار جعفری ——— نیاز حیدر ——— سیّد فیضی
جمیل ملک ——— سراج الدین ظفر ——— رضا ہمدانی
قمر ہاشمی ——— سحر انصاری ——— شہریار
سرشار صدیقی — اور — ریاض انور — وغیرہ
کی تازہ ترین منظومات

---

○ ۶ نئے افسانے
○ نئی کتابیں
○ ادبی و تہذیبی خبریں اور تبصرے

# گھر بیٹھے دیکھئے!



اب تک پانچ روپے اور دس روپے والے بونڈز کے انعامات کی فہرست گزٹ آف پاکستان، اخباروں، پوسٹرز اور کتابچوں کی صورت میں شائع ہوتی رہی ہے۔
اس کے علاوہ اب انعامات کی فہرست ہر ماہ "نیشنل سیونگز نیوز" میں بھی شائع ہوتی ہے۔ یہ ایک ماہانہ رسالہ ہے جسے سنٹرل ڈائرکٹریٹ آف نیشنل سیونگز، حکومت پاکستان، جاری کرتا ہے۔ سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ۔

آپ "نیشنل سیونگز نیوز" تمام منظور شدہ بینکوں اور ڈاکخانوں سے خرید سکتے ہیں یا سنٹرل ڈائرکٹریٹ آف نیشنل سیونگز" کو ایک روپیہ کا پوسٹل آرڈر بھیج کر ایک سال تک گھر بیٹھے حاصل کر سکتے ہیں۔ بھیجنے سے پہلے پوسٹل آرڈر پر کراس لازماً کر دیجئے۔ بھیجنے کا پتہ: سنٹرل ڈائرکٹریٹ آف نیشنل سیونگز۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۹۲۔ کراچی ۱

## انعامی بونڈ۔ ملک کی ترقی اور حفاظت کے لئے

# نیشنل سیونگز نیوز

محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، راولپنڈی
اور جنرل ہیڈ کوارٹرز آرمی ایجوکیشن سے منظور شدہ

جاری شدہ: ۱۹۴۵ * ٹیلی فون: ۷۳۹۹۳


# افکار

سال: ۲۲ ○ شمارہ: ۱۸۷


مدیر
صہبا لکھنوی


| زرِ سالانہ | بیرونی ملکوں سے | | قیمت |
|---|---|---|---|
| ۱۲ روپے | ۴۰ شلنگ | ۱۰ ڈالر | ایک روپیہ |


مکتبۂ افکار
رابسن روڈ کراچی

[illegible]
۱۳- پرنسیز ایونیو۔ لندن۔ این ڈبلیو نمبر ۹

اردو کے مشہور و ممتاز ادیب

سید سبطِ حسن کی نئی کتاب

# شہرِ نگاراں

**شائع ہو گئی**

## شہرِ نگاراں

حیدرآباد دکن کی گراں مایہ شخصیتوں، مشہور علمی
ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں اور حسین یادوں
اور یادداشتوں کا خوب صورت مرقع ہے، جسے
سید سبطِ حسن کے جادو نگار قلم نے جاوداں بنا دیا ہے

انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ
کی پہلی فخریہ پیش کش

بہترین گیٹ اپ ـــــ سرورق: شاکر علی
صفحات :- ۲۷۴ ـــــ متعدد تصاویر
قیمت مجلد:- پانچ روپے

ملنے کا پتہ

## مکتبۂ افکار

رابسن روڈ کراچی

## مارچ ۱۹۶۷ء کی تخلیقات

اشاریہ

# کاغذ کی ہولناک گرانی

گذشتہ چند ماہ سے اشیائے حیات کی گرانی اور نایابی کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے وہ روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے حکومت کی مشینری اگرچہ حرکت میں ہے اور گرانی کو ختم کرنے اور عوامی مشکلات کو دور کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے لیکن افسوس کہ وہ تاجر پیشہ طبقہ جس نے گذشتہ ستمبر کی جنگ کے دوران بے مثال وطن اور عوام دوستی کا ثبوت دے کر اشیاء زندگی کی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہیں کیا تھا ——— اس وقت عوام کی لوٹ کھسوٹ میں لگ گیا ہے اور وطن، عوام، انسانی اور تہذیبی قدروں سے محبت کے سارے خواب بے تعبیر ہو کر رہ گئے ہیں۔ جس تاجر کو جہاں موقع ملتا ہے ——— اشیاء کی "مصنوعی قلت" پیدا کر کے روزمرہ کی ضروریات کی قیمتیں بڑھا دیتا ہے۔

ابھی اشیاء خورد و نوش کی گرانی کا سلسلہ ختم ہوا تھا کہ یکایک کاغذ کا کال پڑ گیا، اور جو کاغذ کھلے بازار میں گیارہ بارہ روپیہ فی ریم آسانی سے مل رہا تھا سترہ اٹھارہ روپے تک پہنچ گیا۔ کراچی کو بندرگاہ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں ایک نہیں ان گنت کاغذ کے بڑے بڑے بیوپاری ہیں۔ لیکن چونکہ نفع اندوزی مقصود تھی اس لئے بڑے تاجروں نے نہایت خاموشی سے اپنا اسٹاک چھوٹے بیوپاریوں کو منتقل کر دیا۔ جو "کالے بازار" میں اسے علی الاعلان من مانی قیمتوں پر فروخت کر رہے ہیں۔ اور بڑے تاجر خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔

اشیاء کی "مصنوعی قلت" پیدا کر کے قیمتوں کو اپنی مرضی سے بڑھا دینے کا یہ رجحان ارباب حکومت کے لئے یقیناً محتاج توجہ ہے۔ امتحانات قریب ہیں۔ کاغذ ضروریاتِ زندگی میں شامل ہے اور علمی و تعلیمی ادارے اس کے بغیر ایک پل زندہ نہیں رہ سکتے، اس لئے ضرورت ہے کہ کاغذ کی گرانی اور نایابی پر فوری قابو پایا جائے اور اُن بیوپاریوں کے خلاف سخت قدم اٹھایا جائے جو اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں ——— سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ کاغذ ملک ہی میں بنتا ہے اور ضرورت سے زیادہ بنتا ہے اس لئے برآمد بھی کیا جاتا ہے ——— پھر یہ آئے دن قیمتوں میں اُتار چڑھاؤ کیوں ہوتا ہے اور اس کا ذمہ دار کون ہے ——— اور کیا اس کا مستقل تدارک ممکن نہیں ؟!

"افکار" کا یہ شمارہ کالے بازار سے خریدے ہوئے کاغذ پر بدقت شائع کیا جا رہا ہے ——— لیکن آئندہ زیادہ دنوں تک افکار بھی اس گرانی کا متحمل نہیں ہو سکتا ——— اشیائے طباعت، کتابت اور پریس کی اجرتوں میں پہلے ہی اضافہ ہو چکا ہے اور مسلسل گرانی کے باوجود ہم نے افکار کی قیمت میں اب تک کوئی اضافہ نہیں کیا، اور تا بمقدور مہنگائی اور گرانی کا مقابلہ کرتے رہے لیکن اب حالات ناقابل برداشت ہوتے جا رہے ہیں۔ اور ہمارے لئے "افکار" کا زندہ رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔

رفیقانِ "افکار" سے پھر ایک بار درخواست ہے کہ وہ پھر اور سرگرمی کا ثبوت دے کر خریداری مہم میں عملی تعاون فرمائیں بشرطیکہ وہ "افکار" اور اس کی مثالی روایات کو زندہ رکھنا ضروری سمجھیں ——— ہم نے "افکار" کی زندگی کی خاطر اپنی زندگی تک کی بازی لگا رکھی ہے اور جب تک ہمارے حالات و وسائل اور رفیقانِ افکار کی عملی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہیں ہم خون کے آخری قطرے تک "افکار" کی ۲۲ سالہ ادبی روایت کو برقرار رکھنے کی سعی و جہد جاری رکھیں گے ——— آگے جو خدا کی مرضی!

سردار جعفری

# گفتگو

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شامِ ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

ہوں جو الفاظ کے ہاتھوں میں ہیں سنگِ دشنام
طنز چھلکائے تو چھلکایا کرے زہر کے جام
تیکھی نظریں ہوں، ترش ابروئے خمدار رہیں
بن پڑے جیسے بھی دل سینوں میں بیدار رہیں
بے بسی حرف کو زنجیر بہ پا کر نہ سکے
کوئی قاتل ہو مگر قتلِ نوا کر نہ سکے

صبح تک ڈھل کے کوئی حرفِ وفا آئے گا
عشق آئے گا بصد لغزشِ پا آئے گا
نظریں جھک جائیں گی، دل دھڑکیں گے، لب کانپیں گے
خامشی بوسۂ لب بن کے مہک جائے گی
صرف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئے گی

اور پھر حرف و نوا کی نہ ضرورت ہوگی
چشم و ابرو کے اشاروں میں محبت ہوگی
نفرت اٹھ جائے گی مہمان مروت ہوگی

ہاتھ میں ہاتھ لئے، سارا جہاں ساتھ لئے
تحفۂ درد لئے، پیار کی سوغات لئے
ریگزاروں سے عداوت کے گزر جائیں گے
خوں کے دریاؤں سے ہم پار اتر جائیں گے

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شامِ ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

○

سیماب

# غالب

میر جس دیوار کے سائے میں کرتا تھا بسر
عشق کو تیرے وہی دیوارِ زنداں ہے تو کیا
تیری آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
تھا ازل سے جن کو حاصل ذوقِ دیدارِ جمال
چاک دامانیٔ گل
زخمِ جگر
غم ہی جس کا بخیہ گر
چشمِ سوزن سے گزرتا منظرِ تارِ نظر
جلوۂ دار و رسن
قیس کی فریاد تک ہے زیبِ شورِ جنوں
"صبح کرنا شام کا"
ہنگامِ قلب کوہکن
"برقِ خرمن کا ہیولا"
گرمِ خوں
دہقاں کا دل
اور قد و گیسو کی آرائش
حریفِ آرزو
اور بہ ہم اشک آنکھوں میں سلے تیرا شباب
بے محل دعش ان مصائب میں رہا نغمہ طراز
"جتنے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں"
اور تیرے نیم کا ہنگ دل سے آشنا

افکار

جس کی لے پر وجد میں دیر و حرم کی زندگی
شاہد و مشہود
محبوب و حبیب
دلفروزی وصل کی
فرقت کی ظلمت گستری
جام و مینا بجھ گئے روشن رہی بزمِ خیال
ہر حقیقت سے عیاں نکتۂ دلِ درد آشنا
ایک ذرہ ایک صحرا
قطـــرہ دجلہ
جُز میں کُل
زندگی کا رمز ـــ اسرارِ نہاں
"رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں"
ٹوٹا ہوا خوابِ ظفر
بے تاج شاہِ تاجور
ظالم فرنگی فتنہ گر
ہر سمت برپا شور و شر
حیران و ششدر شاعری
تہذیب تو کیا چیز ہے
حیران و ششدر شاعری
رَو میں ہے رخشِ عمر بھی
کاٹے جاتے ہیں تو سے ننھے سرِ دار و رسن
دلّی دلِ ارضِ وطن
لرزش میں جل برگِ سمن
شیدائیانِ حریت
باندھے ہوئے سر سے کفن
تذرِ وطن ہے جسم و جاں
کیا ان کے نام، ان کے نشاں
"سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں"

سیّد فیضی

# جاگ اُٹھا افریشیا

دبی دبی سی جو رہتی ہے شدّتِ احساس
میں چُپ رہوں، مری فطرت کا اقتضا تو نہیں
یہ میری شمعیں مرے ہی لہو سے روشن ہیں
اُجالی ہے اِنہی شمعوں نے ایشیا کی زمیں

ہو ویت نام، فلسطیں کہ وادیٔ کشمیر
جہاں بھی اہلِ وفا ہیں چراغِ منزل ہیں
نہ وقت کا ہے تعیّن نہ فاصلے باقی
بھڑکتے شعلے بہاروں کے ساتھ شامل ہیں

نہتے لوگوں نے بیداد سہہ کے دیکھ لیا
جہاں ہو عـــزم تو کیا کچھ یہ کر نہیں سکتے
ستم کی لاکھ چُنی جائیں ان پہ دیواریں
یہ حرّیت کے فدائی ہیں مر نہیں سکتے

قدم قدم پہ سیاست کے تاجرانہ فریب
نگاہِ ظلم کو جب بے نقاب کرتے ہیں
تو امن کے جو گلوکار ہیں وہی بڑھ کر
بنـامِ امن فضا کو خراب کرتے ہیں

ستم رسیدہ، گریباں دریدہ تھے جمہور
عوام، جن کی نظر میں فقط اندھیرا تھا
اب اس طرح ہیں وہ افریقہ ایشیا میں بلند
کہ اُن کے عزم سے افریشیا بھی جاگ اٹھا

جمیل ملک

# دل سے باتیں

میں پھولوں کے جھرمٹ میں تنہا کھڑا ہوں
صداؤں کے سیلاب میں بہہ رہا ہوں

'یہ گلچیں کہاں سے یہاں آ گیا ہے!
یہ کیوں رنگ و خوشبو کا دشمن ہوا ہے!

تو کیا یہ خطا ہے کہ ہم کھل رہے ہیں
انوکھی ادا سے گلے مل رہے ہیں'

میں باتوں کے گرداب میں کھو گیا ہوں
بہاروں کی آغوش میں سو گیا ہوں

اٹھوں گا تو بدلا ہوا دور ہوگا
سنبھلنے کا انداز ہی اور ہوگا

بہاروں کے سینے میں کھٹکا نہ ہوگا
کسی پھول کے پاس کانٹا نہ ہوگا

قمر ہاشمی

# تماشا طلب آزار

ہم مزرعِ اظہار میں بوتے رہے الفاظ
معنیٰ کی کبھی فصل نہ کاٹی
جب عکس کبھی ذات نہیں بن سکتے
الفاظ بھی جذبات نہیں بن سکتے
تحریر نہیں عکس جمالِ دلدار
تصویر سے کیا بہلے تماشا طلب آزار
وہ خواہش نمناک
کہ احساس کے دامن پہ گری تھی
زندہ نہ ہوئی پھر کبھی یادوں کی ہوا سے
حسرت زدہ آنکھوں کے ترستے ہوئے گوشے
رخسار کے فانوس چھپائے
لمحوں کی گزرگاہ میں کھو جاتے ہیں اکثر
تہذیب کے صحرا میں نمودِ سحر جسم
ہر چشم تماشا کے لئے صاعقہ افگن
ہر بزم طربناک میں آتش فشاں جسم
کھینچے ہوئے لمحوں کی طنابیں
جذبات کے آتشکدے بھڑکائے ہوئے ہیں
ہر کوچہ و بازار کہ ہے آئینہ خانہ
دل ٹوٹے ہوئے کانچ کی مانند وہاں ہیں

ریاض انور

# آرزوؤں کا بھنور

(مشرقی پاکستان پر طویل نظم کا ایک حصّہ)

یہ چائے باگان گورے آقاؤں کے گناہوں کی یادگاریں
ہری بھری وادیوں میں نوحہ کناں ہیں عنبرفشاں بہاریں
سبک ہواؤں میں برگ گل بن کے راکھ خوابوں کی تیرتی ہے
مہکتی، مسکاتی، بیکراں زندگی کے وہ خواب ہائے شیریں
جو پا بہ زنجیر آدمی کی نگاہِ ویراں میں جل بجھے ہیں
یہ گلشن جبر جس میں خوابوں کی آرزو بھی ہے جرم سنگیں
یہ حبس عطر بیز جس میں لبوں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں
یہاں تو انسان صرف خاموش سائے بن کر کھڑے ہوئے ہیں
یہاں سے آنکھوں کی روشنی چھین کر خدایانِ سیم و زر نے
اک اجنبی دیس میں کئے جا کے اپنے محلوں کے دیپ روشن
یہاں کے بیٹوں کی لوحِ تقدیر پر لکھے سب بے چراغ آنگن
یہی ہیں وہ بے چراغ آنگن کہ جن کے سایوں کی تیرگی سے
نہ جانے کتنی حسین سنتالی لڑکیاں چاند بن کے ابھریں
جو اپنے آقاؤں کے شبستاں میں راکھ بن کر بکھر گئی ہیں
یہ چائے کے دل نواز باغات جن کی مغموم دل کشی میں

---

لہ بیتی باڑی (بنگلہ)

اردو ہمت کشوں کے خونِ جواں کی رعنائی کانپتی ہے
ابھی ابھی اجنبی خداؤں کے نقشِ پا سے دہک رہے ہیں
یہ پیچ در پیچ کوہساروں کے سلسلے
جیسے دل کے صحرا میں
آرزوؤں کی بادِ صرصر سے
ریت پر نقش بنتے چلے گئے ہیں،
نیلا آکاش، سبز پربت، حسیں خیاباں
خود اپنی ہیبت سے کانپتے جنگلوں کا افسوں
یہ سبزہ زاروں میں گاتی، بل کھاتی رہگذاریں
کسی کا آنچل ڈھلک کے موجِ خرام کو
راستے کی شکل میں ڈھال گیا ہے،
فضا میں ڈوبی ہوئی ہواؤں کی نغمہ ریزی
تبسّمِ زیرِ لب کی مجبور دل نوازی
یہ موسمِ برشگال یہ اونگھتی گھٹائیں
کہیں اجالے کی نرم کرنوں کا سیلِ سیمیں
کہیں خنک چھاؤں برگِ گل سے لپٹ کے ہے محوِ خوابِ شیریں
کہیں یہ بجلی سی پھانک اک رو پہلے نازک
صبا کے دوشِ جواں پہ لہراتی
بستی بستی پہ رنگ برساتی
جا رہی ہے،
مگر یہ حسن و جمال کیوں اک سوال بن کر
نگارِ ہستی کی چشمِ نیگوں میں کانپتا ہے،
کبھی کبھی ان حسیں بہاروں میں
مرغزاروں میں

آگ اور خون کے بگولے بھی پھیلتے ہیں،
کبھی جواں منجمد رگوں میں
لہو پگھلتا ہے آتشِ غم کی آنچ پا کر
تو دستِ قدرت سے چھوٹ جاتی ہے
لوحِ تقدیرِ ابنِ آدم
خود اپنی تقدیر بن کے اٹھتا ہے آدمی مثلِ موجۂ یم
ہوائے مشکیں میں تھرتھراتا ہے اک نئی زندگی کا پرچم
مگر یہ ڈستے ہوئے اندھیرے
یہاں کی تقدیر بن چکے ہیں
نظر کے جگنو، لبوں کی شمعیں
چھنکتی پازیب کے ستارے
بھڑکتے جسموں کے تند شعلے
حیات کی تیرگی میں شاید
کبھی اجالے نہ بھر سکیں گے
نہ جی سکیں گے نہ مر سکیں گے
یہ شاہزادوں کا دیس ہے اور ماہ پاروں کی سرزمیں ہے
دہکتے جنگلوں، مہکتے جسموں، چہکتی کاروں کی سرزمیں ہے
کہر میں ڈوبی ہوئی یہ صبحیں، ملول شامیں، خموش راتیں
یہ والٹز کی دھن پہ ناچتی بے قرار روحیں اداس چہرے
رجو اپنی تنہائیوں کی اگنی میں جل کے سایوں میں ڈھل گئے ہیں
یہ جام و مینا سے پھوٹتی روشنی حسیں رت جگوں کے میلے
بجھی نگاہیں، بھنچے ہوئے لب، شکستہ دل اور دریدہ داماں
نہ کوئی آواز کا سہارا نہ کوئی اشکوں کی شمع لرزاں
شجر شجر اک صلیب بن کر کسی مسیحا کا منتظر ہے

سحر انصاری

# نظامِ شمسی

سطحِ زمیں بھی چرخِ بریں سے کم تو نہیں ہے
ذرّوں میں بھی روشن چاند ستارے مل جاتے ہیں
گلیوں کی سنسان فضا میں لمحہ لمحہ
زیست کی گردش ماہ و سال بُنا کرتی ہے

دنیا بھی ہے ایک نظامِ شمسی جس کو
علمِ ہیئت سے بے بہرہ، ناپختہ، ناقص ذہنوں نے
جب بھی وہم و گماں کی تنگ رصدگاہوں کے
دھندلے عدسوں سے دیکھا ہے
نظمِ جہاں کو بے ترتیب سمجھ کر
سطحِ زمیں کے سیاروں کی بابت اکثر یہی کہا ہے
ان میں باہم کوئی کشش موجود نہیں ہے
اپنے اپنے محور پر سب گھوم رہے ہیں۔

ساغر خورشید

# زہرِ تنہائی

نہ قربتوں کا تصور نہ فاصلوں کا خیال
نہ اشکِ خوں نہ تبسم کی چاندنی ہی رہی
نہ کوئی رنگ نہ خوشبو نہ یاد کے بادل
کھلے نہ بندِ قبا اور نہ بوئے گل ہی اُڑی
کوئی گلہ، نہ شکایت، نہ دوستی کی طلب
حدیثِ یار نہ ذکرِ صلیب و دار و رسن
کوئی خدائی کا دعوےٰ نہ انقلاب کی بات
نہ شورِ مقتل و زنداں نہ پیار کے نغمے
نگاہ باز دریچوں کو تاکتی ہی نہیں

نہ کوئی یار جو ملنے کی آرزو کرتے
وفا نہیں نہ سہی کچھ عتاب ہی ہوتا
کہیں تو آگ سُلگتی کوئی تو دل جلتا
نہ تھا جو مرہم آزار زخم ہی ہوتے
کوئی خلش، نہ تمنا، نہ زندگی کی تڑپ
حیات بند ہو جیسے دبیز پردوں میں
سکوتِ شام، سکوتِ سحر، سکوتِ حیات
ہزار تلخ سہی زندگی کے ہنگامے
بہت ہی تلخ ہے یہ زہر، زہرِ تنہائی

مجتبیٰ حسین

# سیرت کی ایک کتاب

"سیرتِ رسول اللہ" پروفیسر سید نواب علی مرحوم کی لکھی ہوئی ہے۔

سید نواب علی ہماری اس قدیم علمی اور ادبی بزم کے ممتاز رکن تھے جو اب اُجڑ چکی ہے۔ اس بزم کے ارکان میں سے مولانا شبلی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال اور ابوالکلام آزاد جیسی عہد آفریں ہستیاں تھیں۔ تاریخ، تحقیق، سیاست، مذہب، ادب، ہر شعبے میں ان بزرگوں نے جو کام انجام دیئے ہیں، وہ ہماری فکری، علمی اور تہذیبی دنیا میں ہمیشہ ایک فیضان، ایک تحریک کی حیثیت رکھیں گے۔

پروفیسر نواب علی کا خاص میدان اسرائیلیات ہے۔ اسرائیلیات نے قصص، حکایات اور خرافات کے ذریعے سے جس طرح عام ذہنوں اور دینی عقائد میں وسوسہ پیدا کر دینے کے امکانات فراہم کر دیئے تھے، پروفیسر نواب علی نے ان خطرناک امکانات اور رجحانات کو تحقیق اور دلائل کے ذریعے سے ختم کر دینے کی قابلِ قدر سعی فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی مشہور کتاب "صحفِ سماوی" علمی حلقوں میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

جدید علم الکلام جس کی بنیاد سرسید نے ڈالی تھی، پروفیسر سید نواب علی نے اس سے بڑے اہم اور مفید کام لئے ہیں۔ "سیرتِ رسول اللہ" میں بھی پروفیسر نواب علی نے اس علم الکلام کی رہنمائی میں تحقیق اور تلاش کی راہیں طے کی ہیں۔

یہ کتاب پہلی بار سنہ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی اور مختلف تعلیمی اداروں کے نصاب میں شامل رہی۔ مدت سے نایاب تھی، اب مکتبۂ افکار کراچی نے اسے دوبارہ شائع کر کے ایک تاریخی خدمت انجام دی ہے۔

سیرت رسول اللہ سے قبل مولانا شبلی کی سیرت النبی شائع ہو چکی تھی۔ سیرت النبی تاریخ اور تحقیق کا ایک کارنامہ ہے۔ مولانا شبلی نے وسیع اور نازک مباحث پر جس وسعت نظری اور تحقیقی بصیرت کے ساتھ قلم اٹھایا ہے، اور جس خوش بیانی سے کام لیا ہے اس نے سیرت کو ایک عظیم تاریخی اور ادبی شاہکار کی حیثیت دے دی ہے۔

پروفیسر نواب علی نے سیرت لکھنے کا کام بہت پہلے شروع کر دیا تھا۔ وہ سنہ ۱۹۰۷ء ہی میں آنحضرت کی زندگی پر ایک کتاب "تذکرۃ المصطفےٰ" لکھ چکے تھے۔ ان کے ذہن میں شروع ہی سے یہ خیال بار بار ابھرتا تھا کہ سیرت رسول پر ایسی کتاب لکھی جانی چاہیئے جو ان تمام اور گستاخانہ اعتراضات کا مدلل جواب بن سکے جو وقتاً فوقتاً مغربی مورخین اور مستشرقین کی جانب سے

کے جانشین ہیں۔

یہی جذبہ سرسید کو بھی بے چین کئے ہوئے تھا۔ چنانچہ ولیم میور کے جواب میں انہوں نے "خطبات احمدیہ" لکھ کر ایک نہایت مفید اور بروقت خدمت انجام دی۔

دراصل اس وقت کے تمام سوچنے سمجھنے والے ذہنوں کے سامنے دو سوال تھے:

○ ایک یہ کہ کس طرح مسلمانوں کے سیاسی اور معاشرتی زوال کو ختم کیا جائے؟

○ دوسرے یہ کہ جدید علوم و فنون کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کو کس طرح مدلل اور دلنشیں بنا کر پیش کیا جائے؟

مغرب نے برصغیر کے مسلمانوں پر دو رُخ سے حملہ کیا تھا۔ ایک تو سیاسی اور معاشرتی حملہ تھا۔ دوسرا حملہ علمی اور فکری محاذ پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید، نذیر احمد، حالی، شبلی، محسن الملک، ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، سب کی تحریروں میں انہیں دو محاذوں پر مغربی حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش ملتی ہے۔

پروفیسر نواب علی کو بھی یہی جذبہ سیرت کی طرف لے گیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"یورپ میں جس اصول پر سیرت مسیح کو پیش کرتے ہیں، اور اُسی کے ساتھ جس طور سے آنحضرت صلعم کی سیرت پاک کو قدیم ماخذوں کے حوالہ سے مسخ کر کے مستشرقین دام فریب بچھا رہے ہیں۔ اس کی طرف آج کل یہاں ـــ اگر کچھ توجہ کی جاتی ہے تو اس قدر کہ پبلک جلسوں میں نفرت و حقارت کے ریزولیوشن پاس کر لئے۔

مجھے خیال ہوا کہ اب اس مقدس موضوع پر پھر کچھ لکھوں۔ چنانچہ ابتدائی تیسری صدی تک کے محدثین اور ارباب سیر کی تصانیف اور اُن کے شارحین مابعد کی تالیفات کو مطالعہ کر کے اور مخالفین اسلام کی تصانیف بزبان انگریزی نیز مشہور بانیان مذاہب کی سوانح عمریاں پیش نظر رکھ کر واقعات اس طور سے قلم بند کئے کہ مخالفین کے اعتراضات بھی دفع ہوں اور اصل حالات آئینہ ہو کر زبان اردو میں ایک معتبر اور مختصر متن موجود ہو جائے۔"

اس نہایت ہی اہم مگر نہایت ہی مشکل کام میں انہیں کتنی عرق ریزی، جستجو اور کاوش کرنی پڑی ہوگی، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے ان مباحث پر قلم اٹھایا ہے۔

پروفیسر نواب علی نے نہ صرف قدیم ماخذ کا جائزہ لیا ہے بلکہ جا بجا ان غلط بیانیوں کا بھی مدلل ازالہ کیا ہے جن کے حوالے مستشرقین نہایت اعتماد سے دیتے آئے ہیں۔

ابن اسحاق، ابن ہشام، واقدی، زہری، طبری، کامل، ابن اثیر، غرض کہ تمام ارباب سیر اور مورخوں پر انہوں نے

نظر ڈالی ہے۔

اُموی اور عبّاسی عہد میں روایات نے جو رنگ اختیار کر لیا تھا اُس کا بھی نہ صرف جائزہ لیا ہے بلکہ تجزیہ کر کے اسلامی نقطۂ نظر اور شاہی نقطۂ نظر کے فرق کو واضح کیا ہے۔

کتاب ایک مختصر سی تمہید کے بعد حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کا تذکرہ کرتی ہوئی رسول اللہ کی ولادت سے لے کر وفات تک کے حالات کو اختصار مگر بڑی خوبی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ درمیان میں پروفیسر نواب علی نے موازنۂ ادیان کے ذریعے سے بھی قرآن مجید اور اسلامی تعلیمات کی صداقت کو ثابت کیا ہے۔

موازنۂ ادیان سے انہیں خاص دلچسپی ہے۔ اس کی کامیاب ترین مثال ان کی کتاب "صحفِ سماوی" ہے۔ سیرت رسول اللہ میں بھی مناسب مواقع پر ہمیں پروفیسر نواب علی اس موازنے کے ذریعے سے دادِ تحقیق دیتے نظر آتے ہیں۔

آنحضرت کے نسب نامے کی تحقیق اور مسیحی علماء کے اعتراضات کا جواب، حقیقتِ وحی، سورۂ والنجم کے متعلق جھوٹی روایت کا ازالہ، ایمانِ ابوطالب پر عالمانہ بحث، یہ تمام چیزیں پروفیسر نواب علی کے حسنِ تحقیق پر دلالت کرتی ہیں۔

سیرت رسول اللہ ہر لحاظ سے ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔

پروفیسر نواب علی کا اندازِ بیان سادہ اور دل نشین ہے۔ ان کے پیشِ نظر تحقیقی مسائل زیادہ تھے اسی لئے انہوں نے زورِ بیان سے زیادہ زورِ استدلال کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام بزرگوں نے سیرت نگاری اور تاریخ نگاری کے فن کو جہاں تک پہونچا دیا ہے آج کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال حضرات اسے اور آگے بڑھائیں۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

انجم اعظمی

# ادب کی تعلیم

کسی معاشرے کے افراد کو بہتر زندگی گذارنے کے لئے زندگی کے مختلف شعبوں سے واقفیت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بغیر تعلیم کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ بعض افراد جو اپنی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے کسی ایک مضمون کی تعلیم اور اہمیت کا تذکرہ اس انداز سے کرتے ہیں گویا دوسرے مضامین فضول ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ اور یہ ہمیں زندگی گذارنے کے سلسلے میں انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے کیا آسانیاں بہم پہونچاتی ہے۔

علم کے معنی کسی شے یا اشیاء کی بابت مربوط اور مدلل واقفیت کے ہیں، اسی لئے کسی شے کی ماہیت کو جاننا تعلیم کا بنیادی ستون ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے یہاں تعلیم و تربیت کی ترکیب کا استعمال عام ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ بحیثیت مجموعی صرف جاننا تعلیم کا مقصد نہیں ہے، بلکہ جو کچھ ایک شخص جانتا ہے اُس کی بناء پر جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اس کا سچا احساس تعلیم ہی کا جزو ہے۔ اس اعتبار سے پڑھا لکھا آدمی وہ ہوا جو اپنی ذمہ داری کو جانتا بھی ہے اور اپنے مقاصد کو بروئے کار بھی لاتا ہے۔

بنیادی طور پر انسان کو معاشرے سے اس لئے دلچسپی ہے کہ وہ اس میں رہ کر زندگی گذارتا اور اپنی مسرتوں کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ معاشرے سے الگ ہو کر فرد تمام تر ایک نامکمل فرد رہ جاتا ہے جس طرح معاشرہ افراد سے مل کر بنتا ہے۔ ویسے ہی ہر فرد کی زندگی میں دراصل ایک معاشرہ موجود ہوتا ہے جو اس کے وجود کے تناسب سے چھوٹا یا بڑا ہوتا ہے۔ لیکن اس کی ناآسودگی سے خارجی معاشرے کی ناآسودگی بھی جھلکتی ہے، اور اس کے وجود کی وحدت میں اس معاشرے کی وحدت کا تصور بھی شامل ہوتا ہے۔ یہی وحدت کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سائنس اور فنون کے مختلف شعبوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک فرد کسی خاص شعبہ میں اپنے ذاتی رجحانات کی بناء پر زیادہ دلچسپی لے سکتا ہے اور اس سے گہرے شغف کا اظہار کر سکتا ہے۔ لیکن اسے یہ بھی جاننا پڑتا ہے کہ اس کے شعبہ کا تعلق زندگی کے دوسرے شعبوں سے کیا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس وحدت کے تصور کو مجروح کرتا ہے جس میں اس کے عہد کی زندگی کی رُوح ہوتی ہے۔ یہ تصور جس منزل میں ہوتا ہے وہیں سارا معاشرہ کھلی اور تازہ ہوا میں سانس لیتا ہے۔ اور کسی شعبہ میں حقیقت کے تلاش کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ شعبہ زندگی کے دوسرے تمام شعبوں سے رشتہ جوڑ کر کسی ایسے تصورِ حیات کی نشان دہی کر رہا ہے جس میں آب و رنگ اس خصوص شعبہ کا ہوگا، اور اصلیت اس "کل" کی ہوگی جسے اگر ہر زمانے کی نہیں تو کم از کم اس کے زمانے کی زندگی سے تعبیر کیا جائے گا۔ رنگوں کے اختلاف سے حقیقت کے ایک ہونے کے باوجود مطالعہ

دلچسپ بھی ہوجاتا ہے۔ اور مختلف سمتوں میں زندگی کے پھولنے پھلنے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کبھی کبھی ایک نئی سمت کی نشان دہی کسی ایک شعبہ کا آدمی کرتا ہے اور پھر وہ سمت تمام شعبوں میں کام کرنے والوں کے لئے اہم ہوجاتی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر زندگی کی دریافت کا اگلا قدم کسی شخص کے لئے بھی اٹھانا مشکل ہوجاتا ہے۔

تعلیم کے بارے میں اس حد تک غور و فکر کے بعد یہ واضح ہوجاتا ہے کہ کسی شخص کو کسی مضمون سے چاہے کتنا ہی گہرا شغف ہو اسے اس وقت تک پڑھا لکھا آدمی نہیں کہا جاسکتا جب تک وہ دوسرے علوم سے فلسفیانہ آگاہی نہیں رکھتا۔ دوسرے علوم کی جزئیات میں پڑنا اور ان میں اپنا سر کھپانا اس کے لئے ناممکن ہوگا لیکن زندگی کی وحدت کے تصور تک پہونچنے اور اس کی کلیت کے ادراک کے لئے اسے ان بنیادی کتابوں کا گہرا مطالعہ کرنا ہوگا جو مختلف علوم سے متعلق ہوں گی۔ ایسی صورت میں معاشیات کے ایک ماہر کے لئے آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت، فرائڈ کے نظریۂ جنس اور عظیم شعراء کے کلام سے واقفیت اتنی ہی ضروری ہے جتنی حیاتیات کے ایک طالب علم کے لئے رواقیوں کے فلسفۂ جمال کی۔ کیونکہ ڈاروِن کے نظریۂ ارتقا میں صرف حیاتیات کا تصور نہیں ہے۔ وہ خون اور جسم کی دنیا سے آگے جا نکلتا ہے، اور ارتقا کی سمت کا تعین اس کے یہاں فلسفۂ جمالیات کے بغیر ممکن نہیں۔ بقول ڈاروِن کسی ایک سمت میں اس وقت تک عمل ارتقا جاری رہتا ہے جب تک اس میں بہتر اور خوب صورت ہونے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ مثلاً انسان کو ذہن کی دولت ملی ہے۔ یہ ایک سمت ہے۔ انسان تک پہونچتے پہونچتے فطرت کا لاشعوری ذہن ارتقا کی ایک نئی کڑی یعنی شعوری ذہن میں تبدیل ہوگیا ہے۔ اور اس سمت میں جتنی ترقی بھی ممکن ہے اس کی گنجائش انسانی ذہن میں موجود ہے۔ لہٰذا انسان سے بہتر مخلوق کے پیدا ہونے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اور نطشے کا تصور مافوق البشر یکسر باطل اور غیر منطقی ثابت ہوجاتا ہے۔

آگاہی کی اس منزل میں آکر جس طرح سائنس کے آدمی کے لئے فلسفۂ جمال اور ادب و شعر کا مطالعہ ضروری ہے، تاکہ وہ جس آدمی کے لئے فطرت کو دریافت کرنے کی محنت اٹھا رہا ہے اُسے بہتر طور پر سمجھ سکے اور زیادہ سے زیادہ اس کے کام آسکے، اسی طرح ادب کی تخلیق کرنے اور اس کی تعلیم دینے والوں کے لئے لازم ہے کہ انہیں اپنے عہد کا ادراک حاصل ہو۔ انہیں یہ معلوم ہو کہ زندگی کی دریافت کا سلسلہ عمرانیات اور سائنس کے علوم میں کہاں تک پہونچ چکا ہے اس کے بغیر ادب کی تعلیم اپنے عہد سے ہم آہنگ نہیں ہوسکے گی اور نہ اس میں بڑی تخلیق ممکن ہے۔

اشیاء کی ماہیت اور قوانین فطرت کے مطالعے کے ذریعہ زندگی کی کلیت اور وحدت کے تصور تک پہونچنا، علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں زندگی کے بارے میں ادراک و انکشاف کا جو سلسلہ جاری ہے اسے نظر میں رکھنا تعلیم کی اساس ہے۔ اس کے بعد ہر شعبہ میں اس کی جزئیات کے مطابق درس دینے اور علم حاصل کرنے کے طریقے امتیازی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ یہیں سے ادب کی تعلیم دوسرے شعبوں کی تعلیم سے الگ ہوجاتی ہے جو ادبی تخلیقات اور بلند پایہ تحقیقی کتابوں کے ذریعہ ایک منفرد اور مخصوص مزاج اپنا کر روشنی کے اس دائرے تک پہونچنا چاہتی ہے جہاں تک پہونچنے کی کوشش علم کے ہر شعبے کا آدمی کرتا ہے۔ لیکن ادب کی تعلیم نادر راہ کے طور پر تہذیب و ثقافت کا وہ تصور عطا کرتی ہے جس سے دوسرے شعبوں کے طالب علم محروم رہ جاتے ہیں۔

اس کے بعد ہمیں سمجھنا پڑے گا کہ تعلیم کے نصب العین کو جامد یا متحرک کسی معیار سے بہتر یا کم تر بنانے والی چیز کیا ہے، اور ہر شعبہ کی تعلیمی ضرورت کے مطابق اسے پرکھنا ہوگا۔ ادب کی تخلیق کا مسئلہ ہو یا تعلیم کا۔ دونوں صورتوں میں کچھ باتوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ ادب پڑھانے والے کی عوامی ذمہ داری اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ جس معاشرے میں ادب کی تعلیم دے رہا ہو اس

کی بابت اچھی طرح اسے معلوم ہو کہ اس کے معاشرے کو ادب سے کس حد تک اور کس نوعیت کی دلچسپی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد ہی وہ تعلیم کے بہتر طریقے سوچ سکتا اور ان پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ اسے اپنے آپ سے بھی پوچھنا ہوگا کہ ادب کی جزئیات کے ساتھ ساتھ اس کی روح سے خود اسے کس حد تک آشنائی ہے۔ کیونکہ ادب کی روح سے ناواقف آدمی طالب علم کو جزئیات کی بھول بھلیوں میں گم کر دے گا۔ اسے صرف ماضی کے کلاسیکی ادب سے واقف نہیں ہونا چاہئے بلکہ یہ بھی جاننا ہوگا کہ اس کے اپنے زمانے میں ادب کی تخلیق کرنے والوں کے محبوب موضوعات کیا ہیں اور کون سے مضامین ترک کئے جا چکے ہیں۔ ادب کی اشاعت کے معیار، ادبی نشر و اشاعت کے شعبہ میں کام کرنے والوں کی پسند و ناپسند، ان کی ادبی اور کاروباری دلچسپیوں سے آگاہ ہونا اس کے لئے اتنا ہی اہم ہوگا، جتنا کلاس روم کے طالب علموں سے واقفیت اور مؤانست ناگزیر ہے۔ اس کا علم ان سارے تعصبات کے بارے میں بہت وسیع اور ان تعصبات کے خلاف اس کا حوصلہ بہت بلند ہونا چاہئے جو اس کے اندر اور باہر موجود ہیں، اور جن کی موجودگی میں ادب کی سمجھ پیدا نہیں ہوتی۔ مثلاً زبان کو لے لیجیے۔ چونکہ دوسرے علوم و فنون کی طرح ادب کی تخلیق کا وسیلہ بھی زبان ہے اور زبانیں بے شمار ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ ایک زبان کا آدمی دوسری زبانوں سے تعصب رکھتا ہو۔ اس صورت حال کی موجودگی میں یہ بتانا ضروری ہے کہ ادب زندگی کا ایک شعبہ ہے اور دنیا کی مختلف زبانوں کے درمیان ایک ناقابل تقسیم وحدت کے طور پر موجود ہے۔

ادب کے استاد کے لئے کسی وقت بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ ادب کے معیار سے نیچے اتر کر کاروباری ذہنیت کا شکار ہو جائے۔ جس سے معاشرے کے عام افراد کو نکالنا اس کا مطمح نظر ہوتا ہے۔ کیونکہ کاروباری ذہنیت زندگی کے ہر نصب العین کا قلع قمع کر دیتی ہے۔ اور آدمی کو معیار کی تلاش سے ہٹا کر حرص و ہوس میں مبتلا کرتی اور ذہنی طور پر پست بنا دیتی ہے جب کہ ادب نام ہی ہے زندگی کے بہتر معیار کی تلاش کا۔ اس بہانے وہ روایت کا احترام کرتا اور تجربے کی سچائی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ پڑھانے والا اگر ادب کی ماہیت سے آگاہ نہ ہو تو اپنے اس کردار کی حفاظت نہیں کر سکتا جو ادبی شعور کے حصول کے سلسلے میں اس کے طالب علموں کی رہنمائی کرتا ہے۔ معلم چند فرسودہ اخلاقی قدروں کی پیروی کر کے معاشرے کو صرف علم و ادب سے ہی دور نہیں کرتا بلکہ اسے اپنی ہی طرح بے روح بنا دیتا ہے اور اپنی نالائقی کا سارا بوجھ آئندہ نسلوں پر ڈال دیتا ہے۔

ادب چاہے قدیم ہو یا جدید۔ ذریعہ ہے زندہ روایات کو سیکھنے اور سکھانے کا۔ اسی لئے ادب کا ہر آدمی چاہے ادب کا خالق ہو یا معلم۔ انہیں روایات سے پہچانا جا سکتا ہے۔ ادیب معاشرہ کے گہرے مطالعہ اور حقائق سے آشنا ہو کر روایت کے خزانے میں اپنے سچے تجربوں کا اضافہ کرتا ہے اور معلم زندہ روایات کا نگراں ہوتا ہے۔ ادب کے معلم سے اگر پوچھا جائے کہ اس نے اپنے طالب علموں کو کیا پڑھایا ہے یا وہ کیا پڑھائے گا، تو مختصراً اس کا یہ جواب ہونا چاہئے کہ اس نے اپنی قوم کے فرزندوں کو زندہ روایت کی تعلیم دی ہے۔ زندہ روایت کی محبت اور اس سے آشنائی معلم اور طالب علم دونوں کو آہستہ آہستہ اپنے اندر اور باہر کے تعصبات سے لڑنا سکھا دیتی ہے۔

ایک صاحب جو یونیورسٹی میں اردو ادب کے پروفیسر ہیں ایک روز مجھ سے فرما رہے تھے کہ وہ ساری زندگی ایک ہی موضوع منتخب کر کے اس پر کام کرتے رہیں گے جیسے لوگ لندن کے اورینٹل اسکول میں کرتے ہیں۔ میں حیران تھا کہ صاحب موصوف کیا فرما رہے ہیں، انہوں نے کچھ عرصہ پہلے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ میں سمجھا کہ لندن اورینٹل اسکول کا تذکرہ ضمنی طور پر درمیان میں آ گیا ہے، اور وہ اپنے مقالہ کی کمزوریاں اور نقائص کو دور کرنے کے لئے اس پر نظر ثانی کریں گے، وہ

ساری زندگی ایک ہی موضوع پر کام کرنے کے معنی ان کی شخصیت اور خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور کیا ہو سکتے تھے لیکن دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔ ان کے پاس نہ کوئی دوسرا موضوع تھا، اور نہ وہ اپنے مقالہ پر نظرثانی کر رہے تھے۔ لہٰذا میں نے ان سے دوبارہ یہ سوال نہیں کیا کہ اپنی گفتگو میں لندن کے اورینٹل اسکول کا حوالہ انہوں نے کس لئے دیا تھا، اور نہ اپنی جانب سے یہ بات کہہ سکا کہ ہمیں اپنی یونیورسٹیوں میں اردو ادب کی تعلیم اس طرح ہرگز نہیں دینی چاہئے جس طرح لندن کے اورینٹل اسکول میں دی جاتی ہے، بلکہ اس کا نمائندہ ہونا چاہئے جو کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیوں میں انگریزی ادب کی تعلیم کا ہے۔ ادب کے ایک استاد کو دوسروں سے سیکھنا ہے تو یہ سیکھے کہ اپنا لٹریچر کس طرح پڑھایا جاتا ہے۔ ہمیں اپنے کلچر اور تہذیب کی تعلیم دینی ہوگی۔ اور جس طرح انگریز یا فرانسیسی یا کوئی اور قوم اپنی ثقافت کی حفاظت کرتی ہے، اس طرح ہمیں بھی اپنی تہذیب کی حفاظت پر آمادہ ہونا پڑے گا۔ اور اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو اپنی تعلیم کا مقابلہ دوسروں سے کرتے رہنا بے کار ہے۔

صاحب موصوف سے میں یہ باتیں نہیں کہہ سکا، لیکن تعلیم کے اس تصور کے بغیر وہ بحیثیت ادب کے معلم کے ہمارے معاشرے کے اندر اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ دراصل کوئی شخص صرف غالب، میر، سرسید اور اقبال کو پڑھا کر اردو ادب کا سچا استاد نہیں بن سکتا۔ اسے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے بہانے ان اقدار تک پہنچنے کے لئے طلباء کے ذہن کو ہموار کرنا پڑتا ہے جنھیں بحیثیت مجموعی روح عصر کہا جاتا ہے۔

پڑھانے والا ادبی تخلیقات کے مطالعہ سے دلچسپی رکھنے کے علاوہ خیال و فکر کی اس بلندی تک پہونچ سکتا ہے جسے ایک ادیب نے اپنی تخلیقی قوت کی مدد سے ابھارا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ خود بھی کچھ ایسے کام کرتا ہو جس سے اس کی اپنی تخلیقی قوتیں قائم رہیں، تب تو ٹھیک ہے۔ ورنہ کچھ عرصہ کے بعد اس کی شخصیت جذب و قبول کی صلاحیت کھو کر دوسروں کے تخلیق کئے ہوئے ادب کو بھی سمجھنے کے قابل نہیں رہتی۔ اتفاق سے ہماری یونیورسٹیوں میں ادب کے اساتذہ کی جو حالت ہے وہ کلچر کے نام پر ادب سے عدم دلچسپی اور تحقیق کے نام پر غیر ادبی تحریروں کے مقابلے میں ادبی و شعری تخلیقات کو ہیچ پوچ سمجھنے کا رجحان ہے۔ ان میں چند ہی ایسے ہیں جو تھوڑا بہت کام کر لیتے ہیں۔ اور کیریر بنانے کے سلسلے میں اپنے تحقیقی مقالوں میں معمولی قسم کی تاریخی معلومات فراہم کر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں ادب کی سمجھ بہت کم اور ادنیٰ درجے کی معلومات سے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تیار کر کے کیریر بنانے کا رجحان بے حد شدید ہے۔ ارباب حل و عقد اتفاق سے اس رجحان کو ہوا دینے میں پیش پیش ہیں۔ نتیجہ کے طور پر خود ادب کے شعبہ میں ادب سے بیزاری، نفرت اور ناواقفیت ایک خطرناک بیماری کی طرح پھیل گئی ہے۔ دراصل ادیبوں اور شاعروں سے نفرت پھیلا کر ہی وہ فضا پیدا کی جا سکتی تھی جس میں وہ ایک غیر ادبی لیکن کامیاب کیریر کی زندگی گذار سکتے تھے۔ وہ ادب کے نام پر صرف پیسہ کماتے اور پیسہ کے بل بوتے پر جھوٹی عزت حاصل کر رہے ہیں۔ غالب بے چارے کے پاس صرف شاعری کی متاع بچ رہی تھی لیکن ان حضرات کی جھولی میں ادب و شعر کے سوا باقی ہر مال مل جائے گا۔

دراصل ادب کے استاد کی ذمہ داری خصوصاً ایک ترقی پذیر ملک میں بڑی بھاری ہے۔ اسے زندگی کو ایک نامیاتی وحدت کے طور پر قبول کرنا پڑے گا۔ اسے اپنے ملک کے ذہنوں کو جذباتیت سے نکال کر ضبط و توازن کے راستے پر لے جانا ہوگا۔ اور اپنے معاشرے کے افراد کو ایک ایسے متحرک کلچر کی تعلیم دینی ہوگی جس کی جانب اس کے ادیبوں اور شاعروں نے جا بجا اپنی تخلیقات میں اشارہ کیا ہے اور جس سے ملک کا مستقبل وابستہ ہے۔

حباب سے کے یہ خالی پیالہ کیا کرتا

یہ لہجہ پراعتماد احتجاج کا ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شخص زندگی کی مسرتوں کو اپنا حق سمجھ کر طلب کر رہا ہے ۔ زندگی چاہے کتنی ہی مختصر ہو، وہ ایک چنگاری کی طرح ہوا میں ایک بے تابانہ رقص ہی کیوں نہ ہو لیکن اس ایک لمحے کے ساغر کو زندگی کی شراب سے لبریز ہونا چاہئے ۔ پیالہ کو خالی پاکر آدمی اپنے خوابوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے جن میں زندگی کا سارا حسن اور سرشاری ہے وہ تشنگی کی شدت اور اپنے احساس محرومی میں بھی زندگی سے گہری وابستگی کا اظہار کرتا ہے ۔

پیالہ خالی اٹھا کر لگا لیا منہ سے
کہ یاس کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

وہی ساغر جو آتش کے ہاتھ میں تھا، اب یگانہ چنگیزی کے ہاتھ میں ہے ۔ لیکن اس خالی ساغر کو ہونٹوں سے یہ سمجھ کر لگا لیا گیا ہے کہ وہ بہرصورت زندگی کی علامت ہے ۔ ماضی کے شعراء نے زندگی کے حسن اور مسرت کے احساس کو اس وقت بھی زندہ رکھا، جب ہمارا معاشرہ اس بات سے بالکل غافل تھا کہ انسان کا سب سے بڑا نصب العین ہمیشہ سے زندگی کا حسن، آگہی اور مسرت ہے ۔ ان ہی تینوں کے بہترین امتزاج سے وہ شعر تخلیق ہوتا ہے جس کو پڑھانے کی ذمہ داری ادب کے استاد پر عائد ہوتی ہے ۔ وہ اپنے طالب علموں کو حسن، مسرت اور آگہی سے آگاہ کئے بغیر جو کچھ سکھاتا ہے وہ ادب کے بجائے الفاظ کا ایک بے روح ذخیرہ رہ جاتا ہے، جو محض ایک طالب علم کو بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے میں مدد دے سکے، لیکن اسے ادب کے معنی سے ہرگز متعارف نہیں کرتا ۔

کچھ اساتذہ زبان کو بڑی اہمیت دیتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ زبان کی تعلیم پر ہمیں بطور خاص توجہ دینی چاہئے ۔ لیکن زبان کا سرمایہ اتنا بڑا ہے کہ ادب کا استاد تنہا پوری زبان سکھانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ حیاتیات کے مضمون کی زبان سکھانا حیاتیات ہی کے پروفیسر کا کام ہے ۔ ہمارے یہاں اگر یہ کام نہیں ہو رہا ہے تو اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ ادب پڑھانے والا اپنے موضوعات سے انحراف کر کے وہ ذمہ داری غلطی سے قبول کر لے جسے وہ کبھی حسن وخوبی سے انجام نہیں دے سکتا ۔ زبان تمام علوم کے اظہار کا وسیلہ ہونے کے سبب ایک بڑی وسیع قلمرو پر حکمرانی کرتی ہے ۔ ادب کا ایک استاد بہت پڑھا لکھا ہو سکتا ہے لیکن سارے علوم کی جزئیات سے آگاہ ہونا اس کے لئے ناممکن ہے ۔ وہ کیا کسی بھی عالم کا سارے علوم کی جزئیات سے آگاہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ اسے صرف ادب پڑھانا چاہئے ۔ اسے اپنے طالب علموں کو اس کیفیت سے روشناس کرانا چاہئے جو اُن کی روح کو زندگی گزارنے کے بہتر معیار کی تلاش پر آمادہ کر دے ۔ اسے صرف ادب کی زبان پڑھانی چاہئے، اور زبان کی اس معنویت سے طالب علموں کو دوچار کرنا چاہئے جو ہمیں محسوسات کے راستے سے الفاظ کے دائرے سے نکال کر زندگی کی گہری بصیرت تک لے جاتی ہے ۔ اسی پر انسانی تہذیب کی عالی شان عمارت کی بنیاد رکھی گئی ہے، اور اسی معنویت کا نام ادب ہے ۔

مروجہ زبانوں کے ادب کے استاد ادب کے ساتھ ساتھ اس زبان کو بھی پڑھاتے ہیں جو آج کسی معاشرے میں رائج ہے ۔ یہ ان کی مجبوری ہے ۔ ہمارے معاشرے میں انگریزی ادب کی تعلیم کے بہانے انگریزی زبان سکھانے کا جذبہ بھی کارفرما

( باقی صفحہ ۸۶ پر )

آغا افتخار حسین

# نیپلز میں مشرقی علوم کا ادارہ

اس ادارے کی داغ بیل اٹھارویں صدی عیسوی میں ایک اطالوی کیتھولک مشنری ماتیو ریپا (Matteo Ripa) نے ڈالی۔ اس وقت اس میں صرف چین سے متعلق تعلیم دی جاتی تھی۔ رومن کیتھولک مشن کی تاریخ میں ماتیو ریپا کی Chinese Seminary کو نمایاں حیثیت حاصل ہے —— اس ادارے کی ابتدا اسی Seminary سے ہوئی۔ ۷ اپریل سنہ ۱۷۳۲ء کو پوپ کلیمنٹ دواز دہم نے اس ادارے کو تسلیم کیا۔ اور اس کی سرپرستی کرتے ہوئے جنوبی اطالیہ میں اس کے لئے ایک جائیداد وقف کردی۔ اس جائیداد میں دوسرے پاپاؤں کے عہد میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اور سرکاری تحویل میں آنے سے پہلے یہ ادارہ مالی اعتبار سے نہایت مستحکم اور خودکفیل ہوچکا تھا —— ماتیو ریپا کی یادگار آج بھی اسی طرح تازہ ہے۔ چنانچہ ادارے کی مرکزی لائبریری کا نام "ماتیو ریپا لائبریری" — (Biblioteca Matteo Ripa) ہے۔ ریپا ہی کے وقت سے یہ ادارہ نہ صرف چینی بلکہ ہندوستانی تعلیمات کے لئے شہرت حاصل کرچکا تھا۔ قدامت کے اعتبار سے علوم شرقیہ کی تعلیم کے لئے (غالباً) یہ یورپ کا قدیم ترین علمی ادارہ ہے۔

یہ ادارہ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا۔ سنہ ۱۸۶۸ء میں اس کا نام — "Real Collegio Asiatico" — (ایشیائی علوم کا شاہی مدرسہ) رکھ دیا گیا۔ سنہ ۱۸۸۸ء میں اس کا نام — "Institu Orientale" — اور سنہ ۱۹۲۵ء میں اس کا نام "Institu Superiore Orientale" رکھا گیا۔ اور سنہ ۱۹۳۷ء میں اسے یونیورسٹی کا درجہ دے کر — "Instituto Universitario Orientale" — بنا دیا گیا۔ سنہ ۱۹۵۷ء میں ایک اور تبدیلی ہوئی، اور ایک قانون کے ذریعے اس یونیورسٹی کو حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا۔

اردو تدریس کی روایت اس ادارے میں بہت قدیم ہے اور جب گارسیں دتاسی پیرس میں درس دے رہے تھے اسی اس ادارے میں کمیلو تالیابوئے (Camillo Tagliabue) اردو کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے کئی کتب لکھیں لیکن ان کی گرامر "Grammatica della Lingua Indostana o Urdu" "ہندوستانی یا اردو زبان کی قواعد" بہت مشہور ہے۔ یہ دو جلدوں میں ہے۔ جلد اول میں [illegible] صفحات ہیں، اور جلد دوم

۹۰ صفحات - دونوں جلدیں سنہ ۱۸۹۲ء میں روم سے شائع ہوئیں۔ نہیں معلوم کہ پروفیسر تالیا بوئے کتاب کی اشاعت کے بعد کتنے سال اردو درس دیتے رہے، اور ان کے انتقال کے بعد اردو کی قسمت کس سے وابستہ رہی۔ دوسری عالمی جنگ میں یہاں ایک بیگم اجیت سنگھ بھی اردو پڑھاتی تھیں۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں پروفیسر بوساجی نے یہاں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے اپنی درسی زندگی کا آغاز کیا۔ نیپلز میں تین چار سال بعد جب فارسی کے پروفیسر کی جگہ ان کا تقرر ہوا تب بھی وہ فارسی کے ساتھ اردو کے پروفیسر بھی رہے۔ جنوری سنہ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر انتدا احسن اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ نومبر ۱۹۶۴ء سے انہیں اردو اور ہندی کا پروفیسر بنا دیا گیا۔

اس یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کا نصاب چار سال کا ہے۔ متعلقہ شعبہ کا نام "شعبۂ اردو و ہندی" ہے۔ اس شعبہ کا قدیم نام "ہندوستانی" تھا۔ مگر تقسیم کے چند سال بعد "اردو ہندی" کر دیا گیا۔ پروفیسر کی صرف ایک جگہ ہے اور وہی اردو ہندی کا مشترکہ استاد ہے۔ لیکچراروں کی تعداد زیادہ ہو سکتی ہے بشرطیکہ طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو جائے۔ اس وقت ادارے میں ہندی کا باقاعدہ لیکچرار نہیں ہے لیکن بہت جلد کسی کا تقرر کیا جائے گا۔ ادارے میں ثقافت، ادب، زبان، تاریخ وغیرہ کی تعلیم مشترکہ ہوتی ہے — ہندوستان اور پاکستان وغیرہ سے متعلق ڈاکٹریٹ کا نام "Doctrate in orientale Language and Civilization" ہے۔ اس لئے طالب علم صرف متعلقہ علاقے کی زبان و ادب ہی نہیں بلکہ تاریخ و ثقافت اور سیاست وغیرہ سب ہی کچھ پڑھتے ہیں، اور ڈاکٹریٹ کے لئے جو مقالہ لکھا جاتا ہے وہ اس علاقے سے متعلق کسی بھی موضوع پر ہو سکتا ہے۔

سنہ ۱۹۶۵ء میں اس شعبے سے ایک طالب علم نے ڈاکٹریٹ کے لئے "Basic Democracies System in Pakistan" کے موضوع پر مقالہ لکھا، اور بہت پسند کیا گیا۔ اس لئے اردو ہندی کے شعبے سے صرف زبان و ادب ہی مراد نہیں ہے بلکہ ثقافت، تاریخ و سیاست وغیرہ بھی ہے۔ اب شعبہ کا نام بدل کر "Indo - Pakistan Studies" رکھنے کی تجویز زیر غور ہے۔

---

## آغا افتخار حسین
### کی
## زیر طبع کتابیں

(۱) یورپ میں تحقیقی مطالعے

(۲) پیرس میں اردو، پنجابی اور سندھی مخطوطات

(۳) یورپ میں اردو

(۴) فرانسیسی ادب پر مشرقی اثرات
(زیر تصنیف)

## سراج الدین ظفر

گلفشاں جب قدحِ مے ہوگا
کوئی جمشید کوئی کے ہوگا

آج اُن سے ہے ملاقات کا قصد
کچھ سرِ تختۂ گل طے ہوگا

فیصلہ یارِ گل اندام سے آج
روبروئے قدحِ مے ہوگا

حسن تھا میری نظر کی ایجاد
لوگ سمجھے کہ بڑی شے ہوگا

منزلِ شاہدِ مے دور سہی
راستہ رقص کناں طے ہوگا

شہرِ آشوبِ قیامت معلوم
ترے قامت سی کوئی شے ہوگا

غنچۂ لب ہے بلا بے چٹکے
ہائے چٹکے گا تو کیا شے ہوگا

آج دیوانوں کے درپے ہے عشق
کل تری زلف کے درپے ہوگا

مے کدے میں مری آمد پہ ظفر
ناگہاں شورِ دف و نے ہوگا

## رضا ہمدانی

کیا قیامت یہ سلگتی ہوئی تنہائی ہے
لذتِ دردِ رگ و پے میں اُتر آئی ہے

مسکرانے لگے پھر دل میں تری یاد کے پھول
پھر امیدوں کے گلستاں میں بہار آئی ہے

میں سدا کرتا رہا پرورشِ گلشنِ غم
لوگ کہتے رہے دیوانہ ہے سودائی ہے

جنسِ ویرانیٔ صحرا ہے مرا داغِ جگر
آنکھ گو آج بھی رنگوں کی تمنائی ہے

جب بھی اس گنبدِ دوّار میں کی ہے فریاد
ہر طرف سے مجھے اپنی ہی صدا آئی ہے

مردہ دل گردشِ تقدیر جسے کہتے ہیں
وقت کا کھیل ہے حالات کی انگڑائی ہے

نئے سورج نئے مہتاب تراشیں گے رضا
ہم نے ظلمت کے مٹانے کی قسم کھائی ہے

## مظفر حنفی

میں نے تو حتی المقدور اُسے سمجھایا - لیکن وہ
"میرے بس میں کیا ہے"۔ جی کو سمجھا لوں گا۔ لیکن وہ
ہر پہلو سے دھوکے کھائے "اونچے لوگوں سے چلتی"
"اونچے لوگوں کی صحبت سے باز نہ آیا لیکن وہ
کم ظرفی کی چغلی کھاتی تھی اُس کی بے باک نگاہ
محفل میں سب ہی نے اس کو گھور کے دیکھا لیکن وہ
مجھ میں یہ خامی ہے منہ پر سچی باتیں کہہ دیتا ہوں
اک مدت سے میرا گھر ہے سونا سونا لیکن وہ
لوگ سمجھتے تھے وہ میری جانب سے بے پروا ہے
مجھ کو سب کی آنکھ چرا کر دیکھ رہا تھا لیکن وہ
"پارس پتھر" کی باتیں کرنے سے پہلے یہ سوچو
لوہے کو تو کر دیتا ہے سونا "ہے کیا لیکن وہ"
اُس کا مجھ سے کوئی خاص تعلق ہوگا جب ہی تو
اس دنیا میں اور نہیں ہے میرے جیسا - لیکن وہ
کانٹے بونا، پھول کھلانا، دونوں اس کے بس میں ہیں
میں ہوتا تو گلشن گلشن پھول کھلاتا۔ لیکن وہ
غیروں نے جو کچھ بھی جڑ دی، وہ سچ مان لیا تھا، پھر
اُس کو یہ بھی لازم تھا، کچھ میری سنتا، لیکن وہ
مجبوراً غزلوں میں کڑوی تیکھی باتیں کرتا ہوں
پہلے اُس سے کہہ کر دیکھا، لکھ کر دیکھا، لیکن وہ
جانے گھاٹ گھاٹ کا پانی کہ اُس سے دھوکا کھایا ہے
صورت سے لگتا تھا بالکل سیدھا سادا، لیکن وہ

آج مظفر حنفی کا ہر مصرعہ پہ یہاں مقبول ہے        اساتذہ نے تو اُس کو ناکارہ سمجھا، لیکن وہ

## سرشار صدیقی

اہلِ زباں کا طنز نیا بھی نہیں کوئی
اس سے غریبِ شہر بچا بھی نہیں کوئی

کیا کیا رفیق ہم کو اسی شہر میں ملے
جس شہر میں کہ دوست نما بھی نہیں کوئی

ہر چند ہم تھے گردِ رُخِ زندگی مگر
پھر یوں غبار بن کے اٹھا بھی نہیں کوئی

مایوسیاں ہیں کفر مگر اس کے باوجود
یہ حال ہے کہ لب پہ دعا بھی نہیں کوئی

یہ زندگی ہے صورتِ دریائے نیل اور
میں ہوں کہ میرے پاس عصا بھی نہیں کوئی

احباب کے خلوصِ تعارف کا فیض ہے
سرشارؔ ورنہ ایسا بُرا بھی نہیں کوئی

# شہریار

کس کس کا یہ دامن دل کھینچے، کس کس کو یہ شے نایاب لگے
بازارِ جہاں میں اب کے برس کیا دیکھئے قیمت خواب لگے

کیا خوب تھی راہِ تمنا بھی، تھے ایسے نشیب و فراز اس میں
کبھی دوست جو تھے دشمن سے لگے کبھی غیر جو تھے احباب لگے

دنیا میں کہیں ہے بھی کہ نہیں وہ شکل کہ جس کی ہو یہ صفت
دن ہو تو دکھائی دے سورج، رات آئے تو مہتاب لگے

کچھ تشنہ لبوں کا کہنا ہے، سچ اس میں جانے کتنا ہے
ساغر ہو اگر ان ہاتھوں میں تو زہر بھی بادۂ ناب لگے

رہتی ہے تعاقب میں اس کے ہر ساعت رسوائی کی بلا
جس شخص کو بھی اعزاز ملے، جس نام میں بھی القاب لگے

## عتیق ساحری

کوئی گلاب بہ گیسو ملا کہ کل یارو
ضرور آنے کو ہے موسم غزل یارو

جہاں بھی جاؤ وہاں محتسب کا چرچا ہے
کہاں ہے تذکرۂ جام آج کل یارو

کبھی شہید تمناؤں کا الم نہ کرو
کسے ملا ہے یہاں محنتوں کا پھل یارو

کچھ اور چاہیۓ دل مطمئن نہیں ہوتا
یہ زندگی تو نہیں موت کا بدل یارو

اس ایک شہر میں رہ کر بھی تم نہیں ملتے
کہاں ہو کیسی گذرتی ہے آج کل یارو

سب اہل دل نظر آتے ہیں سجدہ ریز یہاں
عجب مقام ہے بُت خانۂ غزل یارو

ہمارے دور میں ایسا نہ سوچتا تھا کوئی
شباب ہی میں یہ اندیشۂ اجل یارو!

نشاطِ ہوش فراواں میں رقص فرما ہیں
ہمارے شہر کے دیوانے آج کل یارو

## شمیم حنفی

جب سے میرے ہات میں اک خوش ادا کا ہات ہے

چار سو اُمڈی ہوئی الزام کی برسات ہے

روشنی جن سے اُبلتی تھی وہ چہرے کیا ہوئے

سامنے کب سے وہی ننگی اندھیری رات ہے

درد کی دہلیز بھی کالے دھوئیں میں چھپ گئی

یہ ردائے تیرگی اس دَور کی سوغات ہے

کون ہے جو روک دیتا ہے مجھے ہر موڑ پر

کون آخر کون یوں دن رات میرے سات ہے

دھیان کی مشعل بجھی تو چاند بھی بجھ جائے گا

یہ زوالِ فکر بھی برسوں پرانی بات ہے

۱

## سیدہ حنا

ہم رنگِ زمیں ہے کبھی ہم رنگِ فضا ہے
یہ دامِ محبت بھی عجب دامِ بلا ہے

ہستی نے قدم عالمِ امکاں میں دھرا ہے
یا غنچہ چٹک کر کسی ڈالی پہ کھلا ہے

یہ بحر ہے یا وسعتِ تخئیل کا عالم
لہریں ہیں کہ فن کار کوئی سوچ رہا ہے

سہنا ہی بہر رنگ پڑا ہے غمِ ہستی
یہ زہر بھی ہنستے ہوئے پینا ہی پڑا ہے

ہر قطرے میں پوشیدہ سمندر کا تلاطم
ہر ذرّے میں اک دل کے دھڑکنے کی صدا ہے

ایسے بھی ہیں کچھ لوگ جنہیں دُکھ نہیں کوئی
محسوس اگر کیجئے تو یہ دُکھ بھی بڑا ہے

یہ وادیٔ مہرآن کی افسردہ سی شامیں
محسوس یہ ہوتا ہے کہ دل ڈوب رہا ہے

ہر رات کی آمد ہے نئی صبح کی تمہید
ہم نے تو حنا یہ ہی کتابوں میں پڑھا ہے

رضیہ فصیح احمد

# حرفِ آخر

الحمدللہ کہ آج توماہی "قزاق" کا آخری شمارہ اس کی اشاعت کے اعلان کے عین ایک سال بعد شائع ہو رہا ہے۔
لئے اس میں یہ قباحت نہیں کہ جون کے مہینے میں سال نو مبارک کے اشتہار طبع نازک پر بار ہوں۔ یہ اشتہارات
کے ہیں جو پرچے کی پہلی اشاعت کے لئے دیئے گئے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ چند در چند وجوہ کی بنا پر یہ پرچہ ۲۷
منظر عام پر آسکا، اور بعض مصلحتوں کی بنا پر ہم نے سب سے پہلے اس کا آخری پرچہ نکالنا مناسب سمجھا۔ اس پرچے
شاعت کا مقصد بھی دوسرے رسالوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ قارئین کے بجائے لکھنے والوں کے لئے شائع کیا جا رہا
،۔ اس میں قارئین کی تازہ ترین تخلیقات شائع ہوں گی اور خوش شکل یا خوش تصویر قارئین کی تصویریں بھی شائع کی
ہیں گی۔ کبھی کبھی لکھنے والوں کے خط شائع جا سکیں گے، بشرطیکہ وہ اپنے خطوں میں پرچے کی خوب تعریف کریں، اور اپنے
ں کی فوری اشاعت پر اصرار نہ کریں۔ ناقابل اشاعت خطوط کی واپسی کے لئے جوابی لفافہ آنا ضروری ہے، چونکہ آج کل
ھنے والے کم اور لکھنے والے زیادہ ہیں، اس لئے ہمیں پوری امید ہے کہ اس کی اشاعت دوسرے پرچوں سے کہیں
دہ ہوگی۔ اس پرچے کی ایک خصوصیت یہ ہوگی کہ ایک پورا شمارہ ایک مستقل عنوان کے تحت شائع کیا جائے گا، مگر
ہ نمبر کے نام سے نہیں پکارا جائے گا۔ اس پرچے کے سارے شمارے عام نمبر ہوں گے۔ یہ اس کی ایک اور خصوصیت ہوگی
اسے اپنے ہم عصر پرچوں میں ممتاز کرے گی۔ زیر نظر پرچہ ایک نظم کے بخئے ادھیڑنے پر مشتمل ہے۔ آئندہ پرچہ ادب میں جمود
نام سے شائع ہوگا، جس میں اردو ادب میں جمود کی ترقی و ترویج کے لئے نئی نئی راہیں سوچی جائیں گی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ
ھے والے "قزاق" کے آخری شمارے کے بارے میں اپنی رائے ہمیں لکھیں گے تاکہ ان کی روشنی میں ہم آئندہ پرچے اس سے
ں بہتر نکال سکیں۔ دعا کیجئے کہ ہر نقش اول نقش ثانی سے بہتر ہو۔ اب ہم زیادہ دیر آپ کے اور قارئین کے بیچ میں دیوار بن کر
ھنا نہیں چاہتے اس لئے ملاحظہ ہو اصل رسالہ۔

کلر بلائنڈ

زیست کا پندار نظر
زیست کا حاصل نہ سہی

جنبش رنگ میں ہے نکہت گل
کالے پانی میں ہے سرخی کا عمل
تودۂ خاک پہ ہیں سوئے ہوئے
چاندنی کے تکون ملفوبے
آدمیت کا دل دھڑکتا ہے
میری آنکھوں کی جادونگری میں
کھل گئے چند اور دروازے
بہہ کے نکلی اک اور تازہ سڑک
گرمیوں میں جو پگھل رہتی ہے
آدمی بھی پگھل رہا ہے ضرور
پوچھتا ہے جو ہاتھ پھیلا کے
کہاں ہے لمحہ جو اپنی ساعت کو میری مٹھی میں بند کر دے !

(شاہین پسوانی)

---

جناب نشیب فراز صاحب : نظم "کلربلائنڈ" اردو ادب میں ایک "لازوال" کاوش ہے۔ شاعر نے وجدان کا عرفان حاصل کرلیا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اسے رنگوں کے منطقی معنوں کا ادراک ہوگیا ہے۔ شاعر شعری وزن کی معروضی توضیح کو گنجلک نہیں بناتا۔ بلکہ اس کے منطقی معنوں کے ہمہ گیر تاثر کو علامتی حیثیت اختیار کرکے اسے زندہ درگور کر دیتا ہے، اور شاعر کا یہی وہ کارنامہ ہے۔ جو اسے قیامت کے بعد بھی زندہ رکھے گا، اور اس کے بھی بعد کی نسلیں صدہا سال تک اس سے استفادہ کریں گی۔ شاعر نے کئی خوبصورت ٹکڑے اردو کو بخشے ہیں۔ مثلاً کرب پندار نظر چاندنی کے تکون ملفوبے، اور آخری مصرعے کا تو جواب ہی نہیں۔ ؎

کہاں ہے لمحہ جو اپنی ساعت کو میری مٹھی میں بند کر دے !

یہ ایک مصرع اردو ادب کی آج تک کی متاعِ پر بھاری ہے۔

جناب اجرام فلک صاحب : اس نظم کو نظم کہنا شاعری کی توہین ہے۔ نظم عنوان سے لگا کھاتی ہے نہ عنوان نظم سے۔ ساس نظم پر یہ نوٹ ہونا چاہیے کہ عنوان کا نظم سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔ آج کل دوسری زبانوں کے عنوان "ورگ" پس ہیں یعنی عین فیشن ہیں، اس لئے شاعر بغیر سوچے سمجھے عنوانات رکھ رہے ہیں۔ اس نظم کا عنوان کلربلائنڈ کے بجائے "یفورمانڈ" بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں تک نظم کی فنی خصوصیات کا تعلق ہے اس میں شعری بہاؤ کے آثار و تلازمے کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ حقیقت کے غیر معروضی ڈھلانوں کو ہیئت کے سانچوں میں ڈھالنا تو دور کی بات ہے

نظم کا اختصار اس کے فطری الجھاؤ کے بہاؤ میں مانع ہے۔ پوری نظم میں صرف ایک مصرعہ کام کا ہے، جو مجھے اس وقت یاد نہیں، کیونکہ اتفاق سے وہ نظم اس وقت میرے پیشِ نظر نہیں

جناب عنقا نادری صاحب: یہ نظم نہیں، رنگوں، خوشبوؤں، دروازوں اور کھڑکیوں کا قافلہ ہے جو گرمی کی ایک دوپہر کو پگھلتی سڑک پر رواں دواں ہے۔ شاعر چونکہ کلر بلائنڈ ہے اس لئے دوپہر کی دھوپ اس بات کا اشارہ ہے کہ گو شاعر کے ذہن میں الفاظ کے رنگین دروازے کھل گئے ہیں مگر اس کے لئے رنگ، روپ سے بھری یہ دنیا جلتی دوپہر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ نظم خوب صورت ہے لیکن شاعر اگر اس کا عنوان بدل دیتا اور نظم میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان کی جگہ دوسرے رکھ دیتا تو نظم کی معنویت اور خوبصورتی میں اضافہ ہو جاتا۔

جناب لفاظ صاحب۔ اسلوبی: ایلیٹ نے کہا ہے کہ: "شاعری احساس کے لئے ذہنی اور فکر کے لئے جمالیاتی توثیق مہیا کرتی ہے" میرا اپنا خیال ہے کہ لاشعوری تجربات کے پیچیدار، پہلودار اور خاردار باطنی اشارات اظہار کے خمیر سے اٹھ کر شاعری کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر نظم میرے اس نظریئے کو تقویت پہونچاتی ہے، اور اس سے ایلیٹ کے بیان کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے۔ نظم کے ہر مصرعے پر فرداً فرداً گفتگو کا نہ موقع ہے نہ یہ میرے امکان میں ہے، کیوں کہ آپ خط کے ساتھ نظم رکھنا بھول گئے ہیں، والسلام۔

جناب گنجینۂ گوہر صاحب: نظم اپنی جگہ خوب ہے، اگر دوسری جگہ ہوتی تو بھی بری نہیں تھی۔

جناب ابرکرم صاحب برساتوی: الفاظ کے اس بے دردانہ استعمال پر دل دکھتا ہے۔ کاش شاہین صاحب ذہن کے خزانے سے الفاظ اسی طرح احتیاط سے نکالا کریں جیسے وہ جیب سے پیسے نکالتے ہیں۔ ملاحظہ ہو میرا مضمون "الفاظ کو ووٹ دو" مطبوعہ چار روزہ تین رنگ، حوالپور۔

جنابہ شفوتہ صاحبہ کہکشانی: نظم سندھ کی رنگی ہوئی چنری کی طرح رنگین، اور نیلی قمیص کی طرح چست ہے۔ ملاحظہ کیجئے "کلّے پانی میں ہے سرخی کا عمل" جیسے سیاہ دوپٹے میں لال جھالر۔ نظم نہایت خوب صورت اور معانی کے الجھاؤں سے بلند ہے۔

دل پھینک صاحب رومانوی: نام سے قطعی اندازہ نہیں ہوتا کہ نظم کسی شاعر کی ہے یا شاعرہ کی۔ جس نظم سے لکھنے والے کی جنس تک کا اندازہ نہ ہو اس پر تبصرہ کرنا بے کار ہے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر نظم کسی شاعر کی ہے تو محض تضیعِ اوقات ہے۔ انہیں چاہئے کہ شاعری چھوڑ کر پان بیڑی بیچنا شروع کر دیں۔ اگر شاعرہ کی لکھی ہوئی ہے تو کیا کہنے۔ میں نے اس سے پیاری نظم آج تک نہیں دیکھی۔ اگر اس کے ساتھ شاعرہ کی تصویر اور پتہ بھی ہوتا تو نظم کی معنویت میں کیسا اضافہ ہو جاتا۔ امید ہے اگلے پرچے میں یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔

چند قارئین کے تبصرے اتنی جلد موصول ہو گئے تھے کہ دفتر کی عدم موجودگی کے باعث ادھر ادھر ہو گئے۔ اگر ملے، تو بشرطِ حیات جب کبھی اس پرچے کا ضمیمہ شائع ہوا، ان کو ضرور شامل کیا جائے گا۔ (ادارہ)

## نسیم علوی

# توازن

اس نے آنکھیں کھول کر مشرقی دریچے سے چھن چھن کر آنے والی سنہری دھوپ میں جگمگاتے کمرے کو دیکھا — ہاتھ پھیلا کر ایک طویل انگڑائی لی اور دوبارہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

آج اتوار تھا، اور اس کا دل بستر چھوڑنے کو بالکل نہ چاہ رہا تھا۔

یوں بھی وہ روز ہی دیر سے سو کر اٹھتا تھا۔

کمرے کا ماحول اسے ہمیشہ کی طرح پھیکا اور بے جان محسوس ہوا — ٹوٹی ہوئی کرسی کے ہتھے پر لا اُبالی پن سے اتارے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر، ٹرنک کی سطح پر منوں گرد، لولی میز کے نیچے رنگ برنگے جوتوں، سلیپروں اور چپلوں کا انبار اور میز پر ڈھیر ساری کتابوں، رسالوں، پرانے اخبارات اور ردی کاغذوں کا ایک بے ترتیب سا اڈم لگا ہوا تھا۔

کمرے کی مغربی دیوار پر بے پرواہی سے ٹنگی ہوئی تصویر کی عریاں عورت بدستور مسکرا رہی تھی، جیسے اس کی ذہنی برہنگی کا مضحکہ اڑا رہی ہو — کئی دفعہ اس نے سوچا بھی کہ وہ یہ بے کار سی تصویر اٹھا کر کسی ردی والے کو دے ڈالے، مگر نقوی ہمیشہ اس کے آڑے آیا جس نے یہ تصویر اسے تحفتاً دی تھی۔ کیونکہ خود اس کے پاس اتنی جگہ نہ تھی کہ وہ اتنی بڑی تصویر کو رکھ سکتا — وہ جب بھی یہ مسکراتی ہوئی تصویر دیکھتا، اُس کو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے تپتے ہوئے بھوکے بدن پر کسی نے سڑا ہوا گندا انڈا توڑ دیا ہو، گھنا ؤنی، بدبودار زردی ٹپ ٹپ گر رہی ہو اور وہ اپنے ذہن کے زہریلے فسادیں ڈوب کر بالکل اس پھوٹے ہوئے گندے انڈے کے چھلکے کی مانند ہلکا پھلکا رہ گیا ہو۔

آج بھی جو اس کی لنڈ لیبٹی انجیلا — (اب تو یہی نام تھا اس کا، پہلے اس کا نام تفریبا تھا، دوسری دفعہ یکہ وہ اسٹیلا بنی اور اب وہ انجیلا بن کر انہ حیروں میں بجتی ہے)، کی تصویر پہ پڑی تو اسے رات کی ملکہ یاد آگئی — ہائے اس کی گداز باہیں جیسے ہری ہری ملائم ککڑی —

اُس نے کروٹ بدل کر آنکھیں کھول دیں۔

ملکہ — اُس کے خیال میں ان کے گروپ میں سب سے بور لڑکی تھی سانولی سلونی کوئل جیسی ..... مسکراتی ہوئی نظریں، لوز باتیں، بھدی آواز — اس کی آواز خشک اور غیر مترنم تھی نہ رس نہ کوک بالکل اَن رومانٹک — مگر

اس کی گونجتی ہوئی بھدی آواز ہی کمرے کی ساری خاموشیوں کا توڑ تھی، اور کل رات جب یہ آواز فلیٹ کے اس اکلوتے کمرے میں طوفان جگا رہی تھی تو ماجد نے اس کی لرزتی ہوئی آواز سے اندازہ لگایا کہ وہ اب بہت تھک چکی ہے۔ اور اس کی یہ تھکن زندگی سے دوری کی آئینہ دار ہے ــــ اور یکا یک رنگ برنگی روشنیوں کے نٹ ورک میں بکھرتا ہوا ایک مانوس سا چہرہ اس کے ذہن میں اُبھر آیا، اُس نے گھبرا کر دُبلی پتلی ملکہ کے چہرہ پر نظر ڈالی اور تصور ہی تصور میں ہاتھ بڑھا کر ملکہ کے گالوں کی شفق نوچ لی۔

کمرے کی گھٹی ہوئی فضا میں باتوں کے شعلے چمک رہے تھے!!

زندگی بڑی غمگین ہوتی جا رہی ہے یار و ــــ کل جب میرا سارا وجود ایک مکمل درد بن کر میرے رگ و پے میں سما گیا تھا تو اسکاچ نے خوب مزا دیا ہائے کیا ظالم چیز ہوتی ہے یہ شراب بھی!!، ــــ نقوی نے گلاس میز پر رکھ کر "نتیجہ" کا بہت سا دھواں سارہ کے چہرے پر اُگل دیا، اور جلدی سے منہ پھیر کر زور زور سے کھانسنے لگا۔ سارہ نے ہونٹوں کو گول کر کے فضا میں منتشر ہوتا ہوا تلخ خوشبو دار دھواں سمیٹنا چاہا اور "عصمت" کی کسی کہانی کی منہ پھٹ، بے چین اور بے شرم لڑکی کی طرح دیدے نچا کر نقوی کے آگے رکھی ہوئی اسکاچ پر جھپٹ پڑی، اور ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر کے اس نے گلاس زمین پر دے مارا ــــ گلاس کے ٹکڑے دور تک پھیل گئے، چھوٹے بڑے شیشے کے ٹکڑے ــــ ننھی منی کرچیں جو چبھ جائیں تو خون خون کر دیں، اور نکالنے کی کوشش میں اور اندر اُتر جائیں، اب نہایت خاموشی سے کمرے کے ناہموار فرش پر پڑی سسک رہی تھیں ــــ سارہ سے ذرا پرے ملکہ شیری کے جام کا آخری جرعہ حلق سے اُتار رہی تھی۔

ان لوگوں میں آرٹسٹ اور دلیں بھی تھے ــــ وہ سب ہی ہفتہ کی شام ماجد کے فلیٹ میں جمع ہوتے، بیٹھتے، لڑتے جھگڑتے بحث کرتے، کانچ کے بھدے گلاسوں میں ایک دوسرے کا جام صحت تجویز کرتے، اور جب کمرے میں دھوئیں کے سوا کچھ نہ رہ جاتا تو رات کی تاریکیوں میں چپکے چپکے رینگنے والے کیڑوں کی طرح مستیاں کرتے فلیٹ سے اتر کر شہر کے کسی دیر سے کھلے رہنے والے ہوٹل میں کھانا کھاتے اور پھر کمبختوں کی طرح رینگتی ہوئی چیونٹیوں کی طرح اپنے خولوں میں سما جاتے۔

وہ سب پانچ ہوتے اور آٹھ دس بوتلیں ــــ معاملہ جیب کا تھا ــــ ورنہ وہ سب حاتم تھے ــــ بڑے بڑے ہوائی قلعے، زندگی کے انوکھے رنگ محل، ہنستے ہنستے اور بگڑ جاتے۔ اور کئی بار تو ماجد کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ سب کسی دن تمناؤں کے ادھورے سپنوں میں رنگ بھرنے کی سعی کرتے ہوئے روشنی کی تاب نہ لا کر کسی من موہنے رنگ محل کی سماجی دیواروں تلے دب کر مر جائیں گے۔ (ہائے مر جائیں گے) ــــ یہ تصور ہی کتنا تکلیف دہ تھا۔ دن کیسے کٹیں گے، شامیں کیسے بیتیں گی، اداسی، بے کلی، غم، ویرانی اور شکست ــــ پھر آرزوؤں کے کھیت میں گھومتے ہوئے زندگی کی دھنک کون تلاش کرے گا ــــ یہ سب کم بخت شراب پی کر کتنا بدمست ہو جاتے ہیں ــــ مر گئے تو کیا ہو گا ــــ اس کی ساری سوچوں کے آگے ایک بڑا سا سوالیہ نشان لہرانے لگا!

"شعور زندگی ہے، نغمہ جوانی ــــ تم گاؤ سارہ!"

ملکہ کی آواز کمرے میں گونجی، اور اس کے تمام خیالات پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گئے ــــ اور اس کے نیم مردہ ذہن میں ملکہ اور اس کی آواز کے تیکھے نقوش اُبھر آئے ــــ جواب کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سگرٹ کے چھوٹے چھوٹے

مرغولے بنا رہی تھی، اور اس کی نظریں لیڈی انجیلا کی عریاں تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" ماجد اس کی کرسی کے ہتھے پر جا بیٹھا۔

ملکہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

اُس نے ملکہ کی آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"اے ہٹاؤ اپنا ہاتھ — دیکھو وہ اب رونے والی ہے" ملکہ غرائی۔

اور ماجد نے سوچا کہ شاید اُس نے کچھ زیادہ پی لی ہے۔ مگر ملکہ کی بھیگی بھیگی آنکھیں دیکھ کر وہ خود گھبرا گیا۔ اُس نے میز پر پڑی ہوئی آخری بوتل کا کاگ اُڑایا اور ایک گلاس ملکہ کو دیا۔

ملکہ نے متشکرانہ انداز سے اس کو دیکھا۔ مسکراہٹ سے ناآشنا ہونٹ کچھ خم کھا گئے۔ اور اُس نے گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

"We are the music lovers"

سارہ گا رہی تھی۔

ولسن ماجد کے پلنگ پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔

آرتھر کرسی سے ٹیک لگائے کچھ سوچ رہا تھا۔

اور نقوی گرد آلود فرش پر اکڑوں بیٹھا اپنی انگلی سے آڑے ترچھے نقوش کھینچ رہا تھا — وہ آرٹسٹ تھا.... اُس کے پاس رہنے کو مکان نہ تھا، مگر اس کا دل فراخ تھا — نقوی کو کوئی لیلا نہ ملی تھی، اسی لئے وہ فراخ دل تھا، اور محبت کا بھوکا —!!

"انسان ایک خوب صورت دھوکا ہے ڈیئر! — زندگی شراب کا ایک خوابناک گھونٹ ہے"

"We are the dreams of dreamer"

اُس کا ہاتھ زمین پر رینگتا رہا....

"موت بکواس ہے، عشق حقیقت، حقیقت کو ظالم ہوتی ہے مگر محبت لطیف ہے — عشق زندگی کی تفسیر ہے۔ انسان عشق کے لئے بنا ہے۔ عشق کرو، زندہ رہو — !!"

"ہاں پیارے! — ساز دل کے بے نوا تاروں میں ارتعاش موسیقی کا ذریعہ بن جاتا ہے" — آرتھر آنکھیں بند کئے ہوئے یکایک بول اٹھا — "پھر دل کے ساگر میں موجیں جو اٹھتی ہیں نا دردکی — پیارے بڑا مزا دیتی ہیں، بالکل ایسا لگتا ہے جیسے جذبات کی گرم تپتی ریت پر مست و شباب کا دریا مچل اٹھا ہو — اور پھر ہمارے دل ناداں کا کام ہی کیا.... اس کا دھڑکنا احساس زیست پر بوجھ اور خاموشی بڑی گہری نیند کی علامت ہے — مگر اس پر یقین مت رکھنا پیارے! عقیدے دل کی موت ہیں۔ عقیدوں کے جال میں پھنس کر کسی کام کے نہ رہ جاؤ گے"

وہ جانے یوں ہی آنکھیں بند کئے کتنی دیر تک بولتا رہا۔ اس کا کام ہی بولنا ہے۔ وہ وکیل تھا، مگر یہ اور بات ہے کہ اُس کی وکالت چلتی نہ تھی اور وہ صرف زبانی جمع خرچ سے کام چلاتا تھا۔

"عقیدے دل کی موت نہیں ــــ دل عقیدوں کا مرگھٹ ہے ــــ انواع واقسام کے سیال خیالات دل کی دنیا سجاتے ہیں یارو ــــ دل بے کار رہے تو اچھا ہے ــــ کتنا گندہ مادہ نکلتا ہے اس دل سے ! ــــ محبت آگ ہے دل میں یہ آگ روشن کرو ــــ سارے زہروں کا تریاق !! مجھے ڈیئر ــــ !! ــــ محبت آگ ہے، جسم پانی ــــ بس ایک لمس ! آگ ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح پرسکون ہو جائے گی ــــ یہ جسموں کی بھوک بھی کیسی زہریلی بھوک ہوتی ہے، بالکل دل کے زہریلے سیال کے مانند ــــ ذہنوں کا بدبودار فاسد سڑا ہوا اُبال جیسے آتش فشاں کا بہتا ہوا لاوا ــــ ساری انسانی فصلوں کا قاتل ....." نقوی نے زمین پہ ایک بڑا اچھا نقش اُبھارا تھا۔

وہ بولتے بولتے رُکا تو ملکہ نے کرسی سے جھک کر وہ نقش دیکھا، اور نقش کے نیچے انگلی سے لکھ دیا ــــ

"نوحۂ غم"

اور پھر ایک طویل خاموشی۔

سب اپنے اپنے خیالات میں گم تھے ــــ کسی کو احساس بھی نہ ہوا کہ کب ولیم ماجد کے بستر سے اٹھ کر باہر چلا گیا ــــ

ماجد نے ملکہ کی کرسی پہ جھک کر اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں ــــ

بعض چہرے بھی کتنا فریب دیتے ہیں۔ قریب سے دیکھو تو سارے چہرے زخمی معلوم ہوتے ہیں ــــ زخمی احساسات، زخمی نظریں، زخمی خیالات اور زخمی مسکراہٹیں۔ دراصل ہر چہرہ ایک زخم ہوتا ہے جس میں بعض بدبودار اور عیاں ہوتے ہیں، اور بعض پرسکون اور چھپے ہوئے..... ایسے زخم جن کو چھو لینے سے ٹیسیں اٹھتی ہیں ــــ

ملکہ اندر سے ٹوٹی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اور اس کی آنکھیں، تاریک چہرہ جیسے زیست کی کیاریوں میں کریلے اُگ آئے ہوں، کڑوے کسیلے جو نمک لگانے کے باوجود تلخ ہی رہیں ــــ اس کی آنکھیں اس کسان کی طرح اداس تھیں جس نے روشنی بو کر اندھیری کرنیں کاٹی ہوں۔ جب ہی تو اچھی خاصی مسکراتی ہوئی لیڈی انجیلا کی آنکھوں میں اس کو "نوحۂ غم" صاف سنائی دے رہا تھا۔

"بھئی کیا غم ہے ملکہ ؟"

(کیا اُس کو کوئی غم تھا ؟ ــــ وہ ملکہ کو بہت دنوں سے جانتا تھا)

ملکہ کی انگلیوں میں دبا ہوا سگرٹ کسی دل جلے عاشق کی طرح سُلگ سُلگ کر بجھ چکا تھا اور اس کی نظریں بوتل کی بچی ہوئی شیری پر تھیں۔

دُھند، اندھیرا ــــ مایوسی اور اُداسی ! ــــ ملکہ کی نظریں جھک گئیں۔ وہ کچھ نہ بولی۔

ماجد نے اس کی باہوں کو پکڑ لیا۔

(اس کی باہیں، ہائے انگارے ہی انگارے، ناملوں کی طرح نرم و ملائم انگارے)

"تم ولتی کیوں بیٹھی ہو ــــ تم کو کیا غم ہے ؟" ــــ اُس نے اپنے تپتے ہوئے ہونٹ اس کے مدلیالے، شفق آلودہ رخساروں پر رکھ دیئے۔

"ہیرا ہیرا۔" نقوی زمین سے اچھل کر کھڑا ہو گیا ــــ

ماجد کے سوا سب ہی چونک پڑے۔

فلیٹ کے نیچے موٹر کا ہارن سنائی دیا، اور خاموشی چھا گئی۔ آس پاس گہرا سناٹا تھا ــــ رات بوڑھی ہو کر سسکیاں لے رہی تھی، اور ماجد ملکہ کی نرم بانہوں میں منہ دیئے رو رہا تھا۔

سورج کی چھوٹی بڑی کرنیں ایک دم سے کمرے میں گھس آئیں۔ یعنی دن جوان ہو گیا تھا۔ رات کی Situation کا خیال آتے ہی وہ ہنس پڑا۔ رات جانے وہ کیوں رو پڑا تھا ــــ

"اونہہ ہو گا"

اُس نے اپنے جلتے ہوئے پپوٹوں کو انگلی سے مسلا اور کروٹ بدل کر اُٹھ بیٹھا۔

"واقعی یہ سال اب بالکل رونے والی ہے"

اس کی نظریں بھٹک کر دوبارہ لیڈی انجیلا کی تصویر پر جا پڑیں۔

اس نے اسٹول پر چڑھ کر تصویر الٹ دی، وہ تصویر جو اس کے فاسد خیالات کی ترجمان تھی ــــ کیفیات کا آئینہ ــــ احساسات کا آئینہ ــــ سوچ کا آئینہ ــــ آئینہ جو ہر کونے ہر زاویئے سے دیکھنے والے کی اپنی ہی تصویر، اپنا ہی سراپا منعکس کرتا ہے! ــــ! ــــ!!

لیکن ملکہ تو ایسا آئینہ ہے جس پر کسی سال خوردہ مصور نے مایوسی سے گھبرا کر "اکاسیا" کا ٹنڈ منڈ بغیر پتوں کا ایک درخت بنا دیا ہو، اور وہ بھی سیاہ رنگ سے جیسے ملکہ کے صبیح رنگ میں رات کی سیاہی گھول دی ہو۔

ہر رات صبح کی صداقت کی امین ہے ...... صبح جب درخشاں جوانی کا سورج نکلے گا تو بدن کی دھوپ ضرور بکھرے گی جوانی کا شور مچاتا آبشار کبھی تو کسی دریا کی آغوش میں مچل کر سو جائے گا ــــ جوانی ہوتی ہی ہے تیز رو ــــ آج بڑی بڑی تند لہریں اٹھتی ہیں تو کل سکوت ہو گا ــــ نہ ابھار نہ اُتار ــــ نہ موجیں نہ لہریں ــــ سب کچھ خاک ہو جائے گا ــــ دبی ہوئی چنگاریاں کبھی جاگیں گی بھی تو آگ نہ بن سکیں گی ــــ اسی لئے تو زندگی شراب کا ایک بڑا سا آتشیں جرعہ ہے اور عشق زندگی کی تفسیر ہے.... عشق کرو زندہ رہو۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا بالکونی میں جا کھڑا ہوا، جہاں سے شہر کا ایک چوتھائی حصہ بالکل صاف نظر آتا تھا ــــ اونچی اونچی عمارتوں پر دھوپ پھیل چکی تھی، اور نیچے بازار کی رونقیں بڑھ رہی تھیں۔ پانی بھرنے کے نل پر ستوں کی بے ترتیب لائن لگی ہوئی تھی، اور دھکم پیل کے ساتھ ساتھ فحش گالیاں رُل رہی تھیں، اور ہر کوئی دوسرے سے پہلے پانی بھر لینے کی کوشش میں مصروف تھا ــــ

ماجد نے ایک لمحہ دلچسپی سے یہ منظر دیکھا، اور پھر اکتا کر ان دونوں نوجوانوں کو دیکھنے لگا جو پاکولا کی نئی ڈیزائین کی ایک بوتل کے پیچھے پیچھے سیٹیاں بجاتے اور بلند آواز سے فلسفیانہ خیالات کا اظہار کرتے کالج جا رہے تھے۔ بلکہ ایک آدھ جملہ تو اُس نے سن بھی لیا ــــ

"زمانہ بدل گیا ہے۔ اب اگر کسی سے محبت کرنا ہے تو پہلے اُس کی موٹر سے محبت کرو"

اور کیا، ٹھیک تو ہے ——— زمانہ بدل گیا ہے ——— یہ کیا' دیوانوں کی طرح سے' کتا گود میں لئے پھر رہے ہیں ——— مجنوں کی طرح خاکِ صحرا چھاننے، اور اختر کی طرح رات کی تنہائیوں میں گلراج اور گلودے کے کنارے بیٹھ کر محبت کے ننھے الاپنے میں کیا رکھا ہے ——— ننھے جواہر ہیں ——— ننھے جو صفحۂ قرطاس پر برگِ بنفشہ کی مانند مہکتے ہیں، لبوں پر آکر امرت بن جاتے ہیں ——— لیکن ——— لب سلے ہوئے، پاؤں میں عقیدوں کی زنگ خوردہ زنجیریں ——— نظروں پر تعزیریں اور ذہنوں پر روایات کے پہرے ——— انسانیت سسک رہی ہے ...... ننھے بھی ایک دن یوں ہی سسک سسک کر مر جائیں گے ——— اب زمانہ بدل گیا ہے نا ——— اب کسی سے محبت کرنا ہے تو پہلے اس کی کسی نرم جوانی کی طرح سبک کار سے محبت کرو ———!!

بازار ویسے ہی رواں دواں تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے ——— ان میں چھوٹے چھوٹے گندے ناک سڑکتے بچے تھے جو کل قوم کے معمار ہوں گے ——— وہ کلرک تھے جن کے دل و دماغ مشینی انداز میں سوچتے تھے ——— ان میں موٹے موٹے سیٹھ بھی تھے اور کالج کے شوخ و شریر طلبہ بھی ——— تنگ لباسوں میں کسی ہوئی خوش نما تتلیاں بھی ——— اور کالے برقعوں میں سہمے سہمے قدم اٹھاتی ہوئی زندہ لاشیں بھی ——— بندوق کے غلافوں جیسے پتلون پہنے ہوئے لڑکے اور کسی شاعرِ مدہوش کے خوابوں کی شہزادی جیسی مہوش لڑکیاں اور عورتیں بھی۔

سڑک پر زندگی بڑی بھرپور تھی ——— کروڑہا نقطے جو قلم کی نب کو ایک دم دبا کر چھوڑ دینے سے یکایک وجود میں آگئے تھے، آڑی ترچھی لکیروں کی طرح آپس میں خلط ملط ہو کر شیشوں کی ایک دوکان سجا رہے تھے۔ جس میں زندگی کا ہر رنگ' اور ہر جنبش موجود تھی ——— ہر رُخ، ہر کونے، ہر زاویے سے نقطے منعکس ہو رہے تھے جیسے کروڑہا مکھیاں کسی کوڑے کے ڈھیر پر منڈلا رہی ہوں۔

وہ جانے کتنی دیر یوں ہی بالکونی میں سر لٹکائے کھڑا رہا۔ لڑکی ایک گلی میں مڑ چکی تھی اور دونوں لڑکے شہد کی مکھی کی طرح چپکے ہوئے قدم بقدم چلے جا رہے تھے۔

وہ اکتا کر بالکونی سے ہٹ آیا۔

میز پر کتابوں کے بے ترتیب ڈھیر پر رباعیاتِ عمر خیام کی ایک بوسیدہ سی جلد ادھ کھلی پڑی تھی جیسے قصداً پڑھتے پڑھتے چھوڑ دی گئی ہو ———

اُس کے سپاٹ ذہن میں دبے پاؤں عمر خیام کی ایک رباعی ابھر آئی:

"اگر تقدیر کے ساتھ ساز باز کر کے دنیا کے غم انگیز نظام کا پتہ
لگا لیا جائے تو اسے تباہ کر کے اپنی دلی خواہشات کے مطابق تعمیر کیا جا
سکتا ہے"

نیچے سڑک پر کار کے بریک زور سے چیخے، اور پھر مکھیوں کی بھن بھناتی ہوئی تیز آوازیں اُس کے کانوں میں تیر گئیں۔

اُس نے بالکنی سے جھک کر دیکھا ———

ایک میلا سا گندا چھوکرا کسی بڑے صاحب کی شوخ شیورلے کے نیچے آ کر دم توڑ چکا تھا!

یہ سب سائے یُوں ہی مرجاتے ہیں ——— لیکن ان سے نفرت بھی تو ٹھیک نہیں نا ——— بے چارہ غریب ——— بچے وچے ——— ہم کو دراصل اسی مرجانے والی دنیا کی از سرِ نو تعمیر کرنا چاہئے، تاکہ محبت زندہ رہے ——— یہ مُردے جی سکیں یہ دنیا جی سکے، اور یہ لوگ جی سکیں ——— اسے ہٹاؤ یہ کیا قنوطیت ہے۔ محبت زندہ ہے، کیونکہ عشق حقیقت ہے۔ ایک حقیقت جس کے لئے جسم سب کچھ ہے ——— اور محبت آگ ہے اور جسم لطیف پانی ......

اُس نے کمرے سے باہر نکل کر چپکے سے تالے میں کنجی گھمائی اور بڑی بے فکری سے چاروں طرف نظریں ڈالتا نیچے اُترنے لگا۔

دوسری منزل کے فلیٹ کے سامنے سے گذرتے ہوئے اُس نے سُنا کوئی کہہ رہا تھا ———

"سب لفنگے بدمعاش ہیں۔ کل رات بھر شراب پی کر وہ ادھم مچایا ہے کہ توبہ ہی بھلی ——— محلے میں شریفوں کا رہنا دوبھر کر دیا ہے"

وہ چونک پڑا، جیسے کسی نے بھرے بازار میں ننگا کر دیا ہو۔ اس احساس کے ساتھ ہی وہ بوکھلا کر کئی زینے ایک ساتھ پھلانگ گیا۔ اور جلدی سے چیونٹیوں کی طرح رینگتی ہوئی خلقت میں مل گیا۔

اس کو کچھ کام نہیں تھا۔ بس ذرا سیمنٹ کی پیکڈ بوریوں اور پاکولا، کوکا کولا کی بوتلوں کے نئے کٹس دیکھنا تھے۔ اور کسی پر ہجوم بس اسٹاپ پر بظاہر بس کے انتظار میں کھڑے ہو کر نظروں کے زاویئے بنانا تھا ——— تاریک چشموں کے پیچھے یہ کام بڑی آسانی سے ہو سکتا تھا ——— اُس کے اتوار اسی دلچسپی میں گذرتے تھے۔ اور وہ شام کو جب واپس لوٹتا تو ذہن کے دریچوں پر تولٹ ( [illegible] ) کے نقوش اور گہرے ہو جاتے۔

شام کو جب خالی جیب اور سپاٹ ذہن لئے وہ اپنے فلیٹ پہونچا تو ملکہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اُسے ایک جھٹکا سا لگا ———

"آج لیڈی انجیلا نہیں روئے گی ملکہ ——— تم جاؤ ——— زندگی کے اُجاڑ تپتے صحراؤں سے پرے گاتے ہوئے آبشاروں کے کنارے آسمانی اپسراؤں کی طرح کسی دور دیس کے شہزادے کا انتظار کرو ——— تم یہاں کیوں آئی؟ مجھے اپنے کل کے رویئے پر افسوس ہے"

"تمہیں کوئی افسوس نہیں ——— اُس کی آواز بالکل خشک تھی۔ جاڑوں کی چاندنی کی طرح خنک اور بے کیف ...... "آج میں یہیں رہوں گی۔ میری ماں مجھے بیچنا چاہتی ہے"

"تم یعنی تم ......" وہ ہکلانے لگا۔

تصوّرات کے سارے آئینے پاش پاش ہو گئے ——— وہ ریاضی کا UNSOLVED مسئلہ تو یوں چٹکی بجاتے حل ہو گیا ——— جسم کی بھوک زہریلی ہی سہی مگر کتنی طاقتور بھوک ہے ——— محبت آگ ہے جسم پانی ——— بس ایک لمس آگ ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح پر سکون ہو جائے گی ——— رات اپنی ہے ——— وہ سہمے سہمے سوچتے کانپ اٹھا۔

"نہیں، تم یہاں نہیں رہوگی" ——— اُس کی آواز کپکپا اٹھی ——— "تمہاری موجودگی کسی نئی کہانی کو جنم دے سکتی ہے"

"کہانیاں تو جنم لیتی ہی رہتی ہیں ڈیئر تم کیوں ڈرتے ہو ؟" اس کی آواز بدستور سرد تھی۔
اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے سلگ اٹھے۔ اُس نے چپکے سے دروازہ بند کر کے بجلی کھول دی۔
ملکہ پلکیں جھپکاتی ہوئی اس کے بستر پر نیم دراز سگریٹ کا دھواں اُگل رہی تھی۔

"جسم کی آگ کتنی لطیف ہوتی ہے" اُس نے میز پر پڑی ہوئی رباعیات عمر خیام کو گھورتے ہوئے سوچا ــــ "ایک دفعہ ں آگ کا غسل آبِ حیات کو فراموش کر دیتا ہے ــــ اس آگ میں جلتے رہو ــــ چلو ــــ یہاں تک کہ جسم سوکھ جائیں زبات راکھ ہو جائیں ــــ پھر دبی ہوئی چنگاریاں اگر جاگیں بھی تو آگ نہ بن سکیں گی" ــــ اُس نے نہایت تلخی سے سوچا رد ہسکی کی نئی بوتل کا کنوارپن توڑ کر اپنی خود ساختہ شکست کا احساس مٹانے لگا۔

ملکہ نے سلجھائی ہوئی نظریں گلاس میں اُبلتی ہوئی شراب پر ڈالیں ــــ
"ایک گھونٹ ادھر بھی ڈیئر، منہ کا مزا خراب ہو رہا ہے ــــ"
اس نے جھنجھلا کر بوتل زمین پر دے ماری۔
بچی کھچی شراب زمین پر نقش و نگار بناتی فرش کے رخنوں میں سو گئی۔
وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی ــــ

"تم مجھے غلط سمجھے" ــــ اُس کی آواز میں تلخی کا رس تھا ــــ "میں اپنا جسم بیچنے نہیں آئی ہوں ــــ میں تو نی آخری پونجی بھیڑیوں سے بچا کر لائی تھی تاکہ تمہاری نذر کر دوں ــــ یہ تو تمہارا ظرف ہے ــــ اسے جس طرح چاہو برتو ــــ میرا تو یہ خیال تھا کہ تم سے بہتر اس جسم کی حفاظت کوئی نہ کر سکے گا ــــ تم کم ظرف ہو، تم نے غلط انداز میں اپنی سوچ کا رُخ کھو دیا ــــ تمہارے احساسات مر چکے ہیں ــــ تمہاری رگوں میں ایسا فاسد خون رواں ہے جیسے سڑے ہوئے آم کا بدبودار رس ــــ محبت آگ ضرور ہے مگر جسم پٹرول نہیں پانی ہے ڈیئر ــــ ذرا آگ پر ڈال کر دیکھو تو، محبت کے سارے شعلے ایک ایک کر کے یوں بجھ جائیں گے جیسے شمع صرف ایک رات جی کر مردہ ہو جاتی ہے ــــ جوانی آبشار کی طرح تیز گام ہے ــــ یہ جسموں کی بھوک جو ہے نا، اگر نہ ہوتی تو جوانی زندگی کے اَن گنت لمحات تک متوازن رہتی ــــ محبت جواں ہو تو دل نہیں مرتا ......"

"جوانی تیز گام ہے ــــ جسم کی بھوک نہ ہو تو ــــ ...."
شراب کا جام بے خیالی میں اُس کے ہاتھ سے گر پڑا
وہ چونک اٹھا ...... !!

"محبت جواں ہو تو دل نہیں مرتا !!"

جیسے ایک دم سے دھوپ نکل آئی ہو ــــ کمرے کا بگڑا ہوا توازن درست ہو گیا ــــ ہر چیز با ترتیب نظر آنے لگی ــــ اُس نے بڑھ کر ملکہ کو سینے سے لگا لیا ...... تنگی بھوکی دنیا کے اُس پار فضاؤں کی حسین وادی میں کسی کا دل دھڑکا، اور جیسے کمرہ اندھیروں میں ڈوب کر روشن ہو گیا۔

---

نفیس رضا زیدی

# بہتی ندیا ناؤ پرائی

ہلکے سے اندھیرے میں سامنے دالان کے ستونوں سے لپٹی عشق پیچاں کی بیل گہری ہوگئی تھی۔ یہ پیچ و خم ــــ
میں نے اس پیچ و خم کے بارے میں سوچا۔

کمرے کے کنارے پر ٹنگی ہوئی بڑی سی تصویر کو میں نے ہزاروں مرتبہ دیکھا ہے۔ لیکن آج میں اس میں کوئی جدت نہ پاتے ہوئے بھی اسے بے مقصد گھور رہی ہوں ــــ

بڑی سی تصویر جس کے دونوں طرف بڑے بڑے خاموش درخت اور بیچ میں پرسکون پانی کی سطح پر بہتی ہوئی کشتی !!
اور مجھے زندگی کی تمام تر یکسانیت اس تصویر میں ڈوبی ہوئی نظر آئی۔
یہ درخت جو صدیوں سے یوں ہی کھڑے ہیں۔
یہ ندی جو برسوں سے یوں ہی بہہ رہی ہے۔
اور یہ کشتی جو ساحل پہ جا جا کر لوٹ آتی ہے ــــ جو بہہ رہی ہے مسلسل ..... بغیر کسی منزل کے ..... !!
کتنا بے تکا سوچ رہی ہوں کہ ساتھ ایک عورت کی زندگی کا موازنہ اس کشتی سے کر رہی ہوں۔
اس کشتی سے جو بار بار ساحل سے لگ کر بیچ میں آجاتی ہے ــــ کشتی جو مسافروں کو کناروں پر چھوڑ آتی ہے ..... لیکن خود اس کا کوئی کنارا نہیں ہے .....

جو ہر لمحہ زمین اور سورج کی مانند گردش کر رہی ہے ــــ
جب تک وہ ایک جسم رکھتی ہے ــــ حرکت کرتی رہے گی۔
ہاں تو میں اپنی الجھنوں میں عورت کا کشتی سے موازنہ کر کے اضافہ کر رہی ہوں .....
۔ جانے کیوں مجھے اس سمے بچپن کی وہ کہانیاں یاد آرہی ہیں۔ جو ہم رات ہوتے ہی بڑی ماں کے پہلو میں لیٹ کر سنا کرتے تھے ــــ

بڑی ماں ــــ جو خود ایک کہانی تھیں ــــ ہر وقت چھالیہ کترتیں ــــ یا تسبیح پڑھتی رہتیں !
بڑی ماں بھولی بیٹیا کی کہانی سناتیں ــــ

بھیا ہمیشہ کہتا: بڑی ماں، مجھے دیو کی کہانی سناؤ۔ اس دیو کی ــ جو بہت سے لوگوں کو ہرا کر کنول شہزادی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر لے گیا تھا۔

اور میں سہم کر کہتی ــــ نہیں ..... نہیں بڑی ماں ..... دیو کی کہانی نہیں ..... مجھے تو سات شہزادیوں کی کہانی سناؤ..... جن میں سب سے چھوٹی شہزادی کو زمین کھودنے سے خزانہ ملا تھا ــــ اور اس نے بڑا سا محل بنوایا تھا جس میں وہ اکیلی رہتی تھی ــــ

بھیا چڑاتا تم۔ تم دیو کی کہانی سننے سے ڈرتی ہو کہ کہیں تم کو کوئی دیو اٹھا کر نہ لے جائے ــ

(اور آج میں سوچتی ہوں۔ ہر لڑکی کو دیو ہی تو اٹھا رہے جاتے ہیں ــ کتنے لوگوں کو ہرا کر)

اور بڑی ماں اس سے کوئی نئی کہانی چھیڑ دیتیں .....

وہ اس پری کی کہانی سنانے لگتیں، جو رات کو چپکے سے آ کر اچھے بچوں کو خوب صورت کھلونے دے جاتی ہے۔

اور میں ساری رات ان خوب صورت کھلونوں کے خواب دیکھتی۔

اب میں سوچتی ہوں۔ ہمیں خواب دیکھنے کی کتنی عادت ہوتی ہے، بچپن سے بڑھاپے تک صرف خواب ہی دیکھتے ہیں ــ

خواب ــــ جن کی ڈوروں کو اگر ملا لیں، تو پوری ایک کہانی بن جاتی ہے ـ

وہ کہانی جس کی حقیقی شکل دیکھنے کے لئے عورت خواب دیکھتی ہے۔

بڑی ماں کو اتنی کہانیاں یاد تھیں کہ وہ ہر روز ہمیں نئی کہانی سناتیں۔

اور آج میں سوچتی ہوں ــــ تو ..... تو کہانی صرف ایک تھی ــــ ہاں روز اس میں ہیر پھیر ہو جاتے تھے، اور کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔

ہم روز رات کو اندھیرے کے ساتھ ہی کہانی کا تصور کرتے تھے۔

اور آج وقت بیتنے پر میں ہلکے اندھیرے میں اس تصویر کی کشتی کا عورت سے مقابلہ کر رہی ہوں۔

عورت جو دوسروں کو منزل سے لگا دیتی ہے۔

لیکن خود بیچ میں یوں ہی ہچکولے کھاتی رہتی ہے۔

جیسے یہ کشتی ــــ

اس تصویر میں تو پانی بڑا پرسکون ہے۔ لیکن اس پانی میں بڑے بڑے طوفان پوشیدہ ہیں۔

اور جب طوفان بپا ہوتے ہیں تو کشتی ڈگمگا جاتی ہے۔

اور آخر ڈوب جاتی ہے۔

اس تصویر میں تو مصور نے صرف ایک لمحے کو قید کر دیا ہے۔

[illegible]

[illegible] ــــ یہ لمحے، ہاں یہ معصوم بھری کہانی ــــ

بڑی ماں جو میرے سب سے بڑے تایا کی بیوی تھیں.....

کہتے ہیں بہت خوب صورت تھیں....

انہوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ میری خوب صورتی میرے شوہر کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی — اپنے کو خاموشی کی چادر میں لپیٹ لیا۔ اور عبادت کے لامتناہی سلسلوں میں اپنے کو ڈبو لیا۔

کہتے ہیں: بڑے تایا — بڑے بانکے سجیلے تھے —

اُن کو گھر کی اس خوب صورت، کم عمر شرمیلی لڑکی میں کوئی دلکشی نظر نہیں آئی۔

اور بس بڑی ماں نے اس چوکھٹ کو جس میں وہ بیاہ کر آئی تھیں، سجدہ گاہ بنا لیا۔

بڑے تایا تو چند سال بعد ہی دنیا سے منہ موڑ گئے۔

اور بڑی ماں ایک کہانی بن گئیں۔

وہ عورت جو ایک کشتی ہے — ہر دم رواں ہوتے ہوئے بھی یکسانیت کے ریزہ ریزہ پردوں میں دفن —

بڑی ماں صرف چند لمحے زندہ رہیں۔

اور میرے خیال میں وہ چند لمحے ان کے دلہن بننے کے سمے تھے۔

پھر وہ مر گئیں۔

اور ایک کہانی نے جنم لیا۔

کہانی جو ہمیشہ سے ایک ہے۔ لیکن ہیر پھیر کر ہم اُس کو کبھی بڑی ماں کی کہانی — کبھی اپنی ماں کی کہانی — اور کبھی خود اپنی کہانی بنا لیتے ہیں۔

وہ کہانی جو دھرتی کی تمام عورتوں کی ہے۔

جو سب ایک کشتی کے سوار ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہیں۔

اندھیرا گہرا ہو گیا ہے — اور تصویر کے نقوش چھپ گئے ہیں۔

میں نے کرسی میں سر پیچھے کی طرف ٹیک کر سوچا:

بڑی ماں! جب تم ڈھیر سارے بے مقصد سال دنیا کی نذر کر کے چلی گئیں۔

تو کیا ہوا — کچھ بھی تو نہ ہوا۔

بالکل ایسے، جیسے اس کے تصویر کے نقوش پر گہرے اندھیرے نے ایک کالی چادر ڈال دی ہو — تم چلی گئیں — رفتارِ زندگی میں کوئی فرق نہ آیا — بس صرف اتنا کہ پرانی کہانیوں کے نئے کردار سامنے آ گئے! — کیونکہ اب میں خود ایک کہانی بن گئی تھی۔

بھیا اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر چلا گیا تھا۔

بھیا بہت شریر تھا۔ ہر ہفتے تمہاری تسبیح توڑ ڈالتا تھا — دانے بکھر جاتے — تم بھیا کو ہلکے لہجے میں ڈانٹتیں۔

میں سہم سہم کر دانے چنتی — بار بار دانوں کو چومتی —

یا سُنا تفران میں دعا پڑھی جاتی ہے نا!
یہ کربلا کی مٹی کے بنے ہوتے ہیں۔
میں چوکی کے نیچے سے دانے چن چن کر تمہارے آنچل میں رکھتی ــــ اور تم ان کو پروتیں ــ
بڑی ماں تم ساری زندگی دانے پروتی رہیں۔
اور ہر مرتبہ ایک دانہ کم ہو جاتا۔
تم بکس کھول کر دوسری تسبیح نکالتیں۔
بڑی ماں، ہم ساری زندگی دانے پروتے اور کھوتے ہیں ــ!!
انسانوں سے ملتے اور بچھڑتے رہتے ہیں۔
تم میں اتنی ڈھیر ساری اچھائیاں تھیں ــــ اور تمہارا وجود ایک بلبلے کی مانند ہوا میں تحلیل ہو گیا ــــ اور ہم کچھ نہ کر سکے ــ
تو ہم کیسے تحلیل ہوں گے۔
کہتے ہیں: بڑی ماں زندگی میں بڑی حقیقت پیدا ہو گئی ہے۔
لوگ حقیقت پسند ہو گئے ہیں۔
اب بچے راتوں کو پریوں کی کہانی نہیں سنتے۔
یہ کہتے ہوئے میرا قہقہے لگانے کو جی چاہتا ہے کہ اب لوگ نئی قدروں کے حامی ہیں۔
آج عورت اپنے کو ایک کہانی نہیں ــــ پہیلی سمجھتا ہے۔
بڑی ماں ہمیں پرانی روایتیں کتنی عزیز تھیں۔
تم نے کتنے تجربے اپنی زندگی اس چوکھٹ کی سجدہ ریزی میں صرف کر دی۔ جس کے مالک نے تم کو کبھی اس چوکھٹ کی مالکن نہیں بنایا۔
تم نے مجھے ہمیشہ یہ سکھایا ــــ
بیٹی، عورت میں بڑی نرمی ہے ــــ بہت دھیرج ہے ــــ اس دھیرج کو زندگی کا بنیادی نصب العین بنا لو۔
اُس وقت میں دھیرج اور نصب العین کے معنی بھی نہ سمجھتی تھی۔
اور اب سوچتی ہوں کہ ــــ
تم کتنی عظیم تھیں۔
تم نے زندگی کے ۷۵ سال اتنی دھیرج اور نرمی سے گذار دیئے ــــ اور اُف نہ کی!
اتنی نرمی اور بے نیازی سے،
جیسے آہستہ خرام پانی میں کنول تیر رہا ہو۔
جیسے شاخ پر نازک سا پھول ہلکی ہوا سے ہلکورے کھائے ــ!

جس طرح اس تصویر میں دریا کا پانی انتہائی سکون سے بہہ رہا ہے۔
مصور نے ایک لمحہ میں اس تصویر کو جاوداں بنا دیا۔
بالکل اسی طرح خدا نے ایک لمحے میں تمہاری تقدیر کی سند لکھ دی۔
اور تم نے زندگی کے ۶۵ سال انتہائی دھیرج سے گزار دیئے ——
آج میں چاہوں تو اس دھیرج پر ہزاروں صفحے کالے کر سکتی ہوں۔
لیکن یہ سب کچھ نہیں ہے —
اصل تو یہ ہے:
عورت ایک کشتی ہے !! ——— ہردم رواں ———
ایک دریا ہے !! ——— وہ پدما ہو یا راوی ———
ایک پھول ہے !! ——— خواہ مُرجھائے یا سَدا بہار رہے ———
اور کچھ بھی نہیں!

احفاظ الرحمٰن

# آواز کا روپ

اس دن مجید کو خالہ یونہی اتفاقاً مل گئی تھیں، ورنہ اسی شہر اسی علاقے میں رہتے ہوئے بھی وہ ان سے تین چار برس سے نہیں ملا تھا۔ صبح چار بجے سے رات کے گیارہ بجے تک چائے کے کپ اٹھائے، ایک میز سے دوسری میز کے چکر لگانا، بدخصلت گاہکوں کے ناز نخرے برداشت کرنا، سیٹھ کی سُرخ سُرخ آنکھوں کا بار اٹھانا، یہ سب معمولی باتیں نہیں تھیں۔ ان کے لئے بڑی مستقل مزاجی اور بے حسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کونے سے اُس کونے تک، اس میز سے اُس میز تک اٹھارہ گھنٹے چلتے چلتے کمر ٹوٹ جاتی تھی۔ اور اس کے بعد جسم پر ایسی تھکن سوار ہوتی کہ رُوح کے تمام رشتے ٹوٹ جاتے، چہروں پر اندھیرا چھا جاتا۔ نیند سے بوجھل آنکھوں میں بس ایک سوال گھومتا رہتا؛

ساری میزیں گر کر چور ہو جائیں، سارے گاہک بھاگ جائیں، اور موٹی توند والا ایرانی سیٹھ اپنے بدصورت، بے ہنگم چہرے کے ساتھ کاؤنٹر پر بیٹھے بیٹھے اچانک گر کر مر جائے؛

پھر مہینے میں ایک آدھ دن کی چھٹی بھی ملتی تو وہ ادھر ادھر گھوم پھر کر گزار دیتا۔

روز کے معمولات مستقل صورت اختیار کر چکے تھے، اور اب ان میں کوئی نئی بات پیدا ہونے کی گنجائش بہت کم تھی۔

لیکن آج ان معمولات کی خامشی اور سکوت میں ایک بم سا پھٹ پڑا تھا۔ جس نے اس کی بے حسی کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا ہوٹل کی ملازمت نے اس کے ذہن پر جو زنگ لگایا تھا اُسے جیسی بے دردی سے کھرچ دیا تھا۔ روح کے تمام رشتوں کا درد اس کے دل میں جگا دیا تھا۔

اور اس درد، اس کسک نے اس کی ساری جسمانی قوت سلب کر لی تھی اور وہ میزوں کے گرد، گاہکوں کے شور و غل میں اپنے آپ کو اجنبی سا محسوس کر رہا تھا۔ ایرانی سیٹھ کی سُرخ سُرخ آنکھیں اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھیں۔ گاہکوں کا حساب بناتے وقت اس کا ذہن، اس کی آواز کا ساتھ چھوڑ جاتی اور وہ روہانسا ہو جاتا ـــــ دس منٹ میں وہ چائے کی چار پیالیاں توڑ چکا تھا۔ ایرانی سیٹھ کی سرخ سرخ آنکھیں اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھیں۔ گاہکوں کے قہقہے، ان کا ہنسی مذاق، شور و غل ہتھوڑے کی طرح اس کے ذہن پر برس رہے تھے۔ آوازوں کے جنگل میں اس کے دل کی آواز جانے کہاں سے ابھری اور ساری آوازوں پر چھا گئی...... اس کی پلکیں آنسوؤں میں بھیگ گئیں۔ وہ دوسروں کی آوازوں پر میزوں کی طرف لپکتا تھا۔

ان کی خواہشات کی تکمیل کرتا تھا ـــــ لیکن آج اس کے دل کی آواز کون سنتا؟ کس نے اس آواز کے احترام میں جس نے روح کے ایک رشتے کا درد پہچانا تھا، اپنی آواز نیچی نہیں کی ـــــ کیونکہ وہ ایک بیرا تھا ...... تیسرے درجے کے ایک ہوٹل کا معمولی سا بیرا!

ابھی دس منٹ پہلے وہ خالہ سے ملا تھا۔

شاید باہر والا چائے لے کر کہیں دور گیا ہوا تھا، اسی لئے جب سامنے سے محمد طفیل ماسٹر نے چائے کی آواز لگائی، تو سیٹھ نے اس سے کہا تھا کہ وہ دوڑ کر لے چائے دے آئے۔

وہ جھنجلا ہی تو گیا ـــــ اندر کا کام کیا کم تھا جو وہ خوشی سے باہر کا کام کرنے دوڑا جاتا ـــــ پھر محمد ماسٹر سے تو وہ اسی دن سے نفرت کرنے لگا تھا جس دن سے اس نے ایک بوڑھے بھکاری کو گالیاں دی تھیں، اور اسے دھکا دے کر اپنی دوکان کے آگے سے ہٹا دیا تھا۔

لیکن اب تو اسے جانا ہی تھا۔

یہ سیٹھ کا حکم تھا!

سیٹھ، جس سے ہر ماہ اُسے اسّی روپے ملتے تھے ـــــ ان اسّی روپوں نے نفرت کے اس جذبے پر پردہ ڈال دیا، اور وہ چائے کا کپ لے کر باہر نکل گیا۔

پھر اُس نے سڑک پار کر کے دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے سے اسے خالہ آتی دکھائی دیں، جلدی سے ماسٹر کو چائے پکڑا کر وہ اُن کی طرف لپکا۔

سلام کر کے شرماتا ہوا وہ ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ خالہ اسے اجنبی سی لگ رہی تھیں۔ گزرے ہوئے سالوں نے ان کے چہرے پر کتنی بوڑھی کمزور سی لکیریں کھینچ دی تھیں۔ ماتھے کی طرف لٹکے ہوئے سفید بالوں میں یاس و حرماں کے نقوش کتنے نمایاں تھے۔ آنکھوں کی چمک ان انگاروں کی طرح تھی جو اب بجھنے والے ہوں۔

تو بڑا آدمی بن گیا ہے؟۔ خالہ جیسے بجھے لب سے مسکرائیں۔ کبھی بھول کر بھی نہیں آیا، اتنا ناراض ہے؟"

فٹ پاتھ پر لوگ آ جا رہے تھے۔ اچھے اچھے خوب صورت لباس پہنے، اپنے چہروں پر مسکراہٹیں لئے ..... اور ان کے سامنے ان کے اندر کا معمولی سا بیرا سمٹا جا رہا تھا۔

اُس نے خالہ کو پکڑ کر ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔ "وقت ہی نہیں ملتا خالہ جان! رات کو بارہ بجے بند ہوتا ہے ہوٹل!"

اُس نے اب غور سے خالہ کی طرف دیکھا، ان کا جائزہ لیا ـــــ برقع جو شاید کسی زمانے میں کالا تھا، بار بار تیزابی مادوں سے دُھلنے کی وجہ سے مٹیالے رنگ کا ہو گیا تھا۔ شکنیں اتنی پڑی تھیں جیسے ابھی ابھی کسی نے اسے پکڑ کر رسی کی طرح بل دے ڈالا ہو۔ بغیر استری کی میلی کچیلی شلوار میں جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے۔ کٹے پھٹے پاؤں میں گرد آلود ٹوٹی پھوٹی چپلیں پڑی ہوئی تھیں ـــــ لیکن یہ باتیں کچھ اتنی زیادہ اہم نہیں تھیں۔ آنکھوں میں جب روح کا آلام جھلکنے لگے تو کچھ اور دیکھنے کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے۔

اُسے یہ تو معلوم تھا کہ خالو کے انتقال کے بعد ان پر بڑا بھاری بوجھ آن پڑا تھا۔ امجد بھی بے روزگار تھا۔ لیکن حالات

اتنے بگڑ چکے ہیں اُسے اس کا اندازہ نہیں تھا ـــ ورنہ یہ وہی خالہ تو ہیں جو اپنی خوب صورتی اور خوش لباس ہونے کی وجہ سے پورے خاندان میں مقبول تھیں۔

"نجمہ اور امجد تجھے بہت یاد کرتے ہیں"

وہ چونک پڑا۔

خالہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھیں:

"امجد کے مُنّے کو تو تُو نے دیکھا ہی نہیں، دو سال کا ہو گیا ہے! چلبلا ہے تو اس کا!"

وہ روہانسا ہو گیا۔ ہوٹل کی پرشور سخت، کرخت فضا میں اس کے دل میں محبت کے جذبوں پر سرد مہری کی گرد چھا گئی تھی۔ خالہ نے ایک ہی پول میں، میٹھے بول کی ایک ہی پھونک سے اس گرد کو اڑا پھینکا تھا۔

"اگلے بدھ کو ضرور آؤں گا! سیٹھ سے ایک گھنٹے کی چھٹی لے کر!!" اس نے بھرائی ہوئی آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اسے دعائیں دیتی رہیں، اور وہ انہیں سلام کر کے ہوٹل کی طرف مڑ گیا۔

کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے موٹے سیٹھ کی بھینسے جیسی آنکھیں آگ سی برسانے لگیں۔ روز وہ اس کی جھڑکیاں برداشت کر لیتا تھا، ہلکی نگاہیں سہہ لیتا تھا، لیکن آج تو وہ اسے بالکل زہر لگا، اور اس کا جی چاہا کہ سامنے والی میز پر رکھا ہوا گلاس اٹھا کر اس کے مجرموں جیسے چہرے پر دے مارے۔

خالہ نے اس کے بے حس جذبات کی جھیل میں احساس کا جو بھاری پتھر پھینکا تھا، اس سے کئی دائرے، کئی زاویے رقص کرنے لگے تھے اور ہر دائرہ، ہر زاویہ بیتے دنوں کے نقطوں سے شروع ہوتا تھا......

یہ خالہ ہی تو تھیں جنہوں نے ماں کے انتقال کے بعد اسے اپنے بیٹے کی طرح، اپنی کوکھ کے بچے کی طرح پالا تھا۔ جب اس کی ماں کا انتقال ہوا تو اُس وقت وہ بالکل ناسمجھ تھا۔ تین چار سال کا بچہ دنیا کے وسیع اور لامحدود علم کے سمندر میں ادھر ادھر ڈولتا ہی تو رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس عمر میں بھی یہ بتا سکتا تھا کہ ممتا کا جذبہ کیا ہوتا ہے۔ خالہ نے کبھی اس کے دل میں ماں سے محرومی کا احساس نہیں جاگنے دیا۔ وہ اسے بالکل اپنے بچوں کی طرح رکھتی تھیں۔ باہر کے لوگ اسے اور امجد کو ہم عمر ہونے اور لباس کی یکسانیت کی وجہ سے سگے بھائی سمجھتے تھے۔

خالہ نے اسے ممتا کا ہر جذبہ دیا تھا اور اس نے ہر رُخ سے ماں کی محبت کو پہچانا تھا، جانچا تھا، اور اس سے پوری خوشی حاصل کی تھی۔ سارے رُخ، سارے جذبے، سارے رنگ اسے اب تک یاد تھے، ہوٹل کی سخت فضا میں ان کا نرم خنک تصور اس کے دل میں بسا رہا، اور وہ میزوں کے گرد چکر لگاتے ہوئے اور چیخ چیخ کر گاہکوں کا حساب بتاتے ہوئے انہیں یادوں میں، انہیں میٹھی یادوں میں ڈوبا رہا...

جب وہ چھوٹا تھا، بہت چھوٹا ـــ تو خالہ اسے سُلانے کے لئے میٹھی میٹھی لوریاں سناتیں اور جب وہ سو جاتا، تو اسے بادلوں کی دنیا میں پریاں رقص کرتی دکھائی دیتیں، دور ہلکے سُروں میں گھنٹیاں سی بجتیں، اور وہ کتنی دیر تک ان پریوں کے ساتھ کھیلتا رہتا ـــ اس کے ذہن میں پریوں کا تصور بھی خالہ ہی کے نقوش سے بنتا تھا، وہ بھی تو پریوں کے

مانند خوب صورت لگتی تھیں۔ ہر دم ان کے بدن سے ایک بھینی بھینی سی خوشبو پھوٹتی رہتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ ان کے گلے میں باہیں ڈالے ان سے چمٹا رہے۔

سنا ہے کہ جب وہ دس گیارہ سال ہی کی تھیں تو ان کے لئے ان گنت گھروں سے پیام آنے لگے تھے۔ اور جب ان کی شادی ہوگئی اور پھر دو تین بچے ہو گئے تب بھی ان کے چہرے پر کنواریوں سے بڑھ کر جاذبیت اور کشش تھی۔ محلے کے نوعمر چھوکرے ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے گھر کے ارد گرد منڈلاتے رہتے تھے۔

میرٹھ میں ان کا چھوٹا سا خوب صورت گھر تھا جس کے آنگن میں مولسری کا درخت لگا ہوا تھا۔ صبح صبح اس کے پھولوں کی خوشبو پورے گھر میں پھیل جاتی تھی۔ وہ چھوٹی عمر ہی میں اس پر چڑھنا سیکھ گیا تھا۔ جب وہ خالہ کو ستانا چاہتا، تو کھانے کے وقت اس کے اوپر چڑھ جاتا۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جھانکتی پھرتیں، اور زور زور سے اسے پکارتیں ــــ جھنجلاتیں ــــ

"کھانے کے وقت بھی غائب رہتا ہے کم بخت! ہر وقت کھیل کی دھن میں لگا رہتا ہے"

اور جب وہ آنگن میں آتیں تو وہ دھم سے ان کے سامنے کود پڑتا۔

"اوئی" ــــ وہ ڈر کے ایک طرف اچھل پڑتیں، اور جب اسے دیکھتیں تو جھینپ کر کہتیں ـــ "بہت بدمعاش ہو گیا ہے، ڈرا دیا نا؟"

وہ واقعی ہر دم کھیل کود ہی میں لگا رہتا تھا، پڑھنے لکھنے سے اسے ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اور امجد ایک ہی کلاس میں داخل ہوئے تھے، لیکن وہ فیل ہوتا رہا اور امجد اس سے کئی جماعت آگے نکل گیا۔ خالہ اسے سمجھاتی رہتیں، ہمیشہ اس کے پیچھے پڑی رہتیں ـــ

"پڑھ لکھ لے، کام آئے گا!"

لیکن وہ اس معاملے میں نہایت کاہل تھا۔ پڑھنے لکھنے کی بہ نسبت کھیل کود اور مار پیٹ میں اس کا دل زیادہ لگتا تھا۔ لیکن شاید ہر بچہ ایک زمانے میں ایسا ہی ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ سدھر جاتا ہے۔

اور اگر وہ وقت کے ساتھ ساتھ بگڑتا گیا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ خالو بہت سخت آدمی تھے، اور بات بات پر لوگوں کی طرح دھنک ڈالتے تھے۔ بہت معمولی معمولی سی باتیں ہوتیں جنہیں اگر وہ چاہتے تو آسانی سے نظر انداز کر سکتے تھے۔

وہ شروع ہی سے بہت حساس تھا، اور یہ سمجھتا تھا کہ خالو اس کی پٹائی اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ان کا اپنا بچہ نہیں ہے امجد کو انہوں نے کبھی پھولوں سے بھی نہیں مارا تھا۔ اس کا ردّ عمل یہ ہوا کہ وہ ضدی ہوگیا۔ زنجیر سے پٹنے کے بعد بھی خالو کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ خالو پر بھی ضد سوار ہو جاتی، اور وہ غصے میں اندھے ہو کر اسے اتنا مارتے کہ سب کانپ کر رہ جاتے۔

خالہ بھی اس پر سختی کرتیں، ڈانٹ ڈپٹ کے کام لیتیں، لیکن وہ جانتا تھا کہ ان کے سخت سے سخت الفاظ کے پیچھے بھی ان کا مہربان دل چھلکتا تھا۔ ہر سے محبت کا جذبہ جھلکتا تھا۔

خالو کی سخت نظروں سے بچنے کے لئے وہ اکثر وقت باہر گزارتا۔ ان دنوں اسے بہت خراب دوست مل گئے تھے، صبح وہ امجد کے ساتھ اسکول جانے کے لئے گھر سے باہر نکلتا، لیکن راستے میں اسے چھوڑ کر ان دوستوں کے پاس چلا جاتا ـــ

یہ لڑکے پختہ عادتوں کے تھے، اور نوعمر آوارہ لڑکوں کی تمام بُری عادتیں ان میں موجود تھیں۔ پہلے پہل اس نے ان کے ساتھ سگریٹ پینی سیکھی، پھر اسکول سے بھاگنے لگا۔

اس کی شکایات آتیں تو خالو بغیر سوچے سمجھے اندھا دھند اسے پیٹنے لگتے، وہ پیٹتے پیٹتے تھک جاتے، لیکن اس کی آنکھوں سے ایک آنسو نہیں نکلتا، کیونکہ اسے وہ اپنی شکست سمجھتا تھا۔ اور خالو کی "بزرگی" پر اس ردِعمل سے سخت چوٹ لگتی، اور وہ دن بدن اپنا رویہ سخت تر کرتے گئے۔ معمولی معمولی سی باتوں پر جھڑکتے رہتے:

"ہنس کیوں رہا ہے؟"

"تیز تیز کیوں چل رہا ہے؟"

"اس کرسی پر کیوں بیٹھا ہے؟"

گھر میں اس کی ہمدرد نجمہ تھی۔ اگر کبھی وہ گھر میں ٹک جاتا تو نجمہ ہی کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ اسے خالہ سے جو پیسے ملتے تھے انہیں وہ خرچ نہیں کرتا تھا، جمع کرتا جاتا، اور جب کافی پیسے جمع ہو جاتے تو ان سے نجمہ کے لئے کوئی چیز لے آتا۔ جب کبھی خالو اس کی پٹائی کرتے تو کچھ دیر بعد نجمہ چپکے سے اس کے پاس آتی، اور دھیرے دھیرے اُس کی چوٹوں پر ہلدی چونے کا لیپ لگاتی جاتی، اور کہتی:

"مجید بھیا، تم بھی بڑے ضدی ہو، مانتے نہیں ہو پٹے بغیر، کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کرتے ہو۔"

اور جب وہ اپنی اُداس نگاہیں اوپر اٹھاتا تو گھبرا کر خود کہنے لگتی،

"ابا بڑے ظالم ہیں، ذرا ذرا سی بات پر مارتے ہیں۔"

اور جب وہ چلی جاتی تو اس کی آنکھوں میں ضبط کے وہ بند ٹوٹ جاتے جنہیں وہ اب تک خودداری کے احساس سے روکے رکھتا تھا۔

خودداری کا یہ احساس اسے اس راستے تک لے جا رہا تھا جس کی منزل میزوں کے گرد چکر لگاتے لگاتے دھندلا جاتی ہے اور جہاں آوازوں کے جنگل میں اپنی آواز، اپنے احساس کی آواز ڈوبتی چلی جاتی ہے۔ وہ تو اس راستے پر اسی دن مڑ گیا تھا، جس دن خالو نے پہلی بار ایک معمولی سی بات پر اسے مارتے مارتے بے ہوش کر دیا تھا۔

پاکستان آنے کے بعد وہ حیثیت نہیں رہی۔ خالو کو جیسے تیسے ایک نوکری مل گئی۔ وہ بھی غنیمت ہوا، ورنہ آنکھوں کے سامنے کتنے کماتے پیتے گھرانے بکھر گئے۔

خالہ نے جیسے تیسے خالو کی خوشامد کرکے اسے بھی امجد کے ساتھ اسکول میں داخل کرا دیا۔ افلاس نے خالو کو پہلے سے زیادہ ضدی اور چڑچڑا بنا دیا تھا......

وہ گھر سے باہر رہنے کے لئے سارا دن آوارہ گردی کرتا رہتا۔ ماحول بالکل بدل گیا۔ اُس کے عادات و اطوار روز بروز بگڑنے لگے۔ دن بھر گھٹیا سے ہوٹلوں میں بدقماش لڑکوں کے ساتھ گپیں مارتا رہتا، اور ایسے لوگوں کے ساتھ رہ کر اس کی فطرت میں سختی اور خود سری پیدا ہوتی گئی۔

پھر ایک دن جب خالو نے اُسے چھت سے اُلٹا لٹکا کر بید سے پٹائی کی تو وہ گھر سے بھاگ گیا۔ اور جب بہت دنوں بعد

واپس آیا تو خالو نے بجائے پیار کرنے اور سمجھانے کے جی بھر اس کی پٹائی کی ...... وہ اُسی وقت اُسی دن پھر گھر سے بھاگ گیا...... اور آج تین برس ہوئے وہ پھر وہاں نہیں گیا۔

اس دوران اُس نے زندہ رہنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا، اور آخر میں اس ہوٹل میں ملازم ہو گیا۔ شاید وہ اسی خانے میں فٹ ہونے کے لئے پیدا ہوا تھا۔

اسے خالہ اور نجمہ کی محبت یاد آتی تو بے چین ہو جاتا، اس کے ساتھی دوسرے ملازم جب اپنے ماں باپ، بھائی بہن کی باتیں کرتے تو اس کے دل پر ان جلنے سے سیاہ جذبے چھا جاتے، اور محرومی کا احساس اس کی پلکوں پر آنسوؤں کا روپ دھار لیتا۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ میری بھی ایک ماں ہے، میرا بھی ایک بھائی ہے اور میری بھی ایک بہن ہے۔ لیکن وہ کیسے کہتا۔ چپکے سے وہاں سے ٹل جاتا کہ زیادہ دیر تک ان کی باتیں نہ سن سکے۔

وہ میزوں کے گرد چکر لگاتا رہتا، یا ایک ڈیڑھ بجے رات کو دن بھر کی تھکن سے نڈھال بستر پر پڑا ہوتا، بس ایک ہی خیال میں ڈوبا رہتا —" کاش میں بھاگا نہ ہوتا" — گھر گھر ہی ہوتا ہے، پچھلے تین سال کی ٹھوکروں نے اُسے یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی۔

پھر اُس نے سُنا کہ: خالو کا انتقال ہو چکا ہے۔

اس کے ایک ڈیڑھ سال بعد اسے یہ معلوم ہوا کہ امجد کی شادی ہو گئی ہے۔

کئی بار اُس نے جانا چاہا، لیکن بس سوچتا رہ گیا۔

جانے خالہ کیا کہیں گی،

خالو کی طرح اسے ڈانٹ ڈپٹ کر نکال تو نہیں دیں گی کہ سپنولئے کو پال چکی۔

کہیں یہ نہ سوچیں کہ اب بے کار ہو گیا ہو گا تو دوڑا آیا۔

اب تو امجد کی شادی بھی ہو گئی ہے۔ جانے اس کی بیوی کیسی ہو گی۔ میرے متعلق کچھ نہ کچھ سُن تو چکی ہو گی۔

میں ایک معمولی سا بیرا ہوں، شاید اب وہ مجھے اُس گھر میں نہ برداشت کر سکیں۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے خیالات اُس کے پیروں میں زنجیر ڈال دیتے۔ فرار اور گریز کا جذبہ محبت کے تمام جذبوں پر چھا جاتا، اور بیتے ہوئے دنوں پر گرد سی چھا جاتی۔

لیکن آج خالہ نے فرار کی یہ زنجیر توڑ ڈالی تھی۔ ان کے چہرے پر ان کا شفیق دل آج بھی دھڑک رہا تھا، انہوں نے کچھ بھی تو نہیں کہا۔ ملامت کا ایک لفظ بھی ان کے ہونٹوں پر نہیں آیا۔

پانچ نمبر میز کا آرڈر پورا کرنے کے بعد وہ سیدھا کاؤنٹر کی طرف بڑھا —" سیٹھ ہم کو دو گھنٹے کا چھٹی چاہئے بدھ کے دن، ہم اپنی ماں سے ملنے جائے گا!"

"کیا بولا؟" سیٹھ اسے گھورتا ہوا بولا: "تم تو کہتا تھا ادھر تمہارا کوئی رشتے والا نہیں!"

"نہیں سیٹھ! میں جھوٹ بولتا تھا" اُس نے رُندھے گلے سے کہا "میری ماں ادھر ہی ہے"

سیٹھ کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ شاید سیٹھوں کے چہروں پر کوئی تاثر نہیں ہوتا۔ اور ان کے دلوں میں کوئی لہر ہی نہیں

خوشی -

"اچھا ٹھیک ہے !" اُس نے کہا " دیکھو چار نمبر پہ گاہک آیا ہے "

اُسے ہمیشہ سیٹھ کا یہ تجارتی خود غرضانہ انداز زہر لگتا تھا، لیکن آج اسے اس کا احساس تک نہیں ہوا - چار نمبر کا آرڈر پورا کرنے کے بعد وہ واپس آیا :

"سیٹھ ہم کو بدھ کو بیس روپیہ بھی چاہئے، تنخواہ میں سے کاٹ لینا - میں اپنی ماں کے لئے کپڑا لے کر جاؤں گا "

"اچھا، اچھا لے لینا !" سیٹھ اسے خالی خالی نظروں سے گھورتا رہا - " دیکھو پانچ نمبر پہ گاہک لوگ آیا ہے "

وہ پانچ نمبر کا آرڈر لینے چلا گیا -

خوشی ناپی نہیں جا سکتی - لیکن اس کی روح کا پیمانہ خوشی سے چھلکا پڑ رہا تھا - اور وہ اس لامحدود پیمانے سے اپنی خوشیوں کو ناپ سکتا تھا -

وہ بڑی بے چینی سے بدھ کا انتظار کرتا رہا ـــــ جانے کو وہ وہاں کل بھی جا سکتا تھا، اُس دن بھی جا سکتا تھا، جس دن خالہ ملی تھیں، اور اُس نے ان کا چھلنی چھلنی برقع دیکھا تھا - اور ان کی آنکھوں میں موت کی دھندلی دھندلی پرچھائیاں سی تیرتی محسوس کی تھیں، تو اس نے اسی لمحے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خالہ کے لئے ایک شلوار اور ایک جمپر کا کپڑا ضرور لے کر جائے گا، اور اس کے لئے اس نے پندرہ روپے کا تخمینہ لگایا تھا، اور یہ روپے اسے بدھ کے دن ملنے تھے -

بدھ تک اُس نے کتنی ہی باتیں سوچ ڈالی تھیں ...... دوڑتا ہوا جاؤں گا، اور بچوں کی طرح خالہ سے لپٹ کر کہوں گا ـــ "خالہ ! اچھی خالہ !! مجھے معاف کر دو، میں باہر کی کڑی دھوپ سے بھاگ کر آیا ہوں مجھے گھر کی ٹھنڈی چھاؤں میں رکھ لو - اب میں یہاں سے کبھی بھاگ کر نہیں جاؤں گا " اور جیب میں کپڑوں کا بنڈل ان کے ہاتھ پر رکھ کر کہوں گا - " خالہ یہ کپڑے میں تمہارے لئے لایا ہوں تو ..... وہ کتنی خوش ہوں گی ـــــ پھر میں بھی ان کی اتنی خدمت کروں گا کہ وہ بھی سارے غم بھول جائیں گی ـــ ساری تنخواہ لے جا کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیا کروں گا ..... رنج و آلام کی گرد ان کے چہرے سے اڑ جائے گی - میں کہوں گا ـــ "خالہ ! امجد بے کار ہے تو کیا ہوا - میں بھی تو تمہارا امجد ہی ہوں - میں ایک بار تمہاری ممتا کی چھاؤں کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا، جب سے میں تند و تیز آوازوں میں گھرا ہوا ہوں - اجنبی نظروں کی سرد مہری کی آگ میں جلتا رہا ہوں - نرم میٹھی آوازوں کے لئے ترستا رہا ہوں - اب مجھے زندگی کے باقی سارے لمحے اپنے قدموں میں بکھیر لینے دو "

نجمہ بھی شرمائی شرمائی سی بیٹھی ہو گی - خالہ کہیں گی ' ارے نجمہ، حمید سے نہیں ملے گی - پھر جب اکیلے میں اس سے ملوں گا تو کہوں گا - " نجمہ ! یاد ہے ایک دفعہ تم نے مجھے سیڑھیوں پر سے دھکا دے دیا تھا - میں گر پڑا تھا، اور میرے ماتھے پر سخت چوٹ آئی تھی، جسے دیکھ کر تم بہت دیر تک روتی رہی تھیں - دیکھو ! اس چوٹ کا نشان اب تک باقی ہے - کیا تم نے پھر کبھی میری یاد میں آنسو بہائے تھے ! '

بدھ کے دن وہ سو کر اٹھا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس کی زندگی کی سب سے خوبصورت صبح تھی - حالانکہ اس دن بھی اس کے کانوں میں برتنوں کا کرخت شور اور بد مزاج گاہکوں کی سخت بے ہنگم آوازیں گونجتی رہیں - لیکن اس کی روح تو جیسے ان ہنگاموں سے بے نیاز کسی نرم فضا میں اڑتی پھر رہی تھی -

دس بجے تک وہ کام کرتا رہا۔

جب وہ سیٹھ سے بیس روپے لے رہا تھا تو اسے خیال آیا کہ اگر وہ صرف خالہ کے لئے کوئی چیز لے جائے گا، تو اچھا نہیں لگے گا۔ اس کی بیوی، اس کا بچہ اور بچہ بھی تو ہیں ۔۔ اس نے سیٹھ کی منت سماجت کر کے دس روپے اور لے لئے۔

"جا ستی دیر مت کرنا، ایک بجے تک آجانا، ہاں" سیٹھ کی آواز میں اس کو دیئے ہوئے تیس روپوں کا دکھ تھا "غفور اکیلا کام نہیں سنبھالے گا، گاہک لوگ خراب ہوگا۔ دیکھو چار نمبر پہ گاہک لوگ آیا ہے!"

چار نمبر کا آرڈر پورا کرنے کے بعد وہ اپنی کوٹھری میں چلا گیا، رگڑ رگڑ کر ہاتھ منہ دھونے کے بعد اس نے اپنے پرانے گندے کپڑے اتار کر صاف کپڑے پہنے، جنہیں اس نے کل ہی سامنے والی دوکان سے ارجنٹ دھلوائے تھے۔ پھر اس نے سر میں تیل ڈالا، کنگھی کی، اکنی میں پالش کرائے ہوئے جوتے پہنے، اور تیس روپے جیب میں ڈال کر باہر نکل گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر لوگ آجا رہے تھے، اچھے اچھے خوب صورت لباس پہنے ہوئے، چہروں پر مسکراہٹیں اور آنکھوں میں چمک لئے۔ لیکن آج اس کے اندر کا معمولی سا بیرا جیسے کہیں سو گیا تھا۔ اس کی جیب میں تیس روپے تھے، اس نے ارجنٹ دھلوائے ہوئے کپڑے اور اکنی میں پالش کرائے ہوئے جوتے پہنے تھے، اور اس کے بال سرسوں کے تیل سے چمک رہے تھے۔ اس لئے وہ گردن اکڑائے، چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک لئے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ان کے درمیان سے گزرتا چلا گیا۔

اس نے سیدھے کپڑا مارکیٹ کا رخ کیا۔

دوکانوں پہ طرح طرح کے رنگ برنگے، پرکشش، چمک دار کپڑے نظر آرہے تھے.... زری، بروکیڈ، لیڈی ہملٹن نائلون، کریپ، شنیل، ساٹن، جارجٹ .... اتنے چمک دار، اتنے خوب صورت کہ انہیں دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں، اس نے دل ہی دل میں کہا:

"اگر کبھی اس قابل ہوا تو یہ سب ضرور خریدوں گا"

پھر اس نے خالہ کی شلوار کے لئے بڑھیا سا سفید لٹھا اور جمیر کے لئے ایک خوب صورت بیلوں والی چھینٹ خریدی اسی کپڑے کا فراک اس کے ہوٹل کے سامنے والی بلڈنگ کے ایک فلیٹ کی ایک نوجوان اینگلو انڈین لڑکی پہنتی تھی، اور جب وہ اسے پہن کر اپنی بالکنی پہ آتی تھی تو آس پاس کے سارے دوکاندار اپنا اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھنے لگتے تھے، وہ خود بھی کتنی دیر تک بڑی محویت سے اسے تکے جاتا، یہاں تک کہ سیٹھ کی بھاری بھرکم گرجدار آواز سنائی دیتی۔

"مجیدا پانچ نمبر پہ گاہک لوگ آیا ہے"

اور وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے آرڈر لینے چلا جاتا۔

"خالہ ان کپڑوں کو دیکھ کر کتنی خوش ہوں گی" ۔۔۔ اس نے سوچا ۔۔۔ "بے چاری اس دن کیسے گلے سڑے کپڑے پہنے ہوئے تھیں"

وہاں سے وہ سامنے والی کھلونوں کی دوکان پر گیا۔ دوکان میں ایک سے ایک خوب صورت رنگ برنگے کھلونے سجے ہوئے تھے۔ کالا زبان کھانے والا لنگور، پلعا ساننا کلاز جرمنی کی ایک کتاب کے ورق تیزی سے الٹ رہا تھا، ناچنے والی گڑیا، چھلانگیں لگانے والا مینڈک، پستول چلانے والا کاؤ بوائے .... ڈھول بجانے والا بھالو ۔۔۔ وہ ہر کھلونے کو دیکھ کر

حیران ہوتا رہا۔ لیکن اسے کمبالو سب سے زیادہ پسند آیا۔ اُس نے سوچا:

"اگر کبھی میں اس قابل ہوا تو یہ کمبالو ضرور خرید دوں گا۔"

پھر اُس نے امجد کے منے کے لئے سٹین کی ایک چینی گیند خریدی ــــ اب وہ نجمہ کے لئے کوئی اچھی سی موزوں چیز خریدنے لگا۔

بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے ایلیشن کے دو خوب صورت سے ہار خریدے ـــــ دوسرا امجد کی بیوی کے لئے تھا ـــ ..... کتنے سالوں بعد اس نے اپنے علاوہ کسی دوسرے کے لئے چیزیں خریدی تھیں، اس لئے اس کے دل میں مسرت کی انجانی لہریں مچل رہی تھیں۔

ان تمام چیزوں کو اُس نے ایک پیکٹ میں بندھوا لیا۔

وہاں پہونچ کر اس نے دھڑکتے دل سے شرماتے ہوئے جھجکتے ہوئے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

اور جب خالہ نے دروازہ کھولا اور اسے اندر لے گئیں تو اس وقت اس کی نظروں میں ملے جلے جذبات جھلک رہے تھے ـــ

سامنے پلنگ پر امجد بیٹھا تھا، اور اسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح مسکرا رہا تھا، وہ اس کے برابر بیٹھ گیا۔

اُس نے دیکھا کہ کونے میں بیٹھی ہوئی نجمہ اُسے کنکھیوں سے دیکھ رہی ہے۔

خالہ نیچے فرش پر بیٹھ کر سبزی کاٹنے لگیں۔ ان کے برابر میں ایک دُبلا پتلا سا ننگ دھڑنگ بچہ فرش پر اپنے تھوک سے نقش و نگار بنا رہا تھا۔

"یہ ارشد ہے! امجد کا بیٹا!" خالہ عام مشرقی عورتوں کے سے لاڈ پیار کے ساتھ اس کی ناک صاف کرتے ہوئے بولیں۔

"اچھا!" اُس نے لپک کر بچے کو گود میں اٹھا لیا۔

سامنے دروازے سے ایک سانولی سلونی، پرکشش ناک نقشے والی عورت شرماتی ہوئی کمرے کے اندر داخل ہوئی۔

"اور یہ ہیں اُن کی اماں!" اب کے امجد نے جھجکتے ہوئے تعارف کرایا۔ "تمہاری بھابی!"

اس نے کھڑے ہو کر انہیں سلام کیا۔

اتنے دنوں بعد جو گھر کے ماحول میں بیٹھا ہوا تھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پچھلی صدیوں کا ایک فرد ہو اور پچھلی صدیوں کے کسی خاندان کے ساتھ بیٹھا ہوا ہو۔ اسے ساری باتیں نئی، عجیب اور مقناطیسی لگ رہی تھیں ...... فرش پر سبزی کاٹتی ہوئی خالہ اسے بڑی اچھی لگ رہی تھیں ــــ میلے کچیلے ارشد کے جسم سے ایک جانی پہچانی خوشبو سی پھوٹ رہی تھی ـــــ شرمائی، جانی سی بھابی کی اجنبیت میں پہچان کے کتنے رنگ ابھر آئے تھے ـــ کونے میں دبی ہوئی نجمہ جیسے دھنک کے رنگوں میں بسی ہوئی تھی ـــــ

اینٹوں پر بسے ہوئے زنگ آلود صندوق، ٹوٹی جھلنگی چارپائیاں، میلے چادر، مصالحے کے میلے کچیلے ڈبے، میلا کچیلا فرش، پلستر اکھڑی دیواریں، سارا ماحول بجھا بجھا سا تھا ــــ لیکن کتنا اصلی، کتنا فطری! اس میں سے خلوص اور محبت کی خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں، اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ انہیں ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں سمو لے، کتنے دنوں تک وہ اس طرح

۔ حول سے محروم رہا تھا۔ محرومی کے اس تصور سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

اُس نے سوچا: "اب میں یہیں رہوں گا، خلوص اور محبت کی خوشبوؤں کے بیچ میں، جانی پہچانی روحوں کے سائے میں۔ چاہے مجھے خالہ کے پیر ہی کیوں نہ پکڑنے پڑیں"

اچانک دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ امجد نے اٹھ کر دروازہ کھولا، اور اس کے ساتھ ہی ادھیڑ عمر کا کھچڑی بالوں والا طوطے کی شکل کا ایک شخص اندر داخل ہوا۔

"یہ نصیر بھائی ہیں!"

اس نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

امجد کہہ رہا تھا "اسی محلّے میں رہتے ہیں۔ یہاں ان کی راشن کی دو دو دکانیں ہیں"

جانے کیوں اسے امجد کی آنکھیں جھکی جھکی سی لگیں۔

"اور یہ میرے خالہ زاد بھائی مجید ہیں!"

لیکن طوطے کی شکل والا نصیر اس کی طرف متوجہ نہیں تھا، وہ تو کونے میں دبکی ہوئی نجمہ کو مسلسل گھورے جا رہا تھا۔

مجید کو امجد کی نظریں اور بجھی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

اسے یہ شخص پہلی ہی نظر میں بالکل اچھا نہیں لگا۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے منہ کڑوا ہو گیا ہو۔

نجمہ دھیرے سے اٹھ کر اندر والے کمرے میں چلی گئی۔

طوطا بھی فوراً اٹھ گیا۔

"ارے بیٹا، بیٹھو نا!" خالہ لاڈ سے اِٹھلائیں۔

"نہیں چچی جان! دکان پر ایک صاحب میرا انتظار کر رہے ہیں" وہ بڑے مصنوعی لہجے میں بولا۔

نفرت کا جو جذبہ مجید کے دل میں اُبل رہا تھا وہ اب اس کے چہرے پر بھی جھلکنے لگا تھا۔

"نجمہ! تمہارے لئے چائے بنانے گئی ہے" خالہ نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

"اوہو! پھر تو ضرور رُکوں گا، نجمہ صاحبہ کے ہاتھ کی چائے پینے کے لئے، ورنہ میں تو یونہی چلا آیا تھا، یہ پیکٹ دینے کے لئے" طوطے نے اپنے ساتھ لائے ہوئے پیکٹ کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

مجید کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا پورا جسم جلنے لگا ہو۔

طوطا پیکٹ کھولنے لگا۔

"یہ آپ کے لئے ہے چچی جان" اُس نے اوپر رکھے ہوئے سفید ساٹن اور پھولدار کریپ کے دو ٹکڑے اٹھاتے ہوئے کہا۔

مجید نے دیکھا خالہ جان کے چہرے پر جالی کے سارے رنگ ابھر آئے تھے۔

"اور یہ رہا منے کا بھالو، ڈھول بجانے والا بھالو!" اُس نے چابی بھر کے بھالو کو زمین پہ ڈال دیا۔

"ڈھم..... ڈھما ڈھم.... ڈھم.... ڈھما ڈھم.... ڈھم...." بھالو ناچ ناچ کر ڈھول بجانے لگا۔

ارشد اسے دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔

امجد ہنس رہا تھا۔

اور اس کی بیوی طوطے کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔

اور خالہ ناچتے ہوئے بھالو کو ایسے تعجب سے دیکھ رہی تھیں جیسے دنیا کا نادر عجوبہ یہی ہو۔

مجید نے دیکھا کہ سامنے والے دروازے کی آڑ سے دو آنکھیں بڑی بے تابی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"اور یہ نجمہ کے لئے ہے!" طوطے نے آسمانی رنگ کے بروکیڈ کا ایک جھلملاتا ہوا ٹکڑا اٹھا کر سامنے والے دروازے کی طرف لہرایا۔

دروازے پر لگی ہوئی آنکھیں جیسے چمک سی اٹھیں۔

"بازار کا سب سے نیا ڈیزائن ہے!" طوطا اس انداز میں اس لہجے میں بول رہا تھا جیسے کوئی ہاتھی چیونٹیوں کے سامنے بول رہا ہو۔

بھالو کی چابی ختم ہو گئی تھی۔ اور وہ ڈھول بجاتے بجاتے ایک دم رک گیا تھا۔

"چائے ابھی تک نہیں آئی!" طوطے نے للچائی ہوئی نظروں سے سامنے والے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نجمہ بیٹی!" خالہ نے بڑے بناوٹی پیار سے آواز دی "چائے نہیں تیار ہوئی؟ جلدی سے لے آؤ"۔

"بس تیار ہو گئی امی، ابھی لاتی ہوں!" اندر سے نجمہ کی خوشیاں آواز کے روپ میں چھلک سی پڑیں۔

خالہ جان طوطے سے بڑے میٹھے انداز میں باتیں کرنے لگیں۔

امجد ہولے ہولے اپنے برابر پڑے ہوئے ریشمی کپڑوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

اس کی بیوی اپنے منے کے لئے بڑے پیار سے بھالو میں چابی بھر رہی تھی۔

مجید نے چارپائی پر رکھے ہوئے اپنے گھٹیا سے پیکٹ کی طرف دیکھا، اور خود بخود اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگتے چلے گئے۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ بس ایک منا نہ معلوم کیوں اسے غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو: "تم کیوں کھلونے کی طرح خاموش ہو گئے؟ تمہاری چابی کہاں ہے؟"

سامنے چارپائی پر پڑا ہوا اس کا گھٹیا سا پیکٹ اس کا منہ چڑا رہا تھا، دیواروں پر اکھڑے ہوئے پلستر کے بھوت منہ کھولے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہے تھے، اس کا دم گھٹنے لگا ——

خالہ طوطے کی کسی غیر دلچسپ بات پر زور زور سے قہقہے لگا رہی تھیں۔

امجد اب نرم ریشمی کپڑوں کو تہہ کر رہا تھا۔

اس کی بیوی کھلونے میں چابی بھر کر اسے فرش پر چھوڑ چکی تھی۔ اور جب وہ ناچتے ہوئے ڈھول بجانے لگا، تو سب ہنستے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"تمہاری چابی کہاں ہے؟ تمہاری چابی کہاں ہے؟" منے کی آنکھیں مجید سے جیسے کچھ پوچھ رہی تھیں۔

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا "اچھا خالہ جان! میں چلتا ہوں"۔

سب اس کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے بم پھٹ پڑا ہو۔

"ارے ، ابھی سے ؟ چائے پی کر جانا " خالہ اس کی طرف دیکھے بغیر رسمی انداز میں بولیں ۔

"نہیں خالہ جان " اس نے رندھے ہوئے گلے میں کہا " میں بڑی مشکل سے آدھے گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا تھا ، پھر کبھی آؤں گا "

بھالو ڈھول بجاتے بجاتے لڑکھڑا کر گر گیا ۔ ڈھول کی آواز آنی بند ہو گئی ۔

امجد کی بیوی نے جلدی سے اسے اٹھا کر کھڑا کیا ، اور وہ پھر سے ناچ ناچ کر ڈھول بجانے لگا —

"ڈھم ..... ڈھما ڈھم .... ڈھم ..... ڈھما ڈھم .... ڈھم ......"

سب پھر اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے تھے ۔

جمیل کے اندر کا معمولی سا ہیرا ، جسے اس نے اکنی کی پالش سے چمکائے ہوئے جوتوں اور ارجینٹ دھلائے ہوئے کپڑوں سے سلا دیا تھا ، جاگ چکا تھا ۔

اس نے چارپائی پر رکھا ہوا اپنا پیکٹ اٹھایا ، اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا ۔

باہر دھوپ تھی ..... کڑی دھوپ ، اور وہ اس کڑی دھوپ میں پاگلوں کی طرح دور تک بھاگتا چلا گیا ۔

خالدہ شفیع

# لکیریں کہتی ہیں

ہاڑ ماہ کی گرمی میں جب ہر چیز بھنی جا رہی تھی صحن کا فرش تنور کی طرح دہک رہا تھا، بوگن ویلیا کی تنی ہوئی ڈالیاں بے طرح جھک گئی تھیں، پیپل کے پتے یوں جھول رہے تھے جیسے تشنگی کے مارے کھلی ہوئی زبانیں ——— ایسی ہی گرما گرمی میں منی بھیا ایسی ٹھنڈی ٹھنڈی باتیں کر رہے تھے کہ قلفی کا مزا آ رہا تھا۔ سب کے ہاتھ دیکھ کر قلمی دلوں پہ بچا ہے رکھ رہے تھے۔ گھر میں ظہور پذیر ہونے والی نئی نئی باتیں معلوم کر رہے تھے۔ ہاتھ دیکھنے کا کمال یہی ہے کہ بھلا مانس اٹکل سے ہاتھ دیکھتے دیکھتے زخم کریدے اور پھر اس کا علاج تجویز کرے۔ انہیں اس بات کا کافی سلیقہ تھا۔

"آ ——— یہ ٹھیک ہے ——— ہاں نجو بیگم کیا خیال ہے ——— یہ ضروری نہیں کہ تم جو کچھ چاہتی ہو، وہی ہو جائے ——— آخر ہر بات کے لئے کچھ نہ کچھ وقت لگتا ہے ——— کچھ تقاضے ہوتے ہیں ———" انہوں نے مشاق شاطر کی سی چال چلی، اور مزید اگلوانے کے انتظار میں بے پروائی سے ہاتھ چھوڑ کر بیٹھ گئے۔

"لیکن بھائی جان کوئی صورت بھی نظر آتی ہے ——— پورا ہونے کی ———" نجو بیگم کی ذہنی عمر تیرہ سال سے زیادہ کی نہ ہوگی۔

"ہاں ہاں ——— کیوں نہیں" ——— وہ نجو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائے ——— "مگر یہ سلسلہ کب شروع ہوا ———؟"

"ہائے اللہ کتنے چالاک ہیں ——— انہیں سب پتہ رہتا ہے دو ہی دن تو ہوئے ہیں یہ واردات ہوئے" بھئی، پنو اور رانو حیرت میں تھے۔

نجو نے نہ جانے کیسے بہت کچھ بتا ڈالا۔

پنو کا ذرا سا رنگ بدلا۔

"اور ——— اور پنو نے بھی تمہاری مدد کی تھی ———" انہوں نے پکڑ لیا۔

"تو میں کیا کرتی بھیا ——— نجو باجی نے خود ہی بہ زبردستی کہا دیا تھا!"

"اچھا ——— چھا ——— بھئی اول تو یہ معاملہ بڑوں کی مداخلت کے بغیر حل نہ ہوگا، پھر ——— آپ ——— یہ

یہ لکیر جو چھنگلیا سے نکلتی ہوئی ——— اس جانب ——— مڑ رہی ہے ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واردات تمہارے حق میں اچھی نہیں ہے ——— "

انہوں نے بڑے ماہرانہ انداز میں بتا کر مانی کا ہاتھ تھام لیا :

"لاؤ مانی تمہارا ہاتھ دیکھیں "

"ہوں ——— کل کا دن تمہارے لئے اچھا رہے گا ——— اسکول کا کام جلدی ختم کر لوگے ——— واہ ——— مٹھائی بھی کھاؤ گے ——— ایں ! ——— ہاں مگر آج صبح کیا کیا تھا تم نے ——— ؟ "

مانی کا خوشی سے اٹھا ہوا چہرہ جھک گیا ۔

"مانی یار تم تو بالکل ہی ——— ہم کچھ کہتے تھوڑا ہی ہیں " حنی بھیا جواب کے منتظر تھے ۔

"نہیں بھائی جان ، ہم نے کچھ بھی نہیں کیا ——— بے بی نے آپ کے قلم کا نب توڑ دیا ۔ ہم تو چھپا کر رکھ رہے تھے"

وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ گیا اور حنی بھیا مسکرا دیئے ۔

وہ واقعی حنی (Honey) تھے ، اور اس دوران جب کہ پولی کا ہاتھ سامنے دھرا تھا ، اور وہ شرارت سے بار بار پورا ہاتھ کھولے ان کے منہ کے سامنے رکھ رہی تھی ۔

"دیکھئے نا ——— حنی بھیا ——— دیکھئے "

پنو نے چڑ کر ہاتھ مار دیا ۔

اور حنی بھیا کی نظریں سامنے تخت پوش کے نیچے مسلسل چیونٹے کو گھورتے ہوئے فضل پر پڑیں ،

"فضل آؤ تمہارا ہاتھ دیکھیں "

فضل بھیا چونک پڑا ، اور حنی بھیا کی دعوت پر آہستہ آہستہ ان کی طرف کھسکتا چلا آیا ——— وہ بے حد گندا لگ رہا تھا ، پسینے میں چپچپاتا میلا کچیلا ——— اسے تو سکر ہیچھے چھپ جانے والے بھوری بلی کے مریل بلونگڑے یاد آ گئے ۔

سب نے باری باری طنزیہ انداز میں دیکھا :

"کامریڈ ہاتھ دکھاؤ گے نا "

اور اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا دیا ۔

اسے تو بس اتنا معلوم تھا کہ حنی بھیا بہت اچھے ہیں ۔ ہاتھ بھی ضرور اچھا دیکھتے ہوں گے ۔

"حنی بھیا ۔ باہر روشنی میں جانا پڑے گا لکیریں تلاش کرنے کے لئے " پولو بولا ۔

"سرچ لائٹ لاؤ یار ——— بھنگی کا ہاتھ ہے مذاق نہیں " روفی بولا ۔

اور فضل احمقوں کی طرح دیکھتا پلکیں جھپکاتا رہا ۔

بقول پولو : فضل بالکل پچھلا ریگلا ، ہے ۔

فضل نے حنی بھیا کی چمکتی ہوئی شریر آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ۔ اس کا دل ڈوب گیا ۔ کیا پتہ حنی بھیا بھی ——— کیا تاریکی کا مستقبل تاریکی ہے اور تابناکی کا تابناکی ——— اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ۔

"اوئے - پھلا پڑا مان گیا ——"

سب بے تحاشا ہنس پڑے۔

"چھوڑیئے بھی —— حنی بھیا ——" سب بولے۔

سب ہی کو معلوم تھا کہ فضل کیسا عجیب لڑکا ہے بے ڈھنگا سا —— پیلا کاغذی، کمزور، کاہل - ایک سے ایک بھونڈی عادتیں —— کبھی بیچ سیڑھیوں کے سو رہا ہے - کبھی تخت پوش کے نیچے، تو کبھی میلے کپڑوں کے ڈھیر پر —— اور چچی فضل کو ڈھونڈنے میں گھر کا کونہ کھدرہ تک دیکھ ڈالتیں، جیسے کھویا ہوا جوتا تلاش کر رہی ہوں —— کلاس میں سب ہی بچے اس کا مذاق اڑاتے:

"انیچی سوتا رہتا ہے۔"

ماسٹر صاحب ہر بار غصے میں نئے زاویئے سے کلّے نوچتے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ بلبلا اٹھے۔

ابو اُسے اپنی اولاد ماننے پر ہی تیار نہ تھے۔ اس کی پیدائش پر انہوں نے سنجیدگی سے ڈانٹ دیا تھا۔ "خبردار، جو آئندہ کوئی بچہ اسپتال میں ولادت پائے - نہ جانے کس کی اولاد جڑ دی ہے۔"

لے دے کے اماں ہی اسے اپنی حقیقی اولاد گردانتی تھیں - ہر سال رو پیٹ کر حنی بھیا کی خوشامد کرتیں تو اسے کسی نہ کسی طرح پاس کرا دے ورنہ دو کوڑی کا نہ رہے گا۔

اور برخوردار فضل کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی۔

اسی طرح وہ اپنی بدصورتی میں بے شمار اضافے کرتے چلے گئے۔

"توبہ ہے —— کیسی کیسی عبرت ناک چیزیں بنائی ہیں اللہ میاں نے —— شکر ہے اس نے مجھے بچائے رکھا —— مجھے تو گھن آتی ہے اس لڑکے سے —— یہ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ میرے جیٹھ کا لڑکا ہے ——" چچی کی زبان سدا سے بے قابو تھی - کچھ تو اُن کے بچے تھے بھی غیر معمولی —— چندے آفتاب چندے ماہتاب۔

"میاں ہٹ کر کھڑے ہو ذرا —— ہاتھ نہیں دکھا تا تو!"

"کپڑے بھی تو کتنے میلے ہیں۔" شادو بولا۔

"میلے کہاں ہیں —— رنگ چھوٹ گیا ہے۔" پولو نے وضاحت کی۔

ہٹتے میں اس کا ہاتھ بانی کے گلابی رخساروں سے چھو گیا، تو اس نے انتہائی غصے سے گھورا - اور بڑی ادا سے منہ پھیر لیا، وہ دہکتے رخساروں اور جلتی آنکھوں کو دیکھتا رہ گیا۔

"چچی کو بھلا ایسی دوپہر میں نیند کہاں آتی تھی: اے میاں چھوڑو —— کب تک بیٹھے رہوگے بھری دوپہر میں —— بیٹھے بچوں کا ستیاناس مارتے رہتے ہو —— چلو سو جاؤ۔"

"آپ اندر لیٹ جائیں —— یہاں کیوں بلاوجہ گرمی میں پڑی ہیں۔" حنی بولے۔

اور چچی نے بھنا کر کروٹ بدل لی۔

فضل اب تک ہاتھ ہٹائے گم سم کھڑا تھا۔

بھیا ہمارا ہاتھ تھکا جا رہا ہے" روفی بولے۔

"حنی بھیا، آپ نے جو حسنہ کو بتایا تھا نا کہ تم اس سال پاس ہو جاؤ گی۔ وہ سچ مچ پاس ہو گئی۔ حالانکہ پچھلے سال فیل تھی" پپو بتا رہا تھا۔

"اور بھیا۔ میرا بلا بھی مل گیا تھا۔ گھر ہی میں موجود تھا" مانی بولا۔

"حنی بھیا، آپ نے پوری بات تو بتائی ہی نہیں کہ ——— " بجو کچھ سوچ کر پھر خاموش ہو گئی ——— اور ایسے ہی سارے تاثرات ہاتھ کی لکیروں کو بامعنی بنا دیتے ہیں۔

"بھلا تو ہے ہی بھلا ——— ڈرتا ہو گا ——— کیا پوچھے گا ——— فضول میں رہا سہا دم بھی نکل جائے گا ———

فضل ہاتھ پیچھے کئے جوں کا توں کھڑا تھا۔

"فضل لاؤ تمہارا ہاتھ دیکھیں ——— جن ناموں میں "ف" ہوتا ہے وہ بہت سی الگ خصوصیات کے مالک ہوتے ہیں"

اس نے آہستگی سے ہاتھ بڑھا دیا۔ اور حنی بھیا نے تپاک سے اس کا کمزور سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس کے جسم میں ایک میٹھی سی لہر دوڑ گئی، اور یوں لگا جیسے مارے سردی کے ٹھٹھری جگہ سے نرم گرم جگہ آ گیا ہو۔

"فضل میاں قسمت کا لکھا کوئی نہیں مٹا سکتا ——— " چچی بھی سنیں ——— (چچی کے کان کھڑے ہو گئے) ——— تمہارے ہاتھ میں اچھی لکیریں زیادہ ہیں اور بری کم ——— یہ رہی اصل قسمت کی لکیر! بہت واضح، بے حد اچھی: جو چیز تم حاصل کرنا چاہو گے تمہیں مل جائے گی ——— لیکن کافی محنت کے بعد ——— جب محنت کے دور سے گذر جاؤ گے، تو بس چاندی ہی چاندی ہے ——— " وہ بڑے ماہرانہ انداز میں ہاتھ گھما پھرا کر بتا رہے تھے۔

"میں جو چیز چاہوں مجھے مل جائے گی؟" یہ آواز بالکل نئی سی آواز تھی۔

"ہاں بھئی ضرور ——— جو چاہو گے مل جائے گا ——— لیکن کوشش اور محنت درکار ہے"

"اچھا بھلا فضل تم کیا حاصل کرنا چاہتے ہو؟" حنی بھیا نے آہستگی سے پوچھا۔

"میں ——— میں بہت کچھ ——— " وہ سامنے کچھ نہ دیکھتے ہوئے بولا۔

"حنی بھیا ——— بھلا سہرا کب بندھے گا ان کے ——— " پنو نے چھیڑا۔

"کس کے سہرا بندھ رہا ہے؟" چچی پھر مڑیں۔

"اے فضل ——— تو بھی شادی کرے گا ——— ہیں؟"

"ہاں"

"کیسے بھلا ———!"

"جیسے آپ نے کی" حنی بھیا نے لقمہ دیا۔

"جیسے آپ نے چچا میاں کے ساتھ کی ——— " فضل نے وضاحت کی۔

"زبان بھی ایسی ہی کالی ہے ——— کلوٹے کی"

"فضل کس سے کرو گے ———؟" پنو پھر بولی۔

"بولو ـــــ بتادو کا مریڈ، کوئی بات نہیں ـــــ" حنی بھیا نے پکارا۔

"ہاں سے!"

"تمہاری خود کی ـــــ میری کیوں ـــــ" بالی جھنجھلائی

"ذرا آئینہ تو دیکھ ـ ـ دماغ تو بڑے اُونچے ہیں" چچی تقریباً چنگھاڑیں۔

"واہ میرے شیر!" حنی بھیا نے اسے گلے سے لگالیا۔

"اسی بات پر قائم رہنا ـــــ ہاتھ کی لکیریں کبھی نہیں مٹتیں"

"حنان باز آجا ـــــ ورنہ چلتا کر دوں گی ـــــ" چچی کہے جا رہی تھیں۔ وہ حنی بھیا کی سوتیلی اماں تھیں اور اپنے اس سولہ سالہ شریر لڑکے سے تنگ آگئی تھیں۔

"جو چاہو گے ملے گا ـــــ مگر محنت کرو ـــــ خوب پڑھو ـــــ کماؤ اور پھر ـــــ" اُنہوں نے اُس کا ہاتھ چوم لیا۔

سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

گرتے میں ایسے مضبوط سہارے کی اسے قطعی امید نہ تھی ـــــ وہ جما جما کر قدم رکھتا ہوا وہاں سے چپ چاپ چلا آیا، جیسے حنی بھیا کے ہر ہر جملے اور عمل کو اپنے اندر جذب کر لینے میں کوئی مزاحمت نہ پیش آجائے ـــــ اس کی آنکھوں میں ایک کرن قوس قزح بن کر تیر گئی ـــــ اس نے اپنے ہاتھ کی لکیروں کو غور سے دیکھا ـــــ پھر دیکھا ـــــ دیکھتا رہا ـــــ اور رات بھر روشنی کی کرنیں اس کی ہتھیلی پر جگمگاتی رہیں۔

گرمیوں کی طویل سست رفتار دوپہریں کچھوے کی چال چلتی بہت آگے نکل گئیں ـــــ حنی بھیا سب ہی کے ہاتھ کی لکیروں میں رنگ بھرتے رہے اور اپنی ہی لکیروں میں رنگ بھرنا بھول گئے ـــــ وہ اب بھی لڑکیوں اور بچوں میں اسی طرح مقبول تھے اور سب کا حال دیکھا کرتے۔

اُن کی سانولی پیشانی پر پڑی ہوئی بالوں کی لٹ میں اب کئی ایک سفیدیاں آگئے تھے ـ

کیا چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے؟

بہت کچھ دینے والا خود خالی ہاتھ رہ جاتا ہے؟

نہیں، یہ سب سطحی باتیں ہیں ـــــ دیکھنے والوں کے لئے محض ظاہرا کیفیت بدل جاتی ہے۔ ورنہ اُن کی متاعِ حیات دوسروں کا ہی دم ہوتی ہے ـــــ ان کی اپنی خوشی دوسروں کی خوشی میں ہوتی ہے، اور اس طرح ان کا دامن بیک وقت بہت ساری خوشیوں سے بھرا رہتا ہے۔

حنی بھیا سے چچی اب کتنی شرمندہ نظر آتی تھیں ـــــ انہوں نے ان کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا ـــــ سوتیلی ماؤں کی روایتی بدسلوکی روا رکھی ـ

وہ بھی کیا کرتیں آخر، جو بے حد خوب صورت تھیں، اور جن پر شادی کے بعد انکشاف ہوا کہ وہ نہ صرف اپنے شوہر کی

دوسری شریکِ حیات بلکہ سابقہ بیوی کے ایک مرد بچے کی ماں بھی ہیں۔ جو کافی بدشکل ہے ——— پھر چچی کے سارے ہی بچے اس قدر خوب صورت ہوئے کہ حنی بھیا انتظار ہی کرتے رہ گئے ——— کوئی تو ہوتا اُن جیسا۔

پھر انہوں نے جیسے ہی تعلیم ختم کی، چچا جان اللہ میاں کو پیارے ہوگئے۔ اس وقت بالی پانچ سال کی، چیز تین سال کا اور بے بی چھ ماہ کی تھی ——— حنی بھیا کو سب کچھ تیاگ دینا پڑا ——— سب کے درد سمیٹنے میں لگ گئے

کاروبار میں وہ بالکل نااہل ثابت ہوئے، ہر چیز گھلنے پر لگی ——— چچی بیمار ہوگئیں اور بالی نے کھیلا تگ کراتی کی مسند سنبھال لی ——— سب کو اپنی اپنی جگہ بدلنا پڑی ——— وہ طویل فاصلہ جو چچا طے کئے بغیر رخصت ہوگئے تھے، سب کو دوڑ دوڑ کر طے کرنا پڑا ——— لیکن پھر بھی جائے مقصود پر نہ پہونچ سکے۔

حنی بھیا نے تنگ آکر بینک میں ملازمت کرلی، اور زندگی کی گاڑی رِیں ——— رِیں چھکڑے کی طرح جھولتی چلنے لگی ———

وہ اب بھی دوپہر میں سب کا ہاتھ دیکھا کرتے تھے۔ بالی باورچی خانے میں لکڑیاں ٹھکور کر پھکنی سے پھونکیں مار مار کر آگ جلاتی رہتی، لیکن کڑوا کسیلا دھواں اُس کی چمکیلی آنکھوں میں گھس کر رُلا دیتا۔ اسی بہانے اس کا جی چاہتا خوب خوب روئے۔

ان ہی آنکھوں کو دیکھ کر حنی بھیا کہتے رہتے ——— "بس شہزادہ راستے ہی میں ہے۔ سبزہ زاروں، اونچی نیچی بل کھاتی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا چلا آرہا ہے ——— اُس کے سفید براق گھوڑے کی سنہری باگیں بس ابھی ابھی اس جانب مڑنے والی ہیں ——— مگر وہ شہزادہ ہے بے چارہ کالا بھجنگ!"

چچی تو اب حنی کی ان باتوں کی عادی ہوچکی تھیں۔ ویسے بھی جواب دینے کی ہمت ہی نہ تھی۔ محلے کے دو چار گھروں سے رشتے آئے لیکن چچی کو پسند نہ آئے۔

حنی بھیا نے فضل کے متعلق بتایا، وہ بہت پڑھ لکھ گیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ ——— تو بدستور چڑ گئیں۔ "اُس کا نام میرے سامنے نہ لیا کرو ——— اس کلوٹے کو میں برداشت نہیں کرسکتی۔"

"تو آپ کو برداشت کرنے کے لئے کون کلو ہا کہتا ہے۔ میں تو بالی کے لئے کہہ رہا ہوں۔"

"تجھ پر خدا کی مار ———"

"کچھ کسر باقی ہے کیا!"

"پڑھ لکھ جانے سے کیا ہوتا ہے، تم بھی تو اپنا پڑھ لکھ کر ڈھائی سو روپے کی نوکری کر رہا ہے نا ——— " چچی بدستور اڑی رہیں۔

حنی بھیا کے معمولات میں گزرتے وقت کی تبدیلیوں سے کوئی فرق نہ آیا۔ وہ بدستور بچوں سے گھرے رہتے تھے:

"مرنی بیٹے ——— ہاں بالکل ٹھیک۔ تمہارے دائیں ہاتھ کی یہ لائن بتاتی ہے کہ تم ——— تم کیا بنوگے۔"

"ٹیپو سلطان بنوں گا!"

"ہاں شاباش ——— مگر بھئی محنت کرنا ہوگی، بڑوں کا کہنا ماننا ہوگا ——— جھوٹ سے بھی بچنا ہوگا ———"

"منی رانی ——— آپ کو ——— آپ کو آج اچھا سبق پڑھنے پر شاباش ملے گی ——— انعام بھی مل سکتا ہے ۔ اگر آپ ذراسی زیادہ محنت کریں"

اس دوران منو دوڑا دوڑا آیا :

"حنی بھیا ، ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں ——— بڑے شا ——— ندار لگ رہے ہیں ——— ان کے ساتھ ایک میم بھی ہے"

"ہیں ! ——— مجھ سے ملنے آئے ہیں ———"

راستے میں حنی بھیا نے دیکھا : مرِیل سست سا بدصورت فضل تنومند ——— دراز قد ، وجیہہ ، مسکراتا ہوا چلا آرہا ہے اور اس کے ساتھ ہی کٹ پٹ انگلش بولتی ہوئی گڑیا سی میم بھی چلی آرہی ہے ۔

چچی نے بھی دیکھا ۔

آنکھیں ملیں ، پھر دیکھا ———

"یہ فضل میاں ہیں ——— ؟"

چچی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا ۔

"ارے چچی ——— یعنی میری سوتیلی ماں ——— یہ فضل میاں ہیں ——— فضل" ——— یہ کہتے ہوئے حنی انُ سے لپٹ گئے ۔

چچی چپ چاپ دیکھتی رہیں ——— دیکھے گئیں ——— بدصورتوں میں اس قدر کیٔی بھی کی جاسکتی ہے ! ———

چچی کو یقین نہیں آرہا تھا ——— پھر گڑیا سی میم کو ساتھ دیکھ کر انہیں اپنے پیروں تلے زمین کھسکتی معلوم ہوئی تھی ——— انہوں نے اس بات کے لئے بار بار اس چھوٹے سے بدشکل فضل کو دیکھنے کی کوشش کی ——— لیکن اس وقت ذہن اُن کا ساتھ نہ دے رہا تھا ۔

"میں کام سے یہاں آیا تھا ——— سوچا ملتا ہوا جاؤں ......"

وہ نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا ۔

پھر چاروں طرف دیکھا ،

تو چچی نے انتہائی بے دلی سے بالی کو آواز دی ۔

"یہ بالی کیا کرتی ہیں آج کل ؟"

"کیا نہیں کرتیں ——— سارے گھر کا بوجھ سنبھالے ہوئے ہیں ———"

چچی اتنی ساری تبدیلیوں کی چکاچوند سے اب تک خیرہ تھیں اور تاب نہ لارہی تھیں ۔

"بالی بیٹا ، چائے لے آؤ ——— اپنے بھائی اور بھابی کے لئے ———"

چچی نے پھر آواز دی ۔

"نہیں ——— چچی جان ، ان سے تعارف کرانا تو میں بھول ہی گیا تھا ———"

"کوئی بات نہیں ——— ایسا بھی ہو جاتا ہے ——— میں خود ہی سمجھ گئی تھی ——— بچی بے حد سنجیدہ تھیں ———
"ہاں دلہن ٹھیک سے بیٹھو ——— تم کیا سمجھوگی ہم لوگوں کی باتیں ———"
"چچی ——— یہ تو میری سکریٹری مسز قبالہ ہیں"
مسز قبالہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔
"اچھا! ———" چچی کی ڈوبتی ہوئی آواز پھر اُبھری۔
حنی بھیا اور فضل نے پھر چچی کو بڑے معنی خیز انداز میں دیکھا ——— کھسکی ہوئی زمین جیسے اپنی جگہ واپس آگئی تھی ———
چچی کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں شیرینی سی آگئی۔
"ہاں بیٹا ——— آج فضل میاں اور قبالہ بی دوپہر کا کھانا یہیں کھائیں گے۔"
وہ بڑے چاؤ سے کھوئے کی پلیٹ آگے بڑھا رہی تھیں ——— اور بڑے اشتیاق سے کاروبار کی خشک ترین باتیں سُن رہی تھیں

حنی بھیا کو یوں لگا جیسے ——— ان کو اپنی محنت کا صلہ مل گیا ہو ——— اگر زندگی یوں ہی گذرتی ہے تو بُرا نہیں"
وہ امیر دین چوکیدار کی بیٹی کو بتا رہے تھے:
"بلقیس ——— جاؤ اپنے بابا کو بتاؤ ——— ہاتھ کی لکیریں لکھی ہیں ——— بہت بہت پڑھوں گی ——— اپنے ہاں کی غریب لڑکیوں کو پڑھاؤں گی ——— علم کی روشنی پھیلاؤں گی ——— اور........"
اُن کی آنکھوں میں کئی کرنیں قوس قزح بن کر تیر گئیں۔

ایوان ہنٹر

ترجمہ:

سید رضا کاظمی

# وہمی

## (امریکی کہانی)

بے چارہ پیلو!

لیکن پہلے آپ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ وہ دن انتہائی گرم تھا، اور دھوپ ناقابل برداشت تھی۔ مائیکل سورج نکلتے ہی اپنے کھیت پر چلا گیا تھا، اور سارا کام اسی دن ختم کر لینا چاہتا تھا۔

کھیت میں گوبھی کے پودوں کی کیاریوں کے درمیان بے شمار پتھر پڑے ہوئے تھے، اور غالباً اسی سے مخوذ ہوا۔ جب مائیکل کو پہلا پتھر نظر آیا تو اس نے جھک کر اسے اٹھا لیا، اور ہاتھ کے جھٹکے سے دور پھینک دیا۔ ابھی سورج سر پر نہیں آیا تھا، اور زمین زیادہ گرم نہ ہوئی تھی، اس لئے اس کے چوڑے منہ پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ جھک کر گوڈی چلانے لگا۔ وہ ماریا اور گذشتہ رات کی باتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

وہ بے حد مطمئن تھا کہ ماریا اس کی بہترین رفیق زندگی ثابت ہوگی اور وہ انتہائی پرسکون اور پر مسرت زندگی بسر کرے گا۔ اور اسے اپنے انتخاب پر کبھی پچھتانا نہ پڑے گا — ماریا تو ہزاروں میں ایک تھی۔ بلبل کی طرح چہکتی ہوئی — ہرن کی مانند پھرتیلی۔ شیرنی کی مانند مست۔ جس کی ہلکی سی مسکراہٹ دل کے تاروں کو جھنجھوڑ دیتی اور دل چاہتا کہ.......

دفعتاً اسے دوسرا پتھر نظر آیا!

"اوہ۔ میری ماں! دوسرا پتھر؟" مائیکل نے منہ بگاڑ کر کہا، اور پتھر اٹھا کر دور پھینک دیا۔ وہ پھر کدال چلانے لگا جب اسے اور کئی پتھر نظر آئے تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے سوچا کہ غالباً کسی نے اسے ستانے کے لئے اس کے کھیت میں پتھر ڈال دیئے ہیں۔ اور یہ خیال آتے ہی اس کی بھنویں تن گئیں، اور وہ سوچنے لگا کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے کیا اس کمینے جوان کی؟ — یا بدمعاش فیلی کی — یا پھر پیلو کی.....

معاً اسے یاد آیا کہ گذشتہ رات تیز بارش ہوئی تھی، اور غالباً مٹی کے بہہ جانے سے زمین میں دبے ہوئے پتھر

نوہی

## افکار

ایوان منٹر

اوپر اُبھر آتے ہیں

اس نے خود کو کوسا کہ وہ پودوں کی حفاظت سے غافل رہا۔ پھر اس نے اُن پتھروں کو کوسا، اور آخر میں گرم سورج کو
کوسنے دے کر پھر اپنے کام میں لگ گیا۔
پتھر بھاری نہ تھے، کیونکہ چھوٹے چھوٹے تھے۔ اُس نے انہیں اُٹھا اُٹھا کر پھینکنا شروع کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ انہیں
گنتا رہا۔ لیکن دس تک گننے کے بعد اس نے پھر گنتی شروع کی، اس لئے کہ اسے دس سے زیادہ گنتی نہ آتی تھی۔
اب دھوپ کی شدّت بڑھ گئی تھی۔ ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے وہ پتھر اُٹھا اُٹھا کر پھینکتا رہا۔ دفعتاً اسے زمین پر
اپنے سامنے سایہ نظر آیا اور ساتھ ہی آواز سنائی دی۔
"بڑے زوروں میں کام کر رہے ہو مائیکل!" آواز موٹے ہونٹوں کے بیچ سے کھینچی ہوئی سی نکلی تھی۔
مائیکل نے اپنے مٹی بھرے ہاتھوں کو اپنی پتلون پر رگڑ کر صاف کرتے ہوئے دائیں جانب گھوم کر دیکھا۔ اس کے قریب
فِلپی کھڑا ہوا تھا۔
"نہیں میں کام وام تو نہیں کر رہا ہوں۔" مائیکل نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "میں تو آرام سے لیٹا تارے گن رہا تھا۔"
"لیکن ابھی تو دن چڑھا ہے ——" فلپی نے کہا۔
لیکن مائیکل کے جملے کا طنز محسوس کر کے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا:
"اچھا تو تم تارے گن رہے تھے۔"
"تم غالباً کسی کام سے جا رہے ہو، اس لئے میں تمہیں روکنا نہیں چاہتا۔" مائیکل نے منہ بنا کر کہا۔
"نہیں۔ میں کہیں نہیں جا رہا ہوں۔" فلپی نے کہا۔
مائیکل جھک کر پتھر اٹھانے لگا۔
"ارے تم پتھر چن رہے ہو مائیکل؟"
مائیکل نے کوئی جواب نہ دیا۔
"میں نے کہا، مائیکل تم پتھر چن رہے ہو......"
"ہاں۔" مائیکل نے کہا، اور سیدھا ہو کر اپنی کمر سہلانے لگا۔
"معلوم ہوتا ہے تمہاری کمر میں درد ہو رہا ہے!"
"ہاں —— لیکن تم اس طرح مسکرا کیوں رہے ہو؟"
"کون میں؟ میں کہاں مسکرا رہا ہوں۔"
"تم مسکرا رہے ہو۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ آخر تم یہاں کھڑے ہو کر اس سانپ کی مانند جس نے مرغی کا چوزہ نگل لیا ہے
کیوں بل کھا رہے ہو؟"
"نہیں مائیکل، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے سر ہلایا ہے نہ مسکرانے کی کوشش کی ہے۔"
"میں اندھا نہیں ہوں۔ سمجھے! میں نے کہا کہ میری کمر میں درد ہو رہا ہے، اور تم مسکرا کر سر ہلانے لگے۔ آخر کیوں؟ اگر

میری کمر میں درد ہو رہا ہے تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ؟"

"نہیں نہیں مائیکل اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں ہے"

"تو پھر تم کیوں مسکرائے تھے ؟"

فلپی کے ہونٹوں کے کونوں میں دبی ہوئی مسکراہٹ ابھر آئی ——

"ماریا ......."

مائیکل کی مٹھیاں بھینچ گئیں : "میری بیوی ماریا کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں مائیکل۔ کچھ بھی نہیں۔ دراصل ماریا..... "

"تم نے ابھی میری کمر کے درد کی بات کی ....."

"ہاں"

"اور پھر تم نے اسی سلسلے میں ماریا کا نام لیا۔ آخر کیوں ؟ دونوں کا کیا تعلق ہے ؟"

"ماریا تمہاری بیوی ہے۔ خدا اُس کو زندہ رکھے، بڑی طاقتور عورت ہے"

"کیا مطلب ؟ ماریا طاقتور ہے تو کیا ہوا ؟ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"تم تو جانتے ہی ہوگے کہ وہ شیرنی کی طرح ستاتی ہے"

"آخر تمہیں کیونکر پتہ چلا کہ ماریا...."

"میں کچھ نہیں جانتا مائیکل"

"اگر تم کچھ نہیں جانتے تو یہ کیونکر جان گئے کہ ماریا شیرنی کی طرح ستاتی ہے ؟ ایں ؟"

"اچھا میں چلا مائیکل، مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے"

"ٹھہرو۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ......."

"خدا حافظ مائیکل" کہتا ہوا فلپی تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا، اور کچھ دور جانے کے بعد اُس نے ہاتھ ہلا کر مائیکل کو خدا حافظ کہا۔ لیکن مائیکل نے جواباً ہاتھ نہیں ہلایا۔ وہ خاموش کھڑا جاتے ہوئے فلپی کو گھورتا رہا۔

"آخر اس بدمعاش کو کیونکر پتہ چلا کہ ماریا ستاتی عورت ہے۔ میں نے تو اپنی زبان سے کبھی اس حقیقت کا اظہار نہیں کیا۔ پھر اس کمینے کو کیونکر معلوم ہوا؟" مائیکل بڑبڑانے لگا۔

مائیکل وسوسوں میں گھر گیا۔ وہ پتھروں کی جانب متوجہ ہوا۔ لیکن اب پتھر پہلے سے زیادہ وزنی معلوم ہوئے۔ آفتاب کی تمازت بھی تیز معلوم ہوئی اور کمر کا درد بھی پہلے سے زیادہ محسوس ہونے لگا۔

"آخر فلپی کو کیونکر معلوم ہوا؟"، اُس نے جھنجھلا کر خود سے سوال کیا۔

وہ ابھی اس سوال پر غور کر ہی رہا تھا کہ جوآن آکر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ جوآن گھٹے ہوئے جسم کا خوبرو نوجوان تھا اس کی سفید پتلون اور شوخ رنگ کی قمیص دھوپ میں چمک رہی تھی۔

مائیکل نے مشتبہ نگاہ سے جوآن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا: "کیا تم بھی وقت گذاری کے لئے میرے پاس چلے آئے ہو؟"

"تم کچھ ناراض معلوم ہوتے ہو مائیکل"۔ جُوآن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں ناراض نہیں ہوں"۔

"تو پھر تم مجھے دیکھتے ہی شیر کی طرح اُچھل کیوں پڑے تھے؟"

"میرے سامنے اس جانور کا نام نہ لو!"

"شیر کا نام نہ لوں؟"

"نہیں۔ مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے، اور میں دوپہر کے کھانے سے پہلے اسے ختم کر لینا چاہتا ہوں۔ آج ماریا نے کہا ہے کہ کھانا گھر پر ہی کھاؤں"۔

"اہا!"

مائیکل نے سختی سے جُوآن کو گھورا ۔۔

اُس نے دیکھا کہ جُوآن کے ہونٹوں پر بھی ویسی ہی شریر مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہے جیسی کچھ دیر قبل فلپی کے ہونٹوں پر نظر آئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ فلپی کے بدصورت چہرے اور موٹے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ بھدی نظر آئی تھی اور جُوآن تو گاؤں کا انتہائی خوبرو جوان تھا!

مائیکل نے اپنی نظریں جُوآن کے چہرے پر گڑا دیں۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا جُوآن نے فلپی کو ماریا کے جنسی ہیجان کے بارے میں بتلایا ہے؟ اور اگر اُس نے نہیں بتلایا ہے تو پھر اسے کیونکر ماریا کی اس حالت کا علم ہوا!

"جُوآن تم نے ابھی 'اہا!' کیوں کہا؟" اُس نے ترش لہجے میں پوچھا۔

"کیا میں نے 'اہا!' کہا تھا؟"

"ہاں ہاں' میں نے صاف سنا ہے۔ آخر تم نے ایسا کیوں کہا؟"

جُوآن کھڑا مسکراتا رہا۔

"کیا کھانے کی بات سن کر تمہارے منہ سے 'اہا!' نکلا؟"

"نہیں، ہرگز نہیں!"

"تو پھر اس کا یہ مطلب ہوا کہ ماریا کا نام سن کر تم نے اہا! کہا؟"

جُوآن خاموش رہا۔

"میں نے کہا ......"

"تم نے جو کچھ کہا، میں نے سن لیا ہے"۔

"تو پھر ماریا کی کیا بات ہے؟"

"لیکن میں نے تو ماریا کی بابت کوئی بات نہیں کی"۔

"تمہاری آنکھیں اس وقت بھی ماریا کے بارے میں کہہ رہی ہیں۔ بولو، کیا بات ہے؟"

"[illegible] ٹھیک ہے ..."

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ وہ میری بیوی ہے۔"

جوآن مسکراتا رہا۔

"آخر کیا بات ہے تم کیوں مسکرا رہے ہو؟"

"کوئی بات نہیں مائیکل، ماریا تمہاری بیوی ہے خدا اُسے خوش رکھے۔"

"کیا مطلب؟"

"صرف یہ کہ وہ بڑی اچھی عورت ہے خدا اُسے زندہ سلامت رکھے۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟" مائیکل چیخ اٹھا۔

"کیا؟ کیا یہ کہ وہ بہت اچھی عورت ہے؟ لیکن مائیکل ......"

"تم خوب سمجھتے ہو کہ میں کیا پوچھ رہا ہوں۔" مائیکل نے اُونچی آواز میں کہا "یہ کیا ماجرا ہے! تم لوگ میری بیوی کا تذکرہ کیوں کرتے رہتے ہو، آخر تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"تعلق؟"

"ہاں ہاں تعلق، اگر کوئی بات ہو تو مجھے بتا دو۔"

"لیکن مائیکل، کوئی بات ہو تو بتاؤں۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ کوئی بات نہیں؟"

"بھئی مجھے جلدی ہے اس لئے میں چلا۔ شہر جا رہا ہوں، کوئی کام ہو تو بتا دو۔"

"نہیں کوئی کام نہیں۔"

"اچھا تو خدا حافظ مائیکل۔"

جوآن اپنے سر کو جھٹکا دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ مائیکل کو یقین تھا کہ جوآن نے خدا حافظ کے بدلے لفظ خیر تی استعمال کیا ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ آخر ماجرا کیا ہے۔ پہلے فیتی نے اور اب جوآن نے اس کی بیوی کا تذکرہ کیا۔ آخر ان سب کا اُس کی بیوی سے کیا تعلق ہے؟

اسے ماریا کا خیال آیا۔ وہ اُس کے گداز جسم، کمر تک لٹکے ہوئے گھنے سیاہ بال، نازک گلابی ہونٹ، متوالی چال اور دلکش اداؤں کے بارے میں سوچنے لگا۔

واقعی ماریا بڑی جاندار عورت ہے۔ بڑی مستانی!

کھیت میں کام کرنے والے سیدھے سادے مائیکل کی خواہشات سے کہیں زیادہ مست اور جذباتی۔

وہ سوچتا رہا!

کیا یہی وجہ ہے کہ ماریا کا نام آتے ہی فیتی معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا تھا؟ اور جوآن نے شرارت آمیز انداز میں ہا ہا کہا تھا؟

مائیکل نے اپنی کدال قریب چٹان پہ دے ماری۔ ایک تیز آواز ضرور پیدا ہوئی، لیکن چٹان اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔

کیا واقعی یہی بات ہے ؟

کیا ماریا اپنے شوہر کی سادہ لوحی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی تھی ؟

اور اسی لئے گاؤں کے لوگ مائیکل کی جانب دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا اُٹھتے تھے ؟ — کیا یہ بات صرف گاؤں والوں تک ہی محدود تھی، یا آس پاس کے گاؤں اور قریبی قصبہ اور شہر میں جا پہونچی تھی ؟

کیا لوگ ماریا کو شراب کے بھرے ہوئے پیالے کی مانند استعمال کر رہے تھے ؟ کیا ہر کوئی اس پیالے سے اپنی پیاس بجھا رہا تھا، اور اسی لئے مائیکل کو دیکھ کر ہنستا تھا ؟ ؟

سورج کی تمازت ناقابلِ برداشت ہو چلی تھی -

مائیکل نے کئی بار اپنی کدال سے چٹان پر ضرب لگائی ——

"میں ان سب کو مزا چکھا دوں گا !"

اور عین اس موقع پر پیلو وہاں پہونچ گیا -

وہ مائیکل کے گھر کے سامنے سے گذر رہا تھا، تو ماریا نے اُس سے کہا تھا کہ : کھیت پر جا کر مائیکل سے کہہ دے کہ کھانا تیار ہو گیا ہے جلد گھر آ جائے !

پیلو گھامڑ قسم کا دیہاتی تھا، وہ چلتا ہوا بالکل مائیکل کے برابر پہونچ گیا، اس وقت مائیکل انتہائی طیش اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں چٹان پر کدال سے ضربیں لگا رہا تھا -

پیلو نے مائیکل کے شانہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا :

"ماریا ......"

مائیکل زخمی جانور کی مانند تیزی سے گھوما - اُس کے ہاتھ میں اٹھا ہوا کدال پیلو کے سر پر بجلی کی طرح گرا !

تو دیکھا آپ نے کہ کس طرح بے چارے پیلو کی وہی مائیکل کے ہاتھوں شامت آ گئی !!

---

# ادب کی تعلیم

(صفحہ ۴۴ سے آگے)

بیچ جو حسن ہے - ابھی ہمیں انگریزی سے بہت کام لینا ہے - لیکن شعبۂ اردو کے اساتذہ کی ذمہ داری ادبی بصیرت کی تعلیم دینا وہ مسن کے لئے اپنے ملک و قوم کے سامنے جوابدہ ہیں، جب ادبی شعور کی توقع ان سے کی جاتی ہے ہم اس کا مطالبہ انگریزی یا عربی فارسی اور عربی کے اساتذہ سے نہیں کر سکتے - اس سے اردو ادب کے اساتذہ کی ذمہ داری ہی نہیں سرافرازی کا بھی اندازہ لگ جا سکتا ہے - کاش ادب کی یہ تعلیم ہمارے ملک میں رائج ہو کر تیزی سے فروغ پا سکے - ورنہ قومی اور تہذیبی بے بضاعتی کا حل ۳۱ تعلیم کے علاوہ دنیا کے کسی کونے میں موجود نہیں ہے -

---

سیّد علی احسن
ترجمہ
منصور قیصر

بنگلہ

# میرا وطن - ایک بلند مینار

میرا دل اس اونچے مینار کی سیڑھیوں میں ہے
جس کی چوٹی ستارے کی طرح صاف شفاف اور پرسکون ہے
(جیسے بچپن کے بے غرض ہمجولی) کی روشن یاد
جو ماضی کے دھندلکوں کو تابندہ کر دے
جس کا ہر گوشہ چاند ستاروں سے بھرے آسمان کی طرح روشن ہے

کچھ ظالم لوگوں کے ظلم کے باعث
میں خالی اور خاموش ایام میں لرز گیا
میں نے اس دن دشمنوں کے پاؤں کی آہٹ سنی
اچانک ایک رن آگ اور خون نے — وقت کو
اپنے پُرہوس پردوں میں چھپا لیا
اور — صوت و نغمہ و نشاط کی زنجیر ٹوٹ گئی

تب میں نے زندگی کی حرارت کو محسوس کرنے کے لئے
نئی سرحدوں — سمندر کے نغموں
ندی اور درختوں کی آوازوں
اور بارش کے پاکیزہ قطروں میں
امّید فردا کو بیدار کیا
اپنے پرسکون اور کشادہ دل میں
میں نے زندگی کی نئی رمق محسوس کی

جس کا تعلق دل کی انتہائی گہرائیوں سے تھا
بے شمار لوگ دلوں میں جذبۂ جدوجہد سے
ماں کی مسکراہٹ کی طرح پُرمسرت کیف میں دکھائی دیئے
جیسے دھان کے پودے میں تخلیق کا پہلا لمحہ
جیسے لوہار کے ہتھوڑے کی ضرب
وقت چاندی کی طرح چمکتا ہے
نئی صدائیں اور نئی فصلوں کی میٹھی خوشبو
میری مٹی میں روح بس گئی ہے

میرا خیال تھا ظلم کی تاریخ ختم ہو چکی
مگر پھر ظلم اور برائی کی رو
سچائی کے شعلے کو بجھانا چاہتی ہے
تخریب کے عفریت اپنی آماجگاہوں سے باہر نکل آئے ہیں
حسد کے شعلے پھر بھڑک اٹھے ہیں
اور میرے مینار کی سیڑھیوں پر قدم رکھنا چاہتے ہیں
لیکن میرا اعتماد اور یقین محکم ......
دریا کی طرح زندہ و تابندہ ہے
گیتوں کی آواز ابھی ستاروں اور زمین پر ختم نہیں ہوئی۔
سبزے کا نیا سکون، نئی حیرت
پرندوں کی مسلسل چہکاریں
ہم ایک صبح بیدار ہوئے
نئی صبح نے کھلا اٹا دیا
میرا دل ہمیشہ کے لئے بلند مینار کی سیڑھیوں پر ہے
جس کی چوٹی ستاروں کی طرح صاف شفاف اور پرسکون ہے
جیسے بچپن کے بے غرض، بھولی کی روشن یاد
جو ماضی کے دھندلکوں کو تابندہ کر دے
جس کا ہر گوشہ چاند ستاروں سے بھرے آسمان کی طرح روشن ہے

تصنیف و ترجمہ

احمد ظفر

پنجابی

# آہیں

بوہا کوئی ٹھکور دا
ادھی رات دی گل
جیکن بیڑی ڈبدی
جیکن شوکے چھل

آدھی رات ہے
دروازے پر
جانے کس نے دستک دی ہے
جیسے ناؤ ڈوب رہی ہے
لہر غضب میں آئی ہوئی ہے

بوہا چھیکے کھول کے
جے میں پچھائی کون
اگوں کوئی نہ بولدا
نیویں پا کے دھون

تیزی سے دروازہ کھول کے
جب بھی پوچھا
کون ہے جس نے
دستک دی ہے
اس کی گردن جھک سی گئی ہے
جیسے اس کو چُپ سی لگی ہے

ایہہ سفنے سبھا نکاں
پل پل ویکھن نین
جنہاں موت نکھیڑیا
آسے پاسے رہن

یہ سپنے یہ خواب ہیں سارے
پل پل جن کو
میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں
موت جُدا رکھتی ہے جن کو
چاروں جانب گھوم رہے ہیں

لوک گیت

ترجمہ

عطا شاد - مبین سلام

بلوچی

# دل ہے پشیماں

(مغربی اور وسطی بلوچستان کا ایک مقبول عوامی گیت)

لیلڑو لاڑو - لیلڑو لاڑو
اپح وتی کاراں، دل پشوماں انت
کے جتہ تیرے، کے جتہ تیرے
مۓ دل ءِ چونیں، اس دا لگیرے
اپح وتی کاراں، دل پشوماں انت
لیلڑو لاڑو - لیلڑو لاڑو

کس نے مارا تیر نظر کا
تیر نظر کا کس نے مارا
بن گیا دل دہکا انگارا
اپنے کۓ پر دل ہے پشیماں
لیلڑو لاڑو - لیلڑو لاڑو

پل گدیں، شاری پل گدیں شاری
ما فقیراں تئی رہ سر ءِ جاری
اپح وتی کاراں دل پشوماں انت
لیلڑو لاڑو - لیلڑو لاڑو

اے شاری اے سندر ناری
اے سندر ناری اے شاری
میں ہوں تری راہوں میں بھکاری
اپنے کۓ پر دل ہے پشیماں
لیلڑو لاڑو - لیلڑو لاڑو

تو کدی کائے تو کدی کائے
تو منی جان ءُ ساہ وار واے
اپح وتی کاراں دل پشوماں انت
لیلڑو لارو - لیلڑو لاڑو

تیری حسرت تیری تمنا
تیری تمنا تیری حسرت
میری ہستی میری فطرت
اپنے کۓ پر دل ہے پشیماں
لیلڑو لاڑو - لیلڑو لاڑو

خواجہ غلام فرید
ترجمہ
مولانا محمد عزیز الرحمن

سرائیکی

# پورب کی ہوا

| | |
|---|---|
| پردیسی یاروا<br>پورب دی گھلے | پردیس میں رہنے والے دوست<br>پورب کی ہوا چل رہی ہے |
| ساونڑ مینہ برسات دی واری<br>پھوگ پھلی کھپ پھلے | ساون کی برسات کی باری آگئی ہے<br>پھوگ اور کھپ کے پودے پھول دے رہے ہیں |
| گاجاں گجکن بجلیاں لِسکن<br>ذوقوں دلڑی چُھلے | بادل گرج رہے ہیں، بجلیاں کوند رہی ہیں<br>اور دل میں ذوق و وجدان کی وجہ سے ہیجان پیدا ہو رہا ہے |
| دھامنڑ کترنڑ سنڑ تے سبھوں<br>چتر سہاگ دا جُھلے | دھامن، کترن سنڑ پودوں کے سر پر سہاگ کا چتر<br>جھول رہا ہے۔ سب مسرت سے مست ہیں |
| جیں تئیں پانی پھڑ نہ کھٹی<br>کون بھلا سندھ چلے | جب تک بارش کا پانی خشک نہیں ہوتا بھلا سندھ کی طرف کون جا<br>سکتا ہے جب تک ریگستان میں پانی ہے ہمارا قیام یہیں رہے گا |
| روز بروز فرید ہے لذت<br>طبع تے تھیوے تے کھلے | ایسے کیف افزا موسم کے اثر سے اے فرید روز بروز لذت زیادہ<br>ہو رہی ہے اور طبیعت میں لحظہ بہ لحظہ شگفتگی آتی جا رہی ہے۔ |

خواجہ حبیب اللہ
ترجمہ
تابش صدیقی

کشمیری

# پھل

میں نے ایک بھکاری دیکھا
ہاتھ کو پھیلائے جو کھڑا تھا
میں نے کہا: "اے مورکھ بندے!
بید سے کیا پھل تجھ کو ملے گا؟

کیا کیا میں نے دام بچھائے
کیا کیا دشت نوردی کی ہے
کیسے کیسے کوہساروں کی
ہر اونچی چوٹی سر کی ہے

جو انساں کی طاقت میں تھا
وہ سب کچھ میں نے کر دیکھا
گر یہ رضا مولا کی نہیں تھی
بید سے کیا پھل مجھ کو ملتا

بید سے کیا پھل تجھ کو ملے گا

ادارہ

## تبصرہ و تعارف

# نئی کتابیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

## شہر نگاراں

مصنف :۔ سید سبط حسن

صفحات :۔ ۲۲۴ - قیمت :۔ ۵ روپے

ناشر :۔ انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ، کراچی

انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ، کراچی کی جانب سے ایک کتاب بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کی گئی ہے جس کا نام "شہر نگاراں" ہے۔ مصنف ہمارے ملک کے مشہور صحافی اور ادیب سید سبط حسن ہیں جن کے قلم میں ابتدا ہی سے جادو کی تاثیر ہے۔

"شہر نگاراں" ریاست حیدرآباد دکن کے ماضی قریب کی تاریخ بھی ہے اور سید سبط حسن کی یاد کا ایک حصہ بھی ہے۔ اس میں سبط حسن کے واسطے سے ایک ماحول ملتا ہے جو جدید حیدرآباد ہے۔ اس کے نمائندوں کا کام ریاست کے اندر مشترک انسانی اقدار کی حفاظت کرنا اور انہیں فروغ دینا ہے۔ یہ باعمل اور باشعور جوانوں کی ٹولی تھی۔

اس کتاب میں مولانا محمد علی، سروجنی نائیڈو، قاضی عبد الغفار اور مولوی عبد الحق جیسے رہنماؤں کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ صحافت کے معیار، سیاست کی رفتار اور ادب و تحقیق پر گفتگو کی گئی ہے اور جوان سال ادیبوں، شاعروں اور کارکنوں کا حال بھی ہے جو اس پندرہ سال گزرنے کے بعد اب کاروان میں شامل ہو گئے ہیں۔ انہیں میں مرزا ظفر الحسن بھی ہیں جو انجمن طلبائے جامعہ عثمانیہ کے محترم معتمد ہیں، مخدوم، سکندر علی وجد، ابراہیم جلیس وغیرہ اسی کاروان کے مسافر ہیں۔

سبط حسن نے بے شمار واقعات اور یادیں اس کتاب میں محفوظ کر دی ہیں، جو ہمارے سامنے

بڑی اہم ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق صرف حیدرآباد دکن کے لوگوں سے نہیں ہے بلکہ وہ ہماری ثقافت سے براہ راست اور بہت گہرا رشتہ رکھتی ہیں۔

اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف واقعات کا تماشائی ہی نہیں، ایک کردار بھی ہے اور ہر واقعہ میں شریک ہے۔ اس نے دکن میں گذارے ہوئے دنوں کو اپنے دل کی دھڑکنوں میں سمو کر پیش کیا ہے۔ ان سے اپنی ذہنی تعمیر میں مدد لی ہے۔ اور گرد و پیش کے مشاہدہ کو اپنے جذبے اور فکر کی روشنی عطا کر دی ہے۔

ہم ایک کتاب کے مصنف سے اور کس بات کی توقع رکھتے ہیں یہ ڈرامہ۔ وہ مخصوص فن ہے جس میں ریاست حیدرآباد کے لوگ دوسروں سے بہت آگے نکل گئے تھے۔ سبط حسن ان کے شغف سے واقف بھی ہیں اور انہیں عزیز بھی رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کو اس طرح لکھا ہے کہ حیدرآباد دکن کی انفرادیت بھی نمایاں ہے اور برصغیر کا مزاج بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ نوابوں، جاگیرداروں اور نظام کا حیدرآباد، ادیبوں اور شاعروں کا حیدرآباد، اردو یونیورسٹی کا ماحول، مسلمانوں میں حاکم ہونے کا احساس، ریاست میں برصغیر کا ایک تہذیبی اور ثقافتی مرکز، اقبال، جوش، فانی اور دوسرے اکابر سے یہاں کے لوگوں کے روابط، غرض ریاست حیدرآباد کے محدود ماحول میں ایک وسیع دنیا کے آباد ہونے کی منظر کشی اس کتاب سے ملتی ہے۔ جو ہماری تاریخ اور تہذیب کی بعض اہم کڑیوں کو ملا کر ہمارے شعور و علم میں اضافہ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں اصل مزا سبط حسن کی تحریر پڑھ کر آتا ہے جو لطیف کیف پرور اور سوز آگیں ہے۔

## مرقع مسعود

مرتبہ :- جلیل قدوائی

صفحات :- ۱۸۲ - قیمت :- ۶ روپے

ملنے کا پتہ :- راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان

بی، ۸۵ - بلاک پی - شمالی ناظم آباد - کراچی

یہ کتاب مضامین اور تاثرات کا مجموعہ ہے جو راس مسعود سے متعلق ہیں۔ ان کو علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک ذہین فرزند جلیل قدوائی نے مرتب کیا ہے۔ راس مسعود کے بارے میں کون نہیں جانتا۔ جس کے دادا سرسید اور والد جسٹس محمود جیسے لوگ ہوں اسے کون نہیں جانتا تھا۔ لیکن راس مسعود صرف باپ دادا کی دی ہوئی شہرت کے بل پر زندگی گزارنے والوں میں سے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنا مقام خود پیدا کیا۔ وہ اپنے باپ اور دادا ہی کی طرح زبردست ماہر علم تھے۔ اُن کے دادا نے مسلم یونیورسٹی کی بنیاد رکھی تھی، انہوں نے حیدرآباد دکن میں اردو یونیورسٹی کے نظام کا خاکہ تیار کیا

وہ ریاست حیدرآباد میں بڑے عہدے پر فائز رہے۔ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور آخر عمر میں نواب بھوپال نے انہیں اپنے پاس بلا کر تعلیم کی وزارت اُن کے سپرد کر دی تھی۔ انہوں نے جاپان کا سفر اس غرض سے کیا تھا کہ اپنے ملک کی تعلیم میں خاطر خواہ تبدیلی ہو سکیں تو۔ انہوں نے علامہ اقبال سے کہا تھا کہ تعلیم کے بغیر سیاست کبھی کبھی بڑے خطرناک موڑ پر پہنچ جاتی ہے اسی لئے ہماری سب سے بڑی ضرورت تعلیم ہے۔

اُن کی زندگی، طرزِ فکر، رہن سہن، معاشرت کو یہ کتاب احاطہ کرتی ہے۔ اور بحیثیت مجموعی ایک بڑے ذہن کو ہم پر بے نقاب کرتی ہے۔ جس نے بقول رشید احمد صدیقی "غیر معمولی خراجِ تحسین دو عظیم تہذیبوں سے لیا۔ مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا بہترین امتزاج ان کی ذات میں پایا جاتا تھا۔ لیکن ان کا دل سرتاپا مشرقی تھا۔ جس میں برصغیر کے مسلمانوں کی قومی زندگی بھی دھڑکتی رہتی تھی۔

یہ کتاب ہمارے لئے ایک اچھے مطالعہ کا کام دیتی ہے۔ اس میں ماہرین تعلیم کی خصوصی دلچسپی کے مواد کے علاوہ، اسلاف کے کارناموں کی جستجو کرنے والے افراد کے لئے بہت کچھ ہے۔ اور ثقافت و تہذیب کی وہ روشنی فراواں ہے جس کے لئے ہمارا تجسس روز بروز شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے معلوم نہیں ہمارے یہاں صنعت و تجارت کی ترقی کا راستہ کیا اور کس موڑ پر ان خوابوں سے ہمکنار ہوگا جو سر سید، جسٹس محمود، راس مسعود اور علامہ اقبال وغیرہ نے دیکھے تھا۔ اور جن کی تعبیر کی تلاش ہم سب کو ہے۔

## ایمانیات

مولف :- مونس زبیری
صفحات :- ۱۸۵ - قیمت :- ۲ روپے ۲۵ پیسے
ملنے کا پتہ :- پبلشرز یونائیٹڈ لمیٹڈ - ۱۷۶ - انارکلی - لاہور

یہ ایک قابل قدر کتاب ہے، جس میں ایمان اور دین کے ارکان پر مفصل بحث ملتی ہے مونس زبیری صاحب نے کوشش کی ہے کہ آسان اور دل نشین پیرائے میں مسلمانوں اور نوجوانوں راہ راست سے ہٹے ہوئے مسلمانوں کو صراط مستقیم کی طرف لائیں۔ انہوں نے روزمرہ کی دینی ضروریات کو بڑے سلیقے سے یکجا کر دیا ہے۔ اور بقول مولانا عبدالماجد دریابادی مؤلف موصوف نے کافی محنت و تلاش سے اس رسالہ کو ترتیب دیا ہے۔ جس قدر مضمون رسالہ میں دیا گیا ہے وہ ہدایت کے لئے راہنما ہے۔ مونس صاحب کی اس ایمان افروز پیشکش کا ہر مسلمان کے گھر میں ہونا بے حد ضروری ہے۔

وہ اپنی جستجو، محنت، ذہنی شغف اور شستہ و رواں پیرایۂ اظہار کے لئے بجا طور پر داد کے مستحق ہیں۔

## دو پاٹن کے بیچ

مصنفہ :- رضیہ فصیح احمد
ناشر :- مکتبۂ ادب جدید- ۱۵ پٹیالہ گراؤنڈ، میکلوڈ روڈ، لاہور
صفحات :- ۲۱۵ - قیمت :- ۵ روپے

رضیہ فصیح احمد کے ناول "آبلہ پا" کو آدم جی کا ادبی انعام مل چکا ہے۔ "دو پاٹن کے بیچ" انہی مصنفہ کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جسے مکتبۂ ادب جدید نے خوب صورت ٹائپ میں شائع کیا ہے۔ اردو ادب کے افسانوی ادب میں ایک دھوم دھام کا زمانہ گزر چکا ہے۔ کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، منٹو، بیدی، احمد ندیم قاسمی - پھر قرۃ العین حیدر، بلونت سنگھ اور شوکت صدیقی وغیرہ۔ اس کے بعد اچانک افسانہ نگاری کی رَو کمزور پڑ گئی۔ نئے لکھنے والوں میں جیلانی بانو، رام لعل، انور عظیم اور واجدہ تبسم وغیرہ کے ساتھ رضیہ فصیح احمد کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ ان کے بعض افسانے "شہزاد" "گنجینۂ در" "دو پاٹن کے بیچ" آپ کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ان میں لکھنے والے کے وہ خواب ملتے ہیں۔ جو اپنے عہد کی بنتی ہوئی اقدار کی طرف اشارا کر رہے ہیں۔ کرداروں سے آپ کو یک گونہ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض افراد کو ان کا افسانہ "لگاؤ" بے حد پسند آیا ہے۔ جو اس کتاب میں شامل ہے۔ ان کا ایک افسانہ "بدلہ" اس جملہ سے شروع ہوتا ہے۔

"وہ ہینڈل پکڑ کر اوپر چڑھی"

اور ختم ایک اور جملہ پر ہوتا ہے۔

"اور اس وقت اسے افسوس ہوا کہ کیوں نہ اپنی ٹوکری میں وہ "آگ کا دریا" اور "اداس نسلیں" بھی لے کر چلی"

درمیان کی کہانی آپ پڑھئے۔ مجھے تو ہینڈل پکڑ کر چڑھنے والے یا چڑھانے والے سے صرف یہ شکایت ہے کہ "آگ کا دریا" اور "اداس نسلیں" کا تذکرہ ایک ساتھ کیوں کیا ہے؟

رضیہ فصیح احمد اردو کی ذہین افسانہ نگار ہیں۔ اور ان سے مستقبل میں ہماری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ انہوں نے گزشتہ دنوں کئی اچھی کہانیاں بھی لکھی ہیں جو افکار اور دوسرے جرائد میں چھپی ہیں۔

کتاب خوبصورت ٹائپ میں شائع کی گئی ہے۔ اور قیمت مناسب ہے۔

ص۔ل

# رفتارِ عالم

## ادبی و تہذیبی خبریں اور تبصرے

## اردو میں تحقیق اور سائنسی تعلیم کے لئے پوری صلاحیت موجود ہے

**ملک کے عوام کا مستقبل اردو کے مستقبل سے وابستہ ہے**

### جامعہ کراچی میں انڈونیشیا۔ چین۔ سعودی عرب۔ ملائیشیا۔ جاپان اور امریکہ کے طلبہ اردو زبان کے حصول میں مصروف ہیں

کراچی۔ پچھلے دنوں شعبۂ اردو کی انجمن طلبہ کے افتتاح کے موقع پر مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر محمود حسین نے کہا کہ ملک میں عوام کا مستقبل اردو کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ آپ نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ اب ملک میں اردو کی تحریک اس قدر زور پکڑ گئی ہے کہ آئندہ چند سالوں میں تمام علوم وفنون کی تعلیم اردو میں دی جائے گی۔ موصوف نے کہا کہ اردو میں تحقیق اور سائنسی تعلیم کے لئے پوری صلاحیت موجود ہے۔ اردو کی بین الاقوامی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر محمود حسین نے کہا کہ تمام ممالک اب اس بات سے خوب آگاہ ہیں کہ کسی ملک کی سیاسی اور معاشرتی قدروں اور تہذیب وتمدن اور ثقافت کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ پہلے اس ملک کی زبان پر عبور حاصل کیا جائے۔ آپ نے کہا کہ اسی مسئلہ کے پیش نظر آج جامعہ کے شعبۂ اردو میں مشرق وسطیٰ اور چین کے طالب علم اردو زبان سیکھنے کے لئے موجود ہیں۔

قبل ازیں شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ دوسرے ممالک بھی اردو کی تعلیم کی طرف توجہ دے رہے ہیں اور فی الوقت شعبۂ اردو میں انڈونیشیا، چین، سعودی عرب، ملائیشیا، جاپان اور امریکہ کے طالب علم اردو زبان کے حصول میں مصروف ہیں۔

شعبۂ اردو کی علمی مصروفیات پر تبصرہ کرتے ہوئے موصوف نے بتایا کہ ان دنوں ایک جامع قواعد لکھنے

کے علاوہ انگلستان میں مقیم پاکستانی بچوں کی تعلیم کے لئے ایک نصاب بھی مرتب کیا جا رہا ہے، جس کا انگلستان میں مقیم والدین نے مطالبہ کیا ہے ۔

## ٹورنٹو سے اردو جریدہ "صہبا" کا اجرا

ٹورنٹو (کنیڈا) ۔ افکار کے دیرینہ رفیق پروفیسر ضیاء علیگ نے جو لارنٹین یونیورسٹی، سڈبری (صوبہ انٹوریو ۔ کنیڈا) میں تاریخ کے پروفیسر ہیں، اطلاع دی ہے کہ ٹورنٹو کے اردو داں اور باذوق حضرات اپنی بزمِ ادب کے زیرِ اہتمام "صہبا" کے نام سے (یہ نام پروفیسر ضیا نے متجویز کیا ہے) ایک اردو جریدہ کا جاری کر رہے ہیں ۔ اس کی ادارت کے فرائض ایم ایچ کے قریشی کے سپرد ہیں صہبا کے اجراء کا مقصد یہ ہے کہ مغرب اور مشرق میں رابطہ قائم ہو اور اہلِ مشرق کو مغربی ادب، کلچر اور بالخصوص شمالی امریکہ کی ادبی و ثقافتی تحریکوں اور سرگرمیوں سے باخبر رکھا جائے ۔ شمالی امریکہ کی تاریخ میں یہ پہلا اردو جریدہ ہے جسے اردو سے محبت رکھنے والے ٹورنٹو ایسے دور افتادہ مقام سے شائع کرنے کی ابتدا کر رہے ہیں ۔

## روس میں پاکستانی ادب سے دلچسپی

ماسکو ۔ روس کے ادیبوں، مصنفوں اور عوام کی پاکستان اور اُس کے لٹریچر میں دلچسپی تیزی سے بڑھ رہی ہے ۔ گذشتہ سال کے دوران پاکستانی امور کے ماہر روسی ادیبوں نے جو کتابیں لکھی ہیں انہیں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے بلکہ یونیورسٹیوں میں تعلیمی مقاصد کے لئے انہی کتابوں کی بنیاد پر ایک نئی نصابی کتاب مرتب کر لی گئی ہے ۔ پشتو زبان کے پاکستانی ادیب امیر حمزہ شنواری اجمل خٹک، میر مہدی شاہ اور ملی محمد طوفان کے کئی مجموعے شائع کرنے کے علاوہ احمد ندیم قاسمی کی نظموں کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے ۔ روسی زبان میں پنجابی شاعروں کا ایک تذکرہ مرتب کرنے کی اطلاع بھی ملی ہے ۔ معلوم ہوا ہے کہ لینن گراڈ اور تاشقند کے اسکالروں نے "پاکستان" کے عنوان سے ایک ضخیم علمی کتاب بھی شائع کی ہے ۔ اس سے قبل پاکستانی افسانہ نگاروں کا منتخب مجموعہ جسے فیض احمد فیض نے مرتب کیا تھا، شائع ہو چکا ہے ۔

تازہ ترین اطلاعات کے بموجب شوکت صدیقی کا آدم جی انعام یافتہ ناول "خدا کی بستی" بھی روسی زبان میں شائع ہو چکا ہے ۔

## ویت نام کی جنگ فوراً بند کی جائے

### پاکستان امریکہ اور برطانیہ کے دانشوروں کے بیانات

کراچی ۔ پاکستانی فن کاروں، دانشوروں اور سماجی و ثقافتی کارکنوں نے جن میں جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض بھی شامل ہیں ایک مشترکہ بیان میں مطالبہ کیا ہے کہ ویت نام میں امریکی جارحیت ختم کی جائے اور اس جنگ کو پھیلنے سے روکا جائے ۔

اس سلسلے میں گذشتہ دنوں یہاں ایک دستخطی مہم

شروع کرنے کے لئے فیض احمد فیض کی صدارت میں ایک اجلاس منعقد کیا گیا ۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ اس قسم کے اجلاس لاہور، ڈھاکہ اور ملک کے دیگر حصوں میں بھی بلائے جائیں گے تاکہ ویت نام پر بمباری بند کرنے اور جنگ کو روکنے کے لئے اہلِ علم و فکر کو منظم کیا جاسکے ۔

امریکی پروفیسروں کے علاوہ برطانیہ کی یونیورسٹیوں کے ڈیڑھ ہزار پروفیسروں اور لیکچراروں نے جن میں چار نوبل انعام یافتگان اور رائل سوسائٹی کے بتیس ارکان بھی شامل ہیں۔ "ٹائمز" میں اپنے دستخطوں سے ایک اشتہار شائع کرایا ہے جس میں ویت نام کی جنگ کو عالمی امن کے لئے خطرہ قرار دیتے ہوئے امریکی پالیسی کی برطانوی حمایت کی شدید مذمت کی گئی ہے ۔

## جامعہ کراچی میں رشید احمد صدیقی پر مذاکرہ

کراچی ۔ گذشتہ دنوں جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام رشید احمد صدیقی کی زندگی، شخصیت اور فن پر ایک سیر حاصل مذاکرہ منعقد ہوا جو ۱۲ بجے دن سے ۳ بجے دن تک جاری رہا۔ مذاکرہ میں جن حضرات نے حصہ لیا ان میں سے بیشتر وہ تھے جنہوں نے دوست یا شاگرد کی حیثیت سے رشید صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے ۔ خود صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی بھی ان کے عزیز شاگردوں میں سے ہیں ۔

مذاکرہ کے شرکاء میں پروفیسر محمد شفیع، سید الطاف علی بریلوی، پروفیسر احسان رشید، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، انجم اعظمی اور جمیل اختر قابل ذکر ہیں ۔ انجم اعظمی کا رشید صاحب پر جامع اور بھرپور مقالہ بے حد پسند کیا گیا۔

## غالب کی یاد میں

کراچی ۔ انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ نے مجوزہ ادبی و ثقافتی پروگرام "غالب کے اُڑتے پُرزے" کے سلسلے میں تصویر سازی کے ایک انعامی مقابلہ کا اعلان کیا ہے جس میں ۲۲ سو روپے کے نقد انعامات، ایک ٹرافی، اور تین طلائی تمغے دیئے جائیں گے ۔

جواں سال مصوروں کو غالب کے اشعار کا مفہوم اور شعری نزاکت سمجھانے کے لئے انجمن نے "درسِ غالب" کا بھی اہتمام کیا، جس کا افتتاح فیض احمد فیض نے کیا۔ شارحینِ غالب میں جنہوں نے نوجوان مصوروں کو ہفتہ بھر تک درس دیا ممتاز حسین، اسلم ضیائی، شان الحق حقی، بیگم سلمیٰ حقی، ڈاکٹر اسلم فرخی، شجاع احمد زیبا اور مرزا ظفر الحسن شامل ہیں۔

## روسی ادیبوں کو اعلیٰ ترین اعزازات

ماسکو ۔ سوویت یونین کا اعلیٰ ترین اعزاز "ہیرو آف سوشلسٹ لیبر" مائیکل شولوخوف، کونسٹانٹن فیدین، الیگزنڈر کورنی چک، لیونا نڈ لیونا نوف، مرزا ترسون زادہ، پاؤلو شاتنا اور آندری اپٹ کو گذشتہ دنوں دیا گیا ــــــ ان ادیبوں میں سے اکثر لینن انعام یافتہ ہیں ۔ اور مائیکل شولوخوف کو نوبل پرائز بھی مل چکا ہے ۔

## تحریک پاکستان اور علامہ اقبال —

### پراسیس میں تصانیف

لاہور۔ پنجاب یونیورسٹی نے تحریک پاکستان کی تاریخ مرتب کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں نگرانی کے لئے تین ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر دی گئی ہے جو ایسے افراد کے ناموں کی فہرست تیار کر رہی ہے جنہوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا۔

اس کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی نے ایک منصوبہ تیار کیا ہے جس کے تحت متعدد غیر ملکی زبانوں میں علامہ اقبال کے کلام اور فلسفہ سے متعلق تصنیفات شائع کی جائیں گی۔ انگریزی میں علامہ کی سوانح عمری، اور ان کے کلام کے مجموعوں کا انگریزی میں ترجمہ بھی شائع کیا جائے گا۔

## جوش کے ساتھ ایک شام

کراچی۔ خاتون دینا لائبریری ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام گذشتہ دنوں جوش ملیح آبادی کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ فیض احمد فیض، سید سبط حسن، رئیس امروہوی اور سید محمد تقی نے جوش کی شخصیت اور فن پر تقاریر کیں اور انہیں خراج تحسین ادا کیا۔

اس سے قبل لائبریری ایسوسی ایشن فیض کے ساتھ ایک شام منا چکی ہے اور آئندہ احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ایک شام منائی جائے گی۔

## تاریخ کی دو معیاری کتابیں

ڈھاکہ۔ مرکزی وزیر تعلیم قاضی انوار الحق نے اعلان کیا ہے کہ مرکزی وزارت تعلیم ماہرین کی نگرانی میں درس و تدریس کے لئے تاریخ کی دو معیاری کتابیں تیار کر رہی ہے جن میں سے ایک کا تعلق تاریخ پاکستان سے اور دوسری کا تعلق مسلم بنگال سے ہوگا۔

## تعمیری ادب تخلیق کیجئے!

### کمشنر قلات کی ادیبوں اور شاعروں سے اپیل

کوئٹہ۔ کمشنر قلات جناب ظفر علی خاں نے ادیبوں اور شاعروں سے اپیل کی ہے کہ وہ عوام کی ذہنی نشوونما کے لئے تعمیری ادب تخلیق کریں، انہوں نے ڈویژن کے ڈپٹی کمشنروں کو ہدایت کی ہے کہ وہ ادیبوں اور شاعروں کے اجتماعات کا انتظام کر کے عوام کو ان کے تعمیری جذبات سے واقف ہونے کا موقع دیں۔

## ارم لکھنوی کی رحلت

کراچی۔ آرزو اسکول کے نمائندہ اور مشہور و ممتاز شاعر ارم لکھنوی کا گذشتہ دنوں یہاں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ وہ نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر تھے بلکہ نہایت اچھے اور مخلص انسان بھی تھے۔ افسوس کہ ان کا مجموعۂ کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ جس کی ترتیب و اشاعت میں وہ مصروف تھے۔ ارم ایسے مستند، باکمال، خاموش طبع اور مخلص شاعر و انسان کی وفات سے لکھنؤ اسکول کی آخری بہار بھی اجڑ گئی۔

# مختصر اور اہم

○ لندن۔ نوٹنگھم کی اردو لائبریری کمیٹی نے گذشتہ دنوں نوٹنگھم میں ایک اردو لائبریری قائم کی ہے لائبریری کی افتتاحی تقریب میں نوٹنگھم کے شیرف کے علاوہ برمنگھم یونیورسٹی کے ڈائرکٹر اسلامی تحقیقات، مقامی ڈائرکٹر تعلیمات، ممبر پارلیمنٹ اور کئی معزز افراد نے شرکت کی۔ اس لائبریری کے لئے انجمن ترقی اردو پاکستان اور پاکستان کی وزارت تعلیم نے کتابوں کی پیش کش کی ہے۔

○ پیرس۔ پکاسو کے فن کی نمائش جسے فرانس کی تاریخ میں سب سے کامیاب نمائش قرار دیا جا رہا ہے۔ تین ماہ تک جاری رہنے کے بعد گذشتہ ہفتہ ختم ہو گئی۔ یہ نمائش پکاسو کی ۸۵ ویں سالگرہ پر منعقد کی گئی تھی اور اسے تقریباً ۹ لاکھ افراد نے دیکھا۔

○ لاہور۔ ترکی کی مشہور محقق خاتون، جو پچھلے دنوں پاکستان کے دورے پر آئی تھیں، یہ انکشاف کیا کہ عہد وسطیٰ کے مشہور شاعر حضرت مولانا جلال الدین رومی ترکی اور یونانی زبانوں میں بھی اشعار کہتے تھے چنانچہ ان کی شاعری کا کچھ سرمایہ ترکی زبان میں بھی محفوظ ہے۔

○ مغربی جرمنی۔ چیئرمین ماؤزے تنگ کے فلسفے پر مبنی "تعلیمات ماؤزے تنگ" کے زیر عنوان کتاب کا فرانسیسی، جرمن، اسپینی اور جرمن زبانوں میں ترجمہ شائع کر دیا گیا ہے ــــــ اس کے علاوہ چینی رہنما کی ایک اور تصنیف بھی "منتخب مضامین" کے عنوان سے چار جلدوں میں شائع کی گئی ہے ــــــ یہ انگریزی زبان میں ہے۔

## پروفیسر سید نواب علی کی اہلیہ کا مدینہ منورہ میں انتقال

کراچی۔ ذریعۂ تار اطلاع ملی ہے کہ اسلامی تاریخ کی مشہور و مستند شخصیت پروفیسر سید نواب علی (سابق وزیر تعلیمات جوناگڑھ) کی اہلیہ احمدی بیگم کا ۱۲ فروری ۶۷ء کو مدینہ منورہ میں انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ۔ وہ یکم فروری کو اپنے بھائی سید حبیب کے ہمراہ فریضۂ حج ادا کرنے کراچی سے گئی تھیں۔

احمدی بیگم پروفیسر سید نواب علی کی تیسری بیوی تھیں، جن سے پروفیسر صاحب نے دو بیویوں کی وفات کے بعد ۱۹۲۳ء میں شادی کی تھی۔ وہ عرب کے مشہور خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کے والد سید احمد بالفقیہ اپنے دور کے جید عالم تھے۔

احمدی بیگم نے اپنے بلند مرتبت شوہر پروفیسر نواب علی (وفات: ۳۰ جون ۱۹۶۱ء بمقام کراچی) کی آخر دم تک بھرپور رفاقت کی۔ وہ نہایت باشعور، ملنسار، خوش خلق اور خدمت گذار، مخلص اور عبادت گذار خاتون تھیں۔

پس ماندگان میں سید انور علی (منیجر نیشنل بنک)، سید احمد علی (ڈائریکٹر نیشنل بنک)، سید محبوب علی (منیجر مسلم کمرشل بنک)، سیدہ نزہت بخاری، سید اطہر غالب قریشی اور سید محمود صہبا لکھنوی شامل ہیں۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحومہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور متعلقین کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

○



# گھر گھر پوسٹل لائف انشورنس کا چرچا ہے

روز بروز زیادہ سے زیادہ لوگ پوسٹل لائف انشورنس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ پوسٹل لائف انشورنس نے پاکستان میں سب سے زیادہ بیمہ پالیسیاں جاری کی ہیں۔ ان کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار سے بڑھ چکی ہے۔

اس لئے کہ پوسٹل لائف انشورنس کی پریمیم کی شرح سب سے کم اور منافع زیادہ ہے۔ پریمیم کی شرح میں بغیر کسی اضافے کے ماہانہ قسطوں کی سہولت میسر ہے۔ اور تمام ادائیگیاں بلا تاخیر کی جاتی ہیں۔

## بیمہ کی رقم پر شرح بونس

عام شہریوں کے لئے :- ۱۸ روپے فی ہزار
فوجیوں کے لئے :- ۱۵ روپے فی ہزار

# پوسٹل لائف انشورنس

— ملک میں زندگی کے بیمہ کا سب سے بڑا ادارہ!

### افکار دوستوں سے

# ایک اپیل

خریداروں کی مہم میں سرگرمی سے حصہ لیجیے
اچھے اور معیاری ادب کی حوصلہ افزائی کیجیے!

افکار خود بھی پڑھیے،
اور عزیزوں اور دوستوں
کو بھی اس کے
مطالعہ کی دعوت دیجیے

زر سالانہ صرف بارہ روپے
ادا فرما کر آپ اور گھر کا ہر فرد افکار سے استفادہ کرسکتا ہے

**افکار اردو ماہناموں کی آبرو ہے**
**افکار آپ کا اپنا رسالہ ہے**

افکار کی
توسیع اشاعت میں حصہ لے کر تعاون کیجیے

زر سالانہ اس پتہ پر بھیجیے:

**مینیجر ماہنامہ افکار**
**رابسن روڈ، کراچی**

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی — طابع: مشہور آفسٹ پریس کراچی — دفتر: رابسن روڈ کراچی